

بسم الله الرحمن الرحيم  
میزان

تفسیر آیات القرآن

جلد هشتم

سورة آل عمران آیات ۱ تا ۱۷۵

ادبیات

مطبع اسلام آباد

شعبه اسلامیات و کتب و نشریات و مطبعات

مولانا عبدالرزاق بھٹوی صاحب

پتہ پورہ پورہ پورہ پورہ

ڈاکٹر جمشید احمد صاحب

پتہ پورہ پورہ پورہ



کتاب لاریب کی توضیحات و تشریحات، علوم عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں  
علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم و جدید مسائل پر اباحت کا حسین مرقع  
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ و تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر  
مسمی بہ

# نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن  
جلد ہشتم

سورة آل عمران آیات 70 تا 165  
از رشحات قلم

محقق اہلسنت

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت علامہ

مولانا عبدالرزاق بہترالوی، حطاروی

مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی

ناشر: جامعہ جماعتیہ مہر العلوم راولپنڈی



## جملہ حقوق بحق مصنف موجود ہیں

نام کتاب:	نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن
	سورۃ آل عمران آیات 165 تا 70
تالیف:	شیخ الحدیث علامہ عبدالرزاق بھتر الوی حطاروی
کمپیوٹر گرافکس:	محمد اسحاق ہزاروی
کمپوزر:	افضال احمد، تنویر احمد ہزاروی
کمپوزنگ سنٹر:	مہر العلوم کمپوزنگ سنٹر راولپنڈی
بار طباعت:	اول مارچ 2008ء
صفحات:	832
	23 x 36/8

### ملنے کے پتے

- جامعہ جماعتیہ مہر العلوم شکرپال راولپنڈی
- جامع مسجد غوثیہ F.6/1 اسلام آباد
- اسلامک بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی
- مکتبہ امام ابوحنیفہ مسلم ٹاؤن راولپنڈی
- اسلامک یونیورسٹی بک سینٹر H.10 اسلام آباد
- اور ہر اچھے بک شال سے خرید فرمائیں

### انتباہ

ادارہ کی جانب سے ”ضیاء العلوم پبلی کیشنز“ کو مصنف کی چند کتب کی اشاعت کی اجازت دی گئی ہے اسکے علاوہ کوئی بھی پبلشر بغیر اجازت اشاعت کی کوشش نہ کرے۔



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
16	وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ..... (آیہ نمبر ۷۳)	1	يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ..... (۷۰)
16	ما قبل سے تعلق	1	ما قبل سے تعلق
16	وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ	1	دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے
16	اعلیٰ حضرت و علامہ رازی رحمہما اللہ	1	یہاں اللہ کی آیات سے مراد کیا ہے
17	راقم اور روح البیان و تفسیر کبیر	4	﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾
18	تفسیر کبیر نے دوسرا معنی ان الفاظ سے بیان کیا	4	علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے
18	آیہ کریمہ کا مختصر مطلب	5	يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ..... (۷۱)
19	قُلْ إِنْ الْهُدَى	5	ما قبل سے تعلق
20	أَنْ يُؤْتِيَ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ	6	يَا أَهْلَ الْكِتَابِ
22	قُلْ إِنْ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ	6	اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ و تفسیر خازن
23	وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ	7	دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں
24	يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ..... (۷۴)	8	وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ
24	ما قبل سے تعلق	8	حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقے
25	یہود کی دو چالوں کے دو بیان	8	وہ حق کو کیسے چھپاتے تھے
25	فضل سے مراد رسالت و نبوت بھی ہے	9	وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ
26	بندوں پر رب تعالیٰ کے انعامات کی کوئی حد نہیں	9	معز لہ کا مذہب
27	وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ..... (۷۵)	9	اہل سنت و جماعت کا مذہب
27	ما قبل سے تعلق	10	وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ..... (۷۶)
27	پہلی وجہ	10	ما قبل سے تعلق
28	دوسری وجہ	10	شان نزول
28	شان نزول	12	یہ تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں
28	آیہ کریمہ کے نزول سے تنبیہ	12	وجہ النہار اور آخرہ سے کیا مراد ہے
29	اعتراض	13	غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے
29	جواب	13	مسلمان محفوظ رہے
29	آیہ کریمہ میں مذکور قنطار سے مراد	13	یہود و نصاریٰ ذلیل خوار ہوئے
30	مجازی معانی	14	لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
31	اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و مدارک	63	حقوق العباد اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا
31	ذَلِكْ بِأَنَّهُمْ قَالُوا	65	وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُودُونَ..... (۷۸)
32	راہ کی نفی کا مطلب	65	شان نزول
32	وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ	66	لِتَحْسِبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ
33	گزشتہ سے پیوستہ	66	وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ
33	امانت کے متعلق احادیث مبارکہ	66	وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ
37	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	67	وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبِ
38	آہ! ہم کتنے بے قدر ہیں	67	معتزلہ کا استدلال
43	ودیعت اور امانت میں فرق	68	معتزلہ کا رد
44	ودیعت کے متعلق چند ضروری مسائل	70	راقم کا موقف
44	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	70	انجیلوں کی تعداد
44	ضمان لازم نہ ہونے پر عقلی دلیل	71	انجیلوں کا اختلاف
44	امانت کی حفاظت کون کون کر سکتے ہیں	72	بیان اختلاف
45	مسائل	72	مرقس اور یوحنا اس بیان سے خالی ہیں
48 (۷۶)	بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ..... (۷۶)	72	ایک اور اختلاف دیکھئے
49	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	72	انجیلوں کا ایک اور اختلاف دیکھئے
50	عظمت قرآن پر جان قربان	73	تفسیر نعیمی سے ایک خوبصورت اقتباس
52	سبق آموز حکایت	73	مودودی صاحب کی کذب بیانی
55 (۷۷)	إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ..... (۷۷)	75	مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ..... (۷۹)
55	شان نزول	75	شان نزول
58	اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر تبصیر الرحمن	76	مَا كَانَ لِبَشَرٍ
59	أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ	76	ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں
59	وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ	79	ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا
60	آیہ کریمہ میں وعید شدید	80	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
61	وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	81	بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ
62	احادیث مبارکہ	82	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
102	ما قبل سے تعلق	83	فائدہ عظیمہ
102	طلباء کرام ذرا عجیب دل چسپ مسئلہ دیکھئے	83	وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ..... (۸۰)
104	وَلَهُ أَسْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ	83	شان نزول
104	ان میں سے پہلی وجہ	84	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
105	طاعت اور اطاعت	85	ملائکہ اور انبیاء کرام کی تخصیص کی وجہ
106	وَالِيهِ يُرْجَعُونَ	86	آیت کریمہ سے معتزلہ کا استدلال
108	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	86	معتزلہ کی دلیل کا رد
109	فائدہ جلیلہ	88	وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ..... (۸۱)
109	گزشتہ سے پیوستہ	88	سب سے پہلے تسکین الجنان سے ایک ورد دیکھئے
100	قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا..... (۸۲)	88	ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ
100	ما قبل سے تعلق	90	وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ
100	مختصر مطلب از ضیاء القرآن	91	عجیب دل چسپ مسئلہ
111	قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا	91	مقام توجہ
111	قرآن پاک کی خوب شان	93	راجع قول
112	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	95	لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ
113	ترتیب ذکر کا فائدہ	95	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
114	چند انبیاء کرام کے خصوصی ذکر کی وجہ	95	قَالَ أَأَقْرَضْتُمْ
114	حکمت	96	وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ إِصْرِي
115	تمام انبیاء کرام کی نبوت کے اقرار میں فائدہ	96	قَالُوا أَأَقْرَضْنَا
115	لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ	96	قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ
115	وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ	98	فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ
116	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	98	ما قبل سے رابطہ
117	اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ	100	گزشتہ سے پیوستہ
118	وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ..... (۸۵)	101	ارشاد مصطفوی سے مسئلہ واضح ہوتا ہے
118	ما قبل سے تعلق	101	اوصاف مصطفیٰ کریم ﷺ کا تقاضا
118	شان نزول	102	أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ..... (۸۳)



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
134	لَمْ ارْذُوْا كُفْرًا	119	مقام توجہ
134	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	120	وہ خسارہ کیا ہوگا
134	توبہ کا قبول نہ ہونا کیسے؟	121	كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ..... (۸۶)
135	توبہ کے نہ قبول کرنے کی چند وجوہ	122	وَشَهِدُوْا اَنَّ الرُّسُوْلَ
136	چند لوگوں کی توبہ قبول نہیں کی جاتی	122	وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ
138	تنبیہ	122	اعتراض
138	کچھ اور لوگ جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی	122	جواب
138	وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضّٰلُّوْنَ	123	آیت کریمہ میں تکرار نہیں
139	بیان کردہ مضمون کی روایات سے تائید	124	اُولٰٓئِكَ جَزَاؤُهُمْ اَنْ عَلَيْهِمْ (۸۷، ۸۸، ۸۹)
141	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	126	ما قبل سے تعلق
141	اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاٰمَنُوْا وَاُولٰٓئِكَ..... (۹۱)		اللہ کی لعنت اور فرشتوں اور لوگوں کی
141	اعتراض	126	لعنت میں فرق
142	پہلا جواب	126	انتباہ
143	دوسرا جواب	127	اعتراض
143	وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	127	جواب
144	وَمَا لَهُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ	127	سوال
145	﴿پارہ چہارم﴾	128	اعلیٰ حضرت و علامہ رازی رحمہما اللہ
146	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا..... (۹۲)	129	خَالِدِيْنَ فِيْهَا
146	ما قبل سے تعلق	130	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
146	مختصر مطلب	130	لَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ
146	وہ پیاری چیز	131	اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ
148	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ	131	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
148	بھلائی کے ساتھ کامل کی قید کا فائدہ	132	اعتراض
	بعض حضرات نے ”البر“ اور ”الخیر“ میں	132	جواب
151	فرق بیان کیا ہے	133	اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاَبْعَدُوْا اِيْمَانِيْهِمْ..... (۹۰)
151	بیان ذیشان	133	کفر میں زیادتی کیسے؟



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
172	دوسرا جواب	153	اعتراض
173	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	153	جواب
173	قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا..... (۹۵)	154	ابھی تک ذکر کردہ بحث کو بیضاوی میں دیکھئے
174	فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ	154	وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ
175	دین ابراہیم کے اوصاف		پسندیدہ مال رب کی راہ میں خرچ کرنے
175	اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر ابی السعود	155	کی درخشان مثالیں
175	وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ	162	كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ جَلَالِيْنِي..... (۹۳)
176	تین آیات سے حاصل ہونے والے فوائد جلیل	162	ما قبل سے تعلق
176	انسانوں کی ایک قسم یہ ہے	163	شان نزول اور مختصر مطلب
177	اور انسانوں کی دوسری قسم یہ ہے	164	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
178	انسانوں کی تیسری قسم یہ ہے	165	كَانَ جَلَالِيْنِي إِسْرَافِيْلَ
179	اتباع ملت ابراہیم کی علامت	165	اعتراض
	رب تعالیٰ کے قرب کیلئے دل میں	165	جواب اول
179	خلوص ضروری ہے	165	جواب دوم
179	حکایت	165	انبیاء کرام کے اجتہاد کے جواز پر چند وجوہ
180	إِنْ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ..... (۹۶)	168	علامہ رازی رحمہ اللہ کی ایک خوبصورت تحقیق
180	شان نزول	168	مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْزَلَ التَّوْرَةُ
180	روایات اور ان میں تطبیق	168	اس مسئلہ پر ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے
182	روایات میں بظاہر اختلاف	169	قُلْ فَاتَّبِعُوا التَّوْرَةَ فَاتْلُوهَا
182	وجہ تطبیق	170	شان نبوت
182	علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں جواب دیا	170	کفار کے نظریات ہمیشہ ایک رہے
183	اس کا جواب یہ دیا گیا کہ	171	فَمَنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ..... (۹۳)
183	”بکہ“ کی وجہ تسمیہ	172	مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ
184	مقام توجہ	172	فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ
185	”بکہ“ بمعنی ہجوم کرنا کے مطابق اور روایات	172	اعتراض
186	طلباء کے فائدہ کیلئے	172	پہلا جواب



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
206	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ..... (۹۸)	186	مکہ کہنے کی وجہ
206	راقم اور روح البیان	186	مکہ کہنے کی ایک اور وجہ
206	اہل کتاب کو خطاب کی وجہ کیا	186	مکہ کا نام ام القری
207	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ..... (۹۹)	186	مکہ کا نام ضراح
208	راقم اور بیضاوی رحمہ اللہ	187	مکہ کے نام
208	وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ	188	امام ابو حنیفہ و امام محمد رحمہما اللہ کا موقف
209	وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ	189	کعبہ شریف کی فضیلت کی چند وجوہ
209	کنز الایمان مطالب کا حقیقی ترجمان	191	عجیب حکمت
210	عجیب حکمت	191	هٰذِي الْعَالَمِينَ
211	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا..... (۱۰۰)	192	فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ..... (۹۷)
211	شان نزول	193	اعتراض
213	ما قبل سے تعلق	193	جوابات
214	ایک عجیب نکتہ	194	حصول امن کی چند وجوہ
214	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	197	امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف
215	وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى..... (۱۰۱)	197	امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف
215	اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا حسین و جمیل ترجمہ	197	اتفاقی مسئلہ
215	اعتراض	198	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
215	جواب	198	دینی طلباء کے فائدہ کیلئے ایک اور بحث
216	فرق واضح ہو گیا	199	وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ
217	وَمَنْ يُغْتَصِمْ بِاللَّهِ	201	حِجُّ الْبَيْتِ
218	دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے	201	حج فرض ہے
218	اہلسنت و جماعت کا مذہب	201	مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا
219	معتزلہ کا مذہب	202	حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے
219	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ..... (۱۰۲)	202	استطاعت بالغیر کا مطلب
219	ما قبل سے تعلق	204	وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ
219	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	205	تنبیہ



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
232	جماعت کو لازم پکڑنا	220	اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ
237	فائدہ جلیلہ	221	صحابہ کرام پر عمل شاق کیوں گذرا؟
238	کوئی بدعت ضلالت ہے؟	222	بعض حضرات نے اس آیہ کو منسوخ نہیں مانا
238	صحابہ کرام نے نئے کام ایجاد کئے	222	حاکمہ
239	بدعات کے متعلق خوبصورت ضابطہ	222	اعتراض
240	باطل فرتے اور سیدھی راہ	223	جواب
	تہتر فرقوں کو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ	223	اظہار تشکر
241	یوں بیان فرماتے ہیں	223	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
243	فرقہ ناجیہ	224	پہلا معنی
	بہتر ناری فرقوں کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ	224	دوسرا معنی
244	نے یوں بیان کیا	226	وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا..... (۱۰۳)
244	وہ چھ فرتے یہ ہیں	226	مختصر مطلب
246	قد یہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم	227	شان نزول
248	جمہیہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم	227	وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا
250	مرجہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم	227	حبل اللہ بمعنی قرآن
252	فرقہ رافضیہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم	227	حبل اللہ بمعنی قرآن و عترت
255	فرقہ جبریہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم	228	حبل اللہ بمعنی طاعت و جماعت
257	حاصل کلام	228	حبل اللہ بمعنی اخلاص
260	اخوت و صداقت	228	حبل اللہ بمعنی اسلام
261	دنیا کی زندگی کتنی ہے	229	حبل اللہ بمعنی عہد و امر
261	كَذَلِكَ يَبَيِّنُ اللَّهُ	229	سب معانی قریب قریب ہیں
262	اجماع کی مختصر بحث از حسامی مع نامی	229	اللہ تعالیٰ کے دین کو رسی سے تشبیہ کیوں دی گئی؟
262	اجماع کا لغوی معنی	230	اصل بنیادی چیز
262	اصطلاحی معنی	230	مسائل کی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے
264	اجماع کے مراتب	230	اس حدیث پر معترضین کا حال
264	اس کے بعد اجماع سکوتی کا درجہ ہے	231	اختلاف کی تین قسمیں ہیں



صفحہ

عنوان

صفحہ

عنوان

279

مثال اور مثل لہ کا بیان

264

پھر ہر زمانہ کے علماء صالحین و مجتہدین کا اجماع

279

حاصل کلام

پھر اجماع جس میں بعض صحابہ کرام

282

آیہ کریمہ کا مطلب

265

کی مخالفت پائی گئی ہے

عذر کی وجہ سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے

265

اس آخری درجہ اجماع پر بحث

283

ترک کی اجازت

265

احناف کا اس میں مذہب

288

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا..... (۱۰۵)

266

اجماع کے انتقال کی اقسام

288

ما قبل سے تعلق

266

فرقہ واریت ناسور ہے

289

یہود و نصاریٰ کے تفرقہ و اختلاف کی چند وجوہ

268

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ..... (۱۰۴)

289

تفرقہ و اختلاف میں فرق

268

ما قبل سے تعلق

290

ان کا اختلاف کیسا تھا؟

269

لفظ ”من“ کے متعلق بحث

291

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتِ

270

راقم کے نزدیک محاکمہ

جن فروع پر اجماع امت ہواں میں

271

ضحاک کا قول

291

اختلاف حرام ہے

271

آیہ کریمہ میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے

294

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ..... (۱۰۶)

272

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

294

ما قبل سے تعلق

فاسق اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں

294

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے

272

سے روکتا سکتا ہے یا نہیں؟

294

اس آیہ کریمہ میں کن لوگوں کا تذکرہ ہے

273

طریقہ تبلیغ

296

خوارج کے متعلق ارشاد مصطفوی ﷺ

274

امر بالمعروف، نہی عن المنکر پر احادیث مبارکہ

چہرے سفید ہونے اور سیاہ ہونے

275

ہاتھ سے بری چیز کو روکنے کا ایک مطلب

296

سے کیا مراد ہے

275

قول سے برائی کا بدلنا

296

مجازی معنی

275

دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب

298

دوسرا معنی حقیقی ہے

276

دل سے برا سمجھنا اضعف ایمان ہے

298

راقم کے نزدیک عموم الحجاز معنی لینا بہتر ہے

276

بعض علماء نے تین مدارج اس طرح بیان کئے

299

چہرے سیاہ و سفید کب اور کہاں ہوں گے؟

276

اضعف ایمان کا مطلب

300

دینی طلباء کرام کیلئے ایک علمی نکتہ

278

عربی زبان کا کمال

301

سؤال

278

مدہنت اور مدارات میں فرق



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
320	دلالت کر رہی ہے	301	جواب
321	تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	302	دینی مدارس کے طلباء توجہ فرمائیں
321	اصول فقہ کا قانون	303 (۱۰۷)	وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وَجُوهُهُمْ
322	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد	303	جنت کو رحمت کہنے کی وجہ
322	جہاد کا فائدہ	303	سفید چہرے والے کون ہوں گے؟
324	وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ	304	سوال
324	اہل کتاب کا کونسا ایمان معتبر ہے؟	304	جواب
325	اہل کتاب غلطی نہیں سے محروم ہوں گے	305 (۱۰۸)	بَلِّغْ آيَاتِ اللَّهِ تَتْلُوَهَا
325	کافر کو فاسق کہنے میں عجیب حکمت	305	معنی سمجھنے کیلئے نحوی ترکیب کی طرف توجہ ضروری
326	امت کا کیا مطلب؟	306	اللہ تعالیٰ کے ظلم نہ فرمانے کا مطلب
327	افضلیت امت مصطفیٰ کریم ﷺ پر احادیث مبارکہ	309	گذشتہ سے پیوستہ
331	مطلب واضح ہے	310	زیر بحث آیہ کے متعلق
335	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	310 (۱۰۹)	وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ
335	خطاب کا فائدہ	311	ما قبل سے تعلق
336	لَنْ يَضُرُّكُمْ إِلَّا أَذًى..... (۱۱۱)	312	دینی طلباء کرام کیلئے بہت مفید
336	شان نزول	312	زیر بحث آیہ کریمہ کے متعلق کچھ مزید بحثیں
337	یہود کے ستانے کے مختلف انداز	314	فلاسفہ کا مذہب
337	آیہ کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل	314	وہی اول وہی آخر
338	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	315	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
339 (۱۱۲)	ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ	315	طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور مسئلہ
340	ان کی ذلت کی اور وجوہ	316 (۱۱۰)	كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ
340	سب سے بہتر قول	316	ما قبل سے تعلق
341	إِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللَّهِ	317	دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے
341	اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟	318	کان ناقصہ کی صورت میں معافی میں چند احتمال
341	لوگوں کی رسی سے مراد کیا ہے؟	319	اعلیٰ حضرت و علامہ رازی و علامہ بیضاوی
341	اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا ایک اور مطلب		آیہ کریمہ اجماع امت کی حجت پر



صفحہ

عنوان

صفحہ

عنوان

359	اعتراض	341	وہ وجہ فرق یہ ہے
360	جوابات	342	وَبَاءُ وَابْغَضَ مِنَ اللَّهِ
361	احادیث پاک سے فائدہ حاصل ہوا	343	وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ
362	يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ..... (۱۱۳)	343	ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِالْخ
362	ما قبل سے تعلق	343	ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ
362	صالحین بمعنی صلاحیت احوال	344	کبھی مستحبات کی ترک کا انجام کفر ہو جاتا ہے
363	صالحین بمعنی رب کی رضا و ثناء کے مستحق		آیات سے مراد کون سی آیات ہیں؟ جن سے
364	”من“ بمعنی ”مع“	346	وہ کفر کرتے ہیں
364	سب تراجم کو حاوی ترجمہ	347	لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ..... (۱۱۳)
366	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	347	شان نزول
367	وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ..... (۱۱۵)	348	قائم رہنے سے مراد
367	ما قبل سے تعلق	349	يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ الْخ
368	وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ	350	آیت کریمہ کن لوگوں کا ذکر ہے
369	دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں	352	رات کی نماز اور تہجد
369	جواب	353	تہجد نوافل ہیں
369	تنبیہ		تمام رات جاگنے والے کے نوافل تہجد کا
370	تقویٰ خیر اور اچھے اعمال کا مبداء ہے	353	درجہ رکھتے ہیں
371	خوبصورت سبق آموز حکایت	353	عشاء کی نماز سے پہلے تہجد نہیں
372	اوصاف عبودیت	354	تہجد اور وقت مقرر نہیں
372	نعت ابو بیت	354	البتہ افضل طریقہ یہ ہے
373	إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ..... (۱۱۶)	354	رات کی نماز افضل ہے
373	شان نزول	354	تہجد کی کتنی رکعت ہیں
374	صرف مال اور اولاد کا ذکر کیوں؟	355	تہجد کی عادت بنا کر چھوڑ دینا مکروہ ہے
374	وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ الْخ	355	رات کی نماز کے متعلق احادیث
375	مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ..... (۱۱۷)		عشاء کی نماز یہود ادا نہیں کرتے تھے
375	شان نزول	359	اس کا کیا مطلب ہے؟



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
391	”ہا“ تنبیہ ذکر کرنے کا فائدہ	376	مختصر مطلب



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
430	نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت	414	اَلَنْ يُكْفِيَكُمْ الْخ
431	نبی کریم ﷺ کے انصاف کی درخشاں مثال	415	بَلَىٰ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا ..... (۱۲۵)
431	ولید، عقبہ، شیبہ کا پہلے لکھنا اور اپنے مقابل طلب کرنا	416	وَيَاۡتُوْكُمْ الْخ
432	ابو جہل کا قتل	416	فرشتوں نے لڑائی کی تھی یا نہیں؟
435	عبداللہ سندھی کا جواب لیکن ضعیف	417	راقم کا موقف
435	صحیح جواب	418	واقعہ بدر
435	فرشتوں کو دیکھنا اور ان کی آواز سننا	419	بدر کا نام بدر کیوں؟
436	وضاحت حدیث		غزوہ بدر حق و باطل میں تمیز کرنے
437	استاذی المکرم کا استدلال	419	کا ذریعہ واقع ہوا
437	غزوہ احد میں بھی فرشتوں کو دیکھا گیا	419	مسلمانوں کی تعداد
438	پانچ ہزار فرشتے آئے یا نہیں	420	مشرکوں کی تعداد و جنگی سامان
438	نبی کریم ﷺ کا کفار کیلئے دعاء ہلاکت کرنا	420	جنگ بدر کا سبب
439	قدرت کا عجیب فیصلہ	421	عائکہ بنت عبدالمطلب کا خواب دیکھنا
442	راقم کے نزدیک صحیح جواب	422	مصمم غفاری کا خواب
443	بیر اور قلب میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟	422	اہل مکہ کا فیصلہ
444	چوبیس صنادید قریش کو کنوئیں میں ڈالا گیا	425	ابو جہل کا کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر لوگوں کو بھڑکانا
445	کنوئیں میں کفار کو کیوں ڈالا گیا؟		نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام سے مشورہ اور صحابہ کرام
446	اس حدیث سے شیخ کا سامع موتی پر استدلال	425	کی طرف آپ کو اطمینان بخش جواب
446	شہداء مسلمان	427	ابوسفیان کا مشورہ لیکن ابو جہل کا اصرار
446	مہاجرین شہداء کرام کے اسماء گرامی	427	دونوں لشکر بدر کے دو کناروں پر ٹھہر گئے
446	انصار شہداء کرام کے اسماء گرامی	428	شیطان و سوسہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت
447	مقتولین کفار	428	نبی کریم ﷺ کی دعاء
447	کفار قیدی	429	نبی کریم ﷺ کیلئے عریضہ بنایا گیا
447	شبلی نعمانی صاحب اور علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ	430	ایک لشکری نے قریش کو جنگ سے منع کیا



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
489	مقام توجہ	447	قال السبلی العثماني، غزوہ بدر پر دوبارہ نظر
491	وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ ..... (۱۲۹)	468	وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ ..... (۱۲۶)
491	اہل سنت و جماعت کا مذہب	469	اعتراض
492	اعتراض	470	جواباب
492	جواب	470	وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْخ
492	اہلسنت اور معتزلہ کا آسان لفظوں میں فرق	470	اعتراض
493	اہل سنت و جماعت کی طرف سے رد	471	جوابات
494	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا ..... (۱۳۰)	472	لَيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ ..... (۱۲۷)
494	ما قبل سے تعلق	474	لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْ ..... (۱۲۸)
495	دونادون سود کی ممانعت کیون؟	474	مقام پر خطر ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا
495	وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ	475	شان نزول میں چند احتمالات
495	اعلیٰ حضرت اور بیضاوی رحمہما اللہ	475	شان نزول کی مکمل تفصیل
497	وَتَقُوا النَّارَ الَّتِي ..... (۱۳۱)	475	پہلا قول
497	اعتراض	477	روایات میں تطبیق کیسے؟
497	جوابات	478	وجہ تطبیق
498	اس آیت کریمہ میں وعید ہے یا رجاء	478	دوسرا قول
498	تحدید شدید	478	بر معونہ کا تفصیلی واقعہ
499	معتزلہ کا مذہب باطل ہے	482	قنوت نازلہ کا ثبوت احادیث سے
499	سود کھانا کتنا عظیم جرم ہے	483	قنوت نازلہ کی منسوخیت احادیث سے
500	وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ ..... (۱۳۲)	485	شان نزول کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں
500	ما قبل سے تعلق		نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء سے
500	معتزلہ	486	کیوں منع کیا گیا؟
500	اہل سنت و جماعت کا قول	486	سریہ رجب کے متعلق بخاری کی ایک روایت
501	اطاعت کن چیزوں میں کی جائے	489	غزوہ اور سریہ میں فرق



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
528	خطباء کے فائدہ کیلئے	502	مردودی صاحب کا ترجمہ دونوں جگہ باطل ہے
528	انسان فکر کرے اور دعاء بھی کرے	503	وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ..... (۱۳۲)
529	گزشتہ سے پیوستہ	503	اسباب مغفرت میں چند اقوال
530	أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ..... (۱۳۱)	504	تمام اقوال کا جامع قول
530	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	505	مختصر مطلب
531	دوام مطلوب ہیں	509	الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَاءِ..... (۱۳۳)
532	ما قبل اور ما بعد سے تعلق	510	شان سخاوت اور مذمت بخیل پر احادیث مبارکہ
532	انسان عمل سے بے نیاز نہ ہو	512	وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ
533	طالب حق کیلئے یہ ضروری ہے	513	غصہ کو روکنے کی فضیلت میں احادیث مبارکہ
534	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	516	وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ
535	ایک مذہب یہ ہے	517	وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ
535	یہ مذہب صحیح نہیں	518	خیال رہے
536	دوسرا مذہب	518	فائدہ جلیلہ
536	تفضل کی دو قسمیں ہیں	519	احسان کی دوسری قسم
536	تفضل کی دوسری قسم	521	وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً..... (۱۳۵)
536	نکتہ	521	ما قبل سے تعلق
537	قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ..... (۱۳۴)	522	شان نزول
537	ما قبل سے تعلق	523	مختصر مطلب
537	اس لفظ کے اشتقاق میں چند وجوہ ہیں	523	فاحشہ اور ظلم میں فرق
	پہلے طریقے یا پہلی امتیں گذر گئیں اس		آیہ کریمہ کے نزول پر شیطان کی
538	سے مراد کیا ہے؟	524	پریشانی و بے قراری
540	اصل مقصود عبرت پکڑنا ہے	527	استغفار کی فضیلت کا بیان
540	اعتراض	528	سحری کے وقت استغفار
541	هَذَا بَيَانُ النَّاسِ..... (۱۳۸)	528	سید الاستغفار



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
565	وَلِيْمَحْصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ..... (۱۴۱)	541	بیان و ہدایت و مواعظت میں فرق
565	آیہ کریمہ میں یہی معنی لیا گیا ہے	543	وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا..... (۱۳۹)
567	محض اور محقق میں فرق	543	مختصر تفسیر لیکن جامع
568	اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ..... (۱۴۲)	543	ما قبل سے تعلق
568	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	544	شان نزول کے متعلق روایات
568	طلباء کرام ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ کریں	546	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
569	تسکین البہتان فی محاسن کنز الایمان سے اقتباس	546	(وَاَنْتُمْ اَلَا غُلُوْنَ) میں چند وجوہ
570	دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے	548	ایمان کے بغیر مادی وسائل بے کار ہیں
571	کیا خوب نتیجہ پیش کیا گیا		شہید ہونے والے مہاجرین صحابہ کرام
572	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	549	کے اسماء گرامی
572	ابتدائی کلاسوں کے دینی طلباء اسے نہ بھولیں	549	اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ..... (۱۴۰)
573	وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ..... (۱۴۳)	551	اعتراض
573	شان نزول	551	جواب
574	مختصر مطلب	551	انتباہ شدید
575	وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ..... (۱۴۴)	552	لوگوں میں دنوں کے پھیرنے کا فائدہ کیا ہے؟
576	شان نزول		دونوں کے پھیرنے اور کافروں کی ابتدائی شکست
577	نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر شیطان نے اور حائی	553	پر حدیث پاک
579	نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں قتل ہونے والا بد بخت	554	ترجمہ بمع تشریح
579	اللہ کے شدید غضب کی وجہ		صحابہ کرام کے پہا ہونے اور ستر کی تعداد میں
580	نبی کریم ﷺ اور پندراں صحابہ کرام کی ثابت قدمی	556	شہید ہونے کی وجہ
583	اسم گرامی سے متعلق بحث	558	مزید وضاحت
586	دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے	559	آیہ کریمہ کے چند مطالب
588	طلباء کرام خلاصہ کلام یوں یاد کریں	561	شہید کو شہید کہنے کی وجہ
	نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت اسی آیہ کریمہ سے	564	وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
609	اذن کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں	588	حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا استدلال
610	دوسرا احتمال	591	حدیث پاک کی مختصر وضاحت
611	مقتول کی موت وقت مقررہ پر ہے	592	تمام انبیاء کرام موت و حیات میں مختار تھے
611	معتزلہ کا مذہب	592	حدیث پاک میں استعمال الفاظ کی وضاحت
611	اہلسنت نے ان کا جواب یہ دیا ہے	593	مرض وصال نبی کریم ﷺ کی بے قراری کی وجہ
613	خلاصہ تفسیر	595	نکتہ
614	خصوصی صورت کا لحاظ نہیں عموم الفاظ کا لحاظ ہے	595	نبی کریم ﷺ کو اپنی وفات کا وقت معلوم تھا
615	وَكَأَيُّنْ مِنْ نَبِيِّ قَاتِلَ مَعَهُ..... (۱۳۶)	596	حدیث پاک کی مختصر وضاحت
615	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے		اللہ کے نبی وصال سے پہلے اپنا مکان جنت
616	ایک نئے فتنہ نے جنم لیا	598	میں دیکھ لیتے ہیں
617	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں	599	نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ میں کوئی امام نہیں تھا
618	آیہ کریمہ کا اشارہ مفہوم یہ ہوا	600	نبی کریم ﷺ کی تدفین میں تاخیر
621	مقام افسوس	600	شیعہ کا اعتراض باطل ہے
622	وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا..... (۱۳۷)	601	نبی کریم ﷺ کے وصال کا تغیر احوال
622	ما قبل سے تعلق	602	اعتراض
623	دعاء میں عجز پایا گیا ہے	602	جواب
623	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	603	دینی طلباء کرام
624	دوسری قرأت	604	اعتراض
624	ثابت قدم کا ایک اور مطلب	604	جواب
624	دعاء کیسی ہو؟	605	مختصر وضاحت حدیث
	میدان جنگ میں وہی دعا کرے جو اللہ	605	قبر کے سامنے سجدہ کرنے کی ممانعت
624	والوں نے کی	607	نبی کریم ﷺ کی قبر انور کا مقام عرش اعلیٰ سے بلند ہے
625	فَاتَأْتُهُمُ اللَّهُ تَوَابَ الدُّنْيَا..... (۱۳۸)	608	وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ..... (۱۳۵)
629	رقیقہ لطیفہ	608	ما قبل سے تعلق کی چند وجوہ



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
651	امر میں اختلاف کا کیا مطلب؟	630	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
651	وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَلِلَّهِ ذُو فَضْلٍ الْخ		محبت کے حاصل ہونے سے تمام نیک بختیاں
	غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت	630	حاصل ہو جاتی ہیں
654	رہنے والے حضرات	631	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا..... (۱۳۹)
654	فائدہ جلیلہ	631	شان نزول میں چند احتمال ہیں
654	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا شاندار استدلال	632	شان نزول
655	دوسرے شعر کا معنی	632	دنیا و آخرت کا خسارہ کتنا عظیم ہے
656	إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ..... (۱۵۳)	633	بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ..... (۱۵۰)
656	آیہ کریمہ کا ماقبل سے تعلق ہے یا استیناف پایا گیا	634	مَسْلُفِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ..... (۱۵۱)
657	مختصر مطلب	634	شان نزول
658	وَالرُّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَافِكُمْ	639	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
658	راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا	640	رب تعالیٰ کی شرکت پر حجت کا پایا جانا محال ہے
660	پہلے معنی میں چند صورتیں	640	صانع صرف ایک ہے
660	دوسرے معنی میں چند صورتیں	641	کاش کہ جہلاء علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول سمجھتے
661	لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ الْخ	641	وَمَا وَاهُمُ النَّارُ
662	فائدہ	642	”ماوا“ اور ”مشواہ“ میں فرق
663	حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ کا ارشاد	642	وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ..... (۱۵۲)
663	حکمت آموز قول	643	مختصر مطلب
664	تنبیہ	644	اس آیہ کا ماقبل سے تعلق اور شان نزول
665	ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ..... (۱۵۳)	645	حَتَّى إِذَا فُشِلْتُمْ
666	مختصر مطلب	648	فائدہ جلیلہ
666	ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْخ	649	ثُمَّ صَرَّفَكُمْ عَنْهُمْ
667	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	649	اعتراض
668	غنودگی میں فوائد	649	جواب



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
684	تنبیہ	669	وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ
686	فائدہ جلیلہ	670	مومنوں اور منافقوں کے غم میں فرق
686	صحابہ کرام کا پھر جانا کون سا گناہ تھا؟	670	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
687	تنبیہ شدید	671	جاہلیت کا گمان کیا تھا
688	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا ..... (۱۵۶)	672	شان نزول
688	شان نزول و مختصر مطلب	673	قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ
689	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا الْخ	674	تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر میں ہیں
689	تنبیہ	674	آیہ کریمہ اور برہان عقلی کا تطابق
690	دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے	675	يَقُولُونَ لَوْ كُنَّا لَنَا مِنَ الْأَمْرِ الْخ
692	تفسیر کبیر کی عظمت دینی طلباء کیلئے	675	سوال
692	اعتراض	675	پہلا جواب
692	پہلا جواب	675	دوسرا جواب
693	دوسرا جواب	677	مطلب
693	تیسرا جواب	677	تنبیہ
695	لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ خَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ	678	قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ الْخ
697	آیہ کریمہ کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے	679	اعتراض
697	اعتراض	679	پہلا جواب
697	جواب	679	دوسرا جواب
698	دوسری وجہ تفسیر	680	فائدہ
698	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	680	موت کی جگہ کو مرنے والا ضرور پہنچ جاتا ہے
699	وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ..... (۱۵۷)	682	إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ ..... (۱۵۵)
699	مقصد عظیم	682	”تسکین البھان“ کا ایک ورق
700	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	683	إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ الْخ
701	مغفرت و رحمت کے بہتر ہونے پر چند وجوہ	684	مقام توجہ



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
723	مشاورات میں عظیم برکت ہے	702	اعتراض
724	نبی کریم ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دینے میں حکمت	702	جواب
727	نبی کریم ﷺ کو امت سے مشاورت کب منع تھی؟	702	تنبیہ
727	مقام توجہ	703	وَلَئِنْ مَّتُمْ أَوْ قَتَلْتُمْ..... (۱۵۸)
728	علماء کرام اور طلباء کرام کیلئے لمحہ فکریہ	703	مقام توجہ
729	مسئلہ عظیمہ	703	مختصر مطلب
729	دو حدیثوں میں تطبیق	703	چند دقائق
731	فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ	705	فائدہ جلیلہ
732	توکل بمعنی التجاء الی اللہ	707	طلباء کرام کے یاد کرنے کیلئے خوبصورت عبارت
732	توکل بمعنی عدم معصیت	709	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لَئِنْ لَّهُمْ..... (۱۵۹)
732	توکل بمعنی صرف اللہ تعالیٰ سے طلب	709	مختصر مطلب
733	سوال	710	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لَئِنْ لَّهُمْ
733	جواب	710	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
734	إِنْ يُنْصِرْكُمُ اللَّهُ..... (۱۶۰)	712	نبی کریم ﷺ کی نرم دلی اور حسن اخلاق
734	ما قبل سے تعلق	713	وضاحت حدیث
734	آیہ کریمہ میں ترغیب و ترہیب پائی گئی	718	تنبیہ
735	مسئلہ	719	فائدہ جلیلہ
735	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے	719	ترتیب عجیب
736	وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ	719	نرمی کر کے حقوق اللہ کو ضائع کرنا جائز نہیں
736	دینی طلباء کرام یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھیں	720	وَمَا وَدَّاهُمْ فِي الْأَمْرِ
738	مَا كَانَ لِإِنْسِي أَنْ يَغْلُ..... (۱۶۱)	720	مشورہ نہ کرنے والے حاکم کو معزول کر دیا جائے
738	آسان اور مختصر مطلب	721	مشاورات کا عظیم قانون
738	اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں	722	مشورہ میں خطاء کے واقع ہونے پر کوئی پکڑ نہیں
739	مختلف قرأتوں کے لحاظ پر مختلف معانی	723	دنیاوی کاموں میں مشیر کیسا ہو؟



صفحہ

عنوان

760	احسان عظیم مصطفیٰ ﷺ ہے
760	آپ کی بعثت کے احسان عظیم ہونے پر دو وجہ سے دلیل
760	اصل بعثت کی وجہ سے منافع
760	بعثت رسول سے انتفاع کی چند وجوہ
762	آپ کی صفات سے حاصل ہونے والے فوائد
766	میلاد النبی ﷺ کے متعلق کچھ ذکر خیر
767	میلاد النبی ﷺ کا جلسہ جو رب تعالیٰ نے قائم کیا
767	نبی ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے
767	اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کیا جائے
768	فائدہ
768	اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کے میلاد کا ذکر کیا
768	آدم کا تذکرہ آپ کی تخلیق سے پہلے یوں کیا
769	حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرماتے ہوئے یوں فرمایا
769	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا
769	حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا
769	حضرت اسمعیل علیہ السلام کا تذکرہ یوں کیا
769	حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا
769	حضرت اسمعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا تذکرہ یوں کیا
770	حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کا تذکرہ یوں کیا
770	حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا ذکر یوں فرمایا

صفحہ

عنوان

739	پہلی قراءت کے مطابق چند روایات
740	دوسری قراءت کے مطابق معانی
745	مسئلہ
745	نارے ہتھیار سے کافر کو قتل کرنا جائز ہے
745	نبوت اور خیانت کا اجتماع ممکن نہیں
746	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
746	غلول کا اطلاق کس چیز پر
747	ثُمَّ تُوَفِّي كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ
748	أَقْمِنِ اتَّبِعِ رِضْوَانَ اللَّهِ..... (۱۶۲)
749	آیہ کریمہ کا حکم عام ہے
749	ضابطہ
749	اعلیٰ حضرت اور علامہ رازی رحمہما اللہ
750	هُمْ دَرَجَتٌ عِنْدَ اللَّهِ..... (۱۶۳)
751	جستی لوگوں کی چار قسمیں ہیں
752	مخلوق کے مختلف درجات کی وجوہ
753	محبت کی بات
753	خوش قسمت انسان
754	پیاری نصیحت
755	لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ..... (۱۶۴)
755	دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں
756	ما قبل سے تعلق
758	لفظ "مَنْ" کے معانی
759	بعثت رسول کل جہانوں پر احسان ہے
	تمام رسولوں کی بعثت احسان ہے لیکن



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
776	جواب		حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا
777	تشریح	770	ذکریوں فرمایا
777	اعتراض	770	حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر فرمایا
777	پہلا جواب	771	حضرت یسع علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا
777	دوسرا جواب		حضرت عیسیٰ، حضرت الیاس، حضرت یونس
778	پہلی وجہ	771	اور انبیاء کرام کا تذکرہ یوں کیا
778	دوسری وجہ	771	اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کا تذکرہ یوں کیا
779	نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی منانا	771	تمام انبیاء کرام کا ذکر یوں فرمایا
779	نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت بھی نعمت ہے	771	اور ذکر یوں کیا
780	دوسری دلیل	772	محافل میلاد النبی ﷺ میں کیا ہوتا ہے؟
780	آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں	772	آئیے ذرا دیکھئے
	تفسیر روح المعانی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر		حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا یوم ولادت یوں
780	اس طرح بیان کی گئی	773	بیان کرتے ہیں
781	علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں	774	اللہ تعالیٰ کا نوح علیہ السلام پر سلام
781	سوال	774	اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام پر سلام
781	جواب		اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام
782	یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی کذب بیانی	774	پر سلام
782	آئیے دیکھئے یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے	774	اللہ تعالیٰ کا حضرت الیاس علیہ السلام پر سلام
	تاریخ ابن خلکان کی طرف منسوب کرنا		اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا صلوة وسلام نبی کریم ﷺ پر
784	بھی جھوٹ ہے	775	اور بندوں کو حکم
784	اعتراض	775	بحث مذکور سے نتیجہ واضح ہوا
785	جواب	775	صحابہ کرام کا ذکر انبیاء کرام
	یہتی نے مناقب امام شافعی رحمہ اللہ میں	775	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں
785	امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا	776	اعتراض



صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
799	مقام توجہ		نئے کاموں کے ایجاد کیلئے نبی کریم ﷺ نے
799	مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہو گیا	786	ضابطہ بیان فرمایا
799	میلا دالنبی ﷺ کی عید کہنے کی وجہ		میلا دالنبی ﷺ پر انعقاد محافل اور ہر جائز
800	اعتراض	787	خوشی مستحب ہے
801	پہلا جواب	787	مقرر دن میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا
801	دوسرا جواب	788	نبی کریم ﷺ نے ہر پیر کے دن اپنا یوم ولادت منایا
802	تیسرا جواب	789	جائز کاموں سے اظہار مسرت کرے
802	اہل سنت و جماعت سے دردمندانہ اپیل	789	مباح کام کرنے میں کوئی حرج نہیں
803	لمحات فکر	789	حرام و مکروہ خلاف اولی کاموں سے بچنا ضروری ہے
804	أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ..... (۱۶۵)	789	خرابی کو دور کیا جائے اچھائی کو ختم نہ کیا جائے
804	مقام توجہ		دوسری وجہ جس پر میلا دالنبی ﷺ کی خوشی کا مستحب
804	شان نزول	790	ہونا قیاس کیا گیا
805	زجاج کی غلطی علامہ واحدی کی گرفت		نبی کریم ﷺ کی ولادت پر اللہ تعالیٰ نے
806	قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ	790	قوم کو لڑکے عطاء کئے
806	ایک اور وجہ عظیم	791	نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں
807	إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ	791	اعتراض
		791	جواب
		793	اعتراض
		793	پہلا جواب
		793	دوسرا جواب
		794	خلاصہ جواب
		795	علم کے بحریکراں مفکر اسلام، مفسر قرآن کی تحقیق
			دوسیرت نگاروں کی غلط فہمی کی وجہ سے سکولی
		798	طبقہ غلط فہمی کا شکار ہوا





يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ (آیہ نمبر ۷۰)

(۱) اے کتابیو! اللہ کی آیتوں سے کیوں کفر کرتے ہو، حالانکہ خود گواہ ہو۔ (کنز ایمان)

(۲) اے اہل کتاب! کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیتوں سے، حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے اہل کتاب کے اس گروہ کا ذکر فرمایا جن کو سمجھ اور شعور ہی حاصل نہ تھا کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات پائی گئی ہیں۔ اب اس آیت کریمہ میں ان کے علماء کا ذکر کیا جا رہا ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات اور آپ کے اوصاف کو بیان کرنے والی آیات کو جانتے تھے، لیکن جاننے کے باوجود کفر کرتے تھے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”لِمَ“ (لام کے نیچے کسرہ اور میم پر فتح) اصل میں ”لَمَّا“ ہے۔ یہ مرکب ہے لام جارہ اور ما استفہامیہ سے ”مَّا“ کے آخر الف کو تخفیف کیلئے حذف کر دیا گیا، اور حرف جار کو گویا کہ اس کا عوض (بدل) سمجھ لیا گیا ہے، الف چونکہ برطرف تھا اسی وجہ سے عربی قوانین کے مطابق تخفیف کیلئے اسے ہی حذف کرنا تھا، اور میم کا فتح برقرار رکھ دیا تاکہ الف کے حذف ہونے پر دلالت کرے، یہی قانون ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ﴾ کے لفظ ”عَمَّ“ اور ﴿فَبِمَ تُبَشِّرُونَ﴾ کے لفظ ”بِمَا“ میں جاری ہے، اور وقف کی حالت میں ان کے آخر میں ”ہاء“ بڑھادی جاتی ہے ”فبمہ“ ”لمہ“ پڑھ لیا جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہاں اللہ کی آیات سے مراد کیا ہے؟

اس آیت کریمہ میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ ”اے اہل کتاب کیوں کفر کرتے ہو تم اللہ کی آیتوں سے“ ان آیات سے مراد میں کئی احتمال ہیں، جو تمام ہی پائے جاتے ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں۔

(۱) ”قال ابن عباس هي التوراة والانجيل وكفرهم بها من جهة تغيير الاحكام وتحريف الكلام“



حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد توراۃ وانجیل ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کتب توراۃ وانجیل کی آیات میں مذکور احکام کو بدل کر اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کر کے کیوں کفر کرتے ہو۔

(۲) اولیات النبی فی التوراة والانجیل من وصف النبی ﷺ والایمان به کما بین فی قوله تعالیٰ یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل

یا آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو توراۃ انجیل میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر دلالت کر رہی ہیں، ان پر انہوں نے ایمان نہ لایا، بلکہ ان سے کفر کیا، اسی کا تذکرہ یہاں کیا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو۔

• یہی مضمون اللہ تعالیٰ کے دوسرے ارشاد گرامی میں بھی موجود ہے ﴿يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْانْجِيلِ﴾ وہ پاتے ہیں اسے لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ وانجیل میں، یعنی نبی کریم ﷺ کے اوصاف ان کی کتب توراۃ وانجیل میں موجود تھے، لیکن انہوں نے ان آیات پر ایمان نہ لایا بلکہ کفر کیا۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

واخرج عبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر عن قتادة في قوله "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ" قال تشهدون ان نعت نبي الله محمد ﷺ في كتابكم ثم تكفرون به وتنكرونه ولا تؤمنون به وانتم تجدونه مکتوبا عندكم في التوراة والانجيل النبی الامی

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب تم گواہی بھی دیتے ہو کہ اللہ کے نبی محمد ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں، پھر تم ان سے کفر کرتے ہو، اور ان کا انکار کرتے ہو، اور ان کے ساتھ ایمان نہیں لاتے ہو، جبکہ تم توراۃ وانجیل میں ان کے اوصاف کو لکھا ہوا پاتے ہو کہ وہ نبی امی ہوں گے تو پھر تم اللہ کی آیات سے کفر کیوں کرتے حالانکہ تم گواہی دیتے ہو

(در منشور)

(۳) اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد میں تیسرا قول یہ ہے جو قتادہ، سدی، ربیع، ابن جریج رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔

او القرآن من جهة قولهم "إِنَّمَا يَعْلَمُهُ بَشَرٌ" "إِنَّ هَذَا إِلَّا الْفَكُّ الْفَتْرَى" "إِنَّ هَذَا إِلَّا مَاطِئُ الْأَوَّلِينَ"

کہ اس آیت کریمہ میں "آیات اللہ" سے مراد قرآن پاک ہے یعنی اے اہل کتاب تم قرآن پاک کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو۔



یہود و نصاریٰ کے قرآن پاک سے کفر کو رب تعالیٰ نے کئی آیات کریمہ میں ذکر کیا ہے۔ ﴿إِنَّمَا يَعْلَمُ  
بَشَرٌ﴾ یہود و نصاریٰ قرآن پاک کا انکار اس طرح کرتے تھے کہ وہ کہتے تھے، ”یہ قرآن اسے کوئی انسان سکھاتا ہے“  
اور کبھی یوں کہہ کر انکار کرتے ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا فِكْ اِفْتَرَى﴾ یہ تو نہیں مگر ایک بہتان جو انہوں نے بنالیا ہے اور  
کبھی یوں کہہ کر انکار کرتے ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ یہ تو نہیں مگر پہلے لوگوں کی داستانیں۔

(۴) اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے کا یہ مطلب ہے

”او الايات التي اظهرها على يديه من انشقاق القمر وحنين الجذع وتسبيح الحصى  
وغیره ذلک“

کہ وہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کا انکار کرتے تھے، آپ کے چاند توڑنے کا وہ انکار کرتے تھے، اور مسجد نبوی  
میں ستون سے سہارا لگا کر خطبہ منبر پر پڑھنے پر ستون کے رونے کو وہ نہیں مانتے تھے اور کنکریوں کا آپ کے ہاتھ  
مبارک میں تسبیحات پڑھنے کا وہ انکار کرتے تھے، اور اس قسم کے معجزات کا وہ انکار کرتے تھے، اس کا تذکرہ بھی اس آیہ  
کریمہ میں موجود ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی جو معجزات اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو عطاء کر رکھے ہیں ان  
سے کفر کیوں کرتے ہو۔

(۵) ”او محمد ﷺ والاسلام“ اللہ کی آیات سے مراد نبی کریم ﷺ اور دین اسلام ہیں۔ یعنی حضرت محمد ﷺ اور  
دین اسلام جو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیاں) ہیں، ان کا انکار کر کے تم کفر کیوں کرتے ہو؟ (البحر المحیط)

واخرج ابن جرير وابن ابی حاتم عن ابن جريج ”لَمْ تَكْفُرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ  
تَشْهَدُونَ“ علی ان الدین عند اللہ الاسلام لیس للہ دین غیرہ“

اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد دین اسلام ہے، یعنی جب تم خود گواہی دیتے ہو کہ دین اللہ تعالیٰ کو  
پسند اسلام ہی ہے، اس دین کے بغیر کوئی پسندیدہ دین نہیں۔ یعنی دین اسلام کے آجانے کے بعد پہلے دین منسوخ ہو  
چکے ہیں، رب کا اب پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اس کا اعتراف کرنے کے باوجود تم کفر کیوں کرتے ہو۔ (البحر المحیط)  
(۶) ومنها ما فی هذین کتابین ان ابرهیم علیہ السلام کان حنیفا مسلما“

اور مراد اللہ تعالیٰ کی آیات سے ہے کہ توراۃ و انجیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصاف ذکر ہیں کہ بیشک  
ابراہیم تمام باطل دینوں سے جدا (اور) مسلمان تھے (اسلام پر قائم تھے) لیکن یہود نے اس کا انکار کر کے آپ کو  
یہودی کہا، اور نصرائیوں نے اس کا انکار کر کے نصرانی کہا، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہیں۔ قرآن



پاک کی فصاحت و بلاغت واضح ہوئی کہ مختصر الفاظ مبارکہ کتنے بڑے مطالب کو حاوی ہیں، اسلئے کہ تمام مطالب کو بیک وقت ﴿لَمْ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ کے الفاظ مبارکہ شامل ہیں۔

﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ ”حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو۔“

ان الفاظ مبارکہ کے بھی کئی مطالب، ایک وہی جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے واضح ہے، ”حالانکہ تم خود گواہ ہو“ واقف نے بھی یہی نقل کیا ہے، وہ مسلمانوں کے سامنے گواہی دیتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں آپ آخری اور سچے نبی ہیں، قرآن پاک سچی کتاب ہے، لیکن عوام کے سامنے انکار کر دیتے تھے کہ توراۃ و انجیل میں محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی کوئی آیات موجود نہیں۔ ”ثم اذا خلا بعضهم مع بعض شهدوا بصحتها“ پھر جب آپس میں وہ ایک دوسرے سے ملتے تو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے کی شہادت دیتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ﴾ تم ٹیڑھا پن (کج روی) تلاش کرتے ہو حالانکہ تم خود گواہ ہو۔ (کبیر)

علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے:

”واعلم ان تفسیر الآیة بهذا القول يدل على احتمال هذه الآیة على الاخبار عن الغیب لانه ﷺ اخبرهم بما یکتُمونه فی انفسهم ویظهرون غیره ولا شک ان الاخبار عن الغیب معجز“

جان بیشک آیہ کریمہ کی اس تفسیر سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ آیہ کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کو خبر دی جو وہ اپنے نفسوں میں چھپاتے تھے، اور ظاہر اور کرتے تھے، یقینی بات ہے یہ غیب کی خبر ہے، علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ (کبیر)

(وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ) ای تعترفون فیما بینکم علی سبیل الکتمان انه نبی حق مذکور نعتہ فی التوراة والانجیل“

حالانکہ تم اعتراف کرتے ہو آپس میں چھپے ہوئے طریقہ سے کہ یہ نبی تو برحق ہیں، یہ تو وہی نبی ہیں جن کے اوصاف توراۃ و انجیل میں مذکور ہیں۔

یعنی اس تفسیر کے مطابق ﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ کا معنی ہوا، حالانکہ تم اعتراف کرتے ہو ”وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ“ یا معنی یہ ہوا ﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ حالانکہ تم جانتے ہو، یعنی تم نبی کریم ﷺ کے معجزات



(ماخوذ از مظہری)

کو دیکھ کر تم جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں۔

”وقیل المعنی وانتم تشهدون بمثلها من آیات الانبیاء الی انتم مقرون بها“ (قرطبی)

اور معنی ﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے سامنے نبی کریم ﷺ کے اوصاف ”جو تمہاری کتب میں ہیں“ کا اقرار کرتے ہو جیسے کہ دوسرے انبیاء کرام کے اوصاف و معجزات کا اقرار کرتے ہو۔  
عجب یہی ہے تم پر کہ یہ جاننے، ماننے، اقرار کرنے اور گواہی دینے کے باوجود تم انکار کرتے ہو اور کفر کرتے ہو، درحقیقت ان کو اس پر تو بخ کی گئی (یعنی ڈانٹ دی گئی ہے۔)



يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (آیہ نمبر ۷۷)

(۱) اے کتابیو! حق میں باطل کیوں ملا تے ہو اور حق کیوں چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں خبر ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) اے اہل کتاب! تم کیوں ملا تے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور کیوں چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم

(نجوم الفرقان)

جانتے ہو۔

ما قبل سے تعلق:

علمائے یہود کے دو طریقے تھے۔ ایک قسم کے وہ لوگ تھے اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے کفر کرتے تھے باوجود اس کے کہ اپنے دلوں سے جانتے تھے کہ بیشک یہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ اس سے پہلی آیہ کریمہ میں ان کا ہی ذکر ہے اور ان کو کفر سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اور دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جو لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے تھے اور دلائل و بینات کو مخفی رکھتے تھے تاکہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں ان دوسری قسم کے لوگوں کو اس غلط طریقہ سے منع فرمایا۔

”فالْمَقَامُ الْأَوَّلُ مَقَامُ الْغَوَايَةِ وَالضَّلَالَةِ وَالْمَقَامُ الثَّانِي مَقَامُ الْإِغْوَاءِ وَالْإِضْلَالِ“



پہلی قسم کے لوگوں کا مقام بھٹکنا اور گمراہ ہونا ہے اور دوسرے قسم کے لوگوں کا مقام بھٹکانا اور گمراہ کرنا ہوتا ہے۔ (کیر)

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾  
”اے اہل کتاب تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے“

”ای تخلصون الحق الذي النزل على موسى من آيات التوراة بالباطل الذي كتبه ايديكم بالتحريف“

یعنی اے اہل کتاب کیوں ملاتے ہو اس حق کو جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا یعنی توراة کی آیات کیوں ملاتے ہو باطل سے جو تمہارے ہاتھوں نے تحریف کر کے لکھا ہے۔ (مظہری)

خیال رہے راقم کا ترجمہ تفسیر مظہری کے مطابق ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تفسیر خازن:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے ”اے کتابیو! حق میں باطل کیوں ملاتے ہو، تفسیر خازن نے اس مقام پر یوں بیان کیا۔

(۱) وذلك ان علماء اليهود والنصارى كانوا يعلمون بقلوبهم ان محمداً رسول من عند الله وان دينه حق وكانوا ينكرون ذلك بالسنتهم وكانوا يجتهدون في القاء الشبهات والتشكيكات وذلك ان الساعى في اخفاء الحق لا يقدر على ذلك الا بهذه الامور، فقلوه تعالى (لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ) معناه تحريف الرورة وتبديلها فيخلطون المحرف الذي كتبه بايديهم بالحق المنزل“

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے علماء اپنے دلوں سے جانتے تھے کہ بیشک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور بیشک آپ کا (رب تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوا) دین حق ہے، لیکن وہ زبان سے انکار کرتے تھے، اور کوشش کرتے رہتے تھے کہ دوسرے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالیں، کیونکہ حق کو مخفی رکھنے کی کوشش کرنے والا اسی قسم کے، کھنڈے (حیلے) استعمال کر کے اپنے مقاصد میں بظاہر کامیابی سمجھتا ہے، (در حقیقت وہ ذلیل ہی ہوتا ہے) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ باطل کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے توراة میں تحریف کر دی تھی، یعنی اس میں تبدیلی کر دی تھی ”تو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھی تحریف شدہ کو ملا دیتے تھے حق سے جو رب تعالیٰ کی طرف سے نال کیا گیا تھا“



خازن کے ان الفاظ:

”فیخلطون المحرف الذی کتبہ بایدیہم بالحق المنزل“

کو بار بار دیکھیں اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو بھی دیکھیں تو یقیناً خازن کے مطابق پائیں گے۔

دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں:

چاہئے تو یوں ترجمہ کر لیا جائے اے اہل کتاب تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے؟ یا یوں ترجمہ کر لیا جائے اے اہل کتاب تم باطل کو حق سے کیوں ملاتے ہو۔ ان دونوں تراجم میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں ترجمے صحیح ہیں، اسلئے کہ ”تلبس“ کا معنی ہے خلط ملط کر دینا، دو چیزوں کو آپس میں ملا دینا، لہذا، ”لَمْ تَلْبِسُون“ کا لفظ دونوں معانی کو شامل ہے ”یعنی حق اور باطل کو کیوں خلط ملط کرتے ہو“

(۲) ”وقیل ہو خلط الاسلام بالیہودیۃ والنصرانیۃ“

اور اس کا یہ معنی بھی لیا گیا ہے کہ اسلام کو یہودیت و نصرانیت سے کیوں ملاتے ہو؟ جبکہ اسلام حق ہے اور یہودیت و نصرانیت تحریف کے بعد باطل ہو چکی ہیں، اور اسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں، پھر تم اسلام اور یہودیت کو خلط ملط کیوں کرتے ہو۔ (خازن)

(۳) ”ان المراد اظہارہم الاسلام وابطانہم النفاق“ اس آیت کریمہ کا اور مطلب یہ ہے وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے اور دل میں منافقت کرتے تھے، تو ان کو کہا گیا، اسلام اور کفر کو تم کیوں خلط ملط کرتے ہو۔

(۴) ”ان المراد الايمان بموسى وعيسى والكفر بمحمد عليهم الصلوة والسلام“

کہ وہ اہل کتاب یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے ایمان رکھتے ہیں لیکن محمد (ﷺ) پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس سے ہم کفر کرتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ کے ارشاد کا ایک مطلب یوں بھی ہے اے اہل کتاب تم اپنے دعویٰ کے مطابق موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے ساتھ محمد (ﷺ) کے ساتھ کفر کرنے کو کیوں ملاتے ہو۔

(۵) ”ان المراد ما يعلمونه في قلوبهم من حقية رسالته ﷺ وما يظهرونه من تكذيبه“

وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو دل سے مانتے تھے اور ظاہر طور پر آپ کی تکذیب کرتے تھے، تو ان کو کہا گیا اے اہل کتاب تم دل سے حق کو ماننے کے ساتھ ظاہری کفر کیوں ملاتے ہو۔ (ماخوذ از روح المعانی)



قرآن پاک کی فصاحت بلاغت کو دیکھا جائے کہ ایک چھوٹا سا جملہ ﴿لَمْ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ کتنے معانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

﴿وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ ”اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو“

طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ معطوف سے پہلے والے الفاظ کا تعلق معطوف سے بھی ہوتا ہے ﴿وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ کا عطف ہے ﴿لَمْ تَلْبِسُوا الْحَقَّ﴾ پر اس لئے ”لم“ کا لفظ معطوف علیہ اور معطوف دونوں سے متعلق ہے، اسی لئے معنی یہ ہے ”اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو“

حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقے:

”اعلم ان الساعی فی اخفاء الحق لا سبیل له الی ذلک الامن احد وجہین اما بالقاء شبهة تدل علی الباطل واما باخفاء الدلیل الذی يدل علی الحق“  
جان لو بیشک حق کو چھپانے کی کوشش کرنے والوں کے دو طریقہ واردات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈال کر باطل کی طرف انہیں مائل کرتے ہیں۔ ان کا ذکر رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے کر دیا ﴿لَمْ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (تم کیوں ملاتے ہو حق کو باطل سے)

اور دوسرا طریقہ ان کا یہ تھا کہ وہ حق پر دلالت کرنے والے دلائل کو مخفی رکھتے تھے تاکہ ان دلائل کو دیکھ کر کوئی ایمان قبول نہ کر لے، ان کا رد ان الفاظ مبارکہ سے کیا ﴿وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ ”اور کیوں تم چھپاتے ہو حق کو“  
وہ حق کو کیسے چھپاتے تھے؟

”فالمراد ان الآيات الموجودة فی التوراة الدالة علی نبیة محمد اکان الاستدلال بها مفتقر الی التفكير“ ”والتأمل والقوم كانوا یجتهدون فی اخفاء تلك الالفاظ التي كان بمجموعها يتم هذا الاستدلال، مثل ما ان اهل البدعة فی زماننا یسعون فی ان لا یصل الی عوامهم دلائل المحققین“

مراد اس سے یہ ہے کہ توراة میں موجود آیات جو حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں، جن میں غور و فکر کر کے آپ پر ایمان لانا آسان تھا، ان آیات کو قوم سے مخفی رکھتے تھے تاکہ یہ لوگ ایمان نہ لاسکیں، جیسا کہ اہل بدعت ہمارے زمانہ میں کوشش کرتے ہیں کہ محققین کے دلائل عوام تک نہ پہنچ سکیں۔ (کبیر)



علماء اہل سنت و جماعت آجکل اسی کسی پرسی کا شکار ہیں، میڈیا تک ان کی رسائی نہیں، یہ وقت خریدنے کی طاقت نہیں رکھتے یا رقم کی طرح ہر سنی عالم دین یہی سمجھتا ہے کہ نفع اس کا کم ہے نقصانات زیادہ ہیں، گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔

﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ”حالانکہ تم جانتے ہو۔“

اس کے چند مطالب ہیں:

(۱) احدها انکم تعلمون انما تفعلون ذلک عناداً وحسداً“ ان میں سے ایک مطلب یہ ہے کہ بیشک تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ سچے نبی ہیں اور قرآن پاک سچی کتاب ہے، اور تمہاری کتب میں ان کا تذکرہ موجود ہے، پھر تم حق و باطل کو ملاتے ہو اور حق و کچھپاتے ہو تو اس کی وجہ صرف حسد اور عناد ہے۔

(۲) وثانیہا (وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ) ای انتم ارباب العلم والمعرفة لا ارباب الجهل والخرافة“

دوسرا مطلب یہ ہے، حالانکہ تم جانتے ہو، یعنی تم علم والے اور معرفت تمہیں حاصل ہے، تم جاہل نہیں ہو، بے سمجھ نہیں ہو، پھر تم حق و باطل کو کیوں ملارہے ہو، اور حق کو تم کیوں چھپا رہے ہو، یہ کام تو جاہل لوگوں اور بے سمجھ لوگوں کا ہے۔

(۳) وثالثہا (وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ) ان عقاب من يفعل مثل هذه الافعال عظیم“ اور تیسرا مطلب ہے کہ ”حالانکہ تم جانتے ہو“ کہ اس قسم کے افعال پر سخت عذاب ہوگا، پھر جاننے کے باوجود تم حق و باطل کو کیوں ملارہے ہو، اور حق کو کیوں چھپاتے ہو؟

(کبیر)

معترکہ کا مذہب:

معترکہ کا مذہب یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، وہ ان دونوں آیات سے اپنے موقف پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ”لَمْ تَكْفُرُونَ“ اور ”لَمْ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ“ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ اپنے کفر اور اپنے فعل حق و باطل کے ملانے کے خود ہی خالق تھے اور کوئی ان کا خالق نہیں تھا۔

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے، خالق تمام افعال کا اللہ تعالیٰ ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ (اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو) یہ بات واضح ہے کہ حادث چیز کا خالق ہونا ضروری ہے، ایسا ممکن نہیں کہ حادث چیز بغیر خالق و صانع کے معرض وجود میں آجائے، اور اگر بندے کو خالق ہونا



ضروری ہے، ایسا ممکن نہیں کہ حادث چیز بغیر خالق و صانع کے معرض وجود میں آجائے، اور اگر بندے کے خالق مانا جائے تو وہ اور ارادہ کا محتاج ہوگا، پھر ارادہ کیلئے اور ارادہ کی محتاجی ہوگی، یہ سلسلہ چلتا رہے گا ختم نہیں ہوگا، یہ محال ہے، طلباء کرام اصطلاحی الفاظ ذہن میں رکھیں ”دوریا تسلسل“ لازم آئے گا یہ دونوں محال ہیں۔ اسلئے یقیناً خالق اللہ تعالیٰ کو ہی ماننا پڑے گا، البتہ بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے، یعنی ان پر عمل کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بصری)



وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ  
وَ اكْفُرُوا الْآخِرَةَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

(آیہ نمبر ۷۲)

(۱) اور کتابیوں کا ایک گروہ بولا وہ جو ایمان والوں پر اترنا صبح کو اس پر ایمان لاؤ اور شام کو منکر ہو جاؤ  
شاید وہ پھر جائیں۔ (کنز الایمان)

(۲) اور کہا اہل کتاب کے ایک گروہ نے ایمان لاؤ اس پر ”جو اتارا گیا ان پر جنہوں نے ایمان  
لایا“ صبح کو، اور کفر کرو اس کے آخر میں، شاید کہ وہ پھر جائیں۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

یہود و نصاریٰ کے مختلف مکرو فریب کے حیلے تھے کہ وہ مسلمانوں کو کس طرح دین سے پھیریں یا جنہوں نے  
ابھی اسلام قبول نہیں کیا وہ اسلام سے دور کس طرح رہیں۔ ان کے ایک مکر کو اس سے پہلے مذکورہ آیت کریمہ میں ذکر  
آچکا ہے کہ وہ حق و باطل کو ملاتے تھے، اور ان کے ایک اور مکر کو اس آیت کریمہ میں ذکر کیا جا رہا ہے۔

شان نزول:

میں چند جوہ پائی گئی ہیں، جو تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) یہود و نصاریٰ نے نئے نئے مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالنے اور ان کو اسلام سے پھیرنے کا حیلہ نکالا کہ  
بعض لوگ ہم سے صبح کے وقت ایمان لے آئیں اور شام کے وقت انکار کر دیں، صبح اور شام سے مراد بھی معین اوقات



نہیں بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ بعض اوقات میں ایمان لے آؤ کہ جو کتاب اور شریعت نازل ہوئی ہے (حضرت) محمد ﷺ پر ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کچھ دیر کے بعد اسکا انکار کر دو کہ یہ شریعت تو اس طرح نہیں جس طرح ہماری کتب میں اس کا ذکر ہے۔ جب لوگ اس تکذیب کا مشاہدہ کریں گے تو وہ کہیں گے کہ اہل کتاب کا انکار کرنا حسد اور عناد کی وجہ سے نہیں ورنہ یہ لوگ ابتدائی طور پر ایمان ہی نہ لاتے۔

جب یہ لوگ اہل کتاب ہیں، دین کو سمجھتے ہیں تو یقیناً انہوں نے مکمل غور فکر اور کامل تحقیق کے بعد ہی اس شخص کو چھوڑا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ ”انہ کذاب“ وہ مدعی نبوت (معاذ اللہ) جھوٹا ہے، اسی طرح نئے نئے مسلمانوں کو ہم اسلام سے پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

”وقبل تو اطاعنا عشر رجلا من احبار يهود خبير على هذا الطريق“

(۱) یہ مکرو فریب کا جال بچھانے والے اور یہ منصوبہ تیار کرنے والے خیبر کے یہود میں سے بارہ شخص تھے جو بظاہر اہل علم تھے۔ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بدترین جاہل تھے، نبی کریم ﷺ کی شان سے اور آپ پر ایمان لانے والے صحابہ کرام کی شان سے بے خبر تھے۔

(۲) شان نزول کی اور وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے رئیس لوگ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ہم سے کچھ لوگوں کو منافق ہو جانا چاہئے جو مسلمانوں سے بظاہر اچھا سلوک کریں اور ان سے محبت کا دعویٰ کریں، اور بظاہر ایمان لے آئیں، لیکن شرط یہ ہے وہ اپنے دین پر پختگی سے قائم رہیں، اور علیحدگی میں اپنے بھائیوں سے ملتے رہیں۔ کچھ دیر کے بعد نئے نئے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کئے جائیں کہ یہ دین اور یہ نبی تو سچے نہیں، ہماری کتب میں تو اور اوصاف مذکور ہیں جو ان میں نہیں پائے جاتے، قرآن پاک میں منافقین کا تذکرہ بہت ہے۔

(۳) یہود و نصاریٰ میں سے بعض لوگوں نے دوسرے بعض کو مشورہ دیا کہ کچھ لوگ ایمان لے آؤ۔ کچھ دیر کے بعد ایمان سے پھر جانا، لیکن یہ نہ کہنا کہ یہ دین مکمل طور پر جھوٹا ہے، اگر تم نے مکمل دین کو جھوٹا کہا تو تمہاری بات کو عام لوگ تسلیم نہیں کریں گے۔

”ولكن صدقوه في بعض و كذبوه في بعض حتى يحمل الناس تكذيبكم له على

الانصاف لا على العناد فيقبلوا قولكم“

البتہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ بعض مسائل کو سچا کہو، اور بعض کو جھوٹا، یعنی نئے نئے اسلام کو قبول کرنے والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو کہو کہ اس دین کی یہ باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ باتیں جھوٹی بھی ہیں۔ اس طرح



لوگ تم پر اعتبار کر لیں گے کہ یہ لوگ تو بڑی انصاف کی بات کرتے ہیں، سچ کو سچ کہتے ہیں اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے ہیں، لیکن جس دین میں جھوٹ کی آمیزش ہو، اس دین پر ہمیں بھی قائم نہیں رہنا چاہئے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں:

یہود و نصاریٰ کے مختلف لوگوں کی مختلف سوچیں تھیں، اس بات پر تو متفق تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیا جائے، لیکن کیسے پھیرا جائے اس میں ان کے اپنے اپنے خیالات اور اپنے مکرو فریب تھے، ان تمام کے مکر و فریب کا ذکر کرنے کیلئے اس آیہ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

”وجه النهار“ اور ”آخرہ“ سے کیا مراد ہے؟

اس میں کئی وجوہ ہیں وہ تمام ہی معتبر ہیں۔

(۱) ”وجه النهار“ سے مراد صبح، اور ”آخرہ“ سے مراد شام ہے، اہل کتاب کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس صبح آئے تو دوسرے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو کہا کہ یہ سچے نبی ہیں، یہ دین حق ہے تم اس پر قائم رہو، اور یہود و نصاریٰ میں سے اپنے سے گھٹیا لوگوں کو بھی یہ مشورہ دیا کہ تم اس کی تابعداری کرو، ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ہم ایک مرتبہ توراۃ میں دیکھ لیں کیا وہی اوصاف اس شخص میں پائے گئے یا نہیں، شام کو وہ واپس لوٹے کہنے لگے۔

”وقد نظرنا فی التوراة فلیس ہو بہ، یقولون انہ لیس بحق“  
ہم نے توراۃ کو دیکھا ہے، لیکن یہ شخص وہ نبی نہیں جس کے اوصاف توراۃ میں ذکر ہیں، کیونکہ اس میں وہ اوصاف نہیں پائے گئے۔

”وانما ارادوا ان یلبسوا علی السفلة وان یشککوا فیہ“

انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ ہمارے گھٹیا لوگوں اور جاہل لوگوں پر خلط ملط ہو جائے، وہ شک میں پڑ جائیں تاکہ وہ ایمان نہ لائیں، دوسرا مقصد ان کا ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو راہ راست سے پھیرنا بھی تھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

(۲) کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی بعض بعض کو کہنے لگے کہ صبح صبح قبلہ کے معاملہ میں جو آیات نازل ہوئیں ان پر ایمان لے آؤ اور صبح کی نماز کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے ادا کرو، پھر شام کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرو، تاکہ لوگ دیکھ کر پھر جائیں کہ یہ اہل کتاب ہیں، ان کو کوئی چیز باطل نظر آئی، اسی لئے یہ پھر گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اسی پر عمل کیا، صبح کی نماز کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ادا کی اور ظہر کی صحرہ یعقوبی (جو بیت



المقدس میں ہے) کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کی، رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر ان کی چال بازی سے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمادیا۔  
(خازن وکیر)

”وجه النهار“ کا معنی ہے ”دن کا اول حصہ“ لغت میں ہر وہ چیز جس کی طرف توجہ کی جائے اسے ”وجه“ کہہ لیا جاتا ہے، نئی کوالٹی میں آنے والے کپڑے کو ”وجه الثوب“ کہا جاتا ہے، کیونکہ اسے دیکھنے کیلئے اسی کی طرف چہرے اٹھتے ہیں۔ یہ کہا جائے کہ ”اتيتہ بوجه النهار“ یا کہا جائے ”اتيتہ بصدر النهار“ یا یہ کہا جائے ”اتيتہ بشباب نهار“ سب کا ایک ہی معنی ہے ”میں اس کے پاس صبح آیا“

**فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر مؤمنین کو مطلع فرمادیا، اس میں چند فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۱) **غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے:**

یہود و نصاریٰ کا یہ حیلہ اور مکر و فریب لوگ سے مخفی تھا، کوئی ایک بھی اس پر مطلع نہیں تھا، ”فلما اخبر الرسول عنها كان ذلك اخبارا عن الغيب فيكون معجزا“ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ نبی خبر دی تو آپ کا یہ معجزہ بن گیا۔

(۲) **مسلمان محفوظ رہے:**

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو جب مطلع فرمادیا کہ یہود و نصاریٰ اس قسم کے حیلے کر رہے ہیں۔

”لم يحصل لهذه الحيلة اثر في قلوب المؤمنين“

تو یہود و نصاریٰ کے مکر و فریب کا مؤمنوں کے دل میں کوئی اثر نہیں ہوا۔

اگر مؤمنوں کو مطلع نہ کیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ کچھ ضعیف الاعتقاد حضرات ان لوگوں کے مکر و فریب کا

شکار ہو جاتے اور ایمان سے پھر جاتے ”العباؤ بالله“

(۳) **یہود و نصاریٰ ذلیل و خوار ہوئے:**

ان القوم لما افضحوا في هذه الحيلة صار ذلك رادعاً لهم عن الاقدام على امثالها

من الحيل والتليس“

یہود و نصاریٰ اس حیلہ میں جب ناکام ہو گئے تو رب تعالیٰ نے ان کے مکر و فریب کی خبر دے کر بے نقاب کر



دیا ان کی ذلت و رسوائی کا ذکر کر کے گویا کہ ان کو تنبیہ کر دی کہ آئندہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے باز آ جانا، کہاں تمہارے باطل حیلے اور کہاں نبی کریم ﷺ اور مومنوں کی بلند شان۔  
(ماخوذ از کبیر)

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ ”شاید وہ پھر جائیں“

یعنی یہود و نصاریٰ نے حیلہ سوچا کہ صبح ایمان لے آؤ اور شام کو پھر جاؤ ہو سکتا ہے یہ لوگ ایمان سے پھر جائیں۔ تفسیر کبیر سے جو تین وجوہ تفصیلاً ذکر کر دی گئی ہیں کہ رب تعالیٰ نے ان کے حیلے سے مطلع فرمادیا، ان میں دو صورتوں کے مضمون کو خازن میں مختصر الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے، اگر طلباء کرام عبارت یاد کرنا چاہیں تو ان کے فائدہ کیلئے خازن کی عبارت ذکر کی جا رہی ہے۔

”ولمادبروا هذه الحيلة اخبر الله تعالى نبيه ﷺ بها فلم تتم لهم ولم يحصل لها اثر في قلوب المؤمنين ولولا هذا الاعلام من الله تعالى لكان ربما اثر ذلك في قلوب بعض من كان في ايمانه ضعف“  
(خازن)

جب انہوں نے اس حیلہ کی تدبیر کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مطلع فرمادیا تو وہ لوگ اپنے حیلہ میں ناکام ہو گئے، اور مومنوں پر ان کے حیلہ کا کوئی اثر نہ ہوا، اگر ان کی چال بازی کی خبر نہ دی جاتی تو ہو سکتا تھا کہ کچھ ضعیف ایمان والوں پر اس کا اثر ہوتا اور وہ پھر جاتے۔

**تنبیہ:** آیہ کریمہ سے اتنا تو واضح ہوا کہ یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے کو اس حیلہ اور مکر و فریب کا مشورہ دیا کہ ایسا کرو، اور یوں کہو۔

”واما امثال الامر من المأمورات فمسكوت عن بيان وقوعه وعدمه“  
کیا انہوں نے اس حیلہ پر عمل بھی کیا تھا؟ یا نہیں، بعض نے بعض کی بات کو مانا تھا یا نہیں؟ اس کا بظاہر ذکر اس آیہ کریمہ میں نہیں۔

”وعن بعضهم ان في الاخبار ما يدل على وقوعه“  
بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ آیہ کریمہ سے تقریباً یہ سمجھ آ رہا ہے کہ انہوں نے اپنے حیلہ پر عمل تو کیا تھا لیکن وہ اس میں ناکام رہے اور ذلیل و خوار ہوئے۔  
(ماخوذ از روح العالی)

تفسیر کبیر اور خازن سے یہی بات سمجھ آ رہی ہے کہ انہوں نے حیلہ کیا اور اس میں ناکام ہو کر ذلیل و خوار ہوئے، تفسیر البحر المحیط نے لکھا ہے۔



”واسباب النزول تدل علی وقوعه“

آیہ کریمہ کے نزول کی وجہ اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس حیلہ پر عمل کیا۔ وہ اپنا حیلہ کرنے کے باوجود ناکام رہے، مسلمانوں کو اسلام سے نہ پھیر سکے۔

**تنبیہ:** کفار کی چالپوسی پر اعتماد نہ کرنا چاہئے، بسا اوقات ان کی نمازیں، روزے، بلکہ ان کا کلمہ طیبہ پڑھنا سیاسی ہوتا ہے نہ کی دینی، غضب تو دیکھو کہ یہود نے مسلمانوں کو بہکانے کیلئے ایمان قبول کر کے نمازیں پڑھ کر مرتد ہونے کی ٹھان لی۔

خیال رہے کفار کی یہ تدبیریں اب بھی باقی ہیں، ہر سال بعض یہودی فرمان مصطفوی کے نام سے اشتہار چھاپتے ہیں جس میں لکھتے ہیں کہ شیخ احمد خادم روضہ رسول اللہ ﷺ نے حضور ﷺ کی خواب میں زیارت کی کہ ان سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس ہفتہ میں اتنے مسلمان مرے جن میں سے پچانوے فی صدی کافر ہو کر مرے اور پانچ فی صد مسلمان، میں خدا کے سامنے اپنی امت کی بد عملیوں سے سخت شرمندہ ہوں، فلاں سنہ میں سورج مغرب سے نکلے گا، فلاں سنہ میں یا جوج و ما جوج ظاہر ہوں گے اور فلاں سنہ میں لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں گی، اور جو اس مضمون کو نہ مانے وہ کافر ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب یہود کی حرکتیں ہیں تاکہ مسلمان ان حالات کو سن کر اسلام سے بد دل ہوں، اور ان پیشگوئیوں کی غلطی معلوم کر کے بانی اسلام ﷺ سے پھر جائیں اور سوچیں کہ بارہا ایسی پیشگوئیاں ہوئیں مگر ظاہر کچھ بھی نہ ہوا، حالانکہ روضہ مطہرہ کے خدام میں سے کسی کا نام شیخ احمد نہیں، سیدھے سادھے مسلمان اسے وحی سمجھ کر چھاپتے اور شائع کرتے ہیں یہ یہودیوں کی وہی پرانی چال ہے۔

(تفسیر نعیمی)





وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبَعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنْ الْهُدَىٰ هَدَىٰ اللَّهُ أَنْ يُؤْتِيَ أَحَدَ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنْ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

(آیہ نمبر ۷۳)

- (۱) اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہو، تم فرما دو کہ اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے (یقین کا ہے کہ نہ لاؤ) اس کا کہ کسی کو ملے جیسا تمہیں ملا، یا کوئی تم پر حجت لا سکے تمہارے رب کے پاس، تم فرما دو کہ فضل تو اللہ ہی کے ہاتھ ہے جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ (کنز الایمان)
- (۲) اور نہ لاؤ تم ایمان مگر ان کیلئے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، آپ فرما دیجئے بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے، کسی ایک کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا، یا حجت لا سکے تم تمہارے رب کے ہاں، فرما دیجئے بیشک فضل اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے دیتا ہے وہ جسے چاہے، اور وسعت والا، علم والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ یہود کے بقیہ کلام کی حکایت بیان کی گئی ہے، جب ان میں سب بعض نے بعض کو کہا کہ تم صبح ایمان لاؤ، شام کو پھر جاؤ شاید کہ یہ لوگ بھی پھر جائیں، اس کے بعد ان کا یہ کلام جو اس آیت کریمہ میں ذکر کر دیا گیا۔

﴿وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبَعَ دِينَكُمْ﴾

”اور نہ ایمان لاؤ مگر ان کیلئے جنہوں نے تابعداری کی تمہارے دین کی“

اعلیٰ حضرت و علامہ رازی رحمہما اللہ:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ”اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہو“ (کنز الایمان)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ”کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں“



تمہارے دین کی۔ ان کی بزرگوں کے تراجم علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کی اس عبارت کے مطابق ہیں“  
”ولا تصدقوا الالبیاء یقرر شرائع التوراة فاما من جاء بتغییر شی من احکام التوراة  
فلا تصدقوه، وهذا هو مذهب اليهود الی الیوم“

اور نہ تصدیق کرو یعنی یقین نہ لاؤ، مت مانو سوائے اس نبی کے جو توراة کے احکام کو ہی بیان کرے اور ان کے مطابق ہی عمل کرے، جو نبی توراة کے احکام میں سے کچھ بھی بدل دے، اس کی بات پر یقین نہ کرو، اس کی بات کو مت مانو، یہی مذہب یہود کا آج تک چل رہا ہے، کہ جو ہماری چال چلے وہ تو کچھ ہمارے قریب ہے، اور جو ہماری چال نہ چلے وہ ہم سے دور ہے، ہم اسے سر نہیں اٹھانے دیں گے، وہ نصاریٰ کو اپنے ساتھ ملائے ہوئے ہیں، یا یوں کہیں یہود نصاریٰ سے ملکر مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ بعض مسلمان یہود و نصاریٰ سے مل کر دوسرے مسلمانوں کو مروارہے ہیں، افسوس اے مسلمان تیری عقل کہاں گئی۔

**تنبیہ:** ابھی تفسیر کبیر سے جو عبارت پیش کی ہے، اس تفسیر کیلئے یہ جاننا بھی ضروری ہے۔

وعلى هذا التفسير تكون "اللام" في قوله (الا لمن تبع) صلة زائدة فانه يقال صدقت فلانا، ولا يقال صدقت لفلان، وكون هذا اللام صلة زائدة جاز كقوله تعالى (ردف لكم) والمراد ردفكم

اس تفسیر کیلئے یہ ضروری کہ لام کو زائد مانا جائے جو ﴿اَلَا لِمَنْ تَبِعَ﴾ میں ہے کہ یہ فقط اتصال کیلئے ہے اور زائد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿رَدَفَ لَكُمْ﴾ میں لام معنوی لحاظ پر زائد ہے اور رابطہ کیلئے، اسی وجہ سے اس کا معنی ”رَدَفْكُمْ“ والا ہے۔

**تنبیہ:** طلباء کرام تو سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات کسی لفظ کا کسی جگہ معنی نہیں ہوتا وہ دو کلموں یا دو کلاموں کے درمیان رابطہ کا کام دے رہا ہوتا ہے، اس حرف کو زائد کہتے ہیں، جو صرف معنوی طور پر زائد ہوتا ہے، زائد کو (معاذ اللہ) کوئی بے فائدہ کہہ کر اپنے ایمان کا جنازہ نہ نکالے۔

**راقم اور روح البیان و تفسیر کبیر:**

راقم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ روح البیان سے لیا ہے، اور تفسیر کبیر نے بھی دوسرا معنی وہی لکھا ہے، اصل میں راقم کی کوشش ہوتی ہے کہ دینی مدارس کے طلباء کرام کے سامنے تمام بحثیں آجائیں تاکہ وہ بھرپور فائدہ حاصل کر سکیں۔  
(ولا تؤمنوا ای لا تقروا بتصدیق قلبی) (الا لمن تبع دینکم) ای لاہل دینکم لا لمن تبع



محمدًا و اسلم لما قالت الطائفة المتقدمة لاتباعهم اظهروا الايمان بالقرآن اول النهار كان من بقية كلامها لهم انكم لاتصدقوا بحقيه الاسلام والقرآن بقلوبكم لكن لاتظهروه للمسلمين ولا تفروا بذلك الا لاهل دينكم“ (روح البيان)

اور تم دل سے تصدیق کر کے اقرار نہ کرو (یعنی ایمان نہ لاؤ) مگر ان کی وجہ سے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، ان کی وجہ سے ایمان لانا مقصود نہیں جنہوں نے محمد ﷺ کی تابعداری کی اور اسلام قبول کیا۔ جب اس سے پہلی آیت میں گذر چکا ہے کہ ایک گروہ نے اپنے قبیعین (پیروی کرنے والوں) کو کہا: ”تم قرآن پر ایمان کو دن کے اول حصہ میں ظاہر کرو“ تو اس آیت کریمہ میں ان کے کلام کا بقیہ حصہ ذکر کیا ”تم اسلام اور قرآن کی حقانیت کو دلوں سے تسلیم نہ کرنا“ لیکن مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان کا نہ اظہار کرنا اور نہ اقرار کرنا مگر بوجہ اپنے دین والوں کے۔

تفسیر کبیر نے دوسرا معنی ان الفاظ سے بیان کیا:

(ولا تؤمنوا الا لمن تبع دينكم) ای لاتاتوا بذلك الايمان الا لاجل من تبع دينكم، كانهم قالوا ليس الغرض من الاتيان بذلك التلبس بالبقاء بباعكم على دينكم فالمعنى ولا تاتوا بذلك الايمان الا لاجل من تبع دينكم“

یعنی تم ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی، گویا کہ انہوں نے کہ یہ ایمان لانے کا مکر و فریب اور طمع سازی صرف اپنے قبیعین کو دین پر قائم رکھنا مقصود ہو، اب آیت کریمہ کا معنی واضح ہو گیا ”ولا تاتوا بذلك الايمان الا لاجل من تبع دينكم“ ”اور ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کے جنہوں نے تمہارے دین کی تابعداری کی“ اس صورت میں ﴿لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ﴾ میں لام تعلیلیہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

آیت کریمہ کا مختصر مطلب:

یہود جو رئیس تھے انہوں نے اپنے پیروی کرنے والے لوگوں کو یہ کہا کہ تین باتوں کو ذہنوں میں رکھو ایک یہ کہ (پہلے معنی کے مطابق) کسی کو بات پر یقین نہیں لانا، ہاں البتہ صرف ان کی بات کو ماننا جو تمہارے دین کے متبع ہوں، (اور دوسرے معنی کے مطابق مطلب یہ ہے) کہ دل سے ایمان نہ لانا البتہ ایمان کا اظہار اور اقرار بھی صرف اپنے دین والوں کے فائدہ کیلئے کرنا کہ کہیں وہ ایمان نہ لے آئیں، جب تم صبح ایمان کا صرف اظہار کر کے شام کو پھر جاؤ گے تو ہمارے دینی بھائی یہ دیکھ کر اپنے دین پر قائم رہیں گے کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو ہمارے اہل علم ایمان لا کر نہ



پھرتے، دوسری چیز کی ترغیب دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انعامات تمہیں عطاء کر رکھے ہیں وہ کسی اور کو عطاء نہیں کئے گئے، (لہذا تم اپنے دین پر قائم رہنا صرف زبانی، کلامی اسلام کا اظہار کرنا) تیسری چیز تم یہ یاد کرو کہ وہ لوگ قیامت کے دن بھی تمہارے ساتھ حجت و دلیل میں غالب نہیں آئیں گے۔ یہ تین چیزیں رئیس یہودیوں نے اپنے قبیعین کو سکھائیں تاکہ یہ ظاہری طور پر ایمان لائیں اور دل میں اپنے دین کو ہی پختہ رکھیں، پھر البتہ ظاہری طور پر لائے ہوئے ایمان سے بھی پھر جائیں۔ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ سے ان کو دو جواب دلائے۔ ایک یہ کہ اے محبوب ”آپ فرمادو کہ بیشک ہدایت اللہ کی طرف سے ہدایت ہے“ یعنی ہدایت دینا جب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے تو تمہاری یہ تدبیر باطل و برباد ہو کر رہ جائے گی کہ صبح ایمان لا کر شام پھر جاؤ تو لوگ اسلام سے پھر جائیں گے، یہ احمقانہ تدبیر ہے۔ اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ”اے محبوب آپ فرمادو“ بیشک فضل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے جسے چاہتا ہے وہ عطاء کرتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا علم والا ہے ”یعنی تمہاری یہ نصیحت بھی باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات صرف یہود پر ہی ہیں وہ جسے چاہے اپنے انعامات سے نواز دے، جب فضل اسی کے قبضہ قدرت میں تو تمہارا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ قیامت کے دن حج و دلائل میں ان پر کوئی غالب نہیں آئے گا۔

﴿قُلْ إِنْ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ﴾ ”آپ فرمادے کہ بیشک ہدایت اللہ ہی کہ ہدایت ہے“

”قل یا محمد للمرؤساء (ان الہدی ہدی اللہ) یہدی بہ من یشاء الی الایمان ویشبہ

علیہ فاذا کانت الہدایۃ والتوفیق من اللہ فلا یضر کیدکم وحیلکم، وهو اعتراض

مفید لکون کیدہم غیر مجد لطائل“

یہ جملہ معترضہ ہے اس میں بتانا یہ مقصود ہے کہ یہود و نصاریٰ کا مکر و فریب باطل ہے اس میں کسی قسم کا ان کو نفع نہیں۔ اسلئے اے محمد مصطفیٰ ﷺ یہود و نصاریٰ کے رئیسوں کو آپ فرمادیں بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے ”وہ جسے چاہے ایمان کی ہدایت عطاء فرماتا ہے، اور ان کو اس پر ثابت قدم رکھتا ہے، جب ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی توفیق سے ہے تو اے یہود و نصاریٰ تمہارا مکر و فریب نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کو نقصان نہیں پہنچا سکتا“ (روح البیان)

ان الفاظ مبارکہ سے ہی یہ حاصل ہو گیا ”فمن یہدی اللہ فلا مضل لہ“ جس کو اللہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا بھی پتہ چل گیا۔

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (سورۃ الصف پارہ ۲۸ آیہ نمبر ۸)

”وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کا نور بجھا دیں اپنے مونہوں سے، حالانکہ اللہ مکمل کرنے والا ہے اپنے نور کو



﴿أَنْ يُؤْتِيَ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾

یہ کہ کسی ایک کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا، یا حجت لاسکے تمہارے رب کے ہاں۔“

ان الفاظ مبارکہ کے مختلف مطالب بیان کئے گئے، اصل میں تراکیب میں جب مختلف احتمال ہوں تو یقیناً معانی بھی مختلف ہوتے ہیں، زیادہ فہم کے قریب خازن اور صاوی سے ایک معنی پیش کر رہا ہوں، جو طلباء کی سمجھ کیلئے زیادہ بہتر ہے“

(۱) (قل ان الهدی هدى الله) ای ان الدین دین الله والبیان بیانہ وهذا خبر من الله تعالى ثم اختلفوا فيه فمنهم من قال هذا كلام معترض بين كلامين وما بعده متصل بالكلام الاول وهو اخبار عن قول اليهود بعضهم لبعض ومعنى الآية ولا تؤمنوا الا لمن تبع دينكم ولا تؤمنوا ان يؤتى احد مثل ما اوتيتم من العلم والحكمة والكتاب والآيات من فلق البحر وانزال المن والسلوى عليكم وغير ذلك من الكرامات ولا تؤمنوا ان يحاجوكم عند ربكم لانكم اصح دينا منهم فلما اخبر الله تعالى عن اليهود بذلك قال في الثناء ذلك قل ان الهدى هدى الله والمعنى ان الذى اتم عليه انما صار دينا بحكم الله وامره فاذا امر بدين آخر وجب اتباعه والانقياد لحكمه لانه هو الذى هدى اليه وامره، وقيل معناه قل لهم يا محمد ان الهدى هد الله وقد جنتكم به ولن ينفعكم فى دفعه هذا الكيد الضعيف“

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدٰى اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے (اے محبوب) آپ فرمادیجئے ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے، یعنی دین اللہ ہی کا دین ہے، اور بیان اللہ ہی کا بیان ہے۔ اب ترکیبی لحاظ پر ایک احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے، یعنی فعل ”وَلَا تُؤْمِنُوا“ اور اس کے معمولات ﴿اَنْ يُؤْتِيَ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ﴾ اور ﴿أَوْ يُحَاجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ کے درمیان واقع ہے، اس ترکیب کے لحاظ پر مطلب یہ ہے کہ یہود کے بعض لوگوں نے جو بعض کو کہا، اس کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی، اس لحاظ پر آیت کریمہ کا معنی یہ ہوا۔ اور نہ ایمان لاؤ مگر ان کیلئے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور نہ ایمان لاؤ اس پر کہ کسی اور کو دیا جائے مثل اس کے جو تمہیں دیا گیا یعنی جو علم تمہیں دیا گیا، کتاب و حکمت تمہیں دی گئی، اور نشانیاں تمہیں گئیں، یعنی دریا کا تمہارے لئے پھاڑنا، اور من و سلوی تم پر نازل کرنا، اور طرح طرح کی کرامات سے تمہیں نوازا (یہ نعمتیں کسی اور نہیں دی جائیں یہ صرف تمہاری ہی شان



ہے) اور تم اس پر ایمان نہ لاؤ کہ وہ کسی قسم کی حجت و دلیل میں تم پر غالب آسکیں گے، اس لئے کہ تمہارا دین ان کے دین سے زیادہ صحیح ہے۔ رب تعالیٰ نے یہود کے تین اقوال کا ذکر فرمایا تو درمیان میں ذکر فرمایا ﴿قُلْ إِنْ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ﴾ (آپ فرمادیجئے بیشک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے) یعنی جس دین پر تم ہو وہ اللہ کے حکم سے ہی دین بناتھا، اب رب تعالیٰ نے جب اسے منسوخ فرما کر دوسرے دین کا حکم دیا ہے تو تمہارے لئے ضروری ہو چکا ہے کہ تم اسی کی تابعداری کرو، کیونکہ ہدایت تو وہی جو رب تعالیٰ کی ہدایت ہے، صرف تمہاری عقل اور سوچ کی بات نہیں۔ اور بعضوں نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محبوب آپ فرمادیں کہ بیشک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے جو میں نے تمہارے پاس دین لایا ہے، وہی اللہ کی ہدایت ہے، لہذا یہ کمزور قسم کے تمہارے مکر و فریب اور گھٹیا تمہاری چالیں تمہیں نفع نہیں پہنچا سکتیں، اور نہ ہی دین کو ختم کر سکتی ہیں۔

(خازن)

طلباء کرام خازن کی عبارت اور ترجمہ کو دیکھنے کے بعد ”صاوی کو دیکھیں تو (۱) شاء (اللہ) اس میں سے بھی یہ مطالب سمجھنے آسان ہوں گے۔ یہ مطلب جو بیان کیا گیا ہے اس کی دار و مدار ﴿لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ﴾ کے لام کا معنی علت اور انتفاع کا لینے پر ہے۔

(۲) اگر لام زائد ہو تو معنی یہ ہوگا نہ یقین لاؤ اور نہ مانو سوائے ان کی باتوں کے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور یہ نہ مانو کہ کسی اور کو اس کی مثل دیا جائے گا جو تمہیں دیا گیا ہے، اور یہ نہ مانو اور اس پر یقین نہ لاؤ کہ کوئی تم پر دلائل میں تمہارے رب کے ہاں تم پر غالب ہوگا۔

(۳) تیسرا معنی لام کو صلہ کا بناتے ہوئے یہ ہوگا۔

”لا تظہروا ایمانکم بان یؤتی احدکم مثل او یتیم او یحاجوکم عند ربکم الا لمن تبع دینکم“

کہ تم اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرو کہ کسی اور کو تمہاری مثل انعامات دے جائیں گے، یا کوئی اور اللہ کے ہاں تم پر دلائل میں غالب آسکے گا۔ ہاں یہ باتیں صرف اپنے قبیحین کے سامنے ظاہر کر سکتے ہو۔

”ولا تفسوہ الی المسلمین کیلا یزید ثباتہم ولا الی المشرکین کیلا یدعوہم الی الاسلام“

یعنی مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کرنا کہ ہماری آسمانی کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ آخری نبی آئیں گے اور ان کا دین دین اسلام ہوگا، تو یہ تمہاری باتیں سن کر مسلمان دین پر اور پختہ طریقے سے قائم ہوں گے، اسلئے مسلمانوں پر یہ باتیں ظاہر نہ کریں، اور مشرکین کو بھی یہ نہ بتائیں ورنہ مسلمان ان کو اپنے دین کی طرف پھیر لیں گے، اور ان کو یہ



کہیں گے کہ ہمارا دین سچا ہے کیونکہ اس کی حقانیت کا تذکرہ پہلی آسمانی کتب میں بھی موجود ہے۔ (ماخوذ از مظہری) خیال رہے یہی معنی تفسیر ابن کثیر اور صابونی میں ذکر کیا گیا ہے۔

(وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا مَنِ ابْتَدَأَ دِينَكُمْ) اے لاتطمئنوا اور تظہروا سر کم و ما عندکم الا لمن تبع دینکم ولا تظہروا ما بآیدکم الی المسلمین فیؤمنوا بہ و یحتجوا بہ علیکم

یعنی تم یقین نہ کرو اور اپنے راز ظاہر نہ کرو، اور جو تمہاری کتب میں موجود ہے اسے ظاہر نہ کرو سوائے ان کے جنہوں نے تمہاری تابعداری کی، اور جو چیزیں تمہارے علم میں ہیں، انہیں مسلمانوں پر ظاہر نہ کریں ورنہ وہ اپنے ایمان پر پختہ طریقہ سے قائم رہیں گے، اور تم پر دلائل میں غالب آجائیں گے کہ جب ہماری دین اور ہمارے نبی کریم ﷺ کا ذکر تمہاری کتب میں موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ تم ہمیں دین سے پھیرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ (صابونی)

(۴) اور ایک معنی اس صورت کے مطابق ہے جس میں ”أَنْ يُؤْتِي“ میں ”لا“ کو مقدر مانا گیا، ج طرح ﴿يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ﴾ میں ”لا“ مقدر ہے، اصل میں معنوی طور پر اس طرح ہے ﴿يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ﴾ (اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لئے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) اب یہاں معنوی طور پر عبارت یوں ہو گئی۔ ”وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا مَنِ ابْتَدَأَ دِينَكُمْ“ یعنی لا تصدقوہم لئلا یعلموا مثل ما علمتم فیکون لکم الفضل علیہم بالعلم ولئلا یحاجوکم عند ربکم فیقولوا عرفتم ان دیننا حق ولم تؤمنوا“

اب مطلب یہ ہوا کہ ”تم ان کی تصدیق نہ کرنا تاکہ انہیں ایسا علم حاصل نہ ہو جائے جو تمہیں حاصل ہے یہ اس لئے ضروری ہے کہ تمہاری علمی برتری ان پر قائم رہے، اور رب تعالیٰ کے ہاں وہ تم پر حجت نہ پیش کر سکیں، اور رب کے تمہیں یہ نہ کہیں کہ تم ہمارے دین کی حقانیت کو جانتے تھے لیکن تم نے ایمان نہیں لایا۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾

فرما دیجئے بیشک فضل اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے عطاء کرتا ہے جسے چاہے۔

یہ ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے اپنے یہود و نصاریٰ کو کہا کہ کسی ایک کو تمہاری مثل انعام و اکرام نہیں دیا جائے گا ”وَفِي الْحَقِيقَةِ هُوَ دَلْدَعُوا هُمْ مِنْ أَوْلَاهَا إِلَى آخِرِهَا“ حقیقت میں ان کے دعویٰ کا اول سے آخر تک رد ہے۔ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب آپ فرمادیں بیشک فضل اللہ تعالیٰ کے قبضہ



قدرت میں ہے جسے چاہے عطاء کرتا ہے۔

”ای الامور کما یتحت تصرفه وهو المعطى المانع یمن علی من یشاء بالایمان والعلم والتصرف انتام ویضل من یشاء فیعمی بصره ویصیرته ویختم علی قلبه وسمعه ویجعل علی بصره غشاوة وله الحجة والحمكة البالغة“

یعنی تمام امور رب تعالیٰ کے تصرف میں ہیں وہی عطاء کرنے والا ہے، وہی اپنی مہربانیوں سے کسی کو دور کرنے والا ہے، جس پر چاہے اس پر احسان فرماتا ہے یعنی اسے ایمان و علم اور تصرف تام عطاء فرماتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور اس کی بصارت اور بصیرت کو گم کر دیتا ہے۔ اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتا ہے، اور اس کی آنکھوں پر پردہ کر دیتا ہے، رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت پر حجت اور حکمت بالغہ ہے۔ (صابونی)

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ ”اور اللہ وسعت والا، علم والا ہے“

اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، یعنی بہت بڑے فضل والا ہے، ”وہ علم والا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ کون اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ اس پر فضل کیا جائے۔“





(آیہ نمبر ۷۴)

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

(۱) اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

جب اس سے پہلی آیہ کریمہ میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، یعنی بہت بڑے فضل والا ہے، اور ”وہ علم والا ہے“ یعنی جانتا ہے کہ کون اس کے فضل کا مستحق ہے“ تو اس آیہ کریمہ میں یہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کرتا ہے، اور اللہ ہی بہت بڑے فضل والا ہے، نصاریٰ اور یہودی کا یہ دعویٰ کہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل صرف ہم پر ہے جو ہمیں اس نے انعام و اکرام عطاء کیا ہے وہ کسی اور کو عطاء نہیں کیا، یہ (ان کا دعویٰ) باطل ہے۔

”اختصکم ایہا المؤمنون من الفضل بما لا یحد ولا یوصف بما شرف به نبیکم محمد ﷺ علی سائر الانبیاء وهداکم به الی اکمل الشرائع“

اس آیہ کریمہ سے یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کو رد کر کے مؤمنین کو بتایا گیا ہے کہ:۔ مومنو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے فضل سے خاص کیا ہے۔ اتنے بڑے فضل سے تمہیں نوازا ہے جس کی کوئی حد اور کوئی وصف نہیں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر تمہارے نبی کو افضل بنایا، جس کی وجہ سے تمہیں تمام امتوں سے افضل بنایا، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں سید الانبیاء اور افضل الانبیاء کے ذریعے کامل شریعت کی ہدایت دی۔ تو اب اے مومنو تم خود ہی ہی سمجھ جاؤ کہ تم سے کوئی افضل نہیں۔ یہود کے غلط دعویٰ اور باطل نظریات کے ڈھنڈورا پیٹنے سے کہیں بدظن نہ ہونا۔ (ماخوذ از صابونی)

(یختص بر رحمته من یشاء) یعنی بنوہ و رسالتہ و قبل بدینہ الذی هو الاسلام و قبل بالقرآن (من یشاء) یعنی من خلقہ و فیہ دلیل علی ان النبوة لا تحصل الا بالاختصاص والتفضل لا بالاستحقاق لانه تعالی جعلها من باب الاختصاص وللفاعل ان يفعل ما یشاء الی من یشاء بغير استحقاق“

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کرتا ہے، یعنی نبوت اور رسالت اپنی مخلوق سے جسے چاہے عطاء کرتا ہے۔ اور جسے چاہے دین اسلام عطاء فرما کر اور قرآن پاک عطاء فرما کر اپنی رحمت سے خاص فرمالیتا ہے۔ آیہ کریمہ سے ایک اور دلیل حاصل ہوگئی کہ نبوت صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے، رب تعالیٰ جسے چاہے



نبوت کیلئے خاص کر دے، اور وہی جانتا ہے کہ نبوت کا اہل کون ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" اللہ زیادہ جانتا ہے کہ منصب رسالت کسے عطاء کرنا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے نبوت استحقاق (حق دار ہونے) کی وجہ سے ملی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس خصوص فضل کو اپنی مشیت سے خاص کر دیا ہے کہ (اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص کر دے) اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے، فاعل مختار جسے چاہے اس کے استحقاق کے بغیر ہی عطاء کر دے۔

(از خازن)

**فائدہ جلیلہ:** ان دونوں مذکورہ آیات سے صوفیاء کرام نے اس عظیم فائدہ کا ذکر کیا ہے کہ  
 "لا تعاشروا الا من یوافقکم علی احوالکم و طریقتکم فان من لا یوافقکم لا یرافقکم  
 واللہ اعلم"

کہ ان لوگوں سے تعلقات رکھو جو تمہارے حالات کے مطابقت تمہارے موافق ہو، اور تمہارے طریقہ پر چلیں، جو لوگ تمہارے موافق نہیں وہ تمہارے رفیق نہیں بن سکتے، "واللہ اعلم" (قطبی)

**یہود کی دو چالوں کے دو بیان:**

یہود نے ایک چال یہ چلی کہ اپنے بعض لوگوں کو کہا کہ تم صبح ایمان لے آؤ اور شام کو کفر اختیار کر لو، تاکہ ضعیف الاعتقاد مسلمان اسلام سے پھر جائیں، تو رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدٰى اللّٰهِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کی کامل ہدایت اور اسی کی کامل قوت بیان یہ کہ ہوتے ہوئے تمہارے یہ کمزور حیلے، گھٹیا قسم کے مکر و فریب کسی کام کے نہیں، تم نے اپنے ان مقاصد میں ناکام ہی ناکام ہونا ہے، دوسری چال ان کی یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں کو اپنے عقائد پر قائم رکھنے کیلئے اور اس غرض کیلئے کہ یہ ہماری ہر بات پر عمل کرتے رہیں تو انہوں نے کہا کہ جو کتاب اور احکام اور حکمتیں اور نبوت تمہیں عطاء کی گئی ہے وہ کسی اور کو عطاء نہیں کی گئی، تو رب تعالیٰ نے ان کے رد میں ذکر فرمایا۔ ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يُّشَاءُ﴾ فرمادیتے فضل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں عطاء کرتا ہے وہ جسے چاہتا ہے۔ (کبیر)

**فضل سے مراد رسالت و نبوت بھی ہے:**

اور ہر قسم کا زیادہ احسان بھی ہے۔

"الفضل هو فی اللغة عبارة عن الزيادة واكثر ما يستعمل فی زیادة الاحسان والفاضل الزائد علی غیره فی خصال الخیر لم یكثر استعمال الفضل حتی صار لكل نفع قصد"



به فاعله الاحسان الى الغير

فضل کا لغوی معنی ہے ”زیادہ ہونا“ اکثر طور پر احسان کی زیادتی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے جو دوسروں پر اچھے کاموں میں زیادہ فوقیت رکھتا ہو اسے ”فاضل“ کہا جاتا ہے۔ پھر عام طور پر ہر نفع مند چیز پر اور دوسروں پر احسان کرنے کے معنی میں ”فضل“ کا استعمال ہونے لگا۔ (کیر)

بندوں پر رب تعالیٰ کے انعامات کی کوئی حد نہیں:

”وَيَحْصِلُ مِنْ مَجْمُوعِ الْآيَاتِينَ أَنَّهَا لَانْهَاءُ لِمَرَاتِبِ اعْزَازِ اللَّهِ وَاکْرَامِهِ لِعِبَادِهِ وَانْ قَصْرِ انْعَامِهِ وَاکْرَامِهِ عَلَى مَرَاتِبِهِ مَعِينَةٌ وَعَلَى اشْخَاصٍ مَعِينِينَ جَهْلٌ بِكَمَالِ اللَّهِ فِي التَّدْرَةِ وَالْحِكْمَةِ“

ان دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اعزاز و اکرام عطاء فرماتا ہے اس کی کوئی حد نہیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو چند معین قسم کے اعزاز و اکرام سے نوازتا ہے، یا یہ کہے کہ چند آدمیوں کو وہ اعزاز و اکرام سے نوازتا ہے تو یہ کہنا درحقیقت جہالت ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے قدرت و حکمت میں بے حد کمال کو نہیں جانتا۔ (کیر)

ہاں اتنی بات واضح ہے کہ رب تعالیٰ کا فضل مومنین کو حاصل ہے، کافر اس سے محروم ہیں پھر خصوصی کمالات و انعامات بندوں کے مراتب کے مطابق حاصل ہونے ہیں۔





وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِنطَارٍ يُودِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ لَا يُودِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ فَإِنَّمَا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (آیہ نمبر ۷۵)

- (1) اور کتابیوں میں کوئی وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک ڈھیر امانت رکھے تو وہ تجھے ادا کر دے گا اور ان میں سے کوئی وہ ہے کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ ادا کرے گا مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پڑھوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں۔ (کنز الایمان)
- (2) اور بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ تم ان کے پاس امانت رکھو کثیر مال وہ ادا کر دیں گے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ تم ان کے پاس ایک دینار امانت رکھو تو نہیں ادا کریں گے وہ تمہاری طرف مگر یہ کہ تم لگا تار اس پر کھڑے رہو، یہ بے شک اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (پکڑ کی راہ) اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق: اس آیت کریمہ کا تعلق ما قبل سے دو وجہ سے ہے۔

**پہلی وجہ:** اس لئے پہلی آیت کریمہ میں یہود کے ایک جھوٹ کا ذکر کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا فضل صرف ہم پر ہے اور کسی کو رب تعالیٰ نے ان نعمتوں سے نہیں نوازا ہے جن سے ہمیں نوازا ہے، اب اس آیت کریمہ میں ان کا امانت میں خیانت کے ارتکاب کا ذکر کیا جا رہا ہے، اور اسی آیت کریمہ سے ان کے جھوٹے ہونے پر دلیل قائم کی گئی، وہ اس طرح کہ

”انہ تعالیٰ بین ان الخیانة مستقبحه عند جمیع ارباب الادیان وهم مصرون علیها فذل هذا علی کذبهم“

اللہ تعالیٰ نے جب ان کی خیانت کا ذکر فرمایا تو اسی سے پتہ چل گیا کہ وہ جھوٹے ہیں، کیونکہ خیانت تو



تمام دینوں والوں کے نزدیک قبیح (بری) چیز ہے۔ جب وہ خیانت پر قائم رہنے پر اصرار کر رہے ہیں تو ان کے جھوٹے ہونے پر ان کا اپنا عمل ہی دلیل کیلئے کافی ہے۔

**دوسری وجہ:** پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ان قبیح (برے) احوال کا تذکرہ کیا جن کا تعلق دین سے تھا یعنی انہوں نے کہا (وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ) تم ایمان نہ لاؤ مگر بوجہ ان کہ جنہوں نے تابعداری کی تمہارے دین کی۔

”حکى في هذه الآية بعض قبائح احوالهم فيما يتعلق بمعاملة الناس وهو اصرارهم على الخيانة والظلم واخذ اموال الناس في القليل والكثير“  
اس آیت کریمہ میں یہود کے ان برے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے جو لوگوں کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ خیانت پر اصرار کرتے ہیں، اور لوگوں کا مال ناحق طریقے سے لے لیتے ہیں، خواہ وہ مال قلیل ہو یا کثیر ہو۔  
(ماخوذ از کبیر)

## شان نزول :

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن سلام کے پاس دو ہزار دو سو اوقیہ سونا بطور امانت رکھا، جب اس نے طلب کیا تو عبد اللہ بن سلام نے وہ سونا اسے واپس لوٹا دیا (اوقیہ کا وزن چالیس درہم کے برابر ہے یعنی ساڑھے دس تولے کا ایک اوقیہ ہے) اسی طرح آپ کے دوسرے ساتھی بھی امانت کا یوں ہی پاس کرتے تھے اور علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ قریش کے ایک شخص نے فحاص ابن عازور را یہودی کے پاس ایک دینا ربطور امانت رکھا تو اس نے خیانت کر لی، وہ ایک دینا واپس نہ لوٹایا تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو پہلے فریق کی تعریف اور دوسرے فریق کی مذمت میں نازل کیا۔ (ماخوذ از مظہری)

## آیت کریمہ کے نزول سے تنبیہ:

اخبِرِ تَعَالَىٰ اِنْ فِيْ اَهْلِ الْكِتَابِ الْخٰنِثِيْنَ وَالْاٰمِيْنَ وَالْمُؤْمِنِيْنَ لَا يُمَيِّزُوْنَ ذٰلِكَ فَيَنْبَغِيْ اجْتِنَابُ جَمِيْعِهِمْ“

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض خیانت کرنے والے ہیں، اور بعض امانت کا پاس کرنے والے ہیں، مؤمن چونکہ ان میں فرق نہیں کو سکتے تھے تو گویا کہ تمام اہل کتاب سے اجتناب کا حکم دیا گیا۔ (قرطبی)



قرطبی کی اس عبارت سے راقم کے موقف کو تائید حاصل ہوگئی کہ عبد اللہ بن سلام نے جب کثیر مال امانت رکھا ہوا واپس کر دیا تو اس وقت وہ یہودی تھے، مؤمن اور صحابی نہیں تھے۔ البتہ امانت کا پاس کرنے کی برکت اور رسول اللہ ﷺ کی نظر عنایت کی وجہ سے ان کو ایمان نصیب ہو گیا۔ اگر یہ مطلب لیا جائے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام ﷺ نے ایمان لانے کے بعد امانت واپس کی جس کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں ہے تو علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے قول ”فینبغی اجتناب جمیعہم“ کا کوئی مطلب نہیں نکل سکتا۔

**اعتراض:** تفسیر مظہری میں تو یوں بیان کیا گیا ہے ”ومن اهل الكتاب یعنی عبد اللہ بن سلام و اشباہہ مومنی اهل الكتاب“ جن اہل کتاب کے امانت لوٹا دینے کا ذکر ہے اس سے مراد اہل کتاب سے ایمان لانے والے عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔

اسی طرح روح البیان نے بیان کیا ہے ”فاهل الامانة من اهل الكتاب هم الذين اسلموا“ جن اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے کہ وہ امانتیں ادا کر دیتے ہیں خواہ ڈھیروں مال ہی ان کے پاس رکھا جائے، اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان تفاسیر سے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام ﷺ کا اسلام لانے کے بعد امانت واپس کرنے کا ذکر ہے، حالت یہودیت میں مراد لینا کیسے صحیح ہے۔

**جواب:** ان تفاسیر میں یہ ذکر نہیں کہ آپ نے اسلام لانے کے بعد امانت واپس کی، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے امانت واپس کی جب کہ وہ ڈھیروں مال تھا، اور انہوں نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا

”والله اعلم بالصواب“

آیت کریمہ میں مذکور قنطار سے مراد:

”والقنطار عبارة عن المال الكثير والدينار عبارة عن المال القليل“  
قنطار سے مراد کثیر مال اور دینار سے مراد قلیل مال ہے، اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے قنطار کا معنی ڈھیروں جمع کیا ہوا، اور دینار سونے کا ایک سکہ ہے، جسے اشرفی بھی کہا جاتا ہے اور دینار بھی جو اس کا مشہور نام ہے، یہ ساڑھے چار ماشے کا وزن ہے۔ اب مطلب یہ ہو گیا:

”منہم من یؤدی الامانة وان کثرت مثل عبد اللہ بن سلام واصحابہ ومنہم من لا یؤدیہا وان قلت وہم کفار اهل الکتاب مثل کعب الاشرف واصحابہ وفنحاص بن عاوزاء“



بعض اہل کتاب امانت ادا کر دیتے اگرچہ وہ بہت کثیر مال ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی امانتیں لوٹا دیا کرتے تھے اور بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ جو امانتیں واپس نہیں کرتے اگرچہ وہ مال بہت تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی اور فحاص بن عازوا (یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر شان نزول میں آچکا ہے) (ماخوذ از خازن)

خازن میں بھی ”وہم کفار“ ذکر کیا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ امانتیں ادا کرنے والے مسلمان تھے اور نہ ادا کرنے والے کافر تھے، لیکن راقم کا موقف وہی ہے جو ذکر دیا گیا کہ بعض اہل کتاب امانتیں واپس کر دیتے ہیں اگرچہ کثیر مال ہی کیوں نہ ہو یہ وہی ہیں جو بعد میں اسلام لے آئے اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو امانتیں واپس نہیں کرتے اگرچہ وہ مال قلیل ہی کیوں نہ ہو، یہ وہ لوگ ہیں جو کفر پر ہی قائم رہے۔  
”وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَامَنَهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا“  
اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ تم ان کے پاس امانت رکھو ایک دینار تو وہ نہیں ادا کریں گے تمہاری طرف، مگر یہ کہ تم لگا تار اس پر کھڑے رہو۔

یعنی بعض اہل کتاب کے پاس تم تھوڑا مال بطور امانت رکھ دو تو وہ تمہیں نہیں لوٹائیں گے، ہاں اگر تم ان سے لگا تار مطالبہ کرتے رہو تو وہ مال لوٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ”اِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا“ کا حقیقی معنی تو یہ ہے ”مگر یہ کہ تم ہمیشہ اس کے اوپر کھڑے رہو“ یہ حقیقی معنی تو متعارف نہیں، البتہ مجازی معانی میں سے کوئی ایک لے لیا جائے۔

### مجازی معانی:

(۱) ”قال ابن عباس يريد تقوم عليه وتطالبه بالالاحاح والخصومة والملازمة“  
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس پر کھڑا رہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس سے بار بار مطالبہ کرتے رہو، اور جھگڑا کرتے رہو، اسے لازم پکڑو، یعنی اس کا پیچھا نہ چھوڑو، تاکہ وہ تمہاری امانت ادا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

(۲) ”الامدة دوامك عليه يا صاحب الحق قائما على راسه متوكلا عليه بالنطالبة له والتعنيف بالرفع الى الحاكم واقامة البينة عليه“  
اس پر کھڑے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے صاحب حق تم اس کے سر پر کھڑے رہو، یہ بھروسہ رکھتے ہوئے (یہ توکل کرتے ہوئے) کہ یہ ادا کر دے گا اور اسے دھمکی دی جائے کہ میں اپنا یہ مقدمہ عدالت میں لے جاؤں گا اور دعویٰ پر تمہارے خلاف گواہ قائم کروں گا۔ دھمکی سے کام چل جائے تو بہتر ورنہ اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جائے اور اپنے دعویٰ پر گواہ قائم کر دے تاکہ حاکم اسے امانت واپس کر دے۔



(۳) تو امانت ایسے لوگوں کے پاس رکھ کر وہیں کھڑا رہ اور جلدی ہی لوٹا لے تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے اگر تو نے دیر کی اور وہاں سے واپس لوٹ آیا تو تجھے وہ امانت واپس نہیں کریں گے۔ (خازن)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و مدارک:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل المعروف بالنفسی کے مطابق ہے۔

(الا ما دمت علیہ قائما) الامدة دوامک علیہ یا صاحب الحق قائما علی رأسہ ملازما لہ یؤدہ “ یعنی مطلب یہ ہوا کہ بعض اہل کتاب کے پاس اگر تم نے ایک دینار امانت رکھ دیا تو تمہیں ادا نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ اے صاحب حق تم ان کے سر پر کھڑے رہو، انہیں لازم پکڑے رہو، انکا پیچھا نہ چھوڑو تو وہ تمہیں تمہاری امانت ادا کریں گے، اگر تم نے انہیں یوں ہی چھوڑ دیا کہ یہ خود ہی ادا کر دیں گے تو وہ ادا نہیں کریں گے۔

آئیے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ کو ایک مرتبہ پھر دیکھیں اور تفسیر مدارک کو پھر دیکھیں تو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ تفسیر مدارک کے مطابق خوب ترین با محاورہ ترجمہ نظر آئے گا۔ (اور ان میں سے کوئی وہ ہیں کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ دے گا مگر تو اس کے سر پر کھڑا رہے“ (کنز الایمان)

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاٰمِيْنِ سَبِيْلٌ﴾

”یہ بیشک اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (پکڑ کی راہ)“

بعض اہل کتاب جو امانت میں خیانت کر لیتے تھے وہ اس پر دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم ان ان پڑھ لوگوں کی خیانت کر لیں تو ہمیں کوئی گرفت (پکڑ) نہیں ہوگی۔ ان کا یہ کہنا ہمیں کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اس کے چند مطالب ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) یہود اپنے دین میں سخت شدت رکھتے تھے، ان کا عقیدہ یہ تھا ”یحل قتل المخالف ويحل اخذ ماله باى طريق كان“ کہ مخالف کو قتل کرنا حلال ہے اور اس کا مال جس طرح بھی حاصل کر لو وہ حلال ہے، مخالف کا مال حاصل کرنے کے لئے حلال طریقے کی ضرورت نہیں۔

وروى فى الخبر انه لما نزلت هذه الآية قال عليه السلام ”كذب اعداء الله مامن شىء كان

فى الجاهلية الا وهو تحت قدمى الا امانة فانها مؤداة الى البر والفاجر“

روایت بیان کی گئی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے دشمن جھوٹے



ہیں، زمانہ جاہلیت کی کوئی چیز نہیں مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے (یعنی زمانہ جاہلیت کے تمام رسم و رواج، طور طریقے سب میری شریعت نے ختم کر دیے) سواء امانت کے وہ ادا کی جائے خواہ مال امانت رکھنے والا نیک ہو یا برا۔

(۲) دوسری وجہ ”یہود کے یہ کہنے کی کہ ہم ان پڑھوں کا مال کھاتے رہیں تو ہم پر کوئی مواخذہ (پکڑ) نہیں“ یہ تھی کہ وہ یوں کہہ رہے تھے ”نحن ابناء الله واحباؤه“ والخلق لنا عبيد فلا سبيل لاحد علينا اذا اكلنا اموال عبيدنا“ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (معاذ اللہ) اور مخلوق ہماری غلام ہے، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی کا مال کھالیں تو وہ ہم سے پوچھیں کیونکہ ہم جس کا مال بھی کھائیں گے وہ ہمارا غلام ہوگا، غلام کا مال آقا کو کھانا جائز ہے۔

(۳) تیسری وجہ ان کے قول کی یہ تھی کہ وہ معاذ اللہ اسلام لانے والوں کو مرتد سمجھ رہے تھے، کہ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا ہے، لہذا دین کو چھوڑ دینے والے کا مال حلال ہے، خواہ جس طرح بھی اس کا مال کھالیا جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

### راہ کی نفی کا مطلب :

ان کا یہ کہنا ”نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ“ اس کا یہ مطلب ہے ”نفی السبيل المراد منه نفى القدرة على المطالبة والالزام“ ”ہم پر کوئی راہ نہیں“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ گویا کہ یوں کہہ رہے تھے کہ ہم جب ان لوگوں کا مال لے لیں تو یہ ہم سے مطالبہ کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے، اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم پر ہمارا مال دینا لازم ہے۔ (از کبیر)

ہمیں کوئی عذاب دینے والا نہیں، ہماری کوئی گرفت نہیں کر سکتا، ہمارا کوئی مواخذہ نہیں کر سکتا۔

﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

”اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں“

ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں۔

✽ ”ایک مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تو راۃ میں مذکور ہے کہ مخالف کے مال میں خیانت کر لینا جائز ہے“ ان کا یہ قول سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، ”اور وہ جانتے بھی تھے کہ ہم جھوٹے ہیں“ ”ومن كان كذلك كانت خيانه اعظم وجرمه افحش“ جو شخص اس طرح ہو اس میں بہت بڑی خیانت پائی جاتی ہے اور وہ بہت بڑا مجرم ہوتا ہے۔



❖ ”الثانی انہم یعلمون کون الخیانة محرمة“ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے بھی تھے کہ خیانت حرام ہے، پھر وہ یہ کہہ رہے تھے کہ حلال ہے، رب تعالیٰ ہم سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا، یہ ان کا کہنا اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا ہی تھا۔

❖ ”الثالث انہم یعلمون ما علی الخائن من الائم“ اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ خیانت کرنے والے پر کتنا عظیم گناہ ہے، لیکن یہ جاننے کہ باوجود وہ کہہ رہے تھے کہ یہ جائز ہے کہ مخالف کا مال خیانت کر کے کھالیا، اس کی ہمیں رب تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے، یہ ان کا کہنا سر اسر اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء باندھنا تھا۔  
(ماخذ از کبیر بوضاحت)

یہود کا عجیب قول یا احمقانہ قول یہ بھی تھا کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تمام مال ہمارے تھے، عرب کے لوگوں نے ہم پر ظلم کر کے ہم سے مال چھین لیا، اس لئے ہم پر کوئی گناہ نہیں کہ ہم اپنا مال ان سے لے لیں خواہ خیانت کر کے ہی کیوں نہ لے لیں۔

**گذشتہ سے پیوستہ :** ابن ابی حاتم نے مالک بن دینار سے عجیب و غریب بات دینار کو دینار کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے یوں بیان فرمائی۔

الما سمي الدينار دينار الانة ”دين و نار“ ومعناه ان من اخذه بحقه فهو دينه ومن اخذه بغير حقه فهو نار“

دینار کو دینار کہنے کی وجہ یہ ہے ”دین“ اور ”نار“ سے مرکب ہے، جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرے تو اس کے لئے یہ دین ہے اور جو ناجائز طریقے سے حاصل کرے اس کے لئے یہ ”نار“ (آگ) ہے۔  
(روح المعانی)

**امانت کے متعلق احادیث مبارکہ:**

❖ وعن انس قال قلما خطبنا رسول الله ﷺ الا قال لا ايمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له“  
(رواه البهقي في شعب الایمان، مشکوة کتاب الایمان)

حضرت انس فرماتے ہیں بہت کم ہی آپ نے ہمیں خطبہ دیا ہوگا جس میں یہ ارشاد فرمایا ہوگا ”اس شخص کا (کامل) ایمان نہیں جسے امانت کا پاس نہیں، اور اس کا دین (پر یقین) نہیں جو وعدہ پورا نہیں کرتا۔

**وضاحت حدیث :**

”قلما“ کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ ”ما“ مصدر یہ ہو، اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”قل خطبة“



خطبنا“ کم ہی آپ نے ہمیں خطبہ دیا“ جس میں یہ نہ کہا ہوا“ الخ“ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”ما“ کافہ ہو، اور وہ نفی میں استعمال ہوتا ہے اور اس پر استثناء دلالت کرتا ہے، اب معنی یہ ہو گیا ”ما وعظنا الا قال فیہا لا ایمان لمن لا امانة له“ الخ آپ نے ہمیں کوئی نصیحت نہیں فرمائی مگر یہ کہ اس میں فرمایا اس شخص کا ایمان (کامل) نہیں جسے امانت کا پاس نہیں“

(لا ایمان) ای علی وجہ الکمال (لمن لا امانة له) فی النفس والاہل والمال وقیل  
فیما استؤمن علیہ من حقوق اللہ وحقوق العباد التی کلف بہا“

حدیث شریف میں امانت کا وسیع تر مفہوم لیا گیا ہے ”آپ کے ارشاد گرامی“ لا ایمان لمن لا امانة له“ کا مطلب یہ ہے کہ ”اسے کامل ایمان حاصل نہیں جو اپنے نفس اور اہل اور مال میں خیانت کا لحاظ نہیں کرتا، جس شخص کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مکلف بنایا گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ ان کو پورا کرے۔  
رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس وسیع مفہوم کی وضاحت کر رہا ہے۔

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَابْتَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَعْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾  
(سورۃ الاحزاب آیہ نمبر ۷۲)

بے شک ہم نے بامانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انہوں نے اس کے اٹھانے کا انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور آدمی نے اٹھالی، بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔

صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ امانت سے مراد طاقت و فرائض ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پیش کیا انہیں کو آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں پر پیش کیا تھا کہ اگر وہ انہیں ادا کریں گے تو ثواب دیئے جائیں گے، نہ ادا کریں گے تو عذاب کئے جائیں گے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امانت نمازیں ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا، خانہ کعبہ کا حج، حج بولنا، ناپ اور تول میں اور لوگوں کی دولتوں میں عدل کرنا۔

بعضوں نے کہا کہ امانت سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا حکم دیا گیا اور جن کی ممانعت کی گئی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا کہ تمام اعضاء کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب امانت ہیں، اس کا ایمان ہی کیا جو امانت دار نہ ہو، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ امانت سے مراد لوگوں کی ودیعتیں اور عہدوں کا پورا کرنا ہے، تو ہر مؤمن پر فرض ہے کہ نہ کسی مؤمن کی خیانت کرے، نہ کافر معاہدہ کی، نہ قلیل کی نہ کثیر کی، (آیہ کریمہ کی مکمل تفسیر ان



شاء اللہ اپنی جگہ پر ہی آئے گی)

(ولا دين) على طريق اليقين (لمن لا عهد له) بان غدر في العهد واليمين، "ولا دين لمن لا عهد له"

(اے دین حاصل نہیں جسے وعدہ کا پاس نہیں) یعنی اس شخص کو دین پر کامل یقین حاصل نہیں جو وعدہ کر کے پھر جائے، اور قسم اٹھا کر پوری نہ کرے۔

**تنبیہ:** "لا ایمان لمن لا امانة له" میں اگرچہ بظاہر طور پر مطلقاً ایمان کی نفی سمجھ آرہی ہے لیکن اس کی وضاحت علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

"هذا الكلام وامثاله وعيد لا يراد به الانقلاع بل الزجر ونفي الفضيلة دون الحقيقة وقيل يحتمل ان يراد به الحقيقة فان من اعتاد هذه الامور"

یہ کلام ہو یا اس کی مثل اور کلام ہو جس میں کسی عمل کے چھوڑنے پر وعید فرمائی گئی، بظاہر ایمان کی نفی ہو رہی ہو، اس میں حقیقت ایمان کی نفی نہیں، بلکہ زجر پائی گئی ہے، اور فضیلت کی نفی ہے یعنی نفی کمال ایمان کی ہے، نفی اصل ایمان کی نہیں۔

ہاں البتہ ایک شخص ان امور کی عادت بنالے، امانت میں خیانت کرنے کو جائز مانے، جھوٹ کو جائز مانے، اور وعدہ توڑنے کو جائز مانے تو وہ حقیقی طور پر کافر ہے۔ اسی حدیث کی شرح مرقاۃ میں طبرانی کی معجم کبیر میں بیان کردہ روایت کو ذکر کیا، جس میں مزید چیزوں کا ذکر ہے، فائدہ کے لئے اسے ذکر کیا جا رہا ہے۔

عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لا ایمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه ولا يستقيم له حتى يستقيم قلبه ولا يدخل الجنة من لا يأمن جاره بوائفة فويل ما البوائق يا رسول الله قال غشمه وظلمه وايماء رجل اصاب مالا من حرام وانفق منه لم يبارك له فيه وان تصدق منه لم يقبل منه وما بقى فزاده الى النار الا ان الخبيث لا يكفر الخبيث ولكن الطيب يكفر"

(رواه الطبرانی فی معجمه الكبير)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس شخص کا ایمان (کامل) نہیں جسے امانت کا پاس نہیں، اور اس شخص کا دین (پر یقین) نہیں جسے وعدہ کا پاس نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے اس شخص کا دین درست نہیں جس کی زبان درست نہیں، اور اس شخص کی زبان درست نہیں جس کا دل درست نہیں، اور وہ شخص (ابتدائی طور پر) جنت میں داخل نہیں ہو



گا جس کے پڑوسی اس کے بوائق سے محفوظ نہ ہوئے، آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ ”بوائق“ سے مراد کیا ہے، آپ نے فرمایا اس کے مظالم اور بے جا زیادتیاں ہیں۔

یعنی جس شخص کے مظالم اور بے جا زیادتیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوئے تو وہ ابتدائی طور پر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اور جس شخص نے حرام مال حاصل کیا اور اسے خرچ کیا اس شخص کو اس مال میں کوئی برکت حاصل نہیں ہوگی، اور اگر اس نے وہ حرام مال صدقہ کیا تو اس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا، اس سے جو مال بچ گیا وہ آگ میں لے جانے کا ذریعہ ہوگا۔ خبردار ناپاک لوگ ناپاک چیز کا انکار نہیں کرتے، لیکن پاک لوگ ناپاک (اور حرام) چیزوں کا انکار کرتے ہیں، یعنی ان سے اجتناب کرتے ہیں۔

(وضاحت حدیث از مراقۃ ج ۱ صفحہ نمبر ۱۰۹)

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ آية المنافق ثلاث زاد مسلم وان صام وصلى وزعم انه مسلم ثم اتفقا اذا حدث كذب واذا وعد اخلف واذا ائتمن خان .

(مشکوٰۃ باب علامات النفاق)

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں، مسلم میں یہ الفاظ زائد ہیں اگرچہ اس نے روزہ رکھا ہو اور نماز ادا کی ہو، یعنی وہ اپنے آپ کو مسلمان ہو۔۔۔ نے کا دعویٰ بھی کرے، پھر بخاری اور مسلم کے آگے الفاظ ایک ہی ہیں، جن کا مطلب یہ ہے جب کلام کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔

## وضاحت حدیث:

اس حدیث شریف میں پہلے اور آخری جملے بخاری اور مسلم کے اتفاقی ہیں درمیان میں الفاظ ”وان صام وصلى“ زائد ہیں۔

”آية المنافق“ کا مطلب یہ ہے کہ منافق کی علامت جو اس کی بری نیت اور فساد پر مبنی افعال پر دلالت کرتی ہے، وہ تین ہیں:

(اصل النفاق من يظهر خلاف ما يضمّر ثم غلب على من يظهر الاسلام ويبطن الكفر)

نفاق کا اصل میں معنی یہ ہے کہ جو وہ دل رکھتا ہے (فساد اور برے عقائد وغیرہ) ظاہر اعمال اس کے خلاف ہوں، یعنی ظاہری طور پر اس کے عمل بہتر ہوں اگرچہ ان میں پوشیدہ ہو، لیکن نفاق کا غالب استعمال اس میں ہو رہا ہے کہ اسلام کو ظاہر کرے اور کفر کو پوشیدہ رکھے۔



## دینی طلباء لرام کی توجہ کیلئے:

حدیث شریف میں بظاہر وہم ہوتا ہے کہ ”آیۃ“ مفرد ہے، اور ”ثلاث“ جمع پر دلالت کر رہا ہے تو ان دونوں میں مطابقت کیسے؟ ”نشانی منافقت کی تین ہیں“ کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ”آیۃ“ مفرد ذکر کر کے مراد جنس آیۃ لیا گیا ہے، اب معنی یہ ہوگا ”کل واحد منها آیۃ“ ہر ایک ان میں سے علامت ہے، اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے ”وان العلامة انما تحصل باجتماع الثلاث“ کہ تینوں مل کر علامت نفاق ہوں۔ پہلا معنی زیادہ معتبر ہے کہ ہر ایک ایک علیحدہ علیحدہ علامت ہے، اس معنی کو صحیح ابن عوانہ کی حدیث سے تائید حاصل ہے جس میں یوں ذکر ہے ”علامات المنافق ثلاث“ منافق کی علامتیں تین ہیں۔

**اعتراض:** حدیث پاک سے ظاہر طور پر یہ سمجھ آ رہا ہے کہ تین میں حصر پائی گئی ہے، یعنی منافقت کی تین علامتوں میں اسے بند کیا گیا ہے کہ کوئی چوتھی علامت نہیں، حالانکہ دوسری حدیث میں چار علامات کا ذکر کیا گیا ہے، تو ان میں کس طرح تطبیق دی جائے گی؟

**جواب:** مسلم شریف کی ایک روایت میں جو علماء بن عبد الرحمن نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی اس میں حصر نہیں پائی گئی، اس کے الفاظ یہ ہیں ”من علامة المنافق ثلاث“ منافق کی علامتوں میں سے تین علامتیں یہ ہیں الخ۔

”فيكون قد اخبر ببعض العلامات في وقت وبعضها في وقت آخر“

نبی کریم ﷺ نے کسی وقت میں منافقت کی بعض علامتوں کا ذکر فرمایا کہ اس وقت ان کے ذکر کی ہی ضرورت تھی، اور کسی دوسرے وقت میں دوسری علامات کو ضرورت کے پیش نظر بیان فرمادیا، لہذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔

مسلم شریف میں جو الفاظ زائد مذکور ہیں ”وان صام و صلی و زعم انه مسلم“ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز ادا کرے اور دعویٰ کرے کہ میں کامل مسلمان ہوں، پھر بھی اس میں تین خصلتیں اس کی منافقت پر دلالت کرتی ہیں۔

”زعم“ کا معنی ”ادعی“ کیا گیا، اور ”انه مسلم“ میں تنوین کو تعظیم کے لئے لیا گیا ہے اسی لئے اس کا معنی کیا گیا ہے ”انه مسلم ای کامل“ اب راقم کے ترجمہ کو دیکھیں ”اور دعویٰ کرے کہ میں کامل مسلمان ہوں“ تو مرقاة کے مطابق پائیں گے، اور طلباء کرام کو باخوبی علم ہے کہ کہیں غائب کے صیغوں سے مراد تکلم ہوتا ہے، اسی لئے راقم نے ترجمہ تکلم کا کیا ہے۔



(اذا حدث كذب) منافقت کی ایک علامت یہ ہے کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، ”وہو اقبیح الثلاثة“  
تین علامتوں میں سے بری علامت جھوٹ بولنا ہے۔

”واذا وعد اخلف“ (اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے) یہ منافقت کی دوسری علامت ہے، مستقبل  
میں اچھا کام کرنے کی خبر دینا ”وعد“ ہے۔ ”اذو وعد يغلب في الخير واو وعد في الشر“ ”وعد“ کا لفظ  
غالباً خیر کے لئے استعمال ہوتا، اور ”او وعد“ کا لفظ زیادہ طور پر شر کیلئے استعمال ہوتا ہے، یعنی دھمکی دینا اسے وعید کہا  
جاتا ہے، مہربانی کرنے کو وعد کہا جاتا ہے، اگرچہ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں ارشاد فرمایا ”الخلف في الوعد  
من مكارم الاخلاق“ وعید (دھمکی) کی مخالفت اچھے اخلاق کا اظہار ہے، یہ علامت نفاق نہیں۔ کسی شاعر نے کہا:  
”وانی اذا اوعدته او وعدته لمخلف ايعادی ومنجز موعدی“

بے شک میں جب کسی کو وعید کروں (دھمکی دوں) یا وعدہ کروں، تو وعید کی میں خلاف ورزی کر لیتا  
ہوں اور وعدہ پورا کرتا ہوں۔

لیکن راقم کا اس میں موقف یہ ہے کہ صراحتہ جھوٹ منع ہے خواہ وعد میں ہو یا وعید میں، بلکہ شروع میں ہی  
ایسے الفاظ کو شامل کیا جائے کہ بغیر جھوٹ کے وعید کو چھوڑ دے۔ جیسے ہم طلباء کو کہتے ہیں اگر تم نے مدرسہ سے بہت غیر  
حاضریاں کیں، اسباق یاد نہ کئے تو ہم تمہیں مدرسہ سے نکال دیں گے، تاہم ہماری طرف سے پوری کوشش ہوگی کہ ہم  
کوئی سخت قدم نہ اٹھائیں آپ کا نقصان نہ ہو، لیکن آپ بھی اپنے نفع و نقصان کو اپنے ذہنوں میں رکھتے ہوئے،  
اچھے اخلاق سے کام لیں۔ اس قسم کے جملوں سے ”وعید“ سے نکلنے کی پہلے ہی راہ رکھ دی گئی ہے۔

آہ! ہم کتنے بے قدر ہیں:

الخلف في الوعد (وعید کی خلاف ورزی) کا مسئلہ استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا غلام رسول رضوی  
رحمہ اللہ (شیخ الحدیث فیصل آباد) نے مقدمہ مسلم الثبوت سے عربی حاشیہ میں بہت خوبصورت انداز میں حل فرمایا ہے،  
آپ کا عربی حاشیہ مختصر لیکن جامع و مانع اور کتاب کو حل کرنے میں بہت آسان ہے، اس حاشیہ کو پڑھ کر بار بار دل سے  
دعاء نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے محشی کے مزار پر انوار پران گنت رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ تنظیم المدارس کے کورس سے مسلم الثبوت کو نکال دیا گیا ہے جس کی وجہ سے عظیم  
شخصیت کا عظیم کام بھی علماء کرام اور طلباء کرام کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ راقم بھی اہلسنت و جماعت کے طلباء کرام



کے فائدہ کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے، صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دنیاوی کاموں سے کھل اجتناب کرتے ہوئے حواشی تیار کر رہا ہے، تلخیص المفتاح، نور الایضاح، قدوری، کنز الدقائق کے عربی حواشی طبع ہو چکے ہیں، ہدایہ اولین کے حاشیہ کا کام جاری ہے، جزء اول ختم ہو چکی ہے، جزء ثانی کا حاشیہ ترتیب دے رہا ہوں، دعا ہے اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ کتب تنظیم المدارس میں جاری رہیں تاکہ طلباء کرام محشی کے لئے دعاء فرماتے رہیں۔ اگرچہ راقم کے اردو حواشی سراج الارواح، میزان الصرف، سراجی کے بھی طبع ہو چکے ہیں، لیکن اردو حواشی کوئی معیاری کام نہیں۔

**سوال :** جھوٹ بولنا اور وعدہ کے خلاف بظاہر ایک ہی صورت نظر آتی ہے، دونوں میں جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، پھر وعدہ کی خلاف ورزی کو علیحدہ ذکر کیوں کیا؟

**جواب :** "ان الاخلاف قد یكون بالفعل وهو غیر الکذب الذی هو لازم التحذیر و لیس فیہ ما یدل علی وجوب الوفاء بالوعدہ"

وعدہ کی خلاف ورزی کبھی فعل (عمل) سے بھی ہونی ہوتی ہے ضروری نہیں کہ زبان سے ہی وعدہ خلاف ہو، لیکن جھوٹ کا تعلق زبان سے ہے کیونکہ جھوٹی بات پر جھوٹ کا اطلاق ہے وعدہ کے خلاف فعل کو جھوٹ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ جھوٹ کے لئے ضروری نہیں اس سے پہلے وعدہ بھی پایا جائے، اور وعدہ خلافی میں یقیناً پہلے وعدہ پایا جاتا ہے۔ "واذا ائتمن خان" اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے وہ اس میں خیانت کرے، یعنی منافقت کی تیسری علامت امانت میں خیانت کرنا ہے۔

"و حق الامانة ان تؤدی الی اهلها فالخیانة مخالفة لها"

امانت کا حق یہ ہے کہ حقدار کو وہ ادا کر دی جائے، حقدار کو امانت نہ دینا، امانت میں خیانت کرنا ہے جو علامت منافقت ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

"ائتمن" باب ائتمن ہے اور ماضی مجہول ہے، بعض روایات "اتمن" بھی آیا ہوا ہے۔ جو اصل میں "ائتمن" ہی ہے، ہمزہ کو واؤ بنایا گیا، اور واؤ کو تاء سے بدلا گیا اور تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا "اتمن" میں تاء مشدد ہے۔

**سوال :** "فان قبل هذا الحدیث مشکل من حیث ان هذه الخصال قد تو جد فی المسلم المجمع علی عدم الحکم بکفره"



یہاں سوال یہ ہے کہ یہ حدیث بظاہر مشکل نظر آتی ہے کہ جن تین خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کبھی مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں، حالانکہ اجماع امت اس پر ہے کہ مسلمان میں اگر یہ عیوب پائے جائیں تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔

**جواب:** ”قلنا اللام فی المنافق اما لکن للجنس فهو اما علی التشبیه لنفاق العمل الذی لا ینافی الاسلام او ان المراد الا عتیاد“

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ”آیۃ المنافق“ میں المنافق پر الف لام جنسی ہے، اور یہ بیان کیا گیا ہے، کہ یہ علامتیں جس میں پائی جائیں گی وہ منافق کے مشابہ ہے، نفاق عملی اعلام کے منافی نہیں، کیونکہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے، البتہ نفاق قلبی، اعتقادی ایمان کے منافی ہے، کیونکہ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں، یعنی جس کا عقیدہ بھی منافقوں والا ہو وہ حقیقی منافق ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ان خصلتوں کو عادت بنا لے، اور ان پر بار بار عمل کرے، جب ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا تو ان کو جائز سمجھنے لگے گا، جب جائز سمجھے گا تو کافر ہو جائے گا، اب اس پر حقیقی منافقت کا اطلاق بھی جائز ہو جائے گا

(وضاحت حدیث از مرقاۃ ج ۱ صفحہ ۱۲۶)

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ اربع من کن فیہ منافقا خالصا ومن کانت فیہ خصلۃ منہن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاہد غدر واذا خاصم فجر“ (رواہ البخاری و مسلم مشکوٰۃ باب علامات النفاق)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار (خصلتیں) جس میں پائی جائیں وہ شخص خالص منافق ہے، جس میں ایک خصلت پائی جائے اس میں منافقت پائی گئی یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے (وہ چار یہ ہیں) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اسے توڑ دے، اور جب جھگڑا کرے تو فجور سے کام لے (یعنی گالی نکالے)

### وضاحت حدیث:

دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ منافقت کی علامتیں پانچ ہیں اس لئے کہ ”واذا عاہد غدر“ کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک معنی ”نقض العهد ابتداء“ ابتدائی طور پر ہی وعدہ کو توڑ دے اور دوسرا معنی علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے ”اذا خالف ترک الوفاء“ جب قسم اٹھالے تو اسے پورا نہ کرے۔



راقم کے نزدیک ”واذا وعد اخلف“ عام ہے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے یہ ہر قسم کے وعدہ کو شامل ہے، اور ”واذا عاهد غدر“ خاص ہو جائے کیونکہ ”غدر“ کا اطلاق زیادہ طور پر جنگی وعدہ کو توڑنے پر بولا جاتا ہے، کہ جب جنگ میں وعدہ کرے کہ ہم تم پر حملہ نہیں کریں گے تو پھر حملہ کر دے وعدہ توڑ دے تو یہ علامت منافقت ہے۔

حدیث شریف میں جو یہ ذکر ہے کہ جن میں ایک خصلت پائی گئی تو وہ منافقت کی خصلت ہوگی اس کی وضاحت تو پہلے جن دو حدیثوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے سمجھ آگئی۔ البتہ آپ کا ارشاد ”اربع من کن فیہ منافقا خالصا“ جس میں چار خصلتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اس میں مشکل یہ درپیش آرہی ہے کہ چار عیوب جب پائے جائیں تو پھر بھی وہ گنہگار ہوگا، کافر نہیں ہوگا، آپ کے ارشاد گرامی میں ”خالص منافق ہونے کا“ کیا مطلب ہے؟ اس کے چند جواب دئے گئے ہیں کہ یہ حدیث ظاہر پر مبنی نہیں، بلکہ اس کی تاویلات پائی گئی ہیں۔ اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے۔

”من اجتمعت فیہ هذه الخصال واستمرت فبالحرى ان يكون منافقا“

جس شخص میں یہ چار خصلتیں پائی جائیں اور وہ ان پر قائم رہے اور ان کی عادت بنالے تو لائق یہ ہے کہ وہ خالص منافق ہو جائے، کیونکہ ہمیشہ کی عادت ان افعال کے جواز کی طرف پہنچا دے گی جو یقیناً کفر ہے، دعویٰ ایمان کا اور حرام کاموں جائز سمجھنا خالص منافقت ہی ہے۔

”وقيل يحتمل ان يكون المراد كالمنافق بحذف اداة التشبيه مثل زيد اسد“

اور دوسرا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں حرف تشبیہ محذوف ہے، یعنی حدیث شریف معنوی لحاظ پر اس طرح ہوگی ”اربع من کن فیہ کان كالمنافق الخالص“ جس میں چار خصلتیں پائی گئی وہ خالص منافق کی طرح ہے، طلباء کرام سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ حرف تشبیہ عام طور پر محذوف ہوتا رہتا ہے، عام محاورہ عرب میں ”زيد اسد“ استعمال ہوتا ہے، جس کا معنی ہوتا ہے ”زيد کا الاسد“ زید شیر کی طرح ہے، یہ معنی نہیں کہ زید حقیقی طور پر شیر ہے۔

ويحتمل ان يكون هذا مختصا باهل زمانه فانه عليه الصلوة والسلام عرف بنور

الوحي بواطن احوالهم وميز بين من آمن به صدقا ومن اذعن له نفاقا“

اور تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے زمانہ کے چند لوگوں کا تذکرہ کیا ہو اور آپ کو نور وحی سے ان کے باطن احوال پر مطلع فرما دیا گیا، جن کے اعتقادات سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا، آپ کو معلوم تھا کہ سچے



مسلمان کون ہیں، اور خالص منافق کون ہیں، آپ نے ان کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا، البتہ خالص منافقوں کے نام ذکر نہیں فرمائے کہ ہو سکتا ہے کہ تو بہ کر لیں، ان کو لوگوں کے سامنے رسوا نہ کیا جائے۔

”ولان ترک التصریح اوقع فی النصیحة وادل علی الشفقة واجلب علی الدعوة الی الایمان وابعد عن النفور والمخاصمة والالتحاق بالمخالفین“

صراحتہً (واضح طور پر) کسی کی برائی کا نہ ذکر کرنا نصیحت کے لئے بہت نفع مند ہے، اور شفقت پر دلالت کرتا ہے، اور ایمان کی دعوت کی طرف کھینچنے میں مفید ہے، اور کسی کو نفرت دلانے اور جھگڑا پیدا کرنے سے یہ طریقہ دور ہے، اور مخالفین کو اپنے ساتھ ملانے میں فائدہ مند ہے، ”واذا خاصم فجر“ کا وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے، ایک معنی تو ذکر کر دیا گیا ہے ”واذا خاصم فجر ای شتم“ اور جب جھگڑا کرے تو گالی دے لیکن ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے ”ورمی بالاشیاء القبیحة“ اور بری چیزوں کو کسی طرف منسوب کرنا، یعنی کسی کو ناحق طور پر بری تہمت لگانا، کسی کی طرف برائی کو منسوب کرنا، کسی پر بدگمانی کرنا، اور کسی کی غیبت کرنا وغیرہ سب کو یہ شامل ہے، یعنی یہ سب چیزیں منافقت کی علامت ہیں، آپ کا یہ ارشاد ”جوامع الکلم“ صفت میں آتا ہے کہ الفاظ مختصر ہوں اور مطالب زیادہ ہوں۔ (وضاحت حدیث ماخوذ از کبیر مرقاة ج نمبر ۱۲۸ ص ۱۲۸)

**فائدہ جلیلہ :** حضرت یوسف علیہ السلام کی بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اپنے باپ سے جھوٹ بولا، وعدہ خلافی کی لیکن یہ گناہ کے کام تھے، کفر نہیں، وہ چونکہ نبی نہیں تھے اسلئے ان سے گناہ سرزد ہونا ممکن تھا، اسی لئے انہوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا:

(سورہ یوسف، آیہ نمبر ۹۷)

﴿قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ﴾

بولے اے ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی معافی مانگئے بے شک ہم خطاوار ہیں۔

”ان الانبیاء معصومون قبل النبوة وبعدها عن کبائر الذنوب وصغائرہا ولوسہوا

علی ما هو الحق عند المحققین“ (ماخوذ از مرقاة ج نمبر ۱ ص ۱۲۷)

البتہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد چھوٹے اور بڑے گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں ان سے بھول کر بھی کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، محققین کا یہی مذہب ہے۔

نجوم الفرقان کے دوسرے حصہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر میں تفصیل دیکھئے۔

عن ابن عمر ان النبی ﷺ قال ان اللہ عزوجل اذا اراد ان یهلك عبدانزع منه الحیاء فاذا نزع منه الحیاء لم تلقہ الامقیة اما فاذالم تلقہ الامقیة امتانزع منہ



الامانة فاذا نزعته منه الامانة لم تلقه الا خائنا مخونا فاذا لم تلقه الا خائنا مخونا نزعته منه الرحمة فاذا نزعته منه الرحمة لم تلقه الا رجيمًا ملعونًا فاذا لم تلقه الا رجيمًا ملعونًا نزعته منه ربة الاسلام“  
(رواه ابن ماجه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تحقیق اللہ تعالیٰ جب کسی کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیاء کو دور کر دیتا ہے، جب حیاء کو اس سے نکال دیا گیا تو تم اس کو نہیں پاؤ گے سوائے اس کے کہ وہ شدید قابل نفرت ہوگا، جب تم نے اسے نہ پایا سوائے شدید قابل نفرت کے تو اس سے امانت کو ہٹا دیا گیا، جس سے امانت کو ہٹا دیا گیا تو اسے نہیں پاؤ گے سوائے خائن ہونے کے اور خیانت میں شدید طور پر اسے مبتلا پاؤ گے، جب تم کسی کو نہ پاؤ سوائے شدید خائن ہونے کے تو اس سے رحمت کو دور کر دیا گیا، جس سے رحمت کو دور کر دیا گیا اسے تم نہیں پاؤ گے سوائے راندے ہوئے لعنت کے مرتکب کے، جس کو تم نہ پاؤ سوائے راندے ہوئے ملعون کے اس (کی گردن) سے اسلام کا ڈورا (دھاگہ) اتار دیا گیا ہے۔  
(منقول از قرطبی)

حدیث شریف کے ترجمہ سے واضح ہو گیا کہ جسے حیاء حاصل نہ ہو وہ قابل نفرت ہے، ہاں محبوب وہی جسے حیاء حاصل ہو، جو شخص قابل نفرت ہو وہ امین نہیں ہوگا بلکہ خیانت کرنے والا ہوگا، یعنی امین وہی ہوگا جو قابل محبت ہوگا، خیانت کرنے والا رحمت سے دور ہوگا، جسے رحمت ہی حاصل نہ ہو یقیناً رحمت سے دور قابل لعنت اور دربار خداوندی سے ہانکا ہوا ہوگا، ایسا شخص گویا کہ اسلام سے بہت دور ہوگا۔

### ودیعت اور امانت میں فرق:

”الوديعة خاصة والامانة عامة فان الوديعة هي المستحفظ قصدًا والامانة هي الشيء الذي وقع في يده وان من غير قصد بان هبت الريح والقت ثوب انسان في حجر انسان“  
ودیعت خاص ہے کیونکہ وديعت میں خود اپنے ارادے سے کسی سے حفاظت طلب کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ مال تم اپنی حفاظت میں رکھ لو، امانت عام ہے کیونکہ کسی شخص کا مال دوسرے کے ہاتھ میں آجائے تو وہ امانت ہی کہلائے گا جیسا کہ ہوائے کوئی کپڑا اڑا کر کسی دوسرے کے پاس پہنچا دیا ہو۔

اسی طرح کسی سے کوئی چیز نفع اٹھانے کے لئے عاریۃ (مانگ کر) لی، وہ بھی امانت کے درجہ میں ہی ہے، اس کی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ہر وديعت کو امانت ضرور کہہ لیا جائے گا، لیکن ہر امانت وديعت نہیں، دینی مدارس کے طلباء کرام اپنی اصطلاح میں کہیں گے کہ وديعت اور امانت میں نسبت عموم و خصوص مطلق کی پائی گئی ہے۔



## ودیعت کے متعلق چند ضروری مسائل:

الودیعة امانة فی ید المودع اذا هلكت بضمنها

جس کے پاس حفاظت کے لئے مال رکھا جائے اس کے پاس وہ مال امانت ہوتا ہے، امانت خود بخود ہلاک ہو جائے تو اس شخص پر کوئی ضمان لازم نہیں۔ جیسا کہ مکان گر گیا، مکان کو آگ لگ گئی، چوروں، ڈاکوؤں نے مال لے لیا، ان تمام صورتوں میں (مودع) جس کے پاس امانت رکھا گیا اس پر کوئی ضمان لازم نہیں ہے۔

”لقوله ليس على المستعير غير المغل ضمان ولا على المستودع غير المغل ضمان“

اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”جس نے عاریۃ گوئی چیز لی اس پر کوئی ضمان لازم نہیں سوائے اس کے کہ اس نے کوئی خیانت کی، اور جس کے پاس امانت رکھی گئی اس پر کوئی ضمان لازم نہیں سوائے خیانت کرنے کے، یعنی نفع اٹھانے کیلئے مانگ کر لے جانے والا، یا امین اگر خیانت کر لیس تو ان پر ضمان لازم نہیں۔ (ہدایۃ کتاب الودیعة)

## دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حدیث شریف میں جو لفظ ”مغل“ استعمال ہے یہ اغلال سے لیا ہوا ہے، ”اغلال“ ہر قسم کی خیانت پر بولا جاتا ہے، لیکن ”غلول“ صرف مال غنیمت کی خیانت پر بولا جاتا ہے۔ اور دوسری توجہ اس طرف کر لیں کہ حدیث شریف پر اعتراض کیا گیا ہے یہ حدیث مرفوع نہیں، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے ”واجب بانہ مسند عن عبداللہ بن عمر عن النبی ﷺ“ کہ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مسند ثابت ہے۔ (العناية)

## ضمان لازم نہ ہونے پر عقلی دلیل:

چونکہ لوگ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں اپنا مال کسی کے پاس بطور امانت رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، اگر مال کے خود ہلاک ہو جانے پر ضمان لازم آئے تو کوئی شخص اپنے پاس کسی کی امانت رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، اسی طرح لوگوں کے فائدہ والے کام معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ (ہدایۃ)

## امانت کی حفاظت کون کون کر سکتے ہیں؟

جس شخص کے پاس مال بطور امانت رکھا گیا ہے وہ خود اس مال کی حفاظت کرے یا اس کی زوجہ، یا اس کے عیال



حفاظت کریں تو مال ہلاک ہو جائے تو کوئی ضمان لازم نہیں آئے گی، اس لئے کے ان کو حفاظت کا حق حاصل ہے۔ عیال میں اسی کی زوجہ، اس کی اولاد، اس کے والدین اور اس کے گھر میں رہنے والا خادم جو ماہانہ تنخواہ لیتا ہو، یا سال بعد ایک مرتبہ ہی سال کی تنخواہ لیتا ہو، وہ خادم عیال میں داخل نہیں جو یومیہ (ہردن کی) مزدوری لے لیتا ہے، اسی طرح شاگرد جو اپنے پاس رہیں اور ان پر اعتماد کیا جائے وہ بھی عیال میں داخل ہوتا ہے، قیمتی اشیاء کے سنور کی چابیاں اسے ہی دے دی جاتی ہیں جس پر اعتماد ہو، اگر والدین یا اولاد کا خرچ تو اس کے ذمہ لازم ہے لیکن وہ اس کے گھر نہیں رہتے تو ان کو امانت والے مال کی حفاظت کا حق حاصل نہیں، کیونکہ مال امانت رکھنے والے نے اس شخص اور اس کے گھر پر اعتماد کیا ہے، اور اگر بڑا بیٹا یا بڑی بیٹی باپ کے گھر میں رہتے ہوں، ان کا خرچ باپ پر لازم نہیں، بلکہ وہ اپنا علیحدہ خرچ کرتے ہیں تو وہ بھی عیال میں داخل ہیں، ان کو بھی باپ کے پاس رکھی ہوئی امانت کا حق حاصل ہے۔ (ہدایہ، کفایہ)

**تنبیہ :** عیال کو امانت کی حفاظت کرنے کا حق اسی وقت دیا جاسکے گا جب غالب گمان یہ ہو کہ یہ خیانت کرنے والے نہیں ”فان علم ذلک وحفظ بہم ضمن“ اگر اس شخص کو معلوم ہو کہ میرے گھر کے افراد تو مال میں خیانت کر لیتے ہیں تو پھر بھی ان سے حفاظت کراتا ہے تو مال کے نقصان اسے ضمان دینا لازم آئے گا۔ (عنایہ)

**فائدہ :** اگر ایک شخص نے کسی کا مال اپنے گھر بطور امانت رکھا ہوا ہے، اس گھر کو آگ لگ گئی تو اس نے مال پڑوسی کو دے دیا یا اس نے حفاظت والا مال اپنے پاس کشتی میں رکھا ہوا تھا اسے کشتی کے غرق ہونے کا خطرہ ہوا اس نے مال ساتھ دوسری کشتی میں کسی کو دے دیا، وہ مال دوسرے شخص کے پاس ہلاک ہو جائے، اور اس کے پاس دو گواہ بھی ہوں کہ اس نے مال ہلاکت سے بچانے کیلئے دوسرے کو دیا تھا تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔ (ہدایہ)

اگر گواہ نہ ہوں تو ضمان لازم آئے گی تاکہ لوگ بغیر کسی ثبوت کے جھوٹے دعوے نہ کر سکیں۔

**مسئلہ ۱:** اگر امانت رکھنے والے نے اپنا مال طلب کیا تو امین نے اسے مال نہیں دیا، حالانکہ وہ مال دینے پر قادر بھی تھا تو اس صورت میں اگر مال ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم آئے گی، کیونکہ اس نے مال کو اپنے پاس روک کر حد سے تجاوز کیا۔ (ہدایہ)

**مسئلہ ۲:** اگر امین نے امانت والے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیا جسے جدا کرنا مشکل ہو گیا جیسا کہ گندم کے ساتھ گندم کو ملا لیا، جو کے ساتھ جو کو ملا لیا تو اس صورت میں ضمان لازم آئے گی، اگر مال خود مل گیا کہ بوریاں پھٹ گئیں اور امین کے دانے اور نس نے امانت رکھی اس کے دانے آپس میں مل گئے تو یہ دونوں اس غلہ میں شریک ہوں گے۔ (ہدایہ)



**مسئلہ ۳:** اگر امین امانت والے مال سے کچھ خرچ کر لیا، پھر اتنا ہی مال اس میں لوٹا دیا، اگر مال ہلاک ہو گیا تو تمام مال کی ضمان اس پر لازم آئے گی، اس لئے کہ غیر کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر یہ تجاوز کرنے والا بن گیا، گویا کہ اس نے مال خود ہلاک کیا، لہذا ضمان لازم ہے۔ (ہدایہ)

**مسئلہ ۴:** اگر کسی شخص کے پاس سواری امانت رکھی گئی وہ اس پر سوار ہو گیا، یا کپڑا رکھا گیا اس نے وہ پہن لیا، یا غلام رکھا گیا تو اس نے اس سے خدمت لے لی، یا ان چیزوں کو کسی دوسرے کے پاس امانت رکھ دیا، اگر ان چیزوں میں کوئی نقصان نہیں تو ضمان لازم نہیں آئے گا، اگرچہ امانت میں مال دار کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کی وجہ سے وہ شخص گنہگار ہوا۔ اور اگر ان تصرفات سے مال میں نقصان لازم آیا تو ضمان لازم آئے گی، کیونکہ اس نے تجاوز کیا ہے۔ (ہدایہ و عینی)

**مسئلہ ۵:** اگر امین شخص امانت والے مال کو حفاظت کیلئے سفر میں اپنے ساتھ رکھے تو وہ مال ہلاک ہو جائے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر ضمان لازم نہیں کیونکہ اسے یہ حق تھا کہ جس طرح بھی حفاظت کر سکے حفاظت کرے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ سفر میں خطرات ہوتے ہیں اس لئے امانت والا مال سفر میں ساتھ نہ لے جائے، مال کو ساتھ لے جانے پر مال کے ہلاک ہونے پر ضمان لازم آئے گی، اصل میں یہ اختلاف، اختلاف زمان کی وجہ سے تھا، امام صاحب رحمہ اللہ کے وقت سفر میں وہ خطرات نہیں تھے جو صاحبین کے زمانہ میں تھے۔ (ہدایہ مع حاشیہ)

راقم کے نزدیک آجکل کے دور میں امانت والے مال کو سفر میں ساتھ رکھنا ممکن نہیں، آجکل جب گھر میں امانت رکھنے کے لئے کوئی تیار نہیں کہ ڈاکو امانت کے ساتھ ساتھ ہمارا مال بھی لوٹ کر لے جائیں گے، تو سفر میں تو مال کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ہاں یہ خیال رہے کہ اگر مال دار نے سفر میں مال کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا، امین پھر بھی ساتھ لے گیا مال کے ہلاک ہونے پر بالاتفاق اس پر ضمان لازم آئے گی۔ (ہدایہ)

**مسئلہ ۶:** جب دو آدمی مل کر کسی کے پاس کوئی چیز بطور ودیعت (امانت) رکھیں، تو پھر ان میں سے، ایک شخص آئے اور مطالبہ کرے کہ ہماری امانت واپس کر دو، تو وہ امانت واپس نہ کی جائے جب تک کہ دونوں مل کر نہ آئیں۔ یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے، اسی پر فتویٰ ہے، اس لئے کہ اگر تمام مال واپس لوٹائے گا تو دوسرے کا مال اس مطالبہ کرنے والے کو دینا لازم آئے گا جو جائز نہیں، اور اگر اس کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا گیا تو پھر بھی درست نہیں، کیونکہ امین کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ دو شخصوں کی مشترک چیز ان دونوں میں سے کسی ایک غائب ہونے پر تقسیم کر دے۔ (ماخوذ از ہدایہ)



استاذی المکرم مولانا غلام یوسف گجراتی رحمہ اللہ جن سے راقم نے ابتدائی صرف کی کتب پڑھیں، انہوں نے صبح کی نماز کے بعد درس قرآن پاک میں ایک مرتبہ امام شافعی رحمہ اللہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دو شخص ان کی والدہ کے پاس کوئی چیز امانت رکھ گئے، اور ساتھ ہی یہ کہہ گئے کہ جب تک ہم دونوں نہ آئیں تو یہ چیز واپس نہیں کرنی۔ چند دنوں بعد ان میں سے ایک آیا تو اس کے مطالبہ کرنے پر آپ کی والدہ نے وہ چیز اسے واپس کر دی، ایک دو دنوں کے بعد دوسرا شخص آیا کہ ہماری امانت ہمیں واپس کرو، تو امام شافعی رحمہ اللہ کی والدہ نے کہا کہ تمہارا دوسرا ساتھی امانت لے گیا ہے، اس نے جھگڑا شروع کر دیا تو وہ بہت پریشان ہوئیں، امام شافعی اس وقت نابالغ بچے تھے لیکن بہت زیادہ ذہین تھے، انہوں نے والدہ کی پریشانی کو دیکھ کر کہا، اے اماں جی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس شخص کو کہو تم اکیلے کیوں آ گئے ہو، اپنے دوسرے ساتھی کو بھی ساتھ لاؤ تا کہ تمہاری امانت تمہیں واپس کی جائے، یہ کہنے پر وہ واپس چلا گیا، پھر لوٹ کر نہیں آیا۔

**مسئلہ ۴:** ”وفی الجامع الصغير اذا نهاه ان يدفع الى احد من عياله فدفعها الى من لا بد منه لا يضمن“  
جامع صغیر میں یہ مذکور ہے اگر کسی شخص نے مال امانت رکھا اور امین کو منع کیا کہ یہ میری امانت میرے اہل و عیال کو نہیں دینی، تو امین نے اس کی زوجہ کو دے دی تو ضمان لازم نہیں آئے گی، کیونکہ عیال میں بعض وہ افراد ہوتے ہیں جن سے چھٹکارا نہیں ہوتا، زوجہ بھی ان میں سے ہی ہے، لیکن زوجہ کو مال دینے پر اسی وقت ضمان لازم نہیں آئے گی جب وہ امانت میں خیانت کرنے میں مشہور نہ ہو۔

”وان كان له منه بد ضمن لان الشرط مفيد فان من العيال من لا يؤتمن على المال“

اگر عیال میں وہ اشخاص ہوں جن کو مال دینا کوئی ضروری نہ ہو جیسے بڑی اولاد ہے تو ان کو امانت نہ لوٹائی جائے کیونکہ عیال میں بعض وہ افراد ہوتے ہیں جن کو مال دینے میں اعتماد نہیں کیا جاتا، اس لئے اس کا یہ شرط لگانا کہ میرے عیال کو میری امانت نہ لوٹانا ان کے حق میں مفید ہے، کیونکہ امانت میں خیانت کرنے میں جو مشہور ہوں ان کو مال لوٹانا ضمان کا سبب ہوگا۔

(ماخوذ از ہدایہ)





بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ (آیہ نمبر ۷۶)

(۱) ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا عہد پورا کیا اور پرہیزگاری کی اور بے شک پرہیزگار اللہ کو خوش آتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) کیوں نہیں، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا بیشک اللہ پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو۔ (نجوم الفرقان)

﴿بَلَىٰ﴾ ”کیوں نہیں!“

اثبات لما نفوه ای بلی علیہم فیہم سبیل“ جب یہود نصاریٰ نے کہا ”لیس علینا فی الامین“ نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ (یعنی پکڑ کی راہ) تو رب تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا، ارشاد فرمایا ”بلی“ یہ ایک لفظ ان کے نفی جملہ کو رد کر کے حکم کو ثابت کر رہا ہے، اب صرف ایک لفظ کا مطلب یوں ہوگا کیوں نہیں ان پر ان پڑھوں کے معاملہ میں پکڑ کی راہ ضرور پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

سبحان اللہ! قرآن پاک کی فصاحت کیا ہی خوب ہے کہ بظاہر ایک لفظ نظر آتا ہے، لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہے۔ خیال رہے کہ تفسیر ابی السعود سے جو قول لیا گیا ہے وہ زجاج نحوی کا ہے، اس قول کے مطابق ”بلی“ پر وقف تام ہے، اور اس کے بعد جملہ استثنائیہ ہے ”اس قول کے مطابق مکمل آیت کریمہ کا یوں مطلب ہو گیا، ہاں کیوں نہیں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو عرب لوگوں کے مال کھانے پر پکڑ ہوگی جن کو یہ ان پڑھ کہتے تھے، اور ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ ہمیں ان کے معاملہ میں کوئی پکڑ نہیں۔ (بات یہاں ختم ہوگئی آگے نئی بات شروع ہے) کہ جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا (وہی اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے ہی محبت کرتا ہے۔

”والثانی ان کلمۃ (بلی) کلمۃ تذکر ابتداء الکلام آخریدہ کربعدہ وذلک لان قولہم لیس علینا فیما نفعل جناح قائم مقام قولہم نحن احباء اللہ تعالیٰ ان اهل الوفاء بالتهد واتقى هم الذين يحبهم اللہ تعالیٰ لا غیرہم، وعلى هذا الوجه فانه لا يحسن الوقف على (بلی)“

اور دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ لفظ ”بلی“ کبھی ابتداء کلام میں آتا ہے، اس کے بعد والا جملہ اسی پر مرتب ہوتا ہے، اس قول کے مطابق، ان کا یہ کہنا ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأَمِينِ سَبِيلُ﴾ (نہیں ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی راہ گرفت) کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو بھی کرتے رہیں ہم پر کوئی بھی گناہ نہیں، یہ جملہ معنوی اعتبار سے ان کے اس قول



کے مطابق ہے ”نحن احباء الله و ابناءه و ه“ ہم اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دعویٰ کو باطل اور جھوٹا ظاہر کرنے کیلئے ارشاد فرمایا ﴿بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾

اب اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ ان کا قول درست نہیں بلکہ وعدہ کی وفاء کرنے والے اور تقویٰ اختیار کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے، ان کے بغیر کسی اور سے محبت نہیں کرتا، اس قول کے مطابق لفظ ”بلی“ پر وقف نہیں ہوگا، اس قول کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا ایسا نہیں، بلکہ وہ جس نے وفاء کی عہد کی اور پرہیزگاری کی (وہی اللہ کے محبوب ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

حروف ایجاب چھ ہیں، نَعَمْ، بَلَىٰ، إِي، أَجَلٌ، جَيِّدٌ، اور ”إِنْ“ نعم اور بلی، میں ابن حاجب رحمہ اللہ نے کافیہ میں بیان کیا ”فنعم مقررۃ لما سبقها و بلی مختصة بإيجاب النفي“ ”نعم“ ماقبل مضمون کی تقریر کے لئے آتا ہے، اور ”بلی“ نفی کے ایجاب کے لئے خاص ہے، اس کی وضاحت میں علامہ جامی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

(فنعم مقررۃ لما سبقها) ای محققۃ لمضمونه استفهاما كان او خبرا فہی فی جواب اقام زید بمعنی قام زید وفی جواب الم یقم زید بمعنی لم یقم زید، و بلی فی جواب الم یقم زید بمعنی قام زید، فمعنی بلی فی جواب (الست بربکم) انت ربنا، ولو قيل فی موضع بلی مہنا نعم لكان کفرا فان معناه حينئذ لست بربنا“

”نعم“ ماقبل مضمون کی توثیق کرتا ہے، خواہ استفہام ہو، خواہ خبر ہو، اگر پہلے کلام مثبت ہو تو مثبت کی توثیق کرتا ہے، جیسا کہ کوئی پوچھے ”اقام زید“ (کیا زید کھڑا ہے) تو جواب میں ”نعم“ کہا جائے تو معنی ہوگا ”قام زید“ ہاں (زید کھڑا ہے) اور اگر کوئی پوچھے ”الم یقم زید“ (کیا زید نہیں کھڑا؟) تو جواب میں ”نعم“ (ہاں) تو اس مقام پر نفی کی توثیق ہے، یعنی جواب یہ ہوگا ”لم یقم زید“ ہاں (زید نہیں کھڑا) اگر ”الم یقم زید“ (کیا زید نہیں کھڑا) کے جواب میں ”بلی“ آجائے تو معنی یہ ہوگا ”قام زید“ کیوں نہیں بلکہ زید کھڑا ہے۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے یوم میثاق کو جب اولاد آدم علیہ السلام سے پوچھا ”الست بربکم“ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ تو جواب میں ”قالو بلی“ انہوں نے کہا کیوں نہیں، یعنی تو ہمارا رب ہے۔ اس مقام پر اگر جواب میں ”نعم“ بولا جائے تو کفر لازم آئے گا کیونکہ وہ توفیق کی نفی سے توثیق کیلئے آتا ہے، اس صورت میں، یعنی جواب میں ”نعم“ بولنے سے



معاذ اللہ معنی یہ ہو جاتا ہاں (تو ہمارا رب نہیں) تو اس سے کفر لازم آتا۔

البتہ یہ خیال رہے کہ کبھی عرف میں ”نعم“ بلی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن عرف قانون نہیں بلکہ مختلف علاقہ جات کے مختلف عرف ہوتے ہیں، بعض علاقوں میں اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ کوئی کہے:

”یا زید ایس لی علیک الف درہم وقال زید نعم یكون اقراراً وتقوم مقام بلی لتقریر الالبات بعد النفی“

اے زید کیا میرے تجھ پر ہزار درہم نہیں؟ تو زید اس کے جواب میں کہے ”نعم“ تو یہ بعض علاقوں کے عرف کے مطابق اقرار ہو جائے گا کہ ہاں مجھ پر تمہارے ہزار درہم ہیں، اس صورت میں، نعم، بلی کے معنی میں استعمال ہوگا۔

(ماخوذ از شرح جامی، بحث الحروف صفحہ نمبر ۳۶۱)

**طلبہ کرام** ایہ بحث طویل اس لئے ذکر کی کہ راقم کو تفسیر نعیمی کی یہ بحث سمجھ نہیں کہ اس میں سہو ہے یا کہ نحو کی کسی اور کتاب سے آپ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے، قبلہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا بلی، نعم، اور ای، جیسے سب جواب کے حروف ہیں، بمعنی ہاں، مگر فرق یہ کہ ”نعم“ نفی کے اثبات کے لئے آتا ہے، بلی منفی کے اثبات کیلئے (راقم کو سہو ہی نظر آتا ہے)

## عظمت قرآن پر جان قربان:

قرآن پاک کی فصاحت کو بیان کرنا بھی میرے جیسے ہچمدان کیلئے تو ممکن ہی نہیں، البتہ علماء کرام کے بیان سے نقل کر کے طلباء کرام کو کچھ فائدہ پہنچا دیتا ہوں علامہ رازی رحمہ اللہ کیا خوب بیان فرماتے ہیں۔

”واعلم ان هذا الآية دالة على تعظيم امر الوفاء بالعهد وذلك لان الطاعات محصورة في امرين التعظيم لامر الله، والشفقة على خلق الله فالوفاء بالعهد مشتمل عليهما معا، لان ذلك سبب لمنفعة الخلق فهو شفقة على خلق الله ولما امر الله به كان الوفاء به تعظيماً لامر الله فثبت ان هذه العبارة مشتملة على جميع انواع الطاعات والوفاء بالعهد كما يمكن في حق الغير يمكن ايضاً في حق النفس لان الوافي بعهد النفس هو الاتي بالطاعات والتارك للمحرمات لان عند ذلك تفوذا النفس بالثواب عن العقاب“

اس آیت کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا اور وعدہ کے امر کو معظم سمجھنا ضروری ہے، اس لئے کہ طاعات کو دو چیزوں میں منحصر کر دیا گیا۔

- (۱) اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم، یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کو معظم سمجھنا۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کرنا۔



”من اوفی بعہدہ“ ان دو چیزوں کو شامل ہے، اسلئے کہ وعدہ کو پورا کرنا مخلوق کے نفع کا سبب ہے، تو واضح ہوا کہ وعدہ کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کا ذریعہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جب وعدہ پورا کرنے حکم دیا ہے تو وعدہ کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم بھی پائی جائے گی۔

واضح ہوا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں ”بلسی من اوفی بعہدہ“ بہت مختصر الفاظ مبارکہ ہیں، لیکن فصاحت و بلاغت کے لحاظ پر بہت عظیم کلام ہے، جو کہ تمام طاعات پر مشتمل ہے، آیہ کریمہ سے اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس طرح اور لوگوں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا لازم ہے، اسی طرح اپنے آپ سے کئے گئے وعدے پورے کرنے بھی لازم ہیں، انسان نے اپنے نفس سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ طاعات کو لائے گا، اور حرام کاموں کو چھوڑ دے گا، لہذا جب اپنے نفس سے کئے گئے ان دعووں کو پورا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اسے ثواب عطا فرمائے گا، اور عذاب سے بچائے گا۔ (کبیر)

صرف لفظ ”بلسی“ سے یہود کے من گھڑت اقوال کو رد کر دیا گیا کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم عرب لوگوں کا جو مال ہڑپ کرتے رہیں ہمیں کوئی گرفت نہیں، یہ باطل ہے، یعنی انہوں نے جب یہ کہا کہ ہمیں کوئی مواخذہ (پکڑ) نہیں، ہم جو بھی کرتے رہیں، تو رب تعالیٰ نے ہمیں کوئی عذاب نہیں دینا، تو ان کے رد میں صرف لفظ ”بلسی“ ذکر فرما دیا، کیون نہیں؟ یعنی تمہیں رب تعالیٰ نے اپنی گرفت میں تو لینا ہی ہے۔

یہود کے من گھڑت اقوال کی ایک جھلک دیکھئے، تفہیم میں بیان کیا گیا ہے ”تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیل کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیل کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان ہی چیز رکھ لینی چاہیے۔

ربی اشاعیل کہتا ہے کہ اگر امی اور اسرائیل کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہے تو اس کے مطابق جتوائے، اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے، اور اگر امیوں کے قانون کے تحت جتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے، اور دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے، ربی شموئل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(قالمودک مسلینی، پال آئزک ہرشون، لندن ۱۸۸۵ء، صفحات ۲۱۰، ۲۲۱)

آج تک یہود و نصاریٰ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم ایٹم بم بنائیں اور ان کو استعمال کریں تو ہماری مرضی کی بات ہے ہمیں اس میں اختیار ہے، کوئی دوسرا ملک ایٹم بم بنائے گا تو یہ ہمارے لئے قابل برداشت نہیں، ہم اس کے ایٹم بم کو اور اس



کے ملک کو تباہ کر دیں گے۔ ان کی یہ بڑھک سن کراہی قوتیں مفلوج ہو گئیں، ایٹم کے تذکرے ختم ہو گئے، موجد ہیرو سے زیرو بنادئے گئے، مقام افسوس! مسلمان اتنے زیادہ ڈرپوک کیوں ہو گئے؟

**فوائد:** ”التقوى نعم وفاء ما عاهدوا الله عليه من الايمان بمحمد ﷺ وبما جاء به

مما يتعلق بتكميل القوة النظرية والعملية“

تقوی عام ہے، وعدہ کی وفاء کو شامل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کیا ہوا وعدہ کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ گے ﴿الَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ قَالَ بَلٰی ﴿اس وعدہ کو شامل ہے، اور تقوی اس چیز سے بھی متعلق ہے کہ قوت نظریہ اور قوت عملیہ کی تکمیل جن کاموں سے ہو سکے وہ کئے جائیں۔

### سبق آموز حکایت:

ایک جوان نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ میں دنیا کی خوبصورت چیزوں کو نہیں دیکھوں گا، ایک دن وہ بازار سے گزرا تو اس نے موتیوں سے مرصع ایک کمر بند دیکھا، تو اس کی طرف کچھ دیر تعجب سے دیکھا، پھر آگے چلا گیا، ابھی آگے چلا ہی تھا کہ دکاندار کو کمر بند نظر نہ آیا، وہ جلدی سے اپنی دکان سے نکلا تو اس اللہ کے بندے کو پکڑ لیا کہ تو تو عیار و مکار ہے، میری دکان سے کمر بند تو نے چوری کر لیا ہے، وہ پکڑ کر حاکم کے پاس لے گیا، حاکم نے اس کے ظاہر حال کو دیکھ کر کہا یہ چور نہیں ہو سکتا یہ تو نیک شخص ہے، دکاندار نے کہا میرا کمر بند اس اس طرح تھا، دکان کے پاس یہی کھڑا ہوا تو وہ کمر بند گم ہو گیا، آپ اس کی تلاشی لیں، تلاشی لینے پر وہ کمر بند اس کی کمر سے باندھا ہوا مل گیا، بادشاہ نے بھی کہا تو تو بڑا عیار ہے، کیا تجھے شرم نہیں آتی لباس تو نیک لوگوں کا پہنتا ہے اور پھر چوریاں بھی کرتا ہے۔

اس جوان سے کمر بند کو دیکھ کر کہا ”مولای الا قالۃ الہی لا اعود الی مثلہا“ اے میرے مولیٰ میں باز آ گیا، میں باز آ گیا (میری پناہ، میری پناہ) اور میرے اللہ میں آئندہ ایسا کام نہیں کروں۔

اس نے وہ کمر بند چوری تو نہیں کیا تھا، قدرتی طور پر اس کی کمر کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چل سکا، بادشاہ نے کہا اسے خوب مارو، جب اس کے کارندوں نے اس شخص کے کپڑے اتار دیئے تاکہ اسے خوب ماریں ”فاذا هم بصوت يسمع ولا يرى يقول دعوه ولا تضربوه انما اردنا نأدبہ“ اچانک ایک غیبی آواز آئی، آواز تو سنی جا رہی تھی لیکن بولنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، وہ آواز یہ آرہی تھی کہ اسے نہ مارو، ہم نے تو اسے ادب سکھانے کا ارادہ کیا، ”فولب السلطان الی الفتی وقبلہ بین عینیہ“ بادشاہ جلدی سے جوان طرف آگے بڑھا، اس کی درمیان آنکھوں کے



بوسہ لیا، اس جوان سے پوچھا تمہارا معاملہ کیا ہے؟ اس نے بتایا میرا رب تعالیٰ سے وعدہ یہ تھا کہ میں دنیا کی اچھی چیزوں کو نہیں دیکھوں گا، لیکن بازار سے گزرتے ہوئے مجھے یہ کمر بند خوبصورت نظر آیا تو میں نے اسے دیکھنا شروع کر دیا تھا، آگے کا رب تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوا، پھر اس نے آیت کریمہ کا یہ حصہ پڑھا ﴿وَالْمُؤْفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ وہ اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں..... وہی لوگ سچے ہیں اور وہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

کمر بند کے مالک دکاندار نے بھی اس جوان کی خدمت میں یوں عرض کیا ”سالتک باللہ الا ما قبلتھا منی واجعلنی فی حل“ میں اللہ تعالیٰ کے لئے تم سے سوال کرتا ہوں جو مجھ سے تم ضرور قبول کرو وہ سوال یہ ہے تم مجھے معاف کرو، ”فقال البک عنی لیس هذا من صنعتک انما الصنع لصاحب الصنع ولا مؤثر فی الوجود غیر الحق و لیس فی الدار غیرہ دیار“ اس جوان نے کمر بند والے دکاندار کو کہا میں نے تمہیں معاف کر دیا، درحقیقت تمہارا یہ کام ہی نہیں، یہ کام تو کام والے کا ہی ہے، وہی قادر مطلق ہے، اس کام میں سوائے حق تعالیٰ کے اور کوئی مؤثر نہیں، یہ سب جہان اسی کا ہے، اس کے جہان میں اور کوئی جہان نہیں۔

اس حکایت سے یہ سبق حاصل ہوا ”فعلى العاقل ان یوفی بعہدہ فی السراء والضراء ویجتہد فی محافظتہ“ کہ عقلمند شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے وعدہ کو ہر حال میں پورا کرے خواہ خوشی میں ہو یا پریشان حالی میں ہو، اس وعدہ کو پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔

راقم کو اس حکایت سے اور یہ فائدہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، بظاہر ان کا وہ گناہ نہیں ہوتا جس میں انہیں پکڑ لیا جاتا ہے، خناس لوگ اللہ کے پیاروں پر انگشت زنی کرتے ہیں (ان کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں) دیکھو جی اس صوفی، اس مولوی کی طرف اس نے یہ کام کیا ہے یہ تو کتنا برا کام ہے، انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی اور گرفت میں ہیں، حقیقت سے باخبر صرف رب تعالیٰ ہی ہوتا ہے، ایک مرتبہ موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے لاہور شہر سیلاب کا منظر پیش کر رہا تھا، گلبرگ جیسی جگہ بھی جھیل کا منظر پیش کر رہی تھی،

**عبد القادر حسن** (سابقہ کالم نگار روزنامہ جنگ) نے اس پر ایک مضمون لکھا کہ یہ درحقیقت مرغی کے چوزوں کے خون کو مال روڈ سے دھونے کے لئے آیا، کیونکہ جب مرغابی پر ٹیکس لگایا گیا تو مرغی کا کاروبار کرنے والوں نے چوزوں کو مختلف رنگ لگا کر مال روڈ پر بطور احتجاج چھوڑ دیا جو گاڑیوں کی زد میں آ کر مر گئے تھے اس خون کو دھونے کیلئے رب تعالیٰ نے سیلابی بارشوں کا انتظام کیا۔



اس پر اس نے ایک صاحب کشف بزرگ کا واقعہ نقل کیا کہ دو شخص قتل کے ملزم قرار دئے گئے، وہ جیل میں تھے، ان کے لواحقین ایک نیک بزرگ کے پاس دعاء کرانے کے لئے گئے، اس نے کہا اللہ تعالیٰ خیر کرے ابھی گھوڑی بہت روتی ہے اور اس کا پچھیرا بہت روتا ہے، اس بزرگ کا یہ اشارہ جیل میں قیدیوں کے لواحقین کو نہ سمجھ آ سکا، انہوں نے قیدیوں کو بزرگ کی بات سنائی تو انہوں نے سمجھ لیا، وہ کہنے لگے کہ ہم نے ایک مرتبہ چوری کی تھی، چوری کیا ہوا مال اسی گھر سے گھوڑی کو کھول کر اس پر لا دیا تھا، اس گھوڑی کا پچھیرا بار بار گھوڑی کے آگے آ جاتا جو ہمارے سفر میں رکاوٹ بن رہا تھا تو ہم نے اس پچھیرے کو مار کر ایک کنویں میں پھینک دیا تھا، یعنی وہ دونوں قیدی درحقیقت گھوڑی کے پچھیرے کو قتل کرنے کے جرم میں مبتلا تھے، لیکن بظاہر ان پر کسی شخص کو قتل کرنے کا الزام تھا، وہ حقیقت میں اس شخص کے قتل کے شریک نہیں تھے، اللہ تعالیٰ ہی حقائق کو جانتا ہے، وہی علیم وخبیر ہے۔

راقم نے کئی مرتبہ اپنا موقف تقریر میں دہرایا ہے کہ نواز شریف اور شہباز شریف میرے خیال میں لاہور میں مساجد کو شہید کرنے اور جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے اور لاہور کو خوبصورت بنانے کے زعم باطل کے جرم کی وجہ سے جلا وطن کر دئے گئے، ورنہ طیارہ فراڈ کیس فراڈ کیس ہی تھا

اور سبق حاصل یہ ہوا کہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سمجھے، اسی کی طرف رجوع کرے۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوی      چو بگذشت بر عارفی جنگ جوی  
کتنا اچھا کہا بہلول اچھی عادت والے نے۔ جب وہ گزرا ایک عارف جنگجو (لڑائی کرنے والے) پر  
گر ایں مدعی دوست بشناختی      بہ بیکار دشمن نہ پرداختی  
اگر یہ مدعی معرفت اپنے دوست (اللہ تعالیٰ) کو پہچانتا، تو بیکار دشمن سے (لڑائی کرنے) مشغول نہ ہوتا،  
گر از ہستی حق خبر داشتی      ہمہ خلق را نیست پنداشتی  
اگر اسے یہ خبر ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات موجود ہے، تو تمام مخلوق نہ ہونے کے برابر سمجھتا،

”فاذا وقفت علی هذا الخبر فقم فی تربية نفسك الی ان تصل الی الهوية المطلقة  
ممیطالنام الاثینة مشاہدا وجود الحق فی کل شئی رزقنا اللہ وایاکم مشاہدہ“

جب یہ بات تمہیں سمجھ آ جائے کہ حقیقی موجود اللہ تعالیٰ ہی ہے، مخلوق تمام فانی ہے تو تم اپنے نفس کی یوں تربیت کرو کہ تمہاری رسائی ذات مطلق (باری تعالیٰ) کی طرف ہو، دوئی کو مٹا دو فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کرو تا کہ ہر چیز میں تمہیں وجود باری تعالیٰ کا مشاہدہ حاصل ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنا مشاہدہ عطا فرمائے ”آمین“  
(ماخوذ از روح البیان مع خیالات درام)





إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي  
الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ  
أَلِيمٌ ۝ (آیہ نمبر ۷۷)

(۱) وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں،  
اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے قیامت کے دن، اور نہ انہیں پاک  
کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) بیشک وہ جو حاصل کرتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا مال، یہ وہ ہیں کہ نہیں  
حصہ ان کا آخرت میں اور نہیں کلام کرے گا ان سے اللہ اور نہ ہی نظر (رحمت) کرے گا ان کی  
طرف قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کیلئے عذاب ہے دردناک“ (نجوم الفرقان)

شان نزول:

میں چند وجوہ ذکر کی گئی ہیں، لیکن ان میں کوئی تعارض نہیں، وہ تمام وجوہ ہی حقیقت میں شان نزول ہیں، یعنی  
کئی واقعات کے بعد آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔

(۱) قَالَ عِزَّةٌ نَزَلَتْ فِي رء و س الْيَهُودَ كَتَمُوا مَا عَهَدَ اللَّهُ إِلَيْهِمْ فِي التَّوْرَةِ فِي شَانِ مُحَمَّدٍ  
وَبَدَّلُوهُ وَكَتَبُوا بِأَيْدِيهِمْ غَيْرَهُ وَحَلَفُوا أَنَّهُ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لَثَلَا يَفُوتُهُمُ الْمَآكِلُ وَالرَّشَالَتِي  
كَانَتْ لَهُمْ مِنْ اتِّبَاعِهِمْ

شان نزول کی ایک وجہ عکرمہ ؑ کی روایت میں مذکور ہے کہ یہ آیہ کریمہ یہود کے سرداروں کے متعلق نازل ہوئی  
جنہوں نے چھپا دیا نبی کریم ؑ کی شان کو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں ان سے وعدہ لیا کہ اسے حق طور پر بیان کرنا،  
لیکن انہوں نے نبی کریم ؑ کی شان کو تبدیل کر دیا، اپنے ہاتھوں سے آپ کے اوصاف کو تبدیل کر کے لکھ دیا، اور  
قسمیں اٹھائیں کہ توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی  
تابعہ داری کریں۔ یہ اوصاف تبدیل کرنے، توراۃ میں لئے گئے وعدہ کو توڑنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی رشوت اور  
امیر لوگوں سے ملنے والا مال بندنہ ہو جائے۔ (معالم التنزیل للبعوی)



وہ یہود کے سرکردہ لوگ تھے جن کا تذکرہ اس روایت میں موجود ہے۔

”واخرج ابن جریر عن عكرمة قال نزلت هذه الآية “ان الذين يشترون بعهد الله وايمانهم ثمنا قليلا  
“فی ابی رافع وكنانة بن ابی الحقیق وکعب ابن اشرف وحی بن اخطب“

ابن جریر نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ یہ آیت کریمہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ ابورافع، کنانہ بن حقیق، کعب بن اشرف اور حی بن اخطب یہود کے متعلق نازل ہوئی جن کی کوشش سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف توراۃ میں تبدیل کر دیئے گئے (درمنشور)

(۲) عن ابی وائل عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ من خلف على يمين صبر يقطع بها مال امرئ مسلم لقي الله يوم القيامة وهو عليه غضبان فانزل الله تعالى تصديق ذلك، ان الذين يشترون بعهد الله ايمانهم ثمنا قليلا“ (رواه البغوي بالاسناد على طريق البخاري)

ابو وائل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قسم اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال لے لیتا ہے، قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی تصدیق کے لئے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔ (معالم التنزیل للبغوی و مظہری)

(۳) دخل الاشعث بن قيس فقال ما يحدثكم ابو عبد الرحمن؟ فقالوا كذا كذا فقال في انزلت كانت لي بشر في ارضي ابن عم لي فالتيت رسول الله ﷺ فحدثته فقال هات بينتك او يمينه قلت اذا يحلف عليها يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ ”من حلف على يمين صبر وهو فيها فاجر يقطع بها مال امرئ مسلم لقي الله يوم القيامة وهو عليه غضبان“

اشعث بن قیس آئے انہوں نے پوچھا ابو عبد الرحمن اس آیت کے متعلق کیا کہتے ہیں، ان کو بتایا گیا کہ اس اس طرح وہ بیان کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یہ آیت کریمہ میرے حق میں نازل ہوئی، میرا ایک کنواں چچا کے بیٹے کی زمین میں تھا (وہ مجھے دے نہیں رہا تھا) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو بتایا، آپ نے فرمایا، گواہ پیش کرو یا قسم اٹھاؤ (یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب مدعی سے بھی قسم لے کر فیصلہ کیا جاتا تھا) میں قسم اٹھانے پر پختہ طریقہ سے تیار ہو گیا۔ میں نے کہا میں قسم اٹھاتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قسم اٹھا کر اپنے بھائی کا مال لے لے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا، تو آپ کے ارشاد کی تائید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للبغوی)

(۳) واخرج مسلم وابو داؤد والترمذی عن وائل بن حجر قال جاء رجل من حضر موت



ورجل من كندة الى النبي ﷺ فقال الحضرمي يا رسول الله ان هذا قد غلبني على ارض كانت لابى قال الكندي هي ارض كانت في يدى از رعها ليس له فيها حق فقال النبي ﷺ للحضرمي الك بينة قال لا قال ذلك يمينه فقال يا رسول الله ان الرجل فاجر لا يبالى على ما حلف عليه وليس يتورع عن شئ فقال ليس لك منه الا ذلك فانطلق ليحلف فقال رسول الله ﷺ لما ادبر لئن حلف على مال ليا كله ظلما ليلقين الله وهو عنه معرض“

مسلم، ابوداؤد، ترمذی نے وائل بن حجر سے روایت بیان کی کہ ایک شخص حضرت موت سے اور دوسرا کندہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، حضرمی نے کہا یا رسول اللہ یہ شخص مجھ پر غالب آ گیا ہے، میرے باپ کی طرف سے مجھے ملی ہوئی زمین پر اس نے قبضہ کر لیا ہے، کندی نے کہا یہ زمین میرے قبضہ میں ہے، میں اس میں کھیتی باڑی کر رہا ہوں، اس شخص کا اس میں کوئی حق نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرمی کو کہا، کیا تمہارے پاس گواہ ہیں؟ اس نے کہا میرے پاس گواہ تو نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر وہ دوسرا شخص قسم اٹھا لیتا ہے، حضرمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ وہ شخص تو فاجر ہے، وہ قسم اٹھانے میں کوئی پرواہ نہیں کرے گا، اسے پرہیزگاری تو کچھ بھی حاصل نہیں، تو آپ نے فرمایا تمہارے لئے اس کے بغیر اور کوئی فیصلہ نہیں، تو وہ کندی شخص قسم اٹھانے کیلئے چلا، تو نبی کریم ﷺ نے اس کے پھر جانے پر فرمایا کہ اگر کوئی شخص دوسرے بھائی کا مال ظلماً کھانے کے لئے قسم اٹھائے گا، تو اللہ تعالیٰ سے جب ملاقات کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرمائے گا، یعنی رب تعالیٰ اسکی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (منقول از درمنثور)

علامہ بغوی نے ایک روایت علقمہ سے بیان کی کہ کندی شخص کا نام امرؤ القیس تھا اور حضرمی کا ربیعہ بن عبدان تھا جب امرؤ القیس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو وہ اٹھانے سے رک گیا ”واقر لخصمه بحقه ودفعه اليه“ اور اپنے مدعی کے حق کو تسلیم کر لیا، زمین اس کے حوالے کر دی۔ (معالم التنزيل)

(5) اور شان نزول یہ بیان کیا گیا ”عن ابی امامہ ان رسول اللہ ﷺ قال من اقتطع حق امرئ مسلم بيمينه حرم الله عليه الجنة و اوجب له النار قالوا وان كان شينا يسيرا يا رسول الله؟ قال وان كان قضيبا من اراك قالها ثلاث مرات “ (رواہ مالک و ابن سعد و احمد و مسلم و انسائی و ابن ماجہ درمنثور)

حضرت ابو امامہ کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے اپنی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا، اور اس کے لئے جہنم کو ثابت کر دیا“ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ اگر چہ وہ چیز تھوڑی بھی ہو، آپ نے فرمایا ہاں اگر چہ وہ پیلو درخت کی شاخ ہی ہو، (اس کی جھوٹی قسم کے ذریعے حاصل کرنے پر



جنت حرام ہوگئی جہنم ثابت ہوگئی) یہ جواب آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا، آپ کی تائید کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (معالم التنزیل للبغوی)

(۶) عن عبد الله بن ابي اوفى ان رجلا اقام سلعة وهو في السوق فحلف بالله لقد اعطى بها ما لم يعط ليوقع رجلا من المسلمين "فنزلت"

(رواہ ابن ابی حاتم ورواہ البخاری من غیر وجہ عن العوام حاشیہ صابونی)

عبداللہ بن ابی اوفی فرماتے ہیں بیشک ایک شخص (یہود میں سے) اپنا سامان بازار میں لے کر کھڑا ہے وہ (جھوٹی) قسم اٹھا رہا ہے کہ یہ چیز میں اسے دوں گا جو مجھے اتنی رقم اس کے بدلے دے گا جو مجھے پہلے نہیں دی گئی، (کیونکہ مجھے پہلے اس کے بدلے اتنا مال مل رہا تھا) وہ اصل میں کسی مسلمان کو پھنسانا چاہتا تھا، تو یہ آیہ کریمہ (اس کی مذمت میں) نازل ہوئی۔ (معالم التنزیل للبغوی)

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾  
”بیشک وہ جو حاصل کرتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے گھٹیا مال، یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ان کا آخرت میں“

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر تبصیر الرحمن:

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا الفاظ کا ترجمہ کیا ہے، اور وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں۔ آپ کا یہ ترجمہ تفسیر تبصیر الرحمن کے کامل طور پر مطابق ہے، آئیے ذرا دیکھیں، غور کریں۔

(إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ) ای یاخذون بدله بتغيره (وایمانهم) ای بايمانهم الكاذبة  
یبدلونہا فیاخذون (لثمنًا قليلًا) اشیاء حقیرا من الدنيا الحقيرة التي لا نسبة لجمعها الى ادنى  
ما فوقه (اولئك لا خلاق لهم في الآخرة) ای لا نصيب (لهم في الآخرة) (تبصیر الرحمن)  
بیشک وہ جو لیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عہد کے بدلے (یعنی اللہ کے وعدے کو توڑ کر اس کے بدلے لیتے  
ہیں) اور اپنی قسموں کے بدلے یعنی جھوٹی قسموں کے ذریعے کہ اپنی قسموں کو تبدیل کر کے جھوٹ سے  
حاصل کرتے ہیں حقیر دنیا کا حقیر مال اسلئے کہ دنیا کے تمام مال کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی جو ان  
چیزوں کو حاصل تھی جن کو انہوں نے تبدیل کر دیا ”یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو انہوں نے  
توڑ دیا“ آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں“ راقم نے بھی تقریباً اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی نقل کیا۔



خیال رہے کہ ”شراء“ کا معنی ”بیچنا اور خریدنا“ دونوں معنی آتے ہیں، بیچنا ہو یا خریدنا ہو تو ہر ایک میں ایک شخص کی طرف سے مال دیا جاتا ہے دوسرے کی طرف سے اس کے بدلے میں مال دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا معنی تبدیل کرنا، حاصل کرنا، لینا وغیرہ کیا جاتا ہے۔

ہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے اگر ”ثمنا قليلا“ کا معنی ”تھوڑا مال“ کیا جائے تو پھر بھی درست ہے، کہ یہ حقیقی معنی ہے، لیکن پھر بھی اس کی وضاحت کی ضرورت ہوگی کہ دنیا کا تمام مال ہی تھوڑا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ (آپ فرمادیجئے دنیا کا سامان تھوڑا ہے) یعنی دنیا کا تمام مال حقیر ہونیکی وجہ تھوڑا ہی ہے۔  
﴿أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ ”یہ وہ ہیں کہ نہیں حصہ ہوگا ان کا آخرت میں“  
یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ کر اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر یہ آخرت کی نعمتوں اور ثواب کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ﴾ ”اور نہیں کلام فرمائے گا ان سے اللہ“

یعنی وعدہ توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں اٹھانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائے گا۔  
اعتراض: سورۃ المؤمنون میں رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿قَالَ احْسَبُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُون﴾ سورۃ المؤمنون آیہ (۱۰۸) سے پتہ چلتا ہے کہ رب تعالیٰ ان سے کلام فرمائے گا؟  
پہلا جواب: اجیب بان قوله تعالى ”ولا يكلمهم الله“ ای کلام رضافلا ينافي انه يكلمهم  
کلام غضب“

کہ یہاں جو ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے رحمت اور رضاء مندی کا کلام نہیں فرمائے گا۔ اور سورۃ المؤمنون میں جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد ناراضگی کا کلام ہے یعنی غیظ و غضب والا کلام کیا جائے گا اور رضاء مندی اور رحمت والا کلام نہیں کیا جائے گا۔

دوسرا جواب: ولا يكلمهم اصلا و آیات الکلام علی لسان السلاطین و بشهد  
لذلك قوله تعالى ”ونادوا يا مالک ليقض علينا ربك“

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ رب تعالیٰ کافروں سے بالکل کلام نہیں فرمائے گا ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے فرشتوں کے ذریعے کلام فرمائے گا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَنَادُوا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک! کوئی فیصلہ کر ہی دے ہم پر تیرا رب۔



مالک نام ہے جہنم کے بڑے سردار فرشتے کا، وہ مالک سے درخواست کریں گے کہ تم اللہ پر ہمارا پیغام پہنچا دو کہ وہ ہمیں موت عطا کر دے، ہم پر مکمل فیصلہ کر دے یعنی ہمیں نیست و نابود کرے (ہمیں مٹا ہی دے) اس آیت کریمہ سے پتہ چلا کہ فرشتوں کے ذریعے بات ہوگی۔ (ماخوذ از صاوی)

لیکن راقم کو پہلا جواب قوی نظر آیا، کیونکہ رب تعالیٰ ان کو منع فرما دے گا کہ ”تم میرے ساتھ کلام نہ کرو“ وہ رب تعالیٰ سے کلام فرشتہ کے ذریعے کریں گے، اور رب تعالیٰ ناراضگی کا کلام ان سے خود ہی فرمائے گا ”وَلَا يَكْلَمُهُمْ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ“

آیت کریمہ میں وعید شدید:

دنیا کے حقیر مال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑ دینے اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر لوگوں کا مال ہڑپ کر جانے والوں کے لئے اس آیت کریمہ میں وعید شدید (سخت گرفت کا حکم) پائی گئی ہے۔ پانچ قسم کے سزاؤں کا تذکرہ کیا، چار سے یہ ذکر فرمایا کہ وہ ثواب سے محروم ہوں گے اور پانچویں سے یہ ذکر فرمایا کہ وہ شدید عذاب میں واقع ہوں گے۔

”ان الثواب عبارة عن المنفعة الخاصة المقرونة بالتعظيم“

بیشک ثواب سے مراد یہ ہے کہ کسی کو خالص نفع پہنچایا جائے، ساتھ ساتھ اس کی تعظیم بھی کی جائے۔

”فالاول وهو قوله“اولئك لا خلاق لهم في الآخرة“اشارة الى حرمانهم عن منافع الآخرة“

ان کی پہلی سزا رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ ”ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا آخرت میں“ اس سے یہ بیان فرما دیا گیا کہ وہ آخرت میں نفع حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔

واما الثلاثة الباقية وهي قوله تعالى ”ولا يكلمهم الله ولا ينظر اليهم ولا يزكهم“فهو

اشارة الى حرمانهم عن التعظيم والاعزاز“

باقی تین سزاؤں کا جو تذکرہ فرمایا کہ ”ان سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرمائے گا، اور ان کو دیکھے گا نہیں اور ان کو پاک نہیں کرے گا“ ان سزاؤں کے تذکرہ سے یہ بیان فرما دیا گیا کہ وہ لوگ تعظیم اور اعزاز سے محروم ہوں گے۔

”واما الخامس وهو قوله“ولهم عذاب اليم“فهو اشارة الى العقاب“

پانچویں سزا جس کا ذکر فرمایا کہ ”ان کو دردناک عذاب ہوگا“ اس سے بہت واضح فرما دیا کہ وہ رب تعالیٰ کے شدید عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

خیال رہے کہ ان کی دو سزاؤں ﴿أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ اور ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ﴾ کو

تفصیل طور پر بیان کیا جا چکا ہے، اب باقی تین کو ذکر کیا جا رہا ہے۔



﴿وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ”اور نہیں نظر (رحمت) کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن۔“

راقم نے ترجمہ میں نظر کے بعد بریکٹ میں، رحمت کا لفظ بڑھایا ہے، اسلئے کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے ”انہ لا ينظر اليهم بالاحسان“ کہ بیشک وہ ان طرف احسان کی نظر نہیں کرے گا، عام طور پر کہا جاتا ہے ”فلان لا ينظر الى فلان“ فلاں شخص فلاں کی طرف نظر نہیں کرتا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص اسے شمار میں ہی نہیں لاتا اور نہ ہی اس پر احسان کرتا ہے، اس مجاز کا سبب یہ ہے ”ان من اعتد بالانسان التفت اليه واعاد نظره اليه مرة بعد اخرى“ کہ بیشک جب کوئی انسان کسی دوسرے شخص کو شمار میں لائے تو اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اور بار بار اسے دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظر کرنے سے مراد بھی ”کسی کو شمار میں لانا اور اس پر احسان کرنا“ ہے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نظر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو شمار میں ہی نہیں لائے گا اور ان پر احسان نہیں گا۔

”ولا يجوز ان يكون المراد من هذا النظر الرؤية لانه تعالى يراهم كما يرى غيرهم“  
آیہ کریمہ نظر میں سے مراد رؤیت (دیکھنا) نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق جو دیکھتا ہے وہ اس شان سے اس کو بھی ایسے ہی دیکھے گا جیسے اوروں کو دیکھے گا۔

”ولا ان يكون المراد من النظر قلب الحديقة الى جانب المرئي التماسا  
لرؤيته لان هذا من صفات الاجسام وتعالى الهنا عن ان يكون جسما“

یہاں نظر نہ کرنے سے مراد یہ بھی نہیں کہ وہ آنکھ کی پتلی سے ان کو نہیں دیکھے گا، اسلئے کہ آنکھ کی پتلی جسموں کی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”نظر“ کے بعد ”الی“ آئے تو اس کا معنی ”دیکھنا“ آتا ہی نہیں۔ بلکہ جب بعد میں ”لام“ آئے تو معنی ”دیکھنا“ آتا ہے۔ یہاں ﴿وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ﴾ ہے، ”ولا ينظر لهم“ نہیں۔ لیکن یہ قول عربی زبان سے ناواقعی کی علامت ہے، اس لئے کہ ”نظر“ کے بعد ”الی“ آئے یا ”لام“ آئے دونوں ہی، دیکھنے کے معنی میں استعمال ہیں۔  
(ماخوذ از کبیر)



## احادیث مبارکہ:

یہاں چند احادیث مبارکہ ذکر کی جا رہی ہیں جن کا وعدہ توڑنے اور جھوٹی قسموں کے ساتھ متعلق ہیں، اگرچہ زیادہ احادیث کا ذکر پہلے پارہ میں بھی آچکا ہے، لیکن سلف صالحین مفسرین کرام کی تفاسیر سے نقل کر رہا ہوں، سلف صالحین کا انداز یہی ہے کہ کسی دوسری آیت کریمہ کی تفسیر سے متعلق جن احادیث کا ذکر ہوتا ہے انہیں دوبارہ ذکر کر دیتے ہیں۔

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ لا یکلّمہم اللہ ولا ینظر الیہم یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولہم عذاب الیم، قلت یا رسول اللہ من ہم؟ خسروا وخابوا، قال واعادہ رسول اللہ ﷺ ثلاث مرّات قال المسبل والمنفق سلعتہ بالحلف الکاذب والمنان

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین سے (قسم کے لوگوں سے) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، اور ان کو پاک نہیں کرے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا۔ (حضرت ابو ذر کہتے ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ وہ خسارے میں ہوں گے، رسوا ہوں گے، وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اپنے کلمات کو دہرایا، پھر آپ نے فرمایا (تکبرانہ انداز پر) چادر کو گھسیٹنے والا اور جھوٹی قسم کے ذریعے اپنے سامان کو اچھا کر کے دکھانے والے، اور احسان جتلانے والا۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

قال احمد عن سهل بن معاذ بن انس عن ابیہ ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ تعالیٰ عباد الا یکلّمہم یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولا ینظر الیہم، قیل ومن اولئک یا رسول اللہ؟ قال مبترنی من والدیہ راغب عنہما ومبترنی من ولدیہ ورجل انعم علیہ قوم فکفر نعمتہم وتبرا منہم

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کچھ بندوں سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور ان کو پاک نہیں کرے گا اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، آپ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص جو اپنے والدین سے بیزار ہو کر ان سے اعراض کر لے، اور وہ شخص جو اولاد سے بیزار ہو جائے، اور وہ جس پر کسی قوم کے انعامات ہوں وہ ان کی ناشکری کرے ان سے بیزار ہو جائے۔ (ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یکلّمہم اللہ یوم القیامۃ ولا ینظر الیہم ولا یزکیہم ولہم عذاب الیم رجل منع ابن السبیل فضل ماء عنده، ورجل حلف علی سلعتہ بعد العصر یعنی کاذبا ورجل بايع اماما فان اعطاه وفي له وان لم يعطه لم يف له

(رواہ احمد و ابو داؤد و الترمذی و قال الترمذی حدیث حسن صحیح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین (قسم کے لوگوں) سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کلام نہیں فر



مائے گا، اور ان کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا، اور ان کو پاک نہیں کرے گا، اور ان کو دردناک عذاب ہوگا۔“ (ایک) وہ شخص جو اپنی ضرورت سے زائد پانی سے مسافر کو روکے، اور (دوسرا) وہ شخص جو عصر کے بعد اپنے سامان کو بیچنے کیلئے جھوٹی قسموں کے ذریعے اچھا کر کے دکھائے، اور (تیسرا) وہ شخص جو امام (حاکم) کی بیعت کرے پھر اگر وہ اسے مال دے تو یہ وعدہ کو پورا کرے، اور اگر وہ اسے مال نہ دے تو یہ وعدہ کو پورا نہ کرے۔ (ماخوذ از ابن کثیر و صابونی)

❖ واخرج الحرث ابن ابی اسامة والحاكم وصححه عن كعب بن مالك سمعت رسول الله ﷺ يقول من اقتطع مال امرئ مسلم بيمين كاذبة كانت نكته سوداء في قلبه لا يغيرها شيء الى يوم القيامة“

کعب ابن مالک فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس شخص نے کسی مسلمان کا مال جھوٹی قسموں کے ذریعے (ناحق طور پر) لے لیا تو اس کے دل پر سیاہ نکتہ چھا جائے گا، قیامت کے دن تک کوئی چیز اسے تبدیل نہیں کر سکے گی۔ (ماخوذ از درمنثور)

❖ واخرج عبد الرزاق عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان اليمين الكاذبة تنفق السلعة وتمحق الكسب“

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک جھوٹی قسم سامان کو رائج کر دے گی اور کسب کو مٹا دے گی، یعنی جھوٹی قسم کے ذریعے سامان کو اچھا دکھا کر بیچا جاسکے گا، لیکن اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بے برکت ہو جائے گی اور مٹ جائے گی۔

❖ واخرج عبد الرزاق عن ابی سويد سمعت رسول الله ﷺ يقول ان اليمين الفاجرة تعقم الرحم وتقل العدد وتدع الديار بلاقع“

ابو سويد فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک جھوٹی قسم رحم (بچہ دانی) کو بانجھ کر دیتی ہے، اور تعداد کو کم کر دیتی ہے، اور شہروں کو ویران کر دیتی ہے۔ (ماخوذ از درمنثور)

حقوق العباد اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا:

(ولا يزكيهم) ای لا یثنی علیہم والظاهر ان معناه لا يغفر الله ذنبه لانه من حقوق العباد وفيه القصاص لا محالة“

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ”ولا يزكيهم“ کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہیں کرے گا، لیکن



زیادہ ظاہر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرے گا جو وعدہ توڑ کر یا جھوٹی قسمیں اٹھا کر دوسرے لوگوں کا مال ہڑپ کر جائیں، کیونکہ یہ حقوق العباد سے ہے، اس کا بدلہ ضروری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کو معاف نہیں کرتا۔

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ الدواوین ثلاثة فديوان لا يعبالله به سينا وديوان لا يترك الله منه شيئا وديوان لا يغفر الله اما الديوان الذي لا يغفر الله فهو الشرك واما الديوان الذي لا يعبالله به شيئا فظلم العبد نفسه فيما بينه وبين ربه من صوم تركه او صلوة تركها واما الديوان الذي لا يترك منه شيئا فظلم العباد بعضهم بعضا القصاص لا محالة

(رواہ الحالم و احمد و روی الطبرانی مثله من حدیث سلمان و ابی ہریرۃ و لم یز ار مثله من حدیث اس)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دفا تر تین (قسم) کے ہیں۔

(۱) ایک وہ دفتر ہے جس کی اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں۔

(۲) اور دوسرا دفتر وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی ذرا بھر چیز کو بھی نہیں چھوڑتا۔

(۳) اور تیسرا دفتر وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بخشش نہیں فرمائے گا۔

(دفا تر سے مراد نامہ اعمال ہے، یعنی لوگوں کے اعمال کے دفا تر تین قسم کے ہوں گے) لیکن وہ دفتر جس کی اللہ تعالیٰ نے مغفرت (بخشش) نہیں کرنی وہ ہے شرک، لیکن وہ دفتر جس کی اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں وہ ہے بندے کا اپنے نفس پر ظلم کرنا یعنی بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان جو چیزیں ہیں روزہ چھوڑ دے یا نماز چھوڑ دے (یعنی حقوق اللہ کو پورا نہ کرنا) (رب تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہیں چاہیے تو اس کو معاف فرما دے اور چاہیے تو عذاب میں مبتلا کر لے) لیکن وہ دفتر جس میں سے اللہ تعالیٰ کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑے گا یہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا، ان کا بدلہ ضرور دلا یا جائے گا، (یعنی حقوق العباد کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرمائے گا، بلکہ ان کا بدلہ دلانے گا) (منظہری)





وَأَنَّ مِنْهُمْ لَفِرِيقًا يُلَوِّنَ السِّتْرَ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَاهُو مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَاهُو مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

(آیہ نمبر ۸۷)

(۱) اور ان میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل کرتے ہیں کہ تم سمجھو یہ بھی کتاب میں ہے اور وہ کتاب میں نہیں اور وہ کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے اور وہ اللہ کے پاس سے نہیں اور اللہ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) اور بے شک ان سے ایک فریق پھیرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب میں تاکہ تم اسے گمان کرو کتاب سے حالانکہ نہیں ہے وہ کتاب سے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ نہیں ہے وہ اللہ کی طرف سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

**شان نزول :** اس آیہ کریمہ کے شان نزول میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ آیہ کریمہ یہود کے چند اشخاص کے متعلق نازل ہوئی وہ کعب بن اشرف اور مالک اور حنی بن اخطب اور ابویاسر اور شعبہ بن عمرو اشاعر۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تورات سے اپنے خلاف دلائل کو تبدیل کر دیا گیا۔

(۲) روی الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان الآیة نزلت فی الیہود والنصارى جميعا وذلک انہم حرّفوا التوراة والانجیل والحقوا بکتاب اللہ تعالیٰ مالیس منه “

ضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیہ کریمہ یہود و نصاریٰ دونوں فریقوں کے متعلق نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے تورات و انجیل میں تحریف کی اور کتاب اللہ میں ان چیزوں کو ملا دیا جو اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تورات و انجیل میں نہیں تھیں۔ واقعہ کو دوسرا قول زیادہ معتبر نظر آتا ہے اگرچہ تفسیر کبیر میں پہلے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔

”یلوون“ ماخوذ ہے ”لی“ سے جو اصل میں ”لوی“ ہے ”سید“ والے قاعدے کے مطابق واؤ کو یاء کیا اور یاء کو یاء میں ادغام کیا۔ ”اللی فتل الحبل“ لوی کا معنی رسی مٹنا۔ ”لوی بدہ“ ہاتھ کو پھیرنا یا مروڑنا۔ لوی راسہ “ سکر کو پھیرنا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ”لو وارثو سہم“ انہوں نے اپنے سروں کو پھیرا۔ لوی لسانہ



بکذا“ کناية عن الکذب وتخصر الحديث “ اس نے اپنی زبان کو اس طرح پھیرا یعنی جھوٹی بات کی اور اٹکل سے بات کی یعنی من گھڑت کلام پیش کیا۔ رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ”یلوون الستهم بالکتاب“ میں یہی معنی ہے ”وہ اپنی زبانوں کو کتاب میں پھیرتے ہیں“ یعنی جھوٹ بولتے ہیں اور من گھڑت باتوں کو اللہ تعالیٰ کی کتابوں تورات اور انجیل میں شامل کرتے ہیں۔ (مفردات راغب)

”والمعنی یحرفون الکلم ویعدلون به عن القصد“ مطلب یہ ہے کہ وہ کلمات میں تحریف کرتے ہیں اور حق سے اسے پھیر دیتے ہیں۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ ”لویت الغریم“ کا معنی یہ بھی ہے کہ ”میں نے قرض خواہ کو ٹال دیا“ وفی الخبر ”لی الواجد ظلم“ جس شخص کے پاس مال ہو وہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے تو یہ ظلم ہے۔ (روح المعانی)

”وفی الحديث لی الوجد یحل عرضه وعقوبته“ جس شخص کے پاس مال ہو وہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کال لے تو اسکی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہے۔ (قرطبی)

﴿لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ﴾ ”تا کہ تم اسے گمان کرو کتاب سے“

یہ خطاب ہے مؤمنین کو ”لتحسبوه“ میں منصوب کی ضمیر ”محرف“ تحریف شدہ کلام کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر سیاق و سباق دلالت کر رہا ہے یعنی ماقبل اور مابعد سے یہ بات واضح ہو رہی ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی مسئلہ کو ان الفاظ سے بیان فرمایا:

”لتحسبوه من الكتاب“ ای لتظنوا ایہا المسلمون ان المحرف المدلول علیہ (روح المعانی)

﴿وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ﴾ ”حالانکہ وہ کتاب سے نہیں“

یعنی وہ اللہ کی کتابوں توراۃ و انجیل میں تحریف کر کے مؤمنوں کو یہ گمان دلانا چاہتے ہیں کہ یہ تحریف شدہ عبارت بھی اصل توراۃ و انجیل کا حصہ ہیں حالانکہ وہ توراۃ و انجیل کا حصہ نہیں۔

﴿وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾

”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں“

یعنی وہ بہت کھلے انداز میں بغیر اشارہ کے یہ کہتے ہیں کہ ہم جو کلام پیش کر رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے نازل



فرمایا ہے اسی مسئلہ کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ ان الفاظ سے پیش کرتے ہیں۔

”ويزعمون صريحا غير متمكن بالثبوت والتعريض ان المحرف او المشابه نازل من عند الله وليس هو نازل من عند الله“  
(روح المعاني)

**تنبیہ:** راقم نے ”وما هو من الكتاب“ اور ”وما هو من عند الله“ کا ترجمہ حال والا کیا ہے جو روح المعانی کی اس عبارت سے لیا ہے۔ ”والواو للسحاح والجملة حال من ضمير المبتدأ في الخبر“ واو حال کے لئے اور خبر میں جو ضمیر مبتداء کی طرف لوٹ رہی ہے یہ جملہ اس سے حال واقع ہو رہا ہے۔

﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ”اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں“  
”وہم يعلمون“ کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ

”(وہم يعلمون) انہم کا ذہن علیہ سبحانہ و هو تسجیل علیہم بان ما افتروه عن عمد لا خطاء“  
وہ جانتے ہیں کہ بیشک وہ جھوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل پر مہر لگا دی، پختہ طریقے سے بیان فرما دیا کہ وہ جو افتراء باندھتے تھے، جھوٹ بولتے ہیں وہ جان بوجھ کر، غلطی سے نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اللہ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں ”اور دوسرا مطلب یہ ہے“ ”وقيل (يعلمون) ما عليهم في ذلك من العقاب“ ”وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان پر اس جھوٹ کی وجہ سے شدید عذاب آئے گا“ راقم نے کوشش کی ہے کہ الفاظ مبارکہ کا لغوی ترجمہ بھی ہو اور ان دونوں مطالب کو شامل بھی ہو، راقم کا ترجمہ یہ ہے ”اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“

خیال رہے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ قرآن پاک کنز الایمان کو اور تفاسیر کو دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ رائج قول کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں اور ادب و احترام کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور راقم کا خیال ہوتا ہے کہ طلباء کرام کو دوسرا مطلب بھی ذہن نشین ہو جائے اور ترجمہ میں ہی تمام اقوال سمٹ آئیں تو ان کو سمیٹ لیا جائے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اصل ہے راقم کا ترجمہ زیادہ مقامات آپ کے ترجمہ کی ہی نقل ہے، یہ بات واضح ہے کہ اصل اور نقل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

**معتزلہ کا استدلال:**

معتزلہ نے اپنے مذہب پر اس آیت کریمہ سے یہ دلیل پیش کی ہے کہ بندے کا برا فعل اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں، ورنہ یہ سچا آتا ”اولئك المحرفون بقولهم هو من عند الله تعالى“ کہ ان لوگوں کی تحریف اللہ تعالیٰ کی طرف



سے ہے کیونکہ ان کی تخلیق ہے، ان لوگوں کا دعویٰ ہی یہ تھا ”ان التحریف من عند الله وبخلقه“ کہ ان کی تحریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق ہے، لیکن رب تعالیٰ نے ان کے دعوے کو رد کر دیا کہ ان کی تحریف اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں کی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے حکموں میں سے کوئی حکم ہے۔

اس تمام بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ لوگوں کے برے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں، بلکہ بندوں کی اپنی تخلیق ہیں، یہ ہیں دلائل جبائی اور کعبی معتزلیوں کے۔

### معتزلہ کا رد:

ان المقصود بالنفی كما اشرنا اليه نزوله من عنده سبحانه وهو اخص من كونه من فعله وخلقه ونفى الخاص لا يستلزم نفى العام فلا يدل على مذهب المعتزلة القائلين بان افعال العباد مخلوقة لهم لالله تعالى

یہود و نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہماری تحریف اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تحریف کو نازل نہیں فرمایا۔ یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ ہماری تحریف اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی تخلیق ہے، جب ان کا یہ دعویٰ ہوتا تو ان کے قول کے رد سے سمجھ آتا کہ بندوں کے برے افعال رب تعالیٰ کی تخلیق نہیں۔

معتزلہ کا یہ کہنا ہی سراسر جھوٹ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا ”ان التحریف من عند الله وبخلقه“ کہ بیشک تحریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کی تخلیق سے ہے۔ ان کا دعویٰ تو قرآن پاک نے صرف اتنا بیان کیا ”ويقولون هو من عند الله“ وہ کہتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ”انہوں نے ”من عند الله“ کہ ساتھ ”وبخلقه“ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ان کا دعویٰ خاص ہے، نفی بھی خاص کی ہے اور یہ قانون بھی دینی طلباء پر مخفی نہیں ”نفی الخاص لا يستلزم نفى العام“ خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوتی۔

جب ان کا دعویٰ صرف اتنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (یعنی اس نے جو نازل کیا ہے وہی ہے) تو اسی قول کا رد کیا ﴿وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ یہ اللہ کی طرف سے (نازل) نہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں“ یہ باطل اور جھوٹ ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہ حقیقت ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح معتزلہ بھی جھوٹے ہیں۔ پرانے مذاہب باطلہ کو آج کل پھرا جا کر کیا جا رہا ہے لیکن وہ پہلے بھی باطل تھے آج بھی باطل ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ باطل ہی رہیں گے۔ یہود و نصاریٰ نے



اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں کیسے تحریف کی؟ اس مسئلہ میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ایک قول یہ ہے ”فذهب جمع الی انه لیس فی التوراة سوی کلام اللہ وان تحریف الیہود لم یکن الا تغیر اوقت القراءة او تاویلا باطلا للنصوص واما انهم یکتبون ما یرومون فی التوراة علی تعدد نسخها فلا“

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ توراة میں صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بیشک یہود کی تحریف یہ تھی کہ پڑھتے ہوئے الفاظ کو اس طرح بدل دیتے تھے کہ اس سے مطالب تبدیل ہو جاتے تھے، اور کبھی الفاظ مبارکہ کے باطل مطالب پیش کرتے تھے، لیکن انہوں نے توراة میں اپنی طرف سے کوئی الفاظ شامل نہیں کئے۔ ان لوگوں نے اپنے دعویٰ پر ابن منذر اور ابن ابی حاتم کی وہب ابن منبہ کی روایت کو پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

”ان التوراة والانجیل کما انزلہما اللہ تعالیٰ لم یغیر منہما حرف ولکنہم یضلون بالتحریف والتأویل وکتب کانوا یکتبونہا من عند انفسہم ویقولون ان ذلک من عند اللہ وما هو من عند اللہ فأما کتب اللہ تعالیٰ فانہا محفوظة لا تحول“  
کہ توراة وانجیل کو جس طرح نازل فرمایا اسی طرح رہیں، ان میں کسی ایک حرف کو بھی تبدیل نہیں کیا گیا لیکن وہ تحریف یعنی انداز بیان اور غلط مطالب بیان کرنے سے گمراہ ہوئے، وہ اپنی طرف سے مطالب توراة وانجیل سے علیحدہ لکھ کر پیش کرتے اور کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا تھا، اصل کتابوں کو وہ تبدیل نہ کر سکے بلکہ وہ محفوظ رہیں۔

ان حضرات کی اور دلیل یہ ہے کہ

”ان النبی ﷺ کان یقول للیہود الزامالہم“ انتو بالتوراة فاتلوہا ان کنتم صادقین“

بیشک نبی کریم ﷺ یہود کو الزامی جواب کے طور پر یوں ارشاد فرماتے تھے ”تم توراة لے آؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو“ اگر اصل توراة میں تبدیلی ہوتی تو نہ نبی کریم ﷺ لانے کا ارشاد فرماتے، اور نہ ہی وہ توراة لانے سے رکتے۔ لیکن وہ توراة لانے سے رک جاتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ توراة میں تبدیلی نہیں تھی اسی وجہ سے ان کا موقف ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ توراة کو پیش کرنے سے ہچکچاتے تھے۔  
(ماخوذ از روح المعانی)

(۲) دوسرے حضرات کا قول یہ ہے ”وذهب آخرون الی انہم بدلوا وکتبوا ذلک فی نفس کتابہم“

کہ انہوں نے اصل کتاب کو تبدیل کر دیا تھا اور اپنی طرف سے اس میں لکھ دیا تھا، ان حضرات کی دلیل قرآن پاک کی آیات ہیں جو ظاہر طور پر دلالت کر رہی ہیں کہ انہوں نے الفاظ کو تبدیل کیا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿فَوَيْلٌ



لِّلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ﴿تو بربادی ہے ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے﴾۔ اسی طرح اور ارشاد گرامی یہ ﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ﴾ وہ کلمات کو اپنی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اس پر حضرت ابن عباس ؓ کی ایک روایت بھی دلالت کر رہی ہے۔  
عن ابی عباس ؓ انه قال ان النفر الذين لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم كتبوا كتابا شوشوه فيه نعت محمد ؐ و خلطوه بالكتاب الذي كان فيه نعت محمد ؐ ثم قالوا هذا من عند الله

حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ بیشک کچھ وہ لوگ ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ہی کلام فرمائے گا اور نہ ہی نظر رحمت فرمائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی طرف سے لکھا تو نبی کریم ؐ کے اوصاف کو منتشر کر دیا اور آپ کے اوصاف کو خلط ملط کر دیا پھر کہنے لگے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

### راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابتدائی طور پر وہ صرف اتنی تحریف کرتے تھے کہ لفظوں کی حرکات وغیرہ کو تبدیل کر دیتے تھے اور پڑھنے کا انداز تبدیل کر کے معانی تبدیل کر دیتے تھے اور مطالب تبدیل کر دیتے تھے کہ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں بلکہ یہ مطلب ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتے چلے گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں اپنے الفاظ بھی داخل کر دئے راقم کا موقف انشاء اللہ دونوں قولوں میں شاندار تطبیق ثابت کرے گا۔

### انجیلوں کی تعداد:

(1) انجیل متی: یہ انجیل عیسیٰ ؑ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے آٹھ سال بعد بارہ

حواریوں نے فلسطین کی سرزمین پر سریانی زبان میں لکھی۔

(2) انجیل مرقس: یہ انجیل عیسیٰ ؑ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بارہ سال بعد شہر روم

میں فرنگی زبان میں ستر شخصوں نے مل کر لکھی۔

(3) انجیل لوقا: یہ انجیل بھی حضرت عیسیٰ ؑ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد ستر شخصوں نے مل

کر شہر سکندریہ میں یونانی زبان میں لکھی۔

(4) انجیل یوحنا: یہ انجیل عیسیٰ ؑ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے تیس سال بعد آپ کے ایک



دوست نے رومی شہروں میں سے ایک شہر افسس میں انگریزی زبان میں لکھی۔

ان چار انجیلوں میں سے کوئی بھی اصلی انجیل نہیں، اصل انجیل تو صرف وہی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، یہ سب انجیلیں آپ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد بنائی گئیں، جو یقینی طور پر من گھڑت انجیلیں ہیں۔

”یؤید وقوع التغبیر فی کتب اللہ وانہا لم تبق کیوم نزلت وقوع التناقض فی الاناجیل وتعارضها وتکاذبها وتها فتها ومصامتھا بعضها ببعض“

اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں حقیقی طور پر رد و بدل کر دیا گیا، وہ آج اپنی اصل حالت میں نہ رہیں، اس پر انجیلوں کی تعداد اور ان کا اختلاف تائید کر رہا ہے، کہ انجیلیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ان کے دلائل ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہ انجیلیں ایک دوسری کی تکذیب کر رہی ہیں۔ ایک دوسری کے خلاف تصادم ان میں پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

### انجیلوں کا اختلاف:

چار انجیلوں کا ایک دوسری سے اس طرح اختلاف پایا گیا ہے کہ ان میں مذکور واقعات اور قصص (قصے) ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ایک انجیل میں واقعات کا دوسری انجیل کے خلاف پائے جانے سے یہ واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے۔

”وفیہا ما تحکم الضرورة بانہ لیس من کلام اللہ تعالیٰ اصلاً“

کہ ان مذکورہ انجیلوں میں سے کوئی ایک انجیل بھی اللہ کا کلام بالکل نہیں۔

آئیے انجیلوں کے اختلاف پر نظر ڈالئے تو مسئلہ نکھر کر واضح ہو جائے اور شاید یہود و نصاریٰ کے چیلے، چپے، کڑچھے بھی کچھ سمجھ جائیں۔

**متی انجیل:** کا بیان یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جب سولی پر چڑھایا گیا تو آپ کے ساتھ دو چوروں کو بھی سولی چڑھایا گیا، ایک کو آپ کی دائیں جانب اور دوسرے کو آپ کی بائیں جانب سولی چڑھایا گیا، وہ دونوں چور یہود کے ساتھ مل کر عیسیٰ علیہ السلام سے مزاح اڑا رہے تھے اور آپ کو عار دلدارہ تھے۔

**لوقا کا بیان:** لوقا انجیل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک عیسیٰ علیہ السلام سے مزاح اڑا رہا تھا اور دوسرا اسے یہ کہہ رہا تھا کہ تو اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں ڈرتا، ہمیں اسی وجہ سے تو سزا دی جا رہی ہے۔ اس شخص نے آپ کے متعلق کوئی بیہودہ بات نہیں کی، پھر اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا ”اے میرے سردار میرا ذکر ملکوت میں رب تعالیٰ کے حضور کر



دینا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا، ”ہاں تمہارے ساتھ پکا وعدہ ہے کہ تم میرے ساتھ جنت الفردوس میں رہو گے۔“

### بیان اختلاف:

ولا يخفى ان هذا يؤول الى التناقض فان اللصين عند متي كافران وعند لوقا احدهما مؤمن والاخر كافر“  
متی اور لوقا دونوں میں اختلاف واضح نظر آ رہا ہے کہ متی کے مطابق دونوں چور کافر تھے کیونکہ دونوں اللہ کے نبی سے مزاح اڑا رہے تھے، اور لوقا کے بیان کے مطابق ایک ان دونوں میں سے مؤمن تھا اور دوسرا کافر تھا۔

### مرقس اور یوحنا اس بیان سے خالی ہیں:

”واغفل هذه القصة مرقس ويوحنا“ مذکورہ بالا واقعہ جو متی انجیل اور لوقا انجیل نے ایک دوسرے کے خلاف بیان کیا ہے، وہ واقعہ مرقس اور یوحنا نے سرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ واضح ہوا کہ چار کی چار من گھڑت انجیلیں ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد ہیں۔

### ایک اور اختلاف دیکھئے:

لوقا انجیل نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا ہے کہ انسان دو انسانوں کو ہلاک کرنے کیلئے نہیں آیا بلکہ زندہ رکھنے کیلئے آیا ہے اور دوسری انجیلوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان روئے زمین پر کوئی سلامتی لے کر نہیں آیا، بلکہ تلوار اور جلائے والی آگ لے کر آیا ہے۔

”ولا شك عن هذا تناقض احدهما يقول جاء رحمة للعلمين والاخر يقول جاء نقمة على الخلاق اجمعين“

یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے ثابت ہے کہ ان دونوں قوموں میں تناقض (مخالفت) ہے۔ ایک انجیل سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ انسان سب کیلئے رحمت بن کر آیا ہے، اور دوسری انجیلوں سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ انسان لوگوں کیلئے عذاب بن کر آیا، انسان صرفی انتقامی کاروائیوں کیلئے آیا ہے۔

### انجیلوں کا ایک اور اختلاف دیکھئے:

متی انجیل میں ہے کہ حضرت یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے اپنے بارہ شاگردوں کو کہا کہ تم آئندہ بارہ کرسیوں پر



بیٹھو گے، تم ایسے دیندار ہو گے جیسے اسرائیل علیہ السلام (یعقوب علیہ السلام) کے بارہ بیٹے دیندار تھے۔ پھر آپ نے ان تمام کی قیامت کے دن کامیابی کی خبر دی۔ پھر اسی متی انجیل اور دوسری انجیلوں نے اس کے خلاف بیان کیا کہ ان شاگردوں میں سے ایک یہود تھا جس نے یہودیوں سے تیس درہم رشوت لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکو پتہ دے دیا، بلکہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے آیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے حوالے کر دیا، آپ نے فرمایا اس کیلئے بربادی ہو، کاش یہ بیدار ہی نہ ہوتا۔ متی کے ایک قول کے مطابق بارہ نیک تھے، قیامت میں وہ سب اللہ تعالیٰ کے مقرب تھے، اور دیندار تھے اور متی کے دوسرے قول کے مطابق ایک ان میں سے بدترین گنہگار تھا۔

ایک ہی انجیل کے دو قول ایک دوسرے کے مخالف ٹھہرے جو انجیل کے من گھڑت ہونے پر دلالت کر رہے ہیں، صحیح انجیل تو صرف وہ تھی جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔  
(روح المعانی)

### تفسیر نعیمی سے ایک خوبصورت اقتباس:

اس امت میں بھی بعض لوگ یہود سے پیچھے نہ رہے، بلکہ انہوں نے ان سے چار قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اس پر گواہ ہیں کہ کچھ عبارتیں اپنی اور کچھ قرآن پاک کی آیتیں ملا کر کہتے ہیں کہ یہ مجھے الہام ہوا۔

”یا ابتھا المرأة توبی توبی انارادوہ الیک وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامة“  
یہ مرزا جی کا الہام ہے ماشاء اللہ مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا پوند۔ اب ذرا ترجمہ سنئے:

”اے محمدی بیگم (مرزا جی کی عرشی منکوحہ) توبہ توبہ کر (تو دوسرے کے نکاح میں کیوں چلی گئی) اے مرزا جی ہم اس عورت کو تم پر لوٹائیں گے اور تمہارے قسبین کو قیامت تک کفار پر غالب رکھیں گے، (حالانکہ مرتے دم تک محمدی بیگم مرزا جی کے ہاتھ نہ آئی)

یہ ہے ”یَلُوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ“ کی کھلی مثال مگر چونکہ قرآن پاک کا رب تعالیٰ محافظ ہے، اس لئے یہ تحریفیں مٹ گئیں، قرآن پاک اپنے اصلی سے جگمگاتا رہے گا (جگمگا رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک جگمگاتا رہے گا) (نعیمی)  
مودودی صاحب کی کذب بیانی:

مودودی صاحب ﴿یَلُوُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ﴾ کی تفسیریوں بیان کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ



کتاب الہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کچھ سے کچھ مطالب نکالتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کی خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنادیتے ہیں۔

اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب سے بھی مفقود نہیں ہیں، مثلاً بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیہ ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ میں ”انما“ کو ”ان ما“ پڑھتے ہیں، اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ”اے نبی کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا“ (تفہیم القرآن)

اس کے متعلق اتنا ہی کہنا آسان ہے ”لعنة الله على الكذابين“ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی نورانیت کے منکر کو تو بہت لوگ ملتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی بشریت کا کوئی منکر نہیں۔

ہاں البتہ اہلسنت وجماعت کا یہ مذہب ہے کہ نبی کریم ﷺ حقیقت میں نور ہیں اور ظاہر طور پر بشر ہیں۔ آج تک کسی اہل سنت وجماعت کے عالم نے یہ معنی نہیں کہا جو مودودی صاحب نے اہل سنت وجماعت کی طرف منسوب کیا ہے ”اللهم انا اعوذ بك من الكذابين“ ”انما“ کا لفظ حصر کیلئے آتا ہے ”ما“ اور ”الا“ کا معنی دیتا ہے۔

بعض حضرات مختصر معنی بیان کر دیتے ہیں۔ ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ”فرمادیجئے بیشک میں بشر ہوں تمہارے جیسا“ (یہ ترجمہ کامل نہیں) کامل ترجمہ جو طلباء کو ہم کراتے ہیں وہ یہ ہے ”فرمادیجئے جزا میں نیست میں بشر ہوں تمہارے جیسا“ عام فہم ترجمہ یہ ہے ”سوائے اس کے نہیں کہ میں بشر ہوں تمہارے جیسا“ کبھی یوں ترجمہ کیا جاتا ہے ”فرمادیجئے میں نہیں مگر تمہارے جیسا بشر“ اس ترجمہ سے مودودی صاحب غلطی کا شکار ہوئے ہیں کہ آپ نے کسی سنی مولوی کی تقریر سنی اور لفظ ”مگر“ کی طرف توجہ نہ کر سکے، خبط حواسی اور ضد کی وجہ سے انہوں نے یوں سمجھ لیا کہ وہ مولوی یوں ترجمہ کر رہا تھا ”فرمادیجئے کہ میں نہیں ہوں تمہارے جیسا بشر“ ”مگر“ کو مودودی صاحب نہ سن سکے، ”الٹا چور کو توال کو ڈانٹنے“ کے متعلق جھوٹی الزام تراشی علماء اہلسنت پر، اللہ تعالیٰ جھوٹے الزامات سے محفوظ رکھے، دجال جس کی ایک آنکھ نہیں ہوگی اس (کانثرے) سے نبی کریم ﷺ نے پناہ طلب کرنے کے متعلق اسی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ وہ جھوٹا اور مکار ہوگا۔

عن قتادة قال سمعت رسول الله ﷺ ما مني نبي الا وقد اندر امته الا عور الكذاب الا

انه عور وان ربكم عزوجل ليس يا عور مكتوب بين عينيه ك ف ر

(مسلم ۲ باب ذکر الدجال صفحہ نمبر ۴۰۸)



حضرت قتادہ صفرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، کوئی نبی نہیں مگر یہ کہ اس نے اپنی امت کو یک چشم گل (کانثرے) چھوٹے سے ڈرایا، خبردار وہ یک چشم گل (کانثر) ہوگا، بیشک تمہارا رب عزوجل یک چشم گل نہیں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا ”ک ف ر“ کہ وہ کافر ہوگا۔



مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝

(آیہ نمبر ۷۹)

(۱) کسی آدمی کا حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم و پیغمبری دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، ہاں یہ کہے گا کہ اللہ والے ہو جاؤ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس سے کہ تم درس کرتے ہو۔ (کنز الایمان)

(۲) نہیں ہے کسی بشر کیلئے کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ کہے لوگوں سے ”تم ہو جاؤ میرے بندے سوائے اللہ کے، اور (وہ کہے گا) لیکن ہو جاؤ اللہ والے اس سبب سے کہ تم سکھاتے ہو کتاب، اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

## شان نزول :

شان نزول کی چند وجوہ ہیں جو تمام ہی مجموعی طور پر پائی گئی ہیں، یعنی چند واقعات کے بعد آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ ابورافع قرظی نے بیان فرمایا کہ جب اہل نجران سے یہود و نصاریٰ کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوا تو آپ نے ان کو دعوت اسلام دی، تو وہ کہنے لگے۔

”اتريد يا محمد ان نعبدك كما تعبد النصارى عيسى ابن مريم“



اے محمد! کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں جیسا کہ نصاریٰ عیسیٰ ابن مریم کی عبادت کرتے تھے۔ ان اہل نجران میں ایک نصرانی تھا، جسے رئیس کہا جاتا تھا، وہ کہنے لگا "او ذاك تريد منا يا محمد" اے محمد کیا واقعی تم ہم سے یہی ارادہ رکھتے ہو؟ "فقال رسول الله ﷺ "معاذ الله ان نعبد غير الله او نأمر بعبادة غيره" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "معاذ اللہ" (اللہ کی پناہ) ہم اللہ کے بغیر کسی اور کی عبادت کریں یا کسی اور کی عبادت کا حکم دیں۔ "فانزل الله آية" اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔

(2) عبد بن حمید حسن بھری رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔

يا رسول الله نسلم عليك كما يسلم بعضنا على بعض افلا نسجد لك؟ قال، لا، ولكن كونوا اکرموا انبيكم واعرفوا الحق لاهله فانه لا ينبغي ان يسجد لاحد من دون الله" یا رسول اللہ ہم آپ کو ایسے ہی سلام کرتے ہیں جیسے ہمارے بعض بعض کو سلام کرتے ہیں، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کر لیا کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں، لیکن تم اپنے نبی کی عزت کرو، اور حق کو پہچانوں کہ اس حق کا حقدار کون ہے، کسی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرے۔

(3) یہود کے بعض لوگ بعض کی عبادت کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کر دیتے تھے، اور کہتے یہ تھے کہ یہ اللہ کی کتاب میں ہے، ان کا یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا تھا، تو اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا گیا۔ (از روح المعانی)

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾

"نہیں ہے کسی بشر کیلئے کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے پھر وہ کہے لوگوں سے تم ہو جاؤ میرے بندے سوائے اللہ کے"

ان الفاظ مبارکہ کے چند مطالب ہیں:

(1) بالفرض محال "انہم لو ارادوا ان يقولوا ذلك لمنعهم الله عنه"

اگر وہ یہ کہنے کا ارادہ کریں کہ ہمیں خدا کہو، تم اللہ کے سوا ہمارے بندے بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ ان کو منع کر دے گا۔



اس پر دلیل یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَا خَظْمَانِئُهُ بِالْيَمِينِ﴾  
(سورۃ الحاقہ آیہ نمبر ۴۴، ۴۵) ”اور اگر وہ ہم پر ایک بات بھی بنا کر کہتے، ضرور ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے“

سورۃ الحاقہ کی آیات مبارکہ کا اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی یہ بتا رہا ہے کہ یہ کلام بالفرض محال پر مبنی ہے، کہ ”اگر وہ بات بناتے ہم ان کو گرفت میں لیتے“ نہ انہوں نے کہا نہ ہی ان کی پکڑ ہوئی، اسی طرح یہاں بھی یہی مطلب ہے کہ اگر بالفرض محال وہ ارادہ کرتے تو رب تعالیٰ ان کو روک دیتا، نہ انہوں نے ارادہ کیا نہ ہی روکنے کی ضرورت درپیش آئی۔

(2) دوسرا مطلب یہ ہے ”الثانی ان الانبیاء علیہم السلام موصوفون بصفات لا یحسن مع تلك الصفات ادعاء الالهية والربوبية“

کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے کامل صفات عطاء فرمائی ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان سے تصور ہی ممکن نہیں کہ وہ اپنی الوہیت اور اپنی ربوبیت کا دعویٰ کریں۔

(3) ومنها ان الله تعالى آتاهم الكتاب والوحي وهذا لا يكون الا في النفوس الطاهرة والارواح الطيبة والنفس الطاهرة قيمته ان يصدر عنها هذه الدعوى  
اور اس کے مطالب سے یہ مطلب ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب عطاء فرمائی اور ان کی طرف وحی کی یہ منصب صرف پاکیزہ نفوس اور پاکیزہ ارواح کو ہی حاصل ہو سکتا ہے، اور پاکیزہ نفوس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی الوہیت و ربوبیت کا دعویٰ کریں۔

انبیاء کرام کے نفوس کی طہارت اور ان کی ارواح کے طیب ہونے پر ارشادات باری تعالیٰ روز روشن کی طرح دلالت کر رہے ہیں۔ ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ ”اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں (منصب) رسالت کو رکھتا ہے“

(الدخان ۳۲)

”اور تحقیق ہم نے اس کو چن لیا ہے علم پر اس جہان والوں پر“

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ ”اللہ ہی پسند فرماتا ہے ملائکہ سے پیغام پہنچانے والوں کو اور لوگوں سے رسولوں کو“

(4) اللہ تعالیٰ نبوت ان ہستیوں کو عطاء فرماتا ہے جن کی قوت نظریہ اور قوت عملیہ کامل ہو، قوت نظریہ کو کمال حاصل ہوتا ہے علوم اور معرفت حقیقیہ سے، اور قوت عملیہ کو کمال حاصل ہوتا ہے جب وہ برے اخلاق سے پاک ہو،



جب رب تعالیٰ بعض شخصیات کو قوت نظریہ اور قوت عملیہ میں کمال عطاء فرما دیتا ہے، ان میں سے جن کو منصب رسالت کا اہل سمجھتا ہے ان کو منصب رسالت عطاء فرما دیتا ہے ایسی ہستیوں سے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود اپنی الوہیت (خدائی) کا دعویٰ کر بیٹھیں۔

(5) ان الله تعالى لا يشرف عبده بالنبوة والرسالة الا اذا علم منه انه لا يقول مثل هذا الكلام  
اللہ تعالیٰ کو چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس بندے نے منصب رسالت و نبوت پر فائز ہو کر اپنے معبود ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرنا ان کو ہی نبوت عطاء کرتا ہے۔

(6) اللہ کے رسول دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے احکام پہنچا رہے ہیں، وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت پر معجزات کے ذریعے دلیل قائم کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہمیں جو معجزات عطاء کر دئے گئے ہیں وہی ہماری صداقت کے لئے کافی ہیں۔

”فلو امرهم بعبادة نفسه فحينئذ تبطل دلالة المعجزة على كونه صادقا وذلك غير جائز“  
اگر نبی اپنی عبادت کرنے کا حکم دیں کہ تم ہماری عبادت کرو تو ان کا معجزات کے ذریعے اپنی نبوت پر دعویٰ کی صداقت پر دلیل قائم کرنا ممکن نہیں رہتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی اپنی صداقت معجزات کے ذریعے ظاہر کرے اور پھر دعویٰ خدائی بھی کرے۔  
(ماخوذ از کبیر)

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ میں بشر سے مراد کون ہے، بعض حضرات نے بیان کیا ہے ”بشر“ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور کتاب سے مراد ”انجیل“ ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے لائق نہ تھا کہ آپ کو انجیل اور حکم اور نبوت عطاء کی گئی تو آپ نے یہ کہا ہو کہ تم میرے بندے بن جاؤ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آیت کریمہ میں بشر سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن پاک ہے چونکہ ہم یہود کے جواب میں آیت کریمہ نازل ہوئی جب انہوں نے کہا ”یا محمد اتريد ان نعبدك وتتخذك ربا“ اے محمد ﷺ کیا تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں اور تمہیں رب مانیں۔ اگرچہ نبی کریم ﷺ نے یوں جواب دے دیا:-

”قال معاذ الله ان امر بعبادة غير الله وما بذلك امرني الله وما بذلك بعثنى فانزل الله هذه آية“  
اللہ کی پناہ کہ میں کسی کو اللہ کے غیروں کی عبادت کو حکم دوں مجھے اللہ تعالیٰ نے نہ ہی اس کا حکم دیا ہے اور نہ ہی اسکے لئے مجھے مبعوث کیا ہے تو آپ کے اس ارشاد پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرما دیا۔

لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ”بشر“ سے مراد عام ہو اور کتاب سے مراد بھی عام ہو جو ہر آسمانی کتاب کو شامل ہو۔  
ما كان لبشر اى ما ينبغي لبشر ولجميع بنى آدم لا واحد له من لفظه كالقوم والرهط



و یوضع موضع الواحد والجمع

لفظ بشر واحد اور جمع دونوں پر اطلاق ہوتا ہے جس طرح قوم اور رھط کا کوئی اور مفرد نہیں یہ خود ہی مفرد ہیں لیکن جمع پر بولے جاتے ہیں ایسے ہی لفظ بشر کا کوئی اور مفرد نہیں یہ خود مفرد ہے اور اس کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔

اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ بنی آدم سے کسی بشر کے یہ لائق نہیں کہ اسے کتاب، حکم اور نبوت دی جائے تو وہ کہے کہ میرے بندے ہو جاؤ۔ (ماخوذ از خازن)

عموم الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ آیت کریمہ تمام انبیاء کرام اور تمام آسمانی صحیفوں اور کتابوں کو مشتمل ہے۔ خیال رہے کہ خازن کی طرح ہی معالم التنزیل میں بھی ہے اور کبیر میں بھی تقریباً یہی ہے۔ ”والحکم“ یعنی الحکمة والسنة او امضاء الحکم، حکم عطاء کرنے سے مراد یہ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اسے حکمت عطاء کرے اور سنت عطاء کرے یا معنی یہ ہوگا کہ حکم جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ (مظہری)

”والحکم ای الفہم والعلم وقیل امضاء الحکم عن اللہ عز وجل“  
حکم کا مطلب علم وفہم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے علم وفہم عطا کر دے، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے احکام جاری کرنے کی اجازت دے دے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

چونکہ لفظ ”حکم“ وسیع تر مفہوم کے پیش نظر کئی معانی اور مطالب پر مشتمل تھا، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں حکم کا معنی بھی حکم ہی کیا ہے تاکہ تمام مطالب کو شامل ہو جائے، راقم نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔

”والنبوة“ ای المنزلة الرفیعة “نبوت سے مراد ”بلند مرتبہ“ ہے، نبی چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ ہیں، بحیثیت نورانیت کے رب تعالیٰ سے فیض لیتے ہیں، اور بحیثیت بشر ہونے کے بندوں تک وہ فیضان پہنچاتے ہیں، اس منصب کی وجہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بلند مقام انبیاء کرام کا ہے، پھر انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، تفصیل تیسرے پارے کی ابتداء نجوم الفرقان میں دیکھئے۔

﴿ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾

”پھر وہ کہے لوگوں سے تم ہو جاؤ میرے بندے اللہ کے سوا“

”العباد جمع عبد قال القاضي وهو هنا من العبادة ولم يقل عبدا لانه من العبودية وهي لا تمنع ان تكون لعبير الله تعالى ولهذا يقال هؤلاء عبيد زيد ولا يقال عباده“



عباد جمع ہے عبد کی، قاضی اور ابو زید نے کہا کہ ”عباد“ عبادت سے لیا ہوا ہے، اسی وجہ سے ”عبید“ نہیں کہا گیا، کیونکہ رب تعالیٰ کے غیروں کی عبادت منع ہے، عبودیت منع نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ کہا جاسکتا ہے ”ہؤلاء عبید زید“ یہ زید کے غلام ہیں، لیکن یہ کہنا جائز نہیں ”ہؤلاء عباد زید“ یہ زید کے بندے ہیں۔  
(روح المعانی)

**نتیجہ:** واضح ہے کہ بندوں کی غلامیت تو پائی گئی ہے لیکن بندوں کی عبادت نہیں پائی گئی۔

دینی طاہر اکرام کی توجہ کیلئے:

مِنْ دُونِ اللَّهِ ”میں تین ترکیبیں پائی گئی ہیں“

(1) مِنْ دُونِ اللَّهِ، متعلق ہو جائے ”عبادا“ کے کیونکہ اس میں فعل والا معنی بھی موجود ہے ”عبادت کرو“

(2) ”عبادا“ صفت اول ہو اور مِنْ دُونِ اللَّهِ صفت ثانیہ ہو۔

(3) ”عبادا“ حال واقع ہو اور مِنْ دُونِ اللَّهِ صفت کی وجہ نکرہ مخصّصہ ہو جائے۔ (از روح المعانی)

”وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ“ لیکن ہو جاؤ اللہ والے یہاں کچھ الفاظ پوشیدہ ہیں، مطلب یہ ہے ”وَلَكِنْ يَقُولُ لَهُمْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ“ (لیکن وہ ان کو کہتے ہیں ہو جاؤ اللہ والے) ”رَبَّانِيِّينَ“ بظاہر ایک لفظ ہے لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہے۔

(1) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ”ربانی“ اصل میں ”ربی“ ہے جس میں یا نسبت کی پائی گئی ہے، یعنی منسوب ہے رب کی طرف، مفہوم یہ حاصل ہوا کہ وہ اللہ کو جاننے والا ہے اور اس کی طاعت (فرمانبرداری) پر ہمیشہ عمل کرنے والا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے ”رجل الہی“ اس میں بھی یا نسبت کی ہے، معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی طاعت کی طرف متوجہ ہونے والا، الف اور نون ”ربانی“ میں مبالغہ کیلئے ہے جو اس صفت کے کمال پر دلالت کر رہا ہے، یعنی وہ کہیں گے خالص اور کامل اللہ والے ہو جاؤ۔

جب کسی کو یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ بالوں والا ہے تو کہا جاتا ہے ”ہو شعری“ اور جب یہ کہنا مقصود ہو کہ وہ زیادہ بالوں والا ہے تو کہا جاتا ہے ”ہو شعرانی“ داڑھی والے کو کہتے ”لحسی“ اور لمبی اور گھنی داڑھی والے کو کہتے ہیں ”لحیانی“ اسی طرح گردن کی طرف نسبت کرنی تو کہا جاتا ہے ”رقبی“ اور جب موٹی گردن والا کہنا ہو تو کہا جاتا ہے ”رقبانی“

(2) دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”ربانیوں“ کا مطلب ہے ”اصحاب علم“ واحد اس کا ہے ”ربانی“

”هو الذي يرب العلم ويرب الناس اي يعلمهم ويصلحهم ويقوم بامرهم“



اس صورت میں ”ربانی“ کا مطلب علم حاصل کرنے والا، اور لوگوں کی تربیت کرنے والا، یعنی لوگوں کو علم سکھانے والا، اور ان کی اصلاح کرنے والا، اور ان کے معاملات کو درست کرنے والا، اس صورت میں بھی الف ونون مبالغہ کیلئے ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”ربان، عطشان، شعبان اور عریان“ ان سب میں مبالغہ کا معنی پایا گیا ہے۔ زیادہ سیر آب“ زیادہ پیاسا، زیادہ سیر، زیادہ ننگا۔

اس صورت میں اور پہلی صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں ”الف ونون“ زائد ہیں، اور دوسری صورت میں کلمہ کے ہیں۔

(3) الربانی هو الذی یرب الناس فالربانیون هم ولاۃ الامۃ والعلماء

”ربانی“ اسے کہا جاتا ہے جو لوگوں کی تربیت کرے، لہذا احکام اور علماء کو ”ربانیون“ کہا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ﴾

”اور اس سبب سے کہ تم پڑھاتے ہو کتاب اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو“

خیال رہے کہ ”تُعَلِّمُونَ“ میں دو قرأتیں ہیں ایک تخفیف والی، یعنی یہ لفظ ماخوذ ہے ”علم يعلم علما“ سے اور دوسری قرأت میں تشدید ہے، یعنی ”تُعَلِّمُونَ“ تعلیم سے ماخوذ ہے۔

”و كلاهما صواب لانهم كانوا يعلمونه في انفسهم ويعلمونه غيرهم“

دونوں قرأتیں درست ہیں، یعنی وہ خود علم حاصل کرتے ہیں، اور غیروں کو علم سکھاتے ہیں۔ (کبیر)

وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو) ”تَدْرُسُونَ“ کا معنی ”درس الكتاب“ (اس نے کتاب پڑھی) اور ”درس العلم“ سے لیا ہوا ہے، درس العلم (اس نے علم حاصل کیا) یعنی اسباق کو یاد کر کے علم کے اثرات کو حاصل کیا۔

”ولما كان تناول ذلك بمداومة القراءة عبر عن ادامة القراءة بالدرس“

جب علم حاصل کرنے کیلئے بار بار پڑنا پڑتا ہے، جب لگاتار پڑھتے رہیں تو علم حاصل ہوتا رہتا ہے ورنہ حاصل کئے ہوئے مسائل بھول جاتے ہیں، اس لئے ہمیشہ پڑھنے کو جاری رکھنے کو درس کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”و درسو ما فیہ“ میں یہی معنی لیا گیا ہے (وہ پڑھتے رہو جو اس میں ہے) اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”وَبِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ“ میں بھی یہی معنی استعمال ہے۔ (مفردات راغب)



راقم نے مفردات راغب کو ہی دیکھ کر ترجمہ لکھا ہے ”اور اس سبب سے کہ تم پڑھاتے ہو کتاب اور اس سبب سے کہ تم پڑھتے رہتے ہو“

فائدہ جلیلہ گذشتہ سے پیوستہ:

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ ”کسی بشر کیلئے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور حکم اور نبوت عطاء کرے“ ﴿ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي﴾ ”پھر وہ لوگوں کو کہے تم میرے بندے ہو جاؤ“ اس مقام پر تین چیزوں کا ذکر کیا ”کتاب“ اور ”حکم“ اور ”نبوت“ ”اشارة الى ثلاثة اشياء وذكرها على ترتيب في غاية الحسن“ ان تین چیزوں میں بہت اچھی ترتیب رکھی گئی ہے۔

وذلك لان الكتب السماوى ينزل اولاً، ثم انه يحصل في عقل النبی فهم ذلك الكتاب، واليه الاشارة بالحكم، فان اهل اللغة والتفسير اتفقوا على ان هذا الحكم هو العلم قال تعالى ”وَاتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًا“ يعنى العلم والفهم، ثم اذا حصل فهم الكتاب فحينئذ يبلغ ذلك الى الخلق وهو النبوة فما حسن هذا الترتيب“

آسمانی کتابوں کو پہلے نازل کیا جاتا ہے، پھر نبی کی عقل میں اس کتاب کا علم و فہم ڈال دیا جاتا ہے، اسی کا ذکر ”حکم“ سے کیا کیونکہ اہل لغت اور اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ اس مقام میں ”حکم“ سے مراد ”علم“ ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ”وَاتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًا“ میں ”حکم“ سے مراد ”علم و فہم“ ہے، یعنی ہم نے عطاء کیا اسے (صغیر کو) علم و فہم بچپن میں، پھر جب کتاب کی سمجھ عطاء کر دی جاتی ہے تو اس وقت نبی مخلوق کو تبلیغ کرتے ہیں، وہ ہے نبوت، اب دیکھئے کتاب کا ذکر پہلے، حکم (علم و فہم) کا ذکر اس کے بعد، اور نبوت کا ذکر اس کے بعد، کتنی ہی اچھی ترتیب رکھی گئی ہے۔ (از تفسیر کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

لفظ ”ما“ دونوں جگہ مصدر کیلئے ہے، تقدیر عبارت کی یہ ہے۔ ”کونو ار بائین بسبب کونکم عالمین ومعلمین وبسبب دراستکم الكتاب“ (بلکہ وہ کہتے ہیں) تم اللہ والے ہو جاؤ بسبب عالم اور معلم ہونے کے اور بسبب تمہارے کتاب پڑھنے کے۔ (کبیر)



**فائدہ عظیمہ:** دلت الآیة علی ان العلم والتعليم والدراسة توجب كون الانسان ربانياً آیة کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ علم اور تعلیم اور دراستہ سے انسان ربانی بن جاتا ہے، لیکن صرف علم حاصل کرنا مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے۔

”وما ذاك الا ان يكون بحیث يكون تعلمه لله وتعليمه ودراسة لله وبالجملة فان يكون الداعی له الى جميع الافعال طلب مرضاة الله والصارف له عن كل الافعال الهرب عن عقاب الله“  
کہ وہ علم و تعلیم و دراستہ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہو، اس میں دنیا کا مال حاصل کرنا، ریاء کاری اور چرچا مقصود نہ ہو، تمام افعال میں مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنا ہو، اور تمام افعال پر مقصد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا مقصود ہو۔  
”فمن اشتغل بالتعليم والتعليم لالهذا المقصود ضاع سعيه وخاب عمله“  
جس شخص نے علم حاصل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کو مد نظر نہ رکھا اس کی کوشش ضائع ہو گئی اور اس کے عمل ضائع چلے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”نعوذ بالله من علم لا ينفع وقلب لا يخشع“ ہم اللہ کی پناہ پکڑتے ہیں اس علم سے جس میں نفع نہ ہو، اور اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو۔ (ماخوذ از کبیر بتقدیم و تاخیر)



وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝

(آیہ نمبر ۸۰)

- (۱) اور نہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرا لو کیا تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو گئے۔  
(کنز الایمان)
- (۲) اور نہیں تمہیں حکم دے گا کہ تم ٹھہراؤ فرشتوں اور نبیوں کو رب، کیا حکم دے گا تمہیں کفر کا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو گئے۔  
(نجوم الفرقان)

**شان نزول :**

تقریباً وہی جو پچھلی آیہ میں گزر چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کو کہا کہ تم فرشتوں کی عبادت نہ کرو اور یہود



کو کہا تم عزیز ﷺ کی عبادت نہ کرو، اور نصاریٰ کو کہا تم عیسیٰ ﷺ کی عبادت نہ کرو، تو ان سب کی طرف سے یہ جواب تھا "اگر ید ان نتخذک رباً" کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہیں رب ٹھہرائیں۔ اس وقت یہ آیت کریمہ اور اس سے پہلے جو آیت ہے یہ نازل ہوئیں۔

پہلی آیت کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور علم و فہم اور نبوت عطاء کرے تو وہ لوگوں کو کہے کہ تم میرے بندے ہو جاؤ، بلکہ وہ تو کہتا ہے تم اللہ والے ہو جاؤ کیونکہ تم اہل کتاب ہو کہ کتاب پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ اس آیت کریمہ کا تعلق چونکہ ماقبل سے ہی ہے، اس لئے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اسے کتاب، اور علم و فہم، اور نبوت عطاء کی جائے تو وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہراؤ، کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی تمہیں حکم دے کہ تم اسلام لانے کے بعد کافر ہو جاؤ؟ ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

راقم نے ابھی جو دونوں آیات کا خلاصہ بیان کیا ہے وہ اسی ترکیب کے مطابق ہے جس میں "ولا یا امرکم" کو منصوب پڑھا گیا ہے، اور عطف اس کا "بقول" پر ہے تو یقینی بات ہے کہ معطف علیہ سے پہلی عبارت ساتھ ملے گی اور یہ بھی خیال رہے کہ خلاصہ سے یہ بھی سمجھ آ رہا ہے کہ "ولا یا امرکم" میں "لا" زائد ہے نفی والا معنی "ماکان لبشر" سے سمجھ آ رہا ہے۔ زیادہ مفسرین کرام کا رجحان اسی ترکیب کی طرف تھا اسی لئے راقم نے دونوں آیات کا خلاصہ اسی ترکیب کے مطابق تحریر کر دیا ہے۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ "ولا یا امرکم" مرفوع ہے اور جملہ استینافیہ ہے، اس کا عطف "بقول" پر نہیں، اور "لا" بھی زائد نہیں، بلکہ تاکید نفی کیلئے ہے۔ جملہ استینافیہ کبھی سوال کے جواب میں بھی آتا ہے، اس ترکیب کے لحاظ پر ضمناً سوال ہوگا کہ نبی یہ حکم تو نہیں دیتے کہ تم ہمارے بندے ہو جاؤ، لیکن کیا یہ حکم دیتے ہیں کہ فرشتوں کو اور ہمارے بغیر دوسرے نبیوں کو خدا ٹھہراؤ؟ تو اس کا جواب دیا گیا کہ نبی تمہیں حکم نہیں دیتے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب ٹھہراؤ۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی)

ابھی تک جو بحث کی ہے اس کے مطابق "ولا یا امرکم" کی مرفوع ضمیر نبی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق بشر کی شان کے لائق نہیں کہ وہ تمہیں حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہراؤ۔ دوسری ترکیب کے لحاظ پر پھر تین احتمال ہیں ایک یہ کہ مرفوع ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے



”وقال ابن جریج لا یأمرکم محمد“ ابن جریج نے کہا آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) تمہیں حکم نہیں دیتے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہراؤ۔ ”وقیل لا یأمرکم الانبیاء“ اور ایک قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کرام میں سے کوئی نبی بھی تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خدا ٹھہراؤ۔ اس صورت میں ضمیر مرفوع ہر نبی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے ”قال الزجاج ولا یأمرکم اللہ“ کہ مرفوع اللہ کی طرف لوٹے اور معنی یہ ہو کہ ”اللہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب ٹھہراؤ“ یہ قول زجاج کا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

### ملائکہ اور انبیاء کرام کی تخصیص کی وجہ:

الماخص الملائکۃ والنبیین بالذکر لان الذین وصفوا من اهل الکتاب بعبادة غیر اللہ لم یحک عنهم الا عبادة الملائکۃ وعبادة المسیح وعزیر فلہذا المعنی خصہما بالذکر جن اہل کتاب (اور مشرکین مکہ) کو خطاب ہے وہ صرف ملائکہ اور حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے، اسلئے ملائکہ اور انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔ (ماخوذ از کبیر)

(ایا مرم) استفہام بمعنی الانکار ای لا یفعل ذلک

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”ایا مرم“ میں ہمزہ استفہامیہ (سوالیہ) انکار کے لئے استعمال ہے ”کیا وہ تمہیں حکم دے گا کہ تم اسلام لانے کے بعد کافر ہو جاؤ؟ نہیں، یہ حکم وہ ہرگز نہیں دے گا۔ (از کبیر) علامہ زحشری نے کہا ”قوله بعد اذ انتم مسلمون دلیل علی ان المخاطبین کانوا مسلمین وہم الذین استاذنوا الرسول ﷺ فی ان یسجدوا لہ“

کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ”بعد اذ انتم مسلمون“ اس پر دلیل ہے کہ مخاطبین وہ مسلمان تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ (کشاف)

راقم کا موقف یہ ہے کہ ظاہر کو دیکھتے ہوئے کشاف کا قول بھی درست ہے، لیکن جب خطاب اہل کتاب کو ہو تو اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے کتاب کو ماننے کے بعد کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا؟ ہرگز یہ حکم نہیں دے گا۔ جب تم کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہو تو صرف اللہ کو معبود مانو، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس کے بندے ہیں، معبود نہیں۔ (لکھنے کے بعد مظہری کو دیکھا تقریباً یہی اس میں بیان کیا گیا)

جب خطاب مشرکین مکہ کو ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اسلام قبول کو لو تا کہ تم فرشتوں کی عبادت کرنا چھوڑ



دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی تمہیں اسلام لانے کے بعد فرشتوں کی عبادت کا حکم ہرگز نہیں دیں گے۔  
**فائدہ:** فحرم الله تعالى على الانبياء ان يتخذوا الناس عبدا بتالھون لهم ولكن الزم

الخلق حرمتهم وقد ثبت عن النبي ﷺ انه قال لا يقولن احدكم عبدی وامتی وليقل  
 فتای وفتاتی ولا يقل احدكم ربی وليقل سیدی“  
 (قرطبی)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام پر حرام کر دیا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا بندہ بنالیں اور ان کو کہیں کہ تم ہماری عبادت کرو، البتہ مخلوق پر لازم کر دیا ہے کہ وہ ان کی تعظیم و تکریم کریں، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تم میں سے ہرگز کوئی شخص عبدی (میرے عبد) اور ”امتی“ (میری باندی) نہ کہے، بلکہ ”فتای“ (میرے جوان) اور ”فتاتی“ (میری جوان) کہے۔ یعنی جب کوئی اپنے غلام کو ”عبدی“ کہے، یا اپنی غلامہ کو ”امتی“ کہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ”عبدی“ اور ”امتی“ کہنے والا اپنے آپ کو معبود سمجھتا ہے، لیکن ”فتای“ اور ”فتاتی“ کہنے میں یہ احتمال نہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی کو ”ربی“ (میرے رب) نہ کہے، بلکہ ”سیدی“ (میرے سردار) کہے کیونکہ ”ربی“ کہنے میں وہم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ اسے اپنا معبود سمجھ رہا ہے، لیکن ”سیدی“ کہنے میں یہ وہم نہیں پایا جاتا۔

آیہ کریمہ سے معتزلہ کا استدلال:

جبائی معتزلی نے آیہ کریمہ سے دلیل یہ پکڑی ہے کہ یہ کہنا درست نہیں ”اللہ تعالیٰ سے کفر، اس سے جاہل ہوتا ہے“ اور اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ”اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حاصل ہوتا ہے“ یہ قول کیوں درست نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کا کفر بھی ثابت کیا ”ایا امرکم بالكفر“ سے، لیکن ان کو عارف باللہ بھی ثابت کیا ہے۔

”فلما حصل الکفر ههنا مع المعرفة بالله دل ذلك على ان الايمان به ليس هو

المعرفة والكفر به تعالى ليس هو الجهل به“

جب یہ پتہ چل گیا کہ اس آیہ کریمہ میں جن لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے وہ کافر بھی تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل تھی، تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صرف یہ کہنا کہ ”اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے ہی اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور اس سے کفر کرنے سے اس سے جہالت حاصل رہتی ہے یہ قول درست نہیں۔

معتزلہ کی دلیل کا رد:

والجواب ان قولنا الکفر بالله هو الجهل به لا تعنى به مجرد الجهل بكونه موجودا



بل نعتی به الجہل بذاتہ وبصفاته السلبیة و صفاته الاضافیة انه لا شریک له فی المعبودیة فلما جہل هذا فقد جہل بعض صفاته

ان کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قول کہ ”اللہ تعالیٰ سے کفر اللہ تعالیٰ سے جہالت کی وجہ سے ہے“ بالکل درست نہیں، کوئی غلط نہیں، کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کو بھی نہیں جانتے، بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ سے جاہل ہوتے ہیں، اگر وہ یہ جانتے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراتے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ممانعت سے جاہل تھے تو اس کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے جاہل تھے۔

(ماخوذ از کبیر)

نتیجہ یہ واضح ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت رکھنے کے باوجود کافر تھے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات سے جاہل تھے، کاش کہ ان کو اہلسنت و جماعت کا علم حاصل ہوتا تو وہ ظاہری علم رکھنے کے باوجود اس قسم کے لغویات نہ کہتے۔ ”ایامرکم بالكفر بعداذا انتم مسلمون“ کی تفسیر میں صابونی میں یوں ذکر ہے۔

”ای لا یفعل ذلک الامن دعاالی عبادة غیر اللہ ومن عاد الی عبادة غیر اللہ فقد دعا الی الکفر“ تمہارے ایمان لانے کے بعد اللہ اور اس کے نبی تو تمہیں کفر کا حکم نہیں دیں گے، ہاں مگر وہ شخص جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دے گا، اور جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دے وہ کفر کی دعوت دے گا، انبیاء کرام نے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ (سورۃ الانبیاء آیہ نمبر ۲۵) ”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر ہم وحی کرتے اس کی طرف کہ بیشک کوئی معبود نہیں سوائے میرے، تو میری ہی عبادت کرو“

(از صابونی)

**تنبیہ:** یہ بات واضح ہے کہ کوئی مسلمان صاحب علم اللہ تعالیٰ کے بندوں میں وہ صفات کبھی بھی نہیں جانتا جو اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، ہاں اگر اللہ تعالیٰ خود ہی انبیاء کرام کو ”رؤف، رحیم، حمید، حلیم“ بنا دے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ پھر بھی فرق واضح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں اور بندوں کی یہ صفات عطائی ہیں۔ اگر کوئی صاحب علم یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ رؤف ہے، رحیم ہے اور نبی کریم ﷺ بھی ”رؤف“ اور ”رحیم“ تو یہ سن کر کوئی کہہ دے کہ یہ تو شرک ہو گیا، تو چاہئے یہ کہ وہ اپنی جہالت کا علاج کرائے اور ذاتی و عطائی کا فرق سمجھے۔

”اللهم انا نعوذ بک من الضالین المتعصبین المعاندين“



وَإِذَا خَذَلَهُ مِيثَاقُ النَّبِيِّنَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (آیہ نمبر ۸۱)

(۱) اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا، سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (کنز الایمان)

(۲) اور یاد کرو جب لیا اللہ نے (پختہ) وعدہ نبیوں سے، جب میں تمہیں عطاء کروں کتاب اور حکمت، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا، اور تم ضرور بر ضرور اس کی امداد کرنا، فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا، اور (کیا) تم نے لے لیا ہے اس پر میرا بھاری ذمہ، ان تمام نے کہا ہم نے اقرار کر لیا ہے، فرمایا تم گواہ ہو جاؤ، اور میں تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں۔ (نجوم الفرقان)

سب سے پہلے تسکین البجان سے ایک ورق دیکھئے:

راقم کی سب سے پہلی تصنیف ”تسکین البجان فی محاسن کنز الایمان“ ہے۔

﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾

(محمود الحسن صاحب)	”پھر آدے تمہارے پاس کوئی رسول“
(مودودی صاحب)	”کل اگر کوئی دوسرا رسول آئے“
(عبدالماجد صاحب)	”پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے“



(اشرف علی صاحب)	”پھر تمہارے پاس کوئی اور پیغمبر آئے“
(فتح محمد صاحب)	”پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے“
(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)	”پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول“

وجہ فرق آوے، آئے اور تشریف لائے میں ثابت ہے، ہر ذی شعور کے فہم و ادراک سے بعید نہیں کہ ”تشریف لائے“ جس طرح ادب و احترام پر دل ہے، اسی طرح لفظ آوے اور آئے میں کیسے ادب و احترام؟ دوسرا فرق (جو درحقیقت مقصود بیان ہے) ”کوئی رسول“ عام ہے، اور ”وہ رسول“ خاص ہے۔

اس فرق کو سمجھنے کیلئے، پہلے اس آیت کریمہ کا کچھ مطلب ذہن نشین کریں، یہ وہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت عطا کر دوں، پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمہاری کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والے ہوں تو ضرور بر ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، پھر رب تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس میرے وعدے کو قبول کر لیا؟ تو انہوں نے عرض کیا ہم نے اقرار کر لیا۔

اب اس مفہوم کے سمجھنے کے بعد واضح ہوا کہ یہاں جن رسول مقبول ﷺ کے متعلق انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا وہ خاص رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اگر یہاں یہ وہم پیش کیا جائے کہ آیت کریمہ میں لفظ ”رسول“ نکرہ ہے، اس کے مطابق ”کوئی رسول“ ہی ترجمہ ٹھیک ہے ”وہ رسول“ یہ تو خاص ہے، یہ ترجمہ کیسے درست ہے۔

تو اس جواب یہ دیا جائے گا کہ نکرہ کاتنوین تعظیم سے خاص ہو جانا نحو کی کتب میں موجود ہے، اور تنوین کا تعظیم کیلئے ہونا بھی علم معانی میں مذکور ہے۔ جب معنی ”وہ رسول“ کیا جائے گا تو کھسیں ہوگی، جس سے مراد نبی کریم ﷺ ہی ہوں گے، اسی پر تفاسیر بھی دلالت کر رہی ہیں۔

﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ﴾ (جلالین)

”پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کرنے والے ہوں تمہاری کتاب و حکمت کی وہ محمد ﷺ ہیں“

یہ حکم اگرچہ بظاہر انبیاء کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔ ”وامم تبع لهم فی ذلک“ (جلالین) انبیاء کرام کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔ اب یہاں پر اگر یہ وہم پیش کیا جائے کہ انبیاء کرام سے وعدہ لینے اور اقرار کرانے کی وجہ کیا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ آخر الزمان ہیں، انبیاء کرام نے تو آپ کا زمانہ پانا ہی نہیں تھا، اس کا جواب صادی میں ہے، سوال و جواب اس طرح پیش کیا گیا ہے۔



قوله "اقررنا" جواب عن سؤال مقدر تقديره ماذا قالوا حينئذ وثمرة المعاهدة على محمد مع علم الله انه لا يأتى فى زمن نبي من الانبياء الثواب على العزم بالاتباع والعقاب على العزم بعدم الايمان فجمع الانبياء يثابون على الايمان بمحمد ومن عزم على عدم الايمان به لو ظهر عوقب

سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ انبیاء کرام میں سے کوئی نبی، حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں آئیں گے تو اس وعدہ و اقرار کا کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا عزم کرے اس کو ثواب دیا جائے گا، اور جو ایمان نہ لانے کا عزم کرے اسے عذاب دیا جائے گا۔ گویا جمیع انبیاء کرام کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کا ثواب دینا مقصود تھا، اور اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کو عذاب دیا جائے گا، یعنی اس حکم میں انبیاء کرام کے ساتھ چونکہ ان کی امتیں بھی داخل ہیں، اس لئے امتوں میں سے جس شخص نے ایمان نہ لانے کا عزم کیا وہ عذاب میں داخل ہوگا۔

اب اس بیان کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہی کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کے متعلق ہی ہے لہذا ایسا معنی کرنا جو عموم پر دال ہے جس سے مقصد واضح نہ ہو یقیناً اس سے بہتر وہی ترجمہ ہوگا جو تخصیص پر دلالت کرے گا اور مقصد کو واضح کرے گا۔ "ولنصرنه" ای الرسول وهو محمد ﷺ (تم اس کی امداد کرنا) اس سے مراد بھی محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں کہ تم ان کی امداد کرنا "جلا لیں"

(تسکین البیان صفحہ نمبر ۸۶، ۸۷)

**تنبیہ:** تسکین البیان میں راقم نے "اس سے بہتر وہی ترجمہ ہوگا" تحریر کر کے اشارہ کر دیا تھا کہ یہ ترجمہ جو کنز الایمان ہے یہ بہتر ہے اگرچہ اس میں دوسرے اقوال بھی ہیں وہ مرجوح ہیں۔ مرجوح اقوال مرجوح ہی ہوتے ہیں، تاہم زیادہ وضاحت انشاء اللہ قریب ہی خازن کے حوالہ سے آرہی ہے۔

﴿وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ﴾ "اور یاد کرو جب لیا اللہ نے (پختہ) وعدہ نبیوں سے"

"اذ" سے پہلے اگر "اذ کرو" واحد کا صیغہ مقدر ہو تو خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا، اب مطلب یہ ہوگا یاد کرو ان واقعات کو جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ انبیاء کرام سے عہد لینے کا بھی ہے، اسے بھی آپ یاد کریں۔ اور اگر "اذ کرو" جمع کا صیغہ مقدر ہو تو خطاب اہل کتاب کو ہوگا، جو واقعات ان کی کتاب میں اچکے تھے ان میں سے ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ "اے اہل کتاب یاد کرو جب اللہ نے وعدہ لیا نبیوں سے" (خازن)



## عجیب دل چسپ مسئلہ:

اصل الميثاق في اللغة عقد مؤكّد بيمين ومعنى ميثاق النبيين ما وثقوا به على انفسهم من طاعة الله فيما امرهم به ونهاهم عنه“

ميثاق کا اصل لغت میں معنی ہے ”وہ عقد جس کو قسم اٹھا کر پختہ کیا جائے“ انبیاء کرام سے رب تعالیٰ نے جو وعدہ لیا وہ مطلق تھا، لیکن انبیاء کرام نے خود اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کے امور کی طاعت کر کے اور منہیات سے رک کر اس وعدہ کو پختہ کر لیا تھا۔  
(خازن)

وعدہ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف کریں تو ترجمہ صرف وہی ہوگا جو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے (اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا) ”کنز الایمان“ اور اگر نسبت انبیاء کرام کی طرف کرو تو مطلب یہ ہوگا ”یاد کرو جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا جسے نبیوں نے اپنے آپ پختہ کر لیا“  
(خازن)

راقم نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں اسی وجہ سے (پختہ) کا لفظ بڑھایا تاکہ طلباء کرام کو اس عجیب اور دل چسپ مسئلہ کی طرف اشارہ مل جائے، کہ قرآن پاک میں کیا خوب فصاحت پائی گئی ہے، کہ ایک ایک لفظ میں کتنے کتنے مطالب پائے گئے ہیں۔

**مقام توجہ:** اس مقام پر مختلف اقوال کا ذکر کیا جا رہا ہے، بعد میں رائج قول کا ذکر کر دیا جائے گا،

اگرچہ تسکین البھتان سے جو بحث ذکر کی ہے اسی سے رائج قول کا کافی حد تک پتہ چل چکا ہے۔

”وذكروا في معنى “اخذ الميثاق وجهين“ احدهما انه ماخوذ من الانبياء والثاني انه ماخوذ لهم من غيرهم“

ميثاق لینے کی اہل علم نے دو وجہ ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ یہ وعدہ انبیاء کرام سے لیا گیا۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی انبیاء کرام کیلئے یہ وعدہ اوروں سے لیا گیا،

یہی وجہ ہے کہ آیہ کریمہ کے معنی اور مطلب میں اہل علم کا اختلاف نظر آتا ہے۔ ”فذهب القوم الى ان

الله تعالى اخذ الميثاق من النبيين خاصة“ کچھ حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ وعدہ خصوصی طور پر انبیاء کرام سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کرام سے یہ وعدہ ان کی اپنی نبوت اور کتاب کی تبلیغ سے پہلے کا ہے، وعدہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اپنے بعد آنے والے نبی پر ایمان لائے۔ یعنی:

”فاخذ الميثاق من موسى ان يؤمن بعيسى ومن عيسى ان يؤمن بمحمد“



موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا، اور عیسیٰ علیہ السلام سے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا۔

امداد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ امداد کرنے کا مطلب یہ ہے۔

”وینصرہ ان ادرکہ وان لم یدرکہ ان یأمر قومہ بنصرته ان ادرکوه“  
کہ اگر پہلے نبی بعد میں آنے والے نبی کو پالیں تو خود ان کی امداد کریں، اور اگر خود نہ پائیں تو اپنی امت کو وصیت کر جائیں کہ اگر تم نے بعد میں آنے والے نبی کو پالیا تو ان کی امداد کرنا۔

”وقیل انما اخذ الميثاق من النبین فی امر محمد ﷺ خاصة“

اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ کے متعلق نبیوں سے وعدہ لیا گیا ہے۔

اس قول میں پھر کچھ حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ ذکر نبیوں کا ہے مراد ان کی امتیں ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ انبیاء کرام کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ اور لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں جن میں پہلے انبیاء کرام پر ایمان رکھنے والے اہل کتاب بھی تھے۔ (لیکن یہ قول بہت ہی ضعیف ہے کہاں کہاں تاویلیں کریں گے، ذکر نبیوں کا مراد ان کی امتیں ہیں) پھر ”لما اتیتکم من کتاب وحکمة“ کی بھی تاویل کرنی پڑے گی (لہذا یہ قول تو عقل سے بہت بعید ہے)

وقیل اخذ الله الميثاق علی النبین واممهم جمیعاً فی امر محمد ﷺ فاكتفی بذکر

الانبياء لان العهد مع المتبوع عهد مع الاتباع وهو قول ابن عباس

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور ان کی امتوں سے وعدہ لیا کہ جب میرے آخری نبی محمد ﷺ تشریف لے آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، البتہ ذکر صرف انبیاء کرام کا کیا کیونکہ جو وعدہ متبوع (جس کی تابعداری کی جائے) سے لیا جائے وہی تابع سے بھی لیا جاتا ہے۔

”قال علی بن ابی طالب ما بعث الله نبیاً آدم فمن بعده الا اخذ علیہ العهد فی امر

محمد ﷺ واخذ هو العهد علی قومہ“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے وعدہ لیا کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لے

آئیں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، اور یہی وعدہ انبیاء کرام نے اپنی اپنی امتوں سے لیا۔

”وقیل ان المراد من الآية ان الانبياء كانوا ياخذون العهد والميثاق علی اممهم بانه

اذ بعث محمد ﷺ ان يؤمنوا به وينصرونه“

ایک اور قول اس میں یہ ہے کہ آیت کریمہ میں انبیاء کرام سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں سے وعدہ لیتے



رہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائیں تو تم ان پر ضرور بر ضرور ایمان لانا اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کرنا۔

## راجع قول:

**واقم** نے تمام اقوال انصاف سے بیان کر دئے ہیں، تاہم صحیح اور معتبر قول وہی ہے جو تسکین البہان کے حوالے سے جلالین اور صاوی سے بیان کیا، اس میں کوئی تاویل نہیں، حقیقی معنی مراد لیا گیا ہے مجازی معنی نہیں لیا گیا، قانون یہی ہے کہ جب حقیقی معنی صحیح ہو سکے تو مجازی معنی کی ضرورت نہیں، اور جب بغیر تاویل کے معنی درست ہو تو تاویل کی ضرورت نہیں۔ جلالین میں جو بیان کیا گیا ہے وہی مدارک التنزیل للنفسی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مظہری نے بھی قیل وقال کے بعد آخری فیصلہ کن قول یہی کیا۔

”و جاز ان یکون تخصیص العهد لمحمد ﷺ لاظهار فضله“

جائز ہے کہ یہاں جس رسول ﷺ کے تشریف لانے کا ذکر ہے وہ حضرت محمد ﷺ ہوں آپ کی فضیلت کو ظاہر کرنے کیلئے آپ کیلئے انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا، آپ کی خصوصیت کے پیش نظر آیت کریمہ میں آپ کا ہی خصوصی طور پر تذکرہ کیا گیا۔

آئیے علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی خوبصورت عبارت دیکھئے، آپ رقم طراز ہیں:-

ومن هنا ذهب العارفون الى انه ﷺ هو النبی المطلق والرسول الحقیقی والمشرع الاستقلالی وان من سواه من الانبیاء علیہم الصلوۃ السلام فی حکم التبعية له ﷺ عارفین حضرات نے یہی بیان کیا ہے کہ اس آیت کریمہ میں جن رسول معظم کا ذکر ہے وہ نبی مطلق، رسول حقیقی مستقل شریعت لانے والے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور دوسرے انبیاء کرام نبی کریم ﷺ کے تابع ہیں۔ (روح المعانی)

## تنبیہ:

روح المعانی سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت اصلی ہے اور باقی انبیاء کرام کی نبوتیں عارضی ہیں ”معاذ اللہ یہ قول سراسر باطل ہے“ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ انبیاء کرام کو اس معظم رسول کی تابعداری کا حکم دیا گیا وہ مطلق نبی ہیں کہ جب صرف ”رسول اللہ کہا جائے، یا صرف ”اللہ کا نبی“ کہا جائے تو اس سے مراد صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ ساری مخلوق کی تخلیق کا باعث ہیں، لہذا وہ باعث تخلیق انبیاء کرام بھی ہیں۔ اس لحاظ پر آپ کو حقیقی نبی ہونے کا حق حاصل ہوا، کہ حقیقت میں آپ ہی باعث ایجاد کائنات ہیں۔ باقی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت منسوخ نہ ہوئی، نہ ہی قیامت تک منسوخ ہوگی، اس لئے آپ کا لقب بن



گیا آپ مستقل شریعت لانے والے ہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی اس عبارت سے پہلے ایک حدیث بیان کی جس سے راقم کی یہ وضاحت بخوبی سمجھ آ جائے گی۔ وہ حدیث پاک یہ ہے۔

اخرجه ابو یعلیٰ عن جابر قال، قال رسول اللہ ﷺ ”لا تسالوا اهل الكتاب عن شئی فانهم لن یهدوكم وقد ضلوا فاما ان تصدقوا بباطل واما ان تکذبوا بحق وانه والله لو کان موسیٰ حیا بین اظهرکم ما حل له الا ان یتبعنی“

مسند ابو یعلیٰ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل کتاب سے کسی چیز کا سوال نہ کرو، وہ تمہیں ہرگز ہدایت نہیں دے سکیں گے، وہ تو خود گمراہ ہیں۔ (ان کی بات کی مان کر) یا تم باطل کی تصدیق کرو گے، یا تم حق کی تکذیب کرو گے، بیشک قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان زندہ موجود ہوتے تو ان کے لئے جائز نہ ہوتا سوائے میری تابعداری کے۔

حدیث پاک سے واضح ہو گیا کہ انبیاء کرام میں سے کوئی نبی بھی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ظاہری حیات میں ہوتے تو ان پر لازم ہوتا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تابعداری کرتے۔ (راقم کی وضاحت)

”اعلم ان المقصود من هذه الآيات تعدید تقریر الاشیاء المعروفة عند اهل الكتاب مما یدل علی نبو محمد قطعاً لعدرهم و اظهار العنادهم ومن جملتها ما ذکرہ اللہ تعالیٰ فی هذا الآیة“

یقین کر لو بیشک مقصود ان آیات سے چند ان چیزوں کو بیان کرنا تھا جو اہل کتاب کے نزدیک مشہور و معروف تھیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں، تاکہ ان کا عذر ختم ہو جائے کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو علم نہیں تھا، اور بیان کرنا یہ مقصود تھا کہ ان کا عناد ظاہر ہو جائے کہ ان کا نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا صرف عناد کی وجہ سے تھا۔ اور اس آیت کریمہ سے اس بات کو واضح کر دیا کہ

”انه تعالیٰ اخذ الميثاق من الانبياء الذين آتاهم الكتاب والحكمة بانهم كلما جاءهم رسول مصدق لما معهم آمنوا به ونصروه واخبر انهم قبلوا ذلك“

بیشک اللہ تعالیٰ نے جب انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب ان کو اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت عطاء کر دے، اور ان کے پاس وہ رسول معظم تشریف لائیں جو ان کی کتب و شرائع کی تصدیق کریں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔

رب تعالیٰ کے اس حکم کو انبیاء کرام نے تسلیم کر لیا، جس پر ”قالوا قررنا“ واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔ (ماخوذ از کبیر) اسی طرح انبیاء کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی امداد کرنے کا اجر و ثواب حاصل ہو گیا۔



**اعتراض:** جب نبی کریم ﷺ کی شریعت پہلی شریعتوں کی ناسخ ہے تو کس طرح ان کی تصدیق کرنے والی ہے۔

**جواب:** المراد به حصول الموافقة فی التوحید والنبوات واصول الشرائع "مراد اس سے توحید

نبوت اور اصول شرائع میں متفق ہونا ہے، اختلاف صرف تفصیل میں تھا، وہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

"ان جميع الانبياء عليهم السلام متفقون على ان الحق في زمان موسى عليه السلام ليس

الاشرع، وان الحق في زمان محمد ﷺ ليس الاشرعه"

تمام انبیاء کرام کا اس پر اتفاق رہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کی شریعت حق پر تھی، اور بیشک نبی کریم

ﷺ کے زمانہ میں آپ کی ہی شریعت حق ہے۔ (کبیر)

﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ﴾ "ضرور بر ضرورت تم ان پر ایمان لانا اور ضرور بر ضرورت ان کی امداد کرنا"

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لام موطاً للقسیم ہے، اسلئے قسم مقدر ہے، اور مبتداء کی خبر "لاظہار دین الحق" بھی مخذوف ہے، اسلئے

معنوی طور پر عبادت یوں بن گئی۔

"والله لتصدقنه برسالته وتنصرنه على اعدائه لاطهار دين الحق"

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ضرور بر ضرورت تم ان کی رسالت کی تصدیق کرنا اور ضرور بر ضرورت ان کی ان کے دشمنوں

کے خلاف امداد کرنا دین حق کے اظہار کیلئے۔ (ازروح البیان)

﴿قَالَ أَقْرَبْتُمْ﴾ "کہا کیا تم نے اقرار کر لیا"

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے وعدہ لینے کے بعد یہ ارشاد فرمایا "أَقْرَبْتُمْ" کیا تم نے اقرار کر لیا کہ اس نبی

معظم پر ایمان لانا اور اس کی امداد کرنی ہے۔

"والاستفهام للتقرير والتاكيد عليهم لاستحالة حقيقة الاستفهام في حقه تعالى"

اس مقام پر استفہام تقریر و تاکید کیلئے ہے، حقیقت استفہام رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ سوال کرے کیا تم

نے اقرار کر لیا ہے، مجھے بتاؤ، جب رب تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے تو اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اصل مقصود انبیاء

کرام سے اقرار کرانا ہے تاکہ ان کو اقرار کا ثواب بھی حاصل ہو جائے۔

(ازروح البیان)



﴿وَآخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ إِصْرِي﴾ ”اور (کیا) تم نے لے لیا اس پر میرا بھاری ذمہ“

یہ جملہ بھی استفہام تقریری کیلئے ہے، اسی لئے علامہ آلوسی نے بیان کیا ہے ”هل اخذتم“ (کیا تم نے لیا) راقم نے بھی اسی وجہ سے بریکٹ میں لفظ (کیا) زیادہ کیا ہے۔

”(اصري، ای عقدی الذی عقدته علیکم“ ”اصري“ کا مقصد یہ ہے کہ ”میرا وہ عقد جو میں نے تم پر باندھا ہے“

”والا صر الثقل الذی يلحق الانسان لاجل ما يلزمه من العمل“

”اصر“ اس بوجھ کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اس کے عمل کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔

”والا صر ههنا العهد الثقيل لانه ثقل على صاحبه من حيث انه يمنع عن مخالفته اياه“

”اصر“ کا اس آیت کریمہ میں معنی ”بھاری وعدہ“ ہے۔ کیونکہ جس طرح بوجھ ادھر ادھر حرکت سے روکتا

ہے، اسی طرح بھاری وعدہ بھی اس کی مخالفت سے روکتا ہے۔ (از روح البیان)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی لئے خوبصورت ترجمہ یوں تحریر کیا۔

(واخذتم علی ذلکم اصری) ای قبلتم عہدی والاخذ بمعنی القبول کثیر فی الکلام“

کیا تم نے میرا وعدہ قبول کر لیا ہے۔ ”اخذ“ کا معنی قبول کرنا ”کلام اللہ“ میں کئی جگہ استعمال ہے۔ جیسا کہ ”ولا یؤخذ منها فدیة“ (اور نہیں قبول کیا اس سے فدیہ) اسی طرح ”ویأخذ الصلقات“ قبول کرتا ہے صدقات کو۔

﴿قَالُوا أَقْرَرْنَا﴾ ”ان تمام نے کہا اقرار کر لیا ہے“

یعنی اے اللہ تعالیٰ تو نے ہم سے جو وعدہ لیا ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا ہم اس کا اقرار کرتے ہیں، یعنی اس قول سے انبیاء کرام کو اقرار کا ثواب مل گیا۔

خیال رہے کہ چونکہ ”اصر“ کا معنی بھی پختہ وعدہ ہے، جس کا ترجمہ ”بھاری ذمہ داری“ بزرگوں نے کیا تو راقم نے بھی وہی نقل کیا، یہی وجہ ہے کہ صرف عہد کے اقرار کا سوال کیا گیا اور اسی کا اقرار کر لینے کا جواب دیا گیا، اصر کے متعلق نہ سوال کیا گیا اور نہ ہی جواب دیا گیا کیونکہ وہ ضمناً خود بخود ذکر ہو گیا۔ (از روح البیان)

﴿قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾

”فرمایا تم گواہ ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ گواہوں سے ہوں“

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم گواہ ہو جاؤ، جو ارشاد فرمایا ”تم گواہ ہو جاؤ“ اس کے چند مطالب ہیں۔



(1) الاول فليشهد بعضكم على بعض بالاقرار وانا على اقراركم واشهاد بعضكم بعضا من الشاهدين

پہلا مطلب یہ کہ بعض تمہارے بعض پر اقرار کرنے کے گواہ ہو جاؤ، اور تمہارے اقرار کرنے اور بعض کے بعض پر گواہ بننے پر میں بھی گواہ ہوں گا۔

اس میں زیادہ تاکید پائی گئی ہے، اور ان کو پھر نے سے ڈرایا گیا ہے، اس لئے کہ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے بعض بعض پر گواہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ہم پر گواہ ہے تو وہ کبھی اس سے پھر نے کا تصور بھی نہیں کر سکیں گے۔

(2) الثاني ان قوله فاشهدوا خطاب للملاحكه

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”فاشهدوا“ میں خطاب فرشتوں کو ہے کہ ”اے فرشتو تم ان کے اقرار پر گواہ ہو جاؤ“ اور میں بھی اس پر گواہ ہوں۔

(3) الثالث ان قوله (فاشهدوا) اي ليجعل كل احد نفسه شاهدا على نفسه ونظيره قوله ”واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا على انفسنا“ وهذا من باب المبالغة

تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں پر، اپنے اقرار پر گواہ ہو جاؤ، یہ اسی طرح جس طرح آیت کریم ﴿وَاشْهَدْهُمْ عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ قالوا بلى شهدنا على انفسنا میں تمام لوگوں کو یوم میثاق میں ان کے اپنے ہی نفسوں پر گواہ بنایا گیا۔

(4) الرابع ”فاشهدوا“ ای بینوا هذا الميثاق للخاص والعام لكي لا يبقى لاحد عذر في الجهل به واصله ان الشاهد هو الذي يبين صدق الدعوى

چوتھا مطلب یہ ہے کہ ”فاشهدوا“ کا معنی یہ ہے کہ یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے تم سے لیا ہے اسے خاص و عام کے سامنے بیان کرو، تاکہ کسی ایک کو عذر باقی نہ رہے کہ مجھے پتہ نہیں، اصل میں شاہد کو شاہد کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ دعویٰ کی سچائی کو بیان کرتا ہے کہ مدعی کا یہ دعویٰ سچا ہے۔

(5) الخامس ”فاشهدوا“ ای فاستيقنوا ما قررته عليكم من هذا الميثاق وكونو فيه كالمشاهد للشئ المعاین له

پانچواں مطلب یہ ہے کہ ”گواہ بن جاؤ“ یعنی جو تم نے اپنے آپ اقرار کر لیا ہے اس وعدہ کا یقین کر لو اس طرح ہو جاؤ جس طرح گواہ کسی چیز کا معاینہ اور مشاہدہ کر کے یقین کر لیتا ہے، یقین کے بعد وہ گواہی دیتا ہے۔

(6) السادس اذا قلنا ان اخذ الميثاق كان من الامم فقوله ”فاشهدوا“ خطاب الانبياء



عليهم السلام بان يكون شاهدين عليهم

چھٹا مطلب یہ ہے کہ جب یہ خطاب انبیاء کرام کی امتوں کو بھی ان کی تابعداری کی وجہ سے ہے تو ”گواہ ہو جاؤ“ کا حکم انبیاء کرام کو ہے کہ تم اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہو جاؤ کہ انہوں نے بھی اقرار کیا تھا۔ (ازکبیر)

اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے سے مزید تاکید پیدا ہو گئی، اور جس حکم کو لازم کیا گیا ہے وہ زیادہ پختہ ہو گیا، کہ جب اللہ تعالیٰ بھی گواہ ہے تو یقیناً اس حکم جس کو ماننے کا ہم نے اقرار کیا ہے وہ بہت پختہ ہے۔



فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (آیہ نمبر ۸۲)

(۱) تو جو کوئی اس کے بعد پھرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) تو جو کوئی پھر گیا بعد اس کے تو وہی لوگ فاسق (حد سے تجاوز کرنے والے) ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے رابطہ:

اللہ تعالیٰ جب تمام مخفی چیزوں کو جانتا ہے، اس پر کوئی چیز مخفی (پوشیدہ) نہیں، لیکن اس نے مصلحت کیلئے دوسرے لوگوں کو گواہ بنایا تاکہ ایک حکم میں تاکید پائی جائے، اب اس آیہ کریمہ میں مزید تاکید کا ذکر کیا کہ جس نے اس رسول یعنی محمد ﷺ پر ایمان لانے سے اعراض کیا اور آپ کی امداد کرنے سے انکار کیا تو وہ فاسق ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر)

(الفساقون) المتمردون الخارجون عن الطاعة من الكفرة فان الفاسق من كل طائفة

من كان متجاوزا عن الحد

”فاسقون“ سے مراد سرکش لوگ، کفر کی وجہ سے طاعت سے خارج ہونے والے لوگ ہیں، اس لئے

کہ اصل فسق کا معنی حد سے تجاوز کرنا، ہر گروہ میں جو حد سے تجاوز کرے وہ فاسق ہے۔ (روح البیان)

”(الفساقون) ای الخارجون عن الايمان“ فاسقون“ سے مراد ایمان سے نکل جانے والے لوگ ہیں، کیونکہ

(قرطبی)

”فاسق“ کا معنی ”خارج“ (نکل جانے والا) ہے۔

**اعتراض:** جب پہلے دلائل سے بیان کر دیا گیا کہ اس سے پہلے آیہ کریمہ میں مختار قول یہی ہے کہ وعدہ انبیاء



کرام سے لیا گیا اور ”ثم جاءكم رسول“ سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہوا کہ یاد کرو جب اللہ نے وعدہ لیا نبیوں سے کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئیں جو تصدیق کرنے والے ہوں اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بر ضرور ایمان لانا، اور ان کی ضرور بر ضرور امداد کرنا۔ انبیاء کرام کا اپنے اقرار کے بعد پھرنا اور ان کا فاسق ہونا کیسے صحیح ہے؟

**پہلا جواب:** یہ بات بھی پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ اگرچہ خطاب انبیاء کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں۔

”قال فی التیسیر والتولی لا یقع من الانبیاء ولا یوصفون بالفسق لکن له وجہان احدهما ان الميثاق كان على الانبياء واممهم على التبعية والتولی من الامم خاصة“ تیسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کا اپنے وعدہ اور اقرار سے پھرنا ممکن نہیں، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کو (معاذ اللہ) فاسق کہنا بھی ممکن نہیں۔ تو اس مشکل کے حل کی دو وجہ بیان کی گئی، پہلی وجہ یعنی پہلا جواب یہ ہے کہ خطاب جب انبیاء کرام اور ان کی امتوں کو بھی ہے، تو اس آیت کریمہ میں امتوں کا تذکرہ ہے۔

اب مطلب یہ ہو گیا کہ انبیاء کرام کو گویا کہ یوں خطاب ہے ”کہ اے انبیاء کرام تمہاری امتوں میں جو لوگ اس عہد و اقرار سے پھر گئے وہ فاسق ہو جائیں گے، یعنی ایمان سے خارج ہوں گے۔ (روح البیان)

قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے مطابق تفسیر کی:

”فمن تولى من امم الانبياء عن الايمان بعد اخذ الميثاق“ (فاولئك هم الفاسقون) ای الخارجون عن الايمان“

انبیاء کرام کی امتوں میں سے جو شخص وعدہ سے پھر گیا وہ لوگ ایمان سے نکل جانے والے ہیں۔ (قرطبی)

**دوسرا جواب:** انبیاء کرام کی عصمت ان سے محنت کو زائل نہیں کرتی، یعنی یہ یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام کا وعدہ سے پھرنا اور ان کا (معاذ اللہ) فاسق و کافر ہونا تو ممکن نہیں کیونکہ وہ معصوم حضرات ہیں، لیکن انبیاء کرام پر رب تعالیٰ نے عصمت کی وجہ سے محنت کو زائل نہیں کیا۔ ان پر احکام لازم کئے گئے اور ان کو حرام کاموں سے منع کیا گیا، لہذا مطلب یہ ہوا کہ اے انبیاء کرام بالفرض المحال ”اگر تم وعدہ سے پھر گئے تو تم فاسق ہو جاؤ گے“ جو کلام ”بالفرض المحال“ پر مبنی ہوتی ہے اس سے مراد حقیقت نہیں ہوتی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ







ارشاد مصطفوی۔ سے مسئلہ واضح ہوتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”لو کان موسیٰ وعیسیٰ حیین لما وسعہما الا اتباعی“ اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام دونوں زندہ ہوتے تو ان کو سوائے میری اتباع کے کوئی چارہ کار حاصل نہ ہوتا۔

اوصاف مصطفیٰ کریم ﷺ کا تقاضا:

نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے ایسے اوصاف سے متصف کر دیا کہ وہ خود ہی اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہر نبی پر آپ کی تصدیق و امداد لازم ہے۔

”فالرسول محمد خاتم الانبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہ دائما الی یوم الذین“  
حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء کرام کے خاتم ہیں، قیامت تک آپ کی شریعت قائم و دائم رہے گی  
آپ کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہوتی، آپ کے بعد قیامت کوئی نبی نہیں آتا۔

”هو الامام الاعظم الذی لو وجد فی ای عصر وجد لکان هو الواجب الطاعة المقدم  
علی الانبیاء کلہم ولہذا کان امامہم لیلۃ الاسراء لما اجتمعوا بیت المقدس“

نبی کریم ﷺ امام اعظم ہیں جس زمانہ میں بھی دوسرے انبیاء کرام آپ میں موجود ہوں تو امامت آپ کا ہی حق ہے، یہی وجہ تھی کہ معراج کی رات کو جب تمام انبیاء کرام بیت المقدس میں جمع ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ہی ان کی امامت کرائی، آپ کو امام الانبیاء ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔

”وکذلک هو الشفیع فی المحشر فی ابیان الرب جل جلالہ لفصل القضاء بین عبادہ“

محشر کے دن حساب و کتاب شروع کرنے کیلئے صرف آپ کی شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا، جس سے پتہ چلا کہ قیامت کے دن آپ کے سید الانبیاء ہونے کا سب کو پتہ چل جائے گا، کوئی براہ راست رب تعالیٰ کے پاس آپ کے وسیلہ کے بغیر پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکے گا۔

”وہو المقام المحمود الذی لا یلیق الا لہ“ مقام محمود پر جلوہ گری صرف آپ کو ہی حاصل ہوگی کسی اور نبی کو یہ منصب نہیں ہوگا، اس سے آپ کا افضل الانبیاء ہونا واضح ہو جائے گا۔ ان تمام اوصاف سے آپ کا تمام انبیاء کرام سے یکتا ہونا سمجھ آیا کہ آپ کو جو خصوصیات و کمالات حاصل ہیں وہ دوسرے انبیاء کو حاصل نہیں۔

جب انبیاء کرام پر لازم تھا کہ ان کی زندگی میں جو نبی بھی موجود ہو وہ اس کی تصدیق کریں، تو اسی سے اور



زیادہ واضح ہو گیا کہ تمام انبیاء کرام کو ”واذا اخذ الله ميثاق النبين“ آیت کریمہ میں خصوصی طور پر اور تاکید کی طور پر حکم دیا کہ تمام پر لازم ہے کہ جس نبی کی زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئیں تو ان پر وہ ایمان لائیں اور ان کی امداد کریں۔  
(ماخوذ از صابونی وابن کثیر)

مقصد یہی تھا کہ تمام انبیاء کرام کو یہ اقرار کر کے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کے امتی ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔



أَفْغِيرِدِينَ اللَّهُ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طُوعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝

(آیہ نمبر ۸۳)

- (۱) تو کیا اللہ کے دین کے سواء اور دین چاہتے ہیں اور اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری اور اسی کی طرف پھریں گے۔ (کنز الایمان)
  - (۲) تو کیا اللہ کے دین کے غیر کو وہ چاہتے ہیں، حالانکہ اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے، اور اسی کی طرف پھیرے جائیں گے۔ (نجوم الفرقان)
- ما قبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت کریمہ میں بیان فرمایا کہ تمام انبیاء کرام پر لازم ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور ان کی امداد کریں، پھر انبیاء کرام کے واسطے سے خطاب ان کی امتوں کو بھی ہے۔ اس کے بعد اس آیت کریمہ کو نازل کیا، جس میں عجیب انداز پر بیان کیا گیا ہے۔

طلباء کرام ذرا عجیب دل چسپ مسئلہ دیکھئے:

الهمزة للاستفهام والمراد استنكار ان يفعلوا ذلك او تقرير انهم يفعلونه“ (کبیر)  
”افغیر“ میں ہمزہ یا تو استفہام انکاری کیلئے ہے، کیا وہ اللہ کے دین کے سواء دین کو وہ چاہتے ہیں؟ نہیں وہ تو یہ نہیں



چاہتے، یہ اسی وقت ہوگا جب خطاب انبیاء کرام کو ہو، اور یا ہمزہ استفہام تقریری ہے، یعنی کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ ہاں وہ تو اور دین چاہتے ہیں، یہ اسی وقت ہوگا جب خطاب ان کی امتوں کو ہوگا۔

مطلب واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی شان کے تو لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے بغیر اور دین تلاش کریں، البتہ ان کی امتوں کے لوگ حسد کی وجہ سے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گی، وہ گویا کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر اور دین تلاش کر رہے ہوں گے۔

**تنبیہ:** اس آیت کریمہ کا شان نزول علامہ بغوی اور علامہ آلوسی اور علامہ قرطبی رحمہم اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ یہودی اور نصرانی مل کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں اختلاف کر رہے تھے، ایک فریق کہہ رہا تھا ہمارا دین ہی دین ابراہیمی ہے، ہم ان کے زیادہ قریب ہیں، دوسرا فریق کہہ رہا تھا ہمارا دین ہی دین ابراہیمی ہے، ہم ان کے زیادہ قریبی ہیں۔ وہ دونوں فریق نبی کریم ﷺ کو کہنے لگے کہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادیں کہ کون حق پر ہے؟

”فقال عليه الصلوة والسلام كلا الفريقين برىء من دين ابراهيم عليه السلام“

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام کے دین سے دور ہیں۔

”فقالوا ما نرضى بقضائك ولا نأخذ بدینک فنزلت هذه الآية“

وہ کہنے لگے ہم تمہارے فیصلہ پر راضی نہیں اور نہ ہی تمہارے دین کو تسلیم کرتے ہیں، تو اس آیت کریمہ کا نزول ہوا کہ ”کیا یہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں“

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس شان نزول پر اپنا موقف یوں بیان کیا ہے:

”ويعبد عندي حمل هذه الآية على هذا السبب لان على هذا التقدير تكون هذه الآية منقطعة عما قبلها“

میرے نزدیک نزول کی یہ وجہ بعید ہے کیونکہ اس شان نزول سے تو آیت کریمہ ماقبل سے منقطع ہو جائے گی (کٹ جائے گی)

راقم کا موقف یہ ہے کہ جب ﴿واذ اخذ الله ميثاق النبين﴾ آیت کریمہ میں انبیاء کرام کی امتیں بھی داخل ہیں تو شان نزول جس کو ذکر کیا گیا ہے اس سے آیت کریمہ ماقبل سے منقطع نہیں ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کو ان کے انبیاء کرام بتا کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا، اب یہ لوگ فیصلہ کرانے کیلئے آئے لیکن فیصلہ تسلیم نہیں کرتے اور دین مصطفیٰ کریم ﷺ کو بھی تسلیم نہیں کرتے،



کیا یہ اللہ کے دین کے سواء اور کوئی دین چاہتے ہیں؟ راقم نے جس انداز پر بیان کیا ہے، اسے طلباء کرام بار بار پڑھیں تو ان شاء اللہ ماقبل سے منقطع نہیں پائیں گے۔

﴿وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾

”حالانکہ اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے“

”الاسلام هو الاستسلام والانقياد والخضوع“ ”وله اسلم“ کا مطلب یہ ہے کہ اسی کو تسلیم کیا ہے، اسی کے سامنے سر جھکایا ہے، اسی کے سامنے گردن رکھی، اسی کے سامنے عجز کا اظہار کیا۔ زمین و آسمان میں جو ہیں وہ اس کے حضور سر جھکائے ہیں، گردن رکھے ہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔

”الاول، وهو الاصح عندی ان کل ماسوی اللہ سبحانه ممکن لذاته وکل ممکن لذاته فانه لا یوجد الا بايجادہ ولا یعدم الا باعدامہ فاذن کل ماسوی اللہ فهو منقاد خاضع لجلال اللہ فی طرفی وجودہ وعدمہ وهذا هو نہایۃ الانقياد والخضوع“

ان میں سے پہلی وجہ:

جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء تمام چیزیں ممکن لذاتہ ہیں، اور جو چیز ممکن لذاتہ ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے کے بغیر موجود نہیں ہو سکتی، اور اللہ تعالیٰ کے معدوم کرنے کے بغیر معدوم نہیں ہو سکتی، جب تمام مخلوق اپنے وجود و عدم میں رب تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے ہو گردن رکھے ہوئے ہے، تو یہی مطلب ہے ﴿وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ کا۔

**دوسری وجہ:** یہ ہے جو ہر شخص کے ذہن میں آ سکتی ہے، اور اسے ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، کہ ”طوعاً و کرہاً“ کو ساتھ ملا کر مفہوم یوں ہو گیا کہ نیک مسلمان خوشی سے دین کے متعلق چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طاعت کرتے ہیں اور مسلمان کئی چیزوں کو جو ان کی طبیعت کے مخالف ہوتی ہیں یعنی مرض اور فقر اور موت وغیرہ مجبوری سے مانتے ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاحق ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے جب یہ چیزیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں تو خوشی سے ان کو تسلیم کیا جاتا لیکن انسان اپنی فطرت کی وجہ سے مجبوری سے ان کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ لیکن کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتے تو مجبوری سے رب تعالیٰ کو مانتے ہیں دین سے تو ان کا تعلق ہی نہیں ہوتا، باقی امور میں بھی ان کا ماننا مجبوری کی وجہ سے ہے خوشی سے نہیں۔



**تیسری وجہ:** مسلمان خوشی سے اسلام قبول کرتے ہیں، لیکن کئی کافر موت کے وقت رب تعالیٰ کو مانتے ہیں، لیکن اس وقت ماننا ان کیلئے نفع مند نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿فَلَمْ يَكْ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاُوْا اٰبَاسَنَا﴾ ”تو ان کے ایمان نے انہیں کام نہ دیا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا“

**چوتھی وجہ:** تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کو خوشی سے تسلیم کرتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (سورۃ العنکبوت، آیہ نمبر ۶۱) ”اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنائے آسمان اور زمین اور کام میں لگائے سورج اور چاند تو ضرور کہیں گے اللہ نے“ لیکن تکلیفی کام جو ان کے ذمہ لازم ہیں، یا ان کو درد و آلام کا پہنچنا، ان چیزوں کو کہیں مجبوری سے انہیں ماننا پڑے تو مانتے ہیں، ورنہ خوشی سے نہیں مانتے۔

**پانچویں وجہ:** یوم میثاق کو تمام لوگوں نے خوشی سے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا تھا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿وَ اِذَا خَذَرْتُكَ مِنْ بَنِي اٰدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذَرَيْتَهُمْ وَاَشْهَدُهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ ”اور اے محبوب یاد کرو جب تمہارے رب نے اولاد کی پشت سے ان کی نسل نکالی، اور انہیں خود ان پر گواہ کیا، کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب بولے کیوں نہیں“ (یعنی ہاں اے اللہ تو ہمارا رب ہے) یہ سب لوگوں نے خوشی سے تسلیم کیا، لیکن دنیا میں آ کر رب تعالیٰ کی ربوبیت کو مسلمانوں نے خوشی سے مانا، اور کافروں نے مجبوری سے۔

**چھٹی وجہ:** حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اہل سماء نے (آسمان والوں نے) اللہ تعالیٰ کو خوشی سے تسلیم کیا، لیکن اہل ارض (یعنی زمین والوں) میں سے بعض نے خوشی سے تسلیم کیا اور بعض نے مجبوری سے خوشی سے اسلام لانے والے مؤمن ہیں، رب تعالیٰ کے عذاب یعنی موت کو دیکھ کر ایمان لانے والے کافر ہیں۔ (ماخوذ از کبیر بالوضاحت)

**طاعت اور اطاعت:**

قال ابن السکیت یقال طاع له واطاع ”ابن سکیت رحمہ اللہ نے فرمایا ”طاع له“ (فلاں نے اس کی طاعت کی) کہا جائے، یا کہا جائے ”اطاع“ (فلاں نے اطاعت کی) ان دونوں کا مطلب ایک ہے۔

”قال الواحدی رحمہ اللہ الطوع الانقیاد، یقال طاعه یطوعه طوعا اذا انقاد له وخضع واذامضی لأمره فقد اطاعه واذوافقه فقد طاعه“

واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن سکیت کا قول بھی درست ہے کہ طاعت اور اطاعت ایک ہی معنی میں



استعمال ہوتے ہیں لیکن بھی فرق بھی کر لیا جاتا ہے۔ جب کسی امر کے سامنے سر جھکا لیا جائے، خشوع و خضوع سے تسلیم کر لیا جائے تو یہ طاعت ہے جب اس پر عمل بھی پایا جائے تو یہ اطاعت ہے، اور اگر خوشی سے اسے دل بھی قبول کر لے تو یہ مطاوعت ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)

﴿وَالِيهِ يُرْجَعُونَ﴾ ”اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے“

زمین و آسمان کی تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جاتا ہے، جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کریں گے کل قیامت کے دن ان کو رب تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا وہاں ان کو رب تعالیٰ کے سوا کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ ”وَالِيهِ يُرْجَعُونَ“ میں دین حق کے مخالفوں کیلئے وعید عظیم پائی گئی۔

**فوائد:** فعلى العاقل ان يطيع ربه ولا يعصيه بنقض ما عهد اليه يوم الميثاق

عقلمند شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ آیہ کریمہ کو سمجھے اور یہ سمجھے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت اس پر لازم ہے اس کی نافرمانی نہ کرے، ميثاق کے دن اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ نہ توڑے۔

فعهد الله مع الانبياء والاولياء والمؤمنين التوحيد واقامة الدين وعدم التفرق فيه  
وتصدق بعضهم بعضا ودعوة الخلق الى الطاعة وتخصيص العباداة بالله فالله تعالى  
لا يطلب من العبد الا الصديق في العبودية والقيام بحقوق الربوبية

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور اولیاء کرام اور مؤمنین سے توحید کا وعدہ لیا کہ صرف میری ہی عبادت کرو، میرے ساتھ کوئی شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور وعدہ یہ لیا کہ دین پر قائم رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور بعض بعض کی تصدیق کرو، اور رب تعالیٰ نے یہ وعدہ لیا کہ مخلوق کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کی دُعا دو، اور عبادت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے مطالبہ نہیں کرتا سوائے اس کے وہ عبودیت میں سچے دل سے قائم رہیں، اور حقوق ربوبیت کو قائم کریں۔

شیخ شاذلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں طاعت کی توفیق عطا فرمائی تو اس نے تم پر ظاہری نعمتوں کی تکمیل فرمادی، اور تمہارے ظاہر و باطن کو اپنے امر کی مخالفت سے بچالیا، تو تمہیں حق پر قائم کر دیا، اللہ تعالیٰ تم سے یہی چاہتا ہے کہ تم اس کے مطیع بن کر رہو۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کو کہا گیا کہ اگر آپ مسجد میں بیٹھ جایا کریں، اور ہمیں کچھ وعظ و نصیحت سنایا کریں تو یہ ہمارے لئے بہتر ہو، آپ نے فرمایا مجھے چار چیزیں تمہارے پاس بیٹھنے اور بات کرنے سے مانع ہیں، اگر وہ چار چیزیں دور ہو گئیں تو میں تمہارے پاس مسجد میں بیٹھ جاؤں گا، آپ سے پوچھا گیا اے ابوحنیف (یہ کس چیز سے)



ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کی) وہ چار چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا پہلی چیز ان میں سے یہ ہے کہ مجھے جب وہ وعدہ یاد آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم سے لیا، اور اللہ تعالیٰ نے بتا دیا یہ لوگ جنتی ہیں، مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، اور یہ لوگ جہنمی ہیں مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں، (یعنی رب تعالیٰ مستغنی ذات ہے کسی کا جنتیوں والا عمل اس کے اپنے نفع کیلئے ہے، اور جہنم والا عمل اس کے اپنے نقصان کیلئے ہے) ”فلنم ادر من ای الفريقین کنت“ مجھے معلوم نہیں کہ میں اس وقت کس فریق میں تھا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بچے کو اس کی ماں کے پیٹ میں تخلیق کرتا ہے اور اس میں روح پھونکتا ہے تو اس پر موکل فرشتہ رب تعالیٰ سے پوچھتا ہے کیا یہ نیک بخت ہے یا بد بخت ہے (رب تعالیٰ جو بتاتا ہے، فرشتہ وہی لکھ لیتا ہے) ”فلادری کیف یخرج جوابی فی ذلک الوقت“ مجھے معلوم نہیں اس وقت میرے متعلق کیا جواب تھا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جب ملک الموت فرشتہ (عزرائیل) روح قبض کرنے کیلئے آتا ہے تو وہ رب تعالیٰ سے پوچھتا ہے اے اللہ! کیا یہ مسلمان تھا کہ اس کا روح اسلام پر قبض کروں کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو یا کہ یہ کافر تھا کہ اس کا روح کفر پر قبض کروں کہ اس کا خاتمہ بالشر ہو۔ ”فلادری کیف یخرج جوابی فی ذلک الوقت“ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت میرے متعلق کیا جواب ہوگا۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ میں جب رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں تفکر کرتا ہوں۔ ﴿وَأَمَّا أَزْوَاجُ النَّاسِ الَّتِي هُمْ الْمُجْرِمُونَ﴾ ”جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو“ ”فلادری من ای الفريقین اکون“ مجھے معلوم نہیں کہ میں اس وقت کس فریق میں ہوں گا۔ ”ففی ہذا شغل شغلی عن الجلوس لکم والحديث معکم“ یہ چار چیزیں مجھے تمہارے پاس بیٹھنے اور وعظ و نصیحت سے مانع ہیں۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمہ اللہ کے اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس پر ایمان رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں خیر و شر ہیں، اور اسی کے علم میں ہے کہ کون خیر پر مرے گا، اور کون شر پر مرے گا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کو مد نظر رکھتے ہوئے عمل کرتا رہے، اور اپنی طرف سے کوشش کرتا رہے اور دعاء کرتا رہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہو۔ آپ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔ ”اعملوا فکل میسر لما خلق لہ“ عمل کرو ہر شخص جس کیلئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں آسانی پیدا کرنے والا ہے۔

❁ فلیجہد العاقل فی تزکیہ النفس اولا ثم الوصیۃ الی عباد اللہ ولا یكلف المرء الا بقدر وسعہ والناس فی المراتب مختلفون فطوبی لمن وصل الی اعلی المطالب



عقلمند شخص کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنے) کی کوشش کرے، پھر وہ اللہ کے بندوں کو وصیت کرے، کسی انسان کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دی جاتی، لوگ مراتب میں مختلف ہیں خوشی کا مقام ان کیلئے ہی ہے جو اعلیٰ مطالب کو حاصل کر لیں۔

بصعہ نتوان داد طعمہ شہباز

بقدر حوصلہ خویش دانہ چنید مرغ

اپنی طاقت کے مطابق پرندہ دانہ چن سکتا ہے چڑیا محولاً باز کو لقمہ کھلانے کی طاقت نہیں رکھتی۔

حضرت شیخ صفی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ رب تعالیٰ کے قرب کو طلب کرنے والا اپنے خیال میں تمام منازل طے کر لے تو اس پر کوئی اور منزل بھی باقی رہ جاتی ہے جسے اس نے طے کرنا ہے۔ تو آپ نے جواب دیا، ہاں ”بقی علم انہ هل کان مقبولا للرب تعالیٰ اولا“ ابھی یہ علم حاصل ہونا باقی ہے کہ وہ شخص جو یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس نے جو عبادت کی اور اپنے خیال میں تمام منازل طے کر لیں، وہ اللہ تعالیٰ کے حضور قبول ہوئی ہیں یا نہیں۔

وفی القشیری ما حاصلہ ان الولی فی الحال یجوز ان یتغیر حالہ فی المال و یجوز ان یکون

من جملة کرامات الولی ان یعلم انہ مامون العاقبة عصمنا اللہ وایاکم بحسن الخاتمة

کتاب قشیری میں ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے ولی کا حال کل بدل جائے، انجام ولایت پر نہ ہو، یعنی ایمان وہی معتبر ہے جب موت ایمان پر آئے، کسی شخص نے ایمان لایا، نیکی کے عمل کرتا رہا لیکن ”العیاذ باللہ“ مرتد ہو گیا اور موت کفر پر آگئی تو اس کے پہلے ایمان سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص منصب ولایت پر فائز ہو گیا، حقیقتہً وہ اپنے اعمال کے لحاظ پر ولی ہے، لیکن اس کی ولایت پر موت آجائے تو وہ کامیاب ہو گیا، اور اگر وہ بد قسمتی سے بد اعمال ہو گیا اور اس کا خاتمہ بد اعمالیوں پر ہوا تو اس کا خاتمہ ولایت پر نہیں ہوا، ولی کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خاتمہ بالخیر کا اسے علم عطاء کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مؤمنین کا خاتمہ بالخیر فرمادے۔ امین سم امین

ہمہ عالم ہی گویند ہر آن کہ یارب عاقبت محمود گردان

تمام جہان کے (مؤمنین) ہر وقت یہی کہتے ہیں کہ اے رب عاقبت اچھی کر دے (ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

زیر بحث آیہ کریمہ میں ﴿وَأَغْیَرِ دِیْنَ اللّٰهِ یَغْفِرْ﴾ میں ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے اور فاء عاطفہ پر

داخل ہے، اب اس میں دو احتمال ہیں۔



ایک یہ کہ عطف جملہ کا جملہ پر ہو، یعنی ﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ پر عطف ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ عطف مخذوف مقدر پر ہو، تقدیر عبارت کی یہ ہو ”ایقولون فغير دين الله يبغون“ (ماخوذ از مدارک التزیل للنسفی)  
**فائدہ جلیلہ:** وقال ﷺ لا تسبوا أصحابي فإن أصحابي أسلموا من خوف الله

واسلم الناس من خوف السيف“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو گالی نہ دینا، بیشک میرے صحابہ نے اسلام قبول کیا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور باقی لوگ اسلام قبول کریں گے تلوار کے خوف سے۔ (قرطبی)

خیال رہے کہ راقم نے ”اسلم“ ماضی کا ترجمہ مستقبل کا کیا ہے کیونکہ کئی مقاموں پر ماضی مستقبل کے معنی میں استعمال ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی امتوں کا ذکر ہو تو ترجمہ ماضی والا کیا جائے گا کہ ”اور لوگوں نے اسلام قبول کیا تلوار کے خوف سے۔“

**گذشتہ سے پیوستہ:** ”طوعا و کرھا“ کی تفسیر میں صوفیاء کرام کا ارشاد گرامی یہ ہے۔

ان الاسلام طوعا هو الانقياد والامثال لما امر الله تعالى من غير معارضة ظلمة نفسانية وحيلولة حجب الانانية والاسلام کرھا هو الانقياد مع توسط المعارضات والوساوس وحيلولة الحجب والتعلق بالوسائط“

خوشی سے تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو اور اس کے احکام پر عمل کرے یہاں تک کہ نفسانی تاریکیاں اور ”انا“ (میں ہوں، انداز متکبرانہ) درمیان میں حائل نہ ہوں۔

پہلا اسلام فرشتوں اور انبیاء کرام کے اسلام کی طرح ہے، اور دوسرا اسلام ان لوگوں کی طرح ہے جو کثیر شبہات میں گھرے رہتے ہیں۔ کفار بھی رب تعالیٰ کو مجبوری سے مانتے ہیں ظلمت کفر جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)





قُلْ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا نُنْزِلُ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝

(آیہ نمبر ۸۴)

(۱) یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اترا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ ملا موسیٰ اور عیسیٰ اور انبیاء کو ان کے رب سے، ہم ان میں سے کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے حضور گردن جھکائے ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) آپ فرمادیجئے ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف، اور جو اتارا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر، (اور ہم ایمان لائے) اس پر جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان ان میں سے (ایمان لانے میں) اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

جب اللہ تعالیٰ نے گذشتہ آیہ کریمہ ”وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ“ میں انبیاء کرام سے وعدہ لیا کہ جب تمہیں کتاب و حکمت عطاء کردی جائے تو پھر تمہارے پاس وہ رسول آجائیں جو تصدیق کر رہے ہوں اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور بر ضروران پر ایمان لانا اور ضرور بر ضروران کی امداد کرنا۔ اب اس آیہ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے تصدیق کرنے کی مزید وضاحت فرمائی جا رہی ہے۔ (ازکبیر)

مختصر مطلب از ضیاء القرآن:

اپنے حبیب مکرم ﷺ کی زبان پاک سے اس حقیقت عظمیٰ کا پھر اعلان کروایا جا رہا ہے کہ دین الہی اسلام ہی ہے، سب انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تبلیغ فرماتے رہے اور میں بھی اس دین کا داعی اور مبلغ بن کر آیا ہوں، اس لئے وہ تمام مقدس ہستیاں جن کو بارگاہ الہی سے نبوت کا شرف بخشا گیا اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئیں میں اور



میرے ماننے والے ان سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارا یہ شیوہ نہیں کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، یہ ہے دین محمدی کی وہ وسعت اور گہرائی جو ہر حق کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جہاں کسی قومی، وطنی اور نسلی عصبیت کی گنجائش نہیں، اس دین قیم کی روح تمام ان عناصر سے پاک ہے جو انسان کو انسان سے ملنے نہیں دیتے، یہ کسی خاندان یا نسل خدا کا دین نہیں بلکہ رب العالمین کا دین ہے، اور اسی کے داعی کو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنے کیلئے بھیجا نہیں گیا، بلکہ وہ رحمۃ اللعلمین ہے جو سارے عالم انسانیت کی شیرازہ بندی کیلئے مطلع وجود پر جلوہ نما ہوا، اس لئے صرف یہی دین انسانی اتحاد کیلئے اساس محکم ثابت ہو سکتا ہے۔ (ضیاء القرآن)

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾

”آپ فرمادیجئے ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف“

قرآن پاک کی کیا خوب شان:

”قل“ مفرد کا صیغہ ہے (آپ فرمادیجئے) اور ”اٰمَنَّا“ جمع کا صیغہ ہے (ہم ایمان لائے اللہ پر) اسی طرح ”عَلَيْنَا“ میں ضمیر جمع کی ہے کہ (ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔ بظاہر یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ واحد کے صیغہ اور جمع کو کس طرح ایک جگہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن جب قرآن پاک کی عظمت سمجھ آئے تو یہ مسئلہ آسانی سے سمجھ آ سکتا ہے کہ اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) (قل آمنا باللہ) امر للرسول ﷺ بان يخبر عن نفسه ومن معه من المؤمنين بالایمان بما ذكر وجمع الضمير في قوله تعالى (وما انزل علينا) وهو القرآن لما انه منزل عليهم بتوسط تبليغه اليهم

”قل“ سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن ”اٰمَنَّا بِاللّٰهِ“ جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا کہ اے نبی کریم ﷺ آپ فرمادیجئے کہ میں اور میرے ساتھ مؤمنین ہم سب اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح ”وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا“ سے مراد تو قرآن پاک ہے، لیکن جمع کی ضمیر ”عَلَيْنَا“ میں لائی گئی کیونکہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، اور آپ کے واسطے جلیلہ سے آپ کی امت پر بھی نازل ہوا کہ آپ نے اپنی امت کو قرآن پاک کی تبلیغ فرمادی۔ اب ﴿وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ ”اور جو نازل کیا گیا ہم پر“ کا مطلب بھی واضح طور پر سمجھ آ گیا۔ (تفسیر ابی السعود)

(۲) علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی ایک وجہ یہی بیان کی جو تفسیر ابی السعود سے نقل کی گئی۔



اور وجہ یہ بیان کی گئی ”انہ تعالیٰ حین مخاطبہ النما مخاطبہ بلفظ الواحدان و علمہ انہ حین بخاطب القوم بخاطبہم بلفظ الجمع علی وجہ التعظیم والتفخیم مثل ما یتکلم الملوک والعظماء“  
اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو خطاب کیا تو لفظ واحد سے خطاب کیا، پھر آپ کو یہ سکھایا کہ جب آپ قوم سے خطاب فرمائیں تو جمع کے صیغے سے خطاب کریں جو آپ کی عظمت اور رفعت شان پر دلالت کرے، یعنی جس طرح بادشاہ اور بڑے لوگ اپنی عظمت شان بیان کرنے کیلئے جمع کے صیغے استعمال کرتے ہیں، اسی طرح آپ بھی جمع کے صیغے اپنے حق میں استعمال کریں۔

**واقم** کو اس وجہ سے یہ سمجھ آیا کہ کبھی عاجزانہ کلام کو جھوٹے، مکار، دجال ایک آنکھ والے کا نثرے حقیقت سمجھ لیتے ہیں، ان جاہلوں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کلام عاجزانہ کلام ہے، اسلئے جاہلوں اور کافروں، جھوٹے اور مکاروں کو کبھی یہ بھی بتانا چاہیے کہ میرا منصب و مقام کیا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کو لفظ ”قل“ سے خطاب فرمایا کہ آپ کو ہی فقط اس کا مکلف بنایا کہ آپ فرمادیں ”میں اس چیز کی تصدیق کرتا ہوں جو تمہارے پاس ہے“ یہ کام ہی جب آپ نے کرنا تھا تو خطاب بھی صرف آپ کو ہی کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر اور قرآن پاک پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا تو جمع کے صیغے ذکر کئے گئے  
”ثم قال (آمن) تنبیہا علی ان هذا التكلف ليس من خواصه بل هو لازم لكل المؤمنين“  
جن سے اس پر تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ ایمان لانے کا مکلف بنانا صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام لوگوں کو اس کا مکلف بنایا گیا، مؤمنین نے اسے قبول کر لیا، کافروں نے انکار کیا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ كُلُّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا يَفْرِقُونَ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ﴾ تمام مؤمنوں نے ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ نے ان کے رسول پر نازل فرمایا، ہر ایک نے اللہ اور اس کے فرشتوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا (اور یہ کہا کہ) ہم نہیں فرق کرتے اس کے رسولوں کے درمیان کسی ایک پر ایمان لانے میں۔  
(ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں زیر بحث آیہ میں لفظ ”علی“ ذکر کیا ﴿وَمَا أَنزَلَ عَلَيْنَا وَمَا أَنزَلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾، الآیہ اور سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ﴿وَمَا أَنزَلَ إِلَيْنَا وَمَا أَنزَلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾، الآیہ، اس میں ایک وجہ فرق یہ بیان کی گئی ہے ”علی“ استعلاء (بلندی) پر دلالت کرتا ہے، اور ”الی“ انتہا پر، یہاں اس آیہ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ ہے لہذا مناسب استعلاء ہے،



اور سورۃ بقرہ میں خطاب میں عموم ہے، اس لئے وہاں انتہاء مناسب ہے، اسلئے ”الی“ ذکر کیا کیونکہ اس سے پہلے لفظ ”قولوا“ ہے جو عموم پر دلالت کر رہا ہے، طلباء کرام عربی عبارت یاد کرنا چاہیں تو وہ عبارت یہ ہے۔

”وقد جعل الخطاب هنا للنبي ﷺ فناسيه الاستعلاء وهناك العموم فناسب الانتهاء“ (روح المعانی)

**تنبیہ:** کبھی ”علی“ اور ”الی“ کے ذریعے متعدی بنانے میں کوئی فرق نہیں کرتے، بلکہ مبدأ کا لحاظ کریں تو ”علی“ ذکر کر دیا جاتا ہے، اور انتہاء کا لحاظ کریں تو ”الی“ ذکر کر دیا جاتا ہے۔

”ويلاحظ احد الاعتبارين تارة والآخر اخرى تفننا بالعبارۃ“

عبارت میں تفنن پیدا کرنے کیلئے کبھی مبدأ کا اعتبار کر لیا جاتا ہے، لفظ ”عسلی“ ذکر کر دیا جاتا ہے، اور کبھی انتہاء کا لحاظ کر لیا جاتا ہے تو لفظ ”الی“ ذکر کر لیا جاتا ہے۔

وفرق الراغب بان ما كان واصلا من الملاء الأعلى بلا واسطة كان لفظ ”علی“ المختص بالعلو اولى به، وما لم يكن كذلك كان لفظ ”الی“ المختص بالا یصال اولى به“  
علامہ راغب اصفہانی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے کہ جب ملأ اعلیٰ سے بغیر کسی واسطہ کے پہنچے تو اس کے مناسب لفظ ”علی“ ہوتا ہے جو استعلاء پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، تو یہاں مناسب ”علی“ کا لفظ ہی ہے۔

اور سورۃ بقرہ میں خطاب عوام کو ہے ان پر بغیر واسطہ کے تو کوئی کتاب نازل نہیں، بلکہ انبیاء کرام کے واسطہ سے ان پر کتب کا نزول ہوا اس لئے وہاں لفظ ”الی“ کا ذکر کرنا ہی مناسب تھا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

**ترتیب ذکر نبی کا فائدہ:**

پہلے ذکر فرمایا ”اٰمَنَّا بِاللّٰهِ“ ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کے بعد انبیاء کرام کی نبوت اور ان پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا ”لان الایمان باللہ اصل الایمان بالنبوة“ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اصل ہے نبوت پر ایمان لانے کیلئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بغیر نبوت پر ایمان ممکن ہی نہیں۔ پھر ”وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا“ کو ”وَمَا اُنْزِلَ عَلٰی اِبْرٰهیمَ“ الآیہ، سے پہلے ذکر کیا۔

”لان کتب سائر الانبیاء حرفوها وبدلوها فلا سبیل الی معرفۃ احوالها الا بما انزلہ اللہ علی محمد ﷺ فكان ما انزل علی محمد کالأصل لما انزل علی سائر الانبیاء فلہذا قدمہ علیہ“  
اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کی کتب میں تحریف کردی گئی تھی، ان کی حقانیت کو پہچاننے میں مشکل



درپیش تھی، اس کا ایک ہی حل تھا کہ پہلے قرآن پاک پر ایمان لایا جائے پھر قرآن پاک کی رہنمائی سے دوسری آسمانی کتب پر ایمان لایا جائے کہ جو کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام پر نازل کی گئیں ان پر تو ہمارا ایمان ہے، لیکن جن میں تحریف کر دی گئی ان کو ہم نہیں تسلیم کرتے۔

چند انبیاء کرام کے خصوصی ذکر کی وجہ:

﴿وَمَا أَنْزَلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَيَعْقُوبَ وَالْإِسْبَاطَ﴾

”اور ہم نے ایمان لایا اس پر جو نازل کیا گیا ابراہیم اور اسماعیل اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر“

”انما خص هؤلاء الانبياء بالذكر لان اهل الكتاب يعترفون بوجودهم ولم يختلفوا بنبوتهم“

ان انبیاء کرام کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اہل کتاب ان انبیاء کرام کے وجود کا اعتراف کرتے تھے، اور ان کی نبوت کا بھی اعتراف کرتے تھے، ان میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے۔ (ازخازن)

(والاسباط) اولاد یعقوب وکان فیہم انبیاء (مدارک) اور اس پر ایمان ہے جو نازل کیا گیا اسباط پر، اسباط سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، کیونکہ آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آنے والے تمام انبیاء کرام آپ کی اولاد سے ہی تھے، چونکہ یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، اس لئے یہ بھی کہہ لیا جاتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء کرام آپ کی اولاد سے تھے سوائے نبی کریم ﷺ کے کہ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ (وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ) اور ہمارا ایمان اس پر بھی ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا۔ یعنی ہمارا ایمان توراۃ پر ہے اور انجیل پر بھی، اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر بھی، ”وَمَا أُوتِيَ“ ذکر فرمایا ”وَمَا أَنْزَلَ“ ذکر نہیں فرمایا، جس سے کتابوں اور معجزات پر ایمان رکھنے کا ثبوت مل گیا۔

پھر ان دونوں کا علیحدہ ذکر کیا، ماقبل کا انداز بیان بدلا جس سے یہ ثابت کیا کہ دونوں ہی اللہ کے نبی تھے یہود کا عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ ماننا، اور نصاریٰ کا موسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ ماننا باطل اور غلط طریقہ ہے۔

”اور ہمارا ایمان تمام انبیاء کرام پر ہے“

**حکمت:** ﴿وَالنَّبِيُّونَ﴾

کر رفی البقرة وما اوتی ولم یکررہنا لتقوم ذکر الایماء حیث قال لما آتیکم

سورۃ بقرہ میں دوبارہ ”وَمَا أُوتِيَ“ ذکر کیا ہے، یعنی وہاں ہے ”وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ“ اور یہاں صرف ذکر ہے ”وَالنَّبِيُّونَ“ اس لئے کہ اس مقام پر پہلے ”لَمَّا آتَيْنَاكُمْ“ آچکا ہے، جس میں انبیاء کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا



گیا ”جب میں تمہیں کتاب و حکمت عطاء کروں“ اسی وجہ سے ”وَمَا أُوتِيَ“ دوبارہ ذکر نہیں کیا۔ (مدارک) ”مِنْ رَبِّهِمْ“ سے بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو ان کے رب تعالیٰ کی طرف سے عطاء کیا گیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، ان کی امتوں نے ان کی بعد کتابوں میں جب تحریف کر دی تو ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔

تمام انبیاء کرام کی نبوت کے اقرار میں فائدہ:

اس میں چند فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ جب یوم میثاق کو تمام انبیاء کرام سے وعدہ لیا گیا کہ تم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا کیونکہ وہ تمہاری تصدیق کرنے والے ہیں۔ تو یہاں نبی کریم ﷺ سے اقرار کرا کے واضح کر دیا کہ ہاں واقعی آپ پہلی کتب اور معجزات کی تصدیق فرمانے والے ہیں۔

(۲) چونکہ بعض اہل کتاب دوسرے بعض کے مخالف تھے کوئی فریق کسی نبی کو تسلیم کرتا اور کسی کو نہیں، اسی طرح جن کو نبی تسلیم نہیں کرتے تھے، یقیناً ان کے معجزات کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے، تو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے تمام انبیاء کرام پر ایمان لانے کا ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ ”الحق تصدیق الكل والاعتراف نبوة الكل“ حق یہ ہے کہ تمام آسمانی کتب اور تمام انبیاء کرام کے معجزات کی تصدیق کی جائے اور تمام انبیاء کرام کی نبوت کو تسلیم کیا جائے۔ (ازکیر)

﴿لَا نَفْرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ﴾

”ہم نہیں فرق کرتے کسی ایک کے درمیان ان میں سے“ (ایمان لانے میں)

”لَا نَفْرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ“ بَأَن نُّؤْمِنُ بِبَعْضِ دُونِ بَعْضٍ كَمَا تَفَرَّقَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى “ ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں، یہ تو یہود و نصاریٰ کا کام تھا کہ بعض انبیاء پر ایمان رکھتے اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ ”ہم اسی کے فرمانبردار ہیں“

اس ارشاد گرامی کے چند مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ہم ان انبیاء کرام کی نبوت کی اقرار کیا ہے اس وجہ سے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں، اسی کے حکم و امر کو تسلیم کرتے ہیں، اسی کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں سے اس امر کی طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ



نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت کے لوگوں نے رب تعالیٰ کے حکم کو خوشی اور عجز سے تسلیم کیا کہ رب تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، گردن رکھ دی، بخلاف پہلے انبیاء کرام کی امتوں کے، جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں آیا ہوا ہے۔ ﴿وَالْغَيْرِ دِينَ﴾  
اللّٰهُ يَتَغَوَّنَ وَلَهُ اسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَالْيَهُ يَرْجَعُونَ ﴿انہوں نے رب تعالیٰ کے اوامر کو خوشی سے تسلیم نہیں کیا۔

(۲) ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ کا اور یہ مطلب ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم رضاء مندی سے خوشی سے تسلیم کرتے ہیں، اس کی مخالفت نہیں کرتے، ”وَتِلْكَ صِفَةُ الْمُؤْمِنِينَ بِاللّٰهِ وَهُمْ اَهْلُ السَّلَامِ“ یہ صفت ان لوگوں کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ بخلاف کفار کے ”وَالْكَافِرُونَ يَوْصَفُونَ بِالْمُحَارَبَةِ لِلّٰهِ“ کہ ان کافروں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ حاصل ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اِنَّ مَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ اس آیت کریمہ میں کفار کا رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کا واضح ذکر موجود ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ:

﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ يفيد الحصر والتقدير له اسلمنا لا لغرض آخر من سمعة ورياء وطلب مال ، وهذا تنبيه على ان حالهم بالصد من ذلك فانهم لا يفعلون ولا يقولون الا للسمعة والرياء وطلب الاموال، ”والله اعلم“

﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ میں حصر کا فائدہ پایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف اس کی رضاء کیلئے اسے تسلیم کرتے ہیں، اس اطاعت میں اور کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہمیں چرچا حاصل ہو جائے، ہمیں ریاء کاری مقصود نہیں، نہ ہی رب کی اطاعت میں مال کی طلب کی حرص ہے، بخلاف مؤمنین کی ضد یہود و نصاریٰ، کفار وہ کہیں مجبوری سے رب تعالیٰ کے خالق ہونے کو تسلیم کر لیں تو اس میں بھی ان کا مقصد چرچا حاصل کرنا، ریاء کاری، اور مال کی طلب ہوتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

سُبْحَانَ اللّٰهِ! مؤمن تیری کیا شان ہے، ہر طرف یہود کے یار، نصاریٰ کے غمخوار و دندنا تے پھر رہے ہیں، لیکن مؤمن رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حضور سر جھکائے ہوئے ہیں۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلے ایمان کا ذکر ہو چکا ہے تو ”وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ“ جملہ متدرک ہے، اس



کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ لیکن ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے واضح ہوا کہ ”ونحن له مسلمون“ سے مراد صرف اسلام لانا نہیں، بلکہ خوشی اور اعتقاد اور خلوص سے رب تعالیٰ کے حضور سر جھکانا، گردن رکھنا مراد ہے، لہذا یہ جملہ مستدرک نہیں، طلباء کرام روح المعانی کی اس عبارت کو دیکھیں اور راقم کے تذکرہ کو دیکھیں تو ان شاء اللہ ذرا بھرا خراف نہیں پائیں گے۔

(ونحن له مسلمون) ای مستسلمون بالطاعة والانقياد في جميع امار به ونهي عنه  
او مخلصون له في العبادة وعلى التقديرين لا تكون هذه الجملة مستدركة بعد  
جملة الايمان كما هو ظاهر.  
(روح المعانی)

**تنبیہ:** والاسباط الاحفاد لا اولاد البنات

اسباط سے مراد مذکر اور مذکر کی اولاد یعنی بیٹے اور پوتے ہیں لیکن بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسے معتبر نہیں۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا خوب ترجمہ:

آپ نے ”الاسباط“ کا ترجمہ کیا ہے ”ان کے بیٹوں، پر“ راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا ہے۔ راقم نے آگے بحث میں ”الاسباط“ سے مراد ”اولاد“ بھی ذکر کیا ہے، لیکن صرف اسی خیال سے کہ طلباء کرام ترجمہ کو دیکھ کر ہی سمجھ جائیں گے کہ ”اولاد“ سے مراد خاص مذکر لیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت میں مذکر و مؤنث دونوں کو شامل ہے۔





وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

(آیہ نمبر ۸۵)

(۱) اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا، وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں زیاء کاروں میں سے ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) اور جو شخص چاہے سوائے اسلام کے کوئی اور دین، تو ہرگز وہ نہیں قبول کیا جائے گا اس سے، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

جب اس سے پہلی آیت کریمہ میں بیان کیا۔ ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ اور ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں اس کے پیچھے اس آیت کریمہ میں (گویا کہ یہ بیان فرمادیا کہ اللہ کے ہاں معتبر دین صرف دین اسلام ہی ہے۔

”وان كل دين سوى الاسلام فانه غير مقبول عند الله“

بیشک اللہ کے حضور سوائے اسلام کے اور کوئی دین مقبول نہیں۔

”لان القبول للعمل هو ان يرضى الله ذلك العمل ويرضى عن فاعله وبشبهه عليه

ولذلك قال الله تعالى الما يتقبل الله من المتقين“

اللہ تعالیٰ جس عمل کو پسند فرماتا ہے وہی اس کے ہاں قبول ہے، اور اس پر عمل کرنے والوں کو ثواب دیا

جائے گا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے قبول فرماتا ہے“ جب

اللہ تعالیٰ کے ہاں دین اسلام کے سوا کوئی اور دین پسند نہیں تو یہی وجہ ہے کہ کسی اور دین پر عمل کرنے

والے خسارہ پانے والے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

**شان نزول:**

(۱) بارہ شخص مدینہ طیبہ سے (السعیانہ باللہ) مرتد ہو کر مکہ میں چلے گئے، جن میں حارث بن سیدہ انصاری بھی تھا

تو ان کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ اسلام سے پھر جانے والے، کفر کو اختیار کرنے والے خسارے میں

ہیں، رب تعالیٰ کی ناراضگی ان کو حاصل ہے، اور رب تعالیٰ کا غیظ و غضب ان کو حاصل ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی شدید

(ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

گرفت میں آئیں گے۔



**مقام توجہ:** بعد میں مستثنی ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾ آ رہا ہے، جس سے واضح ہو

رہا ہے کہ بعض لوگ مرتد ہونے کے بعد پھر اسلام کی طرف لوٹ کر آ گئے تھے ”فرجع الحارث فاسلم وحسن اسلامه“ حارث بن سويد انصاری لوٹ کر آ گیا، پھر دوبارہ اسلام قبول کیا، اور اسلام پر صدق دل سے قائم رہا۔ (البحر المحیط)

(۲) شان نزول اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ بنی قریظہ اور بنی نضیر یہود مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے آپ کی نبوت کی بشارت دیتے تھے اور گواہی دیتے تھے کہ وہ نبی برحق ہوں گے ”فلما بعث وجاءهم بالبينات والمعجزات كفروا بغيا وحسدا“ جب آپ کو مبعوث فرمایا اور آپ دلائل ومعجزات لے کر آئے تو انہوں نے سرکشی اور حسد کی وجہ سے انکار کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

(۳) ”وقيل هي في عامة المشركين“ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ عام مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، جنہوں نے بھی دین اسلام کے سواء شرک کو پسند کیا وہ سب خسارے میں ہیں۔

(۴) ”الفاظ الآية نعم كل من ذكر وغيرهم“ شان نزول کی جو چند وجوہ بیان کی گئی ہیں، آیت کریمہ ان کو بھی شامل ہے، لیکن الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے ان تمام لوگوں کے متعلق ہے جو دین اسلام کے سواء اور دین پسند کرنے والے ہیں، یعنی تمام ادیان باطلہ پر عمل کرنے والے خسارے میں ہیں۔ (البحر المحیط)

”الاسلام هنا قيل هو الاستسلام الى الله والتفويض اليه وهو مطلوب في كل زمان ومكان وشريعة، ولذلك فسره الزمخشري بالتوحيد واسلام الوجه لله“

اسلام کا مطلب اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور سر جھکانا ہے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنا ہے، ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر شریعت میں یہی مطلوب رہا کہ بندہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ اسی لئے زمخشری نے اسلام کا معنی ”توحيد اور اللہ کی رضا کیلئے سر جھکانا، گردن رکھنا“ کیا ہے۔

”وقيل المراد بالاسلام شريعة محمد ﷺ بين تعالى ان من تحرى بعد مبعثه شريعة غير شريعة فغير مقبول منه“

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس مقام میں اسلام سے مراد نبی کریم ﷺ کی شریعت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ جس نے نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور شریعت پر عمل کیا وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ (البحر المحیط)

قال النبی ﷺ فی الحديث الصحيح ”من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو رد“ نبی کریم ﷺ کا ارشاد حدیث صحیح میں یہ ہے کہ ”جس شخص نے ہماری شریعت کے بغیر کوئی اور عمل کیا وہ



(منقول از صابونی وابن کثیر)

مردود ہے۔

☆ اخرج احمد والطبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ تجنی الاعمال یوم القیامۃ فتجنی الصلوۃ فتقول یارب انا الصلوۃ فیقول انک علی خیر وتجنی الصدقۃ فتقول یارب انا الصدقۃ فیقول انک علی خیر ثم یجینی الصیام فیقول انا الصیام فیقول انک علی خیر ثم تجنی الاعمال کل ذلک یقول اللہ انک علی خیر ثم یجینی الاسلام فیقول یارب انت السلام وانا الاسلام فیقول اللہ انک علی خیر الیوم آخذ وبک اعطی قال اللہ فی کتابہ ﴿وَمَنْ یَتَّبِعْ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

مسند احمد اور اوسط طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال قیامت کے دن (رب کے حضور) آئیں گے، تو نماز حاضر ہوگی، عرض کرے گی اے میرے رب میں نماز ہوں، تو رب تعالیٰ فرمائے گا بیشک تو بھلائی پر ہے، اور صدقہ حاضر ہوگا تو عرض کرے گا، اے میرے رب میں صدقہ ہوں تو رب تعالیٰ فرمائے گا بیشک تو بھلائی پر ہے، پھر روزے (رب تعالیٰ کے حضور) حاضر ہوں گے، تو کہیں گے ہم روزے ہیں، تو رب تعالیٰ فرمائے گا بیشک تم بھلائی پر ہو، پھر تمام اعمال (اسی طرح رب تعالیٰ کے حضور) حاضر ہوں گے، رب تعالیٰ فرمائے گا بیشک تم خیر پر ہو، پھر اسلام حاضر ہوگا تو عرض کہے گا اے میرے رب! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں، تو رب تعالیٰ فرمائے گا بیشک تو بہتری پر ہے، آج میں تیری وجہ سے ہی (کچھ کو) گرفت میں لے رہا ہوں اور (کچھ کو انعامات) عطاء کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن پاک) میں بیان فرمایا ہے۔

﴿وَمَنْ یَتَّبِعْ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

”اور جو شخص چاہتا ہے سوائے اسلام کے کوئی اور دین تو ہرگز نہیں قبول کیا جائے وہ اس سے، اور وہ

(ماخوذ از درمنشور)

آخرت میں ہوگا خسارہ پانے والوں میں سے“

وہ خسارہ کیا ہوگا؟

ان کو خسارہ ہوگا آخرت میں ثواب سے محروم ہو کر، اور ان کو عذاب ہونے کی وجہ سے خسارہ میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ اور نیک اعمال کے ضائع ہونے پر جو افسوس اور حسرت ہوتی ہے وہ خسارہ ہی ہے، اسی طرح دنیا میں باطل دین پر قائم رہ کر اسے جو تھکن اور مشقت حاصل ہوتی ہے وہ بھی اس کیلئے خسارہ ہوگا، غرضیکہ دین حق سے پھرنے والا دین و دنیا میں خسارے میں رہتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)



كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ  
الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

(آیہ نمبر ۸۶)

- (۱) کیونکر اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو ہدایت چاہے جو ایمان لا کر کافر ہو گئے اور گواہی دے چکے تھے کہ  
رسول سچا ہے اور انہیں کھلی نشانیاں آچکی تھیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (کنز الایمان)
- (۲) کیسے ہدایت چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس قوم کی جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد، حالانکہ وہ گواہی  
دے چکے تھے کہ بیشک رسول سچا ہے، اور آچکی تھی ان کے پاس کھلی نشانیاں، اور اللہ انہیں ہدایت  
دیتا ظالم قوم کو۔

(نجوم الفرقان)

بظاہر اس آیہ کریمہ میں واقع ہونے والے اعتراضات تفسیر روح البیان کی خوبصورت تفسیر سے خود بخود  
زائل ہو جاتے ہیں، آئیے ذرا دیکھئے۔

(كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ) الى الحق (قوما كفروا بعد ايمانهم) قيل هم عشرة رهط ارتدوا بعد  
ما آمنوا ولحقو بمكة وهو الاستبعاد لان يهذي قوما هم معاندون للحق مكابرون فيه  
غير خاضعين له بان يخلق فيهم الاهتداء ويوفقهم لا اكتساب الاهتداء والما يخلق  
الاهتداء ويوفق الاكتساب الاهتداء والما يخلق الاهتداء ويوفق على كسب ذلك  
ويقدرهم عليه اذا كانوا خاضعين متواضعين للحق راغبين فيه فالمراد من الهداية خلق  
الاهتداء وقد جرت سنة الله في دار التكليف على ان كل فعل يقصد العبد الى  
تحصيله فان الله تعالى يخلقه عقيب قصد العبد فكأنه تعالى قال كيف يخلق فيهم  
المعرفه والاهتداء وهم قصدوا التحصيل الكفر وارادوه

”کیسے ہدایت چاہتا ہے اللہ اس قوم کی جو کافر ہو گئے ایمان لانے کے بعد“ بیان کیا گیا ہے وہ دس گروہ تھے جو ایمان  
لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور مکہ میں چلے گئے، ان کی ہدایت کو رب تعالیٰ نے بعید سمجھا کہ یہ لوگ جو حق سے عناد  
رکھتے ہیں اور اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں، رب کے حضور جھکتے ہیں، ان کیلئے رب تعالیٰ کیسے ہدایت پیدا فرمادے،  
اور ان کو کیسے ہدایت کی توفیق عطا فرمادے کہ وہ ہدایت کو حاصل کر لیں، اور ان کو کیسے ہدایت پر قادر کر دے، ہاں  
البتہ جب وہ رب تعالیٰ کے حضور جھک جاتے ہیں، عجز اختیار کر لیتے ہیں، اور رب تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو ان کو  
رب کائنات توفیق عطا کر دیتا ہے کہ وہ ہدایت حاصل کر لیں، اور ان کو ہدایت پالینے پر قادر کر دیا جاتا ہے۔



ہدایت سے مراد اس مقام میں ”خلق اہتداء“ ہے، (یعنی ہدایت کا پیدا کرنا اس مقام میں مراد ہے) اللہ تعالیٰ کا طریقہ شریف یہ ہے کہ اس دنیا میں جب کوئی بندہ ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہدایت کی تخلیق فرماتا ہے۔ اور بندے جب رب تعالیٰ کے حضور جھک جاتے ہیں، عجز و انکساری اختیار کرتے ہیں، ایمان اور نیک اعمال کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کیلئے معرفت و ہدایت پیدا کر دیتا ہے۔

﴿وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾

”حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آچکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں“

یعنی جو لوگ مرتد ہو گئے وہ پہلے ایمان لا چکے تھے، جب تک وہ خود دوبارہ توبہ کرنے کی اور اسلام کی طرف میلان کی کوشش نہیں کریں گے ان کی معرفت و ہدایت کو رب تعالیٰ کیسے پیدا فرمائے گا۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالموں کی قوم کو“

یعنی وہ جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور رب تعالیٰ کی معرفت کی طرف توجہ ہی نہ کی، اور کفر کو ایمان پر ترجیح دی، ان کے پاس حق اور رب تعالیٰ کی معرفت کیسے آئے گی۔

**اعتراض:** فان قيل ظاهر الآية يقتضي ان من كفر بعد اسلامه لا يهديه الله ومن كان ظالما لا يهديه الله وقد رأينا كثيرا من المرتدين اسلموا وهداهم وكثيرا من الظالمين تابوا عن الظلم

ظاہر آیت کریمہ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جس نے اسلام کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا، اور جو شخص ظالم ہو اللہ تعالیٰ اسے بھی ہدایت نہیں دیتا، حالانکہ ہم نے بہت مرتدین کو دیکھا کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت عطاء فرمادی، اسی طرح کتنے ہی ظالموں کو ہم نے دیکھا کہ وہ ظلم سے تائب ہو گئے، تو آیت کریمہ کا مطلب کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ مرتدوں اور ظالموں کو رب تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔

**جواب:** فالجواب ان معناه لا يهديهم ماداموا مقيمين على الرغبة في الكفر وفي الثبات عليه ولا يقبلون على الاسلام واما اذا تحروا واصابة الحق والاهتداء بالادلة

المنصوبة فحينئذ يهديهم الله بخلق الاهتداء فيهم

آیت کریمہ کا مفہوم واضح ہے کہ جب تک وہ کفر کی طرف راغب رہتے ہیں، اور کفر پر قائم رہتے ہیں اور اسلام کی طرف توجہ نہیں کرتے، لیکن وہ حق کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حق پر قائم رہنے کیلئے



دلائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو رب تعالیٰ ان کیلئے ہدایت کو پیدا کر دیتا ہے، اور وہ ہدایت کو حاصل کر لیتے ہیں۔  
(تفسیر آیۃ از روح البیان)

آیۃ کریمہ میں تکرار نہیں:

بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ آیۃ کریمہ کی ابتداء میں ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ﴾ ذکر فرمایا، اور انتہاء میں ذکر فرمایا ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ یہ تکرار ہے۔ تو اس وہم کا یوں ازالہ کیا گیا۔  
”قلت ليس فيه تكرار لان قوله ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا“ انما هو مختص باولئك المرتدين عن الاسلام ثم انه تعالى عمم ذلك الحكم في آخر الآية فقال ”وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ“ يعنى جميع الكفار المرتدين عن الاسلام والكافر الاصلی“

کہ اس میں تکرار نہیں اسلئے کہ ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ“ میں ان کفار و مرتدین کا ذکر ہے جن کا پچھلی آیۃ کریمہ کے شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی اس میں تخصیص پائی گئی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو عام کر دیا، یعنی تمام کفار خواہ وہ اصلی کافر ہوں یا مرتد ہوں، سب کا ذکر ”وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ“ میں فرمایا۔

”وانما سمي الكافر ظالما لانه وضع العبادة في غير موضعها“

کافر کو اسلئے ظالم کہا گیا ہے کہ وہ عبادت کو اس کی جگہ کے غیر میں رکھتا ہے۔ یعنی وہ رب تعالیٰ کے بغیر اوروں کی عبادت کرتا ہے اس لئے وہ ظالم ہے۔ (خازن)

ظلم کا مطلب یہ ہے کہ ”وضع الشيء في غير محله“ کہی چیز کو غیر محل میں رکھنا۔





أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

(آیہ نمبر ۸۷، ۸۸، ۸۹)

(۱) ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی سب کی ۝ ہمیشہ اس میں رہیں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہونہ انہیں مہلت دی جائے ۝ مگر جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور آیا سنبھالا تو ضرور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) وہ (لوگ) ان کا بدلہ (یہ ہے) بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ۝ ہمیشہ رہیں گے اس میں، نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب، اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی ۝ مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی بعد اس کے، اور اپنی اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

پچھلی آیہ کریمہ ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا“ اور یہ تین آیتیں ملا کر پڑھی جائیں تو ان کا مطلب سمجھنا آسان ہوگا، ابتداء در منشور کی روایات سے کر رہا ہوں، پھر کبیر وغیرہ سے ان شاء اللہ منقول ہوگا، اس لئے پچھلی آیہ کریمہ کا ذکر بھی ساتھ ساتھ آتا رہے گا۔

❁ اخرج النسائي وابن حبان وابن ابى خاتم والبيهقي فى سننه من طريق عكرمة عن ابن عباس قال كان رجل من الانصار فاسلم ثم ارتد ولحق بالمشركين ثم ندم فارسل الى قومه ارسلوا الى رسول الله ﷺ هل الى من توبه؟ فنزلت كيف يهدى الله قوما كفروا بعد ايمانهم، الى قوله فان الله غفور رحيم، فارسل اليه قومه فاسلم

نسائی اور ابن حبان اور ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کی روایت عکرمہ سے نقل کی کہ انصار سے ایک شخص نے اسلام لایا، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ (العیاذ باللہ) مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جا ملا، پھر اس پر پشیمان ہو گیا، اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیج کر میرے لئے پوچھو ”کیا میری توبہ قبول کی جائے گی“ تو ان کے پوچھنے پر ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ“ سے لیکر ”غَفُورٌ رَحِيمٌ“ تک ”چار آیات کریمہ



”نازل ہوئیں۔ (ازدر منشور)

یعنی اسے بتایا گیا کہ جب تک کوئی شخص اپنے ارتداد اور کفر پر قائم رہے تو اس کیلئے رب تعالیٰ ہدایت و معرفت پیدا نہیں فرماتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف اگر وہ توبہ کر لے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے کیونکہ وہ ”غَفُورٌ رَحِيمٌ“ ہے۔

❁ واخرج عبدالرزاق ومسدد فی مسنده وابن جریر وابن المنذر والباوری فی معرفة الصحابة قال جاء الحارث بن سويد فاسلم مع النبي ﷺ كافر فرجع الى قومه فانزل الله فيه القرآن كيف يهدي الله قوما كفروا الى قوله رحيم، فحملها اليه رجل من قومه فقرأها عليه فقال الحارث انك والله ما علمت لصدوق وان رسول الله ﷺ لا صدق منك وان الله عز وجل لا صدق الثلاثة فرجع الحارث فاسلم فحسن اسلامه“

مسند عبدالرزاق وغیرہ میں ذکر کیا گیا کہ حارث بن سويد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اسلام قبول کیا، پھر کافر ہو گئے، پھر اپنی قوم کی طرف لوٹ کر چلے گئے، (ایک روایت کے مطابق مکہ میں چلے گئے مشرکوں سے جا ملے) تو اللہ تعالیٰ نے ”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا“ سے لے کر ”غَفُورٌ رَحِيمٌ“ تک چار آیات نازل فرمائیں، تو اس قوم کا ایک شخص (جو مسلمان تھا) یہ آیات حارث کے پاس لے گیا، اور اس پر یہ آیات پڑھیں، تو حارث نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مجھے معلوم ہے بیشک تو سچا ہے، اور رسول اللہ ﷺ تم سے بھی زیادہ سچے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سچا ہے، تو حارث لوٹ آئے، پھر اسلام قبول کر لیا، اور اچھے طریقہ سے یعنی خلوص قلب سے ایمان قبول کر لیا۔ (منقول ازدر منشور)

❁ قال عكرمة نزلت في ابي عامر الراهب والحارث بن سويد بن الصامت ووحوش بن الاسلت في اثني عشر رجلا رجعوا عن الاسلام ولحقوا بقريش ثم كتبوا الى اهلهم هل لنا من توبة فنزلت الا الذين تابوا من ذلك ”الآيات“

حضرت عکرمہ ؓ نے فرمایا یہ آیات کریمہ نازل ہوئی ہیں ابو عامر راہب اور حارث بن سويد بن صامت اور وحوش بن اسلت وغیرہ بارہ شخصوں کے متعلق جو (العباد باللہ) اسلام سے پھر گئے اور قریش سے لاحق ہو گئے، پھر انہوں نے اپنی اہل (یعنی اپنی قوم) کی طرف لکھا کیا ہماری توبہ قبول ہو جائے گی، تو ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا“ وغیرہ آیات نازل ہوئیں۔ (منقول ازدر منشور)





﴿أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا﴾  
 ”وہ (لوگ) ان کا بدلہ (یہ ہے) کہ بیشک ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی وہ اس  
 میں ہمیشہ رہیں گے“

ما قبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیت کریمہ میں ذکر فرمایا کہ جو لوگ ایمان کے بعد کافر ہو جاتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کیسے ہدایت  
 دے گا، یعنی جب تک وہ کفر پر جمے رہے اور ایمان کی طرف انہوں نے میلان نہ کیا تو اللہ تعالیٰ ان کیلئے ہدایت  
 و معرفت پیدا نہیں فرمائے گا کہ وہ ہدایت پر آجائیں۔ اب اس آیت کریمہ میں یہ ذکر کیا جا رہا ہے کہ صرف ہدایت نہ  
 دینے پر معاملہ محدود نہیں۔

”بل كما لا يهديهم في الدنيا يلعنهم اللعن العظيم ويعذبهم في الآخرة على سبيل التابيد والخلود“  
 بلکہ جس طرح ان کو دنیا میں ہدایت نہیں دی جاتی اسی طرح آخرت میں ان پر بہت عظیم لعنت ہوگی اور ان کو  
 عذاب دیا جائے گا، یہ لعنت و عذاب ان کیلئے دائمی ہوگا، اس سے ان کو چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔ (ازکبیر)

اللہ کی لعنت اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت میں فرق:

واعلم ان لعنة الله مخالفة للعنة الملائكة لان لعنة بالابعاد من الجنة وانزال العقوبة  
 والعذاب واللعة من الملائكة هي بالقول وكذلك من الناس  
 اللہ تعالیٰ کی لعنت فرشتوں کی لعنت سے علیحدہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کو  
 جنت سے دور رکھے گا، اور ان کو اپنی گرفت میں لے گا اور ان پر عذاب نازل کرے گا، اور فرشتوں اور  
 لوگوں کی لعنت زبانی، کلامی ہوگی کہ ”اللہ کی ان پر لعنت ہو“ (ازکبیر)

**انتباہ:** اولئک جزاؤہم ”کا مطلب یہ“ اولئک جزاء کفرہم“ وہنا ک اولئک علیہم لعنة  
 اللہ“ کہ ان لوگوں کے کفر کی جزاء یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ ”جزاء کفر“ کی تخصیص کی ضرورت کیوں  
 درپیش آئی؟ اس لئے کہ جس کی موت کفر پر آنے کا یقین ہو لعنت اس پر ہی بھیجی جاتی ہے، مؤمن پر لعنت کرنا جائز نہیں۔  
 ان آیات کریمہ کے شان نزول سے واضح ہو چکا ہے کہ کئی لوگ ایمان کے بعد مرتد ہوئے لیکن پھر وہ توبہ



کر کے ایمان بھی لے آئے، ان پر لعنت بھیجنا جائز نہیں، لہذا یہاں ضروری ہے کہ مطلب یوں ہی بیان کیا جائے کہ وہ لوگ جو کافر ہوئے اور کفر پر ہی مر گئے ان کی جزاء یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے، اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ان پر لعنت ہے۔ لیکن وہ خوش قسمت جو توبہ کر کے پھر ایمان لے آئے، ان کو ہدایت بھی مل گئی، مغفرت اور رحمت بھی حاصل ہو گئی اور وہ لعنت سے بھی بچ گئے۔  
(از البحر المحیط)

**اعتراض:** یہ کیسے کہا گیا ہے کہ لعنت صرف کافروں پر مومنوں پر نہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ ایک جگہ سے گزر رہے تھے تو آپ نے ایک گدھے کے چہرہ کو دیکھا جسے گرم لوہے سے داغ دیا ہوا تھا، تو آپ نے فرمایا ”لعن اللہ تعالیٰ من فعل هذا“ اللہ کی اس پر لعنت ہو جس نے یہ کام کیا۔

”وبما صح ان الملائكة للعن من خرجت من بيتها بغير اذن زوجها“  
صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جو عورت خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نکلے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں، ان روایات سے مومنوں پر لعنت کرنے کا جواز ملتا ہے۔

**جواب:** واجب بان اللعن هناک للجنس الداخل فيه الشخص ايضا“

کہ روایات میں جس لعنت کا ذکر ہے وہ جنس لعنت ہے یعنی مطلقاً لعنت میں مومنین بھی داخل ہیں۔ (روح المعانی)  
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لعنت کا جب معنی یہ لیا جائے کہ ”اللہ تعالیٰ ان کو جنت سے دور رکھتا ہے اور دائمی عذاب میں مبتلا رکھتا ہے“ تو یہ لعنت صرف کافروں پر کی جاسکتی ہے، مومنوں پر نہیں، فرشتوں اور لوگوں کی یہی لعنت رب تعالیٰ سے کافروں کیلئے ہی طلب کی جاسکتی ہے، مومنوں کے لئے نہیں۔ لیکن جب لعنت کا معنی یہ لیا جائے کہ رب تعالیٰ کے خصوصی تقرب سے دوری تو یہ لعنت مومنوں پر کی جاسکتی ہے، بلکہ یہ لعنت صرف مومنوں پر ہی کی جاسکتی ہے، کیونکہ تقرب الہی ان کو ہی حاصل ہوتا ہے، کافروں کو جب تقرب حاصل ہی نہیں ہوتا تو ان کیلئے دوری کی دعاء کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

**سوال:** یہاں سب لوگوں کے لعنت بھیجنے کا ذکر کیوں کیا گیا، حالانکہ کافر کافروں پر لعنت نہیں کرتے۔

**پہلا جواب:** یہاں مراد یہ ہے کہ ہر شخص کا حق یہ ہے کہ وہ کافر پر لعنت بھیجے خواہ وہ لعنت بھیجے یا نہ بھیجے۔

**دوسرا جواب:** یوم آخرت میں کافر بھی کافروں پر لعنت کریں گے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے۔ ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعْنَتْ أُخْتَهَا﴾ ”جب بھی کوئی گروہ (کافروں کا) داخل ہوگا تو لعنت کرے گا اپنے ہم جنس گروہ پر“ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم﴾



بَعْضًا ﴿ پھر قیامت کے دن بعض بعض کا انکار کر دیں گے اور لعنت بھیجیں گے بعض بعض پر ﴾

”وَعَلَىٰ هَٰذَا التَّكْدِيرِ فَقَدْ حَصَلَ اللَّعْنُ لِلْكَفَّارِ مِنَ الْكَفَّارِ“

جب یہ معنی لیا جائے کہ قیامت کے دن سب لوگ کافروں پر لعنت بھیجیں گے تو سب کافروں کی دوسرے کافروں کیلئے لعنت ثابت ہو جائے گی۔

**تیسرا جواب:** الثالث كان الناس هم المؤمنون والكفار ليسوا من الناس

رب تعالیٰ نے ”الناس“ ذکر فرمایا جس کا معنی ہے ”انسان“ کہ سب انسان لعنت بھیجتے ہیں، اس سے مراد مؤمنین ہیں، کہ حقیقت میں ”انسان“ صرف مؤمن ہی ہے، کافر تو انسان ہی نہیں، بلکہ وہ تو چوپاؤں سے بھی گھنیا ہے، جس پر قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ دلالت کر رہی ہے ﴿أَوَلَيْسَ كَمَا لَأَنْعَامٍ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ ”وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں“

**چوتھا جواب:** والرابع وهو الاصح عندی ان جميع الخلق يلعنون المبطل

والكافر، ولكنه يعتقد في نفسه انه ليس بمبطل ولا بكافر فاذا لعن الكافر و كان هو

في علم الله كافرا فقد لعن نفسه وان كان لا يعلم ذلك

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق باطل راہ پر چلنے والے اور کافر پر لعنت بھیجتی ہے، البتہ کافر کافر پر تو لعنت بھیجے گا، لیکن اپنے عقیدہ میں اپنے آپ کو وہ کافر نہیں مانتا، وہ کہتا ہے میں تو حق راہ پر ہوں میں کوئی کافر تو نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر ہے، جب وہ باطل راہ پر چلنے والے، اور کافر پر لعنت بھیجے گا تو گویا کہ وہ اپنے آپ پر بھی لعنت بھیج رہا ہوگا۔

(ماخوذ از کبیر)

**وعید شدید:**

وكل ذلك مستحق لهم بسبب ظلمهم و كفرهم فصلاح ان يكون جزاء لذلك

ہر ظالم اور کافر کی یہی جزاء ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے کیونکہ وہ مستحق لعنت ہے۔ (کبیر)

**اعلیٰ حضرت و علامہ رازی رحمہما اللہ:**

ثم لما ذكر لعن الثلاث قال اجمعين (کبیر) پھر جب تین لعنتوں کا ذکر دیا گیا، یعنی اللہ اور فرشتوں اور لوگوں کی لعنت کا ذکر کر دیا گیا تو فرمایا ”اجمعين“ یہ تینوں کی تاکید ہو گئی کہ ”سب کی لعنت ہو“ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ”لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی“ آپ کے ترجمہ میں ”سب کی



”علحدہ مذکور ہے جس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ ”اجمعین“ تینوں کی تاکید ہے۔

**راقم** نے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ان کو دوسری صورت بھی سمجھ آ جائے ورنہ بہتر وہی ہے جو علامہ رازی رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ راقم کا ترجمہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے، آپ رقمطراز ہیں:-

﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ المراد به المؤمنون منهم او المراد مؤمنهم و کافرهم اجمعین فان الکفار ایضاً یلعنون منکری الحق وان کانوا لا یعرفون الحق بعینه او هم یلعن بعضهم بعضاً یوم القيامة قال الله تعالى یکفر بعضهم بعضاً یوم القيامة ، قال الله تعالى یکفر بعضهم ببعض ویلعن بعضهم بعضاً

﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (سب لوگوں کی لعنت) سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں سے سب مؤمنین کافروں پر لعنت کرتے ہیں، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ مراد سب لوگ ہوں خواہ مؤمن ہو یا کافر، کیونکہ کافر بھی حق کے منکرین پر لعنت بھیجتے ہیں، اگرچہ وہ حق نہیں پہچانتے، یعنی وہ خود بھی حق کے منکر ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں، یا مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن سب ہی کافروں پر لعنت کریں گے۔ جو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے واضح ہے، وہ ارشاد یہ ہے ﴿يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا﴾ (ماخوذ از مظہری)

اور تفسیر تبصیر الرحمن نے بھی ”اجمعین“ کو تاکید ”والناس“ کی بنایا ہے۔

﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ من المؤمنین الذین آذوهم والکافرین الذین وقعوا فی الکفر بسیهم یسلطون علیهم مجتمعين

﴿وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ سے مراد یا تو کل مؤمنین ہیں جن کو انہوں نے ایذا دی ہے، اور یا تو صرف کافر مراد ہوں جن کے سبب وہ کفر میں واقع ہوں، وہ ان پر مسلط ہے ہوں۔ (از تبصیر الرحمن)

﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ ”وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے“

یعنی وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، اس ارشاد گرامی کے چند مطالب ہیں، ایک یہ کہ وہ قیامت کے دن لعنت میں مبتلا ہوں گے جو ان سے کبھی زائل نہیں ہوگی، ہمیشہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی رہے گی، بلکہ ان کے ساتھی کفار جہنم میں ہوں گے یہ کافر جہنم میں ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہوں گے۔

دوسری وجہ کہ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا، لعنت کا اثر



عذاب ہے، یعنی وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، لعنت کے اثر میں ہمیشہ رہنا لعنت میں ہی ہمیشہ رہنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَنْ أَعْرَضَ عَنْهُ فَإِنَّهُ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْرًا ۝ خَالِدِينَ فِيهِ﴾ ”جس شخص نے اس سے اعراض کیا بیشک وہ قیامت دن بوجھ اٹھائے ہوگا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے“ یہاں بھی گناہوں کے بوجھ میں رہنے سے مراد عذاب میں رہنا ہے۔

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ (خالدين فيها) ای فی جہنم ”وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اگرچہ جہنم کا ذکر صراحتہ تو پہلے نہیں، لیکن کنایہ سمجھ آ رہا ہے کہ لعنت ذریعہ ہے جہنم میں جانے کا لہذا ”فیہا“ میں ضمیر ”جہنم“ کی طرف لوٹا دی، اسی وجہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ”فعلى هذا الكناية عن غير مذکور“ کہ یہ غیر مذکور سے کنایہ کے طور پر مذکور ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

واعلم ان قوله ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ نصب على الحال مما قبله وهو قوله تعالى ﴿عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ﴾ ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ منصوب ہے کیونکہ ﴿عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ﴾ سے حال واقع ہے، اگرچہ بظاہر یہ مبتداء خبر ہیں لیکن ظرف جب خبر ہو وہاں فاعلیت والا معنی پایا جاتا ہے، کیونکہ عامل وہاں استقر ہوتا ہے، اس لئے حال بنانا صحیح ہے۔ (کبیر بوضاحت)

﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾

”نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی۔“

مطلب واضح ہوا کہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ان کا عذاب ایک وقت سے دوسرے وقت موخر کیا جائے گا۔

﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ معنی الانظار، التاخير، قال تعالى ﴿فَنَظَرْنَا إِلَى مِيسِرَةٍ﴾ ”انظار“ کا معنی ہے تاخیر، جیسا کہ ﴿فَنَظَرْنَا إِلَى مِيسِرَةٍ﴾ میں ”نظرة“ کا معنی تاخیر اور مہلت ہے، اسی طرح ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عذاب کو موخر نہیں کیا جائے گا، ان کو عذاب میں مہلت نہیں دی جائے گی۔

”ان العذاب الملحوق بالكافر مضرة خالصة عن شوائب المنافع دائمة غير منقطة“ نعوذ منه باللہ“ کافروں کا عذاب مکمل طور پر نقصان اور ضرر پہنچانے والا ہوگا، اس میں ذرا بھرنفع کا کوئی احتمال نہیں ہوگا، حالانکہ دنیا



میں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی سزا دی جاتی ہے لیکن اس میں نفع پایا جاتا ہے کہ یہ پڑھ جائے، یا یہ سنو جائے، اس کیلئے اس کا انجام بہتر ہو جائے، لیکن کافر کے عذاب میں نفع کا کوئی شائبہ نہیں پایا جائے گا، اور کافر کا اخروی عذاب ختم بھی نہیں ہوتا، کیونکہ نہ اخروی زندگی نے ختم ہونا ہے ہے اور نہ عذاب نے، (نعوذ باللہ منہ) ”اللہ کی پناہ ایسے عذاب سے۔“ (کبیر)

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

”مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی بعد اس کے اور اپنی اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے“

یعنی کافر جب کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئیں اور اچھے عمل کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا، اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ”تَابُوا“ کے بعد ”وَأَصْلَحُوا“ ذکر فرما کر یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ کامیابی کیلئے صرف توبہ کافی نہیں بلکہ توبہ کے بعد ظاہری اور باطنی اصلاح ضروری ہے۔ راقبہ وغیرہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرے، اور باطنی اصلاح یہ ہے کہ ظاہری اصلاح یہ ہے کہ عبادت کرے یعنی حقوق اللہ ادا کرے، اور حقوق العباد کا لحاظ کرے، کسی انسان پر ظلم نہ کرے، کسی کا مال ناحق اپنے قبضہ میں نہ کرے، جب توبہ بھی کر لے گا اور اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح کر لے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس پر رحم فرمائے گا، اس کی بخشش کر دے گا۔

(فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ) کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کر کے ان کی



مابعد سے) واضح ہو رہا ہے کہ یہ جزاء اور شرط اس کی مفہوم کلام سے واضح ہے، معنوی طور پر عبارت یوں بن گئی ﴿إِنْ تَابُوا فَإِنَّ اللَّهَ يُغْفِرُ لَهُمْ﴾ ”اگر وہ توبہ کر لیں تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کی بخشش کر دے گا۔“ (ماخوذ از کبیر)

**اعتراض :** یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ صرف توبہ کافی نہیں بلکہ اصلاح عقائد و اعمال بھی ضروری ہے، حالانکہ

”ان مجرد التوبة يوجب تخفيف العذاب ونظر الحق اليهم“

صرف توبہ سے ہی عذاب کی تخفیف ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت کا وہ مستحق ہو جاتا ہے۔

”فالظاهر انه ليس تقييدا بل بيان لان يصلح مافسد“

اس سے پتہ چلا کہ ”واصلحوا“ بخشش کی قید نہیں بلکہ بیان ہے اس چیز کا کہ توبہ خود ہی اصلاح ہے

کہ گناہ جو ذریعہ فساد ہیں وہ توبہ سے مٹ جاتے ہیں۔

**جواب :** یہاں دو لحاظ ہیں ایک یہ کہ ماضی کے گناہوں کی توبہ کر لے تو وہ گناہ تو صرف توبہ سے معاف

کر دئے جاتے ہیں، لیکن توبہ یہ ہے کہ ”ماضی کے گناہوں پر نادم ہو“ اور گناہوں کی معافی طلب کرے، اور مستقبل

میں گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے۔ یہ پختہ ارادہ گناہ نہ کرنے کا مستقبل میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اصلاح

عقائد و اعمال بھی ضروری ہے، جواب میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں۔

”واجب بانه ليس بوارد لان مجرد الندم والعزم على ترك الكفر في المستقبل لا

يخرجه منه فهو بيان للتوبة المعتد بها فالمال واحد“ (روح المعانی)





إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزْدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تَقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ۝

(آیہ نمبر ۹۰)

(۱) بیشک وہ جو ایمان لا کر کافر ہوئے پھر اور کفر میں بڑھے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی، اور وہی ہیں بھٹکے ہوئے۔  
(کنز الایمان)

(۲) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ایمان کے بعد، پھر بڑھے اور کفر، ہرگز نہیں قبول کی جائے گی ان کی توبہ، وہی (کامل) بھٹکے ہوئے ہیں۔  
(نجوم الفرقان)

کفر میں زیادتی کیسے؟

اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایک تو مرتد کا کفر کہ وہ کفر پر قائم رہے، اور اسی پر اسرار کرے ”فیکون الاصرار كالزيادة“ تو اس کا اصرار کفر میں زیادتی ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ کفر کے ساتھ اور کفر ملایا جائے، جیسا کہ اہل کتاب نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان رکھتے ہیں ”ثم كفروا به عند المبعث“ پھر انہوں نے آپ کی بعثت پر آپ سے کفر کیا۔  
”ثم ازدادوا كفرا بسبب طعنهم فيه في كل وقت، ونقضهم ميثاقه وفتنتهم للمؤمنين وانكارهم لكل معجزة تظهر“

پھر وہ اور کفر میں بڑھے، کیونکہ وہ ہر وقت آپ کی نبوت اور آپ پر طعن کرتے، اور وعدہ کر کے توڑ دیتے، اور مومنوں کو فتنوں میں مبتلا رکھتے، اور جب بھی کوئی معجزہ ظاہر ہوتا وہ اس کا انکار کرتے، یہ تھا ان کا کفر میں بڑھنا۔

(۳) کفر میں ان کے بڑھنے کی اور وجہ یہ ہے کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے ایمان لایا، پھر عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کر کے کافر ہو گئے ”ثم ازدادوا كفرا بسبب انكارهم محمد ﷺ والقرآن“ پھر وہ حضرت محمد ﷺ اور قرآن پاک کا انکار کر کے کفر میں اور بڑھے۔

(۴) آیہ کریمہ کے شان نزول کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو مرتد ہو کر مکہ چلے گئے، اور ان کا کفر اور زیادہ ہوا کیونکہ انہوں نے کہا۔ ”نقيم بمكة نربص بمحمد اريب المنون“



ہم مکہ میں ہی رہیں گے اور محمد (ﷺ) پر حوادث زمانہ کی انتظار کریں گے۔

(۵) ”المراد فرقة ارتدوا لم عزمو اعلی الرجوع الی الاسلام علی سبیل النفاق فسمى الله تعالى ذلك النفاق كفرا“

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مرتد ہو گئے تھے، پھر انہوں نے اسلام کی طرف منافقانہ انداز پر رجوع کرنے کا ارادہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نفاق کو کفر سے تعبیر کیا، کہ وہ پہلے ہی ارتداد کی وجہ سے کافر تھے پھر منافقت کی وجہ سے اور ہی زیادہ کفر میں بڑھ گئے۔ (کبیر)

(۶) وقيل نزلت في قوم من اصحابه ممن كان يكفر لم يراجع الاسلام“

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کبھی اسلام لے آتے، اور کبھی کافر ہو جاتے ان کا بار بار کفر کی طرف رجوع کرنا حقیقت میں کفر کی طرف بڑھنا تھا، اسی کو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ (از روح المعانی)

”پھر وہ اور کفر میں بڑھ گئے“

﴿ثُمَّ اِزْدَادُوا كُفْرًا﴾

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿اِزْدَادُوا﴾ ماخوذ ہے ”زیادہ“ سے، اصل میں ﴿اِزْدَادُوا﴾ ہے، باب افتعال کی فاء کلمہ میں ”زاء“ واقع ہے، اسلئے ”تاء“ کو ”دال“ سے تبدیل کرنا واجب ہو گیا، اس طرح ﴿اِزْدَادُوا﴾ سے ﴿اِزْدَادُوا﴾ بن گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

توبہ کا قبول نہ ہونا کیسے؟

بظاہر یہ مسئلہ مشکل نظر آ رہا ہے۔

”انه تعالى حکم فی الآیة الاولى بقبول توبة المرتدين وحکم فی هذه الآیة بعدم قبولها“

کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت کریمہ میں مرتدین کی توبہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا، اور اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، یہ تو دونوں آیتوں میں تناقض پایا گیا ہے، اس تناقض کو کیسے دور کیا جائے۔

”وايضاً ثبت بالدلیل انه متى وجدت التوبة بشروطها فانها تكون مقبولة لامحالة“

اور یہ بات بھی دلائل سے ثابت ہے کہ جب توبہ اپنی شرائط کے ساتھ پائی جائے تو وہ یقیناً قبول کی جاتی ہے، تو اس آیت کریمہ میں توبہ کے قبول نہ کئے جانے کی کیا وجہ ہے۔



## توبہ کے نہ قبول کرنے کی چند وجوہ:

(۱) اس میں سے پہلے وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو موت کے وقت توبہ کرتے ہیں، ان کی توبہ نہ قبول کر نیکا ذکر رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں پایا گیا ہے۔

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (النساء آیت نمبر ۱۸)  
 ”اور نہیں توبہ ان کی جو گناہوں کا عمل کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کو موت آئے تو وہ کہے اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی جو کافر مریں، ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے“

یہ جواب حضرت حسن بصری اور قتادہ اور عطاء رحمہم اللہ نے دیا ہے۔

(۲) صاحب کشاف نے یہ ذکر کیا ہے۔

”قوله تعالى (لن تقبل توبتهم) جعل كناية عن الموت على الكفر“

اس آیت کریمہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی موت کفر کی حالت میں آئے، جو کفر کی حالت میں مرے اس کی توبہ قبول نہیں جاتی۔ جو آیت کریمہ سورۃ نساء کی جواب میں ذکر کی ہے اس سے یہ مسئلہ واضح طور پر سمجھ آ رہا ہے۔ ﴿وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ”اور نہ (توبہ) ان کی جو کافر مریں“ اب آیت کریمہ کا معنی یہ ہو گیا۔

”ان اليهود والمرتدين الذين فعلوا ما فعلوا ماتون على الكفر داخلون في جملتهم لا تقبل توبتهم“

بیشک یہود اور مرتدین نے کیا جو کیا، یعنی کفر پر کفر کرتے چلے گئے، پھر موت بھی ان کی کفر پر آئی، اس لئے وہ ان لوگوں میں داخل ہو گئے جن کی توبہ کو نہیں قبول کیا جاتا۔

(۳) انه يحمل هذا على ما اذا تابوا باللسان ولم يحصل في قلوبهم اخلاص“

اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ آیت کریمہ میں جن لوگوں کی توبہ قبول نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو توبہ زبان سے کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں خلوص نہیں پایا گیا۔ ان کا زبان سے توبہ کرنا اور دل سے توبہ نہ کرنا اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں، اس لئے رب تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں کرے گا۔

(۴) اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے یہ ذکر فرمایا جو لوگ ایمان کے بعد کفر کرتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ



اور فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا﴾ ”کہ مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی“ اور لوگ اللہ کی رحمت اور بخشش کے مستحق ہو جاتے ہیں، اب اس آیت کریمہ میں گویا کہ یہ ذکر فرمایا گیا۔

”انہ لو کفر مرة اخرى بعد تلك التوبة فان التوبة الاولى تصير غير مقبولة وتصير كأنها لم تكن“ توبہ کے بعد اگر انہوں نے پھر کفر کیا تو وہ پہلی توبہ غیر مقبول ہوگی، گویا کہ پہلے انہوں نے توبہ کی ہی نہیں تھی۔ یہ قول قاضی ابوبکر رازی اور قتال اور ابن انباری کا ہے، اس قول کو بعض حضرات نے پسند کرتے ہوئے یوں کہا۔ ”وهذا الوجه اليق بالآية من سائر الوجوه“ ”تمام وجوہ میں سے یہ وجہ زیادہ مناسب ہے“

(۵) لعل المراد ما اذا تابوا عن تلك الزيادة فقط فان التوبة عن تلك الزيادة لا تصير مقبولة لم تحصل التوبة عن الاصل

آیت کریمہ میں بیان کیا گیا: ﴿ثُمَّ اِذَا ذُكِّرُوا كُفُّوا﴾ ”پھر وہ کفر میں بڑھتے گئے“ جب وہ کفر پر کفر کرتے گئے تو ان میں سے کئی لوگوں نے زیادتی کفر سے توبہ کی لیکن اصل کفر سے توبہ نہیں کی، تو آیت کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا کہ جو لوگ اصل کفر سے توبہ نہیں کرتے بلکہ صرف زیادتی کفر سے توبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرماتا۔ (ماخوذ از کبیر)

چند لوگوں کی توبہ قبول نہیں کی جاتی:

وكل مسلم ارتد فتوبته مقبولة الا احد عشر من تكررت ردة ساب النبي ﷺ وساب احد الشيخين والساحر والزنديق والخناق والكاهن والملحد والاباحي والمنافق ومنكر بعض الضروريات باطنا“

ہر مسلمان جو مرتد ہو جائے ”العیاذ باللہ“ اس کی توبہ قبول ہے، سوائے گیارہ آدمیوں کے، ان کی توبہ قبول نہیں۔

(۱) وہ شخص جو بار بار مرتد ہو جائے، یعنی جو شخص اسلام کو کھیل تماشہ بنالے اور بار بار اسلام قبول کرتا رہے، بار بار کفر اختیار کرتا رہے، اس کے اسلام کے ساتھ مزاح اڑانے کی وجہ سے مرتے وقت اسے توبہ کی توفیق ہی نہیں حاصل ہوتی وہ کفر پر ہی مر جاتا ہے۔

(۲) اور نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) گالیاں دینے والے کی توبہ قبول نہیں، کیونکہ وہ واجب القتل ہے اسے بھی توبہ کی توفیق حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ کفر پر ہی مرتا ہے۔



(۳) اور حضرت ابو بکر صدیق ؓ اور حضرت عمر ؓ میں سے کسی ایک کو گالیاں دینے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ کافر ہو جاتا ہے اور واجب القتل ہو جاتا ہے، وہ بھی کفر پر ہی مرجاتا ہے، وہ بھی توبہ کرنے کی توفیق حاصل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔

(۴) ”زندیق“ یعنی بے دین شخص کی توبہ قبول نہیں، کیونکہ جن لوگوں کا کوئی دین نہیں ہوتا، ان کو ہر شخص جانتا ہے کہ انہیں راہ راست پر لانا ممکن نہیں ہوتا وہ بھی یوں ہی کفر پر مرتے ہیں، توبہ کی ان کو بھی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

(۵) ”ملحد“ یہ وہ شخص ہوتا ہے جو بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتا ہے لیکن کفریہ عقائد کو اسلام بتاتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہود و نصاریٰ سے پیسے لے کر دین کو برباد کرنے کی ناپاک جسارت کی، دین کو برباد تو نہ کر سکے کیونکہ اس کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے، لیکن وہ خود توبہ کرنے سے محروم ہو کر کوئی جھوٹا مدعی نبوت بن کر مرا، اور کوئی نیچری (جو کچھ ذہن و ضمیر میں یعنی جو من و دھن میں آئے وہی کرے اسے نیچری کہا جاتا ہے) بن کر مرا، توبہ کی توفیق سے یہ لوگ محروم ہو کر مرے۔

(۶) ”اباحی“ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو مباح کہتے ہیں، کہ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی جائز ہے، وہ بھی حلال و حرام میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے توبہ کی توفیق حاصل ہونے کے بغیر ہی مرجاتے ہیں۔

آجکل اباحی لوگوں کی کوئی کمی نہیں، جن لوگوں سے یہ سنو ”کچھ نہیں ہوتا جی دین میں کوئی تنگی نہیں، یہ تو مولوی لوگوں نے چیزیں حرام کر رکھی ہیں، سیر و تفریح کیلئے شراب پی لیا تو کیا ہے، تنگی عورتوں کے بحرے دیکھ لئے تو کیا، یہ مولوی لوگ تو تنگ نظر ہیں، قدامت پسند ہیں، یہ تو ہمیں پندرہ سو سال پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، ایسے لوگ بغیر توبہ کے کفریات و لغویات بکتے بکتے مرجاتے ہیں۔

(۷) جادوگر جو کفریہ کلمات کے ذریعے شیطانوں اور جنوں کو کارساز سمجھ کر ان سے امداد لے کر جادو کرتا ہے وہ بھی کافر ہوتا ہے، بغیر توبہ کے ہی مرجاتا ہے، اس کی موت بھی کفر پر آتی ہے۔

(۸) ”خناق“ جو لوگوں کا گلہ کھونٹ کر ان کو مارتا رہے، اگر یہ کام جائز سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہے، اگر اس کو جائز نہ سمجھے تو ”والخناق غیر کافر و انما یقتل لسعیہ بالفساد“ ”خناق کافر نہیں لیکن وہ فساد پھیلا رہا ہے“ اس لئے اسے قتل کر دیا جائے، اس طرح وہ بھی توبہ کی توفیق حاصل ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جائے گا۔

(۹) ”کاهن“ یہ وہ شخص ہے جو دعویٰ کرے کہ میں غیبی خبریں جانتا ہوں ستاروں وغیرہ کے حساب سے، یہ شخص بھی بغیر توبہ کے مرجاتا ہے۔



(۱۰) ”منافق“ جو بظاہر مسلمان ہو، اندرونی طور پر کافر ہو، کافروں سے اس کی ساز باز ہو، مسلمان کو نقصان پہنچا رہا ہو، ایسا شخص بھی بغیر توبہ کے کفر پر مرتا ہے، اسلئے اس کی توبہ قبول نہیں۔

(۱۱) بعض ضروریات دین کا باطنی طور پر انکار کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوتی کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی توفیق حاصل ہونے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ (ماخوذ از شامی بوضاحت)

**تنبیہ:** ان تمام صورتوں میں توبہ کے نہ قبول کئے جانے کا ایک ہی مطلب ہے کہ ان لوگوں کو توبہ کرنے کی توفیق ہی حاصل نہیں ہوتی، یوں ہی توبہ کے بغیر یہ مردود مرجاتے ہیں۔

کچھ اور لوگ جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی:

لیکن یہ لوگ اکثر طور پر توبہ سے محروم رہتے ہیں، لیکن بعض کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطاء فرما دیتا ہے اور ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اسی طرح جن لوگوں کا پہلے ذکر کیا، ان میں سے بھی کئی لوگوں کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے، ان کی توبہ کو قبول کر لیا جاتا ہے۔

”فكان المناسب ذكر قطاع الطريق وكذا اهل الاهواء وكذا كل من وجب عليه حد زنا او سرقة او قذف او شرب“ (شامی)

مناسب یہی ہے کہ جن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی ان میں ان کو بھی شامل کیا جائے ”ڈاکو اور خواہشات نفسانیہ کی وجہ سے دین کی پرواہ نہ کرنے والے اور جن پر حد زنا یا حد سرقة یا حد قذف ثابت ہو جائے“

لیکن ان کے ساتھ یہ قید لگانی ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر توبہ سے محروم رہ جاتے ہیں، ورنہ بعض کو توبہ کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے، جیسا کہ حضرت ماعز اسلمی ؓ کی توبہ کی قبولیت کا ذکر خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ان شاء اللہ تفصیلی بیان سورۃ نور میں آئے گا۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ ”وہی (کامل) بھٹکے ہوئے ہیں“

”راقم نے اپنے ترجمہ میں بریکٹ میں لفظ ”کامل“ ذکر کیا ہے، اس کی وجہ علامہ رازی رحمہ اللہ کے سوال و جواب میں دیکھئے۔

**سوال:** ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ بنفی کون غیر ہم ضالا وليس الامر كذلك

فان كل كافر فهو ضال سواء كفر بعد الايمان او كان كافرا الى الاصل“



یہاں جن کفار کا ذکر ہو رہا ہے وہ مرتدین ہیں جن کا ذکر گذشتہ چند آیات میں آ رہا ہے۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ میں مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہیں اور درمیان میں ”ہم“ ضمیر حصر کیلئے ہے، اس کا معنی تو یہ ہوگا، ”کہ صرف وہی لوگ بھٹکے ہوئے ہیں“ صرف ان پر اس حکم کو بند کرنا کیسے صحیح ہے جبکہ تمام کفار ہی بھٹکے ہوئے ہیں۔

**جواب:**

والجواب هذا محمول على انهم هم الضالون على سبيل الكمال

آیہ کریمہ میں جن مرتدین کا ذکر ہے، وہ کامل بھٹکے ہوئے ہیں، اب مطلب واضح ہو گیا کہ تمام کفار ہی بھٹکے ہوئے ہیں لیکن جن مرتدین کا ذکر کیا جا رہا ہے ”وہی تو کامل بھٹکے ہوئے ہیں“

**سوال:**

جن کفار کا ذکر ہو رہا ہے وہ تو کفر میں گھرے ہوئے ہیں، ہر طرف سے کفران پر چھایا ہوا ہے، ان کو ”ضال“ کہنے کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ اعلیٰ کا حکم گھٹیا پر ہوتا ہے نہ کہ گھٹیا کا اعلیٰ پر، ضلالت کا درجہ ہے کفر سے، تو کافر کو ضال کہنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، ہاں البتہ ضال کو کافر کہا جائے تو فائدہ حاصل ہوگا۔

**جواب:**

یہاں ضالون سے مراد کاملون فی الضلالت ہیں وہ عام کافروں سے اوپر درجہ رکھتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

بیان کردہ مضمون کی روایات سے تائید:

❁ اخرج البزار عن ابن عباس ان قوماً اسلموا ثم ارتدوا ثم اسلموا ثم ارتدوا فاسلوا الى قومهم يسألون لهم فذكروا ذلك لرسول الله ﷺ فنزلت هذه الآية

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ اِزْدَادُوا كُفْرًا﴾ هذا خطأ من البزار (در منشور)

بزار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو نقل کیا ہے کہ ایک قوم نے اسلام قبول کیا، پھر وہ مرتد ہو گئے، پھر اسلام قبول کر لیا، پھر مرتد ہو گئے، تو انہوں نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ ہمارے متعلق سوال کرو ان کی قوم نے رسول اللہ سے سوال کیا تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ اِزْدَادُوا كُفْرًا﴾

اگرچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو شان نزول کی وجہ بیان کرنے میں بزار کی خطاء قرار دیا ہے، لیکن خطاء اسی وقت ہو سکتی ہے جب حد مقرر کر دی جائے کہ دو مرتبہ مرتد ہونے کے بعد تیسری مرتبہ توبہ کی جائے تو وہ توبہ قبول نہیں لیکن جب روایت سے مراد بار بار اسلام لانا اور مرتد ہونا لیا جائے تو ان کی توبہ کا نہ قبول کیا جانا اسلام کو کھیل تماشہ سمجھ کر بہت واضح سمجھ آتا ہے، کبیر کا حوالہ گذشتہ ادراک میں دیکھئے۔



واخرج ابن جریر عن الحسن فی الآیة قال اليهود والنصارى لن تقبل توبتهم عند الموت“ (درمنشور)

ابن جریر نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے اس آیہ کریمہ کے متعلق روایت ذکر کی، وہ فرماتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ میں یہود و نصاری کا ذکر ہے کہ ان کا موت کے وقت توبہ کرنا قابل قبول نہیں ہوگا۔

واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن ابی حاتم عن قتادة فی الآیة قال هم اليهود کفروا بالانجيل وعيسى لم ازدادوا کفرا بمحمد ﷺ والقرآن“ (دو منشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم سے حضرت قتادہ سے اس آیہ کریمہ کے متعلق بیان کیا کہ وہ لوگ جن کا ذکر اس آیہ کریمہ میں ہے وہ یہود ہیں جنہوں نے انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا، اور پھر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن پاک سے کفر کر کے اور کفر میں بڑھے۔

واخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی العالیة فی الآیة قال انها نزلت فی اليهود والنصارى کفروا بعد ایمانهم لم ازدادوا کفرا بذنوب اذنبوا ثم ذهبوا بتوبون من تلك الذنوب فی کفرهم ولو كانوا علی الهدی قبلت توبتهم ولكنهم علی ضلالة“ (درمنشور)

ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم اس آیہ کریمہ کے متعلق ابن عالیہ کی روایت ذکر کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ بیشک یہ آیہ کریمہ یہود و نصاری کے متعلق نازل ہوئی کہ انہوں نے ایمان کے بعد (نبی کریم ﷺ سے) کفر کیا، پھر وہ گناہوں پر گناہ کرتے چلے گئے یہاں تک کہ کفر میں بڑھتے چلے گئے، پھر انہوں نے صرف گناہوں یعنی کفریات کی زیادتی سے توبہ کرنی شروع کی لیکن اصل کفر سے توبہ نہ کی، اسی وجہ سے ان کی توبہ قبول نہیں کی گئی کہ وہ گمراہی میں جوں کے توں رہے، اگر وہ ہدایت پر آنے کی کوشش کرتے تو یقیناً ان کی توبہ قبول کی جاتی۔

واخرج عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی العالیة فی قوله لن تقبل توبتهم قال تابوا من الذنوب ولم يتوبوا من الاصل“ (درمنشور)

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابو عالیہ سے روایت کی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زیادتی کفر کے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے، لیکن اصل کفر سے توبہ نہیں کر رہے تھے اسی وجہ سے ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔

واخرج عبد بن حمید وابن جریر عن مجاهد فی قوله ”لم ازدادوا کفرا“ قال تموا علی کفرهم“ (درمنشور)



عبد بن حمید اور ابن جریر نے صحابہ سے روایت ذکر کی کہ ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ ”پھر وہ کفر میں بڑھے“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامل طور پر کافر رہے، کفران پر چھایا رہا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اس آیت کریمہ میں ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ میں ”فاء“ نہیں، اور آنے والی آیت کریمہ میں ”فاء“ مذکور ہے ”فَلَنْ يُقْبَلَ“ اس میں وجہ فرق کیا ہے؟

ولم تدخل الفاء في ”لن يقبل“ هنا ودخلت في ”فلن يقبل“ لان الفاء مؤذنة بالاستحقاق بالوصف السابق وهناك قال ”وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ“ وهناك يصرح بهذا القيد

تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ”فاء“ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ”فاء“ کے بعد والا حکم ماقبل وصف پر مرتب ہے ”فَلَنْ يُقْبَلَ“ سے پہلے واضح طور پر ”وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ“ ذکر کر دیا گیا، کہ ان کی موت جب کفر پر آئے گی تو ان سے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، (تفصیل انشاء اللہ، قریب ہی آرہی ہے) لیکن اس آیت کریمہ میں کفر کی حالت میں موت کا تذکرہ نہیں، لہذا ”فاء“ کو ذکر نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ توبہ کے قبول نہ کرنے کی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(ماخوذ از البحر المحیط)



إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوْ افْتَدَى بِهِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَالَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ○ (آیہ نمبر ۹۱)

(۱) وہ جو کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ان میں کسی سے زمین بھر سونا ہر گز قبول نہیں جائے گا، اگرچہ اپنی خلاصی کو دے ان کیلئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار نہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے، تو ہر گز نہیں قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی ایک کا زمین بھر سونا، اگرچہ وہ فدیہ دیں اس کا (جان چھڑانے کیلئے) ان کیلئے عذاب ہوگا دردناک، اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔ (نجوم الفرقان)

**اعتراض:** قیامت کے دن تو کسی کے پاس مال ہی ہونا، تو ان کا فدیہ دینا اور اسے قبول نہ کیا جانا، کا کیا



مطلب ہے۔ جبکہ ”انہم فی ذلک الیوم افلس من ابن المذلق“ قیامت کے دن ہر شخص مذلق سے بھی زیادہ غریب ہوگا۔

**پہلا جواب:** یہ کلام تقدیر و فرض پر مبنی ہے، معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہے۔

”لو ان الکافر یوم القیامة قدر علی اعز الاشیاء ثم قدر علی بذله فی غایة الکثرة نعجز ان یتوصل بذلک الی تخلص نفسه من عذاب اللہ“

کہ اگر کافر قیامت کے دن زمین بھر سونا دینے پر قادر ہو جائے، پھر وہ کثیر مال خرچ کرنے پر قادر ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے آپ کو چھڑانے سے عاجز آ جائے گا۔

”وبالجملة فالمقصود انہم آیسون من تخلص النفس من العقاب“

حاصل کلام یہ ہے کہ مقصد بیان یہ ہے کہ کفر کی حالت پر مرنے والے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑانے سے ناامید ہو جائیں گے۔ (روح المعانی، وکبیر)

اس جواب پر ایک حدیث بطور تائید دیکھئے۔

عن انس ان النبی ﷺ قال ”بحاسب الکافر یوم القیامة، فیقال له ارایت لو کان لک ملء الارض ذہبا کنت تفتدی بہ؟ فیقول نعم، فیقال له، قد کنت سئلت ایسر من ذلک“ (قد اخذت علیک فی ظہر ایبک آدم ان لا تشرک بی شیاً فابیت الا ان تشرک)

(بخاری، صابونی) صحیح اخرجہ البخاری (۳۳۳۳) ومسلم (۲۸۰۵) واحمد (۱۶۹، ۱۲۷، ۳) وابو یعلیٰ (۴۱۸۶) وابن عاصم فی السنة (۹۹) وابو نعیم فی الحلیہ (۳۱۵، ۲) (البحر المحیط مع حاشیہ) (وصابونی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن کافر سے حساب لیا جائے گا اور اسے کہا جائے گا تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو تو فدیہ دے کر اپنی جان چھوڑا لیتا؟ تو وہ کہے ہاں (میرے رب میں فدیہ دے دیتا) رب تعالیٰ فرمائے گا، میں نے تو تجھ سے اس سے بہت آسان مطالبہ کیا تھا کہ تو نے ایمان لانا اور میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرانا، لیکن تم نے میرے ساتھ شریک ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔

وقال الامام احمد عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ ویؤتی بالرجل من اهل الجنة فیقول له یا ابن آدم کیف وجدت منزلک فیقول ای رب خیر منزل فیقول سل وتمن فیقول ما اسأل ولا تمنی الا تردنی الی الدنیا فاقتل فی سبیلک عشر مرار لما یری من فضل الشهادة ویؤتی بالرجل من اهل النار فیقول له یا ابن آدم کیف وجدت منزلک فیقول یا رب شر منزل فیقول له افتدی منی بطلاع الارض



ذهب؟ فيقول اى رب نعم، فيقول كذبت قد سألتك اقل من ذلك وايسر فلم تفعل  
فيرد الى النار“ (منقول از صابونی)

مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی گئی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت والے ایک شخص کو (رب تعالیٰ کے حضور) لایا جائے گا، اسے رب تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم تو نے اپنا مرتبہ کیسے پایا؟ وہ عرض کرے اے میرے رب بہتر مقام پایا، رب تعالیٰ فرمائے گا ”سؤال کر، اور تمنا کر“ وہ کہے گا میں اور تو کچھ سؤال نہیں کرتا اور تو کچھ تمنا نہیں کرتا مگر یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے دنیا میں لوٹا دے، تاکہ مجھے تیری راہ میں دس مرتبہ شہید کر دیا جائے (یہ اس کی تمنا اس لئے ہوگی کہ) وہ شہادت کی فضیلت دیکھ رہا ہوگا، اور ایک جہنمی شخص کو لایا جائے گا، رب تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے اپنا مقام کیسے پایا؟ وہ کہے گا اے میرے رب بہت برا مقام پایا، رب تعالیٰ فرمائے گا (اگر تیرے پاس زمین بھر سونا ہوتا) کیا تو وہ زمین کے ٹیلوں برابر سونا بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھوڑ لیتا؟ وہ کہے گا ہاں میرے رب، رب تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، میں نے تجھ سے اس سے کم اور آسان سؤال کیا تھا (کہ تو ایمان لے آ اور شرک نہ کر) تو نے وہ نہیں کیا، تو اسے آگ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

**دوسرا جواب:** انهم اذا ماتوا على الكفر فلو انهم كانوا قد انفقوا في الدنيا ملء

الارض ذهباً لن يقبل الله تعالى ذلك منهم لان الطاعة مع الكفر لا تكون مقبولة“

ان سے فدیہ نہ قبول کئے جانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب کافر اپنے کفر پر مرجائیں گے تو قیامت کے دن جب وہ رب تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے تو یہ کہیں گے ہم نے تو دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ ان کے دنیا میں زمین بھر سونا خرچ کرنے کو قبول نہیں کرے گا، کیونکہ کفر کی حالت میں کی گئی نیکیاں قبول نہیں۔ (کبیر)

کاش کہ یہود و نصاریٰ سے پیسے لے کر رفاہ عامہ کا کام کرنے والے نام نہاد مسلمانوں کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ کافروں کی کوئی نیکی معتبر نہیں، یہ بہت بڑی حماقت ہے کہ کافروں کو مسلمانوں کا ہمدرد سمجھا جائے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”اور ان کیلئے عذاب ہوگا دردناک۔“

رب تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمادیا کہ کفار اپنی دنیاوی نیکیوں کی وجہ سے، اور آخرت میں ان کے پاس زمین بھر سونا ہوتا تو فدیہ دے کر رب تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے۔ ”اردفہ بصفة ذلك العذاب فقال ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ اى مؤلم“ تو اس کے پیچھے اس عذاب کی صفت بیان کی تو ارشاد فرمایا ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”الیم“ فعیل کا وزن ہے جو فاعل کا معنی دے رہا ہے، اور ساتھ ساتھ دوام بھی پایا



گیا ہے، یعنی ان کو دائمی طور پر درد پہنچانے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ﴾ ”اور نہیں ہوگا ان کا کوئی مددگار۔“

جب یہ بیان فرما دیا کہ کافروں کی عذاب الیم سے فدیہ دے کر نجات نہیں ہوگی اور دنیا میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے بھی نجات حاصل نہیں ہونی، تو اب ساتھ ہی یہ بیان فرما دیا ”انہ لا خلاص لہم عنہ بسبب النصرہ والاعانة والشفاعة“ کہ بیشک کافروں کی نجات دردناک عذاب سے کسی مددگار، کسی معاون اور کسی شفاعت کرنے والوں سے بھی نہیں ہوگی۔ (کبیر)





## پارہ چہارم

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ



لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (آیہ نمبر ۹۲)

(۱) تم ہرگز بھلائی کو نہیں پہنچو گے جب تک راہ خدا میں اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ خرچ

کرو اللہ کو معلوم ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) تم ہرگز نہیں پاؤ گے (کامل) بھلائی کو یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو،

اور جو چیز تم خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے جاننے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیت کریمہ میں بیان فرمایا کہ کافر جو مال دنیا میں خرچ کریں خواہ وہ بطور صدقہ خرچ کریں، یا بطور صلہ رحمی، ان کا خرچ کرنا رب تعالیٰ کے حضور قبول نہیں ہوگا، کیونکہ ان کا ایمان نہیں، اسی طرح بالفرض آخرت میں اگر ان کو مال مل جائے اور وہ زمین بھر سونا خرچ کر دیں تو ان کا سونا قبول نہیں کیا جائے گا، اس آیت کریمہ میں مومنوں کو خرچ کرنے کی کیفیت بتائی جا رہی ہے کہ انہیں آخرت میں اس سے زیادہ نفع حاصل ہوگا۔ (کبیر)

(تفصیل انشاء اللہ ساتھ ہی آرہی ہے)

### مختصر مطلب:

تم ہرگز نہیں پاؤ گے (کامل) بھلائی کو یہاں تک کہ تم اس چیز کو خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو، قرآن پاک میں کیا خوب فصاحت ہے، کتنا مختصر جملہ لیکن عظیم مطالب کو حاوی ہے، یعنی کامل بھلائی کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکو گے جب تک تم اللہ کی راہ میں اپنی پیاری چیز خرچ نہیں کرو گے۔

**وہ پیاری چیز:** انسان کا مال ہے، انسان اپنے مال سے محبت کرتا ہے، کسی مال کو اپنے لئے زیادہ نفع مند ہونے کی وجہ زیادہ پسند کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہی پسندیدہ مال خرچ کرے گا تو کامل بھلائی حاصل کر لے گا۔

**وہ پیاری چیز:** اپنی اولاد بھی ہے، مومنین کو گویا کہ یوں بھی بتا دیا گیا ہے کہ تم کامل بھلائی اس وقت تک حاصل نہیں کر سکو گے جب تک اللہ کی راہ میں یعنی جہاد میں بوقت ضرورت تم اپنی اولاد و قربان نہیں کرو گے، ہاں اگر تم نے اللہ کی راہ میں جہاد ”فی سبیل اللہ“ میں اپنی پیاری چیز یعنی اولاد کو خرچ کر دیا تو تم نے کامل بھلائی حاصل کر لی۔



**وہ پیاری چیز:** اپنا جاہ و جلال بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اگر اپنا جاہ و جلال قربان کرنا پڑے تو وہ نہ قربان کرے تو کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکے گا، کامل بھلائی اسی وقت حاصل ہوگی بوقت ضرورت اپنے جاہ و جلال کو قربان کر دے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچانے میں لوگ اسے بھٹکا رہا اور گمراہ کہیں تو بظاہر اس کا جاہ و جلال ضائع ہو رہا ہے، لیکن پیاری چیز ”جاہ و جلال“ اللہ کی راہ میں قربان کر دے اور یہ سمجھے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی یوں کہا گیا۔

﴿قَالَ الْمَلَأِينَ قَوْمِهِ إِنَّكَ لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (الاعراف آیہ نمبر ۶۰)  
 ”اس کی قوم کے سردار بولے بیشک ہم تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھتے“

آپ نے یوں جواب دیا ﴿قَالَ يَاقَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف آیہ نمبر ۶۱)  
 ”کہا اے میری قوم مجھ میں گمراہی کچھ نہیں، میں تو رب العالمین کا رسول ہوں۔“

اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! تجھے بھی کوئی گمراہ کہے تو تو اپنے جاہ و جلال کو خیال میں نہ لا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا جاری رکھ، ہاں یہود و نصاریٰ اور ان کے حواریں کو صرف یوں کہہ دے میں گمراہ نہیں، میں تو نائب رسول ہوں، تبلیغ دین کو جاری رکھوں گا“ جب لوگ تجھے بے وقوف اور جھوٹا کہیں، تو تجھے یہ یاد ہونا چاہیے کہ حضرت ہود علیہ السلام کو بھی یوں کہا گیا ﴿إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكََاذِبِينَ﴾ ”بیشک ہم تمہیں بے وقوف سمجھتے ہیں، اور بیشک ہم تمہیں جھوٹوں میں گمان کرتے ہیں۔“ (الاعراف آیہ نمبر ۶۵)  
 آپ نے قوم کو یوں جواب دیا ﴿قَالَ يَاقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف آیہ نمبر ۶۶)  
 ”کہا اے میری قوم میں بے وقوف نہیں، میں تو پروردگار عالم کا رسول ہوں۔“

ہاں تو بھی اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! اپنے ظاہری جاہ و جلال کو اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہوئے یوں کہہ میں بے وقوف نہیں، میں جھوٹا نہیں، میں تو نائب رسول ہوتے ہوئے ”اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشاد لوگوں تک پہنچا رہا ہوں۔ ہاں اگر تجھے دیوانہ پاگل کہیں تو تو یہ نہ بھول کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پاگل اور دیوانہ کہا گیا ﴿وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ﴾ (الدخان آیہ نمبر ۱۴) ”اور بولے سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔“

قربان جاؤں رحمة اللعالمین پر، رب تعالیٰ نے آپ کی طرف سے یوں جواب دیا ﴿مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ ”تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔“ ہاں اے مؤمن! اے عالم دین! اے طالب دین! تو



بھی یہ کہہ دے کہ میں پاگل، دیوانہ نہیں، مجھے تو انبیاء کرام کا وارث ہونے کی وجہ سے یہ القاب مل رہے ہیں، لیکن میں اپنی پیاری چیز اپنے ”جاہ و جلال“ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر رہا ہوں تاکہ مجھے کامل بھلائی حاصل ہو جائے۔

وہ پیاری چیز تیری جان بھی:

اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کی ضرورت درپیش آئے تو تو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے بغیر کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ غرضیکہ انسان کے والدین، اقرباء، زوجہ، مکانات، زمین، باغات وغیرہ سب پیاری چیزیں ہیں، بوقت ضرورت ان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ”تم ہرگز نہ پاسکو گے (کامل) بھلائی۔“

”نال“ من نال نیلا اذا اصاب ووجد“ ويقال نال العلم اذا وصل اليه والتصف به“

نال، نال، نیلا، کا معنی ہوتا ہے کسی چیز تک پہنچنا، کسی چیز کو ”پالینا“ جیسا کہ کہا جاتا ہے ”نال العلم“ اس نے علم کو پالیا، وہ علم تک پہنچ گیا، وہ علم سے متصف ہو گیا۔ ”البر“ کے مختلف معانی ہیں ”البر“ الاحسان و کمال الخیر ”البر“ کا معنی احسان ”یعنی ہرگز تم احسان کو نہیں پاسکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو“ ”البر“ کا معنی کامل بھلائی ”اب معنی یہ ہوگا ”ہرگز نہیں پاؤ گے کامل بھلائی یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو“

بھلائی کے ساتھ ”کامل“ کی قید کا فائدہ:

اصل میں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ فقیر جسے ساری عمر مال نہ ملے اور وہ اپنا محبوب مال خرچ نہ کر سکے تو وہ بھلائی سے محروم رہے، یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ رب تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمایا ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ ”جو شخص ذرہ بھر نیکی کا عمل کرے وہ اسے پالے گا“ تو اس سے پتہ چلا کہ تھوڑا مال اور حقیر مال بھی خرچ کرنے کا فائدہ ہوگا، اور بھلائی کو پالے گا، تو پسندیدہ مال کے خرچ نہ کرنے سے بھلائی کی نفی کیسے درست ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ”الکامل“ کہ ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ وہ چیز خرچ کرو جو تمہیں پسند ہو، اگرچہ اس پر پھر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی درست نظر آتا کیونکہ اس معنی کے لحاظ پر لازم یہ آئے گا کہ فقیر ہمیشہ کیلئے کامل بھلائی سے محروم رہے، یہ کس طرح درست ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ”وقبل الاولى من هذا ان يقال ان المراد ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ على الاتفاق“ کہ یہ خرچ کرنے سے مقید ہے،



اب کھل مطلب یہ ہے کیا ”ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے خرچ کرنے میں یہاں تک کہ اس چیز سے خرچ کرو جو تمہیں پسند ہو“ یعنی تم تھوڑا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور جو مال تم خرچ کرو وہ تمہارا پسندیدہ نہ ہو تو پھر بھی تمہیں اس کا ثواب ملے گا، لیکن کامل بھلائی اگر تم اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے حاصل کرنی چاہتے ہو تو اپنا پسندیدہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (ماخوذ از روح المعانی)

راقم کا اس مسئلہ میں موقف یہ ہے کہ ﴿حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ میں مال خرچ کرنے کی قید ہی نہیں۔ اس لئے ہر شخص جس چیز کا مالک ہے اس میں سے پسند چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو کامل بھلائی پالے گا۔ فقیر اپنی آسائش کا وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرے، اپنی پسند قربان کر کے اللہ کو یاد کرے، اپنا آرام قربان کر کے اللہ کو یاد کرے لوگوں کی جھڑکیاں برداشت کر کے اپنا وقار قربان کر کے اللہ کو یاد کرے، اس کا یہی پسندیدہ چیز خرچ کرنا ہے۔

”البر“ یعنی الجنة ”البر“ کا معنی ابن عباس اور ابن مسعود اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے ”جنت“ بیان کیا ہے، وقال مقاتل بن حیان ”التقوی“ مقاتل بن حیان نے ”البر“ کا معنی تقوی بیان کیا ہے۔ ”وقیل الطاعة وقیل الخیر“ اور بعض حضرات نے کہا کہ ”البر“ کا معنی طاعت ہے، بعض نے کہا اس کا معنی خیر ہے

”وقال الحسن لن تكونوا ابرارا“ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہرگز نیک نہیں بن سکو گے یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو، لہذا سچ بولے، جھوٹ سے بچ جائے تو انسان نیکی پالیتا ہے، ابرار کی جماعت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اخبرنا احمد بن عبد اللہ النعمی انا ابو بکر احمد بن الحسن الحیری انا حاجب بن احمد الطوسی اخبرنا محمد بن حماد الصالحی قال اخبرنا ابو معاویہ عن الاعمش عن شفیق عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ ﷺ علیکم بالصدق، فان الصدق یهدی الی البر، وان البر یهدی الی الجنة، وما یزال الرجل یصدق ویتحری الصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقاً وایاکم والکذب فان الکذب یهدی الی الفجور، والفجور یهدی الی النار وما یزال الرجل یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عند اللہ کذاباً“

(معالم التنزیل للبغوی) (رواہ البخاری و مسلم)

حضرت عبد اللہ (بن مسعود) فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ سچ بولو، بیشک سچ بولنا ہدایت دیتا ہے نیکی کی، اور بیشک نیکی ہدایت دیتی ہے جنت کی، اور جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے ”صدیق“ لکھ لیا جاتا ہے۔ اور تم اپنے آپ کو جھوٹ سے بچا کر رکھو بیشک جھوٹ فجور کی



رہنمائی کرتا ہے، اور فجور آگ کی راہنمائی کرتا ہے، اور ہمیشہ ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

”وقال الحسن كل انفاق يتغى به المسلم وجه الله حتى الثمرة ينال به هذا البر“  
حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلمان جب خلوص سے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے مال خرچ کرتا ہے، تو جو کچھ بھی خرچ کرے یہاں تک کہ ایک پھل (ایک کھجور) بھی خرچ کرنے سے وہ کامل بھلائی حاصل کر لیتا ہے، کیونکہ خلوص سے خرچ کیا ہوا مال اس کا پسندیدہ مال ہے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

❀ وقال عطاء ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ای شرف الدین والتقویٰ حتی تصدقوا وانتم اصحاء اشحاء  
عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ ہرگز تم دین کی شرافت اور تقویٰ حاصل نہیں کر سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو) جب کہ تم صحیح ہو اور مال پر حریص ہو، (یعنی ایسے حال میں جبکہ انسان خود بھی مال کا محتاج ہو تو وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا تو وہ اپنا پسندیدہ مال خرچ کرے گا۔)  
(معالم التنزیل للبغوی)

(عطاء رحمہ اللہ کے اس قول میں ”البر“ کا معنی ”دین کی شرافت اور تقویٰ لیا گیا“)

❀ عن النّوأس بن سمعان قال سألت رسول الله عن البر والالتم فقال البر حسن الخلق والالتم ما حاك في صدرک وكرهت ان يطلع عليه الناس منك (رواه مسلم)  
حضرت نوأس بن سمعان ؓ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا ”بر“ (نیکی) یہ ہے کہ تم اچھی عادات رکھو، اور گناہ یہ ہے کہ وہ تمہارے سینہ میں کھٹکے (یعنی تمہیں گناہ کرنے کا خیال آئے) تو تم ناپسند سمجھو کہ لوگ تم پر مطلع ہو جائیں۔

”فعلى هذا يكون المعنى عليكم بالاعمال الصالحة حتى تكونوا ابراراً وتدخلوا في زمرة الابرار“  
حدیث مذکور سے ”البر“ کا معنی جو واضح کیا گیا، اس سے آیہ کریمہ کا مطلب یوں بھی بیان کیا جاسکے گا، ”ہرگز تم نیک نہیں بن سکو گے یہاں تک کہ تم نیک عمل کرو“ جب تم نیک عمل کرو گے تو ابرار بن جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ کے کامل تقرب کے حقدار (کامل ابرار) کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گے۔ (منقول از خازن)

❀ عن ابی هريرة قال اتی رسول الله ﷺ رجل فقال یا رسول الله ای الصدقة افضل؟ قال ان تصدق واقت صحيح شحيح تخشى الفقر وتأمل الغنى“ (رواه البخاری ومسلم)  
حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا یا رسول اللہ کون سا



صدقہ افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تم صدقہ کرو جو تم صحیح ہو اور اپنے مال پر نبیل و حریص ہو، تمہیں فقر کا ڈر ہو اور غنا کی امید ہو۔  
(منقول از خازن)

بعض حضرات نے ”البر“ اور ”الخیر“ میں فرق بیان کیا ہے:

البر هو النفع الواصل الى الغير مع القصد الى ذلك والخير هو النفع مطلقا وان وقع سهوا وضد البر العقوق وضد الخير الشر

”البر“ اس نفع کو کہتے ہیں جو غیر تک اپنے ارادہ سے پہنچائے، لیکن ”الخیر“ مطلقا نفع کو کہا جاتا ہے، غیر کو وہ نفع تو پہنچ جائے لیکن خواہ بھول کر اسے کوئی چیز دے دی، دینی اور کوٹھی، تو اسے ”الخیر“ کہہ لیا جائے گا، لیکن ”البر“ نہیں کہا جائے گا ”البر“ کی ضد ”العقوق“ ہے، اور ”الخیر“ کی ضد ”الشر“ ہے۔ (روح المعانی)

### بیان ذیشان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ میں بیان فرمایا ”ان من انفق مما احب كان من جملة الابرار“ جو شخص اپنی پیاری چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ ابرار (نیک لوگوں) سے ہو جاتا ہے۔ ”ابرار“ کی شان دوسری آیات میں یوں بیان فرمائی۔ ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾ ”بیشک نیک لوگ چین (نعمتوں) میں ہوں گے۔“

اس کے مقابل یہ ارشاد فرمایا ﴿وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ﴾ (اور بے شک بدکار ضرور دوزخ میں ہیں) اور ارشاد فرمایا ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا﴾ (سورۃ الدھر، آیت نمبر ۵) ”بیشک نیک، چین گے اس جام میں سے جسکی طوئی کافور ہے“ اور ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكَ ۝ فِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾  
(المطففين)

بیشک نیکو کار ضرور چین میں ہیں، تختوں پر دیکھتے ہیں، تو ان کے چہرے میں چین کی تازگی پہچانے، نہری (خالص) شراب پلائے جائیں گے جو مہر کی ہوئی رکھی ہے، اس کی مہر مشک (خوشبو) پر ہے، اور اسی پر چاہئے کہ لپچائیں لپچانے والے۔



﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ  
وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ  
وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ  
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (سورة البقرة، آية نمبر ۱۷۷)

”کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو، ہاں اصل نیکی یہ ہے ایمان لائے اللہ اور  
قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر، اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور  
قییموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سالکوں کو اور گردنیں چھوڑانے میں اور نماز قائم رکھے، اور زکوٰۃ دے،  
اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں  
جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔“

ان تمام آیات میں ابرار (نیک لوگوں) کے اجر و ثواب کو ذکر کیا، اور آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ  
تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ میں کمال بر (یعنی کامل بھلائی) کا ذکر فرمایا۔

نتیجہ یوں واضح ہوا، کہ جب تم اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کرو گے تو تم نیک ہو جاؤ گے، جب تم  
ابرار کی جماعت میں آ جاؤ گے تو تم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے چین اور نعمتوں میں ہو گے، اور تمہیں  
قیامت کے دن وہ پاکیزہ مشروب پلائے جائے گا جس میں کافور ملی ہوگی، اور ان کو تختوں پر بٹھایا جائے گا کہ وہ جنت  
کے نظارے کر رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر چین کی تازگی نظر آرہی ہوگی، خالص پاکیزہ مشروب جس پر مہر لگی  
ہوگی وہ ان کو پلائی جائے گی، اس کی مہر خوشبو پر ہوگی، وہ ایسے لذت والے مشروب ہوں گے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے  
لپچانے والے لپچارہ ہوں گے۔ خاص کر کے ”لیس البر“ آیت کریمہ میں بہت سے اعمال کو نیکی کے کام قرار دیا گیا  
ہے، لیکن اس زیر بحث آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ سے یہ ثابت کر دیا ”فانکم لا تفوزون  
بفضيلة البر حتى تنفقوا مما تحبون“ کہ بیشک تم نیکی کی فضیلت کو حاصل کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں  
ہو سکتے جب تک تم اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیز نہیں خرچ کرو گے۔

وهذا يدل على ان الانسان اذا انفق ما يحبه كان ذلك الفضل الطاعات



اس سے یہ واضح ہو گیا، کہ انسان کا اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا تمام عبادتوں سے افضل عبادت ہے۔

**اعتراض:** اس تمام بحث سے تو یہ پتہ چلا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں اپنی پسندیدہ چیز خرچ کرتا ہے وہ کامل بھلائی حاصل کر لیتا ہے، وہ ابرار کی جماعت میں آ جاتا ہے، اور جنت میں طرح طرح کی نعمتیں حاصل کرے گا، خواہ اور کوئی عبادت کرے یا نہ کرے، یہ کس طرح صحیح ہے کہ فرائض کا تارک صرف اپنی پسندیدہ چیز کو خرچ کر کے کامل بھلائی حاصل کر لے اور جنت کی نعمتوں کا مستحق ہو جائے۔

**جواب:** انسان اپنی پسندیدہ چیز کو اس وقت تک خرچ نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ پتہ نہ ہو کہ وہ اس کے بدلے اعلیٰ چیز حاصل کرے گا۔ انسان دنیا کی چیز میں اسی وقت خرچ کرے گا جب اسے یہ یقین ہوگا کہ اس کے ذریعے آخرت کی سعادت حاصل ہوگی، اور آخرت کی سعادت کا اسی وقت اعتراف کرے جب وہ اللہ تعالیٰ جو صانع، عالم، قادر ہے اس کے وجود کا اقرار کر لے گا۔ جب وہ رب تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر لے گا تو وہ خود بخود اپنے آپ کو مکلف سمجھے گا کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کروں، اور مجھ پر واجب ہے کہ میں نواہی سے اجتناب کروں۔

فاذا تأملت عملت ان الانسان لا يمكنه الفاق الدنيا الا اذا كان مستجمعاً لجميع الخصال المحمودة في الدين

ابھی ہم نے جو بیان کیا اگر تو اس میں غور و فکر کرے تو تجھے پتہ چل جائے گا کہ بیشک انسان دنیا کا مال دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس وقت خرچ ہی نہیں کر سکتا جب تک دین کے تمام فرائض اور مستحبات پر عمل نہیں کرے گا، اور نواہی سے نہیں بچے گا۔ دنیا داری، دکھلاوہ، چرچا، نام روشن کرنا خرچ کرنے میں مقصود ہو تو وہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بنتا ہی نہیں بلکہ وہ وبال جان بن کر رہے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

**مقام توجہ:** جس مال کے خرچ کرنے کی فضیلت بیان کی جا رہی ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ اس میں بظاہر اہل علم کا اختلاف نظر آتا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ اور صدقات واجبہ ہیں، یا اس سے مراد صدقات مستحبہ ہیں، راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ اس سے مراد صدقات واجبہ اور مستحبہ دونوں ہیں، اس لئے کہ جب حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول مراد لیا جائے۔

”وقال الحسن كل شيء انفق المسلم من ماله طلب به وجه الله فانه من الدين عني الله سبحانه بقوله ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ حتى التمرة“  
کہ مسلمان کوئی چیز بھی اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کیلئے خرچ کرے وہ ان کا کامل نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کا تذکرہ رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى



تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ﴿۱﴾ میں ذکر کیا، یہاں تک کہ وہ اپنی محبت سے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے ایک بھور بھی خرچ کرے گا تو وہ بھی یہ مقام حاصل کر لے گا۔

اسی کے ضمن میں راقم کے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ”اراد به الزکوة یعنی حتیٰ تخرجوا زکوة اموالکم“ (اس سے مراد زکوة ہے کہ تم اپنے مالوں کی زکوة ادا کرو) بھی آجاتا ہے۔ اب مطلب یہ گیا کہ (ہرگز تم کامل بھلائی نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو) خواہ وہ چیز تمہاری جانیں ہوں یا اولاد ہو، یا مال ہو، مال ہو تو عام ہے خواہ زکوة ہو، یا صدقہ فطر ہو، یا قربانی ہو، یا صدقات مستحبہ ہوں سب کو یہ آیت کریمہ شامل ہے۔

”وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالْغُیُوبِ“

ابھی تک ذکر کردہ بحث کو بیضاوی میں دیکھئے:

(لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ) ای لن تبلغوا حقيقة البر الذي هو كمال الخير ولن تنالوا ببر الله الذي هو الرحمة والرضى والجنة (حَتَّىٰ تَنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ) ای من المال او ما يعمله وغيره كبدل الجاه في معاونة الناس والبدن في طاعة الله والمهجة في سبيله

(ہرگز تم بھلائی نہیں پاؤ گے) اس سے مراد یہ ہے کہ ہرگز تم اس نیکی کی حقیقت نہیں پاؤ گے جس میں کامل بھلائی ہے۔ یعنی حقیقی بھلائی وہی ہے جس میں کمال پایا جائے، اور اس کا مطلب یہ ہے ”کہ ہرگز تم اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کو نہیں پاؤ گے“ وہ فرمانبرداری جو رحمت ہے، وہی رب کی رضا ہے، وہی حصول جنت کا ذریعہ ہے ﴿حَتَّىٰ تَنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ یہاں تک کہ خرچ کرو اس چیز سے جسے تم پسند کرتے ہو، یہ حکم عام ہے، مال اور غیر مال سب کو شامل ہے، لوگوں کی معاونت کیلئے اپنے مرتبہ (جاہ و جلال) کو خرچ کرنا بھی اسی میں شامل ہے، اور اللہ کی طاعت میں اپنی جان قربان بھی اسی میں داخل ہے، اور اپنے چہرے کے حسن و جمال اور اپنی آب و تاب کو اللہ کی راہ میں قربان کر دینا بھی اس آیت کریمہ میں مذکور ہے۔ (بیضاوی)

کیا ہی شان ہے قرآن پاک کی جس نے ایک جملہ میں بے بہا خزانے اور بے حد سمندر سمودے ہیں۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾

”اور جو چیز تم خرچ کرو، تو بیشک اللہ اسے جاننے والا ہے۔“

یہاں علم کا ذکر فرما کر مراد ثواب کا عطاء کرنا لیا گیا ہے، اب تقدیر عبارت کی معنوی طور پر یہ ہوگی



”وما تنفقوا من شيء فان الله به يجازيكم قل ام كثر لانه عليم به لا يخفى عليه شيء منه“ اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا، خواہ قلیل ہو یا کثیر ہو، اس لئے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

اور اس کا مطلب یہ ہے ”انہ تعالیٰ يعلم الوجه الذى لاجله يفعلونه ويعلم ان الداعى اليه اهل الاخلاص ام الرياء ويعلم انكم تنفقون الاحب الاجود ام الاخص الارذل“  
بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مال خرچ کرنے والے کس وجہ سے خرچ کر رہے ہیں، وہ جانتا ہے کہ ان کو خرچ کرنے برا سمجھتے کرنے والا اخلاص ہے یا ریاء (دکھلاوا) اور وہ جانتا ہے کہ خرچ کیا جانے والا مال عمدہ اور پسندیدہ ہے، یا گھٹیا اور رذیل مال ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)

مطلب تقریباً مختصر یہ ہو گیا جس طرح کا مال، جس نیت سے خرچ کرو گے رب تعالیٰ اسی کے مطابق تمہیں جزاء دے گا کیونکہ وہ سب کچھ جانتا ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔

پسندیدہ مال رب کی راہ میں خرچ کرنے کی درخشاں مثالیں:

✽ اخرج مالك واحمد وعبد بن حميد والبخاري ومسلم والترمذي والنسائي وابن المنذر وابن ابى حاتم عن انس قال قال ابو طلحة اكثر النصارى بالمدينة نخلا وكان احب امواله اليه بيرحاء وكانت مستقبلة المسجد وكان النبي ﷺ يدخلها ويشرب من ماء فيها طيب فلما نزلت (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ) قال ابو طلحة يا رسول الله ﷺ يقول (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ) وان احب اموالى الى بيرحاء وانها صدقة الله ارجو ابرها عند الله فضعها يا رسول الله حيث اراك الله فقال رسول الله ﷺ بئخ ذاك مال رابح ذلك مال رابح وقد سمعت ما قلت والى ارى ان تبت اوافى الاقربين فقال ابو طلحة الفعل يا رسول الله فقسما ابو طلحة فى اقاربه وبني عمه“

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابو طلحہ کی مدینہ طیبہ میں بہت کھجوریں تھیں، ان کا سب سے پسندیدہ مال ایک باغ تھا، جس کا نام ”بیرحاء“ تھا، جو مسجد کی قبلہ کی جانب تھا، نبی کریم ﷺ اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے، اس میں ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے، جب آیہ کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ نازل ہوئی، تو ابو طلحہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ تو بیشک میرا سب سے پسندیدہ مال میرا باغ ”بیرحاء“ ہے، میں وہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے کامل



بھلائی عطاء فرمائے گا، اور میرے لئے اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاں وہ ذخیرہ بنائے گا، اس لئے یا رسول اللہ ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق وہ باغ جسے چاہیں عطاء فرمادیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑی خوشی کا مقام ہے یہ تمہارے لئے، اور یہ مال تمہارے لئے نفع مند ہوگا، (پھر فرمایا) اور یہ مال تمہارے لئے نفع مند ہوگا۔ (ایک روایت کے مطابق آپ نے دو مرتبہ فرمایا ”بخ بخ“ اور تحقیق میں نے سنا جو تم نے کہا ہے، اور بیشک میری رائے یہ ہے کہ تم یہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں پر تقسیم کر دو، ابو طلحہ نے عرض نے کیا یا رسول اللہ ﷺ میں یہی کرتا ہوں (جو آپ نے فرمایا ہے) تو آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں، اپنے چچا کے بیٹوں کو وہ دے دیا۔ (منقول از درمنثور)

ابوداؤد اور نسائی میں یہ بھی آتا ہے ”فقال رسول اللہ ﷺ اجعلها فی قرابتک فجعلها فی حسان بن ثابت وابی بن کعب“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دے دو تو انہوں نے حسان بن ثابت اور ابی بن کعب کو دے دیا (کیونکہ یہ ان کے رشتہ دار تھے) (منقول از درمنثور)

طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”بیروحاء“ اصل میں لفظ ”بئر“ (با، ہمزہ، راء ہیں) البتہ ہمزہ ساکن ماقبل مکسور کی وجہ سے ”یاء“ سے تبدیل کرنا بھی جائز ہے، قانون جوازی ہے اسلئے دونوں طرح استعمال ہو رہا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ ”بئرحاء“ مکمل نام ہے، بئر کی اضافت حاء کی طرف نہیں جیسے بئر ذروان اور بئر بضاعة میں اضافت پائی گئی ہے۔

اکثر محدثین کرام نے تو مد سے ہی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ تاہم زمخشری نے فائق میں اسے قصر سے لکھا ہے ”بیرحی“ بروزن فیعلی، یہ البراج سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ”مکشف ظاہر زمین“ پھر اس کی حرکات میں ”اختلف الفواظ المحدثین فیہا فیرو و نہا بفتح الیاء و کسرہا معا و بفتح الراء و ضمہا و المد فیہا و القصر“ مختلف اقوال ہیں، ان کی مجموعی صورت جائز ہے، باء پر فتح پڑھیں یا کسرہ (زیر یا زیر) اور راء پر فتح پڑھیں یا ضمہ (زیر یا پیش) اور مد سے پڑھیں یا قصر سے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ”بخ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو مقام مدح اور رضاء میں استعمال ہوتا ہے، حاء کو سکون سے پڑھا گیا ہے، اور کسرہ اور تنوین سے بھی پڑھا گیا ہے۔ (از شیخ زادہ)

اور طلباء کرام یہ بھی توجہ فرمائیں ﴿مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ میں ”مما“ اصل میں ”من ما“ ہے، نون کو میم میں ادغام کیا گیا ہے۔ (منظہری)



واخرج عبد بن حميد والبخاري عن ابن عمر قال حضرتني هذه الآية (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ) فذكرت مما عطاني الله فلم اجد شيئا احب الي من مرجانة جارية لي رومية فقلت هي حرة لوجه الله فلو اني اعود في شيء جعلته لله لنكحتها فانكحتها نالها

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، جب یہ آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ میرے سامنے آئی، تو میں نے یاد کرنا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مال مجھے دے رکھا ہے اس میں سے زیادہ پسندیدہ چیز کیا ہے؟ میں نے ایسی پسندیدہ چیز کوئی اور نہ پائی جیسی میری رومیہ لونڈی مرجانہ تھی، میں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے آزاد ہے، اب میں اس کی طرف نہیں لوٹوں گا، البتہ اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اس کی مرضی سے نکاح کر دوں گا، پھر آپ نے اپنے غلام نافع سے اس لونڈی کی اجازت سے نکاح کر دیا۔ (ازد درمنثور)

واخرج عبد الرزاق وابن جرير من طريق معمر عن ايوب وغيره انها حين نزلت لن تنالوا البر الآية جاء زيد حارثة بفرس له كان يحبها فقال يا رسول الله هذه في سبيل الله فحمل عليها رسول الله ﷺ اسامة بن زيد فكان زيدا ووجد في نفسه فلما راى ذلك منه النبي ﷺ قال امان الله قد قبلها

معمر بن ایوب وغیرہ سے روایت ذکر کی کہ جب یہ آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ ایک گھوڑی لائے جسے وہ بہت پسند کرتے تھے، عرض کیا یا رسول اللہ یہ اللہ کی راہ میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے (وہ گھوڑی ان کے بیٹے کو دے دی) اس گھوڑی پر اسامہ بن زید کو سوار کو دیا، زید نے اپنے نفس میں گویا کہ کچھ محسوس کیا (انہوں نے سمجھا شاید میرا مال اللہ کی راہ میں قبول نہیں کیا گیا) جب نبی کریم ﷺ نے ان کی کیفیت کو دیکھا تو آپ نے فرمایا ”خبردار بیشک اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا ہے“ (منقول از درمنثور)

اس حدیث پاک میں ایک اور مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ اگر صدقہ کرنے والا اپنی وسعت سے زیادہ اپنے نیک جذبات سے خرچ کر دے تو صدقہ وصول کرنے والے اس سے وصول کر کے، اس کے بیٹے وغیرہ پر وہی چیز یا اس کی چیز جیسی کوئی چیز صدقہ کر دیں، تاکہ اسے صدقہ کا ثواب بھی حاصل ہو جائے اور وہ مالی طور پر مجبور اور پریشان حال بھی نہ ہو جائے۔

واخرج ابن جرير عن ميمون بن مهران ان رجلا سال ابا ذر اي الاعمال الفضل قال الصلوة عماد الاسلام والجهاد سنام العمل والصدقة شيء عجيب فقال يا ابا ذر لقد تركت شيئا هو اوثق عملي في نفسي لا اراك ذكرته قال ما هو قال الصيام فقال قرب



ولیس هنا ولا هذه الآية (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ)

ابن جریر نے میمون بن مہران سے روایت ذکر کی کہ ایک شخص نے حضرت ابو ذرؓ سے سوال کیا کہ اعمال میں سے افضل عمل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز اسلام کا ستون ہے، جہاد عمل کی کوہان (بلندی) ہے، اور صدقہ تو عجیب ہی چیز ہے، تو اس شخص نے کہا آپ نے کس چیز کو چھوڑ دیا جو میرے نزدیک بہت مضبوط عمل ہے، جو میں نے آپ کو ذکر کرتے ہوئے نہیں پایا، آپ نے فرمایا وہ کیا، اس نے کہا روزے، آپ نے فرمایا ہاں روزے بھی بڑی قربت کا ذریعہ ہیں، لیکن صدقہ کا عجیب چیز ہوتا قرآن پاک کی آیت ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ سے ثابت ہے۔ (منقول از درمنثور)

❦ وَاخْرَجَ أَحْمَدُ فِي الزَّهْدِ وَابْنُ الْمُنْذِرِ وَابْنُ أَبِي حَاتِمٍ عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ قَرَأَ ابْنُ عُمَرَ وَهُوَ يَصْلِي فَأَتَى عَلَى هَذِهِ الْآيَةِ (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ) فَأَعْتَقَ جَارِيَةً لَهُ وَهُوَ يَصْلِي إِشَارًا لَهَا بِبَيْدِهِ

حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نماز ادا کر رہے تھے، آپ جب اس آیت کریمہ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ پر پہنچے تو نماز پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا۔ (منقول از درمنثور)

روایت کے انداز سے کہ نماز میں اشارہ کیا سمجھ آتا ہے کہ روایت ضعیف ہے، اگرچہ اشارہ کرنا عمل قلیل ہے تاہم کراہیت سے خالی نہیں۔

❦ وَاخْرَجَ ابْنُ الْمُنْذِرِ عَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَشْتَرِي السَّكْرَ فَيَتَصَدَّقُ بِهِ فَيَقُولُ لَهُ لَوْ اشْتَرَيْتَ لَهُمْ بِشْمَنَهُ طَعَامًا كَانَ النِّفْعُ لَهُمْ مِنْ هَذَا فَيَقُولُ أَلَيْ أَعْرَفَ الَّذِي يَقُولُونَ وَلَكِنْ سَمِعْتُ اللَّهَ يَقُولُ (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ) وَأَنَّ ابْنَ عُمَرَ يَحِبُّ السَّكْرَ

ابن منذر نے حضرت نافع سے روایت ذکر کی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شکر خرید کر صدقہ کرتے تھے، تو ہم کہتے کہ اگر آپ اسی رقم سے ان کو طعام خرید کر دے دیا کرو تو ان کیلئے زیادہ نفع ہو، تو آپ فرماتے میں آپ کی بات سمجھتا ہوں، لیکن میں نے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ﴾ سنا ہے، بیشک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما شکر پسند فرماتے تھے، (اس لئے شکر کو پسندیدہ چیز سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے)

(منقول از درمنثور)

ام ولد ربیع بن خثیم بھی شکر پسند فرماتی تھیں، اسلئے گھر والوں کو سائل کو شکر دینے کا حکم فرماتیں، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کو بھی شکر پسند تھی وہ بھی شکر خرید کر فقراء پر تقسیم کرتے تھے۔ (از قرطبی)



واوی شبل عن ابی نجیح عن مجاهد قال کتب عمر بن الخطاب الی ابی موسی الاشعری ان یتاع له جاریة من سبی جلولا ۛ یوم فتح مدائن کسری فقال سعد بن ابی وقاص فدعا بهاعمر فاعجبته فقال ان الله عزوجل یقول (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا اِمَّا تُحِبُّونَ) فاعتقها عمر ۛ

مجاہد فرماتے ہیں حضرت عمر ۛ نے کسری کے شہر کے فتح ہونے کے دن حضرت ابوموسیٰ اشعری ۛ کی طرف لکھا کہ جلولا کے قیدیوں میں سے میرے لئے ایک لونڈی خرید لیتا، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ۛ نے جب اس لونڈی کو اپنے پاس بلایا تو اس نے آپ کو تعجب میں ڈال دیا، یعنی آپ کو وہ بہت پسند آئی، تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا اِمَّا تُحِبُّونَ﴾ ہے، جس میں پسندیدہ چیز کے خرچ کرنے کے متعلق فرمایا گیا ہے، تو آپ نے وہ لونڈی آزاد کر دی۔ (منقول از قرطبی)

روی عن عمر بن عبدالعزیز ۛ انه كانت لزوجه جاریة بارعة فی الجمال وکان عمر راغباً فیها وکان قد طلبها منها مراراً فلم تعطه اياها ثم لما ولی الخلافة زینتها وارسلتها الیه فقالت وهبتکھایا امیر المؤمنین فلتخدمک قال من این ملکها قالت جئت بهامن بیت ابی عبدالملک ففتش عن تملکھ اياها فقیل انه کان علی فلان العامل دیون فلما توفی اخذت من ترکته ففتش عن حال العامل واحضر ورثته وارضاهم جمیعاً باعطاء المال ثم توجه الی الجاریة وکان یهواها هو ی شدیداً فقال انت حرة لوجه الله فقیل لم یا امیر المؤمنین وقد اذحت عن امرها کل شبهة قال لست اذا ممن لھی النفس عن الهوی

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۛ کی زوجہ کے پاس ایک لونڈی تھی جو بہت خوبصورت تھی، آپ اس کی طرف رغبت رکھتے تھے، کئی مرتبہ آپ نے اپنی زوجہ سے مطالبہ کیا کہ تم اپنی یہ لونڈی مجھے ہیہہ کر دو، لیکن آپ کی زوجہ نے آپ کو نہ دی، جب آپ والئی خلافت بن گئے تو آپ کی زوجہ نے آپ کے پاس وہی لونڈی مزین کر کے بھیج دی کہ میں نے آپ کو یہ ہیہہ کر دی، اب آپ کی یہ خدمت کرے گی، آپ نے پوچھا تمہیں اس کی ملکیت کیسے حاصل ہوئی تھی؟ تو آپ کی زوجہ نے بتایا کہ میں یہ اپنے باپ عبدالملک کے گھر سے لائی تھی، آپ نے اس کی تعقیب کی کہ اس کا باپ کس طرح اس لونڈی کا مالک بنا تھا، تو پتہ چلا کہ فلاں عامل پر کچھ قرضے تھے اس کے فوت ہونے پر اس کے ترکہ سے عبدالملک نے شاہی قرضوں کے بدلے یہ لے لی تھی، آپ نے اس عامل کے حال کی تعقیب



کی پھر اس کے ورثاء کو بلا کر اس کو اس لوٹڈی کی قیمت دے کر راضی کر دیا، پھر آپ اس لوٹڈی کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ کو اس سے شدید محبت ہو گئی، آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے آزاد کر دیا، آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا وجہ ہے اسے آزاد کرنے کی حالانکہ آپ نے تمام شبہات کو دور کر دیا تھا یعنی عامل کے ورثاء کو قیمت دے کر رضا مند کر دیا تھا، پھر آپ نے اسے آزاد کیوں کر دیا؟ ”قال لست ممن نہی النفس عن الهوی“ آپ نے فرمایا میں ان لوگوں سے نہیں ہوا اپنے نفس کو خواہشات سے روک لیتے ہیں، یعنی پسندیدہ چیز پاس ہو، پھر اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی یاد میں مشغول رہنے کی وجہ سے خواہشات سے روک رکھنا دشوار ہے، اور اپنی پسندیدہ چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دینا آسان ہے اور کامل بھلائی کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ (روح البیان)

❀ حضرت ربیع فاج کی مرض میں مبتلاء ہو گئے، آپ کے دروازے پر جب کوئی سائل آتا تو آپ اپنی زوجہ کو فرماتے کہ اسے شکر کھلا دو، کیونکہ آپ کو شکر پسند تھی، وجہ اس کی رب تعالیٰ کا ارشاد ہی مد نظر تھا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ حضرت ربیع کی بیماری لمبی ہو گئی، آپ کے دل میں مرغی کا گوشت کھانے کی رغبت ہوئی، چالیس دن تک تو آپ نے اپنی خواہش کو روک رکھا، لیکن ایک دن اپنی زوجہ کو اپنی شدید رغبت کے متعلق بتا دیا کہ میں چالیس دنوں سے اپنی رغبت کو روک رہا تھا، لیکن آج خواہش کے غالب ہونے پر تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں مرغی کا گوشت کھانا چاہتا ہوں، آپ کی زوجہ نے کہا ”سبحان اللہ وای شئی هذا تکف نفسك عنه وقد احله الله تعالى“ سبحان اللہ اس میں اپنے نفس کو اس خواہش سے روکنے کی کیا ضرورت تھی؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال کر دیا ہے، آپ کی زوجہ نے بازار سے مرغی خرید کر پکادی، جب آپ کے سامنے روٹی اور مرغی کا گوشت رکھا گیا، تو ایک سائل دروازے پر آ کر کہنے لگا ”تصدقوا علی بارک اللہ فیکم“ مجھے صدقہ عطاء کرو اللہ تمہیں برکت عطاء فرمائے، آپ نے کھانے سے ہاتھ ہٹا لیا، اور اپنی زوجہ کو فرمایا یہ روٹی اور گوشت سائل کو دے دو، آپ کی زوجہ نے کہا سبحان اللہ، اتنی خواہش پھر سائل کو دینے کا حکم یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا بس وہی کرو جو میں تجھے حکم دے رہا ہوں، آپ کی زوجہ نے کہا کہ اس سے بہتر پر بھی عمل ہو سکتا ہے، آپ نے فرمایا وہ کیسے؟ اس نے کہا اس کھانے کی قیمت سائل کو دے دیں، ”قال قد احسنت اء تنی بئمنه“ آپ نے فرمایا بہت اچھا مشورہ تم نے دیا ہے، کھانے کی قیمت میرے پاس لاؤ، کھانے کی قیمت لائی گئی، آپ نے وہ رقم کھانے کے ساتھ رکھی اور فرمایا کہ یہ کھانا اور اس کی قیمت تمام ہی فقیر سائل کو دے دو، آپ کی زوجہ نے آپ کے حکم کے مطابق مکمل کھانا اور اس کی قیمت سائل کو دے دی،

سبحان اللہ! کیا ہی خوب ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ پر عمل کیا گیا۔



بہ احسانے آسودہ کردن دلے بہ ازالف رکعت بہر منزله

احسان کے ساتھ کسی دل کو آرام پہنچانا آسودہ حال کرنا ہر منزل میں ہزار رکعت نماز ادا کرنے سے بہتر ہے  
دل بدست آور کہ حج اکبر است از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دل کو ہاتھ میں لا کہ حج اکبر ہے ہزاروں کعبہ سے ایک دل بہتر ہے۔ یعنی تو کسی دل کو نہ ستا، کسی مسکین، فقیر، پریشان حال کی دل جوئی کر، یہ بھی حج اکبر کا ثواب رکھتا ہے۔

کعبہ بنیاد خلیل آزر است دل نظر گاہ جلیل اکبر است

کعبہ کی بنیاد حضرت خلیل اللہ نے رکھی جن کا چچا آزر ہے دل رب جلیل کی نگاہ میں ہے جو سب سے بڑا ہے۔

”و یقال اذا کنت لاتصل الی البر الا بانفاق محبوبک فمتی تصل الی البار وانت ثوثر علیہ حظوظک“

کیا خوب بیان کیا ہے کہ جب تو اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بغیر کامل بھلائی حاصل نہیں کر سکتا تو تجھے چاہیے کہ تو یہ سمجھ لے کہ تو اسی وقت بار (اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی) تک پہنچ سکے گا جب تو اپنی خواہشات کو اس کی رضا پر قربان کر دے گا۔

”قال القشیری من اراد البر فلینفق بعض ما یحبہ ومن اراد البار تعالیٰ فلینفق جمیع ما یحبہ“

علامہ قشیری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا جو شخص بھلائی حاصل کرنا چاہے وہ بعض محبوب چیزوں کو خرچ کرے، اور جو بار تعالیٰ (اللہ تعالیٰ) کو حاصل کرنے، یعنی اس کا تقرب حاصل کرنے، یعنی اس کا تقرب حاصل کرنے کا ارادہ رکھے تو اپنی تمام محبوب چیزوں کو اس پر قربان کر دے۔

”قال الفاشانی کل فعل یقرب صاحبہ من اللہ فهو بر ولا یمکن التقرب الیہ الا بالتبری مما سواہ فمن احب من دون اللہ شیاً فقد حجب بہ عن اللہ واشترک شرکاً خفیاً بالتعلق محبتہ بغیر اللہ“

قاضی شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہر فعل جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے وہ ”بر“ (بھلائی) ہے اللہ تعالیٰ کا تقرب اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کے سوا چیزوں سے بیزاری اختیار نہ کرے، جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور چیزوں سے محبت کی وہ اللہ تعالیٰ سے اسے دور کر دے گی، گویا کہ اغیار سے تعلق کی وجہ سے صوفیاء کرام اسے شرک خفی کہیں گے۔

تراہرچہ مشغول دارد ز دوست اگر راست خوانی دلا رامت اوست

ہر وہ چیز جو تجھے دوست سے دور رکھے اے دل اگر تو سچ پوچھے تو اس غیر چیز کا مطیع ہے،

اگر یاری از خویشمن دم مزن کہ شرک است باریار و با خویشمن



اگر تجھے اپنے آپ سے محبت ہے تو رب تعالیٰ کی یاری کا دم نہ مار کہ یہ اپنے یار سے شرک ہے اور اپنے آپ سے دھوکا ہے۔  
(ماخوذ از روح البیان)



- كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥ (آیہ نمبر ۹۳)
- (۱) سب کھانے بنی اسرائیل کو حلال تھے مگر وہ جو یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا تو راترے سے پہلے ”تم فرماؤ“ تو رات لا کر پڑھوا کر سچے ہو۔ (کنز الایمان)
- (۲) تمام طعام حلال تھے بنی اسرائیل پر مگر وہ جو حرام کئے اسرائیل (یعقوب) نے اپنی ذات پر پہلے نازل ہونے تو رات کے ”آپ فرماؤ“ تم تو رات لے آؤ تو پڑھوا سے اگر تم سچے ہو۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے مؤمنین کو خطاب فرمایا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ ”ہرگز تم بھلائی کو نہیں پاؤ گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز سے جو تمہیں پسند ہو۔“ اس آیت کریمہ میں یہ ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت اسرائیل (یعقوب) بہت شدید مریض ہو گئے، آپ کی بیماری لمبی ہو گئی، آپ نے اللہ تعالیٰ کیلئے نذرمانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیماری سے عافیت عطا فرمائی تو میں اپنے آپ پر محبوب کھانا اور پینا حرام کر دوں گا، آپ کا محبوب کھانا اونٹ کا گوشت تھا، اور آپ کا محبوب مشروب اونٹنی کا دودھ تھا، آپ نے اپنے آپ پر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ پر حرام کیا، (حدیث پاک کا عربی متن یہ ہے)

ونبى الله اسرائيل روى فى الحديث ”انه مرض مرضا شديدا فطال سقمه فنذر الله  
نذرا ان عافاه الله من سقمه ان يحرم او ليحرم من احب الطعام والشراب اليه وكان  
احب الطعام اليه لحوم الابل واحب الشراب البانها ففعل ذلك تقربا الى الله“

البحر المحیط میں اس حدیث پر حاشیہ میں یہ الفاظ ہیں ”حدیث حسن ان شاء اللہ“ بفضلہ تعالیٰ حدیث حسن ہے



پہلی آیت کریمہ اور اس آیت کریمہ میں وجہ جامع یہ ہے۔

”هذه الآية وما قبلها في ان كلا منهما فيما ترك ما يحبه الانسان وما يؤثره على سبيل التقرب به لله تعالى“

ان دونوں آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ انسان اپنی محبوب چیز کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا اور کامل بھلائی حاصل ہوگی۔

### شان نزول اور مختصر مطلب:

قال ابوروق وابن السائب نزلت حين قال النبي ﷺ انا على ملة ابراهيم فقال اليهود فكيف وانت تاكل لحوم الابل والبالها فقال ﷺ ذلك حلال لا ابي ابراهيم ونحن نحله فقالت اليهود كل شئ اصبحنا اليوم نحرمه فانه كان محرما على نوح و ابراهيم حتى انتهى البناء فانزل الله تكذيبا لهم“

ابوروق اور ابن سائب نے یہ فرمایا کہ آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں، تو یہود نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم تو اونٹ کا گوشت کھاتے ہو، اور اونٹوں کا دودھ پیتے ہو، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ چیزیں میرے باپ ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھیں، ہم بھی حلال سمجھتے ہیں، تو یہود کہنے لگے ہر چیز جو آج ہم پر حرام ہے وہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، وہی حرمت ہم تک پہنچی ہے تو اس وقت ان کی تکذیب کیلئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ فَاتَّبِعُوا أَمْرًا قَدْ سَأَلْتُهَا إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (اے محبوب) ”آپ فرما دو تم توراۃ کو لے آؤ، پھر اسے پڑھا اگر تم سچے ہو۔“ یعنی تم اپنی کتاب توراۃ میں سے یہ نکال کر دو کہ یہ چیزیں نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر حرام تھیں، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، لیکن وہ تو جھوٹے تھے توراۃ کو لا کر نہ پڑھ سکے۔ (البحر المحیط)

ایک طویل حدیث پہلے پارہ ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِيلَ﴾ کے بیان میں گزر چکی۔ مسند احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ یہود کے ایک وفد نے نبی کریم ﷺ سے چار سوال کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا ”اخبرونا ای الطعام حرم اسرائیل علی نفسه“ آپ ہمیں خبر دیں کون سا طعام حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا تھا؟

فقال الشدکم بالذی انزل التوراة علی موسیٰ هل تعلمون ان اسرائیل مرض مرضا شديدا و طال سقمه فندبر لله نذرالن شفاء الله من سقمه ليحرمن احب الطعام



والشراب الیہ، وکان احب الطعام الیہ لحم الابل واحب الشراب الیہ البانہا“

تو آپ نے فرمایا میں تم سے اس ذات کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، کیا تم جانتے ہو کہ بیشک حضرت یعقوب علیہ السلام شدید مریض ہو گئے، اور آپ کی مرض لمبی ہو گئی، تو آپ نے اللہ تعالیٰ کیلئے نذرمانی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس بیماری سے شفاء دی تو میں ضرور بر ضرور اپنے آپ پر محبوب کھانا اور پینا حرام کر دوں گا، آپ کا محبوب کھانا اونٹوں کا گوشت تھا، اور آپ کا محبوب مشروب اونٹوں کا دودھ تھا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”الطعام“ بمعنی مطعوم ہے، یا تو اس سے مراد مطلقاً تمام مطعومات ہیں جو کھانے اور پینے کی تمام اشیاء کو شامل ہے، اور کبھی اس کا اطلاق صرف مأكولات یعنی کھانے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ (یہاں مأكولات اور مشروبات کھانے اور پینے کی تمام اشیاء کو شامل ہے) اور ”الطعام“ کا لفظ واحد اور جمع، سب کو شامل ہے۔ (روح المعانی)

”الطعام“ پر الف لام جب استغراقی آئے تو اس وقت، اور لفظ ”کل“ اس پر داخل ہو تو یہ عام مطعومات کو شامل ہوتا ہے، ورنہ صرف ”طعام“ عام نکرہ کا ہی حکم رکھتا ہے۔ یہاں عمومیت پر ”استثناء“ بھی دلیل ہے، کیونکہ ﴿الْمَاحْرَمِ إِسْرَائِيلَ عَلَى نَفْسِهِ﴾ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ﴿كُلُّ الطَّعَامِ﴾ کا معنی ”کل المطعومات“ کریں، جیسا کہ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِفِي خُسْرٍ﴾ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ میں ”الانسان“ پر الف لام استغراقی ہے جو عموم افراد پر دلالت کر رہا ہے، جس سے ”ایمان والوں“ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

**اعتراض:** طعام تو مردار کو بھی شامل ہے اور خنزیر کو بھی شامل ہے، کیا یہ چیزیں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام پر حلال تھیں؟ یہ تو عقلاً بعید نظر آتا ہے۔

**جواب:** شان نزول سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ مسئلہ ان چیزوں میں چل رہا تھا جو بنی اسرائیل پر حرام تھیں، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ تو حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، تو نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ چیزیں حرام نہیں تھیں بلکہ ان پر حلال تھیں، جو چیزیں ان پر حلال تھیں وہ تمام بعد میں بھی حلال رہیں، ہاں البتہ وہ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حلال چیزوں میں سے اپنے اوپر حرام کر دیں وہ ان پر حرام ہو گئیں۔ (ماخوذ از کبیر)



## ﴿كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَٰئِيلَ﴾

”حل“ واحد، جمع، مذکر مؤنث کو شامل ہے، اس کا معنی حلال ہونا، اترنا ﴿وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ﴾ ”اترنے“ کے معنی میں استعمال ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ”كنت اطيب رسول الله ﷺ لحله ولحرمه“ (میں رسول اللہ ﷺ کیلئے حالت حلت (غیر احرام) میں اور حالت احرام میں خوشبو تیار کرتی تھی) میں ”حلال ہونے“ یعنی غیر محرم ہونے کے معنی میں استعمال ہے، اور ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ میں جمع کیلئے استعمال ہے۔ (البحر المحیط)

**اعتراض:** آیہ کریمہ کے ظاہر سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر اونٹوں کا گوشت اور دودھ حرام کر لیا تھا، آپ کے حرام کرنے سے حرام کیسے ہو گیا۔ جبکہ ”ان التحريم والتحليل انما يثبت بخطاب الله تعالى“ حرام ہونا یا حلال ہونا تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے۔

**جواب اول:** یہ کوئی بعید بات نہیں کہ آپ کے حرام کرنے پر اللہ تعالیٰ نے بھی آپ پر حرام کر دیا ہو، یہ کہنا جائز ہے بندے نے اپنے آپ پر ایک چیز کو حرام کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر حرام کر دیا، جیسا کہ بندہ اپنی زوجہ کو اپنے آپ پر طلاق کے ذریعے حرام کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر اس کی زوجہ حرام کر دیتا ہے، اسی طرح بندہ جب لونڈی کو آزاد کر کے اپنے آپ حرام کر لیتا ہے تو رب تعالیٰ بھی اس پر اس لونڈی کو حرام کر دیتا ہے۔

**جواب دوم:** اے علیہ الصلوٰۃ والسلام رہما اجتهد فادی اجتهد الی التحريم فقال بحرمتہ“ نبی کریم ﷺ نے بسا اوقات اجتہاد کیا، آپ نے اپنے اجتہاد سے کسی چیز کو حرام کیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی وہ چیزیں حرام کر دی گئیں، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے آپ پر اجتہاد سے محبوب کھانے اور پینے کی چیز کو حرام کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی آپ پر حرام کر دیا۔

انبیاء کرام کے اجتہاد کے جواز پر چند وجوہ:

(۱) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ﴾ (سورۃ المحشر، آیہ نمبر ۲)

”(تو عبرت لو اے نگاہ والو) اس میں اجتہاد کرنے کا ہی حکم دیا گیا۔“

”ولا شک ان الانبياء عليهم السلام رؤساء اولی الابصار“ یہ بھی یقینی بات ہے کہ انبیاء کرام ”نگاہ والوں“ کے رئیس ہیں، اسلئے آپ کا نظر کرنا، عبرت پکڑنا، اجتہاد کرنا دوسرے لوگوں کے اجتہاد سے افضل ہے۔



(۲) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”لَعَلِمَهُ الدِّينَ يَسْتَبْطُونَهُ مِنْهُمْ“

(تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے) حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

**مسئلہ ۱:** مفسرین کرام نے فرمایا اس آیہ کریمہ میں دلیل ہے جواز قیاس پر اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک علم تو وہ ہے جو نص قرآن و حدیث سے حاصل ہو، اور ایک علم وہ ہے جو قرآن و حدیث سے استنباط و قیاس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

**مسئلہ ۲:** یہ بھی معلوم ہوا کہ امور دینیہ میں ہر شخص کو دخل دینا جائز نہیں جو اہل ہو اس کو تفویض کرنا چاہیے۔ (خزان العرفان)

اس آیہ کریمہ میں رب تعالیٰ نے مستبطنین (مجتہدین) کی مدح فرمائی ”والانبياء اولیٰ بهذا المديح“ اور انبیاء کرام اس مدح کے زیادہ مستحق ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ﴾ (اللہ تمہیں معاف فرمائے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا)

اس آیہ کریمہ سے بھی یہ واضح ہو رہا ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے منافقین کو غزوہ سے واپس لوٹ جانے کی اجازت سے نص سے دی تھی بلکہ اجتہاد سے دی تھی ”فلو كان ذلك الاذن بالنص لم يقل لم اذن“ اگر نص سے اجازت دی ہوتی تو آپ کو ”لِمَ أَذِنْتَ“ نہ فرمایا جاتا، اس آیہ کریمہ سے بھی نبی کریم ﷺ کا اجتہاد کرنا ثابت ہوا، ساتھ ہی اجتہاد کی فضیلت بھی ثابت ہو گئی۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے بڑھ کر اس کی اطاعت کرنے والے انبیاء کرام ہیں، انبیاء کرام کا فعل، عظیم فعل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔

”ولا شك ان استنباط احكام الله تعالى بطريق الاجتهاد طاعة عظيمة شاقة فوجب

ان يكون للانبياء عليهم الصلوة والسلام فيها نصيب“

یہ یقینی بات ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں استنباط و اجتہاد اللہ تعالیٰ کی عظیم طاعت ہے، اس میں بہت مشقت پائی جاتی ہے، تو ضروری ہے کہ اس عظیم طاعت سے انبیاء کرام کو بہت بڑا حصہ عطاء کیا جائے، خصوصاً انبیاء کرام کو سب سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے، ان کی عقلیں سب سے زیادہ منور ہوتی ہیں، اور ان کے ذہن سب سے زیادہ صاف ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان کو خصوصی تائید و توفیق حاصل ہوتی ہے جو ان کو درست راہ پر قائم رکھتی ہے۔



”ثم اذا حكموا بحكم بسبب الاجتهاد يحرم على الأمة مخالفتهم في ذلك الحكم  
كما ان الاجماع اذا انعقد على الاجتهاد فانه يحرم مخالفته“

انبیاء کرام جب اجتہاد سے کسی مسئلہ پر حکم لگا دیں تو امت پر ان کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے، جیسا کہ  
اجتہاد پر اجماع منعقد ہو جائے تو اس کی مخالفت حرام ہو جاتی ہے۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب عليه السلام نے اونٹوں کے گوشت اور دودھ کو جو اپنے آپ پر حرام کیا تھا وہ  
اپنے اجتہاد سے کیا تھا، نص سے نہیں، اگر نص سے حرام کیا گیا ہوتا، تو یوں کہا جاتا ”الا ما حرم الله على اسرائيل“، لیکن  
جب یہ نہیں کہا گیا بلکہ حرام کرنے کی نسبت حضرت یعقوب عليه السلام کی طرف کی گئی، ارشاد فرمایا ﴿اَلَا مَا حَرَّمَ اِسْرَٰئِیْلُ  
عَلٰی نَفْسِهٖ﴾ تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہ فعل حضرت یعقوب عليه السلام کے اجتہاد سے تھا۔ (ماخوذ از کبیر)

**جواب سوم:** الثالث يحتمل ان التحريم في شرعه كالنذر في شرعنا فكما

يجب علينا الوفاء بالنذر كان يجب في شرعه الوفاء بالتحريم“

تیسرا جواب یہ ہے کہ احتمال یہ ہے کہ حضرت یعقوب عليه السلام کی شریعت میں اگر کسی چیز کو اپنے آپ حرام  
کر لیا جاتا تو اسے حرام سمجھنا اور اس سے بچنا فرض ہو جاتا تھا، جیسا کہ ہماری شریعت میں نذر کا پورا کرنا  
واجب ہو جاتا ہے۔

اسی سے ایک سوال کا جواب خود بخود آ گیا کہ حلال چیز کو حرام کرنا منع ہے، جو کہ رب تعالیٰ کے ارشاد سے واضح  
ہے ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ ”اے نبی! کیوں حرام کرتے ہو وہ جو حلال کی ہے اللہ تعالیٰ نے  
آپ کیلئے“ تو حضرت یعقوب عليه السلام نے اپنے آپ پر حلال چیزوں کو کیسے حرام کر لیا تھا؟ اس کا جواب یہ سمجھ آ گیا کہ ان  
کی شریعت میں یہ جائز تھا کہ کسی حلال چیز کو اپنے آپ پر حرام کر لیا جائے، لیکن ہماری شریعت میں منع ہے۔ (ماخوذ از کبیر)  
پہلی شریعتوں کے قوانین ان سے ہی سمجھے جائیں ان کو نبی کریم ﷺ کی شریعت پر قیاس نہ کیا جائے۔

**جواب چہارم:** ہو سکتا ہے کہ یہاں ”تحریم“ کا مجازی معنی لیا گیا ہو، کہ حضرت یعقوب عليه السلام کو اونٹوں کا  
گوشت اور دودھ پسند تھے، طبیعت ان کی طرف مائل رہتی تھی تو آپ نے اپنے پر قہر کرتے ہوئے، نفس کو روکنے کیلئے  
نذر مان لی ہو کہ میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کروں گا۔ حقیقی معنی یہاں نہیں کہ آپ نے واقعی اپنے آپ پر حلال  
چیزوں کو حرام کر دیا (لیکن راقم کے نزدیک یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ دوسرے جوابات ظاہر کے مطابق ہیں)  
(ماخوذ از کبیر)



علامہ رازی رحمہ اللہ کی ایک خوبصورت تحقیق:

اس مقام پر مفسرین کرام کی مختلف بحثیں ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر جن چیزوں کو حرام کیا تھا، وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگئی تھیں یا نہیں؟ کیا ایک مرتبہ ان پر حرام ہوئی تھیں یا دو مرتبہ؟ کبیر میں مختصر اور تحقیقی طور پر خوبصورت انداز پر اس مسئلہ کو ان الفاظ سے حل کیا گیا۔

ظاهر هذه الآية يدل على ان الذي حرمه اسرائيل على نفسه فقد حرمه الله على بني اسرائيل، وذلك لانه تعالى قال ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ فحكم بحل كل انواع المطعومات لبني اسرائيل، ثم استثنى عنه ما حرمه اسرائيل على نفسه فوجب بحكم الاستثناء ان يكون ذلك حراما على بني اسرائيل “والله اعلم  
آیہ کریمہ کا ظاہر اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیشک جن چیزوں کو حضرت اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے اپنے آپ پر حرام کیا، وہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد (بنی اسرائیل) پر حرام کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ تمام کھانے (جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھے) وہ حلال تھے بنی اسرائیل کیلئے۔ پھر اس سے مستثنیٰ کیا ﴿إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ﴾ (مگر وہ جو حرام کیا یعقوب نے اپنے آپ پر) استثناء کا تقاضا یہ ہے کہ وہ چیزیں بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوں۔

﴿مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْزِلَ التَّوْرَةُ﴾ ”پہلے نازل ہونے تو راة کے۔“

مطلب یہ ہے کہ توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل پر تمام کھانے حلال تھے سوائے اس کے جو چیزیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیں وہی بنی اسرائیل پر بھی اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیں۔  
”اما بعد التوراة فلم يبق كذلك بل حرم الله تعالى عليهم انواعا كثيرة“

لیکن توراۃ کے نازل ہونے کے بعد حکم اس طرح نہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کثیر چیزوں کو حرام کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جب کوئی عظیم جرم کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر کئی حلال چیزوں کو حرام کر دیتا تھا، ان پر ہلاکت اور عذاب کو مسلط کر دیتا تھا۔

اس مسئلہ پر ارشاد باری تعالیٰ دیکھئے:

﴿فَبَطَّلْنَا مَنِ الدِّينَ هَٰذَا وَآخَرُ مَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ (سورة النساء، آية ۱۶۰)  
”بوجہ ظلم کرنے یہودیوں کے حرام کر دیں ہم نے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں جو حلال تھیں ان کیلئے“



اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی دیکھئے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾  
(سورة الانعام، آية نمبر ۱۴۶)

”اور یہودیوں پر ہم نے حرام کیا ہر ناخن والا جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کی مگر جو ان کے پیٹھ میں لگی ہو، یا آنت یا ہڈی سے ملی ہو، ہم نے یہ ان کی سرکشی کا بدلہ دیا، اور بیشک ہم ضرور سچے ہیں۔“

﴿قُلْ فَاتَّبِعُوا بِالْتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾

”آپ فرمادیں تو لے آؤ تم توراۃ تو اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔“

بنی اسرائیل قوم نے جب رسول اللہ ﷺ سے جھگڑا کیا اور دعویٰ کیا کہ جو چیزیں ہم پر حرام ہیں یہ تو پہلے سے ہی حرام چلی آرہی ہیں، کیونکہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں، بلکہ ان میں سے بعض نے کہا یہ تو آدم علیہ السلام کے زمانہ سے حرام چلی آرہی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کی تکذیب کی کہ تم جھوٹے ہو، کیونکہ یہ چیزیں پہلے سے حلال چلی آرہی ہیں، صرف ان چیزوں کو ابتدائی طور پر حرام کیا گیا جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیں، تو انہوں نے کہا انہیں بات وہی صحیح جو ہم کہہ رہے ہیں، تو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دے دیا کہ اے محبوب ”آپ ان کو فرمادو تم توراۃ لے آؤ، اسے پڑھو اگر تم سچے ہو“

(بیر)

”فلم ياتوا بها وخافوا الفضيحة“ وہ توراۃ نہ لائے کیونکہ ان کو اپنے رسوا ہونے کا خوف تھا۔ (خازن)

یہ یقینی بات ہے کہ وہ توراۃ لاتے تو اپنے دعویٰ کو توراۃ سے ثابت نہ کر سکتے، اور ذلت و رسوائی کا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔

**فائدہ عظیمہ:**

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس بیماری سے شفاء حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ پر اپنی محبوب چیزوں کو حرام کر دیا تھا، وہ آپ کی بیماری ”عرق النساء“ کی تھی۔ ”عرق النساء“ وہ بیماری ہے جو ران سے درد شروع ہوتا ہے کٹنے یا قدم تک پہنچتا ہے، (المنجد) اس کا علاج ابن ماجہ شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

حدثنا انس بن سيرين انه سمع انس بن مالك يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول

شفاء عرق النساء اليه شاة (اعرابية) لذاب ثم تجزأ ثلاثة اجزاء ثم يشرب على الريق

في كل يوم جزء



حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا عرق النساء کی شفاء اس میں ہے کہ (عربی نسل) بھیڑ کی لاٹ (دم کی چکی) کو پکھلایا جائے، پھر اس (چربی) کے تین حصے کئے جائیں، پھر ہر روز (یعنی تین دن) نہار منہ اس کا ایک ایک حصہ پئے

خیال رہے کہ تفسیر نعیمی میں ”یشرب علی الریق“ کا معنی کیا گیا ہے، پھر اس رگ میں جذب کر دیا جائے جسے ریق کہا جاتا ہے۔

❦ واخرج الثعلبی فی تفسیره ایضا ”من حدیث انس بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ فی عرق النساء تؤخذ الیة كبش عربی لا صغیر ولا کبیر فتقطع صفاراً فتخرج اھالته فتقسم لثلاثة اقسام فی کل یوم علی ریق النفس ثلاثاً“

تفسیر ثعلبی میں یہ حدیث مذکور ہے، ترجمہ دینی ہے جو بیان ہو چکا ہے ”اھالۃ“ کا معنی پکھلائی ہوئی چربی ”قال انس فوصفته لا کثر من مائۃ فبراً باذن اللہ تعالیٰ“ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”میں نے ایک سو سے زائد آدمیوں کو یہی علاج بتایا، جنہوں نے اس پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شفاء حاصل کی۔ (ماخوذ از قرطبی)

## شان نبوت:

نبی کریم ﷺ کا مطالبہ کرنا کہ تم توراۃ لاؤ اور اسے پڑھو، اپنا دعویٰ توراۃ سے ثابت کرو اگر تم سچے ہو، اس سے نبی کریم ﷺ کی شان عظیم واضح ہوئی کہ جس ذات نے کسی مدرسہ میں اور کسی معلم سے تعلیم حاصل نہیں کی، وہ چیلنج کر رہے کہ تم جھوٹے ہو، تمہاری کتاب میں تمہارے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں، تو آپ کا یہ ارشاد گرامی آپ کی حقانیت پر دلالت کر رہا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

کفار کے نظریات ہمیشہ ایک رہے:

وكان سبب نزول هذه الآية ان اليهود انكروا التحليل النبی ﷺ لحوم الابل لانهم لا یرون النسخ جائزاً فانزل الله هذه الآية

یہود نے نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا کہ تم اونٹوں کا گوشت کیوں حلال مانتے ہو، یہود احکام کے منسوخ ہونے کو نہیں مانتے تھے، تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کر کے واضح کر دیا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں یہ حلال تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا تو رب تعالیٰ نے بھی بنی اسرائیل پر حرام کر دیا، اور ان کو بتایا کہ یہ مسئلہ توراۃ میں موجود ہے اگر تم سچے ہو تو توراۃ لاؤ اور پڑھو، جب ایک چیز کی



حلت منسوخ ہوگئی اور حرمت آگئی تو اب اس کی حرمت منسوخ ہوگئی اور حلت آگئی، یہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے جو چاہے کرے ”وبین ذلک بطلان قولہم فی اباء النسخ اذ ماجاز ان یکون مباحا فی وقت ثم حظر جازات اباحتہ بعد حظرہ“ واضح ہو گیا کہ یہود کا نسخ کا انکار باطل ہے، بلکہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کی کسی وقت اجازت دے اور کسی وقت منع کر دے۔  
(احکام القرآن للجصاص)

آج بھی باطل مذاہب والے قادیانی، نیچری وغیرہ نسخ کے قائل نہیں، کیا خوب یہود سے بھائی چارہ۔



فَمَنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (آیہ نمبر ۹۲)

(۱) تو اس کے بعد جو اللہ پر جھوٹ باندھے تو وہی ظالم ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ بعد اس کے، تو وہی ظالم ہیں۔ (نجوم الفرقان)

یعنی جب ان پر دلائل قائم کر دئے گئے کہ اونٹوں کا گوشت اور دودھ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام نہیں تھے بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر یہ حرام کئے بعد میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بھی حرام کر دئے، یہ مسئلہ توراۃ میں موجود ہے، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو توراۃ لے آؤ، لیکن وہ رسوائی سے بچنے کیلئے توراۃ نہ لائے۔ اس آیت کریمہ میں یہ بیان فرمایا گیا کہ اگر ان دلائل کے قائم ہونے کے بعد بھی تم اپنے دعویٰ پر قائم رہے اور رب تعالیٰ کی طرف تم نے جھوٹ منسوب کیا کہ یہ چیزیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام کی تھیں تو تم ظالم ہو جاؤ گے۔

﴿فَمَنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ﴾ ”تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ۔“

”الافتراء، اختلاق الکذب والفریۃ الکذب والقذف“ کا معنی ہے جھوٹ گھڑنا، جھوٹ باندھنا، تہمت لگانا، ”فریۃ“ کا معنی جھوٹ اور تہمت ہے، اصل میں اس کا معنی ماخوذ ہے ”فری الادیم“ (چمڑا کاٹنا) سے، جھوٹ باندھنے کو ”افتراء“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ کاذب (جھوٹا) بغیر تحقیق کے کلام (منقطع) یعنی جھوٹ گھڑ لیتا ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)



## ﴿مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾ ”بعد اس کے۔“

”ای من بعد ظهور الحجة بان التحريم انما كان من جهة يعقوب، ولم يكن محرما قبله“  
(تو جنہوں نے گھڑا اللہ پر جھوٹ اس کے بعد) ”اس کے بعد“ کا مطلب کیا ہے؟ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر خود ”اونٹوں کا گوشت اور دودھ“ حرام کیا تھا، اس سے پہلے ان پر کوئی چیز حرام نہیں تھیں۔

## ﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ”تو وہی ظالم ہیں۔“

یعنی حجت و دلائل حاصل ہونے کے بعد جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا تو وہی ظالم ہیں ”یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہیں، اس لئے کہ ان کا کفر ان کی اپنی جانوں پر ظلم ہے، اور ان لوگوں پر بھی ان کا ظلم ہے جن کو وہ گمراہ کر رہے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

**اعتراض:** اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا تو ہمیشہ ظلم ہے ”مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ“ یعنی حجت و دلائل کے بعد کی قید کیوں لگائی؟

**پہلا جواب:** وانما قيد بالبعدية مع انه يستحق الوعيد بالكذب على الله تعالى في كل

وقت وفي كل حال للدلالة على كمال القبح

یہ بات تسلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ مطلقاً حرام ہے، اور اس سے انسان ہر وقت اور ہر حال میں عذاب کا مستحق ہوتا ہے لیکن جب کسی مسئلہ پر دلائل بھی حاصل ہو جائیں تو دلائل کے بعد نہ تسلیم کرنا اور اپنا من گھڑت اور غلامی دعویٰ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا یہ بہت ہی زیادہ برا طریقہ ہے، اور بہت بڑے عذاب کا مستحق ہوتا ہے، اور بہت بڑا ظلم ہے۔

**دوسرا جواب:** وقيل لبيان انه المايؤخذ به بعد اقامة الحجة عليه ومن كذب

فليس بمحجوج فيه فهو بمنزلة الصبي الذي لا يستحق الوعيد بكذبه، وفيه تأمل

بعض حضرات نے بیان یہ کیا ہے کہ ﴿مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دلائل اور حجت کے

حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ باندھنا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نہیں کہا ہوتا یہ عذاب کا سبب ہے، لیکن اگر کسی شخص نے جہالت کی وجہ سے کہہ دیا کہ ”اللہ نے یہ کیا ہے“ اور ”اللہ تعالیٰ نے یہ کیا ہے“ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کا قول و فعل نہیں ہوتا، تو یہ شخص جس نے لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے یہ کہہ دیا تھا، اس کے پاس دلائل نہیں آئے تھے وہ بچے کی طرح معذور سمجھا جائے گا، اسے کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن اس جواب کے ضعیف



ہونے کی طرف ”وفیہ تامل“ (اور اس میں تامل (سوچ) ہے) سے اشارہ فرمادیا کہ بغیر تحقیق کے یہ کہہ دینا کہ یہ ”اللہ تعالیٰ کا ارشاد“ یہ بھی باعث عذاب ہے، وہ مقام ادب ہے جس کا پاس کرنا ضروری ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

لفظ ”من“ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ شرط ہو، اور دوسرا یہ کہ موصولہ ہو، ”وقد روعی لفظها ومعناها“ آیہ کریمہ میں لفظ ”من“ اور معنی ”من“ دونوں کا لحاظ کیا گیا ہے، کیونکہ ”لفظ من“ مفرد ہے، اور ”معنی من“ جمع ہے، عموم پر دلالت کر رہا ہے، لفظ کا اعتبار کر کے ”افتسری“ واحد کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس کے معنی کا اعتبار کر کے ”اولئک“ اشارہ جمع ”ہم“ ضمیر جمع ”الظالمون“ جمع ذکر کئے گئے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مکمل مفرد والا معنی ذکر فرمایا، راقم نے معنی کا اعتبار کر کے مکمل جمع کا معنی کیا ہے، تاہم لفظوں کے ظاہر کو دیکھ کر یہ ترجمہ بھی درست ہے بلکہ لفظوں کے مطابق یہی ہے۔

”تو جس نے جھوٹ باندھا اللہ پر اس کے بعد، تو وہی ظالم ہیں“



قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (آیہ نمبر ۹۵)

(۱) تم فرمادو اللہ سچا ہے تو ابراہیم کے دین پر چلو جو ہر باطل سے جدا تھے اور شرک والوں میں نہ تھے۔ (کنز الایمان)

(۲) آپ فرمادیں سچا ہے اللہ تو تابعداری کرو دین ابراہیم کی جو ہر باطل سے جدا تھے اور نہیں تھے مشرکوں سے۔ (نجوم الفرقان)

یہاں تین مطلب بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اے محمد ﷺ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر جو محبوب طعام یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے پر حرام کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے، اللہ تعالیٰ سچا ہے، اسی سے یہ واضح ہو گیا ”فصح“



القول بالنسخ وبطل قول اليهود " کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشادات کو منسوخ فرما دیا ہے، جو طعام پہلے حلال تھا وہ بنی اسرائیل پر حرام کیا گیا، پھر نبی کریم ﷺ پر حلال کر دیا گیا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سچا ہے یہ خبر دینے میں کہ اونٹوں کا گوشت اور دودھ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھا، بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر حرام کیا۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خبر میں صادق ہے کہ جو کھانے کی چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حلال تھیں، وہ بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں، کچھ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے پر حرام کیں جو بنی اسرائیل پر بھی حرام کر دی گئیں، اور بعض طعام بنی اسرائیل کے گناہوں کی وجہ سے ان پر بطور سزا حرام کر دئے گئے۔

"ففيه تعريض بكذب اليهود والمعنى ثبت ان الله تعالى صادق فيما انزل واخبر وانتم كاذبون يا معشر اليهود"

اس میں تعریضاً (اشارۃ) یہود کے جھوٹ کو ذکر کر دیا گیا، معنی یہ ہے کہ ثابت ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور خبر میں صادق ہے اور اے یہود تم جھوٹے ہو۔ (خازن)

راقم کے نزدیک تینوں مطالب اس مختصر عبارت میں سمٹ کر آ جاتے ہیں "آپ فرمادے گئے اللہ تعالیٰ سچا ہے تمہارا دعویٰ باطل ہے کہ یہ ارشاد جو ہم پر حرام ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی حرام تھیں، بلکہ ان پر حلال تھیں تم پر حرام ہیں، منسوخیت کا انکار کرنا درست نہیں۔

﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ "تو تابعداری کرو دین ابراہیم کی جو ہر باطل سے جدا تھے۔"

یعنی اے یہود تم جو یہ کہتے ہو کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے محبت ہے اور ہم ان کے دین پر ہیں، تمہارا یہ کہنا سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، دین ابراہیم علیہ السلام تو دین اسلام ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ تمہیں بھلاتے ہیں۔ (فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ) وہی ملۃ الاسلام الی علیہا محمد علیہ السلام ومن آمن معہ حتی تنخلصوا من الیہودیۃ الی ورتکم فی فساد دینکم ودنیاکم حیث اضطررکم الی تحریف کتاب اللہ

دین ابراہیم وہ دین اسلام ہے جس کی طرف حضرت محمد ادرعوت دے رہے ہیں، جس نے آپ پر ایمان لایا، اس نے یہودیت سے چھٹکارا حاصل کر لیا، کیونکہ یہودیت نے تمہیں دین و دنیا کے فساد کی دلدل میں پھنسا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کرنے پر تمہیں یوں لگا دیا ہے جیسے کہ کوئی شخص



دین ابراہیم کے اوصاف:

وكان ملته انفاق المال على الضيفان وبلد الروح عند الامتحان وتسليم القربان  
وهذه ملة الخلّة

آپ کے دین میں یہ چیزیں تھیں ”مہمان پر مال خرچ کرنا اور امتحان کے وقت اپنی جان قربان کرنا، اور  
قربانی کو تسلیم کرنا“ یہی چیزیں رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں بھی جاری رکھی گئیں۔ (روح البیان)

﴿حَنِيفًا﴾ ”جو ہر باطل سے جدا تھے۔“

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ و تفسیر ابی السعود:

”حَنِيفًا“ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے ”ہر باطل سے جدا“ راقم نے  
بھی یہی نقل کیا ہے، آئیے تفسیر ابی السعود کو دیکھتے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ آپ کو اسی کے مطابق نظر آئے گا۔  
”﴿حَنِيفًا﴾ اے ماثلاً عن الادیان الزائغة کلھا“ آپ تمام ٹیڑھے (باطل) دینوں سے اعراض کرنے والے  
(جدا) تھے۔ (تفسیر ابی السعود)

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ ”اور آپ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔“

قرآن پاک کی عظمت کو دیکھیں یہ قلیل الفاظ کتنے عظیم معانی و مطالب کو حاوی ہیں۔

(۱) ”﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ ای فی امر من امور دینہ اصلاً و فرعاً“

کہ ابراہیم علیہ السلام امر دین کے اصول اور فروع میں کسی ایک چیز میں بھی آپ مشرکوں کے ساتھ شریک نہیں تھے۔

(۲) ”وفیه تعریض باسراک الیہود“ ان مختصر الفاظ مبارکہ سے تعریضاً (اشارۃ) یہ بھی سمجھ آ گیا کہ یہود  
دین کے امور میں مشرکوں کے ساتھ شریک تھے۔

(۳) ”وتصریح بالہ علیہ السلام لیس بینہ و بینہم علاقة دینیة قطعیة“

ان الفاظ گرامی سے واضح طور پر یہ بھی سمجھ آ گیا کہ یہود اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں کہ ہم دین ابراہیمی  
پر قائم ہیں، ان کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کوئی واسطہ نہیں۔



(۴) ”والغرض بیان ان النبی ﷺ علی دین ابراہیم علیہ السلام فی الاصول لانه لا یدعو الا الی التوحید والبراءة عن کل معبود سواہ سبحانہ“

ان مختصر الفاظ سے اصل مقصد بیان بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ اصول دین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی اور رب تعالیٰ کے بغیر تمام باطل معبودوں سے آپ نے اعراض کیا، یہی کام نبی کریم ﷺ نے بھی کئے، تو پتہ چل گیا کہ اصول دین میں آپ دین ابراہیم پر تھے۔

(۵) ”ولجملة تدلیل لما قبلها“ یہ مختصر جملہ ما قبل تمام مضمون کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے (تفسیر ابی السعود)

میرے عزیز طلبہ کرام! ”کُلُّ الطَّعَامِ“ سے لے کر یہاں تک تمام ابحاث کو دیکھیں، اور خاص کر کے ”وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ“ کے ضمن میں چار وجوہ کو دیکھیں تو یہ پانچویں وجہ روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آئے گی۔

تین آیات سے حاصل ہونے والے فوائد جلیلہ:

نجم الدین رحمہ اللہ نے تاویلات میں ذکر کیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تین قسموں پر پیدا کیا۔ ایک قسم ان سے فرشتے روحانی، علوی، لطیف، اور نورانی مخلوق ہے، ان کی غذا ان کے مناسب ان کو عطاء کی گئی، وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی عبادت یعنی ان کو پیدا ہی عبادت کیلئے کیا گیا ہے۔

مخلوق کی دوسری قسم حیوانی، جسمانی، سفلی، کثیف، ظلمانی ہیں، ان کی غذا ان کے مناسب عطاء کی گئی، ان کی غذا چارہ ہے، ان کو پیدا ہی خدمت گزاری کیلئے کیا ہے، اور اس لئے کہ اس جہان میں یوں ہی کھانے، پینے میں وقت گزار کر چلے جائیں۔

مخلوق کی تیسری قسم انسان ہیں جو ملکی روحانی اور حیوانی جسمانی کا مرکب ہیں، یعنی ان میں فرشتوں والی حالت بھی ہے، اور حیوانوں والی بھی، ان کی غذا ان کے مطابق مقرر کی گئی ہے، ان کی روحانی غذا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، اور ان کی جسمانی غذا اطعام ہے، اور ان کو عبادت اور معرفت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔

انسانوں کی ایک قسم یہ ہے:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ﴾ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن کی



حیوانیت روحانیت پر غالب ہوتی ہے، وہ جسمانی غذا کھانے کی طرف ہی متوجہ رہتے ہیں، روحانی غذا کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی، گویا کہ ان کی روح حقیقی مرجاتی ہے جس پر ملکی زندگی کی حیات موقوف تھی، اور ان پر حیوانیت غالب ہو جاتی ہے، یہ وہی ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿أُولَٰئِكَ كَمَا لَانْعَامٌ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ وہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، (یہ درحقیقت کافر لوگ ہیں یا گناہوں پر ہمیشہ قائم رہنے والے)

مرد درپے ہر چہ دل خواہت کہ سملین تن نور جاں کاہت  
دل کی ہر مراد کے پیچھے نہ چل کہ تیرے جسم کے پالنے سے تیری جان کا نور کم ہو جائے گا۔

زور دران پس نامرادی بری اگر ہر چہ باشد مرادت خوری

نفس کے پیچھے چلنے کے دوران تجھے نامرادی حاصل ہوگی جبکہ تیرا مقصد ہی (جانوروں کی طرح) صرف کھانا ہوگا

کند مرد در نفس امارہ خوار اگر ہوشمندی عزیز ش مدار

نفس امارہ انسان کو ذلیل کرتا ہے، اگر تو عقلمند ہے تو اس کو عزیز نہ رکھ۔

در لیغ آدمی زادہ پر محل کہ باشد چو انعام بل ہم اضل

انسان کی بلند محلات پر اڑان ختم ہو جائے گی وہ چوپاؤں کی طرح ہوگا، بلکہ اس سے بھی بھٹکا ہوا ہوگا۔

اور انسانوں کی دوسری قسم یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّقْتَصِدٌ﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو میانہ روی پر ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوں گے، جن کی روحانیت اور حیوانیت برابر ہوں گی، ہر ایک کے مطابق اسے غذا حاصل ہوگی، وہ نیک عمل بھی کرتے ہیں اور ذکر و عبادت بھی ان کو حاصل ہوتے ہیں یہ ہے روحانیت، اور وہ کھاتے پیتے بھی ہیں خواہش سے، اور کبھی ان سے گناہ صغیرہ بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں جو ان کی نیکیوں سے ختم ہوتے رہتے ہیں، اور کبھی ان سے برے اعمال گناہ کبیرہ کی شکل میں سرزد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دیتا ہے وہ توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ کو قبول کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّيْءَ﴾ (سورۃ حود، آیہ نمبر ۱۱۳)

”بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔“ (ان برائیوں سے مراد صغائر گناہ ہیں)

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

(سورۃ التوبہ، آیہ نمبر ۱۰۲)



”اور کچھ وہ ہیں جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، انہوں نے ملار کھے ہوتے ہیں، اچھے عمل اور برے، قریب ہے اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کر لے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

دینی طلباء کرام راقم کے ترجمہ کو دیکھ کر اعتراض نہ کریں کہ ماضی کے صیغوں کا ترجمہ مضارع والا کیوں کیا ہے یہ ترجمہ عموم الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے، خصوصی مورد کا لحاظ نہیں کیا گیا۔

انسانوں کی تیسری قسم یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ سَابِقُ بِالْخَيْرَاتِ﴾ ”اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں“ یہ وہ لوگ ہیں جن کی روحانیت حیوانیت پر غالب ہوتی ہے، وہ روحانیت کی غذا کو زیادہ حاصل کرتے ہیں، یعنی ذکر و عبادت میں ان کا وقت زیادہ گزرتا ہے، حیوانیت کی غذا وہ کم استعمال کرتے ہیں یعنی طعام صرف زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے کھاتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح صرف کھانے کی تمنا نہیں رکھتے، ان کا نفس مرجاتا ہے اور روحانیت کو قوت و غلبہ حاصل ہوتا ہے، ان تمام قسموں کا ارشاد ان آیات سے مل گیا، کیونکہ جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق ذکر فرمایا، ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلاَلًا لِّبَنِي إِسْرَآئِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآئِيلُ عَلَى نَفْسِهِ﴾ ”ہر کھانا بنی اسرائیل کیلئے حلال تھا مگر وہ جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے نفس پر حرام کیا۔“ اسی سے یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اولیاء نظام پر حلال کھانے مباح تھے، لیکن انہوں نے اپنے آپ پر خواہشات کو ترک کرتے ہوئے زندگی کی بقاء تک کھانوں کو باقی رکھا، لذات کو چھوڑ دیا۔ ﴿فَمَنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ سے اشارہ ان لوگوں کی طرف مل گیا جو کھانے پینا ہی مقصد حیات سمجھتے ہیں، رب تعالیٰ سے دور رہتے ہیں وہ درحقیقت ظالم ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ سے تیسری قسم کی طرف اشارہ مل گیا کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام مشرکوں سے نہیں تھے ایسے ہی تم نیکیوں سے گناہوں کی شراکت نہ کیا کرو، اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کرنا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے، اور یہ بتا دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی محبت کے دعویدارو! انہوں نے تو زندگی بھر مہمان نوازی کی، امتحان کے وقت اپنی جان کو قربان کرنے کیلئے آگ میں جانا پسند کر لیا، اور امتحان کے وقت بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے پیش کر دیا تم بھی یہی راہ اختیار کرو تو اپنے دعویٰ میں سچے ہو گے کہ تمہیں ابراہیم علیہ السلام سے محبت ہے ورنہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو گے، اور یہ فائدہ حاصل ہوا کہ انسان کو گویا کہ یوں کھا گیا کہ تو سب کو چھوڑ کر صرف مجھے ہی خلیل بنا۔

در آتش فشانند سجاده ات

اگر جز بحق میرود جادہ ات



اگر اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف تیرا راستہ گیا تو آگ میں تیرا مصلی جھاڑ دیں گے۔

### اتباع ملت ابراہیم کی علامت:

”فعلامۃ اتباع ملة ابراهيم هو الاطاعة للحق والتبري من كل دين سوى الاسلام ومحبة الاولياء وعداوة الاعداء“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو، اور سوائے دین اسلام کے باقی باطل دینوں سے دور ہو جائے، اور اولیاء کرام کی محبت اسے حاصل ہو، اور وہ رب تعالیٰ کے دشمنوں سے دور ہو۔

### رب تعالیٰ کے قرب کیلئے دل میں خلوص ضروری ہے:

ولو كان المرء آتيا بجميع الطاعات وليس في قلبه خلوص المحبة فانما يضرب حديدا باردا والله تعالى لا يحب القلب المشرك بمحبة غيره من شهوة او غيرها“  
اگر انسان تمام طاعات کو لائے لیکن اس کے دل کی محبت میں خلوص نہ ہو تو وہ ٹھنڈے لوہا کوٹ رہا ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ دل پسند نہیں جس میں اللہ کے بغیر کسی اور کی محبت ہو۔

**حکایت:** محمد ابن حسان رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں لبنان کے پہاڑوں میں پھر رہا تھا وہاں میں نے ایک جوان دیکھا جسے گرم ہوا کی لونی جلادیا ہے، وہ مجھے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا، میں نے اسے کہا اے جوان مجھے کوئی نصیحت کرتا جا، اس نے کہا ”احذرہ تعالیٰ فانہ غیور لا یجب ان یری فی قلب عبد سواہ“ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، وہ غیور ہے، وہ پسند نہیں کرتا کہ بندے کے دل میں اس کے غیر کی محبت ہو۔  
(ماخوذ از روح البیان)

خیال رہے انبیاء کرام اور اولیاء کرام سے محبت رب تعالیٰ کے غیروں کی محبت نہیں، بلکہ اللہ والوں سے محبت ہے، اللہ والوں سے محبت حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ہے۔





إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝ (آیہ نمبر ۹۶)

(۱) بیشک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور

(کنز الایمان)

سارے جہان کا راہنما۔

(۲) بیشک سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں (کی عبادت) کیلئے، وہ ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا

(نجوم الفرقان)

اور ہدایت دینے والا ہے سب جہان والوں کیلئے۔

## شان نزول:

روایت کی گئی کہ جب قبلہ کعبہ کو بنایا گیا تو یہود نے نبی کریم ﷺ کی نبوت میں طعن کیا، اور انہوں نے کہا بیشک بیت المقدس کعبہ شریف سے افضل ہے، اور زیادہ حق یہی ہے کہ قبلہ بیت المقدس ہی ہونا چاہیے کیونکہ بیت المقدس کعبہ سے پہلے بنایا گیا، اور وہ محشر کی زمین ہے، اور وہ انبیاء کرام کی ہجرت کا مقام ہے، اور وہ انبیاء کرام کا قبلہ ہے، وہ مقدس زمین میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں تمام جہانوں کیلئے برکتیں رکھی ہیں، اس میں وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، اس لئے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنانا درست نہیں۔ یہود کے ان اقوال پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا، اور ان کا رد فرمایا کہ تمہارے اقوال درست نہیں کیونکہ سب سے پہلے عبادت کیلئے بننے والا گھر کعبہ شریف ہے جو مکہ میں ہے، سب سے زیادہ برکتیں بھی اسی میں ہیں، اور یہی تمام جہانوں کیلئے ہدایت ہے۔ (روح البیان)

اس آیت کریمہ اور اگلی آیت کریمہ میں کعبہ شریف کی افضلیت کو اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اس کی وضاحت انشاء اللہ بیان کی جا رہی ہے۔

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ﴾

”بیشک سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا لوگوں (کی عبادت) کیلئے وہ ہے جو مکہ میں ہے۔“

روایات اور ان میں تطبیق:

اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم من طريق الشعبي عن علي بن ابي طالب في قوله ان اول بيت وضع للناس للذي ببكة قال كانت البيوت قبله ولكنه كان اول بيت وضع لعبادة الله



ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے شعبی کی روایت سے حضرت علی بن ابی طالب ؓ کی روایت کو ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ﴾ (بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے) اس کو مطلب یہ ہے کہ عبادت کیلئے سب سے پہلے بننے والا گھر کعبہ شریف ہے جو مکہ میں ہے اگرچہ لوگوں کے رہائشی گھر اس سے پہلے بھی موجود تھے۔  
(ازدرمنثور)

❖ واخرج ابن جریج عن الحسن فی الآیة قال ان اول بیت وضع للناس بعد الله فی للذی بکة

ابن جریر نے حسن سے اس آیہ کریمہ کے متعلق ذکر فرمایا کہ بیشک سب سے پہلا گھر لوگوں کیلئے جو بنایا گیا کہ لوگ اس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں وہ مکہ میں ہے۔  
(ازدرمنثور)

❖ واخرج ابن ابی شیبہ واحمد وعبد بن حمید والبخاری والمسلم وابن جریر والبیہقی فی الشعب عن ابی ذر قال قلت یارسول الله الی مسجد وضع اول قال المسجد الحرام قلت ثم ای قال المسجد الاقصی قلت کم بینہما قال اربعون سنة

ابن ابی شیبہ اور احمد اور عبد بن حمید اور بخاری اور مسلم اور ابن جریر اور بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت ابوذر (غفاری) ؓ سے روایت ذکر کی آپ فرماتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ کونسی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ تو آپ نے فرمایا مسجد حرام، میں نے کہا پھر کونسی؟ آپ نے فرمایا پھر مسجد اقصی، میں نے کہا ان دونوں کے درمیان کتنا عرصہ کا فرق ہے؟ آپ نے فرمایا چالیس سال۔  
(ازدرمنثور)

❖ واخرج ابن المنذر عن ابی ہریرۃ قال ان الکعبۃ خلقت قبل الارض بالفی سنة وھی من الارض الماکانت حشفۃ علی الماء علیہما ملک کان من الملائکۃ یسبحان فلما اراد الله ان یخلق الارض دحاها منها فجعلها فی وسط الارض

ابن منذر نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت بیان فرمائی کہ کعبہ شریف کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا، جب کہ وہ پانی پر گول جزیرہ جھاگ کی صورت میں تھا، فرشتے اس کو تیراتے رہتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا زمین کو پیدا فرمانے کا تو اسے پھیلا دیا تو اسے وسط زمین میں رکھ دیا۔ (ازدرمنثور)

❖ واخرج ابن جریر وابن المنذر والطبرانی والبیہقی فی الشعب عن ابن عمرو قال خلق الله البیت قبل الارض بالفی سنة وکان اذا کان عرشہ علی الماء زبدۃ بیضاء وکانت الارض تحته کأنہا حشفۃ فدحیت الارض من تحته

حضرت ابن عمرو بن العاص فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا، جبکہ عرش پانی پر سفید



جھاگ کی صورت میں تھا، زمین اس کے نیچے چھوٹا سا گول جزیرہ نما تھی، اسی کے نیچے سے زمین کو پھیلا یا گیا۔ (ازدور منشور)

❖ واخرج البيهقي في الشعب عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ اول بقعة وضعت في الارض موضع البيت ثم مهدت منها الارض وان اول جبل وضعه الله على وجه الارض ابوقبيس ثم مدت منه الجبال

نبیہتی نے شعب ایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کو ذکر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک سب سے پہلے زمین کا ٹکڑا بیت اللہ شریف کی جگہ رکھا گیا، پھر اسی سے زمین کو پھیلا گیا، اور بیشک پہلا پہاڑ اللہ تعالیٰ نے زمین پر ابوقبیس رکھا پھر اس سے اور پہاڑ پھیلا دئے گئے۔ (ازدور منشور)

### روایات میں بظاہر اختلاف:

ایک روایت میں آرہا ہے کہ کعبہ شریف کو زمین سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا گیا، اور دوسری روایت میں آرہا ہے کہ کعبہ شریف اور بیت المقدس میں چالیس سال پائے جاتے ہیں، ان میں تطبیق کیسے پائی جائے، بظاہر تو تعارض نظر آتا ہے۔

**وجہ تطبیق:** ایک ہے کعبہ شریف کی ابتدائی تخلیق وہ یہ ہے کہ پہلے تمام پانی تھا، پانی پر ایک جھاگ پیدا کی گئی جو گول تھی، بہت چھوٹا سا ایک جزیرہ نظر آنے لگا، اسی جھاگ کو زمین کے وسط میں رکھا گیا، اور وہاں سے ہی زمین کو پھیلا یا گیا، یہ کعبہ شریف کی جگہ ہے جہاں سے زمین کو پھیلا یا گیا، جھاگ زمین کی تخلیق اور پھیلاؤ سے دو ہزار سال پہلے پیدا کی گئی، یہ کعبہ شریف کی جگہ کی تخلیق ہے، پھر کعبہ شریف حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں تعمیر ہوا۔ چالیس سال کا فاصلہ کعبہ شریف کی اس تعمیر کی بات ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا، اور بیت المقدس کی اس تعمیر کی بات ہے جو حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی، ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کعبہ شریف کی تعمیر اور بیت المقدس کی تعمیر جو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی ان میں بہت زیادہ فاصلہ پایا گیا۔ اگرچہ اسی سوال کا جواب ”کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کعبہ شریف کی تعمیر اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیت المقدس کی تعمیر میں تو بہت زیادہ فاصلہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کہ چالیس سال کا فرق ہے، یہ کیسے صحیح ہے؟

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یوں جواب دیا:

”واجب بان الوضع غير البناء والسؤال عن مدة ما بين وضعيهما لا عن مدة ما بين بناءيهما“



اس کا جواب یہ دیا گیا کہ:

”وضع“ اور چیز ہے، اور ”بناء“ (تعمیر) اور چیز ہے، نبی کریم ﷺ سے سوال وضع کے متعلق تھا ”بناء“ کے متعلق سوال نہیں تھا، اس لئے آپ نے جو چالیس سال کا ذکر فرمایا اس سے مراد کعبہ شریف کی جگہ کی تخلیق اور بیت المقدس کی جگہ کی تخلیق ہے، جن کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ تاریخ کعبہ تفصیلی طور پر پہلے پارہ نجوم الفرقان کی جلد سوم میں بیان ہو چکی ہے، تاہم اختصار کے طور روح المعانی کے ان الفاظ کو مد نظر رکھا جائے۔

”وحكى ان بناء الملائكة له كان من ياقوته حمراء ثم بناء آدم ثم شيث ثم ابراهيم ثم العمالقة ثم جرهم ثم قصي ثم قريش ثم عبد الله بن الزبير ثم الحجاج“  
بیان کیا گیا ہے کہ کعبہ شریف کو ملائکہ نے سرخ یا قوت سے بنایا، پھر آدم ﷺ نے تعمیر کی، پھر شیث ﷺ، پھر ابراہیم ﷺ نے پھر قبیلہ عمالقہ نے پھر جرہم قبیلہ نے، پھر نبی کریم ﷺ کے اجداد سے قصی نے، پھر قریش نے، پھر عبد اللہ بن زبیر نے، پھر حجاج نے تعمیر کی۔  
(روح المعانی)

”بکہ“ کی وجہ تسمیہ:

بک یک (ن) مزاحمت کرنا ”تباک القوم“ لوگوں کا بھیڑ کرنا، ہجوم کرنا (المنجد) اس معنی کی مناسبت سے مکہ شریف کو بکہ کہنے کی وجہ پر یہ روایات دلالت کر رہی ہیں۔

”واخرج سعيد بن منصور وابن جرير والبيهقي في الشعب عن مجاهد قال  
الما سميت بكة لان الناس يتباكون فيها الرجال والنساء يعني يزدحمون“  
سعيد بن منصور اور ابن جریر اور بیہقی نے شعب ایمان میں مجاہد کی روایت نقل کی کہ مکہ شریف کو بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہاں جانے اور طواف وغیرہ میں مرد اور عورتیں ازدحام کرتے ہیں۔ (ازدحام منثور)

(بھیڑ کرتے ہیں، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں) ”بک یک بکا“ کا اور معنی ہے ”پھاڑنا، صخ کرنا“ (المنجد) اس معنی کے لحاظ پر ایک اور روایت دیکھئے۔

”واخرج ابن ابي حاتم عن محمد بن زيد بن مهاجر قال انما سميت بكة لانها كانت تبك الظلمة“  
ابن ابی حاتم نے محمد بن زید بن مہاجر سے روایت نقل کی کہ مکہ کو بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم کے طور پر کعبہ شریف کو برباد کرنے کی کوشش کی ان کو تباہ و برباد کر دیا (یعنی چیر پھاڑ دیا)

اس معنی کو علامہ بیضاوی نے خوبصورت انداز میں یوں تحریر کیا ”او من بكها اذا دقه فانها تبك اعناق“



الجبابرة ” بکہ کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ ” بکہا ” سے معنوی طور پر ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے توڑ دینا، یہ بھی جابروں اور ظالموں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے اس لئے اسے ” بکہ ” کہا گیا۔ (بیضاوی)

”تدقہالم بقصدھا جبار الاقصمہ اللہ عز وجل“ جن جابروں اور ظالموں نے ارادہ کیا کعبہ شریف کو نقصان پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے ان کی گردنوں کو توڑ دیا۔ بظاہر اس پر یہ وہم پیش کیا گیا کہ حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مسجد حرام میں روک لیا تھا، جبل ابی قیس پر متخندق نصب کئے، اور وہاں سے محضروں کے گولے برسائے گئے جو مسجد حرام میں گرے، مسجد حرام کو نقصان پہنچا لیکن حجاج بن یوسف کی گردن نہیں ٹوٹی، تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ ” بکہ “ جابروں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا:

”فلیس ذلک اضرار بالبت وقصدا بالسوء لان مقصود الحجاج کان اخذ عبداللہ“ کہ حجاج بن یوسف کا مقصد بیت اللہ شریف کو نقصان پہنچانا نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد حضرت عبداللہ بن زبیر کو پکڑنا تھا، اگر وہ بیت اللہ شریف کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا تو اس کی گردن کو وہیں توڑ دیا جاتا۔

(ازروح البیان)

## مقام توجہ!

کعبہ شریف اور اس کے متصل ارد گرد کو ” بکہ “ کہا گیا ہے اور باقی مقامات کو مکہ کہا گیا ہے، اس پر چند

روایات ملاحظہ ہوں۔

❁ واخرج ابن ابی شیبہ وعبد بن حمید وابن ابی حاتم عن عکرمۃ قال البیت وماحولہ بکۃ وماوراء ذلک مکۃ

حضرت عکرمہ ؓ فرماتے ہیں بیت اللہ شریف اور اس کا ارد گرد ” بکہ “ ہے، اور اس کے سوا مقامات مکہ ہیں۔ (ازدرمنثور)

❁ واخرج سعید بن منصور وعبد بن حمید وابن ابی شیبہ وابن جریر وعن ابی مالک الغفاری قال بکۃ موضع البیت ومکۃ ماسوی ذلک

ابو مالک غفاری فرماتے ہیں بیت اللہ شریف کے مقام کو ” بکہ “ کہا جاتا ہے، اور اس کے سوا مقامات کو مکہ (ازدرمنثور)

❁ واخرج ابن جریر عن ابن شہاب قال بکۃ البیت والمسجد ومکۃ الحرم کلہ

حضرت ابن شہاب کی روایت میں یہ ہے کہ بیت اللہ شریف اور مسجد حرام بکہ ہیں اور باقی تمام حرم مکہ ہے۔ (ازدرمنثور)

❁ واخرج عبد بن حمید عن مجاہد قال بکۃ الکعبۃ ومکۃ ماحولہا



حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ کعبہ شریف کو بکہ کہا جاتا ہے، اور اس کے سواء باقی مقامات مکہ ہیں۔ (ازدر منشور)

واقف کی سوچ میں ابتدائی طور پر تو صرف بیت اللہ شریف یا مسجد حرام کو ہی بکہ کہا گیا، اور اس کے سواء مقامات کو مکہ کہا گیا، پھر عرف عام میں زیادہ مقام پر بکہ بولا جانے لگا، اس پر ایک اور روایت دیکھئے۔

❖ واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس قال مكة من الفج الى التنعيم وبكة من البيت الى التنعيم  
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مقام فج سے لے کر مقام تنعيم تک مکہ ہے، اور مقام تنعيم سے لے کر بیت اللہ شریف تک بکہ ہے۔ (ازدر منشور)

اور راقم کی سوچ یہ ہے کہ بعد میں عرف عام میں مکہ اور بکہ میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، پورے شہر کو مکہ بھی کہا گیا اور بکہ بھی کہا گیا، اس پر ایک روایت مشاہدہ ہو۔

❖ واخرج ابن جرير عن الضحاك قال بكة هي مكة  
ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ بکہ وہ مکہ ہی ہے۔ (ازدر منشور)

یعنی بکہ اور مکہ ایک ہی شہر کے نام ہیں، راقم نے اپنی سمجھ کے مطابق محاکمہ تیار کر دیا ہے۔ ”(اللہ اعلم بالصواب)“

”بکہ بمعنی ہجوم کرنا“ کے مطابق اور روایات:

❖ واخرج ابن ابی شيبه وعبد بن حميد والبيهقي عن مجاهد قال انما سميت بكة لان الناس يبك بعضهم بعضا فيها وانه يحل فيها ما لا يحل في غيرها“

ابن ابی شیبہ اور عبد بن حمید نے مجاہد سے روایت نقل کی کہ بکہ اس لئے نام رکھا گیا کہ بعض لوگ بعض پر ہجوم کرتے ہیں، کیونکہ اس میں بعض وہ کام جائز ہو جاتے ہیں جو دوسری جگہ پر جائز نہیں ہوتے۔ (ازدر منشور)

❖ قال قتادة رأيت محمد بن علي الباقر يصلي فمرت امرأة بين يديه فذهبت ادفعها فقال دعها فانها سميت بكة لان الناس يبك بعضهم بعضا امرأه بين يدي الرجل وهو يصلي والرجل بين يدي المرأة وهي تصلي لا بأس بذلك“

قتادہ کہتے ہیں میں محمد بن علی باقر کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ایک عورت ان کے سامنے سے گزرنے لگی تو میں اسے روکنے لگا آپ نے مجھے (اشارہ سے) کہا اس کو چھوڑ دیں، اس مقام کا نام بکہ رکھا گیا، کیونکہ لوگ بعض بعض پر ہجوم کرتے ہیں عورت مرد کے نماز پڑھتے ہوئے آگے سے گزر جاتی ہے، مرد عورت کے آگے سے گزر جاتا ہے، حالانکہ عورت نماز پڑھ رہی ہوتی ہے، یہاں کوئی حرج نہیں۔ (شیخ زادہ)



طلباء کے فائدہ کیلئے:

بکہ ایک لغت ہے مکہ میں، یعنی میم کی جگہ باء کو استعمال کیا گیا ہے، عرب حضرات کئی جگہ میم کے مقام پر باء کو استعمال کرتے ہیں ”لازب“ (چٹنا) کی جگہ ”لازم“ اور تیل والی جگہ کو نمیط کہا جاتا ہے، اس کی جگہ ”نمیط“ بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور امر راتب کی جگہ امر راتم بھی استعمال کرتے ہیں ”سمد رأسہ“ (سر کی گوند) کی جگہ سبدراسہ بھی استعمال کرتے ہیں۔  
(تفسیر ابی السعد)

مکہ کہنے کی وجہ:

❁ واما مکة سميت بذلك لقلة مائها من قول العرب مك الفصيل ضرع امه وامتك اذا امتص كل مافيه من اللبن

مکہ شریف کو مکہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پانی کم ہوتا تھا اس لئے اسے مکہ کہہ لیا گیا، یہ لفظ ماخوذ ہے مک الفصيل اور امتک الفصيل سے جب اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے تھنوں سے سارا دودھ پی لے۔ (معالم التنزیل للبغوی)

مکہ کہنے کی ایک اور وجہ:

”وقيل لانها تمك الذنوب ای تزیلها“ بعض حضرات نے کہا مکہ کو اس لئے مکہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہاں جا کر، عبادت کرنے والوں کے گناہوں کو زائل کرتا ہے۔ (خازن)

مکہ کا نام ام القرى:

”وسميت ام القرى لانها اصل كل البلدة“ مکہ شریف کو ام القرى بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام شہروں کا اصل ہے۔ (خازن)

مکہ کا نام ضراح:

قاموس میں ذکر کیا گیا ہے ”ان الضراح البيت المعمور فی السماء الرابعة“ ضراح اصل میں چوتھے آسمان پر بیت المعمور کو کہا جاتا ہے۔ (مدارک التنزیل للنسفی)

حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں سے کعبہ شریف کی بنیادوں کو تعمیر کرایا، پھر اس کے اوپر فرشتوں نے بیت المعمور کو رکھ دیا جو بعد میں طوفان نوح کے وقت اٹھالیا گیا ہے، اصل میں ”ضراح“ کعبہ کو کہا گیا، پھر مکہ کو بھی ضراح کہا گیا۔



مکہ کے نام:

مکہ، بکہ، البیت العتیق، البیت الحرام، البلد الامین، ام القرى، القادس (کیونکہ یہ گناہوں سے پاک کرتا ہے) المقدس، الحاطمة، الرأس، البلدة، البنية، الکعبة۔ (ابن کثیر وصابونی)

**فائدہ جلیلہ:** کعبہ شریف کی تعمیر کا حکم دینے والا اللہ تعالیٰ، اور رب تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا اور (آدم علیہ السلام) کے زمانہ کی بنیادوں کی نشاندہی کرنے والا) اور انجینئر جبریل علیہ السلام، اور تعمیر کرنے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کی معاونت کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام، یہی وجہ ہے ”قیل لیس فی العالم بناء اشرف من الکعبة“ کہ جہان میں کعبہ شریف سے اشرف اور بلند و بالا شان والا کوئی اور مقام نہیں تیار کیا گیا۔ (روح البیان)

﴿مُبَارَكًا﴾ ”برکت والا۔“

پیشک پہلا گھر جو بنایا گیا ہے لوگوں (کی عبادت) کیلئے، وہ جو مکہ میں ہے، برکت والا ہے۔ ”مبارک“ پر نصب ہے کیونکہ یہ حال واقع ہو رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کو برکت والا بنایا ہے اس میں اجر و ثواب زیادہ رکھا گیا ہے۔ بعض عبادات تو ادا ہی مکہ میں ہوتی ہیں جیسے حج اور ہدی کا ذبح کرنا، اور عمرہ ادا کرنا، اور بعض عبادات میں وہاں زیادہ ثواب ہوتا ہے جو دوسرے مقامات پر نہیں ہوتا جیسے وہ ادا کی ہوئی نماز اور روزہ اور اعتکاف کا نسبت دوسرے مقاموں کے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

”ومن ثم قال ابو يوسف رحمه الله من نذر ان يصلي في المسجد الحرام ركعتين لايجزئي عنه ان يصلي في غيره“

یہی وجہ ہے کہ امام یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے نذر مانی کہ وہ دو رکعت مسجد حرام میں ادا کرے گا تو اس کیلئے جائز نہیں کہ یہ دو رکعت کہیں اور ادا کرے۔

❁ لحديث انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ صلوة الرجل في بيته بصلوة، وصلوته في مسجد القبائل بخمس وعشرين صلوة وصلوته في المسجد الذي يجمع فيه بخمس مائة صلوة وصلوته في المسجد الاقصى بالف صلوة وصلوته في مسجدی بخمسين الف سنة وصلوته في المسجد الحرام بمائة الف صلوة (رواه ابن ماجه)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنے موقف پر یہ حدیث پیش کی جو ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد کی نماز گھر میں ادا کرنے پر ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے، اور اپنے قبیلہ کی مسجد



میں (جماعت سے ادا کرنے پر) پچیس درجہ اسے ثواب حاصل ہوگا، اور جامع مسجد میں نماز ادا کرنے پر پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے پر ایک ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اسے ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از مظہری و درمنثور)

(خیال رہے کہ ایک روایت میں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے سے دس ہزار نماز کا ثواب بھی مذکور ہے)

وروی الطحاوی عن عطاء بن الزبیر قال ﷺ صلوة فی مسجدی هذا افضل من الف صلوة فیما سواہ من المساجد الا المسجد الحرام و صلوة فی المسجد الحرام افضل من مائة صلوة فی هذا

طحاوی نے عطاء بن زبیر سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں نماز ادا کرنا اس کے سوا مساجد میں نماز ادا کرنے سے ہزار درجہ افضل ہے سوائے مسجد حرام کے، کیونکہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنا میری مسجد میں نماز ادا کرنے سے سو مرتبہ افضل ہے۔ (ماخوذ از مظہری)

امام ابو حنیفہ و امام محمد رحمہما اللہ کا موقف:

آپ فرماتے ہیں یہ مراتب جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں، ان کا تعلق فرضی نمازوں سے ہے نفلی نمازوں سے نہیں، تاکہ ایک اور حدیث ان فضائل والی حدیثوں کے متعارض نہ ہو، اس لئے کہ فضائل والی احادیث میں گھر کی نسبت مسجد میں نماز ادا کرنا افضل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ دوسری حدیث میں نوافل گھر ادا کرنا افضل قرار دیا گیا ہے، وہ حدیث یہ ہے۔

عن زید بن ثابت قال قال رسول اللہ ﷺ افضل الصلوة الصلوة المرء فی بیتہ الا المكتوبة

(رواہ البخاری و مسلم)

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد کا گھر نماز ادا کرنا افضل ہے سوائے فرض نمازوں کے۔ (از مظہری)

حدیث شریف سے واضح ہو گیا کہ فرض نماز مساجد میں ادا کرنا افضل ہے اور نوافل گھر میں ادا کرنا افضل ہیں، یہی حال مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی اور مسجد حرام کا بھی ہے۔

”واللہ اعلم بالصواب“

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اگر آرام و سکون سے نوافل گھر ادا کر سکے تو گھر ادا کرنا بہتر ہے، اگر گھر مسجد کی



طرح خشوع و خضوع نہ پایا جائے تو مسجد میں ادا کرنا بہتر ہے۔

❖ واخرج الازرقی والطبرانی فی الاوسط عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ ﷺ  
هذا البيت دعامة الاسلام من خرج يؤم هذا البيت من حاج او معتمر كان  
مضمونا على الله ان قبضه ان يدخله الجنة وان رده ان يردده باجر او غنيمة

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ بیت اللہ شریف اسلام کا ستون ہے، جو  
شخص اس بیت اللہ شریف کے ارادہ سے حج یا عمرہ کیلئے نکلا اور اس پر وفات آگئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے  
رکھا ہے کہ اسے جنت میں داخل کر دے، اور اگر وہ لوٹ آیا تو اللہ تعالیٰ اسے عظیم اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

❖ وروی ابن الجوزی فی فضائل مکه عن عبد اللہ بن عدی بن الحمراء انه سمع  
رسول اللہ ﷺ يقول وهو واقف بالحرورة فی سوق مکه واللہ انک لخیر ارض اللہ  
واحب ارض اللہ الی اللہ عزوجل ولولا الی خرجت منک ما خرجت  
ابن جوزی نے فضائل مکہ میں عبد اللہ بن عدی بن حمراء سے روایت ذکر کی کہ بیشک انہوں نے رسول اللہ ﷺ  
کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپ مکہ کے بازار مکہ حروراء میں کھڑے تھے ”قسم ہے اللہ تعالیٰ کی (اے  
بیت اللہ) بیشک اللہ کی زمین میں سے تو بہتر ہے، اور اللہ کی زمین میں سے تو اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، اگر  
میں نے تجھ سے ہجرت نہ کر لی ہوتی تو میں اب تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔“ (منقول از مظہری)

”وکلاروی ابن الجوزی عن ابی ہریرۃ مرفوعا“ اسی طرح ابن جوزی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی  
یہی حدیث مرفوعہ ذکر کی ہے۔ (مظہری)

### کعبہ شریف کی فضیلت کی چند وجوہ:

(۱) کعبہ شریف کی عمارت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائی جبکہ آپ کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور بیت  
المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں سے کرائی۔

”ولا شک ان الخلیل اعظم درجۃ واكثر منقبۃ من سلیمان علیہ السلام فمن  
هذا الوجه يجب ان تكون الکعبۃ اشرف من بیت المقدس“

جب یقینی طور پر یہ واضح ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا درجہ بلند ہے اور آپ کے فضائل زیادہ ہیں حضرت  
سلیمان علیہ السلام سے تو اسی وجہ سے حضرت خلیل اللہ کا تعمیر کردہ کعبہ افضل ہے بیت المقدس سے۔



(۲) کعبہ شریف کا متصل مقام ابراہیم ہے، مقام ابراہیم کی وجہ سے کعبہ شریف کو افضلیت حاصل ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، مقام ابراہیم یہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے تو یہ نرم ہو جاتا، آپ کے قدموں کے نشان اس میں قائم ہو گئے، آپ نے جب اس سے قدم ہٹائے تو اس میں وہی پتھر کی تختی آگئی ”فہذہ انواع من الآيات العجیبة والمعجزات الباهرة اظهرها الله سبحانه في ذلك الحجر“ یہ آیات عجیبہ اور معجزات باہرہ (روشن) اللہ تعالیٰ نے اس پتھر قائم میں کر دیے۔

(۳) صدیاں بیت گئیں، لاکھوں کی تعداد میں ہر سال لوگ حج کرتے ہیں، مقام منیٰ میں جمرات کو ماری جانی والی کنکریاں آج تک ختم نہیں ہوئیں۔

”وقد جاء في الآثار ان من كان حجة مقبولة رفعت حجارة جمراته الى السماء“ روایات میں آتا ہے کہ جس شخص کا حج مقبول ہو، اسکی جمرات کو ماری جانے والی کنکریاں آسمانوں کی طرف اٹھائی جاتی ہیں۔

(۴) پرندے اکٹھے جماعت (جھنڈ) کی شکل میں اڑتے آتے ہیں، لیکن کعبہ شریف کے قریب پہنچ کر دائیں، بائیں ہو جاتے ہیں، کعبہ شریف کے اوپر سے نہیں اڑتے۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی ﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ ”اے میرے رب اس مقام کو امن والا شہر بنادے“ رب تعالیٰ نے اس دعاء کو شرف قبولیت بخشا، یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئی درندہ کسی جانور کو شکار نہیں کرتا، ”وایضا کل من سکن مكة امن من النهب والغارة“ اور اسی دعاء کا یہ اثر آج تک جاری ہے کہ وہاں رہنے والے چوری، ڈاکہ، لوٹ مار سے محفوظ ہیں۔

(۶) ابراہہ اشرم نے جب ایک لشکر کی قیادت کی کہ (معاذ اللہ) کعبہ کو شہید کر دے تو قریش اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے کیونکہ وہ ہاتھیوں پر سوار تھے اور مسلح تھے، قریش نے مکہ کو چھوڑ دیا اور کعبہ کو ان کیلئے خالی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کیلئے چھوٹے چھوٹے پرندوں (ابابیل) کو بھیجا جو جماعت بعد جماعت آرہے تھے، حالانکہ وہ بہت چھوٹے چھوٹے پرندے تھے اور ان کی چونچوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھے جو جہنم کی آگ سے تیار کئے گئے تھے، ان کے ذریعے ہی انہیں ہلاک کر دیا۔

”وهذه آية باهرة دالة على شرف الكعبة وارهاس لنبوة محمد ﷺ“  
یہ واضح نشانی ہے جو کعبہ کی بزرگی پر دلالت کر رہی ہے اور نبی کریم ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے یہ آپ کا معجزہ ہے جسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)



## عجیب حکمت:

اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو ایسی وادی میں رکھا جہاں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی، اس میں چند حکمتیں ہیں۔

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کے رہنے والوں اور کعبہ شریف کے خدام کو دنیا کے اسباب سے تعلق توڑ کر صرف اپنی ذات پر توکل کرنے کا حکم دیا۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ وہاں جابر لوگ اور بادشاہ قابض نہ ہو جائیں، کیونکہ وہ تو عیش و عشرت چاہتے ہیں جب ان کو دنیا کی آسائش وہاں نظر نہیں آئے گی تو وہاں مستقل طور پر نظر نہیں ٹھہرائیں گے، بلکہ اس جگہ کو وہ چھوڑ دیں گے ”فالمقصود تنزیہ ذلک الموضع عن لوٹ وجود اهل الدنيا“ مقصد یہی تھا کہ اس جگہ کو دنیا داروں کے ملوث ہونے سے بچایا جائے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ اس جگہ کو خالص عبادت اور زیارت کے لئے مختص کرنا مقصود تھا کہ وہ تجارتی منڈی نہ بن جائے، بلکہ ضرورت کے مطابق اشیاء کی خرید و فروخت کی جائے۔

(۴) چوتھی حکمت اس میں یہ پائی گئی کہ وہاں کی زمین کو کھیتی باڑی کے قابل نہیں رکھا گیا تاکہ لوگوں کو یہ اشارہ دیا جائے کہ تم فقر کو ترجیح دو، اس سے تمہاری دنیا اور تمہاری آخرت امن و حفاظت میں ہوگی۔

(۵) پانچویں حکمت یہ پائی گئی کہ کعبہ شریف جس زمین میں ہے اسے کھیتی باڑی سے خالی رکھا گیا جس سے ایمان والوں کو یہ بتا دیا گیا کہ اگر تم رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دل کو اغیار کی محبت سے خالی رکھو تاکہ اس میں نور ایمان ضوء فکرن ہو سکے۔

﴿هُدًى الْعَالَمِينَ﴾ ”ہدایت ہے جہان والوں کیلئے۔“

کعبہ شریف کے ہدایت ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کعبہ شریف قبلہ ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو نماز کی ہدایت ملتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ شریف کی برکات و فضائل سے رب تعالیٰ کے صانع و مختار ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے، اور نبی کریم ﷺ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے، تمام وہ دلائل اور نشانیاں جن سے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے ان سے ہی اللہ تعالیٰ کے صانع و مختار، عالم و قدیر، حکیم و غنی ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے، اس لحاظ پر کعبہ شریف ﴿هُدًى الْعَالَمِينَ﴾ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کعبہ شریف جنت کی ہدایت دیتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطاء فرماتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)



فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ  
مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ٥ (آیہ نمبر ۹۷)

(۱) اس میں کھلی نشانیاں ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں آئے امان میں ہو اور  
اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے اور جو منکر ہو تو اللہ سارے جہان سے  
بے پرواہ ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) اس میں نشانیاں کھلی ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو شخص داخل ہو اس میں ہوگا  
امن میں، اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے، جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی،  
اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ کعبہ شریف اور اس کے مضافات میں بڑی کھلی نشانیاں موجود ہیں،  
وہاں مقام ابراہیم ہے، اور جو شخص وہاں داخل ہو جاتا ہے وہ امن میں ہو جاتا ہے، اور جس شخص کو وہاں تک جانے کی طاقت  
حاصل ہو، اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کیلئے بیت اللہ شریف کا حج کرے یعنی بیت اللہ شریف کا طواف کرے،  
کیونکہ طواف کرنا حج کے ارکان میں ایک رکن ہے، اور جس شخص نے حج کی فرضیت کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہو جائے، اس کے  
کفر کا اسے ہی نقصان ہوتا ہے، رب تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ تو جہان والوں سے بے پرواہ ہے۔

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ﴾

”اس میں نشانیاں کھلی ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ۔“

یہاں دو احتمال پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ کھلی نشانیوں سے مراد وہی ہوں جن کو فضیلت کعبہ میں ذکر کیا گیا  
ہے یعنی خوف کرنے والے کو وہاں امن مل جاتا ہے، مریض کو شفاء حاصل ہوتی ہے، کعبہ شریف کو شہید کرنے کی غرض  
سے آنے والے تباہ و برباد ہوتے ہیں، کعبہ شریف کے اوپر سے پرندے نہیں گزرتے، وغیرہا۔ اس لحاظ پر ”مَقَامُ  
إِبْرَاهِيمَ“ ماقبل کا بیان نہیں، بلکہ نیا جملہ ہے، اب مطلب یہ ہو گیا ”اس میں کھلی نشانیاں ہیں، اور مقام ابراہیم بھی ہے،  
ان تمام چیزوں کی وجہ سے کعبہ شریف کو اور زیادہ عظمت حاصل ہو گئی، جبکہ وہ خود بذاتہ بھی معظم و مشرف ہے۔“

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ“ تفسیر ہو ”آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ“ کی، اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا



اس میں کھلی نشانیاں ہیں، وہ مقام ابراہیم ہے۔

**اعتراض:** فان قيل الآيات جماعة ولا يصح تفسيرها بشيء واحد " یہ دوسرا احتمال درست نہیں نظر آتا کیونکہ "آیات" جمع ہے، اور "کہ" مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ " واحد ہے، واحد سے تفسیر جمع کی کیسے صحیح ہے؟

**پہلا جواب:** یہ ہے کہ "مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" اگرچہ واحد ہے لیکن آیات کثیرہ کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کے عالم ہونے پر دلالت کر رہا ہے، اور رب تعالیٰ کے صانع ہونے اور اس کے قادر ہونے اور اس کے ارادہ رکھنے اور اس کی حیات اور اس کے غنی ہونے اور اس کے منزہ (ہر عیب سے پاک) ہونے اور اس کے محدثات کے مشابہ ہونے سے پاک ہونے پر یہ معجزہ دلالت کر رہا ہے۔

"لمقام ابراهيم، وان كان شيئا واحدا لا اله الا الله لما حصل فيه هذه الوجوه الكثيرة كان بمنزلة الدلائل"

اگرچہ کہ "مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" ایک ہے لیکن جب اس سے کثیر چیزوں کا علم حاصل ہو گیا تو یہ کئی دلائل کے درجہ میں آ گیا۔  
**دوسرا جواب:** "ان مقام ابراهيم اشتمل على الآيات" یعنی دوسرا جواب یہ ہے کہ بیشک مقام ابراہیم چند آیات پر مشتمل ہے، لہذا حکم جمع میں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا ایک سخت پتھر میں قدموں کا نشان پڑ جانا یہ ایک نشانی ہے، اور قدموں کا ٹخنوں تک پتھر میں گڑ جانا یہ دوسری نشانی ہے۔ اور پتھر کا صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کی جگہ نرم ہونا اور ادھر ادھر سے سخت ہونا یہ تیسری نشانی ہے، اور مقام ابراہیم کا آج تک محفوظ رہنا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک علیحدہ معجزہ ہے، ورنہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ قرآن پاک کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کے معجزات ختم ہو گئے، لہذا مقام ابراہیم کا آج تک محفوظ رہنا یہ چوتھی نشانی ہے۔

"ثبت ان مقام ابراهيم عليه السلام آيات كثيرة" لہذا ثابت ہو گیا کہ "مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" کثیر آیات ہیں۔

**تیسرا جواب:** یہ ہے کہ زجاج نے کہا کہ صرف کہ "مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" آیات بینات کی تفسیر نہیں، بلکہ "مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ" کے ساتھ "وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا" بھی داخل ہے، دو چیزوں کا جمع پر اطلاق ہوتا رہتا ہے جیسا کہ "فَلَقَدْ صَفَتْ قُلُوبُنَا" میں استعمال ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "الاثنان فما فوقهما جماعة" دو اور دو سے اوپر ایک جماعت ہے۔

**چوتھا جواب:** جب ذکر فرمایا "فِيهِ آيَات" کہ اس میں کثیر آیات ہیں تو مثال کے طور پر دو کا صراحۃً ذکر



کر دیا کہ ان میں کثیر کھلی نشانیوں میں سے ”مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ“ بھی ہے اور جو وہاں داخل ہو وہ امن میں بھی رہتا ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)

”مَقَامُ اِبْرَاهِيمَ“ کی تفصیل پہلے پارہ ”وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ“ میں مکمل طور پر بیان ہو چکی ہے۔

﴿وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا﴾ ”اور جو شخص داخل ہوگا اس میں امن میں ہوگا۔“

حصول امن کی چند وجوہ:

❖ الاول ان من دخله للنسك تقربا الى الله تعالى كان آمنا  
امن حاصل ہونے کی پہلے وجہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے حج کرنے کیلئے گیا  
وہ عذاب سے محفوظ رہے گا، اللہ تعالیٰ کی امان میں آجائے گا۔  
(کبیر)

❖ واخرج عبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن يحيى بن جعدة بن  
هبيرة في قوله ومن دخله كان آمنا قال آمنا من النار  
یعنی بن جعدہ بن ہبیرہ کی روایت میں ہے کہ ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا“ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جو  
اس میں داخل ہوا وہ آگ سے محفوظ رہے گا۔  
(از درمنشور)

❖ واخرج البيهقي عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من دخل البيت دخل في  
حسنة وخرج من سيئة مغفورا له  
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بیت اللہ شریف میں آتا ہے اسے  
نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور برائیاں اس سے دور کر دی جاتی ہیں اور اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

(از درمنشور)

یعنی حج کرنے سے ثواب حاصل ہوگا، اور صفائے گناہ تو اس کے حج کرنے سے ہی مٹا دئے جائیں گے، اور  
اسے توبہ کی بھی توفیق عطا کر دی جاتی ہے تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ بچہ ماں کے پیٹ سے  
باہر آنے پر گناہوں سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ راقم نے یہ وضاحت جو کی ہے، یہ علامہ علی قاری رحمہ اللہ کی وضاحت  
کے مطابق کہ حج سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں، لیکن بعض حضرات کا  
قول یہ ہے کہ حج سے صغائر اور کبائر دونوں ہی معاف ہو جاتے ہیں۔ ”والله اعلم بالصواب“

❖ واخرج ابن المنذر عن عطاء قال من مات في الحرم بعث آمنا يقول الله ومن دخله  
كان آمنا



ابن منذر نے عطاء کی روایت بیان کی ہے کہ جو شخص حرم میں فوت ہو گیا اسے امن میں اٹھایا جائے گا، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ جو وہاں داخل ہوا امن میں ہوگا۔ (ازدر منشور)

واخرج البيهقي في الشعب عن جابر قال قال رسول الله ﷺ مات في احد الحرمين بعث آمنا“

بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت جابر کی روایت بیان کی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی حرمین میں سے کسی ایک میں وفات ہوگئی تو وہ امن میں اٹھایا جائے گا۔ (ازدر منشور)

یعنی جو شخص حالت ایمان میں مدینہ طیبہ یا مکہ مکرمہ میں فوت ہوا تو قیامت کے دن عذاب سے امن میں اٹھایا جائے گا۔

واخرج البيهقي في الشعب وضعفه عن سلمان قال قال رسول الله ﷺ مات في احد الحرمين استوجب شفاعتي وجاء يوم القيامة من الآمنين“

بیہقی نے شعب ایمان کے باب میں سلمان کی روایت ذکر کی، رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا جو شخص حرمین (حرم مکہ، حرم مدینہ) میں سے کسی ایک میں فوت ہوا وہ میری شفاعت کو پالے گا، اور قیامت کے امن والے لوگوں میں آئے گا۔ (ازدر منشور)

واخرج الجندی والبيهقي عن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ مات في احد الحرمين بعث من الآمنين يوم القيامة ومن زارني محتسبا الى المدينة كان في جوارى يوم القيامة“

انس بن مالک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کی حرمین میں سے کسی ایک میں وفات ہوگئی تو وہ قیامت میں امن میں ہوگا، اور جس نے میری زیارت کی ثواب کی غرض سے مدینہ طیبہ میں وہ قیامت کے دن میری پناہ میں ہوگا۔ (ازدر منشور)

(۲) والثاني بحتمل ان يكون المراد ما اودع الله في قلوب الخلق من الشفقة على كل من التجاء اليه ودفع المكروه عنه“

حصول امن کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے دلوں میں شفقت رکھ دیتا ہے کہ جو بھی کعبہ میں جائے اسے امن پہنچایا جائے اور اس سے مکروہات کو دور رکھا جائے۔ (کبیر)

یہ صرف انسان تک محدود نہیں بلکہ جانور بھی دوسرے جانوروں پر رحم کرتے ہیں ”وان الجارحة اذا قصدت صيدا فاذا دخل الصيد الحرم كفت عنه“ بیشک جب کوئی شکار کرنے والا، چیرنے پھاڑنے والا



جانور دوسرے جانوروں پر حملہ کرتا ہے تو وہ جانور جس پر حملہ کیا گیا اس نے حرم شریف میں پناہ لے لی، اس کے حرم شریف میں داخل ہوتے ہی حملہ آور جانور اس پر حملہ کرنے سے رک جاتا ہے کہ اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ نے الفت ڈال دی اور عناد و غضب اس کے دل سے نکال دیا گیا۔ (ماخوذ معالم التنزیل للبغوی)

(۳) وقیل المراد به ان من دخله عام عمره القضاء مع رسول الله ﷺ كان آمناً، كما قال الله تعالى "لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ"

اور بیان کیا گیا ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کے ساتھ عمرہ قضاء کرنے کیلئے جائے گا وہ امن میں رہے گا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ﴾ (سورۃ الفتح، آیہ نمبر ۲۷) "بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے اگر اللہ چاہے امن و امان سے۔" (معالم التنزیل للبغوی)

(۴) چوتھی وجہ اس میں یہ ہے:

"وقیل هو خبر بمعنى الامر تقدیره ومن دخله فامنوه كقوله تعالى "فَلَا رَفْثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ لِفِي الْحَجِّ" ای لا ترفثوا ولا تفسقوا"

کہ اگرچہ صیغہ خبر کے ہیں، لیکن معنی "نہی" والا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے اس امن دے دو، یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ہے: ﴿فَلَا رَفْثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ لِفِي الْحَجِّ﴾ (سورۃ البقرہ، آیہ نمبر ۱۹) "میں ہے، یہاں بھی اگرچہ بظاہر معنی خبر والا ہے، لیکن مراد امر ہے۔" (معالم التنزیل للبغوی)

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ایسا خوبصورت ترجمہ کیا ہے کہ اس میں خبر اور امر دونوں کی جھلک موجود ہے، "تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو، نہ کوئی گناہ، نہ کسی سے جھگڑا"

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس آیہ کریمہ میں زمانہ جاہلیت کے طریقہ کو رد کیا گیا ہے، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں کفار لوگ ایک دوسرے کو حرم میں بھی قتل کر دیتے تھے اور ایک دوسرے کے اعضاء کاٹ دیتے تھے، اس آیہ کریمہ میں ان سے ضمناً منع کیا گیا، گویا کہ مفہوم یہ ہو گیا "ومن دخل الحرم لا یصحر ضونه" جو حرم میں داخل ہو اس کا پیچھا نہ کرو، نہ اسے قتل کرو، نہ اس کے اعضاء کاٹو (چوتھی اور پانچویں وجہ قریب قریب ہی ہیں) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ اور جمہور مفسرین کرام نے یہی وجہ بیان کی ہے، (تاہم راقم کے نزدیک جمیع وجوہ ہی معتبر ہیں، جو تمام کی تمام ہی بیک وقت پائی جاتی ہیں) اسی مضمون کو ایک اور آیہ کریمہ میں بھی پیش کیا گیا ہے۔



”أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ“ (سورة العنكبوت، آية نمبر ۶۷)

”اور کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے رمت والی زمین پناہ بنائی اور ان کے آس پاس والے لوگ اچک لئے جاتے ہیں۔“

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف:

وقال ابوحنيفة رحمه الله معناه من دخله كان آمنا لا يجوز قتله، فمن وجب عليه القتل قصاصا او حدا خارج الحرم فالتجأ الى الحرم لا يستوفى منه لكنه لا يطعم ولا يبايع ولا يشارى حتى يخرج فيقتل، كذا قال ابن عباس

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ کا مطلب یہ ہے کہ حرم شریف میں کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا، یہ اس وقت جب کہ کسی نے حرم کے باہر قتل کیا اور اس پر قصاص لازم آگیا تو اسے حرم میں قصاص قتل نہیں کیا جائے گا، اسی طرح کسی نے حرم کے باہر کسی کے اعضاء کو عدا کاٹا، پھر وہ حرم میں آگیا تو اس کے اعضاء حرم میں نہیں کاٹے جائیں گے، اسی طرح اگر کسی نے حرم کے باہر کوئی جرم کیا اور پھر حرم میں آگیا تو اس پر حرم میں حد نہیں لگے گی، البتہ اس شخص سے خرید و فروخت منع کر دی جائے گی، اس تک کھانے پینے کی اشیاء نہیں پہنچنے دی جائیں گی تاکہ وہ حرم سے نکل جائے تو اس پر حد نافذ کر دی جائے، یا اسے قصاص قتل کر دیا جائے، اگر اس سے اعضاء کاٹنے کا قصاص لینا ہے تو اس کے اعضاء کاٹ دئے جائیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

وقال الشافعي وغيره يستوفى منه القصاص وان دخل فيه“ امام شافعی وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ باہر قتل کر کے یا اعضاء کاٹ کر، یا باعث حد جرم کر کے حرم میں پناہ لینے والے کو حرم میں ہی قتل کر دیا جائے، یا اس کے اعضاء کاٹ دئے جائیں، یا اس پر حد نافذ کر دی جائے، لیکن ہر صاحب علم و دانش امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے موقف کو اعظم ہی سمجھے گا۔

**اتفاقی مسئلہ:** ”واما اذا ارتكب الجريمة في الحرم يستوفى منه عقوبته“ جب کوئی شخص حرم میں

عی جرم کرے تو اس پر اس کے جرم کے مطابق حرم میں اسے سزا دی جائے، اس مسئلہ میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے، زیادہ تفصیل ”وَلَا تُقَابِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَابِلُوَكُمْ فِيهِ“ (البقرة) کی وضاحت کے ضمن میں دیکھئے۔

(ماخوذ از مظہری)



دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”وَمَنْ دَخَلَهُ“ میں ضمیر منصوب کو بعض مفسرین نے ”حرم“ کی طرف لوٹایا، اور بعض نے ”بیت“ کی طرف لوٹایا، البتہ جنہوں نے ”بیت“ کی طرف لوٹایا انہوں نے بھی مضافات کعبہ کو ساتھ ہی مراد لیا، اسلئے مقصد سب حضرات کا ایک ہی ہے کہ جو شخص حرم میں داخل ہوا وہ امن میں ہوگا۔

دینی طلباء کے فائدہ کیلئے ایک اور بحث:

بھی قانون ”طی الذکر“ کا جاری ہوتا ہے، جسے ”الذکر المطوی“ بھی کہا جاتا ہے، یعنی زیادہ چیزوں کا ذکر کیا جائے، پھر کسی حکمت کیلئے بعض کو ذکر کر کے بحث کو سمیٹ دیا جائے، وہی قانون یہاں بھی جاری کیا گیا، پہلے ذکر کیا گیا ”فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ“ اس میں کھلی نشانیاں ہیں، (یہ جمع ہے) پھر دو چیزوں کا ذکر کر کے بحث کو سمیٹ دیا گیا، وہ دو چیزیں یہ ہیں ”مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ“ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ حکمت اس میں یہ ہے کہ بتانا یہ مقصود تھا کہ نشانیاں تو بہت زیادہ ہیں، البتہ ان میں سے دو کا ذکر ان کی اہمیت اور افضلیت کے پیش نظر کر دیا گیا۔

”طی الذکر“ قانون کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی دیکھئے، آپ فرماتے ہیں ”حب الی من دنیا کم ثلاث الطیب والنساء وقرۃ عینی فی الصلوۃ“ مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور اپنی ازواج“ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، دو کا ذکر کر کے بحث کا لپیٹ دیا گیا، تیسری چیز کا ذکر نہیں کیا، حکمت اس میں یہ ہے کہ دو چیزوں کا ذکر کر کے اور تیسری کا ذکر نہ کر کے اشارہ یہ فرمایا کہ دنیا کا زیادہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دو کے ذکر کے بعد جملہ استینافیہ کے طور پر ذکر فرمایا ”وقرۃ عینی فی الصلوۃ“ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے،

”وقرۃ عینی فی الصلوۃ“ لیست من امور الدنیا وانما ہی من الامور الآخرة“ یعنی یہ خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ”وقرۃ عینی فی الصلوۃ“ امور دنیا کی تیسری چیز نہیں، کیونکہ یہ تو امور آخرت سے ہے، تیسری چیز کا ذکر ہی نہیں کیا۔ (مدارک التنزیل للنسفی، شیخ زادہ)

**تنبیہ:** ابھی جو حدیث پاک بیان کی، وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے مسند احمد اور نسائی میں ذکر کیا گیا ہے ”حب الی“ کے بعد ”من الدنیا“ کے الفاظ ابن جوزی کی روایت میں زیادہ کئے گئے۔ (مکتوبہ باب فضل الفقراء)



اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تیسری چیز کا بھی ذکر فرمایا، لیکن وہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں۔

وعن عائشة قالت كان رسول الله يعجبه من الدنيا لثلاثة الطعام والنساء والطيب

فاصاب الثنين ولم يصب واحدا صاب النساء والطيب ولم يصب الطعام

”رواہ احمد“ (مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، رسول اللہ کو دنیا کی تین چیزیں پسند تھیں طعام، اور اپنی ازواج، اور خوشبو، تو آپ نے ان میں دو پالیں اور ایک نہیں پائی، آپ نے ازواج اور خوشبو کو پالیا، لیکن آپ نے طعام نہیں پایا، ”ولم يصب الطعام الا بوصف القلة فاطلاق النفي للمبالغة“ طعام نہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وافر مقدار میں طعام نہیں پایا، اسی مبالغہ کی نفی ہے، اگرچہ قلیل طعام آپ کو حاصل رہا۔ (مرقاۃ)

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾

”اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی۔“

”وللہ“ اور اللہ کیلئے ”ان الفاظ مبارکہ سے یہ ثابت فرمایا کہ حج اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے ہو، اس میں دکھلاوا مقصود نہ ہو، اپنا چرچا کرنا مقصود نہ ہو، طلباء کرام یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ”للہ“ میں ”لام جار“ کا تعلق ”استقر“ مخذوف سے ہے یہ ظرف مستقر ہے۔

﴿عَلَى النَّاسِ﴾ لوگوں پر ”یہاں علی لزوم پر دلالت کر رہا ہے، جس سے پتہ چلے کہ معنی یہ ہے لوگوں پر لازم ہے، یعنی ”افترض علی الناس“ لوگوں پر حج کرنا فرض ہے۔ ”الناس“ پر الف لام عہد خارجی، جس سے مراد خاص لوگ ہیں، وہ خاص لوگ کون ہیں؟

”المراد بالناس الاحرار العقلاء البالغون فلا يجب الحج على المجانين والصبيان

لعدم اهليتهم للخطاب ولا على العبيد بالاجماع“

وہ خاص لوگ یہ ہیں کہ آزاد ہوں، عاقل ہوں، اور بالغ ہوں، ان لوگوں پر حج فرض ہے، پاگل لوگوں پر، بچوں پر حج فرض نہیں، کیونکہ وہ خطاب کے اہل نہیں، یعنی فرضیت کا خطاب عاقل و بالغ کو ہوتا ہے، اگرچہ دکان وغیرہ پر نابالغ بچے کو بھی بھیجا جاسکتا ہے اور غلام پر بھی بالاتفاق حج فرض نہیں۔

مسئلہ ۱: فلو حج الكافر او الصبي العاقل او العبد ثم اسلم الكافر وبلغ الصبي واعتق لعبد

يجب عليه حجة الاسلام ثانيا بالاجماع“



اگر کافر نے حج کیا، یا عاقل بچے نے حج کیا، یا غلام نے حج کیا، حج کرنے کے بعد کافر نے اسلام قبول کیا، اور بچہ بالغ ہو گیا، اور غلام آزاد کر دیا گیا تو ان پر دوبارہ حج فرض ہوگا، پہلا حج کافی نہیں، کافر اگرچہ حج کرتے تھے لیکن ان کا حج تو مقبول ہی نہیں، کسی عبادت کے مقبول ہونے کیلئے ایمان ضروری ہے، البتہ بچے اور غلام کا حج نقلی ہوگا، فرض حج بالغ ہونے کے بعد اور غلام کے آزاد کئے جانے کے بعد ہی ادا کیا جاسکے گا، یہ مسئلہ اجماع امت سے ثابت ہے، اور اجماع امت پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت تائید کر رہی ہے۔

عن ابن عباس ایما صبی حج ثم بلغ الحنث فعليه ان يحج حجة اخرى، وایما اعرابی حج ثم هاجر فعليه ان يحج حجة اخرى وایما عبد حج ثم اعتق فعليه حجة اخرى "رواه الحاكم" والمراد بالاعرابی الذی لم يهاجر من لم یسلم فان مشرکی العرب كانوا یحجون قال الحاكم صحیح علی شرط الشیخین ورواه ابن ابی شیبہ فذكر نحوه وروی ابو داؤد دمر سلا عن محمد بن كعب القرطبی وفی الباب عن جابر وسنده ضعیف وهذه الاحادیث تلتقہ الامة بالقبول والعقد علی مقتضاها الاجماع فجاز به تخصیص الكتاب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جو بچہ حج کرے، بعد میں بالغ ہو اس پر لازم ہے کہ وہ پھر (فرض) حج کرے، جو اعرابی حج کرے پھر ہجرت کرے اس پر (فرض) حج اور ادا کرنا لازم رہے گا، اور جو غلام حج کرے پھر اسے آزاد کر دیا جائے تو وہ (فرض) اور ادا کرے، اعرابی سے مراد مشرکین عرب ہیں جو حج کیا کرتے تھے اور "لم یهاجو" سے مراد "لم یسلم" ہے۔ یعنی مشرکین اگر اسلام لانے سے پہلے حج کریں اور بعد میں اسلام لائیں تو فرض حج ان کو پھر ادا کرنا پڑے گا۔ یہ حدیث حاکم نے بیان کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شرط تیخین پر صحیح ہے، اور اسی کی طرح ابن ابی شیبہ نے بھی حدیث ذکر کی ہے، اور ابو داؤد نے بھی محمد بن کعب قرطبی سے روایت کی ہے، اور اسی مسئلہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث مروی ہے اگرچہ اس کی سند ضعیف ہے، (لیکن دوسری احادیث کی وجہ سے متعدد طرق سے روایت کا درجہ اسے بھی حاصل ہے جو حسن لغیرہ کے درجہ میں ہے) یہاں سے ایک اعتراض بھی اٹھ گیا، وہ اعتراض یہ تھا کہ قرآن پاک نے تو حج کے فرض ہونے کو مطلق ذکر کیا ہے، تو عاقل، بالغ، آزاد، مسلمان ہونے کی قید درست نہیں۔ تو اس کا جواب واضح ہو گیا کہ یہ احادیث اجماع امت سے مقبول ہیں، اور اس مسئلہ پر اجماع امت ہے لہذا ان احادیث سے قرآن پاک کی آیہ کریمہ کی وضاحت کرنی درست ہوگئی۔ (ماخوذ از مظہری)



”اس گھر کا حج کرنا ہے۔“

﴿حَجُّ الْبَيْتِ﴾

ابو جعفر حمزہ، کسائی اور حفص کی قرأت میں صرف اسی مقام میں ”حج“ کی ”حاء“ کے نیچے کسرہ پڑھا گیا ہے، اور باقی قرآن پاک میں جہاں بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں ”حاء“ پر فتح پڑھا گیا ہے ”اہل نجد کی لغت میں کسرہ ہے، اور اہل حجاز کی لغت میں فتح ہے، یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں، اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ ”وفی المدارک انہ بالكسر اسم وبالفتح مصدر“ تفسیر مدارک التنزیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب کسرہ (زیر) سے پڑھا جائے تو یہ اسم، یعنی ذات حج، اور اگر فتح (زیر) سے پڑھا جائے تو مصدر ہے یعنی ”حج کرنا“ ”حج“ کا لغوی معنی ارادہ کرنا، اور اصطلاح میں خاص عبادت جس میں خاص مقامات کی زیارت اور مناسک حج ادا کرنے کا قصد پایا جاتا ہے۔ (ماخوذ از مظہری) حج فرض ہے:

اس میں اجماع امت ہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، مسلمانوں پر فرض ہے جب اس کی تمام شرائط پائیں جائیں۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ﷺ و اقام الصلوة و ايتاء الزکوة والحج وصوم رمضان (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، یہ گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور بیشک محمد اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا، اور حج کرنا، اور رمضان کا روزہ رکھنا۔ (ماخوذ از مظہری)

﴿مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ ”جو طاقت رکھے اس کی طرف راہ پانے کی۔“

استطاعت کی دو قسمیں، ایک استطاعت بنفسہ یعنی وہ آنے جانے پر قادر ہو، اور اس کے پاس واپسی تک کا خرچ ہو، اور سواری ہو۔ اور دوسری قسم ہے ”استطاعت بالغیر“ اگر خود حج نہ کر سکے کہ حج فرض ہو جانے کے بعد معذور ہو گیا، تو کسی اور کو خرچ دے کر حج کرا لے۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

خیال رہے کہ حج کی تفصیلی بحث دوسرے پارہ میں بیان کی جا چکی ہے، یہاں تو صرف اتنی چیزوں کو ذکر کیا جا رہا ہے جو مفسرین کرام نے آیہ کریمہ کی تفسیر میں نقل کی ہیں، اگرچہ بعض چیزیں وہی ذکر کی جا رہی ہیں جو دوسرے پارہ



میں ذکر ہو چکی ہیں، مفسرین کرام کی تابعداری کی وجہ سے راقم کی بھی مجبوری ہے کہ آیہ کریمہ کی وضاحت ضروری ہے۔

## حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے:

عن ابی ہریرۃ قال خطبنا رسول اللہ ﷺ فقال ایہا الناس قد فرض علیکم الحج فحجوا فقال رجل اکل عام یا رسول اللہ؟ فسکت حتی قالہا لثلاثا فقال رسول اللہ ﷺ لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم، ثم قال ذرونی ما ترککم فانما ہلک من کان قبلکم بکثرة سؤالہم واختلافہم علی البیانہم واذا امرتکم بشیء فانتم امنہ ما استطعتم واذا نہیتکم عن شیء فدعوه“ (رواہ احمد ومسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا، تو آپ نے فرمایا اے لوگو تحقیق تم پر حج فرض کر دیا گیا، تو تم حج کرو، ایک شخص اٹھے، عرض کیا، کیا ہر سال یا رسول اللہ؟ تو آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ آپ نے تین مرتبہ اسے (حج کی فرضیت) کو بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر میں ”نعم“ (ہاں) کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہ رکھتے، پھر آپ نے فرمایا تم مجھے چھوڑ دیا کرو جب میں تمہیں چھوڑ دوں، بیشک تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے کثیر سوال کئے اور اپنے انبیاء کرام سے اختلاف پیدا کئے، اور جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم اس پر عمل کرو جتنی تمہیں طاقت حاصل ہو، اور جب میں تمہیں کسی کام سے منع کر دیا کروں تو اس سے رک جاؤ۔

وعن ابن عباسؓ قال خطبنا رسول اللہ ﷺ فقال یا ایہا الناس ان اللہ کتب علیکم الحج، فقال اقرع بن حابس فقال یا رسول اللہ افی کل عام؟ فقال لو قلتہا لوجبت ولو وجبت لم تعملوا بہا ولن تسطيعوا ان تعملوا بہا، الحج مرة فمن زاد فهو تطوع۔

(رواہ احمد و ابو داؤد والنسائی وابن ماجہ)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو اقرع بن حابس کھڑے ہوئے عرض کیا، کیا ہر سال حج فرض کیا گیا یا رسول اللہ؟ تو آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا البتہ واجب ہو جاتا تم اس پر عمل کرنے کی طاقت نہ رکھتے، حج ایک مرتبہ فرض ہے جو زیادہ ہو گا وہ نفل ہو گا۔

(ابن کثیر و مظہری)

## استطاعت بالغیر کا مطلب:

اگر ایک شخص حج فرض ہو جائے، آنے جانے کا خرچہ موجود ہے، اور اہل و عیال کیلئے بھی خرچ موجود ہے،



اسے کوئی عذر لاحق نہیں، کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں، اس صورت میں اس پر حج فرض ہو گیا، اب تاخیر کی وجہ سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی، لہذا اسے چاہئے کہ وہ اپنے مال سے کسی سے حج کرائے جب خود کسی عذر کی وجہ سے آنے جانے سے قاصر ہو گیا، زندگی میں حج کرائے یا وصیت کر جائے کہ میرے مال میں سے میری طرف سے کسی کو حج پر بھیجنا، اب عام ہے کہ اس کا کوئی وارث اس کی طرف سے حج کرائے یا کوئی اجنبی شخص اگر اس نے وصیت نہیں کی تھی تو اب ورثاء پر واجب تو نہیں کہ کسی کو اس کے بدل میں بھیجیں، تاہم اگر چاہیں تو بھیج دیں، میت کو ان شاء اللہ نفلی حج کا ثواب ملے گا، اس حج سے فرض ساقط نہیں ہوگا۔

طلباء کرام! ابھی جو مسئلہ بیان کیا ہے تفسیر مظہری کی اس عبارت میں دیکھیں۔

”من استقر فی ذمتہ صحیحاً لم یطرا علیہ ضعف وزمالة فانه لا يستحط عنه الحج بل یسحب علیہ ان یحج عنه غیرہ من ماله مادام حیا او یوص به عند موته و اذامات ولم یحج یحج عنه وارثه او یحج عنه اجنبیاً من ماله ان شاء“ (مظہری)

اس مسئلہ کو کہ حج غیر کی طرف سے قضاء مثل غیر معقول ہے، قیاس سے تو ثابت نہیں، حدیث پاک پیش کی گئی جس سے یہ مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کان الفضل رد فی النبی ﷺ فجاءت امرأة من خنعم فجعل الفضل ينظر اليها وتنظر اليه وجعل النبی ﷺ يصرف وجه الفضل الى الشق الآخر فقالت يا رسول الله ان فريضة الله على عباده في الحج ادركت ابی شيخا كبيراً لا يستطيع ان يمسك على الرجل الفاحج عنه قال نعم، وفي رواية لا يستطيع ان يستوى على الرحلة فهل تقضى عنه ان احج عنه قال نعم وذلك في حجة الوداع“ (رواه البخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فضل (ابن عباس) نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی سواری پر سوار تھے، خنعم قبیلہ کی ایک عورت آئی، فضل اسے دیکھنے لگے وہ ان کو دیکھنے لگی، نبی کریم ﷺ نے فضل کا رخ دوسری طرف پھیر دیا، پھر اس عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حج فرض کر رکھا ہے، میں نے اپنے باپ کو بوڑھا پایا، جو طاقت نہیں رکھتے کہ وہ سواری پر سوار ہو سکیں، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کر لوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ دوسری روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ سوال حجة الوداع کے موقع پر کیا گیا، اس حدیث سے مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ اس شخص پر حج فرض ہو چکا تھا، جو بغیر کسی عذر کے تاخیر کی وجہ سے معاف نہ ہو سکا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی بیٹی کو اجازت دی کہ تم باپ کی طرف سے حج کر لو۔ (زیادہ درست قول یہی ہے) بعض حضرات نے کہا کہ وہ عورت اپنی خوشی سے



اپنے باپ کو نفلی حج کر کے ثواب پہنچانا چاہتی تھی، اس کی اجازت نے نبی کریم ﷺ سے اس نے طلب کی، تو آپ نے اسے اجازت دے دی۔  
”واللہ اعلم بالصواب“

عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لا تسافر المرأة لثلاث الا معها ذو محرم (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورت بغیر محرم کے تین دنوں کا سفر نہ کرے۔

وفی رواية المسلم لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر تسافر مسيرة ثلاث ليل الا ومعها ذو محرم

جو عورت اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے وہ بغیر محرم کے تین راتوں کا سفر نہ کرے۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے ”الامع زوج او محرم“ بغیر خاوند یا بغیر محرم کے سفر نہ کرے، ان

روایات سے واضح ہوا کہ عورت کا بغیر خاوند یا محرم کے حج کرنا جائز نہیں۔ (ماخوذ از مظہری)

جو عورتیں مصنوعی محرم بنا کر حج کرتی ہیں، وہ شریعت کی عدولی کرتی ہیں، اور پیسہ ضائع کرتی ہیں۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾

”اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ بے پرواہ ہے جہان والوں سے۔“

اس مقام پر ”وَمَنْ كَفَرَ“ سے مراد ہے ”وَمَنْ انكروا وجوب الحج“ جس نے وجوب حج کا انکار کیا۔

اخرج سعيد بن منصور وابن جرير عن الضحاك مرسل انه لما نزل صدر الآية جمع

رسول الله ﷺ ارباب المال فخطبهم وقال ان الله كتب عليكم الحج فحجوا فامنت به

ملة واحدة يعنى المسلمين وكفرت به خمس ملل يعنى المشركين واليهود

والانصارى والصابئين والمجوس فنزل ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾

ضحاك کی روایت میں آتا ہے کہ جب اس آیت کریمہ کا اول حصہ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے تمام دینوں

کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو خطبہ دیا، اور فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے، تم حج کرو ”آپ کے اس ارشاد

پر ایک گروہ یعنی مسلمانوں نے ایمان لایا (کہ حج کی فرضیت کو تسلیم کیا) اور پانچ گروہوں نے ایمان نہ لایا (وہ پانچ

گروہ یہ ہیں) یہود، انصاری، مشرکین، دہریے، مجوسی تو رب تعالیٰ نے نازل فرمایا ”وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ

الْعَالَمِينَ“ جس نے کفر کیا یعنی حج کا انکار کیا تو بیشک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں والوں سے بے پرواہ ہے۔

واخرج سعيد بن منصور عن عكرمة قال لما نزلت ومن يتبع غير الاسلام ديناً الآية قالت

اليهود فنحن مسلمون فقال لهم النبي ﷺ ان الله فرض على المسلمين حج البيت



فَقَالُوا لِمَ يَكْتُبُ عَلَيْنَا وَابْوَا انْ يَحْجُوا فَانْزِلِ اللَّهُ "وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"

اور وجہ ان الفاظ مبارکہ کے نازل ہونے کی حضرت عکرمہ کی روایت ہے جو سعید بن منصور نے بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں جب آیہ کریمہ نازل ہوئی ﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (سورۃ آل عمران آیہ نمبر ۸۵) "اور جو اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہے۔" تو یہود نے کہا ہم بھی مسلمان ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بیت اللہ شریف کا حج فرض کیا، وہ کہنے لگے ہم پر کوئی حج فرض نہیں، انہوں نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا "وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"

**تنبیہ:** حج کے فرض ہونے کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، اگر کسی پر حج فرض تھا اس نے حج نہیں کیا وہ گنہگار ہوا، کافر نہیں ہوا، اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی واضح موجود ہے۔

✽ اخراج عبد بن حمید فی تفسیرہ عن نقیع قال قرأ رسول الله ﷺ هذه الآية فقام رجل من هذیل فقال یا رسول الله فمن ترکہ فقد کفر قال من ترکہ لا یخاف عقوبته ولا یرجو ثوابه

عبد بن حمید نے اپنی تفسیر میں نقیع سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیہ کریمہ پڑھی تو ہذیل قبیلہ سے ایک شخص کھڑا ہوا، سوال کیا یا رسول اللہ! کیا حج نہ کرنے والا کافر ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا جس نے حج چھوڑ دیا اسے عذاب کا خوف نہیں اور وہ ثواب کی امید نہیں رکھتا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہے چاہے وہ تو اسے عذاب دے، چاہے تو اسے معاف کر دے، اس نے حج کی فرضیت کا انکار نہیں کیا، اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف نہیں رکھتا اور اس کے ثواب کی امید نہیں رکھتا ہاں اگر یہی چیز بوجہ انکار ہو تو کافر ہو جائے گا۔

✽ وعن علی بن ابی طالب من ملک زادا وراحلة یبلغه الی بیت الله ولم یحج فلاحیه ان یموت یهودیا او نصرانیا (رواہ العرمذی وضعفه)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص زادراہ کا مالک ہو گیا اور اسے سواری میسر ہو گئی پھر اس نے حج نہ کیا تو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (ماخوذ از مظہری)



- قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ۝ (آیہ نمبر ۹۸)
- (۱) تم فرماؤ اے کتابیو! اللہ کی آیتیں کیوں نہیں مانتے اور تمہارے کام اللہ کے سامنے ہیں۔ (کنز الایمان)
- (۲) آپ فرمادیجئے اے اہل کتاب! تم کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیات سے، حالانکہ اللہ مطلع ہے اس پر جو تم عمل کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

راقم اور روح البیان:

﴿وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ﴾ حال من فاعل تكفرون والمعنى لاى سبب تكفرون بآياته عز وجل والحال انه تعالى مبالغ فى الاطلاع على جميع اعمالكم وفى مجازاتكم عليها ولا ريب فى ان ذلك يسد جميع انحاء ما تاتون به ويقطع اسبابه بالكلية

(روح البیان)

راقم نے ترجمہ روح البیان سے لیا ہے، علامہ اسمعیل حقى رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ﴾ کے فاعل سے حال واقع ہے، معنی یہ ہے کہ کس سبب سے تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کامل طور پر تمہارے اعمال پر مطلع ہے اور تمہیں ان کی جزاء دے گا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمہاری تمام راہیں بند کر دے گا، اور اسباب کھل طور پر منقطع کر دے گا۔

آیہ کریم میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہود کے علماء کو خطاب ہو، کہ اے یہود کے علماء تم نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کو جاننے کے باوجود انکار کیوں کرتے ہو؟ اور ایک احتمال یہ ہے کہ آیات سے مراد مطلقاً اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں، اور خطاب تمام یہود و نصاریٰ کو ہے، یعنی اے یہودیو، اے نصرانیو تم قرآن پاک کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا کیوں انکار کرتے ہو۔ (خازن)

﴿وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ..... وَالشَّهِيدُ الْعَالِمُ الْمُطَّلِعُ﴾ ”شہید کا اس مقام پر معنی عالم، مطلع ہے“ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو، یا معنی یوں کیا جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ مطلع اس پر جو تم عمل کرتے ہو۔ (روح البیان)

اہل کتاب کو خطاب کی وجہ کیا؟

وتحصيص اهل الكتاب بالخطاب دليل على ان كفرهم اقبل لان معرفتهم بالآيات



اقوی وان زعموا انهم مؤمنون بالتوراة والانجیل فهم کافرون بهما“

اہل کتاب کے ساتھ خطاب کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بتانا مقصود یہ ہے کہ ان کا کفر زیادہ قبیح (برا) تھا کیونکہ یہ آیات کو زیادہ جانتے تھے (جونہی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتی تھیں) یہ اپنے گمان کے مطابق توراة و انجیل پر ایمان رکھتے، حالانکہ حقیقت میں توراة و انجیل سے کفر کرتے تھے۔ (بیضاوی)

﴿لَمْ تَكْفُرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ ”بآياته السمعية والعقلية“ آیات سے مراد عام ہے جو سمعی اور عقلی دونوں کو شامل ہے، یہ ان لوگوں کو تو بخ (ڈانٹ ڈپٹ) کیلئے کہا گیا، کہ اے اہل کتاب (یہود و نصاری) تم اللہ تعالیٰ کی آیات ”سمعیہ اور عقلیہ“ ”جونہی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت رہی ہیں“ کا انکار کیوں کرتے ہو؟ (بیضاوی)

اس آیت کریمہ سے یہود و نصاریٰ پر وعید شدید فرمائی کہ اے اہل کتاب تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، لہذا جو تم اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کرتے ہو وہ تمہیں جزا دے گا، اور تمہارا حق کو چھپانا تمہیں نفع نہیں پہنچائے گا۔ (مظہری)



قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٩﴾

(آیت نمبر ۹۹)

(۱) تم فرماؤ اے کتابیو! کیوں اللہ کی راہ سے روکتے ہو اسے جو ایمان لائے اسے ٹیڑھا کیا چاہتے ہو اور تم اس پر خود گواہ ہو اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) آپ فرمادیجئے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ان کو جنہوں نے ایمان لایا، ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا، حالانکہ تم گواہ ہو، اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

اس سے پہلی آیت کریمہ میں ذکر فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کی آیات ”جو صداقت رسول اللہ ﷺ پر دلالت کر رہی ہیں“ کا انکار کرتے ہیں، ان کا انکار کرنا بہت برا ہے کیونکہ وہ اللہ کی آیات کو اپنی کتاب میں پاتے ہیں،



علم کے ہوتے ہوئے انکار بہت بری چیز ہے۔

اب اس آیت کریمہ میں ان کو پھر خطاب کیا ”کدر الخطاب والا سفهام مبالغۃ فی التقریب و نفی العذر لهم واشعار بان کل واحد من الامرین مستقبح فی نفسه مستقبل با متجلاب العذاب“

اب اس آیت کریمہ میں ان کو پھر خطاب کیا اور ان سے ہی نبی کریم ﷺ کے ذریعے پوچھا، اے اہل کتاب ”یہود و نصاریٰ“ تم ایمان والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا، اس آیت کریمہ میں ان کو زیادہ توبیخ کی گئی، ان کے عذر پیش کرنے کی راہ کو مزید بند کر دیا گیا، اور یہ بتایا گیا کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستقل ذریعہ ہے، اور ان کا مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر چلانے کی کوشش یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو لانے کا مستقل ذریعہ ہے۔ ”مسبیل اللہ“ اللہ کی راہ سے مراد دین حق ہے، جس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہے اسلام، کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے اسلام پر چلو، یہود و نصاریٰ اسلام سے پھرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، مومنوں کو فتنے میں ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ یہ راہ راست سے کیسے پھر جائیں، مومنوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارنے کی اپنی طرف سے سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ (ماخوذ از بیضاوی)

وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ خود گمراہ ہیں، مومنوں کو بھی سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھی راہ پر چلا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہماری طرح ہی ہو جائیں۔

راقم اور بیضاوی رحمہ اللہ:

راقم نے ”تبغونہا عوجا“ کا ترجمہ بیضاوی کی اس عبارت سے لیا ہے ”تبغونہا عوجا“ حال من الواد ای باغین طالبین لہا اعوجاجا“ یعنی ”عوجا“ تبغونہا کی واو ضمیر سے حال واقع ہے، معنی یہ ہے ”ایسے حال میں کہ تم چاہتے ہو اس راہ کو ٹیڑھا کرنا“ یعنی تم مسلمانوں پر حق راہ کو غلط ملط کرتے ہو، ان کو وہم میں ڈالتے ہو کہ یہ راہ حق نہیں جس پر تم چل رہے ہو، اور نبی کریم ﷺ کی صفات کو بدل کر پیش کرنا تمہارا مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی ناکام کوشش ہے۔ (ماخوذ از بیضاوی)

﴿وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ﴾ ”حالانکہ تم گواہ ہو“

اس مقام میں ”وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ“ کے معنی میں چند احتمال پائے گئے ہیں۔

(۱) الاول قال ابن عباس رضی اللہ عنہما یعنی التم شہداء ان فی التوراة ان دین اللہ



الذی لا یقبل غیرہ ہو الاسلام“

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ”حالانکہ تم گواہ ہو“ کا مطلب یہ ہے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے لانے کا ذکر اور آپ کے اوصاف کا ذکر موجود ہے، آپ کا ایک وصف توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ کے تشریف لانے کے بعد صرف دین اسلام ہی مقبول ہوگا، باقی کوئی دین مقبول نہیں ہوگا، اس پر تم گواہ بھی ہو، پھر مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کا کیا مطلب؟

(۲) والثانی وانتم شهداء علی ظهور المعجزات علی نبوتہ ﷺ

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو ”وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ“ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات آپ کو رب تعالیٰ نے عطاء فرمائے، جن پر تم گواہ ہو، پھر مومنوں کو ایمان سے پھیرنے کی ناپاک جسامت تمہارے عملوں کو برباد کرنے کا ذریعہ ہے۔

(۳) الثالث وانتم شهداء انہ لا یجوز الصد عن سبیل اللہ“

تیسری وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہا گیا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے کسی کو روکنا حرام ہے، تو پھر ان کو تم روک رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے جس کام پر تم خود گواہ ہو، وہی کام تم کر رہے ہو۔

(۴) الرابع وانتم شهداء بین اہل دینکم عدول یظنون بالقوالکم ویعولون علی شہادتکم فی عظام الامور وہم الاخبار والمعنی ان من کان کذلک فکیف یلیق بہ الاصرار علی الباطل والکذب والضلال والاضلال“

چوتھی وجہ یہ بیان کی گئی کہ تم اپنے دین والوں کے نزدیک شاہد معتبر ہو کہ وہ تمہارے اقوال پر اعتبار کرتے ہیں اور تمہاری شہادت پر بڑے بڑے امور میں اعتبار کرتے ہیں، لیکن اس صورت میں خطاب یہود کے اہل علم کو ہے، معنی یہ ہوا کہ جب تم اپنے پیروکار لوگوں کے نزدیک معتبر گواہ ہو تو تمہارا باطل اور جھوٹ، گمراہ رہنے اور گمراہ کرنے پر قائم رہنا کس طرح تمہارے لائق ہے، یعنی لوگ تمہیں علم والا سمجھ کر تم پر اعتبار کرتے ہیں اور تمہیں اپنے بڑے بڑے امور پر گواہ بتاتے ہیں، تم تو خود بھٹکے پھرتے ہو اور مومنوں کو بھٹکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ (کبیر)

﴿وَمَا لِلَّهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ ”اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔“

کنز الایمان مطالب کا حقیقی ترجمان:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ دیکھئے ”اور اللہ تمہارے کوٹکوں سے بے خبر نہیں“ برے



اعمال کیلئے آپ لفظ ”کوٹکوں“ استعمال فرماتے ہیں، اور اچھے اعمال کیلئے لفظ عمل استعمال فرماتے ہیں، یہ فرق مطالب کو سمجھانے کیلئے بہت خوب ہے۔ ہماری زبان میں لفظ ”کوٹکوں“ استعمال نہیں، اس لئے ہم اس حسین اور تحقیقی ترجمہ کے کمال کو سمجھنے کے بغیر ہی گزر جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات سمجھ ہی نہیں پاتے، راقم نے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کر دیا ہے، تاہم کنزالایمان کے مطابق ہم اپنے استعمال الفاظ میں ترجمہ کرنا چاہیں تو یوں کر سکتے ہیں ”اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں“ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو دھمکی دی کہ تم رب تعالیٰ کی گرفت میں ہو، اس کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔ یہ ایسے ہی جیسے کسی شخص کا غلام اس کا حکم نہ مانے اور اس کے کہنے پر نہ چلے تو وہ اسے کہے ”لا ینحی علی مالت علیہ، ولست غافل عن امرک“ تم جس طریقہ پر ہو وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں، میں تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں، مطلب اس کا بھی یہ ہے کہ ”تم باز آ جاؤ ورنہ میں تمہیں شدید سزا دوں گا۔“

**عجیب حکمت:** اس سے پہلی آیت کریمہ ﴿وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ﴾ سے ختم کیا، اور اس آیت کریمہ ﴿وَمَا لِلّٰهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ سے ختم کیا، اس میں عجیب حکمت یہ پائی گئی کہ پہلی آیت کریمہ میں ان کے کفر کا ذکر فرمایا، ان کا کفر ظاہر تھا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ﴿وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ﴾ ذکر فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس آیت کریمہ میں ان کے مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی ناپاک جسارت کا ذکر فرمایا یہ کام یہ حیلے، بہانے سے کرتے تھے، تو اس کے مناسب رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿وَمَا لِلّٰهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں۔





يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ  
إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ۝

(آیہ نمبر ۱۰۰)

(۱) اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہنے پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر کر  
چھوڑیں گے۔ (کنز الایمان)

(۲) اے ایمان والو! اگر تم نے فرمانبرداری کی ایک فریق کی ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تو وہ  
تمہیں پھیر دیں گے تمہارے ایمان کے بعد حالت کفر میں۔ (نجوم الفرقان)

## شان نزول:

بہت طویل روایت کی وجہ سے ترجمہ پر اکتفاء کیا جا رہا ہے، عربی عبارت روح المعانی، در منشور، بیضاوی  
وغیرہ میں دیکھی جائے، یہ بھی خیال رہے شان نزول جو ابھی بیان کیا جا رہا ہے وہ روح المعانی اور در منشور نے ﴿يَا أَهْلَ  
الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ کی تفسیر میں بیان کیا ہے، اور علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اس زیر بحث  
آیہ کریمہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

✽ ابن اسحاق، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے زید بن اسلم سے روایت ذکر کی کہ مرثاس  
بن قیس ایک بوڑھا شخص تھا، زمانہ جاہلیت میں مسلمانوں کے خلاف شدید حسد رکھتا تھا، کفر میں بہت اونچا درجہ رکھتا تھا،  
مسلمانوں کے خلاف دل میں کھوٹ کینہ اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ایک مرتبہ یہ گذر رہا تھا تو اس نے اوس  
اور خزرج قبائل کے مسلمانوں کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے آپس میں باہم شیر و شکر دیکھا، اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اسلام  
نے ان میں کس طرح الفت و محبت پیدا کر دی، ورنہ یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے بہت بڑے دشمن تھے، ان کے  
درمیان بہت شدید جنگیں لڑی گئیں۔ وہ کہنے لگا بنی قیلہ کے یہ سردار آپس میں متحد و متفق رہے تو ہمارا کیا بنے گا، یہ تو ہم  
پر چھا جائیں گے ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس نے یہود کے چند نو جوانوں کو کہا تم ان کی مجلس میں چلے جاؤ، ان کو  
یوم بعات کی لڑائی یاد دلاؤ، اور اس جنگ کے متعلق کہے گئے اشعار ان دونوں کو سناؤ۔ بعات کا دن وہ دن تھا جس میں  
اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہوئی، فتح اوس کو حاصل ہوئی تھی، جب یہود کے نو جوانوں نے اس جنگ کے متعلق  
اشعار اس محفل میں پڑھے جس میں اوس و خزرج آپس میں محبت سے مل جل کر بیٹھے تھے، جب انہوں نے وہ اشعار



سنے، تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے، یہاں تک کہ اوس بن قنظلی جو اوس قبیلہ کے بنی حارثہ میں سے تھا، اور جبار بن صخر جو خزرج قبیلہ کے بنی سلمہ میں سے تھا، ان کے درمیان تکرار شروع ہو گئی، ایک دوسرے کے خلاف تیز زبانی کھل گئیں، معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ایک دوسرے فریق کو کہا گیا آؤ میدان جنگ میں نکلو، ایک مرتبہ پھر دو دو ہاتھ کرتے ہیں، پتہ چل جائے گا بہادر کون ہے، ہر فریق اپنی اپنی بہادری بیان کر رہا ہے، دوسرے کو طعنہ دے رہا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے ہتھیار لے کر مقام حرہ میں پہنچ گئے، وہی زمانہ جاہلیت کے مطابق ایک دوسرے کو آواز کئے لگے، آؤ ہمارے مقابل تمہیں پتہ چل جائے، ادھر مصطفیٰ کریم ﷺ کو پتہ چلا، تو آپ چند مہاجرین صحابہ کرام کو ساتھ لے کر ان کے مقابلہ میں میدان جنگ میں پہنچ گئے اور ارشاد فرمایا۔

”یا معشر المسلمین اللہ اللہ بدعوی الجاہلیۃ وانا بین اظہر کم بعد اذہدا کم اللہ الی الاسلام واکرمکم بہ و قطع بہ عنکم امر الجاہلیۃ و استقل کم بہ من الکفر و الف بہ بینکم ترجعون الی ما کنتم علیہ کفارا فعرف القوم انہانزحہ من الشیطان و کیدمن عدوہم لہم فالقوا السلاح وبکوا و عانق الرجال بعضهم بعضا ثم انصرفوا مع رسول اللہ ﷺ سامعین مطیعین قد اطفأ اللہ عنہم کید عدوا اللہ شامس“

اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، کیا تم زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر عمل کر رہے ہو، جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور اس کے بعد جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ہدایت دی اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے مکرم بنایا ہے، اور تم سے جاہلیت کو دور کر دیا ہے، اور تمہارے درمیان الفت و محبت ڈال دی، کیا تم پھر کفر کی طرف لوٹنا چاہتے ہو؟ (العیاذ باللہ) اب قوم کو بات سمجھ آ گئی کہ ہمارے درمیان اختلافات کو بھڑکانے والا شیطان کا دوسوہ تھا، اور ہمارے دشمن کا مکر و فریب تھا، انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے اب وہ پھر ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے، اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ واپس لوٹ آئے، آپ کے ارشادات کو (دل و جان سے) سن رہے تھے، آپ کی فرمانبرداری میں مشغول ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دشمنی کی وہ آگ نکال دی جو اللہ کے دشمن شاس یہودی نے بھڑکائی تھی، پہلی دو آیات ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ سے لے کر ﴿وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ تک شاس بن قیس اور اس کے فعل کے متعلق نازل ہوئیں۔ اور یہ زیر بحث آیہ کریمہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا﴾ سے لے کر ﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ تک آیات اوس بن قنظلی اور جبار بن صخر اور ان کے ساتھیوں اور ان کے افعال کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا کر ان کو لڑنے پر آمادہ کر لیا۔ (ماخوذ از درمنثور)



پہلی دونوں آیتوں میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو ڈرایا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کیوں کفر تے ہو، اور دوسری آیت میں ان کو کہا گیا کہ تم مسلمان کو راہ راست سے ہٹانے کی ناپاک جسارت کیوں کر رہے ہو؟ ان دونوں آیتوں میں یہود و نصاریٰ کو کہا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے، اب اس آیت کریمہ میں مومنوں کو ڈرایا گیا کہ اگر تمہیں یہود و نصاریٰ بھٹکانے کی کوشش کریں تو بھٹک نہ جانا، اگر وہ تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو گمراہ نہ ہو جانا بلکہ ان کی باتوں کی طرف توجہ بھی نہ کرنا۔ (کبیر)

رب تعالیٰ نے مومنوں کو اس لئے متنبہ کیا:

”ان المؤمنین ان لاوا قبلوا منهم قولهم ادى ذلك حالا بعد حال الى ان يعودوا كفارا والكفر يوجب الهلاك في الدنيا والدين“

کہ بیشک مؤمنین نے اگر یہود و نصاریٰ کے سامنے نرمی کا مظاہرہ کیا، اور ان کی باتوں کو مان لیا تو وہ آہستہ آہستہ انہیں کافر بنا دیں گے، اور کفر ان کا دین اور ان کی دنیا برباد کر دے گا، آج ہم دیکھتے ہیں یہود و نصاریٰ کے یار مسلمانوں اور اسلام کے غدار نظر آتے ہیں، اور قادیانی اور نیچری بن کر اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے۔

”الحفظ الامان“

کافروں کے یار جب کافر بن گئے تو ان کا دین تو برباد ہونا عقل میں آتا ہے، لیکن ان کی دنیا کیسے برباد ہو جاتی ہے؟ بظاہر تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کافروں سے پیسے بٹورنے کیلئے ہی تو ان کے ہمنوا بنے اور یہود و نصاریٰ اپنے یاروں کو بہت مالی امداد کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے۔

”واما في الدنيا فبوقوع العداوة والبغضاء وهيجان الفتنة وثوران المحاربة المؤدية الى سفك الدماء“

دنیا ان کی اس طرح برباد ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن بن جاتے ہیں، اور مسلمانوں سے بغض شروع کر دیتے ہیں، وہ فتنہ بھڑکا دیتے ہیں، وہ لڑائی کو بھڑکاتے ہیں، جس سے مسلمانوں کا ہی خون بہاتے ہیں۔ (کبیر)

آج کل ہم علماء رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ وجوہ کو دیکھتے ہیں تو سو فیصد سچی نظر آرہی ہیں، کل تک جن لوگوں کو مجاہد کہتے کہتے زبانیں نہیں تھکتی تھیں، آج ان کو ہی نام نہاد مسلمان قتل کر کے اپنے دین و دنیا برباد کر رہے ہیں۔



ایک عجیب نکتہ:

اگرچہ آیہ کریمہ اوس اور خزرج کے حق میں نازل ہوئی جو اسلام لانے اور باہم شیر و شکر ہو جانے کے بعد یہود سے سازش سے ایک دوسرے سے لڑنے کیلئے جنگ میں اتر آئے، لیکن ضمنیہ خطاب تمام مومنین کو ہے۔  
 ”وَخَاطَبَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى بِنَفْسِهِ بَعْدَ مَا أَمَرَ رَسُولَهُ ﷺ بِخُطَابِ أَهْلِ الْكِتَابِ أَظْهَرَ الْجَلَالَةِ  
 قَدَرَهُمْ وَأَشْعَارَ أِهْلَانَهُمْ هُمْ الْآحْقَاءُ بَأَنْ يَخْطُبَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى وَيَكْلَمَهُمْ فَلَا حَاجَةَ إِلَى أَنْ  
 يَقَالَ الْمُخَاطَبُ لِلرَّسُولِ ﷺ بِتَقْدِيرِ قُلْ لَهُمْ“

اللہ تعالیٰ نے جب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو خطاب کیا تو نبی کریم ﷺ کے ذریعے ارشاد فرمایا ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ﴾ آپ فرمادیجئے اے اہل کتاب“ یعنی وہ ذلیل لوگ ہیں اس لئے اے میرے محبوب میں ان سے براہ راست بات نہیں کرنا چاہتا، اسلئے آپ کو کہتا ہوں ”قُلْ“ آپ ہی ان کو فرمادیں، لیکن جب مومنوں کو خطاب کرنے کی باری آئی تو درمیان میں ”قُلْ“ کا واسطہ نہیں رکھا، یہ نہیں کہا کہ اے محبوب آپ مومنوں کو کہہ دیں، اگرچہ مومنوں تک بھی رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہی بات تو پہنچی لیکن ان کو جلیل القدر سمجھتے ہوئے رب تعالیٰ نے اس قابل سمجھا کہ ان کو براہ راست کہا جائے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”اے ایمان والو!“ (روح المعانی)

”فَرِيقًا“ سے مراد اگرچہ بظاہر ”شمال بن قیس“ یہودی مراد ہے، لیکن عموم لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مراد تمام ہی کافر ہیں، کہ تمام کفار یہی چاہتے ہیں کہ مومنین بھی ہماری طرح کافر ہو جائیں۔ (روح المعانی)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”كَافِرِينَ“ ترکیبی لحاظ پر یا تو ”مفعول“ ہے، اور ”يُرْذَوُكُمْ“ تصحیر کے معنی کو متضمن ہے کہ ”وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے“ اور یا ”حال“ واقع ہے، مفعول سے، اس صورت میں معنی ہو ”وہ تمہیں لوٹا دیں گے حالت کفر کی طرف“ مفعول والا معنی لینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں ایمان والوں کی طرف ان کے پہلے کفر کی نسبت بھی نہیں، مطلب یہ ہے کہ ”اے ایمان والو اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک فریق کی تابعداری کی تو وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے“ لیکن اگر حال والا معنی ہو تو ایمان والوں کا پہلا کفر واضح ہوگا اب مطلب یوں ہوگا ”اے ایمان والو اگر تم نے اہل کتاب میں سے ایک فریق کی تابعداری کی تو وہ تمہیں کفر کی طرف لوٹا دیں گے، اور پہلا معنی لینا اس لئے بھی زیادہ معتبر ہے کہ خطاب عام ہے، اس لئے جدی پشتی ایمان والوں کو جب خطاب ہوگا تو دوسرا معنی بغیر تاویل کے درست ہی نہیں ہوگا۔ (ماخوذ از روح المعانی بوضاحت)



وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

(آیہ نمبر ۱۰۱)

(۱) اور تم کیونکر کفر کرو گے تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول تشریف لایا، اور جس نے اللہ کا سہارا لیا تو ضرور وہ سیدھی راہ دکھایا گیا۔ (کنز الایمان)

(۲) اور تم کیسے کفر کرو گے حالانکہ تلاوت کی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اس کے رسول موجود ہیں، اور جس نے سہارا لگایا اللہ سے تو تحقیق ہدایت دی گئی اسے سیدھی راہ کی۔ (نجوم الفرقان)

”کیف“ اس مقام میں تعجب انکاری کے ہے ”کہ تم کیسے کفر کرو گے“ تمہاری شان کے لائق نہیں کہ تم کفر تک پہنچ جاؤ۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا حسین و جمیل ترجمہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے ”اور تم کیونکہ کفر کرو گے“ اور یوں ترجمہ نہیں کیا ”اور تم کیونکر کفر کرتے ہو“ کیونکہ یہ خطاب تو اوس اور خزر ج کے مسلمان صحابہ کرام کو ہے جو قحطی طور پر یہود کی سازش سے ایک دوسرے کے سامنے لڑائی کیلئے جمع ہو گئے، ان کو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم یوں ہی یہود کی سازش کا شکار ہوتے رہے تو وہ تمہیں آہستہ آہستہ کافر بنادیں گے، تم بھلا کیسے کافر ہو گے؟ نہیں نہیں تم کافر نہیں ہو گے تم پر اللہ کے نبی براہ راست اللہ تعالیٰ کی آیات کو تلاوت کر رہے ہیں، خود بنفس نفیس رسول اللہ ﷺ تمہارے درمیان موجود ہیں، لہذا تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ پر سہارا لگاؤ، جس نے اللہ تعالیٰ پر سہارا لگایا اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔

**اعتراض:** وكلمة كيف تعجب، والتعجب انما يليق بمن لا يعلم السبب وذلك على الله محال“

کلمہ ”کیف“ تعجب کیلئے ہے، اکثر مفسرین کرام نے یہی لکھا ہے تعجب تو وہاں ہوتا ہے جہاں اسباب کا علم نہ ہو کہ یہ کیسے ہو گیا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ پر اسباب کا مخفی رہنا محال ہے، تو اس مقام میں ”کیف“ کا تعجب کے معنی میں استعمال کس طرح درست ہے؟

**جواب:** والمراد منه المنع والتغليظ وذلك لان تلاوة آيات الله عليهم حالا بعد حال مع كون الرسول فيهم الذي يزيل كل شبهة ويقرر كالحجة كالمانع من وقوعهم في الكفر، فكان صدور الكفر عن الذين كانوا بحضرة الرسول ابعد من هذا الوجه“



اس مقام میں ”کَيْفَ“ صرف تعجب کیلئے نہیں کہ اعتراض وارد ہو سکے، بلکہ تعجب اور انکار کیلئے ہے، یعنی استفہام انکاری کیلئے ہے جو تعجب پر دلالت کر رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات ان پر وقتاً فوقتاً (آہستہ آہستہ بوقت ضرورت) تلاوت کی جارہی ہیں، خصوصاً وہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کر رہی ہیں وہ ان پر رسول اللہ ﷺ تلاوت کر رہے ہیں، اور آپ خود ان میں تشریف فرما ہیں، ان کے شبہات کو آپ خود زائل کر رہے ہیں، ان پر دلائل قائم کر رہے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ان کو کفر سے روکا جا رہا ہے، پھر ان کا رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یہود کی سازش کا شکار ہو جانا اور آہستہ آہستہ کفر کی طرف پہنچ جانے کا امکان بعید تھا، اب واضح ہو گیا کہ ”کَيْفَ“ استفہام انکاری کیلئے ہے ضمناً تعجب بھی پایا گیا ہے، لہذا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر)

اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ان پر پڑھا جانا اور نبی کریم ﷺ کا ان مؤمنین میں موجود ہونا کفر سے عقلاً بعید ہے ”ووجود هاتين الحالتين تنافي الكفر ولا تجامعه“ یہ دونوں چیزیں کفر کے مخالف ہیں، اس لئے ان میں کفر کا پایا جانا منع تھا ”فلا يتطرق اليهم كفر مع ذلك“ صحابہ کرام پر قرآن پاک کی آیات کا پڑھا جانا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ کفر ان کے قریب کھٹک بھی نہیں سکتا۔

فرق واضح ہو گیا:

اگرچہ یہاں بھی ﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ﴾ ہے، اور ﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمُوتًا﴾ میں بھی ﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ﴾ ہے، لیکن ﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمُوتًا﴾ میں خطاب حقیقت میں کفار کو ہے، لہذا وہاں کفر کا سرزد ہونا حقیقی طور پر پایا گیا ہے، لیکن اس آیت کریمہ خطاب مؤمنین کو ہے ”ولیس المعنی انه وقع منهم الکفر فوبخوا علی وقوعه لانیهم مؤمنون ولذلك نودوا بقوله ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ اس آیت کریمہ میں یہ معنی نہیں کہ جن کو خطاب ہے ان سے کفر واقع ہوا اور ان کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ دی گئی ہو، بلکہ یہ خطاب تو مؤمنین کو ہے، جس پر پچھلی آیت کریمہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے، جس کی ابتداء ہی ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے کی گئی ہے۔ (البحر المحیط)

البحر المحیط کی اس طویل بحث کو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں خوبصورت انداز پر سمودیا ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

**مقام توجہ:** والخطاب قال الزجاج لأصحاب النبي ﷺ خاصة لأن النبي ﷺ

كان فيهم وهم يشاهدونه وقيل لجميع الأمة لأن آلاؤه وسنة فيهم وإن لم يشاهدوه



آیہ کریمہ میں خطاب براہ راست تو آپ کے صحابہ کرام کو ہے کہ آپ ان میں تشریف فرما تھے، اور وہ آپ کا مشاہدہ کر رہے تھے، لیکن بالواسطہ خطاب آپ کی تمام امت کو ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے آثار اور آپ کی سنتیں آپ کی تمام امت میں موجود ہیں، اگرچہ براہ راست نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام کے بعد والے لوگ مشاہدہ تو نہیں کر رہے، لیکن آپ کے آثار اور آپ کی سنتیں گویا کہ آپ کے مشاہدہ پر ہی دلالت کر رہی ہیں۔  
(ماخوذ از البحر المحیط)

﴿وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾  
اور جس نے سہارا لگایا اللہ سے تو تحقیق ہدایت دی گئی اسے سیدھی راہ کی۔

”ومن يعتصم بالله“ ومن يتمسك بدینہ اویلتجنى الیہ فی مجامع امورہ“

بیضاوی رحمہ اللہ نے دو معنی بیان کئے ہیں کہ یا تو ”ومن يعتصم بالله“ کا معنی یہ ہے ”ومن يتمسك بدینہ“ اور جس اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے پکڑا تو تحقیق اسے سیدھی راہ دی گئی، اور یا اس کا معنی یہ ہے ”ومن يلتجنى الیہ فی مجامع امورہ“ جس نے اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے پناہ پکڑی تو اسے سیدھی راہ کی ہدایت دی گئی۔ اس کی مزید وضاحت دیکھئے:

”الاعتصام هو الاستمساک بالشئ واصله من العصمة بمعنى المنع والعاصم المانع واستعصم فلان بالشئ اذا تمسك بالشئ فی منع نفسه عن الوقوع فی آفة واعتصم الرجل بصاحبه لزمه وتمسك به فی الامتناع عما يضر والعصمة المنع يقال عصمة الطعام ای منعه من الجوع“

اعتصام کا معنی ہے ”کسی چیز سے سہارا لگانا“ اصل میں عصمت کا معنی ہے منع کرنا، اور عاصم کا معنی ہے ”منع کرنے والا“ اسی طرح کہا جاتا ہے ”استعصم فلان بالشئ“ فلاں شخص نے ایک چیز سے سہارا لگا کر اپنے آپ کو گرنے سے یا کسی مصیبت میں پھنسنے سے بچا لیا۔ ”عصمة“ کا معنی ہے منع کرنا، جیسے کہا جاتا ہے ”عصمة الطعام“ طعام نے اس کی بھوک کو روک دیا۔

اب اس تفصیل کے بعد یہ سمجھا جائے کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے جو دو معانی بیان کئے اس کی وجہ کیا ہے؟  
”وبالجملة لابد فی الاعتصام من ملاحظة معنى التمسك والتمسك بالله تعالى حقيقة لا يتصور فلابد ان يقدر مضاف وهو الذين اويجعل الاعتصام بالله استعارة للالتجاء الیہ بان يشبه الالتجاء بالتمسك“



حاصل کلام یہ ہے کہ ”اعتصام“ کا معنی ہے سہارا لگانا، جیسا کہ کسی دیوار وغیرہ سے سہارا لگایا جائے، اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے تمسک (سہارا لگانا) نہیں پایا جاسکتا، اس لئے یا تو ضروری ہے کہ حذف مضاف والا قانون پایا جائے، معنی ہو جائے ”ومن يعتصم بدين الله“ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین سے سہارا لگاتا ہے تو تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی، اور یا مجازی طور پر ”اعتصام“ کا معنی ”التجاء“ کر لیا گیا ہے، سہارا لگانے کا مطلب ہے پناہ پکڑنا، اب اس معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا ”اور جس نے پناہ پکڑی اللہ تعالیٰ کی تو تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔“ (شیخ زادہ)

### دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

وجيء في الجواب بقدر دلالة على التحقيق والتوقع فان كلمة قد سواء دخلت على الماضي او المضارع لا بد فيها معنى التحقيق ثم انه ينضاف في بعض المواضع الى هذا المعنى في الماضي التقريب من الحال مع التوقع اى يكون مصدره متوقعا لمن يخاطبه واقعا عن قريب كما تقول لمن يتوقع ركوب الامير، قدر كعب، اى حصل عن قريب ما كنت تتوقعه، ولا شك ان المعتصم بالله متوقع لهدايته وقوله لامحالة اشارة الى ما في قد من معنى التحقيق

”فقد هدى“ میں لفظ ”قد“ لایا گیا ہے، جو تحقیق اور توقع کا معنی دیتا ہے، لفظ ”قد“ خواہ ماضی پر داخل ہو یا مضارع پر، اس میں تحقیق کا معنی ضرور پایا جاتا ہے، یعنی مضارع پر داخل ہو کر تقلیل کا معنی بھی پایا جاتا اور تحقیق کا بھی ”قد یحیی“ کا معنی ہوگا تحقیق وہ کبھی کبھی آئے گا، اور ماضی پر داخل ہو تو تحقیق کے ساتھ ساتھ اس میں کبھی کبھی ”توقع“ کا معنی بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جائے ”قدر کعب“ جس کے سوار ہونے کی توقع تھی تحقیق وہ قریب زمانہ میں سوار ہو گیا، اب اس تمہید کے بعد معنی یہ ہوا ﴿وَمَنْ يُعْتَصِم بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ اور جس نے اللہ تعالیٰ پر سہارا لگایا اسے توقع تھی کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اسے سیدھی راہ کی ہدایت حاصل ہوگئی، تحقیق اسے سیدھی راہ کی ہدایت دے دی گئی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

### اہلسنت وجماعت کا مذہب:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے، جو اس آیت کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے ”فلما جعل ذلك الاعتصام فعلا لهم وهداية من الله ثبت ما قلناه“ جب اللہ تعالیٰ سے سہارا لگانا بندوں کا فعل ہے اور



ہدایت اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوتی ہے تو اس سے ہمارا مذہب ثابت ہو گیا۔

### معتزلہ کا مذہب:

وہ کہتے ہیں بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، وہ اس آیت کریمہ کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں کبھی کہیں گے ہدایت کا مطلب زیادہ رحمت، کبھی کہیں گے ہدایت کا معنی ہے جنت کی راہ، کبھی کہیں گے ہدایت کا معنی اچھے فعل کی تخلیق کی ان کو توفیق دی جاتی ہے، اور کبھی کہیں گے یہ خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سہارا لگانے والوں نے اپنے اچھے اعمال کی تخلیق خود کر لی۔

(ماخوذ از کبیر)



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۰۲)

- (۱) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔ (کنز الایمان)
- (۲) اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا، اور ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

پچھلی آیت کریمہ میں بیان کیا کہ یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں تمہیں اسلام سے پھیر دیں، اسلئے ان کی سازشوں سے ہوشیار رہنا، گمراہ کرنے کی ان کی سازش کو ناکام بنادینا، تاکہ تم دین پر قائم رہ سکو، اور گمراہی سے بچ جاؤ، اب اس آیت کریمہ میں تمام طاعات پر قائم رہنے کا حکم دیا، تفسیر کے الفاظ یہ ہیں ”لما حذرهم تعالى من اضلال من يريد اضلالهم امرهم بجميع الطاعات“ (البحر المحیط)

”اے ایمان والو!“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾

یہ ترجمہ جو نقل کیا گیا ہے، یہ مختصر ہے، ورنہ کُل الفاظ کا ترجمہ یہ ہے (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو) پچھلی آیت کریمہ میں بھی خطاب ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے کیا، یہاں دوبارہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب کیا، جس



سے مسلمانوں کی شرافت و بزرگی کو ظاہر کیا گیا ہے، خاص کر کے جب پچھلی آیت کریمہ ”اتقوا الكتاب“ ذکر کیا گیا، تو وہم ہوتا تھا کہ شاید یہود و نصاریٰ تو ”اہل کتاب“ ہیں وہ ہم سے کہیں افضل نہ ہوں، تو اس وہم کا ازالہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے کر دیا، (اے ایمان والو) یقینی بات ہے، ایمان مکمل اسی وقت ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی رسالت اور قرآن پاک پر بھی ایمان لائے گا، تو گویا ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہ کر نبی کریم ﷺ کے ایماندار لوگوں کو بتایا گیا کہ تم تمام امتوں سے افضل ہو، اسلئے کہ تمہارے نبی سب نبیوں سے افضل ہیں، اور تمہاری کتاب سب کتابوں سے افضل ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی بالوضاحت)

﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ ”ڈرو اللہ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا۔“

اس آیت کریمہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ الفاظ مبارکہ منسوخ ہیں، اور دوسرا یہ کہ یہ منسوخ نہیں، جن حضرات نے کہا ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ ”منسوخ ہیں، انہوں نے کہا کہ اس میں روایات موجود ہیں جن سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ (کیر)

✽ اخرج ابن المبارك في الزهد وعبد الرزاق والفريابي وعبد بن حميد وابن ابى شيبة وابن جرير وابن المنذر وابن ابى حاتم والنحاس في التاسخ والطبراني والحاكم وصححه وابن مردويه عن ابن مسعود في قوله ”اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ“ قال ان يطاع فلا يعصى ويذكر فلا ينسى ويشكر فلا يكفر“

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (موقوف حدیث) بیان فرماتے ہیں ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے، اور اس کو شکر ادا کیا جائے، اس کی نعمتوں کا کفران (ناشکری) نہ کی جائے۔ (ماخوذ از درمنثور)

✽ واخرج الحاكم وصححه وابن مردويه من وجه آخر عن ابن مسعود قال قال رسول الله ﷺ (اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ) ان يطاع فلا يعصى وان يذكر فلا ينسى“

حاکم نے مستدرک میں حدیث بیان کی جسے اس نے صحیح قرار دیا اور ابن مردویہ نے بھی ایک اور سند سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، اس کی نافرمانی نہ کی جائے، اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے۔ (ماخوذ از درمنثور)



❖ واخرج عبد بن حميد عن عكرمة (اتقوا الله حق تقاته) قال ان يطاع فلا يعصى وان يذکر فلا ينسى قال عكرمة قال ابن عباس فشق ذلك على المسلمين فانزل الله بعد ذلك فاتقوا الله ما استطعتم“

عبد بن حمید نے حضرت عکرمہ سے روایت نقل کی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد کیا جائے اس کی یاد کو چھوڑا نہ جائے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس (ؓ) نے فرمایا کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں کا اس پر عمل کرنا شاق گذرنا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تو تم اللہ سے ڈرو جب تک تم طاقت رکھتے ہو۔ (ماخوذ از درمنثور)

❖ واخرج ابن مردويه عن ابن عباس في قوله (اتقوا الله حق تقاته) ان يطاع فلا يعصى فلم يستطيعوا قال الله تعالى فاتقوا الله ما استطعتم“

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے جیسا کہ اس کی اطاعت کا حق ہے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے، تو صحابہ کرام کو اس پر عمل کرنے کی طاقت حاصل نہ ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تو اللہ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ (ماخوذ از درمنثور)

### صحابہ کرام پر عمل شاق کیوں گذرا؟

❖ واخرج ابن ابي حاتم عن سعيد بن جبیر قال لما نزلت هذه الآية اشتد على القوم العمل فقاموا حتى ورمت عراقهم وتفرحت جباههم فانزل الله تخفيفا على المسلمين فاتقوا الله ما استطعتم فنسخت الآية الاولى“

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کی روایت نقل کی کہ جب آیت کریمہ ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ نازل ہوئی تو قوم (صحابہ کرام) کا اس پر عمل کرنا مشکل ہو گیا (کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق یوں ادا کیا) کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کھڑے ہو کر شروع کی یہاں تک کہ ان کے پاؤں سوج گئے، ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر تخفیف کیلئے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ”تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی طاقت رکھتے ہو“ اسی سے پہلی آیت ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ منسوخ ہو گئی۔ (از درمنثور)



بعض حضرات نے اس آیہ کو منسوخ نہیں مانا:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) الاول ما روى عن معاذ انه رضی اللہ عنہ قال له هل تدري ما حق الله على العباد؟ قال الله

ورسوله اعلم قال هو ان يعبدوه ولا يشركوا به شيئا "وهذا مما لا يجوز ان ينسخ"

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ (یعنی اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) اس حق کا کیا مطلب ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں (یہ حکم منسوخ نہیں) کیونکہ نہ اس کی عبادت کو چھوڑنے کی اجازت ہے، اور نہ ہی اس سے شریک ٹھہرانے کی اجازت ہے۔

(۲) والثاني ان معنى قوله "اتقوا الله حق تقاته" اي كما يحق ان يتقى وذلك بان يجتنب جميع معاصيه

ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے کہ تمام معاصی سے اجتناب کرو، اگر آیہ کریمہ کو منسوخ مانا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ بعض معاصی کی اجازت دے دی گئی (معاذ اللہ) ایسا تو ہو نہیں سکتا لہذا آیہ کریمہ منسوخ نہیں ہو سکتی۔ (ماخوذ از کبیر)

**محاکمہ:** دونوں قولوں میں محاکمہ اور تطبیق پائی گئی ہے، کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ جب

﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، کہ تم ساری ساری رات قیام اور سجود میں گزار دو جس سے ان کے پاؤں پر ورم آگیا اور ان کی پیشانیاں زخمی ہو گئیں، اس معنی کے لحاظ پر ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ سے منسوخ ہے۔ اور اگر معنی یہ لیا جائے کہ تم اپنی طاقت کے مطابق اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو آیہ کریمہ منسوخ نہیں، اتنا مسئلہ واضح ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ (راقم)

**اعتراض:** فان قيل اليس انه تعالى قال ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "انہوں



نے اللہ کی قدر نہیں جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا، اس سے پتہ چلا کہ مؤمنین نے اللہ تعالیٰ کی قدر کرنے کا جو حق تھا اس طرح قدر نہیں کی، اور دوسری بات یہ سمجھ آئی کہ ”تکلیف مالا یطاق“ جائز ہے، اسی وجہ سے طاقت سے زائد قدر کرنے کا گویا کہ حکم دے کر کہا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ قدر کرنے کا حق تھا۔

**جواب:** قلنا سنبین فی تفسیر هذه الآیة انها جاءت فی القرآن فی ثلاثة مواضع

وكلها فی صفة الكفار لا فی صفة المسلمين

﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾ کی مکمل تفسیر تو اپنی اپنی جگہ آئے گی ان شاء اللہ، البتہ اجمالی جواب یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن پاک میں یہ الفاظ مبارکہ تین جگہ پر آئے ہوئے ہیں، ہر جگہ میں کافروں کے حق میں یہ نازل ہوئے ہیں مسلمانوں کے حق میں کہیں بھی نازل نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

حقیقت یہی ہے کہ فتنہ و فساد کی جڑ ہی یہ ہے کہ کافروں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کو مسلمانوں پر

چسپاں کیا جائے۔

## ۱ ظہار تشکر:

اللہ تعالیٰ کا ان گنت مرتبہ شکر ہے کہ راقم اپنے ذہن سے کوئی چیز تحریر کر دیتا ہے پھر اسے کسی تفسیر سے تائید حاصل ہوتی ہے، دینی مدارس کے میرے پیارے طلباء کرام آئیے! تفسیر خازن کی عبارت کو دیکھیں اور راقم کے محاکمہ کو دیکھیں لفظ بلفظ مطابق پائیں گے۔

”و موجب هذا الاختلاف يرجع الى معنى الآية فمن قال انها منسوخة قال حق تقاته هو ان ياتى العبد بكل ما يجب لله ويستحقه فهذا يعجز العبد عن الوفاء به فتحصيله ممتنع ومن قال بانها محكمة قال ان حق تقاته اداء ما يلزم العبد على قدر طاقته فكان قوله تعالى ”فاتقوا الله ما استطعتم“ مفسر الحق تقاته لانا سحا ولا مخصصا، فمن اتقى الله ما استطاع فقد اتقاه حق تقواه“ (خازن)

﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ ”اور ہرگز تم نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔“

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ کی ایک ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہے، اس کے مطابق مطلب یوں ہو گیا ”ولا



تکونن علی حال سوی حال الاسلام اذا درککم الموت“ اور ہرگز نہ ہونا کسی حال پر سوائے حالت اسلام کے جب تمہیں موت پائے۔ لفظوں کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا ”اور ہرگز تم نہ مرنے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو“

(مدارک التنزیل للنسفی)

پہلا معنی:

”ولا تموتن“ جمع مذکر مخاطب نہی حاضر معلوم مؤکد بانون تاکید ثقیلہ ہے، لیکن امر کے معنی کو مستلزم ہو، یعنی ﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے ”کونوا علی الاسلام فاذا ودد علیکم الموت صا دفکم وانتم علی الاسلام“ تم اسلام پر قائم رہو، جب تمہارے پاس موت آئے تو وہ تمہیں اسلام پر قائم پائے۔

(خازن)

”ولا تموتن الا وانتم مسلمون“ ای حافظوا علی الاسلام فی حال صحتکم و سلامتکم لتموتوا علیہ فان الکریم قد اجرى عادته بکرمه ، انه من عاش علی شئی مات علیہ ومن مات علی شئی بعث علیہ فعیاذ باللہ من خلاف ذلک“

”تم ہرگز نہ مرنے مگر یہ کہ تم مسلمان ہو“ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی صحت اور سلامتی کے حال میں اسلام کی حفاظت کرو، اسلئے کہ رب کریم کی عادت کریمہ یہ ہے کہ جو شخص کسی عمل پر دنیا کی زندگی میں ہوتا ہے اسے اسی حال پر موت دیتا ہے، اس لئے انسان اسلام پر قائم رہے تاکہ موت اسی پر آئے، ایسا نہ ہو“ العیاذ باللہ“ کہ اسلام سے دور رہ کر کفر پر اس کی موت آجائے، انسان کی یہی بڑی بد قسمتی ہے۔

(ماخوذ از صابونی)

دوسرا معنی:

وقیل معناه ”ولا تموتن الا وانتم مسلمون“ مخلصون مفضون الی اللہ امورکم لحسنون الظن به عزوجل“

اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”ہرگز تم نہ مرنے مگر یہ کہ تم مسلمان ہو“ کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری موت ایسی حالت میں آئے کہ تم خلوص سے اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو، اور اللہ تعالیٰ پر اچھا گمان رکھو۔ (خازن)

☆ روی الامام احمد عن مجاهد ان الناس كانوا يطوفون بالبیت وابن عباس جالس معه محجن فقال قال رسول الله ﷺ ايها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن الا وانتم مسلمون ولو ان قطرة من الزقوم قطرت في دار الدنيا لافسدت علی اهل



الدنیا معاشهم فکیف بمن لیس له طعام الا الزقوم“

(رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجہ) (ماخوذ از صابونی، ابن کثیر و خازن)

امام احمد رحمہ اللہ نے مجاہد کی روایت نقل کی کہ بیشک لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے حضرت ابن عباس وہاں بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے ہاتھ میں ایک ٹیڑھی نوک والا عصا تھا، آپ فرما رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو“ (اس سے پتہ چلا کہ جہنم میں جہنمیوں کی خوراک تھور کے درخت سے بھی ڈرتا رہے) اگر اس تھور کا ایک قطرہ زمین پر ڈال دیا جائے تو تمام زمین کی معیشت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے، تو کیسا حال ہوگا اس شخص کا جس کو اس تھور کے بغیر کوئی اور طعام نہیں ملے گا۔

❖ وقال الامام احمد عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ من احب ان يزحزح عن النار ويدخل الجنة فلتدر كه منيته وهو يؤمن بالله واليوم الآخر ويأتي الى الناس ما يحب ان يؤتى اليه“

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص جہنم کی آگ سے دور رہنا چاہتا ہے اور جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس کے پاس موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اور لوگوں کیلئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

(ماخوذ از صابونی و ابن کثیر)





وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ  
أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ  
النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (آیہ نمبر ۱۰۳)

(۱) اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو  
جب تم میں بیر تھا اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی  
ہو گئے اور تم ایک غار و دوزخ کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچا دیا اللہ تم سے یونہی  
اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے کہ کہیں تم ہدایت پاؤ۔ (کنز الایمان)

(۲) اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر، اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو، اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو  
تم پر ہیں، جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈالی تمہارے دلوں میں، تو  
ہو گئے تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی، اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے  
پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے نکالا، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو  
تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

### مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ کے دین اسلام اور قرآن پاک پر مضبوطی سے قائم رہو، جس طرح رسی سے کوئی سہارا لے کر اپنے  
آپ کو گرنے سے بچا لیتا ہے ایسے ہی تم اپنے آپ کو راہ راست سے پھسلنے سے بچانے کیلئے دین اسلام اور قرآن پاک  
کا مضبوطی سے سہارا لو، اور تمام مسلمان اس پر متفق ہو جاؤ، حق راہ میں کوئی تفرقہ بازی پیدا نہ کرو، جیسا کہ یہود و نصاریٰ  
نے ایک دوسرے سے اختلاف رکھے، ایسے اختلاف آپس میں نہ رکھو، تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو کہ تم آپس میں  
ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت  
ڈال دی جس کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، اور جب تم کافر تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے تھے  
اسی وقت تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے ایک کنارے پر تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان عطا فرما کر اس آگ سے نکال



کر بچالیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

**شان نزول:** یہ خطاب بھی اوس اور خزرج کے قبائل کو ہے جن کا ذکر پہلے سے آ رہا ہے، تو ان کے متعلق ہی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔  
(روح البیان)

﴿وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ ”اور تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر“

”حَبْلُ“ کے مختلف معانی بیان کئے گئے، تاہم تمام کا مقصد ایک ہی ہے، وہ ہے دین اسلام اور قرآن پاک۔

”والحبل لفظ مشترک واصلہ فی اللغة السبب الذی یوصل بہ الی البغیة والحاجة“

”حَبْلُ“ لفظ مشترک ہے، اصل لغت میں اس کا معنی سبب ہے جو مقصد اور حاجت تک پہنچائے۔

اور کندھے اور گردن کے درمیان پٹھوں کو بھی حبل کہا جاتا ہے، اور ریتلے مقامات کو بھی حبل کہا جاتا ہے، جیسے ایک

اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا۔ ”والله ما ترکت من حبل الا وقفت علیہ فهل لی من حج“ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی

میں نے کوئی ریگستان اور ریتلے ٹیلے نہیں چھوڑے مگر یہ کہ میں ان پر ٹھہرا ہوں، کیا میرا حج ہو گیا (آپ نے فرمایا ہاں ہو گیا)

(یعنی حدیث شریف میں لفظ حبل استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے ریتلے ٹیلے، ”حَبْلُ“ کا معنی ”وعدہ“ بھی ہے، اور حبل کا

معنی رسی بھی ہے، یہ بھی اصل میں کنوئیں میں ڈول پہنچانے اور پانی نکالنے کا ذریعہ ہے، یہ سب لغوی معانی ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟ اس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔

**حبل اللہ بمعنی قرآن:**

وروی ذلک بسند صحیح عن ابن مسعود واخرج غیر واحد عن ابی سعید الخدری

قال قال رسول اللہ ﷺ کتاب اللہ حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت مسند صحیح سے ثابت ہے، اور کئی راویوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب (قرآن پاک) اللہ کی رسی ہے، جو آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔

**حبل اللہ بمعنی قرآن وعترت:**

واخرج احمد عن زید بن ثابت قال قال رسول اللہ ﷺ انی تارک فیکم خلیفتین

کتاب اللہ عزوجل ممدود ما بین السماء والارض وعترتی اہل بیتی وانہما لن



يفتر قاحتی یردا علی الحوض“

مسند احمد میں حضرت زید بن ثابت ؓ کی روایت آتی ہے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب جو آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے، اور اپنی اہل بیت سے اپنی عترت (اولاد) چھوڑ کر جا رہا ہوں، جو حوض کوثر تک وارد ہونے تک ساتھ ہوں گی جدا نہیں ہوں گی۔

### حبل اللہ بمعنی طاعت وجماعت:

وقیل المراد بحبل اللہ الطاعة والجماعة ”وروی ذلک عن ابن مسعود ایضا“  
حبل اللہ کا معنی طاعت اور جماعت ہے، یہ روایت بھی حضرت ابن مسعود ؓ سے مروی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت کو لازم پکڑو، اور جماعت کے ساتھ رہو۔

اخرج ابن ابی حاتم من طریق الشعبی عن ثابت بن قطنہ المزنی قال سمعت ابن مسعود یخطب وهو یقول ایہا الناس علیکم بالطاعة والجماعة فانہما حبل اللہ تعالیٰ الذی امر بہ“

ثابت بن قطنہ مزنی کہتے ہیں میں نے حضرت ابن مسعود ؓ سے خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنا ”اے لوگو تم پر اللہ تعالیٰ کی طاعت لازم ہے، اور تم پر لازم ہے کہ جماعت کے ساتھ رہو، بیشک یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی رسیاں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی رسی کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے۔

”وفی رواية عنه حبل اللہ الجماعة وروی ذلک ایضا عن ابن عباس رضی اللہ عنہما“  
ابن مسعود کی ایک اور روایت میں اور حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت میں بھی ”حبل اللہ“ سے مراد جماعت لیا گیا ہے کہ تم جماعت کو لازم پکڑو۔

### حبل اللہ بمعنی اخلاص:

روی عن ابی العالیہ انہ الاخلاص لله تعالیٰ وحده“ ابوالعالیہ سے روایت کی گئی کہ ”حبل اللہ“ کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ وحدہ سے اخلاص رکھنا، یعنی حکم یہ دیا گیا کہ تم صرف کامل طور پر اللہ تعالیٰ سے اخلاص رکھو۔

### حبل اللہ بمعنی اسلام:

وعن ابن زید انہ الاسلام“ ابن زید کی روایت میں آتا ہے کہ حبل اللہ سے مراد اسلام ہے یعنی حکم یہ دیا گیا کہ اسلام پر مضبوطی سے قائم رہو۔



## حبل اللہ بمعنی عہد وامر:

”وعن قتادة انه عهد الله وامره“ حضرت قتادہ کہتے ہیں ”حبل اللہ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا عہد اور اس کا حکم ہے، یعنی حکم دیا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہو۔

سب معانی قریب قریب ہیں:

”وكلها متقاربة“ ان تمام بیان کردہ معانی میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ (روح المعانی)

اللہ تعالیٰ کے دین کو رسی سے تشبیہ کیوں دی گئی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص چھوٹے تنگ راستہ سے گزر رہا ہو تو اسے گرنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، لیکن دونوں طرف اگر رسی باندھ دی جائے اور وہ اس رسی کے سہارے پر چلے تو وہ گرنے کے خطرہ سے محفوظ رہتا ہے اسی طرح حق راہ تنگ راہ ہے، اس راہ سے کثیر مخلوق پھسل گئی، جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دلائل اور بینات سے سہارا لیا وہ اس خوف سے محفوظ رہا۔

”فكان المراد من الحبل ههنا كل شئ يمكن التوصل به الى الحق في طريق الدين“

رسی سے مراد یہاں ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان دین کی راہ حق میں پہنچ جائے، ”وہو انواع کثیر“ وہ کثیر قسم ہیں، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، جب یہ معنی کیا جائے ”اللہ تعالیٰ کے دین سے مضبوطی سے سہارا لگا لو“ تو اس میں وہ تمام معانی آجائیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، طلباء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ یہاں تشبیہ پائی گئی ہے، استعارہ مکنیہ پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ”اور تفرقہ نہ پیدا کرو۔“

تفرقہ سے ممانعت کی تین وجوہ ہیں جو تمام ہی معتبر ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک تفرقہ بھی نا جائز ہوگا:

(۱) الاول انه لہی عن الاختلاف فی الدین وذلك لان الحق لا یكون الا واحدا وما عداہ یكون جهلا وضلالا، فلما كان كذلك وجب ان یكون النہی عن الاختلاف فی الدین، والیہ الاشارة بقوله تعالیٰ ”فما ذابعد الحق الا الضلال“



ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ دین میں اختلاف کرنے سے منع کیا گیا ہے، اسلئے کہ حق صرف ایک ہی ہے اور اس کے سوا جہالت و گمراہی ہے، لہذا ضروری ہے کہ دین میں اختلاف نہ کیا جائے، دین صرف ایک ہے، اسی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے ﴿فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾ (حق کے بعد سوائے گمراہی کے کچھ نہیں)

(۲) والثانی انه نهی عن المعاداة والمخاصمة فانهم كانوا فی الجاهلیة مواظبین علی المحاربة والمنازعة فنهاهم الله عنها

”تفرقہ نہ کرو“ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دشمنی کرنے اور جھگڑا کرنے سے منع کیا، مطلب یہ ہو گیا کہ ایک دوسرے سے دشمنی نہ کرو، اور ایک دوسرے سے جھگڑا نہ کرو۔

(۳) والثالث انه نهی عما یوجب الفرقة ویزیل الألفة والمحبة

تفرقہ سے ممانعت کی تیسری وجہ ہے کہ تم ایک دوسرے سے ایسا تفرقہ نہ کرو جو تمہارے درمیان واقع ایمانی الفت و محبت کو ہی زائل کر دے۔

**اصل بنیادی چیز :** اصل بنیادی چیز یہی ہے کہ ایک دوسرے سے ایسا تفرقہ نہ رکھو جو بعض کو دین سے ہی دور کر دے جیسا کہ اہل کتاب کا ایک دوسرے سے اختلاف تھا، اور ایسا تفرقہ بھی ایک دوسرے سے نہ رکھو جو تمہارے درمیان لڑائی اور دشمنی کا سبب بن جائے اور تم سے ایمان کی وجہ سے دولت محبت و الفت نہ چھینی جائے۔

**مسائل کی تحقیق کا اختلاف رحمت ہے :**

وقد روی عن النبی ﷺ انه قال اختلاف امتی رحمة“ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

**اس حدیث پر معترضین کا حال :**

وقد اعترض علی حدیث اختلاف رحمة رجلاں احدهما مغموس علیہ فی دینہ وهو عمرو بن الجاحظ والآخر معروف بالسخف والخلاعة

اس حدیث پر دو شخصوں نے اعتراض کیا ہے، ان میں سے ایک بے دین اور جاہل و متجاہل ہے، وہ ہے عمرو بن جاحظ، اور دوسرا شخص حدیث کی سند میں ضعیف اور متروک سمجھا گیا ہے، وہ ہے اسحاق بن ابراہیم موصلی، اس شخص نے اغانی میں ایک کتاب لکھی جس میں گانے بجانے کے متعلق باطل اقوال نقل کئے:



”لم يرض بما تزود من المها حتى صدر كتابه بدم اصحاب الحديث وزعم انهم يردون ما لا يدرون“

اس کتاب میں اس نے اپنے لئے گناہوں کا کافی حد تک توشہ جمع کر لیا تھا، لیکن ان گناہوں پر راضی نہ ہوا بلکہ اس نے اور گناہوں کا انبار اٹھانے کیلئے اصحاب حدیث کی مذمت شروع کر دی اور یہاں تک کہنے لگا کہ وہ ایسے ہی روایات ذکر کر دیتے ہیں جن کا انہیں علم ہی نہیں ہوتا، کیا ایسا شخص حدیث کی روایات میں معتبر ہو سکتا ہے، کیا ایسے شخص کے اعتراض کی کوئی حقیقت ہے وہ تو خود ہی غیر معتبر ہے، وہ تو خود ہی اصحاب حدیث سے دور ہے اور مردود ہے۔ آئیے عمرو بن جاحظ کی باطل دلیل کو دیکھئے وہ کہتا ہے:

”لو كان الاختلاف رحمة لكان الاتفاق عذابا“ وہ کہتا ہے اگر اختلاف امت رحمت ہے تو اتفاق امت عذاب ہوگا، اس کی یہ دلیل اسکی جہالت و حماقت پر دلالت کر رہی اس کا موقف ثابت نہیں کر رہی،

”والجواب عن هذا الاعتراض انه لا يلزم من كون الشيء رحمة ان يكون ضده عذابا ولا يلزم هذا ولم يذكره الاجاهل او متجاهل وقد قال الله تعالى ”ومن رحمته جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه“ فسمى الليل رحمة ولم يلزم من ذلك ان يكون النهار عذابا وهو ظاهر لا شك فيه“

عمرو بن جاحظ کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل باطل ہے کہ ایک چیز رحمت ہو تو اس کی ضد عذاب ہو، ایسا قول تو صرف کسی جاہل یا خود ساختہ جاہل کا ہو سکتا ہے، آئیے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کو دیکھئے ﴿وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ﴾ اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات کو بنایا، اور دن کو تمہارے آرام کیلئے، آیت کریمہ میں رات کو رحمت قرار دیا گیا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دن کو عذاب بنایا گیا ہو۔ (حوالہ بعد میں آرہا ہے)

اختلاف کی تین قسمیں ہیں:

احدها في البات الصانع و وحدانيته وانكار ذلك كفر، والثاني في صفاته ومشيته وانكارها بدعة والثالث في احكام الفروع المحتملة وجوها فهذا جعله الله تعالى رحمة وكرامة للعلماء وهو المراد بحديث اختلاف امتي رحمة“

اختلاف کی تین قسموں میں سے ایک یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے خالق ہونے اور اس کی وحدانیت میں اختلاف کیا جائے اور اس کا انکار کیا جائے یہ کفر ہے اور انکار کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی مشیت میں اختلاف کیا



جائے، صفات و مشیت کا انکار بدعت ہے اور اختلاف کی تیسری وجہ فروعی احکام میں اختلاف کا پایا جاتا ہے، کسی مسئلہ میں کئی وجوہ کا احتمال ہوا ہے اپنے دلائل سے مختلف وجوہ کو ثابت کیا جائے تو اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کی عزت افزائی کیلئے رحمت بنایا ہے، یہی وہ اختلاف ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے رحمت قرار دیا، اور ارشاد گرامی (اختلاف امتی رحمة) میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ (مسلم شریف جلد ثانی صفحہ نمبر ۵۵ باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شی یوصی فیہ) واضح ہوا کہ ہر اختلاف جائز بھی نہیں اور ہر اختلاف کو ناجائز قرار دینا بھی حماقت ہے۔

جماعت کو لازم پکڑنا:

❖ وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان الله لا يجمع امتی او قال امة محمد علی ضلالة وید الله علی الجماعة ومن شذّش فی النار "رواه الترمذی"

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا (راوی کو شک ہے کہ شاید آپ نے "امۃ محمد" فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ امت محمد کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا) اللہ تعالیٰ کا دست قدرت جماعت پر ہے، جو جماعت سے بکھر گیا وہ بکھر کر آگ میں چلا گیا۔

**وضاحت حدیث:**

والما حمل الامۃ علی امة الاجابة لما ورد ان الساعة لا تقوم الا علی الکفار

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک میں جس امت کا ذکر ہے وہ امت اجابت ہے یعنی جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ روایات میں موجود ہے کہ بیشک قیامت نہیں قائم ہوگی مگر کفار پر

"فالحديث يدل علی ان اجماع المسلمين حق" حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کا اجتماع حق ہے، یعنی اجماع امت شریعت کی قوی دلیل ہے، لیکن اس اجماع سے مراد "والمراد اجماع العلماء ولا عبرة باجماع العوام لانه لا يكون عن علم" علماء کا اجماع ہے، کہ جب علماء مجتہدین کسی مسئلہ میں اتفاق کر لیتے ہیں تو وہ ایک قوی دلیل ہوتی ہے، اس اجماع سے مراد عوام کا اجماع نہیں، کیونکہ انہیں علم حاصل نہیں ہوتا۔

جہالت سے کسی مسئلہ پر مجتمع ہو جانا شریعت میں معتبر نہیں، آج کل کے دور میں جہلاء تو بے حیائی کو فروغ دینے میں مجتمع ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو اس سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔



نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی میں ”لا یجتمع امتی علی ضلالة“ میں ”ضلالة“ سے کیا مراد ہے؟  
”وقال الابھری قوله علی ضلالة ای علی خطأ وقیل علی کفر ومعصية“

اس سے مراد خطاء، کفر و معصیت ہے، یعنی آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میری امت خطاء و کفر و معصیت پر مجتمع نہیں ہوگی۔

(وید اللہ) کنایۃ عن النصرة والغلبة او الحفظ والرحمة او معناه احسانه وتوفيقه  
لاستنباط الاحکام والاطلاع علی ما کان علیہ رسول اللہ ﷺ واصحابہ من الاعتقاد  
والعمل (علی الجماعة) ای المجتمعین علی الدین یحفظہم من الضلالة والخطأ او  
للتوفیق لموافقة اجماع هذه الامة“

”اور اللہ کا دست رحمت جماعت پر ہے“ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہے، اور ان کو غلبہ حاصل ہے،  
اور ان کی رب تعالیٰ حفاظت فرماتا ہے اور انہیں رحمت عطا فرماتا ہے، یا ان کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے اعتقاد اور  
عمل کے مطابق احکام استنباط (حاصل کرنے) کی اور ان پر مطلع ہونے کی توفیق عطا فرماتا ہے جو لوگ دین پر مجتمع  
ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو گمراہ ہونے اور گنہگار ہونے سے بچا لیتا ہے، یا ان کو اس امت کے ساتھ اجماع میں  
(اجماع امت میں) متفق ہونے کی توفیق عطا فرمادیتا ہے

”ومن شد“ ای انفراد عن الجماعة باعتقاد او قول او فعل لم یکنوا علیہ (شد فی  
النار) ای انفراد فیہا ومعناه انفراد عن اصحابہ الذین ہم اهل الجنة والقی فی النار“  
اور جو شخص جماعت سے اعتقاد یا قول یا فعل سے ہٹ گیا، بکھر گیا، ایسا عقیدہ ایجاد کیا، یا ایسا قول  
کیا یا ایسا عمل کیا جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے مخالف اور دین اور شریعت کے مخالف ہو وہ  
جماعت سے ہٹ کر اکیلا جہنم کی آگ میں پہنچ جائے گا، یعنی جماعت والے صحیح اعتقادات اور صحیح  
اقوال و افعال جو جنت میں جانے کا ذریعہ تھے ان کو چھوڑنے اور جماعت سے بکھرنے کی وجہ سے  
جہنم کی آگ میں پہنچ گیا۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۳۹)

وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ اتبعوا السواد الا عظم فانه من شد شد فی النار  
”رواہ ابن ماجہ“  
(مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سواد اعظم (بڑی جماعت) کی تابعداری  
کرو، بیشک جو اس سے بکھر گیا وہ آگ میں بکھر گیا۔



## وضاحت حدیث:

”سواد اعظم“ سے مراد بڑی جماعت ہے ”والمراد ما علیہ اکثر المسلمین“ مراد اس سے وہ

ہے جس پر اکثر مسلمان ہوں۔

وهذا فی اصول الاعتقاد کان الاسلام واما الفروع کبطلان الوضوء بالمس فلا  
حاجة فیہ الی الاجماع بل يجوز اتباع كل واحد من المجتهدين كالائمة الاربعة“

بڑی جماعت کی تابعداری کرنے کے حکم کا تعلق اعتقادی اصول سے ہے، جیسا کہ ارکان اسلام ہیں، ان میں سب کا متفق ہونا ضروری ہے، لیکن فروع دین میں اجماع امت ضروری نہیں، بعض مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف بھی ہوگا، جو شخص جس امام کا مقلد ہوگا وہ اسی کی تابعداری کرے گا، اس سے وہ جہنم کی آگ کا مستحق نہیں ہوگا، وضوء کے مسائل کو ہی آپ اپنے سامنے رکھیں امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کو مس کرنے (چھونے سے) اور ذکر کو مس کرنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں وضوء نہیں ٹوٹتا، اس طرح کے ائمہ مجتہدین کے نزدیک سینکڑوں مسائل اختلافی ہیں۔ آجکل غیر مقلدین نے اودھم مچا رکھا ہے، ایسے فروعی مسائل کو اصول سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ ”اللسم انا نمونبک من النسر المفسدین“

ماترید یہ اور اشاعرہ کا اختلاف فروع میں ہے، اصول میں نہیں، جن مسائل میں ان کا اختلاف ہے وہ ظنی ہیں اعتقادی اور یقینی نہیں، بلکہ بعض محققین نے کہا ہے کہ اشاعرہ اور ماترید یہ کا اختلاف لفظی ہے حقیقی نہیں:

”اتبعوا السواد الاعظم“ يدل على ان اعظم الناس العلماء وان قل عددهم ولم يقل الاكثر لان العوام والجهال اكثر“

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”بڑی جماعت کی تابعداری کرو“ اس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ لوگوں میں سے عظیم مرتبہ والے علماء کرام ہیں، یعنی علماء حق کی تابعداری کرو، وہی عظیم جماعت ہے، صرف آپ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ، اکثر لوگوں کی تابعداری کرو، کیونکہ صرف تعداد کے لحاظ پر زیادہ تو عوام و جہال ہیں، عوام و جہال کا کوئی اعتبار نہیں۔

(من شد) فی الدین (شد فی النار) جو شخص دین سے ہٹ گیا، دین پر چلنے والی علماء کرام کی عظیم جماعت سے عقیدہ کے لحاظ پر پھر گیا وہ اکیلے نار (آگ) میں پہنچ گیا، اکیلے نار میں پہنچنے کا یہی مطلب ہے کہ جس طرح دین پر چلنے والے علماء کے نظریات و عقائد سے پھر کر علیحدہ ہو گیا، اس طرح آخرت میں اللہ تعالیٰ دیندار لوگوں کو جنت میں



بھیج دے گا اور ان سے پھرنے والے کو ان سے دور کر کے آگ میں بھیج دے گا۔ (سورة جند، سورۃ ۲۰۹، ۲۵۰)

عن معاذ بن جبل قال قال رسول الله ﷺ ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم ياخذ الشاذة والقاصية والناحية واياكم والشعاب وعليكم بالجماعة والعامّة "رواه احمد"

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان انسانوں کا بھیڑیا ہے جس طرح بھیڑ، بکریوں کا بھیڑیا ہے، بھیڑیا اس بکری کو پکڑتا ہے جو دوسری بکریوں سے علیحدہ ہو جاتی ہے، دور ہو جاتی ہے اور کنارے پر ہو جاتی ہے، تم پر لازم ہے کہ تم اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچالو، جماعت کو لازم پکڑو، اور عامہ کو لازم پکڑو۔

### وضاحت حدیث:

"ذئب الانسان" سے مراد مفسد و مہلک ہے، یعنی انسانوں کو شیطان فساد اور ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

"شاذة" اس بکری کو کہیں کہ جو دوسری بکریوں سے نفرت کر کے علیحدہ ہو جائے "قاصية" اس بکری کو کہتے ہیں جو چرتے چرتے دور نکل جائے اگرچہ دوسری بکریوں سے نفرت نہ کرے۔ "ناحية" اس بکری کو کہتے ہیں جو غفلت کی وجہ سے دوسری بکریوں سے دور کنارے پر چلی جائے، یعنی علیحدہ رہنے والی بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے، تمہیں بھی لازم ہے کہ علیحدہ رہنے سے بچ کر رہو اور جماعت کو لازم پکڑو، تاکہ تمہیں شیطان ہلاکت میں نہ ڈال دے جو انسانوں کیلئے بھیڑیے کی طرح ہے۔

"والعامّة" ای عامۃ الجماعة یعنی علیکم بمتابعة جمهور العلماء من اهل السنة والجماعة "عامہ کو لازم پکڑو" کا مطلب یہ ہے کہ تم پر لازم ہے کہ عام جماعت کو لازم پکڑو، جمہور اہل سنت و جماعت کی تابعداری کرو۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ عوام جو دین پر قائم ہیں، ان کے ساتھ مل کر تم بھی دین پر قائم رہو، مقصود یہی ہے کہ دین سے دور نہ ہو جانا اور دین پر قائم رہنا۔

یہاں ایک ہی مسئلہ کو تین مرتبہ ذکر کیا، جس میں شدید تاکید پائی گئی، ایک مرتبہ ذکر فرمایا "واياكم والشعاب" تم اپنے آپ کو علیحدہ ہونے سے بچا کر رکھو، اور دوبارہ ذکر کیا "عليكم بالجماعة" تم پر لازم ہے کہ جماعت کو لازم پکڑو، اور تیسری مرتبہ ذکر کیا "والعامّة" یعنی "عليكم بالعامّة" تم پر لازم ہے کہ جمہور اہل سنت و جماعت کے علماء



❖ وعن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ من فارق الجماعة شرا فقد خلع ربة

الاسلام من عنقه "رواہ احمد" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی جماعت سے ایک بالشت جدا ہو گیا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا ڈورا اتار دیا۔

اس حدیث سے مراد بھی یہی ہے "قال الابہری مفارقة الجماعة ترك السنة واتباع البدعة" جو علامہ ابہری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ جماعت کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ سنت کو چھوڑ دے اور بدعت کی اتباع کرے۔ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)

❖ وعن مالک بن انس مرسل قال قال رسول اللہ ﷺ ترک فیکم امرین لن تضلوا ما

تمسکم بہما کتاب اللہ وسنة رسولہ رواہ فی الموطا" (مشکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے مرسل روایت آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم میں دو چیزوں کو چھوڑا ہے جب تک تم ان سے سہارا رکھو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے (ایک) کتاب اللہ اور (دوسری) سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

## وضاحت حدیث:

"ترکت فیکم امرین" ای شینین عظیمین او حکمین بفتحہما

میں تم میں دو امر چھوڑے جا رہا ہوں، یعنی دو بڑی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، یا آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میں تم میں دو فیصل (دو فیصلہ کرنے والے چیزیں) چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

"لن تضلو" ای لن تقعوا فی الضلالة (ما تمسکم) ای مدة تمسکم (بہما) ای

بالامرین معا (کتاب اللہ) ای القرآن (وسنة رسولہ) ای حدیث رسولہ

تم ہرگز گمراہی میں واقع نہیں ہو گے جب تک ان دونوں چیزوں سے سہارا لگائے رکھو گے، وہ ہے قرآن پاک اور حدیث پاک، کسی ایک کو بھی چھوڑنے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

(مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۶)

"حبس اللہ" سے حدیث پاک کے انکار کرنے والوں کا استدلال باطل ہے، کیونکہ خود میرے پیارے مصطفیٰ

کریم ﷺ نے قرآن پاک اور حدیث دونوں پر سہارا لینے پر زور دیا ہے۔



وعن غضیف (بالمعجمین مصغرا) بن الحرث الثمالی قال قال رسول الله ﷺ ما حدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسک بسنة خیر من احداث بدعة

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

غضیف بن حرث ثمالی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوم نے نہیں ایجاد کیا بدعت کو مگر اس کی مثل سنت کو اٹھالیا گیا، سنت پر عمل کرنا بدعت کی ایجاد سے بہتر ہے۔

وعن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ اما بعد فان خیر الحديث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد وشر الامور محدثاتها وکل بدعة ضلالة

(رواه مسلم) (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ”اما بعد“ بیشک بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، اور بہتر ہدایت محمد (ﷺ) کی ہدایت ہے، اور شر امور نئی چیزوں کی ایجاد ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

### وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ اپنے کلام کو حمد باری تعالیٰ اور اپنے آپ پر درود پاک سے شروع فرماتے تھے، اس لئے مقصد کو شروع کرنے سے پہلے ”اما بعد“ ذکر فرماتے، یعنی ”حمد و صلوٰۃ“ کے بعد ”فان خیر الحديث کتاب الله“ تمام کلاموں سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، یعنی اس میں وہ فصاحت و بلاغت ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں ”واشتمل علیہ من بیان کل شئی تصریحا او تلویحا قال تعالیٰ “ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئی“ ای مما یحتاج الیہ من امر الدین والدنیا والعقبی کالعلوم الاعتقادیة والاعمال الشرعیة والاخلاق البهیة والاحوال السنیة وغیرھا“

قرآن پاک صراحتہ یا اشارہ ہر چیز کے بیان پر مشتمل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ بَيَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ﴾ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کا واضح بیان ہے، یعنی دین و دنیا اور آخرت میں جن چیزوں کی محتاجی تھی ان سب کو بیان کر دیا، خواہ ان کا تعلق علوم اعتقادیہ سے ہو یا اعمال شرعیہ سے، خواہ وہ اچھے اخلاق ہوں یا اچھے اعمال ہوں، ”وغیرھا“ سب کو قرآن پاک میں واضح طور پر بیان کر دیا۔

### فائدہ جلیلہ:

وقد ورد فضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقه ، وفيه اشارة واضحه الی ان کلام اللہ تعالیٰ غیر مخلوق



اللہ تعالیٰ کی کلام کو تمام کلاموں پر فضیلت حاصل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، اسی سے ایک اور مسئلہ واضح طور پر حل ہو گیا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو اس کی صفت ہے، اس لئے کلام نفسی قدیم ہے، حادث نہیں۔

کون سی بدعت ضلالت ہے؟

وکل بدعة ضلالة "قال فی الازہار ای کل بدعة سینه ضلالة"  
ہر بدعت سیئہ (بری بدعت) گمراہی ہے، یہ مراد نہیں کہ مطلقاً ہر بدعت گمراہی ہے۔  
"لقولہ ﷺ من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها"  
نبی کریم ﷺ کا ارشاد گمراہی ہے جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر (ثواب) حاصل ہوگا اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا ثواب بھی اسے حاصل ہوگا۔

صحابہ کرام نے نئے کام ایجاد کئے:

"و جمع ابو بکر وعمر القرآن و کتبہ زید فی المصحف و جدد فی عہد عثمان ؓ"  
حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک جمع کیا، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو لکھ کر جمع کیا، پھر حضرت عثمان ؓ کے دور میں لغت حجاز پر قرآن جمع کیا گیا، یہ سب کام رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے۔  
"قال النووی البدعة کل شئی عمل علی غیر مثال سبق و فی الشرع احداث مالم یکن فی عہد رسول اللہ ﷺ وقولہ کل بدعة ضلالة عام مخصوص"  
علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا بدعت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی مثال پہلے موجود نہ ہو، اور شریعت میں نیا کام جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا۔ "کل بدعة ضلالة" عام مخصوص البعض ہے، یعنی بدعات حسنہ اس سے خارج ہیں اور بدعات سیئہ اس میں داخل ہیں۔

**بدعت واجبہ:** البدعة اما واجبة کتعلم النحو لفہم کلام اللہ ورسولہ وکتدوین

اصول الفقہ والکلام فی الجرح والتعديل

بدعت یا واجب ہوگی، جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو سمجھنے کیلئے علم نحو کا پڑھنا واجب ہے اور اصول فقہ کی تدوین واجب ہے، مسائل میں جرح و تعدیل، یعنی یہ حق ہے، اس میں کمزوری ہے، یہ بحثیں واجب ہیں۔  
**بدعة محرمة:** واما محرمة کمذهب الجبرية والقدرية والمرجئة والمجسمة،



والرد علی هؤلاء من البدع الواجبة لان حفظ الشريعة من هذه البدع فرض كفاية

بدعت کبھی حرام ہوتی ہے، جیسا کہ باطل مذاہب کی ایجاد، یعنی جبریہ فرقہ، قدریہ فرقہ، مرجئہ فرقہ،، بحسمۃ فرقہ تمام نئی ایجادات ہیں، سب فرقے باطل ہیں، بدعات محرمہ ہیں اور ان کا رد کرنا بدعات واجبہ سے ہے، کیونکہ شریعت کی حفاظت کرنا فرض کفایہ ہے۔

**بدعة مستحبة:** واما مندوبة كاحداث الربط والمدارس وكل احسان لم يعهد في الصدر الاول بعض بدعات مستحب ہیں جیسے سرائے بنانا اور مدارس بنانا اور ہر اچھا کام جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا لیکن وہ کام اچھا تو یہ بدعت مستحب ہے۔

**بدعة مكروه:** واما مكروهة كزخرفة المساجد "مكروه بدعت یہ ہے کہ مساجد کو زیاء، کاری کیلئے مزین کرے، لیکن اگر نیت یہ ہو کہ دوسرے گھروں سے اللہ تعالیٰ کا گھر زیادہ حسین نظر آتا ہے تو یہ بدعت مستحب ہو جائے گی۔

**بدعت مباحة:** واما مباحة كالتوسع في لذائد المأكول والمشرب والمساكن "مباح بدعت جس طرح کھانے پینے میں وسعت پیدا کرے، لذت دار کھانے کھائے، اور وسیع مکان میں رہے۔

بدعات کے متعلق خوبصورت ضابطہ:

قال الشافعي رحمه الله ما حدث مما يخالف الكتاب او السنة او الاثر او الاجماع

فهو ضلالة وما حدث من الخير مما لا يخالف شيئا ذلك فليس بمذموم

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہر وہ نیا کام جو قرآن پاک اور حدیث پاک اور صحابہ کرام کے اقوال اور اجماع امت کے مخالف ہو وہ گمراہی ہے، اور جو نئے کام اچھے ہوں، بھلائی پر مشتمل ہوں اور قرآن پاک، حدیث پاک، اقوال صحابہ، اجماع امت کے مخالف نہ ہوں تو وہ برے کام نہیں، بلکہ اچھے کام اچھے ہی ہیں۔

"وقال عمر رضي الله عنه في قيام رمضان نعمت البدعة" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کے قیام پر صحابہ کرام کو مجتمع

دیکھ کر یہ فرمایا یہ کتنی ہی اچھی بدعت ہے "وروی عن ابن مسعود ما راہ المسلمون حسنا فهو عند الله حسن" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ کے ہاں بھی اچھی ہوتی ہے، اس سے مراد علماء و صلحاء و اتقیا کا کسی چیز کو اچھا سمجھنا عند اللہ اچھا ہوتا ہے۔

"وفي حديث مرفوع لا يجتمع امتي على الضلالة" مرفوع حدیث میں یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے



## باطل فرقے اور سیدھی راہ:

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ لیأتین علی امتی کما أتى علی بنی اسرائیل حذوا النعل بالنعل حتی ان کان منهم من اتى امه علانية لکان فی امتی من یصنع ذلک وان بنی اسرائیل تفرقت علی لثنتین وسبعین ملة وتفرق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة قالوا من هی یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی ”رواہ الترمذی“ وفی رواية احمد وابی داود عن معاوية ثنان وسبعون فی النار وواحدة فی الجنة وهی الجماعة وانه سیخرج فی امتی اقوام تتجارى بهم تلک الاهواء کما يتجارى الکلب بصاحبه لا یبقى منه عرق ولا مفصل الا دخله“

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضرور بر ضرور میری امت پر ایک وقت آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا، یہ ان کے ساتھ برابر چلیں گے جیسا کہ جوتا اپنے فرمہ کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے اگر کوئی اپنی ماں کے پاس علانیہ (ظاہر) طور پر آیا تو میری امت میں ایسے ہوں گے جو یہی کام کریں گے، بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقے بنے اور میری امت کے بہتر فرقے بنیں گے، سب آگ میں جائیں گے، سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ وہ ایک فرقہ کون سا ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ جس (راہ) پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ (یہ ترمذی کی روایت ہے)

اور مسند احمد اور ابوداؤد کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے ”بہتر فرقے آگ میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا، یہ جماعت ہے، اور بیشک میری امت میں ایسی قومیں نکلیں گی جن پر خواہشات اس طرح جاری ہوں گی، جیسے کتا کسی شخص کو کاٹ دے تو اس پر اس کے اثرات اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اس کی کوئی رگ اور کوئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر اس میں وہ اثرات داخل ہو جاتے ہیں۔“

## وضاحت حدیث:

”لیأتین علی امتی“ ”اقتیان“ کا معنی ہے ”سہولت سے آنا“ اور جب ”علی“ سے متعدی ہو تو اس کا معنی غالباً ”ہلاکت تک پہنچانا“ ہوتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ﴾ میں



برباد کرنے اور ہلاک کرنے والا معنی ہی لیا گیا ہے۔

”لیاتین علی امتی کما اتی علی بنی اسرائیل“ کے دو مطلب ہیں، ایک مطلب اس کا یہ ہے ”لیاتین علی امتی زمان الیانا مثل الایمان علی بنی اسرائیل“ میری امت پر ایک زمانہ (ایک وقت) آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر وقت آیا۔ دوسرا معنی یہ ہے :

”لیاتین علی امتی مخالفة لما انا علیہ مثل المخالفة التي اتت علی بنی اسرائیل حتی اهلکتهم“ کہ میری امت میرے ہی احکام و شریعت کی اس طرح مخالفت کرے گی جیسا کہ بنی اسرائیل مخالفت کر رہے ہیں، ایک تیسرا معنی مختصر بھی ہو سکتا ہے، جبکہ کاف کو مثل کے مقام پر رکھ کر فاعل مان لیا جائے تو اب مطلب یہ ہوگا ”میری امت ضرور بر ضرور بنی اسرائیل کی طرح ہوگی“

”حذو النعل بالنعل“ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جوتا کو دوسرے جوتے کے برابر کاٹنا، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ جوتا کو اس کے قالب (فرمہ) کے برابر بنانا، مقصد کامل مشابہت کو بیان کرنا ہے کہ میری امت کامل طور پر بنی اسرائیل کے مشابہ ہوگی۔

”حتی ان کان منهم من اتی امه علانية لکان فی امتی من یصنع ذلک“

یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ماں کے پاس علانیہ طور پر آئے گا تو میری امت میں سے کئی لوگ ہوں گے جو (ان کو دیکھ کر) یہی کریں گے، یہ آپ نے اپنی امت کی بنی اسرائیل سے کامل مشابہت کی مثال دی، ماں کے پاس آنے کا مطلب بدکاری کا مرتکب ہونا، یعنی اگر یہود علانیہ طور پر ماں سے بدکاری کے مرتکب ہوئے تو ان کو دیکھ کر میری امت کے لوگ بھی ماں سے بدکاری کے مرتکب ہوں گے۔

تہتر فرقوں کو علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں :

بنی کریم ﷺ کی امت اجابت یعنی کلمہ گو لوگ کفریہ عقیدہ تک پہنچے ہوں گے، وہ لوگ جنہوں نے اصول دین میں اختلاف کیا ہے اور کفر تک پہنچ گئے وہ ابتدائی طور پر آٹھ فرقے ہیں، پھر ہر ایک میں کئی کئی فرقے ہیں۔

”المعتزلة القائلون بان العباد خالقوا اعمالهم وبنفی الرویة وبوجوب الثواب والعقاب وهم عشرون فرقة“

معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں، اور وہ باری تعالیٰ کی روئے کا انکار کرتے ہیں، وہ ثواب و عذاب کو نہیں مانتے، پھر ان کے بیس فرقے ہیں۔



خیال رہے کہ ثواب و عذاب پر ایمان ہو تو خوف خدا بھی ہوتا ہے، اسی لئے آجکل معتزلہ کے مذہب کو زندہ کرنے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں، کہ عذاب قبر نہیں تاکہ ہر قسم کی بے حیائی کو بغیر کسی خطرہ کے فروغ دیا جاسکے، یہ کوئی نہ کہے کہ یہ کام تو عذاب کا ذریعہ ہے۔

”والشیعة المفرطون فی محبة علی کرم اللہ وجہہ و ہم النان و عشرون فرقة“  
اور رافضی جنہوں نے حضرت علیؑ کی محبت میں بہت زیادہ حد سے تجاوز کیا وہ بائیس فرقے ہیں۔

”والخوارج المفرطة المكفرة له ﷺ ومن اذنب كبيرة وهم عشرون فرقة“  
اور خارجی لوگ جنہوں نے حضرت علیؑ کی شان میں نہایت گستاخی کی، یہاں تک کہ معاذ اللہ آپؐ کو کافر کہا، اور انہوں نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہا، یہ بیس فرقے ہیں۔

”والمرجئة القائلة بانه لا يضر مع الايمان معصية كما لا ينفع مع الكفر طاعة وهي خمس فرق“

مرجئہ فرقہ جو اس کے قائل ہیں کہ ایمان کے ساتھ گناہ کوئی نقصان نہیں دیتے جس طرح کفر کے ساتھ طاعت کوئی نقصان نہیں دیتی، یہ پانچ فرقے ہیں۔

”والنجارية الموافقة لاهل السنة فی خلق الافعال والمعتزلة فی نفی الصفات وحدوث الکلام و هم ثلاث فرق“

نجاریہ فرقہ یہ تو مانتا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس مسئلہ میں وہ اہل سنت کے ساتھ ہیں، لیکن وہ صفات باری تعالیٰ کو نہیں مانتے اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو حادث مانتے ہیں، ان مسائل میں وہ معتزلہ کے ساتھ ہیں، یہ تین فرقے ہیں۔

”والجبرية القائلة بسلب الاختيار عن العباد فرقة واحدة“  
اور جبریہ فرقہ اس کا قائل ہے کہ بندے کو کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ پتھر کی طرح مجبور محض ہے، ”معاذ اللہ“ اس نے وہی کام کرنے میں جو رب نے اس سے جبری طور پر کرائے ہیں، یہ ایک فرقہ ہے۔

”والمشبهة الذين يشبهون الحق بالخلق فی الجسمية والحلول فرقة واحدة ايضا“  
مشبہ فرقہ جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا جسم مانتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ وہ بندوں میں حلول کرتا ہے یہ ایک فرقہ ہے۔

”فتلك النان وسبعون فرقة کلهم فی النار“ یہ بہتر فرقے ہیں جو تمام آگ والے ہیں۔



**فرقہ ناجیہ :** وہ ایک فرقہ جو نجات حاصل کرنے والا ہے، جس کی وضاحت خود رسول اللہ ﷺ نے فرمادی ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں جو اس راہ پر قائم ہوں جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ ان کو ہی اہلسنت کہا جاتا ہے۔  
 ”والفرقة الناجية هم اهل السنة البيضاء الحمدية والطريقة النقية الاحمدية“

یعنی فرقہ ناجیہ وہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی روشن سنتوں پر قائم ہوں، اور آپ کے صاف طریقہ پر قائم ہوں، پھر یہی اہل سنت زہد و تقویٰ کے لحاظ پر مختلف مراتب رکھتے ہیں، کوئی شخص بھی شریعت سے دور رہ کر متقی نہیں ہو سکتا، شریعت پر چلنے کا نام ”شـرعة“ ہے، باطنی علم و معرفت کا حصول اور تقرب الی اللہ کا نام ”منہاج“ ہے اور زیادہ خلوص حاصل ہو جائے تو اس کا نام معراج ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا۔

الافالزموا سنة الانبياء      الافاحفظوا سيرة الاصفياء  
 ومن يتدع بدعة لم يكرم      بوجود انه رتبة الاتقياء

خبردار لازم پکڑو انبیاء کرام کی سنت کو خبردار نیک لوگوں کی سیرت کی حفاظت کرو۔ جن لوگوں نے بری بدعات کو ایجاد کر لیا ان کی کوئی عزت نہیں کہ وہ متقی لوگوں کے مرتبہ کو پالیں۔

اور دوسری روایت میں ذکر فرمایا گیا ”وواحدة في الجنة وهي الجماعة“ اور ایک جنتی فرقہ وہ جماعت ہے۔

(وهي الجماعة) ای اہل العلم والفقہ الذین اجتمعوا علی اتباع آثاره علیہ الصلوۃ والسلام فی النقییر والقطمیر ولم یبتدعوا بالتحریف والتغیر“

جماعت سے مراد اہل علم اور اہل فقہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی سنتوں کے مطابق قائم ہیں ذرا بھر بھی سنتوں سے انحراف نہیں کرتے اور بدعات سے سنتوں میں کوئی تحریف اور تبدیلی نہیں کرتے۔

”قال شریح ان السنة قد سبقت قیاسکم فاتبع ولا تبدع فانک لن تضل ما اخذت بالاثار“  
 شریح رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بیشک سنت قیاس سے پہلے ہے، سنت کے ہوتے ہوئے قیاس پر عمل نہ کرو اور سنت کے خلاف کوئی نئے کام ایجاد نہ کرو، جب تک نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی اتباع کرتے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

”وعن سفیان لوان فقیہا علی رأس لکان هو الجماعة“

حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ اگر ایک فقیہ پہاڑ کی چوٹی پر ہو تو وہ بھی جماعت ہے۔

”جماعت کے ساتھ ہونے کا مطلب واضح ہو گیا کہ علماء کرام، فقہاء عظام کے ساتھ ہو جاؤ“

اور دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:



”وانه سيخرج في امتي اقوام لتجاري بهم تلك الالهواء كما يتجاري الكلب  
بصاحبه لا يبقى منه عرق ولا مفصل الا دخله“

کا مطلب یہ ہے ”کہ میری امت میں کئی قومیں ایسی ہوں گی جو سنت کے خلاف نئے نئے کام ایجاد کر لیں  
گے، وہ نئی چیزوں کی ایجاد کی محبت ان کی رگوں اور جوڑوں میں ایسے اثر انداز ہوگی جیسے کہ پاگل کتا کسی کو کاٹ دے تو  
اس کے زہریلے اثرات اس کاٹے ہوئے انسان کی رگوں اور جوڑوں میں پہنچ جاتے ہیں، کوئی رگ، کوئی جوڑا اس کے  
اثر سے محفوظ نہیں رہتے۔“ (مرقاۃ جلد اول صفحہ نمبر ۲۳۷ تا ۲۳۹)

ہاں یہ خیال سے نہ نکلے کہ نئے کام وہی منع ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع امت کے مخالف  
ہوں، جب تک بدعات حسنہ اور سیئہ کا فرق نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی فرقہ دیندار ہونے کا دعویدار یہ ثابت  
نہیں کر سکے گا کہ ہمارے فرقہ کے تمام کام وہی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ اطہر میں تھے، اس سے ہٹ کر ہمارا کوئی نیا  
کام نہیں، دینی مدرسہ ہم نے کوئی نہیں بنایا، پختہ مساجد ہماری نہیں، ہماری مساجد میں بجلی کے پنکھے نہیں، سنگ مرمر یا  
چپس کے فرش نہیں، ہماری مساجد میں قالین نہیں بچھائے گئے، لہذا ہمارے کام صحابہ کرام والے کام ہیں۔ جب سب  
کچھ تم کر رہے ہو تو بدعت بدعت کی رٹ لگا کر، آئے دن پوسٹر چھاپ کر، لوگوں کو گمراہ کرنے کی دن رات تمہیں فکر لگی  
ہوئی ہے، آئیے ذرا غور تو کرو، کتوں کی طرح بھونکنا، مسلمانوں کو گمراہ کہنا، مسلمانوں کو مشرک کہنا کون سا انصاف ہے،  
یہ کیسے دین کی خدمت ہے۔

بہتر ناری فرقوں کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا:

اسی زیر بحث آیہ کریمہ کی تفسیر میں قرطبی رحمہ اللہ یوں رقمطراز ہیں، بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے  
وہ فرقے جو حقیقت میں کفر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے ناری (جہنمی) کہا ہے، وہ چھ فرقے ہیں،  
ہر فرقے کی بارہ بارہ شاخیں ہیں۔

**وہ چھ فرقے یہ ہیں:** حروریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجہ، رافضیہ، جبریہ ”انقسمت الحوروریہ

اثنی عشر فرقۃ“ حروریہ کے بارہ فرقے ہیں:-

(1) فاولہم الازرقیۃ قالوا لانعلم احدا مؤمنا وکفروا اهل القبلة الا من دان بقولہم “  
پہلا فرقہ حروریہ میں سے ازرقیہ ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مؤمن نہیں سمجھتے، وہ اہل قبلہ کو بھی کافر کہتے



ہیں مگر یہ کہ جو ان کی بات کو مانیں وہ مؤمن ہو سکتے ہیں۔

(2) والاباضیۃ قالوا من اخذ بقولنا فهو مؤمن ، ومن اعرض عنه فهو منافق “  
حروریہ میں سے ایک فرقہ ”اباضیہ“ ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ جو ہماری بات پر عمل کرے گا وہ مؤمن ہے، اور ہماری بات سے اعراض کرے گا وہ منافق ہے۔

(3) والعلبیۃ قالوا ان الله عزوجل لم يقض ولم يقدر “  
حروریہ میں سے تیسرا فرقہ ”علبیہ“ ہے جو اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کو تسلیم نہیں کرتے۔

(4) والخازمیۃ قالوا لا ندري ما الايمان والخلق كلهم معذورون “  
حروریہ میں چوتھا فرقہ ”خازمیہ“ ہے وہ کہتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ ایمان کیا ہے، تمام مخلوق معذور ہے (جو چاہیں لوگ وہی کریں ان سے کوئی باز پرس (پوچھ گوچھ) نہیں ہونی)

(5) والخلفیۃ زعموا ان من ترك الجهاد من ذكر او انشى كفر “  
پانچواں فرقہ ”خلفیہ“ ہے، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس مذکر یا مؤنث نے جہاد کو چھوڑا وہ کافر ہو گیا،  
(ان کا یہ قول سراسر مردود ہے، اس میں صحیح عقیدہ یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے، اگر مسلمان دفاع نہ کر سکیں، کافروں کی یلغار ہو تو فرض عین ہو جاتا ہے، فرض عین کا تارک گنہگار ہے، اور فرض عین کی فرضیت کا منکر کافر ہے)  
(6) والكوزیۃ قالوا ليس لاحد ان يمس احدا لانه لا يعرف الطاهر من النجس ولا ان يؤاكله حتى يتوب ويغتسل “

چھٹا فرقہ کوزیہ ہے، اسے کرو یہ بھی کہا گیا ہے اور کدر یہ بھی کہا گیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو ماتھ نہ لگایا جائے۔ معلوم



(یہی آجکل روشن خیال بھی کہتے ہیں اگر ان کو کہا جائے کہ یہ حرام ہے تو وہ کہتے ہیں یہ قدامت پسند ہے)  
(9) والاخنسیہ قالوا لا يلحق الميت بعد موته خير ولا شر

نواں فرقہ "اخنسیہ" ہے، وہ کہتے ہیں مرجانے کے بعد کوئی خیر و شرمیت کو لاحق نہیں ہوگا۔  
(نہ عذاب قبر، اور نہ قبر میں راحت، نہ جنت، نہ دوزخ، آجکل کچھ مردود اسی فرقہ کے مطابق اشتہار چھاپ کر لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کو دور کر نیکی ناپاک جسارت کر رہے ہیں)  
(10) والحکمۃ قالوا من حاکم الی مخلوق فهو کافر  
دسواں فرقہ یہ ہے کہ جو اپنا فیصلہ مخلوق کے پاس لے گیا وہ کافر ہے، (یعنی ان کے نزدیک مخلوق میں نہ کوئی حکم (فیصل) ہے اور نہ ہی کوئی حاکم ہے۔

(11) والمعتزلة قالوا اشتبه علينا امر علی و معاویة فنحن نتبرأ من الفريقین  
گیارہواں فرقہ "معتزلہ" ہیں، وہ کہتے ہیں ہم پر (حضرت علیؓ) اور (حضرت معاویہؓ) کا معاملہ مشتبہ ہے (کہ کون سچا ہے یا کون جھوٹا ہے، کون حق پر ہے یا کون باطل پر ہے) اسلئے ہم دونوں سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔  
(خیال رہے کہ یہ فرقہ حرور یہ کی ایک قسم ہے، نام اس کا بھی معتزلہ ہے، قدر یہ میں سے ایک فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور ہے، جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آ رہا ہے)

(12) والمیمونۃ قالوا لا امام الا برضا اهل مجتنا  
بارہواں فرقہ "میمونیہ" ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی امام نہیں سوائے ہمارے اہل محبت کی رضا مندی کے۔  
قدر یہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) الاحمریۃ وہی التي زعمت ان فی شرط العدل من الله ان یملک عباده امورهم وبحول بینهم و بین معا صیہم  
قدر یہ فرقہ میں سے پہلا فرقہ "احمریہ" ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) اس وقت عادل ہوگا جب وہ اپنے بندوں کو تمام امور کا مالک بنا دے گا، اور بندوں اور ان کے گناہوں کے درمیان خود حائل ہو جائے (یعنی بندوں کو گناہ نہ کرنے دے)

(۲) والثنویۃ وہی التي زعمت ان الخیر من الله والشر من الشیطان  
دوسرا فرقہ ثنویہ ہے یہ وہ فرقہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ خیر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر شیطان کی



طرف سے ہے، (یعنی یہ فرقہ خیر کا خالق اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں، اور شر کا خالق شیطان کو)

(۳) والمعتزلة وهم الذين قالوا بخلق القرآن ووجدوا (صفات) الربوبية

تیسرا فرقہ معتزلہ ہے، یہ وہ لوگ جنہوں نے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا قول کیا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں، (ان کے بہت نظریات اہل سنت کے خلاف ہیں)

(۴) والكيسانية وهم الذين قالوا لا ندري هذه الافعال من الله او من العباد ولا نعلم ايثار الناس بعد او يعاقبون

چوتھا فرقہ ”کیسانیہ“ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، یا کہ بندوں کی تخلیق ہے، پھر ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا عذاب دیا جائے گا۔

(۵) والشيطانية قالوا ان الله تعالى لم يخلق الشيطان

پانچواں فرقہ ”شیطانیہ“ ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا، یعنی تمام مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن وہ شیطان کا خالق نہیں۔

(۶) والشريكية قالوا ان السيآت كلها مقدره الا الكفر

چھٹا فرقہ ”شریکیہ“ ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ تمام گناہ تورب تعالیٰ کی تقدیر میں ہیں، لیکن کفر اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں نہیں۔

(۷) والوهمية قالوا ليس لافعال الخلق وكلامهم ذات ولا للحسنة والسينة ذات

ساتواں فرقہ ”وہمیہ“ ہے وہ کہتے ہیں مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کیلئے کوئی ذات نہیں پائی گئی، اور نہ ہی اچھائیوں اور برائیوں کیلئے کوئی ذات پائی گئی، (اس فرقہ میں کتنی حماقت پائی گئی ہے کہ یہ افعال مانتے ہیں لیکن فاعل نہیں مانتے جبکہ کسی فعل کا فاعل کے بغیر پایا جانا ممکن نہیں)

(۸) والزبورية قالوا كل كتاب نزل من عند الله فالعمل به حق ناسخا كان او منسوخا

آٹھواں فرقہ ”زبریہ“ ہے، اسے ”زبوندیہ“ بھی کہا گیا ہے، یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو کتاب بھی نازل فرمائی اس پر عمل کرنا حق ہے خواہ وہ ناسخ ہو یا منسوخ ہو، گویا کہ یہ لوگ منسوخ ہونے کے منکر ہیں، اسی لئے منسوخ پر عمل کرنا حق مانتے ہیں حالانکہ منسوخ کہتے ہی اسے جس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا ہے، اگر منسوخ ہونے کے باوجود اس پر عمل کرنا جائز ہو تو اسے منسوخ کہنے کا مطلب ہی کیا؟ آجکل نیچری اور قادیانی بھی یہی مذہب رکھتے ہیں، سب باطل مذاہب ایک مرتبہ پھر معرض وجود پر لائے جا رہے ہیں، لیکن وہ پہلے بھی مٹ گئے، پھر مٹ کر رہیں گے۔

(۹) والمسعدية زعموا ان من عصي ثم تاب لم تقبل توبته

نواں فرقہ ”مسعدیہ“ ہے، جسے ”متبریہ“ بھی کہا جاتا ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ بیشک جس نے توبہ کر لی پھر توبہ کر



لیکن اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، (ان کا یہ عقیدہ قرآن پاک کی صریح آیات کے مخالف ہے، جن میں توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے)

(۱۰) وَالنَّاسِ كَثِيرٌ زَعَمُوا أَن مِّنْ نَّكَثٍ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَلَا أَمَّ عَلَيْهِ  
دسواں فرقہ ”ناکثیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کسی نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت توڑ لی تو اس پر کوئی گناہ  
نہیں۔ (معاذ اللہ یہ صریح کفر ہے)

(۱۱) وَالْقَاسِطِيَّةُ تَبِعُوا إِبْرَاهِيمَ بْنِ النَّظَامِ فِي قَوْلِهِ مَن زَعَمَ أَنَّ اللَّهَ شَيْئٌ فَهُوَ كَافِرٌ  
گیارہواں فرقہ ”قاسطیہ“ ہے یہ ابراہیم بن نظام کے متبع ہیں اس کے اس قول میں کہ جس نے ”شی“ کا اطلاق اللہ  
تعالیٰ پر کیا وہ کافر ہے (یہ اس کا عقیدہ سراسر باطل ہے، کیونکہ ”شی“ کا معنی موجود ہونا، اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے)  
بارہواں فرقہ غالباً علامہ قرطبی رحمہ اللہ سے یا کاتب سے چھوٹ گیا ہے، جس کا ذکر نہیں، عین ممکن ہے۔

### جہمیہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) الْمُعْطَلَةُ زَعَمُوا أَنَّ كُلَّ مَا يَفْعُ عَلَيْهِ وَهُمْ الْإِنْسَانُ فَهُوَ مَخْلُوقٌ وَأَنَّ مَنْ ادَّعَى أَنَّ اللَّهَ يَرَى فَهُوَ كَافِرٌ  
جہمیہ فرقہ میں سے ایک فرقہ ”معطلہ“ ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جو واقع ہے وہ مخلوق ہے، لیکن  
اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ انسانوں کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، یہ کفر ہے۔

(یہ خیال رہے کہ زیادہ مشہور تعطیلیہ یا معطلہ فرقہ وہ فرقہ ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک عقل کو پیدا  
کیا، اس عقل نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو، اس طرح دس عقل معرض وجود میں آئے جو ”عقول عشرہ“ سے  
مشہور ہیں، اب سب نظام ان عقول کے ذمہ ہے، اللہ تعالیٰ تمام امور سے معطل ہے۔ (معاذ اللہ)

(۲) وَالْمُرِيسِيَّةُ قَالُوا أَكْثَرَ صِفَاتِ اللَّهِ تَعَالَى مَخْلُوقَةٌ

دوسرا فرقہ ”مریسیہ“ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو قدیم نہیں مانتے بلکہ اکثر صفات کو مخلوق اور حادث مانتے ہیں۔

(۳) وَالْمُلْتَزِقَةُ جَعَلُوا الْبَارِيَّ سَبْحَانَ فِي كُلِّ مَكَانٍ

تیسرا فرقہ ”ملتزقہ“ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں مکین ہے، خیال رہے کہ ایک یہ عقیدہ ہے کہ اللہ  
تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے جو اس کی شان کے لائق ہے موجود ہونا، یہ عقیدہ تو کامل ایمان ہے، دوسرا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ  
تعالیٰ ہر مکان میں مکین ہے، یہ کفر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی مکان سے متمکن ہونے سے پاک ہے، اس لئے کہ مکان کی  
جہات ستہ (فوق، تحت، یمین و یسار، امام، خلف) اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے) سے مقید ہوتا ہے، رب



تعالیٰ جہات ستہ کی تقیید سے پاک ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک مکان جسم حاوی کی سطح باطنی ہے جو جسم محوی کی سطح ظاہری سے مماس ہے، مکان کا یہ معنی بھی لیں تو پھر بھی مقید ہونا لازم آئے گا جو رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں، کیونکہ یہ حدوث پر دلالت کرے گا، اللہ تعالیٰ حدوث سے پاک ہے۔

(۳) والواردية قالوا لا يدخل النار من عرف ربه ومن دخلها لم يخرج منها ابداً

چوتھا فرقہ ”واردیہ“ ہے، وہ کہتے آگ میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا، اور جو آگ میں داخل ہو گیا وہ کبھی بھی نہیں نکالا جائے گا، یہ عقیدہ بھی باطل ہے، کیونکہ کافر کو تو جہنم سے کبھی نہیں نکالا جائے، لیکن مؤمن گنہگار کو اگر سزا دی گئی تو اسے سزا کے ختم ہونے پر جہنم سے نکال دیا جائے گا۔

(۵) والزنادقة قالوا ليس لاحد ان يثبت لنفسه ربا، لان الاثبات لا يكون الا بعد ادراك الحواس وما لا يدرك لا يثبت

پانچواں فرقہ ”زنادقہ“ (زندیق کی جمع) ہے، کسی ایک کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ ”رب تعالیٰ“ ہے اس لئے کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ حواس میں آئے اور اس کا ادراک کیا جاسکے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حواس میں نہیں آتا تو اس کا ثبوت بھی ممکن نہیں۔

(۶) والحرقة زعموا ان الكافر تحرقه النار مرة ثم يبقى محترقا ابدا لا يجد حر النار  
چھٹا فرقہ ”حرقیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کافر کو ایک مرتبہ آگ جلائے گی، پھر وہ جل کر خاکستر ہو جائے گا، اور اسے دوبارہ آگ کی تکلیف کبھی بھی نہیں ہوگی، ان کا عقیدہ سراسر قرآن پاک کے ارشاد گرامی ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا﴾ کے مخالف ہے۔

(۷) والمخلوقية، زعموا ان القرآن مخلوق  
ساتواں فرقہ ”مخلوقیہ“ ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن پاک مخلوق ہے (یعنی حادث ہے، قدیم نہیں) خیال رہے کہ مختلف فرقوں کا کئی معانی میں اختلاف بھی ہے، اور کئی فرقے کسی ایک نظریہ میں متفق بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ خلق قرآن کئی فرقوں کا عقیدہ ہے۔

(۸) والفانية زعموا ان الجنة والنار يفنيان، ومنهم من قال لم يخلقا

آٹھواں فرقہ ”فانیہ“ فرقہ ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فنا ہونے والی چیزیں ہیں، اور اسی فرقہ میں ایک اور گروہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئیں، خیال رہے کہ نیچری فرقہ جنت اور جہنم کو نہیں مانتا، بلکہ جنت سے مراد دنیا کے باغات ہیں، اور جہنم سے مراد دنیا کے مصائب و آلام ہیں، یہ فرقہ بھی قرآن



وحدیث کا واضح طور پر منکر ہے، کیونکہ جنت و دوزخ کا ذکر قرآن و حدیث میں صراحت کثرت سے موجود ہے۔

(۹) والعبدیۃ جحدوا الرسل وقالوا انما هم حکماء

نواں فرقہ ”عبدیہ“ ہے، انہوں نے رسولوں کا انکار کیا ہے کہ کوئی رسول نہیں، البتہ بعض لوگ علم والے دوسروں کے راہنما رہے، وہ حقیقت میں حکماء ہیں، (ان لوگوں کو رسول سمجھ لیا گیا) یہ فرقہ بھی قرآن پاک اور حدیث پاک کے حکم صریح کا مخالف ہے۔

(۱۰) والواقفۃ قالوا لا نقول ان القرآن مخلوق ولا غیر مخلوق

دسواں فرقہ ”واقفیہ“ (وقف سے لیا گیا ہے) ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے، اور نہ ہی یہ کہتے ہیں قرآن مخلوق نہیں۔

(۱۱) والقبریۃ ینکرون عذاب القبر والشفاعة

گیارہواں فرقہ ”قبریہ“ ہے، جو قبر کے عذاب اور شفاعت کے منکر ہیں، یہ فرقہ بھی کفریہ فرقہ ہے، یہ فرقہ آجکل بہت پایا جاتا ہے، جن کو میرے پیارے حبیب پاک ﷺ نے جہنمی کہا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی، راقم کو کوئی نہ برا، کہے، بلکہ اپنے آپ کو صحیح کیا جائے، توبہ کی جائے۔

(۱۲) واللفظیۃ قالوا لفظنا بالقرآن مخلوق

بارہواں فرقہ ”لفظیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم تو قرآن کے مخلوق ہونے کا تلفظ کرتے ہیں، یعنی ہم تو بول بول کر کہہ رہے ہیں کہ (معاف اللہ) قرآن مخلوق ہے۔

### مرتبہ فرقہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) التارکیۃ قالوا یس لله عزوجل علی خلقه فریضة سوی الایمان بہ فمن آمن بہ فلیفعل ما شاء

مرتبہ میں سے پہلا فرقہ ”تارکیہ“ ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر سوائے ایمان کے کوئی چیز فرض نہیں کی، جو شخص ایمان لے آئے، وہ جو چاہے کرے، اسے کوئی نہیں پوچھا جائے گا تو نے یہ گناہ کیوں کیا تھا۔

(۲) والسائبۃ قالوا ان الله تعالى سب خلقه لیفعلوا ما شاؤا

دوسرا فرقہ ”سائبیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دے وہ جو چاہیں کرتے پھریں، ان سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہ ہو، ان کا قول (معاف اللہ) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کسی چیز کو فرض کرے، یا کسی چیز کو حرام کرے۔



(۳) والراجیة قالوا لا یسمی الطائع طائعا ولا العاصی عاصیا لانا لا ندری ماله عند الله تعالیٰ

تیسرا فرقہ ”راجیہ“ ہے، ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشی سے طاعت کرنے والے کو مطیع اور طائع نہ کہا جائے، اور معصیت کرنے والے کو عاصی نہ کہا جائے، کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اللہ کے ہاں کسی درجہ میں ہوگا، ہو سکتا ہے کہ ہم مطیع اور طائع کہتے رہیں وہ حقیقت میں عاصی ہو، اور ہم عاصی کہتے رہیں وہ مطیع اور طائع ہو، ان لوگوں کا مذہب اس لئے باطل ہے کہ ظاہر اعمال پر احکام کا دار و مدار ہے، حقیقت کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، مطلقاً ظاہر سے روگردانی درست نہیں۔

(۴) والسالیه قالوا الطاعة لیست من الایمان

چوتھا فرقہ ”سالیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ طاعت ایمان کا حصہ نہیں، یعنی یہ کہا جائے نیکیاں صرف ایمان والوں کی معتبر ہیں، اور کافروں کی معتبر نہیں، یہ غلط ہے، بلکہ کافروں کی نیکیاں بھی مقبول ہیں، کافر لوگ ایمان والوں سے زیادہ نیک ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی کافر ہے، کافروں کی تعریف کر کے ان سے ہڈی (دنیاوی حقیر مال) وصول کر رہا ہے، وہ بھی ایک کو ہڈی ڈالتے ہیں جب تک وہ ان کی ہمنوائی کی طاقت رکھتا ہے اس وقت تک اسے ہڈی پر ہڈی ڈالتے چلے جاتے ہیں، جب ذرا بھر اس کی ہمنوائی میں کمی آجاتی ہے اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں، وہ حسرت سے کبھی ادھر دیکھتا ہے، کبھی ادھر دیکھتا ہے، اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، کاش کہ مسلمانوں کو ہوش آجائے کہ وہ کافروں سے دور ہو جائیں، آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جائیں۔

(۵) والہیثۃ قالوا الایمان علم ومن لا یعلم الحق من الباطل والحلال من الحرام فهو کافر

پانچواں فرقہ ”ہیثۃ“ ہے، وہ کہتے ہیں ایمان علم ہے، جو حق و باطل اور حلال و حرام کا علم نہ رکھے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ باطل ہے، صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے مؤمن ہو گیا، اب اسے چاہئے وہ حق و باطل میں اور حلال و حرام میں فرق سمجھے، یعنی علم حاصل کرے، یہ مطلب نہیں کہ جاہل لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے۔

(۶) والعملیۃ قالوا الایمان عمل

چھٹا فرقہ ”عملیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایمان عمل ہے، جس کے عمل درست ہوئے وہ مؤمن ہے اور جس کے عمل درست نہ ہوئے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ بھی قرآن و حدیث کے مخالف ہے، صحیح عقیدہ یہ ہے کہ تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے، اور نیک اعمال کچھ فرائض ہیں، کچھ واجبات و سنن و مستحبات۔

(۷) والمنقوصۃ قالوا الایمان لا یزید ولا ینقص



ساتواں فرقہ ”منقوصیہ“ ہے وہ کہتے ہیں، ایمان زیادہ اور کم نہیں ہوتا۔

یہ مذہب باطل ہے، قرآن پاک کے مخالف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَإِذْ أَتَلَيْتُ عَلَيْهِمْ آيَاتِي زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں زیادہ کرتی ہیں ان کے ایمان کو)

(۸) وَالْمُسْتَنِيَّةُ قَالُوا الاستثناء من الايمان

آٹھواں فرقہ ”مستثنیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ استثناء ایمان کا حصہ ہے، یعنی ان کے نزدیک کوئی چیز مستثنیٰ نہیں، جو چاہیں وہ کریں، ایسا نہیں کہ یہ چیز حلال ہے سوائے فلاں کے، وغیرہ، تمام مستثنیات خود ایمان میں داخل ہیں۔

(۹) وَالْمُشَبَّهَةُ قَالُوا بصر كبصر وید كید

نواں فرقہ ”مشبہہ“ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو عام جسموں کے مشابہہ مانتے ہیں، وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ہماری آنکھوں کی طرح ہیں۔

(۱۰) وَالْحَشْوِيَّةُ قَالُوا حكم الاحاديث كلها واحد ، فعندهم ان تارك النفل كتارك الفرض

دسواں فرقہ ”حشویہ“ ہے، وہ کہتے ہیں کہ تمام احادیث کا حکم ایک ہے، ان کے نزدیک نہ ہی راویوں کی تعداد کے لحاظ پر خبر واحد، مشہور اور متواتر کی طرف کوئی تقسیم ہے اور نہ ہی راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے لحاظ پر صحیح، حسن، ضعیف کی طرف کوئی تقسیم ہے، اور ان کے نزدیک نفلوں کو ترک کرنے والا اسی طرح گنہگار ہوتا ہے جیسا کہ فرضوں کو ترک کرنے والا گنہگار ہوتا ہے۔

(۱۱) وَالظَاهِرِيَّةُ الدِّينَ نَفَوُ الْقِيَاسِ

گیارہواں فرقہ ”ظاہریہ“ ہے، یہ قیاس کے منکر ہیں، یہی فرقہ آجکل کی اصطلاح میں غیر مقلدین کا ہے، جو خود ساختہ اہل حدیث بنے بیٹھے ہیں۔

(۱۲) وَالْبَدْعِيَّةُ اُولَ مِنْ اَبْتَدَعَ هَذِهِ الْاَحْدَاثُ فِي هَذِهِ الْاُمَةِ

بارہواں فرقہ بدعیہ ہے، یہ وہ فرقہ ہے جنہوں نے بری بری بدعات اس امت میں ایجاد کی ہیں، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک، حدیث پاک، اجماع امت کے خلاف جو بدعت ہوگی وہ سیئہ کہلائے گی، بعض بدعات حرام ہوں گی، اور بعض مکروہ، لیکن بدعات حسنہ کوئی واجب، کوئی مستحب، کوئی مباح ہیں۔

فرقہ رافضیہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) الْعُلُوْبَةُ قَالُوا ان الرسالة كانت الى علي وان جبريل اخطا



رافضیہ میں سے پہلا فرقہ ”علویہ“ ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ رسالت کے حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، لیکن جبریل سے غلطی ہو گئی کہ وہ وحی حضرت محمد (ﷺ) کے پاس لے آئے۔

(۲) والامریۃ قالوا ان علیا شریک محمد فی امرہ

دوسرا فرقہ ”امریہ“ ہے، یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی (ؓ) حضرت محمد (ﷺ) کے ساتھ ان کے امر میں شریک ہیں، یعنی ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی (ؓ) اور حضرت محمد (ﷺ) دونوں ہی نبی ہیں، اور نبوت میں دونوں شریک ہیں۔

(۳) والشیعۃ قالوا ان علیا وصی رسول اللہ ﷺ وولیه من بعدہ وان الامۃ کفرت بمبايعۃ غیرہ

تیسرا فرقہ ”شیعہ“ ہے یہ کہتے ہیں حضرت علی (ؓ) کے بارے میں رسول اللہ (ﷺ) نے وصیت فرمادی کہ میرے بعد یہ میرے ولی یعنی میرے جانشین ہوں گے، بیشک تمام امت دوسروں کی بیعت کر کے (معاذ اللہ) کافر ہو گئی، اس فرقہ نے تمام صحابہ کرام کو معاذ اللہ کافر کہا، جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی بیعت کی۔

(۴) والاسحاقیۃ قالوا ان النبوة متصلۃ الی یوم القیامۃ وکل من یعلم علم اہل البیت فہو نبی

چوتھا فرقہ ”اسحاقیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت قیامت تک جاری ہے، جس کو اہل بیت کے متعلق علم حاصل ہو گیا وہ نبی ہے، یہ فرقہ ختم نبوت کا منکر ہے، اور جھوٹے نبیوں کیلئے اس فرقہ نے نبوت کا دروازہ کھولا ہے، یعنی قادیانی اسی فرقہ کی پیداوار ہیں، جن کا پہلا شکار ہی رافضی اور دیوبندی بنے، اب بریلوی حضرات ان کی ناپاک نگاہ میں ہیں۔

(۵) والناؤوسیۃ قالوا علی افضل الامۃ فمن فضل غیرہ علیہ فقد کفر

پانچواں فرقہ ”ناؤوسیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی (ؓ) تمام امت سے افضل ہیں، اگر کسی نے دوسرے کسی شخص کو فضیلت دی تو وہ کافر ہو گیا۔ (معاذ اللہ)

اس فرقہ کے مطابق بھی تمام امت (معاذ اللہ) کافر ہے، کیونکہ اجماع امت ہے اس مسئلہ پر کہ حضرت ابوبکر صدیق (ؓ) تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں، پھر حضرت عمر (ؓ)، پھر حضرت عثمان (ؓ)، پھر حضرت علی المرتضیٰ (ؓ)۔

(۶) والامامیۃ قالوا لا یمکن ان تكون الدنیا بغیر امام من ولد الحسنین ، وان الامام یعلمہ

جبریل علیہ السلام فاذا مات بدل غیرہ مکانہ

چھٹا فرقہ ”امامیہ“ ہے، وہ کہتے ہیں، دنیا کا بغیر امام کے قائم ہونا ممکن نہیں، وہ امام ضروری ہے کہ حضرت امام حسنین (ؓ) کی اولاد سے ہو، جبریل علیہ السلام امام مقرر کرتے ہیں، جب ایک امام فوت ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ قائم کر دیتے ہیں۔



(۷) والزیدية قالوا ولد الحسنين كلهم ائمة في الصلوات ، فمتى وجد منهم احد لم تجز الصلوة خلف غيرهم برهم وفاجرهم“

ساتواں فرقہ ”زیدیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نماز کی امامت کرانا صرف حضرت امام حسین ؑ کی اولاد کا حق ہے، جب آپ کی اولاد میں سے کوئی شخص موجود ہو، اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص نماز نہیں پڑھا سکتا، خواہ وہ سید نیک ہو یا فاسق وفاجر ہو۔

(۸) والعباسية زعموا ان العباس كان اولی بالخلافة من غيره“

آٹھواں فرقہ ”عباسیہ“ ہے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کے حقدار حضرت عباس ؑ تھے، ان کے نزدیک بھی دوسری خلافتیں باطل ہیں، خلیفہ بنانے والے (معاذ اللہ) کافر ہیں، حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی خلافت اجماع صحابہ سے ثابت ہے، ان کے عقیدہ کے مطابق تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ باطل ہے۔

(۹) والتناسخية قالوا الارواح تتناسخ فمن كان محسنا خرجت روحه فدخلت في خلق يسعد بعيشه“

نواں فرقہ ”تناسخیہ“ ہے، یہ تناسخ ارواح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایک نیک شخص کی روح جب نکل جاتی ہے تو دوسرے نیک بخت میں منتقل ہو جاتی ہے، دوسرا نیک بخت انسان ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ کوئی جانور بھی جسکی زندگی دوسروں کیلئے نفع مند ہو، اس میں بھی وہ روح منتقل ہو سکتی ہے۔

(۱۰) والرجعية زعموا ان عليا واصحابه يرجعون الى الدنيا وينتقمون من اعدائهم“  
دسواں فرقہ ”رجعیہ“ ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ حضرت علی ؑ اور ان کے اصحاب دنیا میں پھر لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔

(۱۱) واللاعنة يلعنون عثمان وطلحة وزبير ومعاوية و ابا موسى وعائشة وغيرهم“  
گیارہواں فرقہ ”لاعنیہ“ ہے، جو حضرت عثمان اور طلحہ اور زبیر اور معاویہ اور ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عائشہ (وغیرہم) رضی اللہ عنہم پر (معاذ اللہ) لعنت بھیجتے ہیں۔

وہ لعنت یقیناً ان کی طرف لوٹی ہے، اس لئے کہ جس پر لعنت بھیجی جائے وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ لعنت بھیجنے والے کی طرف لوٹ کر آ جاتی ہے۔

(۱۲) والمتربصة تشبهوا بزي النساك ونصبوا في كل عصر رجلا ينسبون اليه الامر يزعمون انه مهدي هذه الامة فاذا مات نصبوا آخر“



بارھواں فرقہ ”متربصہ“ ہے، یہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو درویشوں کی شکل کے مشابہ رکھتے ہیں، اور ہر زمانے میں ایک شخص کو والئی امور سمجھتے ہیں کہ یہ امت کا مہدی ہے، جو وہ مرجاتا ہے تو ایک اور شخص کو مہدی مان لیتے ہیں، یہ سلسلہ ان کا یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

## فرقہ جبریہ کی بارہ فرقوں میں تقسیم:

(۱) فمنهم المضطربة قالوا لا فعل للادمي بل الله يفعل الكل “

جبریہ فرقہ میں سے ایک فرقہ ”مضطربہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے کا کوئی فعل نہیں سب فعل اللہ تعالیٰ کے ہیں، اس فرقہ کو مضطربہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ فرقہ درحقیقت انسانوں کو گنہگار بنانے کی طرف راغب ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ کوئی فعل بندے کا نہیں، تو لوگ عیاش ہو جائیں گے، اور یہ کہیں گے کہ یہ فعل تو ہمارا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہے، گویا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے میں حلول کئے ہوتا ہے، لہذا بندے کے افعال حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں۔

(۲) والافعالية قالوا لنا افعال ولكن لا استطاعة لنا فيها ، وانما نحن كالبهائم نقاد بالجل “

دوسرا فرقہ افعالیہ ہے، یہ کہتے ہیں کہ فعل تو ہمارا ہوتا ہے، لیکن ہمیں اس میں استطاعت و اختیار حاصل نہیں ہوتا، وہ کام تو ہم سے اللہ تعالیٰ کراتا ہے، ہم تو چوپاؤں کی طرح ہوتے ہیں کہ جس طرح چوپاؤں کو رسی ڈال کر جدھر چاہیں گھماتے رہیں، اسی طرح وہ کام ہم سے جبراً کرائے جاتے ہیں۔

(۳) والمفروغية قالوا كل الاشياء قد خلقت والآن لا يخلق شئ “

تیسرا فرقہ ”مفروغیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام چیزوں جنہوں نے پیدا ہونا تھا وہ پیدا ہو چکی ہیں، اس کے بعد کسی اور چیز نے پیدا نہیں ہونا، یہ بدیہی چیزوں کا انکار ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ کوئی پیدا ہو رہا ہے، اور کوئی فوت ہو رہا ہے۔

(۴) والنجارية زعمت ان الله تعالى يعذب الناس على فعله لا على فعلهم “

اور چوتھا فرقہ ”نجاریہ“ ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دیتا ہے، لوگوں کے افعال پر عذاب نہیں دیتا، یعنی یہ لوگ معاذ اللہ بندوں کے افعال ہی نہیں مانتے، بلکہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کے مانتے ہیں، معاذ اللہ کتنا برا اور کتنا کفریہ عقیدہ ہے کہ بندے کا برا کام رب کا ہو جائے، (معاذ اللہ) تم (معاذ اللہ) برا کام تو رب کرے اور سزا بندوں کو دے، کیسے احمق ہیں یہ لوگ؟

(۵) والمنانية قالوا عليك بما يخطر بقلبك ، فافعل ماتو سمت منه الخير “



پانچواں فرقہ ”منائیہ“ ہے، وہ کہتے ہیں، جو تمہارے دل میں آئے وہی کام کرنا تم پر لازم ہے، جو کام تمہیں اچھا سمجھ آئے وہی کرلو۔

(۶) وَالْكسْبِيَّةُ قَالُوا لَا يَكْتَسِبُ الْعَبْدُ ثَوَابًا وَلَا عِقَابًا

چھٹا فرقہ کسبیہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کے کسی فعل پر کوئی ثواب اور کوئی عذاب نہیں۔

یہ فرقہ قرآن پاک کے صریح ارشاد کے منافی ہے۔

﴿بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿البقرة، آية نمبر ۸۱، ۸۲﴾

ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا سے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے، انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں، انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

(۷) وَالسَّابِقِيَّةُ قَالُوا مَنْ شَاءَ فَلْيَعْمَلْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَعْمَلْ ، فَاِنَّ السَّعِيْدَ لَا تَضُرُّهُ ذُنُوْبُهُ وَالشَّقِيَّ لَا يَنْفَعُهُ بَرُّهُ

ساتواں فرقہ سابقیہ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ جو چاہو عمل کرو، جو چاہو نہ کرو، کیونکہ نیک بخت کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے، اور بد بخت کو نیکیاں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

(۸) وَالْحَبِيَّةُ قَالُوا مَنْ شَرِبَ كَأْسَ مَحَبَّةِ اللَّهِ تَعَالَى سَقَطَتْ عَنْهُ عِبَادَةُ الْأَرْكَانِ

آٹھواں فرقہ ”حبیہ“ ہے، وہ یہ کہتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیالہ پی لیا اس سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں، یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کر لے کہ مجھے رب تعالیٰ کی محبت حاصل ہے، اس کے بعد کوئی نماز نہ پڑھے اور روزے نہ رکھے، زکوٰۃ ادا نہ کرے اور حج نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔

(۹) وَالْخَوْفِيَّةُ قَالُوا مَنْ أَحَبَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَسْعَ أَنْ يَخَافَهُ ، لِأَنَّ الْحَبِيْبَ لَا يَخَافُ حَبِيْبَهُ

نواں فرقہ ”خوفیہ“ ہے، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حبیب اپنے حبیب سے نہیں ڈرتا، اس فرقہ کا یہ عقیدہ باطل ہے، کیونکہ یہ تو رب تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ وہ محبت میں کتنا سچا ہے، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ محبت کا دعویٰ کرتا رہے لیکن وہ اس میں کامل درجہ نہ رکھتا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ کو وہ دعویٰ قبول ہی نہ ہو۔

(۱۰) وَالْفَكْرِيَّةُ قَالُوا مَنْ أَزْدَادَ عِلْمًا اسْقَطَ عَنْهُ بِقَدْرِ ذَلِكَ مِنَ الْعِبَادَةِ



دسواں فرقہ ”فکریہ“ ہے، وہ یہ کہتے ہیں جس قدر کسی کا علم بڑھتا جاتا ہے اسی مقدار کے مطابق اس سے عبادات اٹھ جاتی ہیں، اس فرقہ کی کوشش ہے کہ علماء کو جہنمی بنایا جائے، کیونکہ جتنی مقدار میں علم زیادہ ہوگا اتنی مقدار میں اس سے عبادات اٹھ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ یہ کہے میں تو بڑا عالم ہوں مجھے نمازوں، روزوں کی کیا ضرورت ہے۔

(۱۱) والخشبة قالوا الدنيا بين العباد سواء لا تفاضل بينهم فيما ورثهم ابوهم آدم  
گیارہواں فرقہ ”حشیہ“ ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا سب بندوں میں برابر ہے، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں، اسلئے کہ سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور ان کی وراثت سب کو حاصل ہے۔

(۱۲) والمنية قالوا منا الفعل ولنا الاستطاعة

بارہواں فرقہ ”منیہ“ ہے، وہ کہتے ہیں، کام بھی ہمارے ہیں، استطاعت بھی ہماری ہے، یہ فرقہ بھی رب تعالیٰ کا منکر ہے، کیونکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کسی نے کوئی استطاعت عطاء نہیں کی، یہ ہمیں خود ہی حاصل ہے، ہمیں اعمال کی کوئی توفیق عطاء نہیں کرتا، بلکہ ہم اپنی طاقت سے عمل کرتے ہیں۔ (ماخوذ از قرطبی بوضاحت)

## حاصل کلام :

ابھی تک جو بحث کی ہے، اس تمام بحث کا نتیجہ قرطبی کی مندرجہ ذیل بحث میں دیکھئے۔

وقال ابن عباس لسماك الحنفي يا حنفي الجماعة الجماعة ، فانما هلكت الامم الخالية  
لتفرقها اما سمعت الله عز وجل يقول ﴿وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک حنفی کو کہا، اے حنفی جماعت کو لازم پکڑو، جماعت کو لازم پکڑو، بیشک پہلی امتیں تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی نہیں سنا۔ ﴿وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾  
”اور تمہارا لہو اللہ کی رسی کو سب مل کر“

وفي صحيح مسلم عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ ان الله يرضى لكم ثلاثا  
ويكره لكم ثلاثا يرضى لكم ان تعبدوه ولا تشركوا به شيئا وان تعتصموا بحبل الله  
جميعا ولا تفرقوا وان تناصحوا من ولاه الله امركم ”ويكره لكم ثلاثا قيل وقال  
وكثرة السؤال واضاعة المال“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند کرتا



ہے، اور تین چیزیں تمہارے لئے ناپسند کرتا ہے، تمہارے لئے یہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور یہ کہ تھام لو اللہ کی رسی کو سب مل کر اور تفرقہ بازی نہ کرو، اور یہ کہ تم اس کی نصیحت قبول کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے امور کا والی بنایا ہے، اور تین چیزیں تمہارے لئے ناپسند کرتا ہے وہ یہ ہیں قیل وقال (بے مقصد بحثوں میں الجھنا) اور زیادہ سوال کرنا، اور مال ضائع کرنا۔

❁ ”فأوجب الله تعالى علينا التمسك بكتابه وسنة نبيه والرجوع اليهما عند الاختلاف وأمرنا بالاجتماع على الاعتصام بالكتاب والسنة اعتقاداً وعملاً، وذلك سبب اتفاق الكلمة وانتظام الشئ الذي يتم به مصالح الدنيا والدين والسلامة من الاختلاف، وأمر بالاجتماع ونهى عن الافتراق الذي حصل لاهل الكتابين هذا معنى الآية على التمام“

اس آیت کریمہ کا مکمل معنی اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر لازم قرار دیا ہے کہ ہم قرآن پاک اور حدیث پاک مضبوطی سے تھام لیں، اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو قرآن و حدیث کی طرف رجوع کریں، اور ہمیں رب تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اعتقاد اور عمل میں قرآن پاک اور حدیث پاک کو سب متفق ہو کر تھام لیں، قرآن پاک اور حدیث پاک کی طرف رجوع کرنے سے کلمات میں اتفاق حاصل ہوگا، قرآن پاک و حدیث پر اجتماع کا حکم دیا گیا، اور یہود و نصاریٰ کی طرح تفرقہ سے منع کیا گیا۔ (قرطبی)

### فائدہ جلیلہ :

وفيه دليل على صحة الاجماع جسما هو مذكور في موضعه من اصول الفقه ”والله اعلم“  
یہی آیت کریمہ اس مسئلہ پر کافی دلیل ہے کہ ”اجماع امت“ شرعی دلائل میں سے ایک عظیم دلیل ہے۔ (قرطبی)  
اجماع امت پر مختصر بحث ان شاء اللہ اسی آیت کریمہ کی وضاحت کے ضمن میں آخر میں ذکر کر دی جائے گی۔

﴿وَإِذْ كَرُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ  
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾

”اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو، جو تم پر ہیں، جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے الفت ڈالی تمہارے دلوں میں، تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی۔“

جو آیت زیر بحث ہے یہ اسی کا آخری حصہ ہے، شان نزول سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ آیت کریمہ اور اس



سے پہلی آیات اوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئیں، وہ اسلام لانے سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے، اسلام لانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی، جس کی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، یہ حقیقت میں ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا اسی احسان اور نعمت کو یاد رکھنے کا حکم دیا، کہ جب تم اللہ کی اس نعمت کو یاد رکھو گے تو یقیناً تمہاری اخوت اسلامیہ قائم و دائم رہے گی۔

زیادہ مفسرین کرام نے تو یہی مطلب بیان کیا ہے جسے ذکر کر دیا گیا، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہودی کی سازش سے اسلام لانے کے بعد ان دونوں قبیلوں کا ایک دوسرے کے سامنے لڑائی کیلئے آجانے کا تذکرہ کیا ہو کہ تم جب ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ تمہارے پاس تشریف لائے یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تم پر نعمت تھی کہ اس نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت ڈال دی، جس سے تمہاری دشمنی جاتی رہی۔ (ماخوذ از کبیر) **فائدہ جلیلہ :** واعلم ان کل من وجہہ الی الدنیا کان معادیا لأکثر الخلق ومن کان وجہہ الی خدمۃ اللہ تعالیٰ لم یکن معادیا لاحد۔

جو شخص دنیا کی طرف نظر رکھے، اس کے کام دنیاوی اغراض پر مبنی ہو وہ بہت لوگوں کا دشمن ہوتا ہے، اس کا کام انسانیت کے مطابق نہیں بلکہ خواہشات کے مطابق ہے، لیکن جس کی نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو وہ کسی کا بھی دشمن نہیں ہوتا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ جس کی حقیقت میں نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور بالتبع اس کی نظر مخلوق کی طرف ہو تو وہ سب چیزوں کو قضاء و قدر کے قبضہ میں سمجھتا ہے، اس لئے وہ کسی کے دشمنی نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ بیان کیا گیا ہے ”ان العارف اذا امر برفق ویكون ناصحا لا یعنف ویعیر فهو مستبصر بسر اللہ فی القدر“ بیشک عارف جب نرمی سے کسی کو کوئی حکم دیتا ہے تو وہ اسے نصیحت کر رہا ہوتا ہے، وہ نہ تو سختی سے حکم دیتا ہے اور نہ ہی اسے عار دلاتا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ تقدیر میں اللہ تعالیٰ کے رازوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ ”تم ہو گئے اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی“

اس سے پتہ چلا کہ اسلام کے بعد جو ان کے درمیان اچھے معاملات جاری رہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حاصل ہوئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اپنی نعمت سے ایک طاقت پیدا فرمادی جو الفت و محبت کی طرف دعوت دیتی ہے تو اس پر وہ الفت و محبت لازمی طور پر ان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ معتزلہ کا مذہب اس میں یہ ہے



کہ بندوں کے دلوں میں محبت کا پایا جانا بندوں کی اپنی تخلیق ہے، اسلئے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ نہیں، بلکہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں۔

”قال الکعبی ان ذلک بالهدایة والبیان والتحذیر والمعرفة والالطاف“  
یہی وجہ ہے کہ کعبی معزلی نے یہ کہا ہے کہ بندے خود ایک دوسرے سے محبت والفت کو پیدا کرتے ہیں،  
البتہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دیتا ہے، ان کے سامنے بیان کرتا ہے، الفت و محبت نہ کرنے پر ان کو ڈراتا  
ہے، اور الفت و محبت کی ان کو پہچان کراتا ہے، ان پر مہربانیاں کرتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

**اخوت و صداقت:** اصل الاخ فی اللغة من التوخی وهو الطلب فالاخ مقصده  
مقصدا خیه ”اخ“ لغت میں ”توخی“ سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے ”طلب“ لکھذا بھائی کا وہی مقصد ہوتا  
ہے جو اس کے بھائی کا ہوتا ہے۔

”والصدیق ماخوذ من ان یصدق کل واحد من الصدیقین صاحبه مافی قلبه ولا ینحی علیہ شئی“  
صدیق (صاد پر زبر، دال مخفف) کا معنی ہے گہرا دوست، اس وقت دوست کو ”صدیق“ کہا جائے گا،  
جب ایک دوسرے دوست کی کوئی بات مخفی نہ رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا﴾

اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے نکالا۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے دنیاوی نعمتوں کا ذکر فرمایا، اس کے بعد اخروی نعمت کا ذکر فرمایا کہ تمہیں جہنم کی آگ کے  
گڑھے سے نکالنا یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا اخروی عظیم انعام ہے، ”شفا“ (شین پر زبر، الف مقصورہ) اس کا معنی ہے کنارہ  
”شفا البیر“ کنوئیں کا کنارہ، اس کی جمع ہے ”اشفاء“ ”نقد“ ”استنقد“ ”انقد“ کا معنی ہے خلاصی دینا، نجات دینا  
”حُفْرَة“ کا معنی ہے گڑھا، معنی یہ ہے کہ تم اپنے کفر کی وجہ سے جہنم کے کنارے پر تھے، جہنم کو اس گڑھے سے تشبیہ دی جس  
میں آگ ہو، گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ تم کفر کی وجہ سے آگ کے اس طرح مستحق ہو گئے تھے کہ کوئی آگ کے گڑھے کے  
کنارے پر ہو، گرنے کے قریب ہو ”فبین تعالیٰ انه انقلهم من هذه الحفرة وقد قربوا من الوقوع فیها“  
”اسی طرح رب تعالیٰ نے اوس و خزرج کا حال بیان فرمایا کہ وہ کفر کی وجہ سے آگ میں گرنے کے قریب تھے اللہ تعالیٰ  
نے ان کو آگ میں گرنے سے بچالیا، گویا کہ آگ سے نکال لیا۔ (ماخوذ از کبیر)



دینی طلباء کرام کیلئے:

﴿فَانْقَذَكُم مِّنْهَا﴾ میں ”ہا“ ضمیر ﴿شَفَا حُفْرَةً﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے، تو یہ کس طرح صحیح ہے کہ ضمیر مَوْنُث ہے اور ”شفا“ مذکر ہے۔

**پہلا جواب:** یہ ضمیر ﴿حُفْرَةً﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ گڑھے سے نکالا، اسلئے کہ گڑھے کے کنارے سے نکالنا گڑھے سے نکالنا ہی ہے۔

**دوسرا جواب:** ضمیر ”نار“ کی طرف لوٹ رہی ہے جو مَوْنُث سماعی ہے، یعنی تمہیں آگ سے نکالا۔ ”شفا“ اور ”شفة“ دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے رہتے ہیں، اس لئے یہ ضمیر گویا کہ ”شفة“ کی طرف لوٹ رہی ہے، جو مَوْنُث ہے۔

**تیسرا جواب:** خود لفظ ”شفا“ میں تذکیر و تانیث کا احتمال پایا گیا ہے، لہذا ضمیر مذکر کی لوٹائی جائے یا مَوْنُث کی لوٹائی جائے دونوں جائز ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

دنیا کی زندگی کتنی ہے:

آیہ کریمہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ کفر پر مر جاتے تو آگ میں گر جاتے، ان کی زندگی کی مثال بیان کی گئی کہ جس طرح کوئی آگ کے گڑھے کے کنارے پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کا گڑھے میں گر جانا متوقع ہو (گر جانے کی امید کی جاری ہو) یہی حال ان لوگوں کا ہے۔

”وَهَذَا فِيهِ تَنْبِيْهُ عَلَى تَحْقِيْرِ مَدَةِ الْحَيَاةِ فَانْه لَيْسَ بَيْنَ الْحَيَاةِ وَبَيْنَ الْمَوْتِ الْمَسْتَلْزَمُ لِلْوُقُوعِ فِي الْحُفْرَةِ اِلَّا مَا بَيْنَ طَرَفِ الشَّيْءِ وَبَيْنَ ذَلِكَ الشَّيْءِ“  
اسی سے یہ مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ دنیا کی زندگی کی مدت بہت تھوڑی ہے گویا کہ زندگی اور موت کے درمیان اتنا وقفہ ہے جتنا گڑھے کے کنارے پر ہو تو گڑھے میں گر جانے میں وقفہ ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

آیات سے مراد دلائل ہیں، یعنی جس طرح یہ دلیل تمہارے لئے بیان کی اسی طرح اور بھی دلائل تمہارے



لئے بیان کرتا ہے، اس ارادہ سے کہ تم ہدایت حاصل کرلو۔

### اجماع کی مختصر بحث از حسامی مع نامی:

قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ آیہ کریمہ ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ دلالت کر رہی ہے اس پر کہ ”اجماع امت“ بھی دلائل شرع میں سے ایک دلیل ہے، جس کا ذکر اصول فقہ میں ہے، طلباء کرام کے فائدہ کیلئے اصول فقہ کی مشہور کتاب حسامی اور اس کی شرح نامی سے مختصر بحث اجماع امت کی پیش کی جا رہی ہے، زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو نور الانوار کو دیکھئے۔

### اجماع کا لغوی معنی:

اجماع کے لغوی دو معانی ہیں، ایک ”العزم من الشئ“ کسی چیز کا پختہ ارادہ کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”اجمع فلان علی کذا“ فلاں شخص نے اس کام کا پختہ ارادہ کر لیا ہے، اور دوسرا معنی اسکا ”اتفاق“ ہے، جیسا کہ کہا جائے ”اجمعوا علی هذا“ اس پر تمام کا اتفاق ہے۔

### اصطلاحی معنی:

هو اتفاق جميع المجتهدين الصالحين من امة محمد ﷺ في عصر علی واقعة“

نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک مجتہدین اصحاب علم کا ایک زمانہ میں ایک مسئلہ میں متفق ہو جانا، اجماع امت ہے۔ تعریف میں ”اتفاق“ لفظ ذکر کیا گیا ہے جو اقوال اور افعال اور سکوت اور تقریر دونوں کو شامل ہے، یعنی سب کسی مسئلہ پر بول کر اتفاق کریں، یا اس پر عمل کر کے اتفاق کریں، یا بعض کہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے، دوسرے اس پر خاموش رہیں، یا کوئی شخص عمل کر رہا ہو تو علماء مجتہدین دیکھ کر خاموش ہو جائیں، یہ سب صورتیں اجماع امت کی ہیں، جو شرعی دلیل ہے۔

”وقولنا جميع المجتهدين يخرج اتفاق بعضهم ويخرج اتفاق العوام ايضا فانهما ليسا باجماع“

”اجماع“ کی تعریف میں ”تمام مجتہدین کا متفق ہونا“ ذکر کیا ہے، جس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر بعض علماء مجتہدین کسی مسئلہ میں متفق ہو گئے اور بعض نے مخالفت کی تو وہ ”اجماع امت“ نہیں، اور وہ شرعی دلیل بھی نہیں کہ اس پر اعتبار کر کے اس مسئلہ میں عمل کیا جائے، اسی طرح عوام تمام ہی کسی مسئلہ میں متفق ہو جائیں تو ان کا اتفاق شرعی دلیل نہیں، اسے اجماع امت نہیں کہا جائے گا۔



”وقولنا الصالحین یخرج اجماع الفاسقین والمبتدعین من المجتہدین فانه لیس بحجة“

اجماع امت کی تعریف میں ”صالحین“ کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اگر علماء مجتہدین فاسق اور بدعات سیئہ پر عمل کرنے والے ہوں تو ان کا اجماع کوئی دلیل نہیں، واضح ہوا کہ حکمرانوں سے پیسے بٹورنے والے، اور پیسے لے کر ہاں میں ہاں ملانے والے اور غلط فتوے دینے والے علماء کا کسی مسئلہ میں اتفاق یا اختلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ تو ”العوام کا لانعام“ سے بھی گھٹیا اور بدترین ہیں۔

”وقولنا من امة محمد ﷺ یخرج اجماع مجتہدی الامم السابقة لانه من خصائص هذه الامة“

اور اجماع کی تعریف میں ذکر کیا ہے امت محمد مصطفیٰ ﷺ کے علماء مجتہدین و صالحین کا کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا ”اجماع امت ہے“ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ صرف نبی کریم ﷺ کا یہ خاصہ ہے کہ آپ کی امت کے ”علماء مجتہدین و صالحین“ کا اجماع دلیل ہے، ورنہ پہلی امتوں کا اجماع نہ اس وقت دلیل تھا اور نہ ہی اب دلیل ہے۔ تعریف میں ”فی عصر علی واقعة“ کہا ہے، جس سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ ایک زمانہ میں کسی مسئلہ میں علماء کا متفق ہونا ”اجماع امت“ ہے، خواہ تعداد علماء کی قلیل ہو یا کثیر ہو، اسلئے بعض لوگوں کا اس مسئلہ میں یہ کہنا غلط اور باطل ہے کہ کسی مسئلہ میں تمام مجتہدین کا ہر زمانہ میں قیامت تک متفق ہونا اجماع امت ہے۔ اس بحث سے واضح ہو گیا کہ ”اجماع“ میں کئی اقوال باطل ہیں، بعض لوگوں نے کہا ”اجماع“ صرف صحابہ کرام کا ہے، اور بعض لوگوں نے کہا ”اجماع“ صرف اہل مدینہ کا ہے، بعض نے کہا اجماع عترت نبی کریم ﷺ کا ہے، یہ تمام اقوال باطل ہیں۔

”والصحيح عندنا ان اجماع كل عصر من اهل العدالة والاجتهاد حجة ولا عبرة لقلة العلماء وكثرتهم ولا بالثبات على ذلك حتى يموتوا“

ہمارے نزدیک صحیح مذہب یہ ہے کہ ہر زمانہ کے عادل (صالحین) مجتہدین علماء کرام کا اجماع حجت ہے، علماء کی تعداد قلیل ہونے یا کثیر ہونے کا کوئی اعتبار نہیں، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ اجماع کے بعد تا حیات اسی پر قائم رہیں (بلکہ بعد میں موقف بدل جائے اور اس مسئلہ سے کسی نے رجوع کر لیا، تو اس سے اجماع میں کوئی فرق نہیں آئے گا) اہل ہوی کی اجماع کی مخالفت سے اجماع میں کوئی فرق لازم نہیں آتا۔

”اذا انعقد الاجماع على فضيلة ابي بكر فخلاف الروافض فيه غير معتبر“

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر اجماع منعقد ہے، تو رافضیوں کے اختلاف سے ”اجماع امت“ میں کوئی فرق لازم نہیں آئے گا، بلکہ رافضیوں کو رافضی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل حق کو چھوڑ دیا ہے۔



”ولا عبرة لمخالفة من لا رأى له كالعوام فى الباب الا فيما يستغنى عن الراى“

جن لوگوں کو رائے اور اجتہاد حاصل نہیں، جیسے عوام ہیں، ان کی اجماع کے خلاف مخالفت کا کوئی لحاظ نہیں، صاحب کتاب نے ”الا فيما يستغنى عن الراى“ کو مستغنى کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے، بعض احکام میں رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جیسا کہ ”نقل قرآن اور تعداد رکعات“ ان میں نہ عوام کی رائے کا کوئی اعتبار ہے، اور نہ مجتہدین کی رائے کا کوئی اعتبار ہے، کیونکہ ان چیزوں کا ثبوت خبر متواتر سے ہے، بعض احکام میں رائے کا اعتبار پایا جاتا ہے، ان میں علماء صالحین مجتہدین کا رائے میں اتفاق اجماع ہے، لیکن عوام کی رائے کا ان میں بھی کوئی اعتبار نہیں۔

اجماع کے مراتب:

سب سے قوی اجماع صحابہ کرام کا ہے۔ جس میں نص پائی جائے کہ وہ کہیں ”اجمعنا على كذا“ ہمارا اس مسئلہ میں اجماع ہے، اس اجماع کے حجت و دلیل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اسلئے اجماع صحابہ کرام کے ضمن میں اجماع اہل مدینہ بھی آگیا اور اجماع عترت رسول اللہ ﷺ بھی آگیا، ”اس اجماع کا منکر کافر ہے“

اس کے بعد اجماع سکوتی کا درجہ ہے:

اجماع سکوتی یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام کے قول میں نص ہو کہ ہم اس مسئلہ میں متفق ہیں، اور بعض اس میں خاموش ہوں، بعض کے خاموش رہنے اور مخالفت نہ کرنے کی وجہ سے اجماع ہو گیا، لیکن پہلے اجماع سے کم درجہ ہو گیا، ”لان السكوت فى الدلالة على تقرير الحكم دون النص ولذا لا يكفر جاحده“ اسلئے کہ سکوت کسی حکم کو ثابت کرنے کی دلالت میں نص سے کم درجہ رکھتا ہے، اتنا تو ہر صاحب عقل سمجھ لیتا ہے، کہ یہ کہنا کہ ہم اس میں متفق ہیں، اور خاموش رہنا لیکن مخالفت نہ کرنا، ان میں بہت بڑا فرق ہے، اسی وجہ سے اجماع سکوتی کے منکر کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

پھر ہر زمانہ کے علماء صالحین و مجتہدین کا اجماع:

لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا اجماع صحابہ کرام کے اجماع کے مخالف نہ ہو ”لهذا لا جماع بمنزلة المشهور يفيد الطمأنينة دون اليقين“ یہ اجماع خبر مشہور کے درجہ میں ہے، یہ اطمینان حاصل ہونے کا فائدہ دیتا ہے، اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا اس اجماع کا منکر کافر نہیں، لیکن شدید گنہگار ہے، جیسا کہ خبر مشہور کا منکر کافر نہیں لیکن گنہگار ہوتا ہے۔



پھر اجماع جس میں بعض صحابہ کرام کی مخالفت پائی گئی ہو:

یعنی اجماع علماء صالحین مجتہدین کا ہو، اس میں بعض صحابہ کرام کی موافقت پائی گئی ہو، اور بعض کی مخالفت، یہ اسی وقت ہوگا جب بعض صحابہ کرام کا اس میں اختلاف پایا گیا ہوگا، جیسا کہ ”ام ولد“ کی بیع (فروخت کرنے) میں صحابہ کرام کا اختلاف تھا، حضرت عمرؓ جائز نہیں مانتے تھے، اور حضرت علیؓ جائز مانتے تھے، پھر اجماع حضرت عمرؓ کے قول کے مطابق ہو گیا کہ ”ام ولد“ کی بیع جائز نہیں، یہ اجماع پہلے تین قسم کے اجماع سے کم درجہ ہے، اس کا مقام خبر واحد کا ہے، یہ قیاس پر مقدم ہوگا، عمل اس پر واجب ہوگا، لیکن اس کا منکر کا فر نہیں ہوگا ”خبر واحد کا بھی یہی حکم ہے“

اس آخری درجہ اجماع پر بحث:

یہ اجماع جس میں بعض صحابہ کرام کی مخالفت پائی گئی ہو، اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے، بعض اہل ظواہر، اور اصول فقہ والے کئی حضرات جیسے ابو بکر صیرفی شافعی، شیخ ابوالحسن اشعری، احمد بن حنبل، غزالی، امام الحرمین جوینی، اور بعض احناف رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ۔

”هذا لا يكون اجماعا حتى يبقى المسئلة اجتهادية كما كانت ويجوز لاحد ان ياخذ بالقول المخالف لهذا الجماع“

یہ اجماع ہی نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اجتہاد یہ ہے جیسے پہلے اجتہاد یہ تھا، اجماع کے بعد بھی اجتہاد یہ ہے، اس میں اگر کوئی مخالفت کرے تو جائز ہے، ان لوگوں کی اس پر دلیل یہ ہے کہ اس اجماع میں اتفاق نہیں پایا گیا، کیونکہ بعض صحابہ کی مخالفت پائی گئی ہے، پھر مخالفت جس کی گئی اس کی وفات سے بھی ”یہ اجماع دلیل نہیں بن سکے گا“ ”لان موت المخالف لا يبطل قوله“ اس لئے کہ جس کی مخالفت کی گئی اس کی وفات سے اس کا قول باطل نہیں ہوگا۔

احناف کا اس میں مذہب:

یعنی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے کثیر اصحاب اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض اصحاب کا صحیح قول اس میں یہ ہے ”اجماع علماء كل عصر حجة فيما سبق فيه الخلاف وفيما لم يسبق“ ہر زمانے کے علماء صالحین و مجتہدین کا اجماع حجت ہے خواہ پہلے حضرات میں سے بعض کی مخالفت پائی گئی ہو یا نہ پائی گئی ہو، دونوں اجماع حجت ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جس اجماع میں پہلے حضرات کی مخالفت نہیں پائی گئی وہ خبر مشہور کے درجہ میں ہے، اور جس میں اختلاف



پایا گیا وہ خبر واحد صحیح کے درجہ میں ہے۔

## اجماع کے انتقال کی اقسام:

صحابہ کرام کے اجماع کا ہماری طرف منتقل ہونا دو قسم ہے۔ ایک یہ کہ صحابہ کرام کا اجماع ہم تک ہر زمانے کے اتنے لوگوں سے پہنچے جن کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو یعنی اجماع ہم تک ہر زمانے میں اجماع سے پہنچے تو یہ خبر متواتر کے درجہ میں ہوگا۔ دوسرا یہ ہے کہ اجماع صحابہ ہم تک احاد سے پہنچے عمل کرنا اس پر واجب ہوگا لیکن علم یقین حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ اصل کے لحاظ پر تو اس میں یقین پایا گیا ہے، لیکن نقل کے لحاظ پر اس میں ظن آگیا، تاہم یہ اجماع بھی قیاس سے مقدم ہوگا۔

(حسائی مع نامی)

## فرقہ واریت ناسور ہے:

یہ جملہ عام لوگوں کے ذہنوں میں ان لوگوں نے بٹھایا ہوا جو درحقیقت فرقہ واریت کی آگ کو ہوادے کر بھڑکانے والے، یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے پیسے خرچ کر کے ملک میں افراتفری پیدا کرنے کیلئے فرقہ واریت کو پیدا کیا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کے پودوں کی آب زر سے آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنا دیا، جس کی جڑیں ملک کے کونہ کونہ میں پھیل گئیں۔

آئیے! خدا را تجزیہ کی جائے وہ کون ہیں جنہوں نے فرقہ واریت کی آگ کو بھڑکا کر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا فرقہ واریت ناسور ہے، یہ مولوی دہشت گرد ہیں، یہ تو اسی طرح کا جملہ ہے جیسا کہ چور چوری کرنے کے بعد دوسرے لوگوں سے مل کر شور کرنے لگے وہ چور گیا، وہ بھاگ گیا، وہ تنگ گلیوں میں گھس گیا، اس نے تاریک رات کا فائدہ اٹھالیا، اپنے آپ کو اسنے بچالیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ہاں ہاں اب ہر ذی شعور انسان سمجھ چکا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو ایک مرتبہ اقتدار سے چمٹ جاتے ہیں تو ڈنڈے کے زور سے اپنے ساتھ لٹھ برداروں کو ملا کر اس اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں، ان حربوں میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کو لڑاؤ حکومت چلاؤ۔

پھر ان کے مشیر جو پہلے ان کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تمہاری کامیابی کا راز صرف اس میں ہے کہ لوگوں کا لڑاؤ اور حکومت چلاؤ، نا اہل حکام، اور بے تدبیر وزیر، اور فسادی مشیر مل کر پیسہ چھانٹنا شروع کر دیتے ہیں کبھی ایک کو خرید اور



کبھی دوسرے کو، ایک دوسرے کو لڑانے کے ذرائع پیدا کئے جاتے ہیں کون نہیں جانتا کہ تخریب کار تنظیموں کو ارباب حکومت نے ہی کھڑا کیا ہے، بغیر پیچھے ہٹنے ہاتھ کے کوئی تخریب کار تنظیم دو دن بھی قائم نہیں رہ سکی، یہ صرف پیچھے خفیہ ہاتھ کے بل بوتے اور ان کو ملنے والے پیسے سے قائم و دائم رہتی ہیں، جب ان سے پیسہ دینے والے اس لئے ناراض ہو جاتے ہیں کہ تمہیں لڑانے کیلئے، تمہیں پروان چڑھانے کیلئے جو غیر مسلم ہمیں پیسہ دیتے تھے اب وہی تم سے ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ تم نے ان کا کام چھوڑ دیا، ان کی بات مانتے چلے جاتے ان کا کام کرتے رہتے تو تمہیں پیسے ملتے رہتے، تمہاری تنظیمیں برقرار رہتیں۔ تم نے تلے لگنا چھوڑ دیا ہے تو یاروں نے تم سے منہ موڑ لیا ہے، اس لئے اب تم دہشت گرد ہو، ہاں اگر تم نے پھر سے مجاہد کا لقب حاصل کرنا ہے تو نصرانیوں کے غلام بن جاؤ، ان کا کام کرو تو تمہیں پیسے بھی ملیں گے اور تمہیں مجاہد بھی کہا جائے گا۔

یہ ہے وہ سبب جس نے فرقہ واریت کو جنم لیا، اسکے جڑوں کو مضبوط کیا، ملک کو تباہ کیا ملک کے دو ٹکڑے کئے، ابھی تک سوچ وہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، پیچھے آنے والا پہلے کے نقش قدم پر چلتا ہے بلکہ دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، سب خرابی کی جڑ غیر مسلموں کی غلامی ہے، بظاہر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں، لیکن درحقیقت پہلے سے زیادہ غلامیت ہمیں حاصل ہوئی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کے یار ہی ارباب حکومت کے مشیر بے تدبیر ہوتے ہیں، جب ان کو مشورہ دے کر کہ ”لوگوں کو لڑاؤ اور حکومت چلاؤ“ میں کافی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں، ان سے کافی کام ملک کی تباہی کا مسلمانوں کو قتل کرانے کا لے لیتے ہیں تو جب ارباب حکومت ان کی ہاں میں ہاں ملانا ذرا کم کر دیتے ہیں تو اب وہ دوسری طرف آ جاتے ہیں اپنے غیر مسلم آقاؤں سے لیا ہوا پیسہ دوسری جانب چھانٹنا شروع کر دیتے ہیں، اب ان کا نعرہ یہ ہوتا ہے ”شور مچاؤ حاکم ہٹاؤ“

یہ ہیں اسباب جن کی وجہ سے کالج، یونیورسٹیاں، دکانیں، اور بازار اور گھر لڑائی کی لپیٹ میں ہیں، یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے داڑھیوں والے، جبہ و دستار والے جہلاء کو بھی خرید لیا جاتا ہے، ان سے بھی ایک دوسرے سے لڑانے کا کام لے لیا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حقیقی علماء کبھی نہیں بکے اور انشاء اللہ کبھی نہیں بکیں گے، خصوصی طور پر علماء اہل سنت بریلوی مسلک کے علماء جو بحیثیت جماعت کے قائد اعظم کے ساتھ پاکستان بنانے میں پیش پیش تھے وہ انشاء اللہ کبھی ملک کے وقار کے خلاف کام نہیں کریں گے کیونکہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیز کو بگاڑنا اہل علم کا شیوہ ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلک کے حقیقی علماء اللہ کے فضل و کرم سے تخریب کار لوگوں کا کبھی آلہ کار نہ بنے اور نہ ہی انشاء اللہ کبھی بنیں گے۔



اس لئے میرے پیارے عوام الناس! یہ جملہ ضرور یاد کریں کہ ”فرقہ داریت ناسور ہے“ لیکن اس کے اسباب کو بھی نہ بھولیں، انشاء اللہ آپ کو پتہ چل جائے کہ نام و نہاد ملک کے محافظ ہی سب تباہی کا سبب ہیں۔



وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۰۴)

(۱) اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں، اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری سے منع کریں اور یہی لوگ مراد کو پہنچے۔

(۲) اور چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو دعوت دیں بھلائی کی طرف، اور حکم دیں اچھی چیزوں کا، اور منع کریں بری چیزوں سے، اور یہی لوگ کامل کامیاب ہیں۔

ما قبل سے تعلق:

گزشتہ آیات میں اہل کتاب (یہود و نصاری) کے دو عیبوں کا ذکر فرمایا، ایک کفر کا ذکر کیا: ”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ“ اے اہل کتاب تم اللہ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو۔ اور دوسرا ان کا عیب ذکر کیا کہ وہ غیروں کو کفر میں واقع کرنے کی ناپاک جسارت کرتے تھے۔ ”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ“ اے اہل کتاب تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ایمان والوں کو۔

اہل کتاب کے عیوب ذکر کرنے کے بعد ایمان والوں کا تذکرہ فرمایا، اور ان کو ایمان و تقویٰ کا حکم دیا۔ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ“ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے، اور ہر گز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

پھر حکم فرمایا ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ اور تمام لو! اللہ کی رسی کو سب مل کر، اب اس آیہ کریمہ میں ایمان والوں کو حکم دیا کہ تم اوروں کو بھی ایمان و اطاعت کی طرف لانے کی کوشش کرو، یہی وجہ ہے ارشاد فرمایا ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو دعوت دیں بھلائی کی طرف۔ (کبیر)



## لفظ ”من“ کے متعلق بحث:

منکم، میں لفظ ”من“ تبعیض کیلئے ہے، یا تبیین کیلئے ہے، اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ تبیین کیلئے ہے، تبعیض کیلئے نہیں، ان حضرات نے اپنے موقف پر دو دلیلیں پیش کی ہیں۔

”الاول ان الله تعالى اوجب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر على كل الامة في

قوله “كنتم خيرة امة اخرجت للناس تا مرون بالمعروف و تنهون عن المنكر“ پہلی دلیل ان میں سے یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ”امر بالمعروف“ اور ”نہی عن المنكر“ کا حکم تمام امت کو دیا ہے، بعض کو حکم نہیں، ابھی آگے قریب ہی آیت کریمہ آرہی ہے، ”كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ (تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہوئے اور برائی سے منع کرتے ہوئے)

اس آیت کریمہ میں تمام امت کے ”امر بالمعروف“ اور ”نہی عن المنكر“ کا ذکر ہے، صرف بعض کا ذکر نہیں۔ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے

”لا مكلف الا و يجب عليه الامر بالمعروف والنهي عن المنكر“ کہ کوئی مکلف (عادل و بالغ) نہیں یہ کہ اس پر واجب ہے کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دے، اور برے کاموں سے منع کرے، خواہ ہاتھ سے روکے، یا زبان سے روکے، یا دل سے روکے، ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ سے ضرر کو دور کرے۔

”اذا ثبت هذا فتقول معنى هذا الآية كون امة دعاة الى الخير آمرين بالمعروف ناهين عن المنكر“ جب یہ ثابت ہے تو ہم کہتے ہیں معنی اس آیت کا یہ ہے ”ہو جاؤ تم امت بھلائی کی دعوت دو، اچھے کاموں کا حکم دو، اور برے کاموں سے منع کرو۔“

اس تمام تقریر کے بعد واضح ہوا کہ ”من“ تبیین ہے، تبعیض کیلئے نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ یہاں بھی ”من“ تبیین کیلئے ہے، اس طرح کہا جاتا ہے ”لفلان من اولاده“ جند ”فلاں“ کی اولاد لشکر ہے، اور کہا جاتا ہے ”وللامير من غلمانہ عسكر“ امیر کے غلام لشکر ہیں، ان مثالوں میں ”من“ بیانیہ ہے، تبعیض کیلئے نہیں، بعض اولاد یا بعض لشکر مراد نہیں۔

**مقام توجہ:** اگرچہ حکم تو تمام امت کو ہے، لیکن اگر بعض نے ”امر بالمعروف اور نہی عن المنكر“ پر عمل کر دیا تو باقیوں سے حکم ساقط ہو جائے گا، یعنی یہ فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں۔



## دوسرا قول :

بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ ”من“ تبعیض کیلئے، جس کا معنی ہوتا ہے ”بعض“ اب ان حضرات کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ ”من“ تبعیض کیلئے بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ قوم کے بعض لوگ اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جیسا کہ عورتیں، مریض، اور عاجز، دوسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ یہ تکلیف مختص ہے علماء کرام سے۔ اس پر دو دلیلیں موجود ہیں ایک یہ کہ یہ آیت کریمہ مشتمل ہے تین چیزوں پر۔

(۱) ”الدعوة الی الخیر“ ”بھلائی کے کاموں کی طرف بلانا“ (۲) ”والامر بالمعروف“ اچھے کاموں کا حکم دینا۔

(۳) ”والنہی عن المنکر“ برے کاموں سے روکنا، یہ کام علماء ہی کر سکتے ہیں، جہلاء نہیں کر سکتے، کیونکہ جاہل بسا اوقات باطل کی طرف بلائیں گے، برے کاموں کا حکم دیں گے، اچھے کاموں سے روکیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہل بسا اوقات اپنے مذہب کا پرچار کرے گا، دوسرے کے مذہب کو نہیں جانتا ہوگا تو اسے اچھے کاموں سے روک دے گا، جاہل نرمی کے وقت سختی کرے گا، سختی کے وقت نرمی کرے گا، اس لئے آیت کریمہ میں جب علماء کا ذکر ہے تو وہ امت کا بعض ہیں، لہذا ”من“ تبعیض کیلئے آئے گا، دوسرے مقام پر رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی تائید کر رہا ہے۔

”فَلَوْ لَا نَفَرَمِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَلَیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا

(سورة التوبة آية نمبر ۱۲۲)

اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝

تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں ہے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں، اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سنائیں، اس امید پر کہ وہ بچیں۔

دوسری یہ کہ آیت کریمہ میں مراد علماء ہیں، اس لئے کہ جب اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ کا حکم فرض کفایہ ہے تو واضح بات ہے کہ یہ کام علماء کرام ہی مستحسن طریقہ پر ادا کر سکتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

## راقم کے نزدیک محاکمہ :

جن حضرات نے ”من“ بیان کیا اور جن حضرات نے ”من“ تبعیض کیلئے کہا ہے حقیقت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں، جنہوں نے ابتداء کو دیکھا ہے (کہ اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا، یہ حکم امت کے ہر فرد کو ہے، مراد امت اجابت ہے، یعنی جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے، ان سب کو یہ حکم دیا گیا، اگر کسی ایک نے



بھی اس پر عمل نہ کیا تو سب ہی گنہگار ہوں گے) انہوں نے کہا کہ ”من“ بیان یہ ہے، مراد تمام امت ہے، جنہوں نے انتہاء کو دیکھا (کہ مطلوب تو فرض کفایہ ہے، بعض کے ادا کرنے سے حکم پر عمل ہو جائے گا، کوئی بھی گنہگار نہیں ہوگا) انہوں نے کہا ہے کہ ”من“ تبعیض کیلئے، امید ہے کہ طلباء کرام کے روشن اذہان اس محاکمہ کو قبول کریں گے کہ ابتداء کو دیکھنے سے ”من“ بیان یہ ہے، اور انتہاء کو دیکھنے سے ”من“ تبعیض کیلئے ہے۔

### ضحاک کا قول:

اس آیت کریمہ میں خطاب صحابہ کرام کو ہے، کیونکہ وہ براہ راست نبی کریم ﷺ سے علم حاصل کرتے تھے، اس لئے ان کو ہی حکم دیا کہ تم دوسروں کو بھی علم سکھاؤ، اس قول کے مطابق آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا ”کونو امة مجتہعین علی حفظ سنن الرسول ﷺ و تعلم الدین“ کہ تم تمام ایک گروہ بن کر متفق ہو جاؤ اس پر کہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی حفاظت کرنی ہے، اور دین کی تعلیم حاصل کرنی ہے۔

راقم کے نزدیک ضحاک اور جمہور کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ ابتدائی طور پر حکم صحابہ کرام کو تھا، اس طرح ضحاک کا قول ثابت ہو گیا، بعض میں عموم الفاظ کا اعتبار کرتے ہوئے تمام مؤمنین کیلئے حکم نافذ کر دیا، اس طرح جمہور کا قول ثابت ہو گیا۔

### آیت کریمہ میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا:

(۱) بھلائی کی دعوت (۲) اچھے کاموں کا حکم دینا (۳) اور برے کاموں سے روکنا۔

دینی طلباء کرام اس مسئلہ سے بخوبی واقف ہیں کہ عطف مغایریت کو چاہتا ہے، اسلئے تینوں چیزیں علیحدہ علیحدہ مراد ہوں گی۔ اسلئے ”دعوت الی الخیر“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو ثابت کرنے کیلئے دوسروں کو بھی دعوت دے، اور اللہ تعالیٰ کو ممکنات کی مشابہت سے پاک رکھے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے ﴿أَذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ﴾ (سورۃ النحل آیہ نمبر ۱۲۵) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ حکمت سے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی مفہوم کو ثابت کر رہا ہے ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ (سورۃ یوسف آیہ نمبر ۱۰۸) تم فرماؤ یہ میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میری تابعداری کرنے والے دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔



بھلائی کی طرف دعوت دینے کے بعد ایسے فعل کی رغبت دلائی گئی جو مناسب اور بہتر ہو، اسی کو ”ویامرون بالمعروف“ سے بیان فرمایا کہ وہ اچھے کاموں کا حکم دیں، اس کے بعد رغبت دلائی کہ جو کام مناسب نہیں ان کو چھوڑ دیا جائے اسی کو ”وینہون عن المنکر“ سے بیان فرمایا کہ وہ برے کاموں سے منع کریں۔ (تمام بحث ماخوذ از کبیر)

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور وہی کامل کامیاب ہیں۔“

راقم نے یہ ترجمہ بیضاوی سے لیا ہے ”وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ“ ”المخصوصون بکمال الفلاح“ اور وہی کامل کامیاب ہیں، اور اس کامل میں ان کو خصوصی کمال حاصل ہے۔ (بیضاوی)

فاسق اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے روک سکتا ہے یا نہیں؟

بعض حضرات نے اس آیت کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ رب تعالیٰ نے اچھے کاموں کا حکم دینے والوں اور برے کاموں سے روکنے والوں کے متعلق فرمایا ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ فاسقوں کو چونکہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی، لہذا ان کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں، اس قول کا رد کیا گیا ہے کہ یہ درست نہیں، اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اکثریت کا ذکر فرمایا ہے کہ اکثر لوگ جب دوسرے کو نصیحت کریں گے تو یقیناً خود بھی اس پر عمل کریں گے۔

والعلماء قالوا ”الفاسق له ان يامر بالمعروف لانه وجب عليه ترك ذلك المنكر ووجب عليه النهي عن ذلك المنكر فبان ترك احد الواجبين لا يلزمه ترك الواجب الآخر“ علماء کرام نے یہ کہا ہے کہ فاسق دوسرے کو اچھے کام کا حکم دے، کیونکہ کسی کو اچھی نصیحت نہ کرنا بھی برا فعل ہے، اور برے فعل سے بچنا بھی ضروری ہے۔ دو چیزیں واجب ہیں، ایک یہ کہ فاسق گناہوں سے باز آجائے، اور دوسری چیز واجب یہ ہے کہ فاسق دوسروں کو اچھے کاموں کا حکم دے، اگر فاسق سے ایک واجب چھوٹ رہا ہے تو دوسرا وہ نہ چھوڑے۔

”وعن السلف مروا بالخير وان لم تفعلوا“ سلف صالحین سے مروی ہے کہ اچھے کاموں کا حکم دو اگرچہ خود اس پر عمل نہ کرو۔

”وعن الحسن انه سمع مطرف ابن عبد الله يقول لا اقول ما لا افعَل فقال واينا يفعل ما

يقول؟ ود الشيطان لو ظفر بهذه الكلمة منكم فلا يامر احد بمعروف ولا ينهى عن المنكر“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے مطرف ابن عبد اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ”کہ میں وہ بات نہیں کہتا جو خود نہیں کرتا“ آپ



نے فرمایا ہم میں سے کون ہے جو کہے خود بھی اس پر عمل کرے، یعنی بعض اوقات انسان سے کوتاہی ہو جاتی ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کر سکتا، اگر شیطان نے تم سے یہ کلمہ سن لیا تو وہ بہت خوش ہوگا، کیونکہ اس طرح تو اچھے کاموں کا حکم دینے والا اور برے کاموں سے منع کرنے والا کوئی ملے گا نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

☆ روی انه عليه السلام سئل من خير الناس قال امرهم بالمعروف والنهي عن المنكر واتقاهم لله واصلهم للرحم

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے بہتر کون ہے، تو آپ نے فرمایا، جو اچھے کاموں کا حکم دینے والا ہو، اور برے کاموں سے روکنے والا ہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہو اور صلہ رحمی کرنے والا ہو۔ (ماخوذ از بیضاوی)

”والامر بالمعروف يكون واجبا مندوبا على حسب ما يؤمر به والنهي عن المنكر واجب كله لان جميع ما انكره الشرع حرام“

اچھے کاموں کا حکم دینا بھی واجب ہوتا ہے اور بھی مستحب ہوتا، جیسا امر کا تقاضا ہوگا ایسا ہی حکم ہوگا، لیکن برے کاموں سے روکنا ہمیشہ واجب ہوگا، کیونکہ جمیع کام شریعت کے مخالف حرام ہوں گے، حرام سے روکنا واجب ہوگا۔

لیکن علامہ بیضاوی کے اس آخری قول کو شیخ زادہ نے رد کیا ہے:-

قوله (والنهي عن المنكر واجب كله) قال التحرير التفتازاني فيه نظر اذ المكروه منكر يندب تركه ولا يجب والالكان حراما

”علامہ بیضاوی کا یہ کہنا کہ تمام برے کاموں سے روکنا واجب ہے“ یہ درست نہیں، اس لئے کہ بعض برے کام مکروہ ہوتے ہیں، ان سے روکنا مستحب ہے، اگر تمام برے کاموں سے روکنا واجب ہو تو تمام کام حرام ہوں گے، حالانکہ کوئی برے کام مکروہ ہوں گے۔ (شیخ زادہ)

راقم کے نزدیک علامہ بیضاوی کا قول مقید ہے کہ وہ برے کام جو حرام کے درجہ میں ہیں، ان تمام سے روکنا واجب ہے۔

**طریقہ تبلیغ:** يبدأ في الامر بالمعروف والنهي عن المنكر بالارفق مترقيا الى الاغلظ فالاعلظ “ اچھے کاموں کے حکم دینے کی ابتداء اور برے کاموں سے روکنے کی ابتداء نرم کلام سے کرے، اگر نرم کلام کو ہی وہ تسلیم کر لے تو بہتر بات، ورنہ آہستہ آہستہ کلام میں سختی کرتا جائے۔

”ثم اذالم يتم الامر بالتغليظ والتشديد وجب عليه القهر باليد“



اگر سخت کلام اور زوردار کلام کا ان پر کوئی اثر نہ ہو تو اب ضروری ہو جائے گا کہ ان کو ہاتھ سے سمجھایا جائے، یعنی اگر طاقت حاصل ہو تو ان کی سرزنش کی جائے، ان کو تھپڑ رسید کئے جائیں۔ ”فان عجز باللسان وان عجز بالقلب“ اگر ہاتھ سے روکنے کی ان کو طاقت حاصل نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی روک نہ سکے تو دل سے ان کو برا سمجھے۔

خیال رہے یہ سب سے کم درجہ ہے ایمان کا، اگر برے شخص کو برا نہ سمجھا جائے تو اس انسان کا ایمان کامل نہیں، پہلے نرمی سے بات کرے، نرمی سے بات نہ بنے تو پھر سختی سے کلام کرے، اس قول کو رب تعالیٰ کے ارشاد سے تائید حاصل ہے۔  
”وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ“

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کراؤ، پھر اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

اس آیت کریمہ میں ”قدم الاصلاح على القتال“ اصلاح کو قتال سے پہلے ذکر کیا، جس سے پتہ چلا کہ نرم کلام سے سمجھانا پہلے ہے اور سخت کلام کا درجہ اس کے بعد ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)

امر بالمعروف، نہی عن المنکر پر احادیث مبارکہ:

عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فليسانه فان لم يستطع فليقلبه وذلك اضعف الايمان“  
(”رواہ مسلم“ مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص تم میں سے برے کام کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے، اور اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو دل سے، یہ ضعیف ایمان ہے۔

## وضاحت حدیث:

”والخطاب للصحابه اصالة ولغيرهم تبعاً“

اس حدیث پاک میں اصل میں خطاب تو صحابہ کرام کو ہے، اور بالتبع تمام امت کو یہ حکم شامل ہے، ”منکم“ میں ”من“ تبعیض کیلئے جس پتہ چلا کہ ”امر بالمعروف“ اور ”نہی عن المنکر“ فرض کفایہ ہے۔

تنبیہ: وایماء الى انه لا يباشر الامن يعرف مراتب الاحسان وتفاوت المنكرات



ویمیز بین المتفق علیہ والمختلف فیہ منها ، وهذا المعنی مقتبس من قوله تعالى  
”وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“

حدیث پاک میں اس مسئلہ کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ شخص دوسروں کو دعوت دے جو صاحب علم ہو، احسان کے مراتب وہ جانتا ہو، اور منکرات کا فرق اسے پتہ ہو، اور یہ اسے علم ہو کہ اس مسئلہ میں اہل علم کا اتفاق ہے، اور اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف، یہ تمام معنی درحقیقت اللہ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ سے لیا ہے۔

ہاتھ سے بری چیز کو روکنے کا ایک مطلب:

”يمنعه بالفعل بان يكسر الآلات ويريق الخمر ويرد المصوب الى مالكة“

جب کسی میں برائی دیکھے تو اس کے برے فعل کو ہاتھ سے روکے یعنی اس کے لہو و لعب کے آلات کو توڑ دے، اور اس کی شراب کو بہا دے، اور اگر اس نے کسی کی کوئی چیز غصب کی ہو تو اس سے لے کر مالک کو واپس کر دے۔

قول سے برائی کا بدلنا:

(فان لم يستطع فبلسانه) ای فلیغیرہ بالقول وتلاوة ما نزل الله من الوعيد عليه وذكر الوعظ والتخويف والنصيحة“

اگر ہاتھ سے برائی کو تبدیل کرنے (روکنے) کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے اس برائی کو تبدیل کر دے یعنی قرآن پاک کی وہ آیات پڑھ کر سنائے جن میں برائی پر وعید آئی ہوئی ہے، اور وعظ و نصیحت فرمائے، اور خوف دلائے۔

دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب:

(فان لم يستطع فبقلبه) بان لا يرضى به وينكر في باطنه على متعاطيه فيكون تغييرا معنويا اذ ليس في وسعه الاهل هذا القدر من التغيير“

اگر زبان سے برائی کو تبدیل کرنے کی طاقت نہ رکھے تو دل سے برائی کو تبدیل کرے، دل سے برائی کو تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ”اس کی برائی کو پسند نہ کرے، اور دل سے اس کے گناہوں کے ارتکاب کو برا سمجھے، یہ تغیر معنوی ہے، ورنہ دل سے کسی کی برائی کو تبدیل کرنے کی اسے وسعت حاصل نہیں۔



دل سے برا سمجھنا اضعف ایمان ہے:

یعنی اگر برے شخص کو دل سے برا سمجھتا ہے، لیکن زبان سے نہیں روکتا تو یہ ایمان کے شعبوں میں سے کم درجہ کا ایمان ہے، اسلئے کہ قوی ایمان اس ارشاد نبوی سے واضح ہے ”افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر“ افضل جہاد یہ ہے کہ کلمہ حق بیان کرے ظالم بادشاہ کے سامنے، اور اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کی شان ان الفاظ مبارکہ سے بیان کی ہے ﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

بعض علماء نے تین مدارج اس طرح بیان کئے:

”وقد قال بعض علمائنا الامر الاول للامراء، والثاني للعلماء، والثالث لعامة المؤمنين“

بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ ہاتھ سے برائی کو تبدیل کرنے کا حکم ارباب حکومت کو ہے، اور دوسرا حکم یعنی زبان سے روکنے کا حکم علماء کو ہے، اور دل سے برا سمجھنے والا حکم عام مومنین کو ہے۔ راقم کے نزدیک اس قول اور پہلی وضاحت میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ مطلب یہ بھی ہے اور پہلا بھی ہے۔

اضعف ایمان کا مطلب:

معصیت کا انکار دل سے کرنا، یہ ایمان کے مراتب میں سے کم درجہ ہے۔

”لانه اذا رأى منكرا معلوما من الدين بالضرورة فلم ينكره ولم يكرهه ورضى به واستحسنه كان كافرا“

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان دوسرے میں برائی دیکھے، اس برائی کا برا ہونا دین میں واضح طور پر بغیر کسی شک و شبہ سے ثابت ہو، اس برائی کا انکار نہ کرے، اور اس برائی کو برا نہ سمجھے، بلکہ اس برائی پر راضی ہو اور اسے مستحسن (اچھا) سمجھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

**سوال:** حدیث پاک سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ ہوتا ہے، یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے، اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب کس طرح صحیح ہوگا کہ وہ کہتے ہیں، ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، ایمان کا صرف ایک ہی درجہ ہے۔

**جواب:** ”معناه اضعف لمرات الایمان“ والانکار بالقلب منها“

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ایمان کے ثمرات ضعیف ہوں گے، صرف دل سے برائی کو برا سمجھنا اسی قبیلہ سے ہے۔



**اعتراض:** ابھی تم نے پہلے بیان کیا ہے کہ برائی کو دل سے بھی برانہ سمجھنا کفر ہے، وہ کس طرح صحیح ہے۔

**جواب:** ثمرات ایمان کبھی قوی ہوتے ہیں، اور کبھی ضعیف ہوتے ہیں، قوی سے دوری کفر ہے، ہم نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ مکمل یہ ہے کہ برائی کا انکار نہ کرے، برائی کو برانہ سمجھے، برائی کو اچھا سمجھے، اور برائی پر راضی ہو تو کفر ہے، اور اگر ضعیف ثمرات سے دوری ہو تو فسق ہے جیسا کہ برے شخص کو دل سے برانہ سمجھے، لیکن برائی کو اچھا نہ سمجھے، اور برائی پر راضی نہ ہو۔

(ماخوذ از مرقاة جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۲۸)

عن النعمان بن بشیر قال قال رسول الله ﷺ مثل المداهن في حدود الله والواقع فيها مثل قوم استهموا سفينة فصار بعضهم في أسفلها و صار بعضهم في أعلاها فكان الذي في أسفلها يمر بالماء على الذين في أعلاها فتأذوا به فأخذ فأسا فجعل ينقر أسفل السفينة فأتوه فقالوا مالک قال تأذيتم بی ولا بدلی من الماء فان اخذوا على یدیه انجوه ونجوا انفسهم وان تركوه اهلكوه واهلكوا انفسهم

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

نعمان بن بشیر کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں کوتاہی سے کام لینے والے اور ان حدود کی وجوہ کے مرتکب لوگوں کی مثال اس طرح ہے، جس طرح ایک قوم کشتی میں بیٹھنے کیلئے قرعہ ڈالیں قرعہ نکلنے پر بعض نیچے ہوں اور بعض اوپر ہوں، سب سے نیچے حصہ میں جو پانی گزرنے کے ساتھ حصہ ہے اس میں ایک شخص کو اوپر والوں نے کوئی اذیت پہنچائی ہو، اس نے کلباڑا لے کر کشتی کو نیچے سے سوراخ کرنا چاہا، وہ اوپر والے اس کے پاس آگئے، اور اس سے پوچھا تمہیں کیا ہوا؟ اس نے کہا تم نے مجھے ایذا پہنچائی، اب مجھے پانی کی ضرورت ہے (میں کشتی کو سوراخ کر کے پانی حاصل کرنا چاہتا ہوں) اگر ان لوگوں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا تو اس کو بھی بچا لیا اور اپنے آپ کو بھی بچا لیا، اور اگر اسے اسی طرح چھوڑ دیا تو اسے بھی ہلاکت میں ڈال دیا، اور اپنے آپ کو بھی ہلاکت میں ڈال لیا۔

## وضاحت حدیث:

”مثل المداهن في حدود الله والواقع فيها“

اللہ کی حدود میں کوتاہی کرنے والوں اور ان میں واقع ہونے والوں کی مثال ”المداهن ای المتساهل“ ”مداهن“ کا معنی سستی کرنا، کوتاہی کرنا ”فی حدود اللہ“ (اللہ کی حدود میں) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم کرنے میں سستی سے کام لے یعنی حدود قائم نہ کرے، یا مراد یہ ہے کہ دوسروں کو گناہوں سے نہ روکے جو حدود قائم



کرنے کا ذریعہ ہیں۔

”حدود اللہ“ کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اسلئے کہ یہ بہت بڑے گناہوں کے ارتکاب پر لازم آتی ہے، دوسری وجہ ان کے ذکر کی تخصیص کی یہ ہے ”ان ضررها قد يتعدى الى غير فاعلها“ کہ ان گناہوں کے باعث حدود نافذ نہ کرنے کا ضرر (نقصان) دوسروں کو بھی ہوتا ہے جو ان کے مرتکب نہیں ہوتے۔

”ويمكن ان يراد بالحدود مطلق المعاصي فذكر الحدود لتغليب الاقوى“ ممکن ہے مراد حدود سے مطلقاً گناہ ہوں، البتہ ان کو ”حدود“ سے اس لئے تعبیر کر دیا کہ باعث حدود گناہ چونکہ بہت بڑے گناہ ہیں، قاعدہ تغلیب کا لحاظ کرتے ہوئے حدود کو غالب سمجھتے ہوئے ذکر کر دیا اور باقیوں کو اس کے تابع کر دیا۔

”اولان حد كل معصية معروف مقرر“ یا وجہ یہ ہے کہ ہر معصیت کو حد کہنا بھی مشہور و معروف ہے کہا جاتا ہے حد سے تجاوز نہ کرو، یعنی گناہوں کا ارتکاب نہ کرو۔

**والواقع فيها:** (اور ان میں واقع ہونے والے) یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود میں کوتاہی کرنے والے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کی مثال۔

عربی زبان کا کمال:

وفي التعبير بالواقع فيها اشارة الى بسبب المعصية كانه طارح من علو منزلته في هوى بشر عميق ومكان سحيق“

باعث حدود گناہ کرنے والوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ”والواقع فيها“ کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے یہ اشارہ فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے انسان بلند مرتبہ سے خواہشات کے گہرے کنوئیں اور تنگ مکان میں گر جاتا ہے، یہ اشارہ لفظ ”واقع“ سے ملا ہے، جس کا کبھی معنی ہوتا ہے ”طارح“ کرنے والا۔

مداہنت اور مدارات میں فرق:

مداہنت ناجائز ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے، اور مدارات جائز ہے، شریعت نے اس کا حکم دیا ہے۔

”ان المداهنة في الشريعة ان يري منكرا ويقدر على دفعه ولم يدفعه حفظا لجانب مرتكبه او جانب غيره لخوف او طمع او الاستحياء منه او قلة مبالاة في الدين“



شرعی اصطلاح میں مداخلت اسے کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کسی کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے، اور اسے طاقت بھی حاصل ہو برائی سے روکنے کی، لیکن نہ روکے، اس کے نہ روکنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ برے شخص کی حفاظت کرتا ہے، کبھی کسی دوسرے شخص کا اسے خوف ہوتا ہے کہ تم کون ہوتے ہو فلاں کو برائی سے روکنے والے، اور کبھی برائی کے مرتکب سے، اسے لالچ ہوتی ہے کہ وہ میری مالی معاونت کرتا ہے، مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اسے برائی سے منع کروں، اور کبھی یہ شرم محسوس کرتا ہے کہ میں اسے کیسے منع کروں مجھے تو اس سے شرم آتی ہے، یا یہ شخص دین کی کچھ پرواہ ہی نہیں کرتا اس لئے اسے برائی سے منع نہیں کرتا۔

”والمداواة موافقته بترك حفظ نفسه وحق يتعلق بماله وعرضه فيسكت عنه دفعا للشروع الضرر“ مدارات یہ ہے کہ اپنے مال اور اپنی عزت سے تعلق رکھنے والے حقوق کو معاف کر دینا تا کہ شرور ہو جائے، اور کسی کو نقصان نہ ہو، میرا نقصان ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، یہ اچھا فعل ہے اسے شریعت میں پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں جائز امداد پائی گئی ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ”فدارهم مادمت في دارهم“ ان سے مدارات کر جب تک تو ان کے گھر میں موجود ہے، مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر بندوں سے تکلیف برداشت کرنا پسندیدہ عمل ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے:

”ان المداواة انما تكون في الباطل مع الاعداء والمداواة في امر حق مع الاحباء“ باطل طریقے سے دشمنوں کی امداد کرنا مداخلت ہے، اور جائز طریقے سے احباب سے امداد کرنا مدارات ہے۔

مثال اور مثل لہ کا بیان:

نبی کریم ﷺ نے ”اللہ کی حدود میں کوتاہی کرنے والے کو کشتی سے اوپر حصہ میں بیٹھنے والوں سے تشبیہ دی“ ”اور حدود میں واقع ہونے والوں کو کشتی کے نیچے حصہ والوں سے تشبیہ دی“ گناہوں کے مرتکبین جو گناہوں میں کامل طور پر واقع ہو گئے، اور اس سے نکل نہیں سکے ان کو تشبیہ دی کشتی میں سوراخ کرنے والے سے ”اور جو برائی سے روکنے والے ہیں ان کو تشبیہ دی ان لوگوں سے جو کشتی میں سوراخ کرنے والے کو روکیں۔

**حاصل کلام :** والمعنى انه كذلك ان منع الناس الفاسق عن الفسق نجا، ونجوا من عذاب الله تعالى وان تركوه على فعل المعصية ولم يقيموا عليه الحد حل بهم العذاب وهلكوا بشؤمه



معنی اس کا یہ ہے کہ اگر لوگ فاسق کو برائی سے منع کریں تو وہ فاسق بھی اور یہ لوگ بھی رب تعالیٰ کے عذاب سے نجات پا جائیں گے، اور اگر اسے برائی سے نہیں منع کرتے اس پر حدود نافذ نہیں کرتے تو تمام پر رب تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا، اور فاسق کی نحوست کی وجہ سے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۰، ۳۳۱)

وعن اسامة بن زيد قال قال رسول الله ﷺ يجرى بالرجل يوم القيامة فيلقى في النار فتندلق اقبابه في النار فيطحن فيها كطحن الحمار برحاه فيجتمع اهل النار عليه فيقولون اي فلان ماشانك اليس كنت تأمرنا بالمعروف وتنهانا عن المنكر قال كنت آمركم بالمعروف ولا آتبه وانهاكم عن المنكر وآتبه

(رواه البخاری و مسلم ، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا تو اسے آگ میں ڈالا جائے گا، تو جلدی ہی آگ میں اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی، تو وہ ان میں گھومے گا جیسا کہ گدھا آٹے والی چکی کے ارد گرد گھومتا ہے، آگ والے (جہنمی) لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے، وہ کہیں گے اے فلاں شخص تیرا کیا حال ہے کیا تو ہمیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور برے کاموں سے روکتا تھا، تو وہ کہے گا، ہاں میں تمہیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور خود ان پر عمل نہیں کرتا تھا، اور تمہیں برے کاموں سے روکتا تھا اور خود برے کام کرتا تھا۔

”قال المظھر ای يدور ويدور في اقبابه يعني يدور حول اقبابه ويضربها برجله“

اپنی انتڑیوں میں پھرنے کا یہ حکم ہے کہ وہ ان کے ارد گرد پھرے گا اور ان کو اپنے پاؤں سے مارے گا۔

(مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۱)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”فتندلق ای تخرج سریعًا اقبابه ای امعاؤہ فیطحن بصیغة الفاعل علی الصحیح ای

يدور فيها ای فی اقبابه كطحن الحمار برحاه ای كدورانه حول رحاه“

(مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۱)

عن حذيفة ان النبي ﷺ قال والذي نفسي بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن

المنكر او ليوشكن الله ان يبعث عليكم عذابا من عنده ثم لتدعنه ولا يستجاب لكم

(رواه الترمذی، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ”تم ضرور بر ضرور اچھے کاموں کا حکم دو گے یا برے کاموں سے روکو گے“ یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف



سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس سے دعاء کرو تو تمہاری دعاء کو قبول نہ کیا جائے۔

”والمعنى والله ان احد الامرین واقع اما الامر والنهی منکم واما انزال العذاب من ربکم ثم عدم استجابة الدعاء له فی دفعه عنکم“

مطلب یہ کہ ”قسم ہے اللہ تعالیٰ کی دو چیزوں سے ایک کا وقوع ضروری ہے یا اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا پایا جائے گا، اگر یہ چیز نہ پائی گئی تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، اس عذاب کے دور ہونے کی تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۲)

عن ابی ہریرۃ لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنکر اولیسلطن اللہ علیکم شرارکم فیدعو خیارکم فلا یتجاب لہم“

(رواہ الطبرانی فی الاوسط، وھکذا رواہ البزار، مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت آتی ہے کہ ”ضرور بر ضرورت تم اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو“ یا تم پر اللہ تعالیٰ شریر لوگوں کو مسلط کر دے گا، تو (ان سے نجات کیلئے) نیک لوگ دعائیں کریں گے، ان کی دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

اس حدیث پاک کو دیکھئے اور آجکل کے حالات کو دیکھئے تو اس کا وقوع سو فیصد ہو چکا ہے، کیونکہ علماء امر بالمعروف، نہی عن المنکر سے پیچھے ہٹ گئے تو رب تعالیٰ نے ان پر شرار کو مسلط کر دیا ہے اب ہر ہاتھ میں تسبیح دیکھتا ہوں، دعائیں کی جا رہی ہیں، شرار سے جان چھوٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔

وعن العرس بن عمیرۃ عن النبی ﷺ قال اذا عملت الخطیئة فی الارض من شہدھا فکرمھا کان کمن غاب عنها فرضیھا کان کمن شہدھا“

(رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

عرس بن عمیرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب گناہوں کا ارتکاب زمین میں کیا جائے گا جس نے ان برائیوں کو دیکھ کر انہیں ناپسند سمجھا (خواہ دل سے ہی) تو وہ شخص ایسا ہوگا جیسا کہ برائیوں کے ارتکاب کے وقت کوئی موجود ہی نہیں تھا، (یعنی اس کی کوئی گرفت نہیں ہوگی) اگر ایک شخص برائیوں کے ارتکاب پر تو موجود نہیں تھا لیکن وہ ان برائیوں پر راضی رہا، انہیں پسند کیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ برائیوں کے وقت موجود تھا، حدیث پاک سے واضح ہے کہ برائی کو برا سمجھنا باعث نجات ہے، برائی کو اچھا سمجھنا باعث عذاب ہے۔

وعن ابی بکر الصدیق قال یاایہا الناس انتم تقرؤن هذه الآیة (یاایہا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم) فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان الناس اذا



رؤا منكر انهم يغيروه يوشك ان يعمهم الله بعقابه ”رواه ابن ماجه“ وفي رواية ابي داود اذاراوا الظالم فلم ياخذوا على يديه اوشك ان يعمهم الله بعقاب، وفي اخرى له مامن قوم يعمل فيهم بالمعاصي ثم يقدرن على ان يغيروا الا يوشك ان يعمهم الله بعقاب وفي اخرى له ما من قوم يعمل فيهم بالمعاصي هم اكثر ممن يعمله“

حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے فرمایا، اے لوگو تم یہ آیت کریمہ پڑھتے ہو۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ“

(اے ایمان والو تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو) میں نے تو نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ”بیشک لوگ جب برائی کو دیکھیں تو اسے نہ بدلیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب مسلط کر دے (یہ روایت ہے ابن ماجہ کی) اور ایک روایت ابو داؤد کی یوں ہے ”لوگ جب ظالم کو دیکھیں تو اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب مسلط کر دے، اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے ”کوئی قوم ایسی نہیں کہ ان میں برائیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہو وہ اس برائی کو تبدیل کرنے پر قادر بھی ہوں، پھر نہ تبدیل کریں مگر یہ کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر عام عذاب بھیج دے“ ابو داؤد کی ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی ایسی قوم نہیں جن میں برائیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہو، وہ لوگ زیادہ ہوں، برائی کے مرتکب کم ہوں (جب وہ ان کو نہ روکیں، حالانکہ روکنے پر قادر ہوں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام عذاب دے گا) یعنی برائیوں کے مرتکبین، اور ان کو نہ روکنے والے سب ہی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

## وضاحت حدیث:

حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم آیت کریمہ کے ظاہر معنی کو دیکھ کر غلطی کا شکار ہو رہے ہو، جس کا تم مطلب یہ لے رہے ہو کہ انسان خود اچھے عمل کرے، برائیوں سے رکے، دوسروں کو اچھے کام کا حکم دے یا نہ دے، اور دوسروں کو برائی سے روکے یا نہ روکے، اس کیلئے کوئی حرج نہیں، بلکہ وہ خود توحید پر ہے، آیت کریمہ کا جو تم مطلب سمجھ رہے ہو، وہ نہیں، اگر یہی مطلب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ یہ ارشاد کیوں فرماتے ”بیشک لوگ جب برائی کو دیکھیں اسے نہ تبدیل کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام عذاب دے دے“

آیت کریمہ کا مطلب:

اس سے پہلی آیت کریمہ کے آخری الفاظ پر ایک نظر ڈالئے وہ الفاظ مبارکہ یہ ہیں ﴿وَأُولَٰئِكَ أَتِبَاءٌ وَّهُمْ



لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿﴾ (کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانیں اور نہ راہ پر ہوں) ان دونوں آیتوں کا آپس میں باہمی ربط ابن ابی حاتم کی روایت سے واضح ہے، وہ یہ ہے۔

”انما انزلت هذه الآية لان الرجل كان يسلم ويكفر ابوه ويسلم الرجل ويكفر اخوه فلما دخل قلوبهم حلاوة الايمان دعوا آباءهم واخوانهم فقالوا حسبنا ما وجدنا عليه آباؤنا فانزل الله ”يا ايها الذين آمنوا عليكم انفسكم“ الآية“

بیشک کبھی کوئی انسان اسلام قبول کر لیتا اور اس کا باپ کافر ہوتا، اور کبھی کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا اس کا بھائی کافر ہوتا، اسلام لانے والوں میں جب ایمان کی حلاوت داخل ہو جاتی، وہ اپنے آباء اور اپنے بھائیوں کو اسلام کی دعوت دیتے، تو ان کے کافر باپ اور بھائی یہ جواب دیتے ”ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا“ (تو وہ پریشان ہوتے) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ“  
(اے ایمان والو تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہ پر ہو)

تفسیر بیضاوی میں ہے ”والآية نزلت لما كان المؤمنون يتحسرون على الكفرة ويتمنون ايمانهم“ کہ جب مؤمن کافروں پر حسرت رکھتے اور تمنا کرتے کہ کاش کہ یہ ایمان لے آئیں، تو اس وقت آیت کریمہ نازل ہوئی۔  
(بیضاوی)

عذر کی وجہ سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے ترک کی اجازت:

وفي هذه الآية رخصة في ترك الحسبة اذا علم عدم قبولها او فيها مفسدة او اضرار له منها اتفقت عليه كلمة السلف على ذلك والاحاديث تدل عليه“  
اس آیت کریمہ میں عذر کی وجہ سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کے چھوڑنے کی اجازت ہے، جب اسے یہ معلوم ہو کہ میری بات یہ لوگ نہیں سنتے، یا اسے یہ خیال ہو کہ اگر میں نے ان کو اچھے کاموں کا حکم دیا، یا برائیوں سے منع کیا تو یہ فساد برپا کریں گے، یا اسے خطرہ ہو کہ یہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں گے تو اسے اجازت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے، اس مسئلہ پر سلف و صالحین کا اتفاق ہے، اور اس پر احادیث بھی دلالت کر رہی ہیں۔ (تفسیر المعین الضعوی) (ماخوذ از مرقاۃ جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۳۳)

وعن ابی ثعلبة فی قوله تعالى عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم فقال اما والله لقد سالت عنها رسول الله ﷺ فقال بل اتتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر



حتى اذا رايت شحا مطاعا وهوى متبعا ودنيا مؤثرة واعجاب كل ذي رأى براه  
ورأيت امر الابد لك منه نعليك نفسك ودع امر العوام فان ورائكم ايام الصبر  
فمن صبر فيهن قبض على الجمر للعامل فيهن اجر خمسين منكم

(رواه الترمذی وابن ماجه، مشکوة باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ مِنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ کے متعلق قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ہے، تو آپ نے فرمایا بلکہ تم اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو، یہاں تک کہ جب تم دیکھو بخل مطاع کو (یعنی تم دیکھو ایسے شخص کو جو بظاہر تمہارا مطیع ہو اور حقیقت میں غیر کے تابع ہو) اور خواہشات کا تابع ہو، اور دنیا کو وہ (امور دین اور درجات آخرت پر) ترجیح دیتا ہو، اور ہر رائے دینے والے کی رائے کو پسند کرتا ہو (یعنی قرآن پاک وحدیث، اجماع اور قیاس کی طرف اس کی نظر نہیں ہوتی) اور تم اس سے کوئی امر ضروری طور پر دیکھو (یعنی تم اس سے کوئی برائی دیکھو، لیکن تمہارا عذر، اور تمہاری مجبوری ہو کہ تم اس سے چھٹکارا بھی نہیں پاسکتے، لیکن تمہیں یہ بھی خطرہ ہو کہ اگر میں یہاں لوگوں کے ساتھ کھڑا رہا اور اسے برائی سے بھی نہ روک سکا تو میں خود بھی اس برائی کا مرتکب ہو سکتا ہوں) تو ایسی صورت میں تمہارا یہ کام واجب ہے کہ تم اس سے بچاؤ۔ ”دع امر العوام“ اور عوام کا معاملہ چھوڑ دو“ (یعنی عام لوگ جو خواہش کے طریقہ سے دور ہیں، ان کا طریقہ چھوڑ دو)

”وحاصله انه اذا رایت بعض الناس يعملون المعاصی ولا بدلك من السكوت  
لعجزك فاحفظ نفسك عن المعاصی واترك الامر بالمعروف والنهي عن المنكر  
واشتغل بنفسك ودع امر الناس الى الله فانه تعالى لا يكلف نفسا الا وسعها“

حاصل کلام یہ ہے کہ جب تم دیکھو کہ بعض لوگ برائیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، لیکن تم اپنی مجبوری اور معذوری کی وجہ سے خاموش ہو، تو تم پر ضروری ہے کہ اپنے نفس کو برائیوں سے بچالو، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دو، اور خود اچھے کاموں میں مشغول رہو، اور برے کاموں سے اجتناب کرتے رہو، اور لوگوں کا معاملہ اللہ کی طرف چھوڑ دو، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

”فان وراءكم ايام الصبر“ بیشک تمہارے لئے اس کے سواء صبر ہے“ (یہاں دو مطلب ہیں ”فان ورائكم ای قدامکم من الازمان الآتية او خلفکم من الامور الہادیة“ وراء“ کا معنی ہے ”سواء“ جو آگے اور



پیچھے دونوں کو شامل ہے، یعنی تم آنے والے زمانہ میں صبر کرو، یا معنی یہ ہے کہ تم اپنے پیچھے ایسے امور سے صبر کرو جو تمہیں جہنم میں گرانے والے ہوں اور عذاب میں واقع کرنے والے ہوں، ”صبر کرنے سے مراد کیا ہے؟“

”وهو الحبس على خلاف النفس من اختيار العزلة وترك الخلطة والجلوة“

یعنی اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے خلاف روک لے، برائیوں کے مرتکب لوگوں سے اپنے آپ کو جدا کر لے، ان سے میل ملاپ نہ رکھے، اور ان کی محفلوں میں نہ جائے) ”فمن صبر فيهن“ ای فی تلک الايام ”قبض علی الجمر“ جس شخص نے ان دونوں میں صبر کیا تو وہ ایسے ہی ہوگا جیسا کہ اسے آگ کی چنگاری پر روک لیا گیا ہو، (کیونکہ سب لوگوں سے علیحدگی اگرچہ اس کیلئے ذہنی طور پر بہت بڑی مشقت ہوگی، لیکن رب تعالیٰ کی رضاء کی خاطر کی ہوئی مشقت پر عظیم اجر و ثواب ہوگا، اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا ”للعامل فيهن اجر خمسين رجلا يعملون مثل عمله“ ان مشکل ایام میں صبر سے کام لینے والے کو اتنا اجر و ثواب حاصل ہوگا، جتنا پچاس آدمیوں کو یہی عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ یعنی مشقت کے دنوں کے بغیر پچاس لوگ اگر صبر سے کام لیں تو جتنا ثواب ان کو ملے گا، اتنا ثواب اس اکیلے کو حاصل ہوگا ”قالوا یا رسول اللہ اجر خمسين منهم قال اجر خمسين منكم“ صحابہ کرام نے تعجب کے طور پر پوچھا، یا رسول اللہ کیا واقعی اسے پچاس آدمیوں کا ثواب حاصل ہوگا، آپ نے فرمایا ہاں تمہارے پچاس آدمیوں کا اسے ثواب حاصل ہوگا۔ ”اجر خمسين منكم“ آپ نے ارشاد فرمایا کہ، مشقت کے دنوں میں صبر کرنے والے کا عظیم درجہ بیان کیا کہ اسے عام پچاس آدمیوں کا ثواب نہیں ملے گا بلکہ تمہارے جیسے جلیل القدر پچاس آدمی مشقت کے دنوں کے بغیر جو ثواب حاصل کریں، وہ اکیلا اتنا ثواب حاصل کر لے گا۔

(وضاحت ماخوذ از مرقاة جلد ۹ صفحہ نمبر ۳۳۶)

وعن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ یسال العبد یوم القيامة فیقول مالک اذا رايت المنکر فلم تنکره قال رسول اللہ ﷺ فیلقى حجتہ فیقول یا رب خفت الناس ورجوتک“ (رواہ البیہقی، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا، اور کہے گا تجھے کیا ہوا کہ تو نے برائی کو دیکھ کر اس کا انکار (زبان سے یا ہاتھ سے) نہیں کیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا (فیلقى) بتشديد القاف المفتوحة (حجته) بالنصب “اس کے دل میں یہ حجت ڈال دی جائے گی (کہ وہ یہ کہے) وہ عرض کرے گا اے میرے رب میں لوگوں سے ڈرتا تھا، اور تیری (رحمت کی) امید کرتا تھا، سبحان اللہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کتنا کریم ہے کہ خود ہی دل میں یہ بات ڈالے گا کہ یوں کہتا کہ میں تیری بخشش کر دوں“



عن عبد الله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ لما وقعت بنو اسرائيل في المعاصي نهتهم علماءهم فلم ينتهوا فجالسهم في مجالسهم واكلوهم وشاربوهم فضرَب الله قلوب بعضهم ببعض فلعنهم على لسان داود وعيسى ابن مريم ذلك بما عصوا وكانوا يعتدون قال فجلس رسول الله ﷺ وكان متكئا فقال لا والذي نفسي بيده حتى تاطروهم اطرا“ (رواه الترمذی و ابو داود) مشکوة باب الامر بالمعروف

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بنی اسرائیل گناہوں میں واقع ہو گئے تو انہیں ان کے علماء نے منع کیا، انہوں نے ان کو اپنی مجالس میں بٹھایا اور ان کو کھلایا اور ان کو پلایا، تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں کو بعض سے ملا دیا، تو ان پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ذریعے لعنت فرمائی، یہ (لعنت ان پر کی گئی) بوجہ اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کیا، راوی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ سہارا لگا کر بیٹھے، تو آپ نے فرمایا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح (حق کی جانب سے) پھر جاؤ گے۔

### وضاحت حدیث:

معاصی میں مبتلاء ہونے سے مراد، ان کا زنا اور ہفتے کے شکار، اور بڑے بڑے گناہوں میں مبتلاء ہونا ہے، ابتدائی طور پر ان کے علماء نے ان کو گناہوں سے منع کیا، لیکن وہ گناہوں سے نہ رکے، تو ان برائیوں کے مرتکب لوگوں نے علماء کو بھی اپنی مجالس میں بٹھالیا، اور ان کو کھانے اور پینے میں شریک کر لیا (ان کی خوب دعوت کی) تو اللہ تعالیٰ نے ان برے افعال والوں اور علماء کے دلوں کو آپس میں ملا جلادیا۔ ”فضرَب الله قلوب بعضهم ببعض“ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض کے دلوں کو بعض کی وجہ سے ملا دیا، عرب حضرات کہتے ہیں ”ضرب اللبن بعضه ببعض ای خلطه ذکره الراغب“ علامہ راغب اصفہانی نے بیان کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے ”بعض دودھ بعض سے ملا لیا“

”وقال ابن الملك رحمه الله الباء للسببية ای سود الله قلب من لم يعص بشؤم من عصي فصارت قلوب جميعهم قاسية بعيدة عن قبول الحق والخير او الرحمة بسبب المعاصي ومخالطة بعضهم بعضا“

ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ”ببعض“ میں باء سببیت کیلئے ہے، مطلب یہ ہے کہ جب گناہوں کے مرتکب لوگوں کی مجلس میں دوسرے بیٹھیں گے تو ان بروں کی نحوست کی وجہ سے ان کے ساتھ بیٹھنے والوں کے دل ان بروں کے دلوں سے مل جائیں گے، یعنی ان کے دل سیاہ اور بہت زیادہ سخت



ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ حق اور خیر اور رحمت کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ گناہ گاروں کے ساتھ ملنے والوں کے دل بھی سخت ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان پر حضرت داود علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ذریعے ان پر لعنت بھیجے گا، اسی کا ذکر قرآن پاک میں ان الفاظ سے کیا گیا ﴿لَعْنُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى بْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ ”قال“ یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نبی کریم ﷺ سہارا لگا کر بیٹھ گئے، یعنی آپ نے یہ کلام بڑے اطمینان سے فرمایا ”لا“ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے ”لا تعذرون او لا تنجون من العذاب انتم ايها الملة خلف اهل تلك الامة“ یعنی ”لا“ قسم پر داخل ہو کر زائد نہیں، بلکہ نفی کا معنی دے رہا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم نے بھی بنی اسرائیل کا طریقہ اختیار کیا کہ برے لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر دعوت کھالی تو قیامت کے دن تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا، یہاں تک کہ تمہیں عذاب سے نجات نہیں دی جائے گی، تم اے امت اسی امت کے پیچھے آنے والے ہو۔ ”والذي نفسي بيده حتى تاتروهم اطرا“ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہاں تک کہ تم بھی ان کی طرح حق سے پھر جاؤ گے، یعنی اگر تم حق سے پھر کر باطل سے مل گئے تو تم عذاب سے بچ نہیں سکو گے، ہاں اگر تم باطل سے پھر کر حق کی طرف مائل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب سے بچالے گا۔

(ماخوذ از مرقاة جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۳۴۱)





وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتِ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

(آیہ نمبر ۱۰۵)

(۱) اور ان جیسے نہ ہونا جو آپس میں پھٹ گئے اور ان میں پھوٹ پڑ گئی بعد اس کے کہ روشن نشانیاں انہیں آچکی تھیں اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) اور نہ ہو تم ان کی طرح جو آپس میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ آگئیں ان کے پاس واضح نشانیاں، اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

رب تعالیٰ نے اس سے پہلے ذکر فرمایا کہ توراۃ و انجیل وہ آسمانی کتابیں جو دین اسلام کے سچے ہونے اور صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اور ان میں نبی کریم ﷺ کی صداقت و حقانیت کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کے بعد ذکر فرمایا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے نبی کریم ﷺ سے حسد کیا، اور مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کیلئے شکوک و شبہات ڈالنے شروع کئے کہ یہ مسلمان دین سے برگشتہ ہو جائیں (پھر جائیں) اس کے بعد مؤمنوں کو حکم دیا کہ ایمان پر قائم رہو، اور اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دو۔

اب اس آیہ کریمہ کے ذریعے اس مضمون کو ختم کیا جا رہا ہے کہ اے مومنو تم اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی طرح نہ بن جانا کہ آیات کریمہ میں شبہات ڈالتے رہو، اور ان کی فاسد تاویلات کرتے رہو، جس سے ان آیات کے حقیقی مطالب ہی اٹھ جائیں، ہاں اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی ان کی طرح بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتِ﴾  
 ”اور نہ ہو تم انکی طرح جو آپس میں بٹ گئے، اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ آگئیں ان کے پاس واضح نشانیاں۔“

یہاں معنی میں دو احتمال ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ یہ کہا گیا ہے، اے مومنو ان آیات کو سننے کے بعد ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو بٹ گئے، اور انہوں نے واضح نشانیوں کے بعد دین میں اختلاف کیا اس لحاظ پر یہ آیہ



کریمہ تمام پہلی آیات کا تہہ ہے یعنی پہلی آیات کو معنوی طور پر تکمیل کرنے والی ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ارشاد فرمایا، تو اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اچھے کاموں کا حکم دینے والا ظالموں اور غلبہ رکھنے والوں پر حکم دینے کی طاقت نہ رکھے، اور یہ طاقت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک اہل حق و دین کی آپس میں الفت و محبت نہیں ہوگی، اس آیت کریمہ میں مومن کو تفرقہ اور اختلاف سے ڈرایا گیا ہے کہ اگر تم نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا تو تمہیں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی طاقت حاصل نہیں ہوگی، اس معنی کے لحاظ پر یہ آیت کریمہ صرف سابقہ آیت کریمہ کا تہہ ہے۔

(کبر)

### یہود و نصاریٰ کے تفرقہ و اختلاف کی چند وجوہ:

- (۱) تفرقوا و اختلفوا بسبب اتباع الهوی و طاعة النفس والحسد "ان لوگوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا خواہشات کی تابعداری کی وجہ سے، اور نفس کی طاعت کی وجہ سے اور حسد کی وجہ سے۔
- (۲) تفرقوا حتی صار کل فريق منهم يصدق من الانبياء بعضا دون بعض فصاروا بذلك الى العداوة والفرقة

دوسری وجہ ان کے اختلاف کی یہ تھی کہ ان میں سے کسی فریق نے کسی ایک نبی کی تصدیق کی، اور دوسرے کا انکار کیا، دوسرے فریق نے اس نبی کی تصدیق کی جس کی ایک فریق تکذیب کر چکا اور دوسرے نبی کی ان لوگوں نے تصدیق کی، جس کی وجہ سے ان لوگوں کی ایک دوسرے سے عداوت ہو گئی، اور ان کے آپس میں اختلاف ہو گئے، آپس میں بٹ اور پھٹ گئے۔

- (۳) صاروا مثل مبتدعة هذه الامة مثل المشبهة والقدرية والحشوية
- تیسری وجہ ان کے اختلاف کی یہ تھی کہ ان میں بھی کئی نئے نئے فرقوں نے جنم لیا تھا، جیسے اس امت میں مشیمہ، قدریہ، حشویہ فرقتے پیدا ہوئے، ایسے ہی ان میں بھی کئی اس قسم کے نئے نئے فرقے ایجاد ہو گئے تھے۔

### تفرقہ و اختلاف میں فرق:

بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا کہ دونوں کا معنی ایک ہے، اسلئے "تفرقوا" کے بعد "واختلفوا" بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے، اور بعض حضرات نے ان دونوں لفظوں کے معانی میں چند فرق بیان کئے ہیں۔

- (۱) قيل تفرقوا بالعداوة واختلفوا في الدين



ایک وجہ فرق یہ ہے کہ تفرقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عداوت کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے، آپس میں بٹ گئے، ایک دوسرے سے پھٹ گئے۔

(۲) وقیل تفرقوا بسبب استخراج التاویلات الفاسدة من تلك النصوص ثم اختلفوا بان حاول كل واحد نصرة قوله ومذهبه

اور بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے تفرقہ پیدا کیا یعنی ظاہری آیات کے مطالب چھوڑ کر غلط اور باطل تاویلیں نکال لیں، پھر ایک دوسرے سے اختلاف کیا کہ ہر فریق نے اپنے اپنے اقوال اور اپنے مذہب کو صحیح کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، حالانکہ ہر ایک باطل راہ پر تھا۔

(۳) والثالث تفرقوا بابدانهم بان صار كل واحد من اولئك الاحبار رئيسا في بلد، ثم اختلفوا بان حاول كل واحد منهم نصرة قوله ومذهبه

اور تیسری وجہ فرق یہ ہے، وہ متفرق ہو گئے یعنی ان کے اصحاب علم میں سے کوئی کسی شہر کا رئیس بن گیا اور کوئی کسی شہر کا رئیس بن گیا، پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا، ہر ایک دعویٰ کرنے لگا کہ میں حق پر ہوں، دوسرا باطل پر ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے تفرقہ اور اختلاف کی یہ تیسری وجہ بیان کرنے کے بعد ذکر فرمایا۔

”واقول انک اذا انصفت علمت ان اکثر علماء هذا الزمان صاروا موصوفين بهذه الصفة فنسأل الله العفو والرحمة“

میں کہتا ہوں کہ بیشک جب تو انصاف کرے تو تجھے خود پتہ چل جائے گا کہ اس زمانے کے اکثر علماء میں یہ وصف پایا جاتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے عفو اور رحمت کا سوال کرتے ہیں۔ (کبیر)

واقعہ کہتا ہے ہر زمانہ میں علماء کے لباس میں جہلاء نے علماء کو بدنام کیا، اس قسم کے علماء حقیقت میں علماء نہیں ہوتے، بلکہ دین فروش ہوتے ہیں۔

ان کا اختلاف کیسا تھا؟

یہود و نصاریٰ کا اختلاف اصول دین میں تھا، صرف فروعی اختلاف کی مذمت نہیں بیان کی تھی، اور نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی یہی حکم دیا گیا۔

”والاظهر ان النهی فیہ مخصوص بالفرق فی الاصول دون الفروع لقوله ﷺ ”اختلافی امتی رحمة“ ولقوله ﷺ من اجتهد فأصاب فله اجر ان ومن اخطأ فله اجر واحد“



زیادہ ظاہرات یہی ہے کہ اصول دین میں اختلاف سے منع کیا گیا ہے، فروع دین میں اختلاف سے منع نہیں کیا گیا، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت کا اختلاف رحمت ہے، اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس نے اجتہاد کیا اگر اس نے درست راہ پالی تو اسے دواجر حاصل ہوں گے، اور اگر اس سے خطاء ہوگئی تو اسے ایک اجر حاصل ہوگا، یعنی اجتہاد کا ثواب خطاء پر بھی حاصل ہوگا، ان دونوں احادیث سے واضح ہوا کہ فروع میں اختلاف جائز ہے، اس سے منع نہیں کیا گیا۔ (ماخوذ از بیضاوی)

﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ ”اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ گئیں۔“ یعنی وہ واضح نشانیاں آ گئیں جو حق راہ کی دعوت دیتی تھیں، اتفاق کرنے کی راہ بتاتی تھیں اور ایک کلمہ پر متحد ہونے کا سبق دیتیں، لیکن انہوں نے اس کے بعد ان میں اختلاف کیا۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“ میں فعل مذکر رکھا گیا، کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے، اور فعل و فاعل میں ”ہم“ ضمیر کا فاصلہ بھی موجود ہے، اسلئے فعل کا مذکر ذکر کرنا صحیح ہے، علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو مختصر طور پر بیان فرمایا (جو اعتراض سے خالی نہیں)۔

”الما قال (مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ) ولم يقل جاء تهم لجواز حذف علامة التانيث من الفعل اذ كان فعل المؤنث متقدما“

جن فروع پر اجماع امت ہوا ان میں اختلاف حرام ہے:

یہود و نصاریٰ یا اس امت کے وہ لوگ جنہوں نے واضح قطع دلائل کے بعد اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے، ان کیلئے بڑا عذاب ہے، وہ واضح نشانیاں کیا ہیں؟

”الدلائل الواضحة القاطعة من الآيات المحكمة والاخبار المتواترة المحكمة من الانبياء ونحو ذلك كاجماع هذه الامة سواء كان ذلك الاختلاف في اصول الدين كاختلاف اهل الاهواء مع اهل السنة او في الفروع المجمع عليها كمسئلة غسل الرجلين ومسح الخفين في الوضوء وخلافة الخلفاء الاربعة“



واضح نشانیاں یہ ہیں ”قرآن پاک کی آیات قطعیہ، احادیث متواترہ، تمام انبیاء کرام کی اخبار متواترہ محکمہ، اور نبی کریم ﷺ کی امت کے علماء صالحین و مجتہدین کا اجماع، لہذا اصول دین میں اختلاف سے بھی منع کیا گیا ہے جیسا کہ اپنی خواہشات کے مطابق چلنے والوں نے اہل سنت کے خلاف عقائد باطلہ پر قائم ہو کر ان سے اختلاف کیا اور راہ حق سے بھٹک گئے، اسی طرح وہ فروع جن پر اجماع امت ہے ان سے اختلاف کرنے والے بھی صراط مستقیم سے ہٹ گئے وہ علیحدہ فریق بن کر اہل سنت سے دور ہو گئے۔

وہ فروع جن پر اجماع علماء صالحین و مجتہدین ہیں، وہ یہ ہیں ”وضوء میں پاؤں کے دھونے میں اجماع ہے، پاؤں نہ دھونا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے، جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اور وضوء میں موزوں پر مسح کرنے کا جواز اجماع سے ثابت ہے، موزوں پر مسح کرنے کو جائز نہ سمجھنا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے جس سے شریعت نے منع کیا (خیال رہے موزوں پر مسح کرنا ضروری نہیں بلکہ مسح کو جائز سمجھنا ضروری ہے۔) اور چار خلفاء راشدین کی خلافت جس ترتیب سے واقع ہوئی اس کو حق سمجھنے پر اجماع ہے، خلفاء راشدین کی خلافت راشدہ کو حق نہ سمجھنا اختلاف اور تفرقہ بازی ہے، جس سے منع کیا گیا، اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ ظنی دلائل سے اجتہاد کے ذریعے جو مسائل حاصل کئے جاتے ہیں، ان میں اختلاف کا پایا جانا عین ممکن ہے، بعض مجتہدین کا اجتہاد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (مظہری)

”فذلک الاختلاف بعد بذل الجہد بلا مکابرة وتعصب معفو بل هو رحمة وسعة للناس“  
یہ اختلاف چونکہ مسائل کے حصول کیلئے اپنی پوری کوشش صرف کرنے کے بعد پایا جاتا ہے، اس میں نہ کوئی ایک دوسرے سے ضد پائی جاتی ہے، اور نہ کوئی تعصب، یہ اختلاف معاف ہے، بلکہ رحمت ہے، اس کی لوگوں کو اجازت ہے۔ (مظہری)

عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله ﷺ سألت ربي عن اختلاف اصحابي من بعدى فاوحى الله يا محمد ان اصحابك عندى كالنجوم بعضها اقوى من بعض ”وفى رواية بعضها اضعف من بعض ولكل نور فمن اخذ بشئ مما هم عليه من اختلافهم فهو عندى على هدى“

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے اپنے رب سے اپنے صحابہ کے اختلاف کے متعلق پوچھا تو رب تعالیٰ نے میری طرف وحی کی، اے محمد بیشک تیرے صحابہ میرے نزدیک ستاروں کی طرح ہیں، جس طرح بعض ستارے بعض سے زیادہ قوی ہیں (اسی طرح بعض صحابہ بعض پر فوقیت رکھتے ہیں) (مظہری)



اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ بعض ستارے بعض سے زیادہ روشن ہیں، (اسی طرح آپ کے صحابہ کو) بعض کو بعض پر نور حاصل ہے، صحابہ کا جس مسئلہ میں اختلاف ہوا اس میں کسی شخص نے جس صحابی سے قول پر عمل کر لیا وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔

”رواہ عبد بن حمید فی مسنده والدارمی وابن ماجہ والعبدری فی الجمع بین الصحیحین وابن عساکر والحاکم عن عمر بن الخطاب“ ورواہ الدار قطنی فی فضائل الصحابة وابن عبد البر عن جابر والبیہقی فی المدخل عن ابن عباس“ (مظہری)

وروی البیہقی ایضاً فی المدخل بسند ضعیف عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ **مہما اوتیت من کتاب اللہ فالعمل بہ ولا عذر لاحد فی ترکہ فان لم یکن فی کتاب اللہ فسنۃ نبی ماضیۃ فان لم یکن سنۃ نبی فما قال اصحابی ان اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء فایہا اخذتہم بہ اہتدیتم واختلاف اصحابی لکم رحمۃ**

بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا جب تمہیں اللہ کی کتاب دی گئی تو اس پر عمل کرو، کتاب اللہ (قرآن پاک) کو چھوڑنے کا کسی کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا، اگر کتاب اللہ میں (کوئی مسئلہ بظاہر موجود) نہ ہو تو اللہ کے نبی کی سنت جاری ہے، (یعنی سنت رسول اللہ پر عمل کرو) اگر سنت میں نہ ہو تو صحابی کے قول پر عمل کرو، میرے صحابہ آسمان میں ستاروں کی طرح ہیں جس پر تم عمل کرو گے ہدایت پا جاؤ گے، میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔

واخرج البیہقی فی المدخل وابن سعد فی الطبقات عن القاسم بن محمد قال اختلاف اصحاب محمد رحمۃ لعیباد اللہ“

بیہقی اور طبقات سعد نے قاسم بن محمد سے روایت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کا اختلاف اللہ تعالیٰ کے بندوں کیلئے رحمت ہے، اور بیہقی نے اس قسم کی روایت حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی۔

(مظہری)

﴿وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ ”اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔“

یعنی قطعی دلائل جن لوگوں کو حاصل ہو گئے، اس کے بعد جب وہ پھرے گا تو میرے لئے عذاب عظیم ہوگا۔ بہت بڑے عذاب کے مستحق ہو گئے۔

(مظہری)





يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهُ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ  
إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۰۶)

(۱) جس دن کچھ منہ اونچا لے ہوں گے اور کچھ منہ کا لے، تو وہ جن کے منہ کا لے ہوئے کیا تم ایمان  
لا کر کافر ہوئے تو اب چکھو اپنے کفر کا بدلہ۔ (کنز الایمان)

(۲) اس دن سفید ہوں گے کچھ چہرے، اور سیاہ ہوں گے کچھ چہرے، لیکن وہ جو سیاہ ہوئے چہرے  
ان کے (ان کو کہا جائے گا) کیا تم نے کفر کیا بعد ایمان لانے کے، تو چکھو عذاب بوجہ اسکے جو تم  
کفر کرتے رہے۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے یہود کو بعض اشیاء کا حکم دیا اور بعض سے منع کیا، پھر مسلمانوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا اور بعض  
سے منع کیا، اب اس آیہ کریمہ میں پہلے امور کی تاکید کیلئے احوال آخرت کا تذکرہ کیا۔ (کبیر)  
دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”یَوْمَ“ میں نصب کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ ”لہم“ طرف کی وجہ سے نصب ہو جس کا عامل فعل مقدر ہے،  
معنوی طور پر تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ”سَيَكُونُ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فِي هَذَا الْيَوْمِ“ ان کو بڑا عذاب ہوگا اس دن  
میں جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہو گے۔ دوسری وجہ نصب کی ”اذکر“ مقدر ہے، یعنی  
یاد کرو اس دن کو جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔

اس آیہ کریمہ میں کن لوگوں کا تذکرہ ہے:

(۱) آیہ کریمہ ”اِیْلَ اِهْوَاءَ“ (خواہشات کے مرتکبین) کے متعلق نازل ہوئی، اس پر حدیث اسماء دلالت کر رہی ہے۔  
عن اسماء بنت ابی بکر قالت قال رسول اللہ ﷺ اِیْلَی عَلَی الْحَوَاضِ حَتَّى انْظُرَ مِنْ یُورِدُ  
عَلَیْ مَنْکُمْ وَیَسْوَخُذُ نَاسٌ دُونِی فَاَقُولُ یَا رَبِّ مَنْیْ وَمَنْ اَمْتِی فِیْقَالَ هَلْ شَعَرْتَ مَا  
عَمِلُوا بَعْدَکَ وَاللّٰہُ مَا ہُوَ اَبْرَحُ اَوْ یَرْجِعُونَ عَلَیْ اَعْقَابِهِمْ“ (رواہ البخاری)



اسماء بنت ابی بکر (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں حوض (کوثر) پر ہوں گا یہاں تک کہ میں دیکھوں گا تم میں سے (میری امت میں سے) جو مجھ پر وارد ہوں گے، کچھ لوگوں کو میرے قریب آنے سے منع کر دیا جائے گا، تو میں کہوں گا اے میرے رب یہ تو میرے ہیں اور میری امت کے لوگ ہیں، تو کہا جائے گا ”کیا آپ کو معلوم ہے انہوں نے آپ کے بعد کیا عمل کئے ہیں؟ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی وہ ہمیشہ اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹتے چلے جائیں گے۔“ (منظری)

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال بادروا بالاعمال فتناقطع اللیل المظلم یصبح الرجل مؤمنا ویمسی کافرا مؤمنا ویصبح کافرا یشیع دینہ بعرض من الدنیا قلیل

(رواہ مسلم واحمد والترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اعمال کی طرف جلدی کرو فتنوں سے پہلے جس طرح تاریک رات میں ڈاکہ ڈالا جائے، صبح ایک شخص مومن ہوگا شام کو کافر ہو جائے گا اور شام کو کوئی شخص مومن ہوگا صبح کافر ہو جائے گا، اپنے دین کو دنیا کے تھوڑے مال کے بدلے بیچ دے گا۔“ (منظری)

خیال رہے کہ دنیا حقیر چیز ہے اس کا سارا مال دین اور آخرت اور اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے۔

(۲) اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ”خوارج“ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ”عن ابی امامۃ عن النبی ﷺ قال ہم الخوارج“ ”رواہ احمد وغیرہ“ ابو امامہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ”وہ خارجی لوگ ہیں“

(۳) اس میں تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ مرتدین کے بارے میں نازل ہوئی، ظاہری معنی سے یہ قول زیادہ واضح ہے۔

(۴) اس میں چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، اور وہ اہل کتاب بھی اس آیت کریمہ میں آتے ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی بعثت کے بعد آپ سے کفر کیا۔

(۵) تمام اقوال کا جامع قول: جس میں سارے اقوال سمٹ کر آ جاتے ہیں۔

”وقیل فی جمیع الکفار کفروا بعد ما شہدہم اللہ علی انفسہم او بعد ما مکنوا من الایمان بالنظر الی الدلائل“



اس آیت کریمہ میں تمام کفار کا ذکر ہے جنہوں نے یوم یثاق کو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ (کیا میں تمہارا رب نہیں) کے جواب میں کہا ”قَالُوا بَلٰی“ انہوں نے کہا ہاں (تو ہمارا رب ہے) یا تمام کفار کو دلائل کی طرف نظر کرنے سے ایمان لانا چاہئے تھا، اسے ایمان سے تعبیر کر دیا، اور ان کا ایمان نہ لانا گویا کہ ایمان کے بعد کفر کرنے کے مترادف ہے، اس قول میں اہل اہواء جو درجہ کفر تک پہنچے ہوں، اور مرتدین اور خوارج سب ہی آجاتے ہیں۔

خوارج کے متعلق ارشاد مصطفوی ﷺ:

❁ اخرج مسلم عن زيد بن وهب انه كان في الجيش الذين كانوا مع علي (رضي الله عنه) لما ساروا الى الخوارج فقال علي ايها الناس اني سمعت رسول الله ﷺ يقول يخرج قوم من امتي يقرؤون القرآن ليس قراء تكمل الي قراتهم بشئ ولا صلواتهم بشئ ولا صيامكم الي صيامهم بشئ يقرؤون القرآن يحسبون انه لهم وهو عليهم لا تجاوز صلواتهم تراقبهم يمرقون من الاسلام كما يمرق السهم من الرمية

زيد بن وهب فرماتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، جب وہ خارجیوں کی طرف چلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے لوگو بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے ”میری امت میں سے ایک قوم نکلے گی جو قرآن پڑھتے ہوں گے، تمہارا قرآن پڑھنا ان کے پڑھنے کے مقابل کچھ نہیں ہوگا، تمہاری نمازیں ان کی نمازوں کے مقابل کچھ نہیں ہوں گی، اور تمہارے روزے ان کے روزوں کے مقابل کچھ نہیں ہوں گے، وہ قرآن پڑھیں گے گمان یہ کریں گے کہ قرآن ان کو نفع پہنچا رہا ہے لیکن حقیقت میں قرآن انہیں نقصان پہنچا رہا ہوگا (کیونکہ ان کا ایمان ہی نہیں ہوگا) ان کی نمازیں ان کی سینے کی ہڈیوں سے نیچے نہیں جائیں گی، (یعنی ان کے اعمال کو قبولیت حاصل نہیں ہوگی) وہ اسلام سے ایسے نکل جائیں جیسے تیرکمان سے نکل جاتا ہے۔ (خازن)

چہرے سفید ہونے اور سیاہ ہونے سے کیا مراد ہے؟

اس کے دو معنی لئے گئے ہیں، ایک مجازی اور دوسرا حقیقی۔

**مجازی معنی:** ان البياض مجاز عن الفرع والسرور والسواد عن الغم “ چہرے کے سفید ہونے کا مجازی معنی یہ لیا گیا کہ ان کو فرحت و سرور (بہت زیادہ خوشی کا مقام) حاصل ہوگا، اور چہرے کے سیاہ ہونے کا مجازی معنی یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ غم میں مبتلا ہوں گے، یہی معنی دوسری آیات میں بھی پایا گیا ہے۔



﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ﴾ (پارہ نمبر ۲۳ سورۃ الزمر، آیت نمبر ۵۹)

”اور قیامت کے دن تم دیکھو گے انہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے منہ کالے ہیں۔“

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهُهُم قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (پارہ نمبر ۱۱ سورۃ یونس آیت نمبر ۲۶)

”بھلائی والوں کیلئے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد، اور ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت

والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“ (اس کے بعد آیت نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا)

﴿وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾

”اور جنہوں نے برائیاں کیں تو برائی کا بدلہ اسی جیسا اور ان پر ذلت چڑھے گی۔“

یہاں بھی یقیناً ”قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ“ مراد ہے، جو پچھلی آیت سے سمجھ آ رہا ہے، ”قَتَرٌ“ کا معنی ہے ”سیاہی“ یعنی جنتی

لوگ سیاہی سے محفوظ رہیں گے اور جہنمی چہرے سیاہی میں مبتلا ہوں گے۔

﴿وُجُوهُ يُومِئِدُنَا ضِرَّةٍ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَوُجُوهُ يُومِئِدُنَا ضِرَّةٍ ۝ تَنْظُرُ أَنْ يُفْعَلَ

بِهَافَا قِرَّةٍ﴾ (پارہ نمبر ۲۹ سورۃ القیامۃ، آیت نمبر ۲۲ تا ۲۵)

کچھ منہ اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے اور کچھ منہ اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے سمجھتے

ہوں گے کہ ان کے ساتھ وہ کی جائے گی جو کمر کو توڑ دے۔

﴿يُعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ﴾ (سورۃ الرحمن، آیت نمبر ۴۱)

(مجرم اپنے چہرے سے پہچانے جائیں گے)

﴿وُجُوهُ يُومِئِدُنَا مُسْفِرَةٌ ۝ ضَاكِئَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهُ يُومِئِدُنَا غَبَرَةٌ ۝

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ (پارہ نمبر ۳۰ سورۃ عبس آیت نمبر ۳۸ تا ۴۲)

کتنے منہ اس دن روشن ہوں گے، ہنستے خوشیاں مناتے، اور کتنے مونہوں پر اس دن گرد پڑی ہوگی ان پر

سیاہی چڑھ رہی ہے، یہ وہی کافر بدکار، ان تمام مذکورہ آیات میں ”بیاض اور ناظرۃ“ کا مجازی معنی ہے ”فرحت و سرور

حاصل ہونا“ اور سواد، اور غمرۃ اور قترۃ“ کا مجازی معنی ہے غم اور پریشانی“ حضرت امام حسن علیہ السلام نے جب حضرت امیر

معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی، کچھ امور طے کر کے امارت (حاکمیت) ان کے حوالہ کر دی، تو کسی سفید بالوں والے بوڑھے

نے آپ کو کہا ”یا مسود وجوہ المؤمنین“ اے مومنوں کے چہروں کو سیاہ کرنے والے، آپ نے اسے جواب دیا۔

يابياض القرون سودت وجهي عند بيض الوجوه سود القرون



فلعمری لاخفینک جہدی      عن عیانی وعن عیان العیون  
بسواد فیہ بیاض لوجہی      وسواد لوجہک الملعون

- (۱) اے سفید گیسوؤں والے میں نے اپنا چہرہ سیاہ کیا جب کہ سیاہ بالوں والے جوانوں کے چہرے سفید ہو گئے۔  
(۲) مجھے اپنی عمر کی قسم میں اپنی عمر کو ضرور بر ضرور تم سے مخفی رکھوں گا، اپنے آپ کو ظاہر ہونے اور لوگوں کی نظروں میں ظاہر ہونے سے۔

(۳) یہ ایسی سیاہی ہے جس میں حقیقت میں میرے چہرے کی سفیدی ہے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی ملعون ہے۔  
ان اشعار میں بھی چہرے کی سفیدی سے مراد ”فرحت و سرور“ اور چہرے کی سیاہی سے مراد غم اور پریشانی ہے، جب کوئی شخص اپنا مطلوب و مقصود پالیتا ہے تو عرب حضرات اس کیلئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ”ابیض و جہہ“ و ”معناہ الاستبشار والتہلل“ اس کا چہرہ سفید ہو گیا یعنی اسے خوشی حاصل ہو گئی اور اس کا چہرہ اچک اٹھا۔ اسی طرح دعائیہ کلمات میں یوں استعمال کیا جاتا ہے ”الحمد لله الذی بیض و جہک“ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے تمہارے چہرے کو سفید کیا یعنی تمہیں راحت و سرور عطاء کیا، اور جس شخص کو غم اور پریشانی لاحق ہو، اس کیلئے یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، ”اربذ و جہہ و اغبر لونہ و تبدلت صورته“ اس کا چہرہ خاکستری ہو گیا، اس کا رنگ غبار آلودہ ہو گیا اور اس کی صورت بدل گئی، ان تمام الفاظ کا مجازی معنی یہی ہے کہ وہ غمناک ہو گیا۔

**دوسرا معنی حقیقی ہے :** کہ مؤمنین کے چہرے حقیقی طور پر سفید ہوں گے اور ان میں نورانیت ہوگی وہ چمک دمک رہے ہوں گے اور کافروں کے چہرے سیاہ ہوں، غبار آلود ہوں گے، خاکستری ہوں گے۔ (ماخوذ از کبیر راقم کے نزدیک عموم المجاز معنی لینا بہتر ہے :

مؤمنین کے چہرے نورانی ہوں گے اور کافروں کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، اس معنی میں مجاز خود بخود داخل ہو جائے گا، حقیقت و مجاز کا اجتماع بھی لازم نہیں آئے گا، مطلب یہ ہوگا، مؤمنین کے چہرے نورانی ہوں گے وہ سفید ہوں گے، ان میں آب و تاب ہوگی، وہ اپنی اس کیفیت اور اپنے اعمال کی مقبولیت اور رب تعالیٰ کے تقرب اور انبیاء کرام کے مؤمنین پر راضی ہونے کی وجہ سے خوش ہوں گے، ان کو فرح و سرور حاصل ہوگا۔

اور کافروں کے چہروں پر تاریکی چھائی ہوگی، ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، غبار ان کے چہرے سے اڑ رہا ہوگا، ان کے چہرے آگ سے جل جانے کی طرح خاکستری نظر آئیں گے، وہ اپنی یہ حالت دیکھ کر بہت زیادہ غم اور



پریشانی میں مبتلاء ہوں گے، رب تعالیٰ اور انبیاء کرام ان سے ناراض ہوں گے۔

چہرے سیاہ و سفید کب ہوں گے اور کہاں ہوں گے؟

یہ چند مقامات ہیں جہاں مؤمنین کے چہرے سفید اور کفار کے سیاہ ہوں گے، یہ منظر قیامت کے دن ہوگا۔

(۱) یوم القيامة حين يبعثون من قبورهم تكون وجوه المؤمنين مبيضة ووجوه الكافرين مسودة“  
یعنی قیامت کے دن جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو مؤمنوں کے چہرے سفید، چمکدار ہوں گے، اور کافروں کے سیاہ، کالے ہوں گے۔

(۲) دوسرا مقام اس حال کا نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا۔

اذ اقر المؤمن كتابه فرأى في كتابه حسناته استبشر وابيض وجهه واذ اقر الكافر والمنافق كتابه فرأى فيه سيآته اسود وجهه“

جب مؤمن اپنا نامہ اعمال پڑھے گا تو وہ خوش ہوگا اور اس کا چہرہ سفید ہوگا، جس میں آب و تاب ہوگی، جب کافر اور منافق اپنا اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے تو ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور وہ پریشان ہوں گے۔

(۳) یہ حال اس وقت ہوگا جب رب تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا۔

﴿وَأَمَّا زُوالُ الْيَوْمِ إِلَيْهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو، یعنی جب کفار و منافقین کو مؤمنین سے جدا کر دیا جائے گا تو اس وقت مؤمن خوش ہوں گے اور ان کے چہرے سفید ہوں گے، اور کافر اور منافق لوگ اس وقت غم میں ہوں گے، اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

(۴) ويقال ان ذلك عند الميزان اذ رجحت حسناته ابيض وجهه واذ رجحت سيآته اسود وجهه“

یہ حالت میزان کے وقت ہوگی، جن کی نیکیاں بڑھ جائیں گی وہ خوش ہوں گے، اور ان کے چہرے سفید ہوں گے، اور جن کی برائیاں بڑھ جائیں وہ غمزدہ ہوں اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

(۵) ويقول اذا كان يوم القيامة يؤمر كل فريق بان يجتمع الى معبوده فاذا انتهوا اليه

حزنوا واسودت وجوههم، فيبقى المؤمنون واهل الكتاب والمنافقون، فيقول الله تعالى للمؤمنين من ربكم؟ فيقولون ربنا الله عز وجل فيقول لهم اتعرفونه اذ رايتموه فيقولون سبحانه، اذا اعترف عرفناه فيرونه كما شاء الله، فيخبر المؤمنون سجدا لله تعالى فتصير وجوههم مثل الثلج بياضا ويبقى المنافقون واهل الكتاب لا يقدرّون على السجود فيحزنوا وتسود وجوههم“



اور یہ حالت اس وقت ہوگی جب قیامت کے دن ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ جمع ہو جائیں گے، جب خالص کافر اپنے معبودوں سے ملیں گے تو وہ غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، لیکن مؤمنین اور منافقین اور اہل کتاب ابھی تک کافروں سے جدا ہوں گے، مؤمنین سے اللہ تعالیٰ سوال کرے گا تمہارا رب کون ہے؟

وہ کہیں گے ہمارا رب اللہ عزوجل ہے، پھر رب تعالیٰ ان کو کہے گا کیا تم اپنے رب کو دیکھ کر پہچان لو گے، وہ کہیں گے کہ ہمارا رب تو پاک ذات ہے، (یعنی ہم اسے کیسے دیکھ سکتے ہیں) مؤمن جب اپنے عجز کا اعتراف کر لے گا تو رب تعالیٰ اپنی پہچان کرادے گا، یعنی وہ اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا، تو مؤمنین رب تعالیٰ کو دیکھیں گے جس طرح رب تعالیٰ چاہے گا، (اس کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا) مؤمنین رب تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جائیں گے تو ان کے چہرے برف کی طرح سفید ہوں گے، لیکن منافقین اور اہل کتاب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار اور رب تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے سے محروم رہیں گے اس لئے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (ماخوذ از قرطبی)

دینی طلباء کرام کیلئے ایک علمی نکتہ:

اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ مکلف یا مؤمن ہو گیا کافر، ان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جیسا کہ معتزلہ مؤمن اور کافر کے درمیان واسطہ مانتے ہیں، جسے نہ مؤمن مانتے ہیں، نہ کافر، اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت والے لوگوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک قسم یہ ہے کہ ان کے چہرے سفید ہوں گے وہ مؤمن ہوں گے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کافر ہوں گے ”ولم یذکر الثالث فلو کان ھہنا قسم ثالث لذکرہ اللہ تعالیٰ“ یہاں تیسری قسم کا کوئی ذکر نہیں، اگر تیسری قسم ہوتی تو اسے ذکر کیا جاتا، معتزلہ کی جانب سے جواب یہ دیا گیا کہ تیسری قسم کے نہ ذکر کرنے سے تیسری قسم معدوم نہیں ہوگئی، ایک وجہ تو یہ ہے کہ ”وجوہ“ نکرہ ہے، مقام مثبت میں واقع ہے، جو عموم کا فائدہ نہیں دیتا، پھر آیت کریمہ میں مؤمنین کا ذکر ہے اور ان کافروں کا ذکر ہے جو ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں، اصلی کافروں کو یہ آیت کریمہ شامل نہیں، جب اصلی کافروں سے باہر ہیں تو وہ لوگ بھی ان دو قسموں سے باہر ہیں جو نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر۔

اہل سنت کی طرف سے ان کے استدلال کا رد یہ کیا گیا ہے کہ نکرہ مقام اثبات میں عموم پر دلالت کرتا ہے، جب قرینہ پایا جائے، قرائن اس میں واضح ہیں کیونکہ پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا، جس کا تقاضا یہی ہے کہ ایمان لانے والوں کے چہرے سفید ہوں اور کفر کرنے والوں کے



چہرے سیاہ ہو جائیں۔

”ثم دل مابعد هذه الآية على ان صاحب البياض من اهل الجنة وصاحب السواد من اهل النار فحينئذ يلزم نفى المنزلة بين المنزلتين“

پھر اسی کا تذکرہ کر دیا گیا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے، اس کے بعد ذکر کیا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ جہنمی ہوں گے اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ جنتی ہوں گے اب واضح ہو گیا کہ لوگوں کی کل دو قسمیں ہیں، مؤمن اور کافر، درمیان میں اور کوئی قسم نہیں۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ اصلی کافروں کو یہ آیت کریمہ شامل نہیں، یہ درست نہیں، کیونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اصلی کافر بھی یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر چکے ہیں، اسے ہی ایمان سے تعبیر کر دیا گیا، کہ وہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

پھر اس آیت کریمہ کے آخر میں ﴿فَلذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ ذکر کیا گیا، جو سبب ہے عذاب کا وہ کفر ہے۔

”واذا وقع التعليل بمطلق الكفر دخل كل الكفار فيه سواء كفر بعد الايمان او كان كافرا اصليا“

جب علت مطلق کفر ہے تو یہ ان کافروں کو بھی شامل ہے جو ظاہری ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، یعنی مرتد ہو گئے، اور اصلی کافروں کو بھی شامل ہے کہ وہ یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو مان کر پھر گئے۔ (ماخوذ از کبیر)

**سوال:** جب دو قسموں کا ذکر کیا گیا تو ارشاد فرمایا ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ اس میں چہروں کے سفید ہونے کا پہلے ذکر کیا اور سیاہ ہونے کا ذکر بعد میں کیا لیکن جب تفصیل ذکر کی تو ارشاد فرمایا ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ﴾ اس میں سیاہ چہرے والوں کا ذکر پہلے کیا اور سفید چہرے والوں کا بعد میں ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ﴾ میں ذکر ہو رہا ہے، اس کی وجہ کیا ہے۔

**جواب:** اس میں چند وجوہ ہیں:

(۱) داو مطلق جمع کیلئے ہے ترتیب کیلئے نہیں، اس لئے ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ میں مطلقاً یہ ذکر کیا گیا کہ بعض چہرے سفید ہوں گے، بعض سیاہ ہوں گے، ترتیب مقصود نہیں۔

(۲) مقصود مخلوق کو رحمت پہنچانا ہے نہ کہ عذاب، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پہلے سفید چہرے والوں کا ذکر کیا کیونکہ وہ اہل ثواب ہیں، اور وہی سفید چہرے والے ہوں گے۔

”تقديم الاشرف على الاخص في الذكر احسن ثم ختم بذكرهم ايضا تنبيها على ان



ارادة الرحمة اكثر من ارادة الغضب، كما قال سبقت رحمتی غضبی  
اعلیٰ و اشرف کو گھٹیا سے پہلے ذکر کرنا احسن ہے، پھر آخر میں بھی ان کا ہی تذکرہ کیا، جس سے یہ اشارہ بھی  
کر دیا کہ رب تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث قدسی میں رب تعالیٰ  
نے فرمایا کہ ”میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی“

(۳) فصحاء اور شعراء اپنے کلام کی ابتداء ایسے الفاظ سے شروع کرتے ہیں کہ جن سے طبیعت خوش ہو اور سینہ میں  
شرح پائی جائے، اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی سرور اور شرح صدر کا سبب ہے، اسی وجہ سے اہل ثواب کا ذکر پہلے کیا کہ وہ  
سفید چہرے والے ہوں گے اور اختتام بھی اسی سے کیا۔  
(ماخوذ از کبیر)

دینی مدارس کے طلباء توجہ فرمائیں:

سوال یہ پیدا ہوتا کہ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ﴾ میں بظاہر یہ معلوم  
ہوتا ہے کہ ”اما“ کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا گیا، اس کا مطلب واضح نہیں کہ وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، ”کیا  
تم نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد“ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عبارت مقدر ہے، وہ یہ ہے ”فیقال لهم“ تو ان کو  
کہا جائے گا، اب مطلب یہ ہو گیا ”اور لیکن وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے تو ان کو کہا جائے گا کیا تم نے ایمان کے  
بعد کفر کیا (اب مطلب واضح ہو گیا) اس طرح اور آیات میں بھی اس قسم کے الفاظ مخذوف ہیں۔

﴿وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْهِمْ﴾  
اور فرشتے داخل ہوں گے ان پر ہر دروازے سے ”وَيَقُولُونَ لَهُمْ“ اور ان کو کہیں گے ”تم پر سلام ہو“  
﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾  
اور جب اٹھارہ تھے ابراہیم اس گھر ”بیت اللہ“ کی بنیادیں، اور اسمعیل (فقلاً) تو ان دونوں نے  
عرض کیا اے ہمارے رب قبول کر ہم سے۔

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُنْجَرِمُونَ نَارَ كِسُوفٍ وَرُؤُسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا﴾  
اور اگر آپ دیکھتے جب مجرم جھکائیں ہوں گے اپنے سروں کو اپنے رب کے ہاں (فیقولون) تو کہہ  
رہے ہوں گے ”اے ہمارے رب“  
(ماخوذ از کبیر)

”فَذُوقُوا الْعَذَابَ“ الف لام عہد خارجی ہے، یعنی وہ عذاب جو عظیم ہے ”ذوقوا“ امر ہے جو اہانت کیلئے  
استعمال ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا ”چکھو بڑا عذاب“ یعنی اتنا عظیم ہوگا عذاب، جس کی وجہ سے ان کا ہر عضو گرفت میں



ہوگا، یہ ان کی ذلت کیلئے ہوگا۔

﴿بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ ”بوجہ اس کے جو تم کفر کرتے رہے۔“

اس میں ”با“ سمیت کیلئے ہے (اسی کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے) (ماخوذ از روح المعانی)



وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وَجُوهُهُمْ فِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (آیہ نمبر ۷۰)

(1) اور وہ جن کے منہ اونچالے ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (کنز الایمان)

(2) اور وہ جن کے چہرے سفید (چمکدار) ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ

رہیں گے۔ (نجوم الفرقان)

(فقی رحمۃ اللہ) یعنی الجنۃ والثواب المخلد، عبر عن ذلك بالرحمة تبينها على ان

المؤمن وان استغرق عمره في طاقة الله لا يدخل الجنۃ الا برحمته وفضله“

رحمت سے مراد جنت اور دائمی ثواب ہے، اسے رحمت سے تعبیر کیا گیا، جس سے اس پر متنبہ (خبردار) کیا گیا

کہ اگرچہ انسان بہت بڑی عمر اللہ کی طاعت کرتا رہے لیکن جنت میں سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے داخل نہیں ہوگا، اصل وجہ خاتمہ بالخیر پر جنت میں جانے کی دار و مدار ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی)

جنت کو رحمت کہنے کی وجہ:

”سميت الجنة رحمة لانها دار رحمة“ جنت کا نام رحمت رکھا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کا مقام

ہوگا، جو وہاں پہنچ گیا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گیا۔ (خازن)

سفید چہرے والے کون ہوں گے؟

وہ مؤمنین ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنے والے ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پورا کرنے



جنت میں دخول رب تعالیٰ کی رحمت سے ہوگا، کوئی ذاتی طور پر مستحق نہیں، اس پر حدیث پاک دیکھئے۔

عن عائشة عن النبی ﷺ قال سدد وقاربوا وابشروا فإنه لا يدخل الجنة احدا عمله قالوا ولا انت يا رسول الله قال ولا انا ان يتغمدني الله بمغفرة ورحمة

(رواه الشيخان في الصحيحين واحمد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا درست ہو جاؤ، اور قریب ہو جاؤ اور خوش ہو جاؤ، بیشک جنت میں کسی کو اس کا عمل داخل نہیں کرے گا، صحابہ کرام نے عرض کی آپ کو (بھی) نہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا، اور نہ ہی مجھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت نے مجھے ڈھانپ لیا ہے، مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو، اسی سے خاتمہ بالخیر کی دعاء کرو، جب صحابہ کرام نے پوچھا کہ آپ کو بھی آپ کے اعمال جنت میں نہیں داخل کریں گے تو آپ نے فرمایا ہاں مجھے بھی اعمال جنت میں داخل نہیں کریں گے، البتہ مجھے رب تعالیٰ کی مہربانی سے رحمت و مغفرت نے ڈھانپ لیا ہے، یعنی میں نے بھی رب تعالیٰ کی رحمت سے ہی جنت میں جانا ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی رحمت مجھ پر چھا چکی ہے، تمہیں معلوم نہیں، اسلئے اس کی رحمت کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔

وعن جابر عن النبی ﷺ لا يدخل احدا منكم عمله الجنة ولا يجيره من النار ولا انا الا رحمة من الله (رواه مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی ایک کو تم میں سے اس کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے آگ سے نجات دے گا اور نہ ہی مجھے سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے۔

**سوال:** قرآن پاک کی آیہ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جنتی لوگوں کو کہا جائے گا ﴿ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ داخل ہو جاؤ جنت میں بوجہ اس کے کہ تم (اچھے) عمل کرتے رہے تو یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ ”نیک اعمال سے انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے داخل ہوگا؟“

**جواب:** قرآن پاک کی آیہ کریمہ اور حدیث پاک میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ سمجھنے کی ضرورت ہے ”ان للجنة منازل ينال بالاعمال وذلك محمل الآية“ آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں منازل و مراتب ہوں گے، ان کو اچھے اعمال کے ذریعے حاصل کیا جاسکے گا۔

”واما اصل دخولها والخلود فيها بفضل الله ورحمته وذلك معنى الاحاديث“

جنت میں اصل دخول اور اس میں ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوگا، یہ مطلب ہے حدیث پاک کا۔



”ویدل علیہ قول ابن مسعود تجوزون الصراط بعفو اللہ وتدخلون الجنة برحمة اللہ وتقسمون المنازل باعمالکم“ (رواہ ہناد فی الزهد و ابو نعیم عن عون بن عبد اللہ مثله)  
اسی پر حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول دلالت کر رہا ہے کہ پل صراط سے تم اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے سے گزر و گے، اور جنت میں تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے داخل ہو گے اور منازل تمہارے حصہ میں تمہارے اعمال کی وجہ سے آئیں گی۔



تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۰۸)

- (۱) یہ اللہ کی آیتیں ہیں، ہم ٹھیک تم پر پڑھتے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم نہیں چاہتا۔ (کنز الایمان)
- (۲) یہ آیتیں ہیں اللہ کی، ہم پڑھتے ہیں وہ تم پر حق سے اور نہیں اللہ ارادہ فرماتا ظلم کا جہان والوں پر۔ (نجوم الفرقان)

معنی سمجھنے کیلئے نحوی ترکیب کی طرف توجہ ضروری ہے:

”تلك“ مبتداء ہے اور ”آیات اللہ“ اس کی خبر ہے اور ”نتلوها“ جملہ حالیہ، جیسا کہ ”هذا بعلی شیخا“ میں ”شیخا“ حال ہے اسم اشارہ میں ”اشیر“ فعل والا معنی ہوتا ہے، اسی وجہ سے ”فاعلیت اور مفعولیت“ والا معنی اس سے سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے، جسکی وجہ سے حال بنا نا درست ہوتا ہے، اور ایک دوسری ترکیب میں ”آیات اللہ“ بدل ہے ”تلك“ سے اور تمام جملہ خبر مبتداء ہے، اور ”بالحق“ نتلوها کے فاعل سے حال ہے، یا مفعول سے حال ہے، اگر فاعل سے حال ہو تو ان تمام الفاظ کا معنی یہ ہوگا ”یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں، ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں ہمارا پڑھنا حق ہے۔“

اور اگر مفعول سے حال ہو تو اب مکمل معنی یہ ہوگا ”یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ آیات حق ہیں۔ اس صورت میں یہ حال تاکید کیلئے ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہوتی ہی حق ہیں، پھر حق کا ذکر کرنا تاکید ہو گیا۔“ (شیخ زادہ)

”تلك“ اشارہ پہلی آیات کی طرف ہے جن میں کافروں کے عذاب اور نیک لوگوں کی نعمتوں کا ذکر ہے اس پر بظاہر سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ آیات تو قریب ہیں، ان کی طرف ”تلك“ اشارہ بعید سے کیسے کیا گیا؟ تو اس کا



جواب یہ دیا گیا کہ اگرچہ یہ آیات تو قریب ہیں، لیکن ”ان هذه الآيات المذكورة قد انقضت بعد الذكر فصار كأنها بعدت“ بیشک یہ آیات مذکورہ جب ان کو بیان کر دیا گیا تو ان کا بیان ختم ہونے کے بعد وہ بعید ہونے کے درجہ میں چلی گئیں، واما جاز اقامة ”تلك“ مقام ”هذه“ اس لئے اشارہ قریب کی جگہ اشارہ بعید کا لانا صحیح ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ وہ کتاب نازل کرے گا جو ضروریات دین پر مشتمل ہوگی۔

”فلما انزل هذه الآيات قال تلك الآيات الموعودة هي التي نتلوها عليك بالحق“

تو جب ان آیات کو نازل کیا گیا تو یہ فرمایا گیا کہ وہ آیات جن کا وعدہ کیا گیا وہ ہم آپ پر حق سے تلاوت

کر رہے ہیں، اس صورت میں اشارہ بعید اپنے حقیقی معنی پر مشتمل ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

”نتلوها“ جملة حالية من الآيات (عليك) ای نقرأها عليك يا محمد بواسطة جبریل

”ہم پر وہ (آیتیں) پڑھتے ہیں“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد ﷺ ہم آپ پر جبرائیل کے واسطے

سے پڑھتے ہیں۔ (روح البیان)

﴿وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ﴾ ”اور نہیں اللہ ارادہ فرماتا ظلم کا جہان والوں پر“

یعنی اللہ تعالیٰ جہان والوں میں سے کسی ایک پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا۔

اللہ تعالیٰ کے ظلم نہ فرمانے کا مطلب:

والمعنى ان الله لا يريد ان ينقص ثواب من عمل خير بفضله ولا ان يزيد في عذاب

العاصي على قدر جريمته“

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس نے نیکی کا عمل کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ثواب کو کم کرنے کا ارادہ فرماتا،

کہ اس پر ظلم ہو اور نہ ہی عاصی (گنہگار) کے گناہوں سے زیادہ اسے عذاب دیتا ہے، کہ اس پر ظلم ہو۔

”والكفر بالله تعالى اعظم الخطايا لا ذنب فوقه فيعذب بالنار المخلدة عذابا لا يكون

عذاب فوقه جزاء وفاقا“

اللہ تعالیٰ سے کفر تمام گناہوں سے عظیم گناہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی اور عظیم گناہ نہیں، اس لئے اس کا

عذاب بھی جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے کا عذاب ہوگا، یہ عذاب بھی وہ عذاب ہے جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں،

(ماخوذ از مظہری)

لہذا جرم کے موافق کامل جزاء دی جائے گی۔

”وظلمانكرة في سياق النفي فيعم جميع انواع الظلم والعالمين جمع محلى باللام



فیفید العموم ایضا، فالمعنی ما یرید شیامن الظلم لاحد من خلقه

آیہ کریمہ میں ظلماً نکرہ ہے جو نفی کے تحت واقع ہے اس لئے وہ عموم کا فائدہ دے رہا ہے، جس کا مطلب ہے تمام قسم کے مظالم، اور عالمین پر الف لام استغراق کیلئے جو عموم پر دلالت کر رہی ہے، اب مطلب یہ ہو گیا، اور تمام جہانوں میں اپنی مخلوق کے کسی ایک فرد پر کسی قسم کا کوئی ایک بھی ظلم نہیں کرتا۔

”کیف والظلم وضع الشئ فی غیر موضعه والتصرف فی ملک الغیر وهو تعالیٰ

انما يتصرف فی ملک نفسه“

رب تعالیٰ کیسے ظلم کر سکتا ہے؟ ظلم تو یہ ہے کہ ایک چیز کو جہاں رکھنا ہے وہاں نہ رکھا جائے بلکہ اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے، وہ غیر کے ملک میں تصرف نہیں کرتا، اور وہ کسی چیز کو غیر محل میں بھی نہیں رکھتا، بلکہ وہ تو ہر چیز کو اس کے محل میں رکھتا ہے، ایک چیز کو غیر محل میں رکھنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی مستحق کو اس کا حق نہ دینا، اور کبھی وہ کام کرنا جس سے منع کیا گیا ہے۔

”وکل ذلک لا يتصور فی حقہ تعالیٰ فیستحیل تصور الظلم من اللہ تعالیٰ فانہ لاحق علیہ

لاحد فیظلم بنقصہ“ ولا یمنع عن شئ فیظلم بفعله بل هو المالك علی الاطلاق یفعل

ما یشاء بقدرتہ وبحکم ما یرید بحکمتہ فکل ما جاء منه فهو محض حکمة وعدل“

اللہ تعالیٰ کے حق میں ان میں سے کوئی صورت بھی نہیں پائی جاسکتی، لہذا اللہ تعالیٰ سے ظلم کرنے کا تصور بھی محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق نہیں، اس پر کوئی چیز واجب نہیں کہ وہ اس میں کمی کر کے کسی پر ظلم کرے، اور رب تعالیٰ کو کسی چیز سے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اس پر عمل کر کے ظلم کرے، بلکہ وہ مطلقاً مالک ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے جو چاہے وہ کرتا ہے، اور اپنی حکمت کے مطابق جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے، رب تعالیٰ کا ہر کام حکمت اور عدل پر مبنی ہے۔ (شیخ زادہ)

**سوال :** رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ﴾ کا تم کیا مطلب لیتے ہو یا تم کہو گے ”ہو لا یرید ان یظلمہم“ وہ بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا، اور یا تمہارا موقف یہ ہوگا ”انہ لا یرید منہم ان یظلم بعضہم بعضاً“ وہ یہ نہیں چاہتا کہ بعض بندے دوسرے بعض بندوں پر ظلم کریں، یہ دونوں مطلب درست نظر نہیں آتے، پہلا معنی لینا اس لئے درست نہیں کہ تمہارا مذہب یہ ہے

”انہ تعالیٰ لو عذب البرئی عن اللنب باشد العذاب لم یکن ظالماً، بل کان عادلاً لان الظلم

نصرف فی ملک الغیر وهو تعالیٰ انما يتصرف فی ملک نفسه فاستحال کونه ظالماً“

کہ اللہ تعالیٰ اگر گناہ سے بری شخص کو شدید عذاب دے تو یہ ظلم نہیں ہوگا بلکہ عدل ہوگا، کیونکہ ظلم تو اس



وقت ہوتا ہے جب غیر کی ملکیت میں تصرف کیا جائے، اللہ تعالیٰ تو اپنی ملکیت میں تصرف فرماتا ہے لہذا اسے ظلم نہیں کہا جاسکتا۔

اگر تم دوسرا مطلب لو تو وہ بھی درست نظر نہیں آتا، اسلئے کہ تمہارا مذہب یہ ہے ”کل افعال العباد ارادة الله وتكوينه على قولكم“ کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے اور اس کے موجود کرنے سے پائی جاتے ہیں، تو یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں ارادہ فرماتا جہاں والوں پر ظلم کا، جب کہ اس کے بندے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

**جواب :** آیہ کریمہ کا صحیح مطلب تو وہی ہے جو تفسیر مظہری سے بیان کیا جا چکا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے نیک عمل کا ثواب کم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا، اور کسی گنہگار کو اس کے گناہوں سے زیادہ عذاب دینے کا ارادہ نہیں فرماتا۔ اس سے ظلم نہ کرنے کا مفہوم واضح طور پر سمجھ آ گیا، تاہم یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اگر گناہوں سے بری شخص کو شدید عذاب دے تو یہ ظلم نہیں کہ وہ اپنے ملک میں تصرف کر رہا ہے، یہ بھی درست ہے کہ حقیقت میں یہ ظلم ہی نہیں تو اعتراض بھی درست نہیں۔

جہاں تک بندوں کا بعض کا بعض پر ظلم کرنے کا رعب ارادہ نہیں فرماتا، اس صورت میں ارادہ کا مجازی معنی پسند کرنا لے لیا جائے تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ رب تعالیٰ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا پسند نہیں فرماتا، لیکن بندوں کو افعال کا اختیار دیا ہوا ہے وہ اپنے اختیار سے ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ (راقم)

**سؤال :** اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح بیان کی کہ وہ ”جہاں والوں پر ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا“ یہ مدح کس طرح درست ہے، مدح تو اس وقت ہوتی ہے جب ایک چیز کا پایا جانا ممکن ہو تو وہ کام نہ کیا جائے ”الظلم منه محال علی مذہبکم فامتنع التمدح به“ جب اللہ تعالیٰ کا ظلم کرنا تمہارے مذہب میں محال ہے تو اس کی نفی کیسے ہے؟

**پہلا جواب :** یہ کوئی قانون نہیں کہ ایک چیز ممکن ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ سے نہ پائی جائے تو وہ قابل مدح ہے یہ قانون بندوں کے لحاظ پر ہے، اللہ تعالیٰ کی شان کے جو لائق ہی نہ ہو اور محال ہو اس کا نہ پایا جانا بھی قابل مدح ہے، رب تعالیٰ نے اپنی مدح بیان فرمائی ﴿لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ اسے نہیں پکڑی اونگھ اور نیند، یعنی وہ اونگھ اور نیند سے پاک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ وہ کھلاتا ہے، اسے نہیں کھلایا جاتا ”وَلَا يَلْزَمُ مِنْ ذَلِكَ صِحَّةُ النَّوْمِ وَالْأَكْلِ عَلَيْهِ فَكَذَاهُنَا“ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسے نیند کا آنا صحیح ہے لیکن اسے نیند آتی نہیں، اور یہ کہنا بھی درست نہیں کہ وہ کھا سکتا لیکن کھاتا نہیں، اس آیہ کریمہ میں بھی یہی مطلب ہے کہ ظلم اس



سے محال ہوتا، ظلم کا اس سے محال ہونا ہی قابل مدح ہے۔

**دوسرا جواب:** الشانی انه تعالى ان عذب من لم يكن مستحقا للعذاب فهو وان لم

يكن ظلما في نفسه لكنه في صورة الظلم وقد يطلق اسم احد المتشابهين على الآخر

كقوله "وجزاء سيئة مثلها"

اگر اللہ تعالیٰ اس شخص کو عذاب دے جو مستحق عذاب نہیں تو یہ حقیقت میں ظلم تو نہیں، لیکن بظاہر ظلم نظر آتا

ہے، تو اس لحاظ پر مدح کرنا صحیح ہے، دو متشابہ چیزوں کا ایک دوسرے پر اطلاق درست ہے، جس طرح

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ برائی کا بدلہ اسی کی مثل برا ہے، حالانکہ

برائی کا بدلہ حقیقت میں برا نہیں بلکہ عدل و انصاف ہے، لیکن بظاہر برا نظر آتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

**فائدہ:** "والعدل من جزاء المحسن والمسنی" اچھے کام کرنے والے کو اس کے مطابق جزاء دینا

اور برے کام کرنے والے کو اس کے مطابق جزاء دینا عدل و انصاف ہے۔ (مدارک)

**تنبیہ:** اس سے پہلے کافروں کے چہرے سیاہ ہو جانے اور عذاب میں مبتلاء ہونے کا ذکر کیا تو بظاہر وہم

ہوتا تھا کہ شاید یہ عذاب دینا ظلم ہو گا تو ظلم کی نفی کر کے اسے رد کر دیا اور یہ بتایا۔

"الما وقعوا فيما وقعوا فيه بسبب افعالهم المنكرة وانه لا يظلم احدا من خلقه"

کہ ان لوگوں نے برے افعال یعنی کفر کی وجہ سے اپنے آپ کو عذاب میں واقع کر دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ اپنی

مخلوق میں سے کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (خازن)

**گذشتہ سے پیوستہ:**

❖ واخرج ابو نعیم عن انس قال قال رسول الله ﷺ الغبار في سبيل الله اسفار الوجوه

يوم القيامة

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں غبار قیامت کے دن چہرے کو

روشن کر دے گا۔ (درمنثور)

یہ بھی واضح ہے کہ اللہ کی راہ سے مراد جہاد ہے، اور حج کرنا بھی "فی سبیل اللہ" میں آتا ہے، اور دینی طلباء

کرام کا تعلیم حاصل کرنے کیلئے گھر سے باہر جانا بھی "فی سبیل اللہ" میں داخل ہے۔ (راقم)

❖ واخرج الطبرانی عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال ليس من عبد يقول لا اله الا الله

مائة مرة الا بعثه الله يوم القيامة ووجهه كالقمر ليلة البدر



حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسا بندہ نہیں، جس نے لا الہ الا اللہ سو مرتبہ پڑھا مگر وہ جنت میں جائے گا۔  
(درمنثور)

### زیر بحث آیہ کے متعلق:

❖ روی ابو ذر ان النبی ﷺ قال فیما یروی عن ربہ عزوجل ”انہ قال یا عبادى انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ بینکم محرما فلا تظالموا“ (بخاری و مسلم و ترمذی و ابن ماجہ)  
حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد (حدیث قدسی) بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو میں نے اپنے نفس پر ظلم حرام کر دیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کر دیا ہے، تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔  
(منقول از البحر المحیط)

❖ وفی الحدیث الصحیح ایضاً ان رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ لا یظلم المؤمن حسنة یعطى بها فی الدنیا ویجزی بها فی الآخرة، واما الکافر فیطعم بحسناته فی الدنیا ما عمل لله بها فاذا الفضى الى الآخرة لم یکن له حسنة یجزی بها“ (مسلم، مسند احمد)

حدیث صحیح میں ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بیشک اللہ تعالیٰ مؤمن پر ظلم نہیں فرماتا اسے دنیا میں نیکی کرنے کی توفیق عطاء فرماتا ہے اور اس کی جزاء آخرت میں عطاء فرمائے گا، لیکن کافر اپنی اچھائیوں کے بدلے دنیا میں کھا لیتا ہے، اس کا عمل اللہ کی رضا کیلئے نہیں ہوتا، جب وہ قیامت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی کہ اسے جزاء دی جائے۔ (منقول از البحر المحیط)



وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَآلِی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُورُ ۝ (آیہ نمبر ۱۰۹)

(۱) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کاموں کی رجوع ہے۔  
(کنز الایمان)

(۲) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹا یا جانا ہے تمام کاموں کو۔  
(نجوم الفرقان)

”وللہ“ جار مجرور کو پہلے ذکر کیا جو حصر پر دلالت کر رہا ہے، یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ”وحدہ لا شریک لہ“ ہے اس کا کوئی شریک نہیں، تمام مخلوق اسی کی ملکیت میں ہے، موت دینا اور حیات عطا کرنا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے،



ثواب دینا اور عذاب دینا اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، لفظ ”ما“ ذکر کیا یا تو غیر ذوالعقول کی تعداد میں کثرت کی وجہ سے ان کو غالب کیا، یا اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ رب تعالیٰ کی عظمت کے مقابل مخلوق کو پستی حاصل ہے، (اگرچہ مخلوق میں اولوالعزم حضرات انبیاء کرام ہیں اور سید اکائنات حضرت محمد ﷺ ہیں)

”والی اللہ“ ای الی حکمة وقضائه لالی غیرہ شرکۃ واستقلالاً“ (ترجع الامور) ای امورہم فیجازی کلامنہم بما وعدلہ و او عدہ من غیر دخل فی ذلک لاحد قسط“

اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضاء (اس کے فیصلہ) کی طرف تمام امور لوٹائے جانے ہیں، وہ ہر ایک کو اپنے وعدہ کے مطابق جزاء عطاء کرے گا، اور اپنی وعید (ڈرانے) کے مطابق عذاب دے گا، کسی اور کو اس میں کوئی دخل حاصل نہیں ہوگا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے حکم و قضاء میں کوئی شریک ہے، اور نہ ہی رب کے بغیر کسی اور کو یہ حاصل ہے کہ امور اس کی طرف لوٹائے جائیں۔ (روح البیان)

**سوال :** ”رجوع“ کا تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی چیز چلی جائے پھر لوٹ کر آجائے، رب تعالیٰ کی طرف کاموں کا لوٹنا کس طرح صحیح ہے، کہ کام پہلے چلے جائیں پھر لوٹ آئیں۔

**جواب :** قلنا كانت كالداهية بهلا ثم اعادتها لان في الدنيا يملك بعض الخلق بالتدبير وفي القيامة يكون كل ذلك الله تعالى

جب تمام چیزوں میں ایک مرتبہ فنا ہے، پھر ان کو لوٹانا ”رجوع“ ہی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں مخلوق کو بعض چیزوں کی تدبیر کی وجہ سے ملکیت حاصل ہوتی ہے، لیکن قیامت میں صرف اللہ تعالیٰ کو ملکیت حاصل ہوگی، ”اللہ تعالیٰ کی طرف تمام کاموں کے لوٹائے جانے کا یہی مطلب ہے“ (ماخوذ از روح البیان)

ما قبل سے تعلق:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مومنوں کے احوال بیان فرمائے کہ مومنوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا اور کافروں کو عذاب دے گا۔ ”نبہ علی ان التصرف هو فیما یملکہ، فلا اعتراض علیہ تعالیٰ“ اب اس آیت کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے ملکیت میں تصرف فرماتا ہے، اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، اس آیت کریمہ سے پہلی آیت کریمہ کی توثیق بھی ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ملک میں وسعت پائی گئی، تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ”فہو غنی عن الظلم“ جو اپنی وسیع ملکیت میں تصرف کرتا ہے وہ ظلم سے مستغنی ہے، جو



غیر کے ملک میں تصرف کرے ظالم تو وہ ہوتا ہے، اپنی ملکیت میں تصرف کرنا ظلم نہیں۔

دینی طلباء کرام کیلئے بہت مفید:

آیات کریمہ میں یعنی ”بیض“ اور ”سود“ میں، اور اسودت اور بیضت میں، اور ”اکفرتم“ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ“ میں اور ”بالحق“ اور ”وظلما“ میں طباق پایا گیا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ ”طباق“ مطابقت“ تضاد“ ایک معنی میں علم بدیع میں استعمال کئے گئے ہیں ”وہی الجمع بین المتضادین“ دو متضاد چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنا مطابقت اور طباق و تضاد ہے۔

اور ”اکفرتم“ اور ”تکفرون“ میں تجنیس تماثل پائی گئی ہے، جب دو لفظ ایک نوع میں متفق ہوں، دونوں اسم ہوں، یا دونوں فعل ہوں یا دونوں حرف ہوں تو اسے تجنیس مماثل کہتے ہیں، یہاں بھی ایک مادہ سے دو فعل لئے ہوئے ہیں ”اکفرتم“ اور ”تکفرون“ ان دونوں میں تجنیس تماثل ہے، اور ﴿فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ میں اسم ظاہر کی تاکید مضمّر سے کی گئی ہے، یعنی رحمت کی طرف حاضمیروٹ رہی ہے۔ پھر لفظ ”اللہ“ کا تکرار متغائر المعانی (جن کے مختلف معانی ہیں ان) میں استعمال جو زیادتی حسن پر دلالت کرتا ہے۔

”والمعروف في لسان العرب اذا اختلف الجمل اعادت المظهر لا المضمّر“

عرب کی زبان میں یہ مشہور ہے کہ جب جملے مختلف (معانی پر دلالت کر رہے) ہوں تو اسم ظاہر کو لوٹایا جاتا، ضمیر کو نہیں لایا جاتا اس میں تفخیم شان پائی گئی ہے، اور خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کی تعظیم پائی گئی ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط، مختصر المعانی) زیر بحث آیت کریمہ کے متعلق کچھ مزید بحثیں:

احتج اصحابنا لقوله تعالى ”ولله مافی السموات ومافی الارض“ علی کونہ خالقاً لعمال العباد“ اہل سنت نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ سے یہ دلیل حاصل کی کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے، خواہ وہ اعمال اچھے ہوں یا برے، بندوں کے افعال بھی جب زمین و آسمان سے باہر نہیں تو وہ واضح ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ”فدللت هذه الآية علی انه خالق لافعال العباد“ تو یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ وہ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے۔

معتزلہ کا چونکہ مذہب یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، تو اسلئے



”اجاب الجبائی عنہ بان قوله (لله) اضافة ملک لا اضافة فعل الاخرى انه يقال  
”هذا البناء لفلان فيريدون انه مملوك لا انه مفعوله“

جبائی معترلی نے اہل سنت و جماعت کی دلیل کا جواب یہ دیا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں ”لله“ میں نسبت ملک کی طرف ہے، فعل کی طرف نسبت نہیں، عام طور پر بیان کیا جاتا ہے، یہ مکان فلاں کا ہے تو اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ یہ مکان فلاں کی ملکیت میں ہے، اور یہ معنی نہیں کہ فلاں نے یہ مکان خود تعمیر کیا ہے، تعمیر تو معماروں نے کیا ہے، جبائی نے اور یہ دلیل قائم کی ہے کہ آیت کریمہ میں مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور اپنی مدح بیان کی اگر یہ کہا جائے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو بندوں کے افعال تو برے بھی ہوتے ہیں، برے افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کس طرح قابل مدح ہے۔

اور دلیل جبائی نے یہ پیش کی ہے کہ ﴿مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہاں ان چیزوں کا ذکر ہے جو آسمانوں اور زمین کا مظروف بن سکیں (یعنی زمین و آسمان میں ساسکیں)  
”وذلك من صفات الاجسام لا من صفات الافعال التي هي اعراض“  
یہ صفات اجسام سے ہے نہ کہ صفات افعال سے، کیونکہ یہ اعراض ہیں، اعراض بغیر معروض کے، صفت بغیر موصوف کے نہیں پائی جاتی۔

ہمارے اصحاب نے جواب یہ دیا ہے:

”ان هذه الاضافة اضافة الفعل بدليل ان القادر على القبيح والحسن“

کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ اضافت فعل نہیں، بلکہ یہاں اضافت فعل پائی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اچھی اور بری تمام چیزوں کی تخلیق کی قدرت ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ بندوں کے برے افعال رب تعالیٰ کی طرف بحیثیت تخلیق کے منسوب ہیں، برے افعال کی تخلیق بری نہیں بلکہ برے افعال کا کسب برا ہے۔ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تخلیق ہیں اور بندوں کے اسباب جو انکو معرض وجود میں لاتے ہیں وہ امور داعیہ کہلاتے ہیں۔

”ولبت ان مجموع القدرة والداعية بخلق الله تعالى لبت ان فعل العبد مستند الى الله خلقا وتكون بنا بواسطة فعل السبب“

ثابت ہو گیا کہ بیشک انسان کی مجموعی قدرت اور امور داعیہ کا اللہ تعالیٰ خالق ہے، لہذا بندے کے افعال اسباب کے ذریعے پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کا خالق اور انکو معرض وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (ماخوذ از کبیر)



فلاسفہ کا مذہب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ فلاسفہ نے یہ گمان کیا ہے کہ ”ما فی السماوات“ کو پہلے ذکر کیا گیا، اور ”ما فی الارض“ کو بعد میں، اسی سے پتہ چل گیا کہ ”ان احوال السماویة اسباب للاحوال الارضیة فقدم السبب علی المسبب“ سماوی احوال سبب ہیں ارضی احوال کا، اور سبب مسبب سے پہلے ہوتا ہے اسی وجہ سے ما فی السماوات کو پہلے ذکر کیا گیا۔

”وهذا يدل على ان جميع الاحوال الارضية مستندة الى الاحوال السماوية ولا

شك ان الاحوال السماوية مستندة الى خلق الله وتكوينه فيكون الجبر لازما“

یہ قول اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام احوال ارضیہ منسوب ہیں احوال سماویہ کی طرف، اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ احوال سماویہ اللہ کی خلق اور تکوین کی طرف منسوب ہیں، فلاسفہ کے اس قول سے جبر یہ فرقہ کا مدعی ثابت ہوگا کہ انسان احوال سماویہ میں اختیار نہیں رکھتا اور حقیقی طور پر مراد احوال سماویہ ہی ہیں، اس طرح انسان کا مجبور محض ہونا لازم آئے گا۔  
(ماخوذ از کبیر)

وہی اول وہی آخر:

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ میں رب تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ”اللہ“ ذکر فرمایا، پھر ﴿وَالِی اللّٰهُ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ میں اسم گرامی ”اللہ“ ذکر فرمایا۔

”والغرض منه تاکید التعظیم والمقصود ان منه مبدأ المخلوقات والیہ معادہم“ اس سے غرض تاکید تعظیم ہے، اور مقصود اس سے یہ بیان کرنا ہے کہ بیشک اسی سے مخلوقات کی ابتداء ہے، اور اسی کی طرف انتہاء ہے۔

فقوله (ولله ما فی السماوات وما فی الارض) اشارة الى انه سبحانه هو الاول وقوله (والی اللہ ترجع الامور) اشارة الى انه ”هو الآخر“

اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اول ہے، اور ﴿وَالِی اللّٰهُ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہی آخر ہے۔

وذلك يدل على احاطة حكمه وتصرفه وتدبيره باولهم وآخرهم وان الاسباب والمسببات منتسبة اليه وان الحاجات منقطعة عنده“



اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اللہ کا حکم اور اس کا تصرف اور اس کا تصرف اور اس کی تدبیر تمام اول و آخر کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، کیونکہ ظاہری اسباب اور مسببات تمام اسی کی طرف منسوب ہیں، اور تمام حاجات اسی پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔

**فائدہ:** ظاہری اسباب اور ہیں، حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہے، نماز کا سبب ظاہری وقت ہے، اور روزے کا سبب ظاہری رمضان کا موجود ہونا ہے، اور حقیقی سبب تمام چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح تمام حاجتیں اللہ تعالیٰ پر جا کر ختم ہوتی ہیں، حقیقی طور پر حاجت رواء وہی ہے، البتہ اس نے خود ہی وسائل بنا رکھے ہیں، بیماری سے نجات دینے کا ذریعہ طبیب کو بنا دیا، اور کبھی کسی نیک کی دعاء سے حاجت پوری ہو گئی، کبھی کسی نیک شخص سے دم کرا لیا تو شفاء حاصل ہو گئی، کبھی کسی نیک شخص کے وسیلہ سے دعاء کر لی تو وہ دعاء مقبول ہو گئی، یہ سب مجازی طور پر حاجت روا ہیں۔

**دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:**

کلمۃ الی فی قوله ”والی اللہ ترجع الامور“ لا تدل علی کونہ تعالیٰ فی مکان وجہۃ بل المراد ان رجوع الخلق الی موضع لا ینفذ فیہ حکم احد الاحکامہ ولا یجری فیہ قضاء احد الا قضاءہ“

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَالِی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُور﴾ میں کلمہ ”الی“ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کسی مکان یا کسی جہت میں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مخلوق نے وہاں لوٹنا ہے جہاں کسی ایک کا حکم نہیں چلے گا صرف اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہوگا، کسی ایک کا وہاں فیصلہ نہیں ہوگا صرف اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوگا۔ (کبیر)

**طلباء کرام کے فائدہ کیلئے ایک اور مسئلہ:**

ترجع شامی و حمزہ و علی کان عبارة عن وجود الشئ فی زمان ماض علی سبیل الابہام ولا دلیل فیہ علی عدم سابق ولا علی القطاع طارئ

شامی اور حمزہ اور علی رحمہم اللہ نے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے، وہ اعتراض یہ تھا کہ ایک چیز پہلے موجود ہو، پھر اس کی طرف لوٹے تو اسے رجوع کہا جائے گا، جب کوئی چیز پہلے موجود ہی نہ ہو تو لوٹانے کا کیا مطلب؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اگر کوئی چیز زمانہ ماضی میں مبہم طور پر بھی پائی جائے تو اس کیلئے مراجعت کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں کہ تمام امور پہلے معدوم تھے، یا ان پر انقطاع جاری ہو گیا۔

(ماخوذ از مدارک التنزیل للنفسی المعروف بالنفسی)



كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ  
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ  
الْفَاسِقُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۱۰)

(۱) تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر کتابی ایمان لاتے تو ان کا بھلا تھا ان میں کچھ مسلمان ہیں اور زیادہ کافر۔

(۲) تم بہتر ہو تمام امتوں سے جو ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے، تم حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا، اور تم منع کرتے ہو برے کاموں سے، اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر، اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو بہتر ہوتا ان کیلئے، ان میں سے کوئی مؤمن نہیں، اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اس سے پہلے آیات میں مؤمنوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا، اور بعض سے منع کیا، اور اہل کتاب کی طرح سرکش اور نافرمان ہونے سے منع فرمایا، اس کے بعد مطیع لوگوں کے ثواب کا ذکر کیا اور کافروں کے عذاب کا ذکر کیا۔ تمام آیات میں غرض یہ ہے کہ مؤمنین و مکلفین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کے تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا، اور سرکشی اور معصیت سے منع کیا گیا، اس کے بعد اس آیت کریمہ میں ایک اور طریقہ سے مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارا گیا ہے۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ والمعنى انكم كنتم في اللوح المحفوظ خيرا لامة وافضلهم، فاللائق بهذا ان لا تبطلوا على انفسكم هذه الفضيلة وان لا تنزلوا عن انفسكم هذه الخصلة المحموده وان تكونوا منقادين مطيعين في كل ما يتوجه عليكم من التكليف

تم تمام امتوں سے بہتر ہو، یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہو، لائق یہی ہے کہ تم اپنے اعمال کو ترک کر کے اپنے نفسوں کی اس فضیلت کو باطل نہ کرو، اور نہ ہی اپنے نفسوں سے یہ اچھا طریقہ زائل کرو، جو بھی تمہیں تکالیف دی جاتی ہیں یعنی جن کاموں سے تمہیں روکا گیا ان سے رک جاؤ، اور جن کاموں کا



تمہیں حکم دیا گیا ان پر عمل کرو، اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بن جاؤ، اور ماقبل سے تعلق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اشیاء (بدبختوں) کا کامل حال بیان فرمایا۔ ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ﴾ ”لیکن وہ جن کے چہرے سیاہ ہیں۔ پھر نیک بختوں کا کامل حال بیان فرمایا۔ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ﴾ ”لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہیں۔ اس کے بعد بدبختوں کی وعید کا سبب بیان فرمایا۔ ﴿وَمَالَهُ يُرِيدُ ظَلَمًا لِّلْعَالَمِينَ﴾ ”اور اللہ نہیں ارادہ فرماتا ظلم کرنے کا جہاں والوں پر“

”یعنی انہم انما استحقوا ذلك بافعالهم القبيحة“

یعنی وہ اپنے برے افعال کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان پر کوئی ظلم نہیں۔  
ثم نبه في هذه الآية على ما هو السبب لوعدا السعداء بقوله (كنتم خیرامة اخرجت للناس) ای تلك السعادات والكمالات والكرامات انما فازوا بها في الآخرة لانهم كانوا في الدنيا ”خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“

اس کے بعد اس آیت کریمہ میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ اے نیک بختو تمہارے ساتھ وعدہ کا تعلق اس سے ہے کہ تم تمام امتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئیں، یہ نیک بختی اور کمال اور کرامت تمہیں آخرت میں حاصل ہونی ہے، جس کی وجہ سے تمہیں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل ہوگی، کیونکہ دنیا میں تم تمام امتوں سے بہتر ہو۔  
(مفاتیح الغیب المعروف بالکبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

لفظ ”کان“ کبھی تامہ ہوتا ہے، کبھی ناقصہ، اور کبھی زائدہ، اور کبھی ”صار“ کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں تمام احتمال پائے گئے ہیں۔

**پہلا احتمال:** جب ﴿كُنْتُمْ﴾ میں ”کان“ تامہ ہو تو اس صورت میں ”کان“ بمعنی وقوع اور حدوث کے ہوگا، اور وہ خبر کا محتاج نہیں ہوگا ”والمعنى حدثتم خیرامة ووجدتم خیرامة وخلقتم خیرامة“ تمہیں سب امتوں سے بہتر امت بنایا گیا، تمہیں سب امتوں سے بہتر امت پایا گیا، اور تمہیں سب امتوں سے بہتر امت پیدا کیا گیا، اس ترکیب میں ”خیرامة“ میں حال واقع ہوگا، اس پر ہی جمہور مفسرین کرام ہیں۔

**دوسرا احتمال:** دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”کان“ ناقصہ ہو، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ اس سے تو پتہ چلے گا کہ یہ معنی ہوگا ”انہم کانوا موصوفین بهذه الصفة وانهم ما بقوا الآن علیہا“ کہ وہ پہلے اس صفت سے



متصف تھے اب اس صفت پر باقی نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کان ناقصہ ہمیشہ انقطاع پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ کبھی دوام پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اَسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾ یہاں کان ناقصہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ کیلئے غفار ہونا ثابت ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ پہلے غفار تھا اور اب معاذ اللہ نہیں ہے اور اسی طرح ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ میں کان دوام پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے ”غفور“ اور ”رحیم“ ہے۔

کان ناقصہ کی صورت میں معافی میں چند احتمال:

(۱) اَحَدَهَا كُنْتُمْ فِی عِلْمِ اللّٰهِ خَيْرًا مَّۤا “ ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے علم میں تمام امتوں سے بہتر امت ہو۔

(۲) وَثَانِيهَا كُنْتُمْ فِی الْاٰمَمِ الدِّیْنِ كَا نُوْا قَبْلَكُمْ مَذْكُوْرِيْنَ بِاَنْكُمْ خَيْرًا مَّۤا “ دوسرا معنی یہ ہے کہ تم سے پہلے جو امتیں گزر گئیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے بیشک تم ان تمام سے بہتر امت ہو۔

(۳) وَثَالِثُهَا كُنْتُمْ فِی اللُّوْحِ الْمَحْفُوْظِ مُوْصُوْفِيْنَ بِاَنْكُمْ خَيْرًا مَّۤا “ تیسرا معنی یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ تم ”خیرا مہ“ کی صفت سے متصف ہو۔

(۴) وَرَابِعُهَا كُنْتُمْ مِّنْ اٰمَنَتُمْ خَيْرًا مَّۤا اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ “ چوتھا معنی یہ ہے کہ تم نے جب سے ایمان لایا ہے اس وقت سے تم تمام امتوں سے بہتر ہو، جو امتیں لوگوں پر ظاہر کی گئیں۔

(۵) پانچواں معنی ابو مسلم نے بیان کیا کہ ”كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ“ پیچھے لایا گیا ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰبٰیضَتْ وُجُوْهُهُمْ﴾ کے توجہ ان کو جنت میں ہمیشہ رہنے کا حکم دیا جائے گا تو اس وقت ان کو کہا جائے گا۔

”كُنْتُمْ فِی دُنْيَاكُمْ خَيْرًا مَّۤا فَاسْتَحَقَّقْتُمْ مَا اَلْتُمْ فِیْهِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَبِیَاضِ الْوُجُوْهِ بِسَبَبِهِ“  
تم دنیا میں تمام امتوں سے بہتر امت تھے، اسی وجہ سے تم رحمت اور چہرے کی سفیدی کے مستحق ہو۔

(۶) كُنْتُمْ مِّنْ اٰمَنَتُمْ خَيْرًا مَّۤا تَنْبِیْهَا عَلٰی اَنْهُمْ كَا نُوْا مُوْصُوْفِيْنَ بِهٰذِهِ الصِّفَةِ مَذْكُوْرًا “

چھٹا معنی یہ ہے کہ تم نے جب ایمان لایا اس وقت سے تم تمام امتوں سے افضل ہو، اسی سے اس کی طرف تنبیہ کر دی گئی کہ پہلی امتوں کے وہی لوگ بہتر تھے جو ایمان والے تھے، لیکن تم ایمان لانے کے بعد ان سے افضل ہو گئے (کافر کبھی بہتر نہیں ہو سکتا، کافروں کو بہتر کہنے والے اسلام کے باغی ہیں)

(۷) قَوْلُهُ تَعَالٰی ”كُنْتُمْ“ مَخْصُوْصٌ بِقَوْمٍ مُّعٰیْنِيْنَ مِنْ اَصْحَابِ الرَّسُوْلِ ﷺ وَهُمْ السَّابِقُوْنَ



الاولون ومن صنع مثل ما صنعوا“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ”کنتم“ معین لوگوں سے خاص ہے، وہ ہیں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کیونکہ وہی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، پھر البتہ آیہ کریمہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو شامل ہے جن کے اعمال صحابہ کرام کے اعمال کی طرح ہیں۔  
(ماخوذ از کبیر بخذف و تقدیم و تاخیر)

واقعہ کو یہی آخری معنی پسند ہے، کیونکہ افضلیت کے حقدار صحابہ کرام یا ان کے قبیعین۔

**تیسرا احتمال:** تیسرا احتمال یہ کہ ”کان“ زائدہ ہو، زائدہ ہونے کی صورت میں ”کان“ کوذکر کیا جائے، یا پوشیدہ رکھا جائے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ اس قول کو ابن الانباری رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ ”کان“ زائدہ ہوتا ہے درمیان میں یا آخر میں، شروع میں زائدہ نہیں ہوتا ”عبد اللہ کان قائم“ میں، اور ”عبد اللہ قائم کان“ میں ”کان“ کو عرب حضرات زائد مانتے ہیں، لیکن ”کان عبد اللہ قائما“ میں ”کان“ کو زیادہ نہیں مانتے۔

**چوتھا احتمال:** چوتھا احتمال یہ ہے کہ ”کان“ بمعنی ”صار“ کے ہو، یعنی ”کنتم خیرامۃ“ کا معنی ”صرتم خیرامۃ“ تم تمام امتوں سے بہتر امت ہو گئے، اب مکمل معنی یہ ہو گیا:

”صرتم خیرامۃ بسبب كونكم امرين بالمعروف وناهين عن المنكر ومؤمنين بالله“  
تم تمام امتوں سے بہتر ہو گئے اس سبب سے کہ تم اچھے کاموں کا حکم دینے والے ہو، اور برے کاموں سے روکنے والے ہو اور اللہ پر ایمان لانے والے ہو۔  
(ماخوذ از کبیر)

﴿أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ”جو ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے۔“

اعلیٰ حضرت و علامہ رازی و علامہ بیضاوی رحمہم اللہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا ترجمہ کیا ”جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں“ یہی ترجمہ بیضاوی اور رازی رحمہما اللہ نے تحریر فرمایا، الفاظ علامہ رازی رحمہ اللہ کے دیکھیں۔

”ان المعنى كنتم خيرا لامم المخرجة للناس في جميع الاعصار فقولہ ”اخرجت

لنناس“ ای اظہرت للناس حتی تمیزت و عرجت و فصل بینہا و بین غیرہا“

﴿أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا معنی ہے ”ظاہر کی گئیں لوگوں کیلئے“، یعنی تمام امتیں جو لوگوں کیلئے ظاہر کی

گئیں کہ ان کی پہچان ہو سکے اور دوسروں سے ممتاز ہو سکیں، ان تمام امتوں سے تم بہتر اور افضل ہو،



خیال رہے کہا ”اُخْرِجَتْ“ کا لغوی معنی ہے ”نکالی گئی“ یا محاورہ مرادی معنی ہے ”ظاہر کی گئی۔“

آیہ کریمہ اجماع امت کی حجت پر دلالت کر رہی ہے:

”احتج اصحابنا بهذه الآية على ان اجماع الامة حجة“ ہمارے اصحاب نے اس آیہ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اجماع امت بھی شرعی احکام ثابت کرنے والے دلائل میں سے ایک دلیل ہے، حجت ثابت کرنے کیلئے دو وجہ بیان کی گئیں۔

**تقریر اول:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَمِنْ قَوْمٍ مُّؤَسَّىٰ أُمَّةٌ يُّٰهْدُونَ بِالْحَقِّ﴾ موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ وہ ہے جو حق کی ہدایت دیتے ہیں، پھر اس آیہ کریمہ میں ”کنتم خیرامة“ (تم تمام امتوں سے بہتر ہو) اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے وہ لوگ جو اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ موسیٰ علیہ السلام کی امت کے ان لوگوں سے افضل ہیں جو حق کی ہدایت دیتے ہیں۔

”واذا كان هؤلاء الفضل منهم و جب ان تكون هذه الامة لا تحکم الا بالحق“ جب کہ یہ لوگ افضل ہیں ان پہلے لوگوں سے تو ضروری ہے کہ یہ امت سوائے حق کے کوئی حکم نہ دے، اگر نبی کریم کے امت کے وہ لوگ جو صحابہ کرام اور اہل بیت کی اتباع کرتے ہیں، وہ ناحق بات کریں تو موسیٰ علیہ السلام کی امت کے حق بات کرنے والوں سے افضل نہیں ہو سکتے۔

”لان المبطل يمتنع ان يكون خيرا من المحق“ کیونکہ باطل راہ پر چلنے والے کا حق راہ پر چلنے والے سے افضل ہونا منع ہے۔

”ثبت ان هذه الامة لا تحکم الا بالحق واذا كان كذلك كان اجماعهم حجة“ تو ثابت ہوا کہ بیشک یہ امت صرف حق کا فیصلہ کرے گی، جب اس طرح ہے تو ان کا اجماع حجت ہے۔

**تقریر دوم:** ”المعروف“ اور ”الْمُنْكَرُ“ پر الف لام استغراقی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معنی یہ ہے۔

”وهذا يقتضى كونهم آمرين بكل معروف وناہين عن كل منكر ومتى كانوا كذلك

كان اجماعهم حقا وصادقا لا محالة فكان حجة“

کہ وہ صحابہ کرام اور آپ کے قبیحین ہر ایک بھلائی کا حکم دینے والے ہیں اور ہر ایک برائی سے منع کرنے والے ہیں، جب ان کا وصف یہ ہے تو واضح ہوا کہ ان کا اجماع یقینی طور پر حق اور سچ ہے، لہذا ان کا اجماع حجت ہے۔ (کبیر)



**فائدہ:** زجاج نے کہا ہے کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ بظاہر خطاب ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو، لیکن یہ حکم تمام امت کو شامل ہے، جیسا کہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ اور ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ کا حکم بظاہر اس وقت حاضرین کو تھا، لیکن بعد میں وہ حکم تمام امت کو شامل ہو گیا۔

البتہ امت کے وہی لوگ اس میں آئیں گے جن کے اعمال قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔

﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾

”تم حکم دیتے ہو اچھے کاموں کا اور تم روکتے ہو برے کاموں سے اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔“

”واعلم ان هذا كلام مستأنف والمقصود منه بيان علة تلك الخيرية“ یہ نئی بات شروع ہو رہی ہے، اور مقصد امت کے خیر ہونے کی علت بیان کرنا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے ”زید کریم يطعم الناس ويكسوهم ويقوم بما يصلحهم“ زید کریم ہے کہ وہ لوگوں کو طعام کھلاتا ہے اور ان کو کپڑے پہناتا ہے، اور ان کی حاجات کو پورا کرتا ہے یعنی زید کے کریم ہونے کی علت لوگوں کو طعام کھلانا اور ان کو کپڑے پہنانا اور ان کی حاجات کو پورا کرنا ہے۔

**اصول فقہ کا قانون:**

اصول فقہ میں قانون بیان کیا گیا ہے کہ کوئی حکم بیان کیا جائے اس کے بعد اس کے اوصاف بیان کئے جائیں تو وہ اوصاف اس حکم کی علت بنتے ہیں، اس آیت کریمہ میں پہلے امت کے خیر ہونے کا ذکر کیا، پھر ان کے یہ تمام اوصاف امت کی افضلیت کے اسباب ہیں، ان کے بغیر امت افضل نہیں ہو سکتی۔ (کبیر)

**سوال:** اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا اور اللہ پر ایمان رکھنا اس امت کی افضلیت کے اسباب کیسے ہیں؟ یہ اوصاف تو پہلی امتوں کو بھی حاصل تھے۔

**جواب:** نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ اوصاف اعلیٰ درجے کے حاصل ہیں، اعلیٰ درجہ کا ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ جہاد کرنا ہے، کامل درجہ کا جہاد اسی امت کو حاصل ہے۔

”ان الامر بالمعروف قد يكون بالقلب وباللسان وباليدين واواما يكون بالقتال لانه لقاء النفس في خطر القتل“

بیشک اچھے کاموں کا حکم دینا کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ہاتھ سے، ان تم میں سے زیادہ قوی جہاد سے دین کی تبلیغ کی جائے، یہ افضل اس لئے ہے کہ اس میں اپنے نفس کو قتل کے خطرہ میں ڈالنا پایا جاتا ہے



”واعرف المعروفات الدين والايمان بالتوحيد والنبوة، وانكر المنكرات الكفر فكان  
الجهاد في الدين محملاً لا عظم المضار لغرض ايصال الغير الى اعظم المنافع  
وتخليصه من اعظم المضار فوجب ان يكون الجهاد اعظم العبادات ولما كان  
امر الجهاد في شرعنا قوی منه في سائر الشرائع لا جرم صار ذلك موجبا لفضل هذه  
الامة على سائر الامم“

سب کاموں سے اچھا کام دین حق اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا ہے اور سب  
کاموں سے برا کام اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے میں اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر  
اوروں کو عظیم منافع پہنچانا کہ جہاد عبادات میں سے عظیم عبادت ہو، جب جہاد ہماری شریعت میں بنسبت دوسری  
شریعتوں سے زیادہ قوی درجہ رکھتا ہے تو یقیناً وہ امت جسے اعلیٰ درجہ کی عبادت قوی ترین جہاد ”فی سبیل اللہ“ حاصل ہے  
وہ تمام امتوں سے افضل ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد:

وهذا معنى ما روى عن ابن عباس انه قال في تفسير هذه الآية قوله (كنتم خیرامة  
اخرجت للناس) تأمروا ان يشهدوا ان لا اله الا الله ويقرؤا بما انزل الله وتقاتلوا لهم  
عليه ”ولا اله الا الله“ اعظم المعروف والتكذيب هو انكر المنكر“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿كُنْتُمْ  
خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ آیت کریمہ میں ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم حکم دیتے ہو کہ گواہی  
دو اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا اس کے اقرار کرنے اور اللہ کی راہ میں قتال (جہاد) کرنے کا  
حکم دیتے ہو، ”لا اله الا الله“ سب کاموں سے اچھا ہے تو اس کی شہادت پر قائم رہنے کا حکم دینا اچھے کام کا حکم دینا  
ہے، اور ”لا اله الا الله“ کی تکذیب برا کام ہے، اور ”لا اله الا الله“ کی تکذیب سے روکنا برے کام سے روکنا ہے۔

جہاد کا فائدہ:

قتال کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے فائدہ کا کوئی انصاف کرنے والا انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ اکثر  
لوگ اپنے اپنے دین پر آباء و اجداد کی محبت اور عادت کی وجہ سے قائم رہتے ہیں، ان پر جو دلائل بھی قائم کرو وہ ان کی



طرف توجہ نہیں کرتے، اور نہ ہی سوچنے کی کوشش کرتے ہیں، جب وہ دین میں داخل ہونے کو ناپسند کرتے کریں، جو دین قبول کر لیں ان کو اس دین حق سے برگشتہ (پھیرنے) کرنے کی کوشش کریں، اور دیندار لوگوں کیلئے راہ حیات تنگ کر دیں، تو ایسے لوگوں سے جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ راہ راست پر آجائیں، اگر ان کی قسمت میں راہ راست پر آنا نہ ہو تو کم از کم دیندار لوگ ان سے نجات حاصل کر لیں گے، بعض اوقات مسلمانوں کی جرأت، بے باکی کو دیکھ کر ان کے دلوں سے باطل دین کی محبت کم ہو جاتی ہے اور دین حق سے محبت ان کو حاصل ہو جاتی ہے، جو عذاب دائمی کے مستحق تھے ان کو ثواب دائمی حاصل ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر بوضاحت)

**سوال:** اس مقام پر ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کو پہلے ذکر کیا گیا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کو بعد میں ذکر کیا گیا ”وان الایمان باللہ لابد ان یکون مقدما علی کل الطاعات“ حالانکہ تمام عبادات سے پہلے ایمان کا ہونا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایمان کو مؤخر ذکر کیا گیا؟

**جواب:** اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا حق پر قائم رہنے والی پہلی تمام امتوں کو حاصل رہا، جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تمام ان امتوں پر فضیلت دی گئی جو حق پر قائم تھیں اور پہلے گزر گئیں، یہ فضیلت صرف ایمان کی وجہ سے نہیں، ایمان تو تمام کو ہی حاصل رہا، بلکہ یہ فضیلت اس لئے حاصل ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کی فضیلت کو اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا اعلیٰ درجہ کا حاصل رہا، اس کا ذریعہ جہاد جیسا ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کا سبب اسی امت کو حاصل رہا، (نفس ایمان میں کوئی زیادتی نہیں، جسکی تفصیل (لہٰذا) سورۃ انفال میں آئے گی)

”فان المؤثر فی حصول هذه الخیرية هو الامر بالمعروف والنہی عن المنکر واما الایمان باللہ فهو شرط لتاثير هذا المؤثر فی هذا الحکم ..... والمؤثر الصق بالامر من شرط التاثير فلہذا السبب قدم اللہ تعالیٰ ذکر الامر بالمعروف والنہی عن المنکر علی ذکر الایمان“

اصل میں اس امت کے خیر ہونے پر مؤثر ”امر بالمعروف والنہی عن المنکر“ ہیں ”ایمان باللہ“ اس مؤثر کی شرط تاثیر ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عبادت مؤثر نہیں، مؤثر کا اثر سے شرط تاثیر سے ملنا ضروری ہوتا ہے، اسی وجہ سے ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کو پہلے ذکر فرمایا، اور ایمان باللہ کو بعد میں ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

**سوال:** آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا ذکر فرمایا اور نبوت پر ایمان رکھنے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ نبوت پر ایمان رکھنے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا۔



**جواب:** ”الایمان بالله يستلزم الايمان بالنبوة“ اللہ پر ایمان حاصل ہی اس وقت ہوتا ہے جب نبوت پر ایمان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک حاصل نہیں جب تک نبی کے سچے ہونے پر ایمان نہ ہو، اور اس کے سچے ہونے پر ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جب اللہ تعالیٰ اس کے دعویٰ کے سچے ہونے پر اسے معجزات عطا فرمائے گا ”لان المعجز قائم مقام التصديق بالقول“ اس لئے کہ معجزہ عطاء کرنا اسی طرح تصدیق ہے جس طرح زبان سے کسی کی تصدیق کردی کہ یہ سچا ہے۔

”فلما شاهدنا ظهور المعجز على وفق دعوى محمد ﷺ كان من ضرورة الايمان بالله  
الايمان بنبوة محمد ﷺ فكان الاقتصار على ذكر الايمان بالله تنبيهاً على هذه الدقيقة“

جب ہم نے نبی کریم ﷺ کے دعویٰ نبوت پر آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا تو ضروری ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اسی وقت حاصل ہوگا جب نبی کریم ﷺ کی نبوت پر ایمان ہوگا، کیونکہ معجزات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیق فرمائی، اگر آپ پر ایمان نہیں ہوگا تو رب تعالیٰ کی تصدیق کا انکار ہوگا جب رب تعالیٰ نے آپ کی جو تصدیق فرمائی اس پر ایمان نہیں ہوگا تو یقیناً اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہوگا، واضح ہوا کہ ”ایمان باللہ مستلزم ہے ایمان بالنبوة کو“ (اللہ پر ایمان رکھنے سے نبوت پر ایمان خود بخود لازم آ جاتا ہے) اسی نکتہ کی وجہ سے صرف اللہ پر ایمان رکھنے کا ذکر فرما دیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرَ لَهُمْ﴾

”اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو ان کیلئے بہتر ہوتا۔“

”يعنى كما انكم اكتسبتم هذه الخیرامة بسبب هذه الخصال فاهل الكتاب

لو آمنوا حصلت لهم ايضا صفة الخیرية“ واللہ اعلم

یعنی اے مومنو جس طرح تم نے اچھی صفات کے ذریعے بہتری اور افضلیت حاصل کی، اگر اہل کتاب

بھی ایمان لے آتے اور وہی صفات حاصل کر لیتے جو تمہیں حاصل ہیں تو وہ بھی تمام امتوں سے افضل

(کبیر)

ہو جاتے۔

اہل کتاب کا کونسا ایمان معتبر ہے؟

ولو آمن اهل الكتاب بهذا الدين الذى لأجله حصلت صفة الخیرية لاتباع محمد ﷺ لحصلت

هذه الخیرية ايضا لهم فالمقصود من هذا الكلام ترغيب اهل الكتاب فى هذا الدين“

مراد یہ ہے کہ اگر اہل کتاب نبی کریم ﷺ کے دین پر ایمان لے آتے جس پر ایمان لانے اور آپ کی تابعداری



کرنے کی وجہ سے صحابہ کرام اور آپ کی امت کے دوسرے حضرات یعنی علماء و صلحاء کو تمام امتوں سے افضلیت حاصل ہوئی تو ان کو بھی نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ تابعداری کرنے سے بہتری حاصل ہو جاتی، اس آیت کریمہ سے مقصد ہی اہل کتاب اس دین میں داخل ہونے کی ترغیب دینا ہے۔

اہل کتاب غلطی فہمی سے محروم ہو گئے:

ان اهل الكتاب انما آثروا دينهم على دين الاسلام حباً للرياسة واستنباع العوام  
ولو آمنوا حصلت لهم هذه الرياسة في الدنيا مع الثواب العظيم في الآخرة فكان  
ذلك خيراً لهم مما قنعوا به

اہل کتاب نے اپنے دین کو اسلام پر ترجیح دی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریاست و سرداری کو پسند کرتے تھے کہ اگر ہم اپنے دین پر قائم رہے تم ہمیں سرداری حاصل رہے گی اور عوام بھی ہمارے تابع ہوں گے، یہ درحقیقت ان کی غلط فہمی تھی، اگر وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آتے تو ان کو دنیا میں سرداری حاصل ہو جاتی اور آخرت میں ثواب عظیم حاصل ہوتا، یہ فضیلت ان کو قناعت سے حاصل ہو جاتی۔

(کبیر)

جب قسمت ساتھ چھوڑ دے تو عقل بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے، محرومیت ان کی قسمت میں تھی تو اور کیا چیز ان کی مدد کر سکتی تھی۔

﴿مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾

”ان میں سے کوئی مؤمن ہیں اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر۔“

”المؤمنون“ پر الف لام عہد خارجی ہے، اس سے مراد یہود سے ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے چند ساتھی جو ایمان لائے، اسی طرح نصرائیوں میں سے حضرت نجاشی جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ان کے چند ساتھی جنہوں نے ایمان قبول کیا، یعنی ایمان والے بہت تھوڑی تعداد میں تھے، اور ان میں کافر زیادہ تعداد میں تھے۔

کافر کو فاسق کہنے میں عجیب حکمت:

اگرچہ ”فسق“ کا معنی حد سے تجاوز کرنا، جو بہت زیادہ حد سے تجاوز کر جائے وہ کافر ہوتا ہے، یہاں آیت کریمہ میں ”الفساقون“ سے مراد کافر ہیں، اسی لئے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ﴿وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ اور زیادہ کافر، کتنا مختصر اور خوب ترین ترجمہ ہے لیکن راقم نے علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر



دل پذیر و بینظیر یعنی تفسیر کبیر کو دیکھا تو تفصیلی ترجمہ لکھ دیا ”اور اکثر ان میں سے حد سے تجاوز کرنے والے کافر“ آئے آپ بھی تفسیر کبیر کی خوبصورت تحقیقی تفسیر کو دیکھئے، بلا اختیار میری طرح شاید آپ کی زبان سے بھی نکلے ”واہ قرآن تیری عظمت پر قربان۔“

”الوصف التمايز كرم للمبالغة فاي مبالغة تحصل في وصف الكافر باله فاسق“  
یہ ایک سوال کیا گیا کہ ”فسق“ کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا، اس وصف میں مبالغہ پایا گیا، اس سے مراد تو کافر ہے، لیکن کافر کو فاسق کہنے کی وجہ کیا ہے؟

تو اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”الكافر قد يكون عدلا في دينه وقد يكون فاسقا في دينه فيكون مردودا عند الطوائف كلهم لان المسلمين لا يقبلونه لكفره والكفار لا يقبلونه لكونه فاسقا فيما بينهم، فكانه قبل اهل الكتاب فريقان منهم من آمن، والذين ما آمنوا فهم فاسقون في ادیانهم فليسوا ممن يجب الاقتداء بهم البتة عن احد من العقلاء“

کافر کبھی اپنے دین میں عادل ہوتا ہے، یعنی دوسرے کافر اسے عادل کہتے ہیں، وہ کافروں کے نزدیک مقبول ہوتا ہے، اور کبھی کافر اپنے دین میں فاسق ہوتا ہے، حد سے تجاوز کرنے والا ظالم ہوتا ہے، یہ فاسق تمام کے نزدیک مردود ہوتا ہے، مومن تو اسے اس لئے قبول نہیں کرتے کہ وہ کافر ہے، لیکن دوسرے کافر بھی اسے قبول نہیں کرتے کہ وہ فاسق ہے گویا کہ یوں بیان کیا گیا کہ اہل کتاب کے دو فریق ہیں، بعض وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا وہ حقیقت میں اپنے دین میں فاسق ہی ہیں، خواہ کافر ان کو فاسق سمجھیں یا نہ سمجھیں، لہذا کسی عقلمند شخص کے لائق نہیں کہ وہ کسی کافر کی اقتداء کرے۔ (کبیر)

بات صرف سمجھنے کی ہے کہ کافر لوگ کسی کافر کو عادل کہتے ہیں اور کسی کو فاسق، لیکن اسلام ہر کافر کو فاسق کہتا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کافر ہو اور فاسق نہ ہو۔

”امۃ“ کا کیا مطلب؟

”الامة الطائفة المجتمع على الشئ الواحد“ امت کا لغوی معنی ایک گروہ جو ایک چیز پر متفق ہو جائیں نبی کریم ﷺ کی امت کی دو قسمیں ہیں، امت دعوت اور امت اجابت، امت دعوت میں تمام مومنین اور کافرین آتے ہیں، کیونکہ امت دعوت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ نے جن لوگوں کو دعوت اسلام دی، آپ نے چونکہ دعوت اسلام تو لوگوں کو



دی اس لئے تمام ہی امت دعوت میں شامل ہیں لیکن امت اجابت وہ ہے ”ہم الجماعة الموصوفون بالایمان به والاقرار بنبوته“ جن لوگوں نے ایمان لایا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اگر مطلقاً آپ کی امت کا لفظ آئے تو اس وقت آپ کی امت اجابت مراد ہوتی ہے جنہوں نے آپ پر ایمان لایا ہے، جیسا کہ آپ کا اپنا ارشاد گرامی ہے ”امتی لا یتجمع علی ضلالة“ میری امت گمراہی پر مجتمع (جمع) نہیں ہوگی، اور قیامت کے دن آپ فرمائیں گے ”امتی امتی“ یہ تو میری امت کے لوگ ہیں، ان ارشادات سے مراد آپ کی امت کے ایماندار لوگ ہیں، کافر مراد نہیں، اگر آپ کی امت دعوت کا ذکر کرنا مقصود ہو تو وہاں صرف امت کا ذکر نہیں ہوگا، بلکہ ”امت عوت“ مکمل الفاظ آئیں گے۔ (ازکبیر)

### افضلیت امت مصطفیٰ کریم ﷺ پر احادیث مبارکہ:

عن ابن مسعود ان رسول الله ﷺ قال خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (بخاری)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جن کا ان کے بعد متصل آنے والے ہیں، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد متصل آنے والے ہیں۔ قولہ ”خیر الناس قرنی یعنی اصحابی“ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ”لوگوں سے بہتر میرا زمانہ ہے“ اس سے مراد ”میرے صحابہ کا زمانہ“ ہے۔

”والقرن اهل كل زمان ماخوذ من الاقتران فكانه الزمان الذي يقترون فيه اهل ذلك الزمان في اعمارهم واحوالهم“

”قرن“ کا لفظ معنوی لحاظ پر ”اقتران“ سے ماخوذ ہے، یعنی ایک زمانہ میں عمر گزارنے والے لوگ، اور ایک قسم کے احوال رکھنے والے، مراد اس سے ہم زمان لوگ۔ (ماخوذ از خازن)

اسی حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”وهذا يدل علی ان اول هذه الامة ممن بعدهم والی هذا ذهب معظم العلماء وان من صحب النبی ﷺ ولو مرة فی عمره افضل ممن یأتی بعده وان فضيلة الصحبة لا یعد لها عمل“

یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس امت کے اول لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، عظیم علماء کرام کا یہی فیصلہ ہے کہ جن خوش بخت لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی زیارت ایک مرتبہ اپنی عمر میں حاصل ہوئی، خواہ بہت ہی قلیل، اسی طرح نابینا صحابہ کو ایک مرتبہ آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہو تو وہ بعد میں آنے والوں سے







سے افضلیت ثابت نہیں۔

❖ وروی صالح بن جبیر عن ابی جمعة قال قلنا یا رسول اللہ هل احد خیر منا قال نعم قوم یجینون من بعدکم فیجدون کتابا بین لوحین فیؤمنون بما فیہ ویؤمنون بی ولم یرونی

ابو جمعة نے فرمایا کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم سے بھی کوئی بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں وہ قوم جو تمہارے بعد میں آئے گی، وہ دو تختیوں (گتوں) کے درمیان کتاب پائیں گے، اس میں جو کچھ ہوگا اس پر وہ ایمان لائیں گے، اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔ (منقول از قرطبی)

ان تمام احادیث سے شدت محبت سمجھ آرہی ہے کہ وہ کتنے محبت والے لوگ ہوں گے جو مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے، شدت محبت پر حدیث مسلم بہت واضح ہے۔ (منقول از قرطبی)

❖ عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ قال من اشد امتی الی حیساناس یكونون بعدی یود احدہم لورآنی باہلہ ومالہ

(مسلم جلد ثانی صفحہ نمبر ۳۸۷، کتاب الجنة و صفة نعيمها و اهلها)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، لوگوں میں سے شدید محبوب مجھے وہ لوگ ہیں جو میرے بعد میں آئیں گے (وہ میرے ساتھ اتنی محبت کریں گے) کہ ان کی تمنا یہ ہوگی کہ کاش وہ مجھے دیکھ لیں اگر اہل و عیال اور مال ہی قربان کیوں نہ کرنا پڑتا، اس حدیث سے واضح ہوا کہ بعد میں آنے والے، نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کریں گے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی ان سے شدید محبت تھی لیکن صحابہ کرام پر افضلیت اور برتری اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ ان احادیث سے صحابہ کرام سے تشبیہ کو ثابت کرنا ہے، جیسا کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وضاحت کی۔

”وقد قيل في توجيه احاديث هذا الباب ان قرنه انما فضل لانهم كانوا غرباء في ايمانهم لكثرة الكفار وصبرهم على اذاهم وتمسكهم بدينهم وان اواخر هذه الامة اذا قاموا الدين وتمسكوا به وصبروا على طاعة ربهم في حين ظهور الشر والفسق والهرج والمعاصي والكبائر كانوا عند ذلك ايضا غرباء وزكت اعمالهم في ذلك الوقت كما زكت اعمال اوائلهم“

ان احادیث میں جن میں بظاہر بعد میں آنے والے لوگوں کی افضلیت سمجھ آتی ہے ان کی وجہ یہ بیان کی گئی



کہ یہ بات تو یقینی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا زمانہ افضل تھا، ان لوگوں کو فضیلت دی گئی وہ اپنے ایمان میں غریب الوطن مسافرین کی طرح تھے، کفار کی تعداد زیادہ تھی، اور صحابہ کرام صبر سے کام لے رہے تھے، اور اپنے دین پر پختگی سے قائم تھے، ان سے تشبیہ دیتے ہوئے گویا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات سے یوں فرمادیا کہ بیشک اس امت کے بعد میں آنے والے جب دین پر قائم رہیں گے، دین سے مضبوطی سے سہارا لگائے ہوں گے، اور وہ اپنے رب کی فرمانبرداری میں اس وقت صبر کریں گے جبکہ شر ظاہر ہوگا، فسق و فجور، قتل و غارت، اور بڑے بڑے جرائم اور ہر طرف نا فرمانیوں کا دور ہوگا، اس وقت بعد میں آنے والے لوگ بھی پہلے دور یعنی صحابہ کرام کی طرح غریب الوطن مسافرین کی طرح بے سروسامان ہوں گے، اور اُن وقت ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ ہوں گے جیسے پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے۔ (منقول از قرطبی)

یہی مطلب جو بیان کیا گیا اس پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔

❖ قال ﷺ بدأ الإسلام غريباً وسيعود كما بدأ فطوبى للغرباء“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام بے سروسامانی کی حالت میں شروع ہوا، پھر اسی حالت کی طرف لوٹ آئے گا، تو مبارک ہے ان لوگوں کیلئے جو بے سروسامانی میں (دین کی آبیاری کرنے والے) ہوں گے۔ (منقول از قرطبی)

❖ روى عن انس قال قال رسول الله ﷺ مثل امتي مثل المطر لا يدري اوله خير ام آخره“ (ذکرہ ابو داؤد الطیاسی و ابو عیسیٰ الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا پہلا قطرہ بہتر ہے یا آخری بہتر ہے۔ (منقول از قرطبی)

(اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ پہلے لوگوں میں ایمان لانے والے ایمان پر قائم رہے گا یا بعد میں ایمان لانے والا ایمان پر قائم رہے گا، کیونکہ صحابہ کرام کے دور میں کئی لوگ (العباد بالذہن) مرتد ہو گئے لیکن بعد کے دور میں بفضلہ تعالیٰ کتنے ہی لوگ وہ ہیں جو ابتداء سے انتہاء تک ایمان پر قائم رہیں گے) (راقم)

❖ روى ان عمر بن عبدالعزيز لما ولي الخلافة كتب الى سالم بن عبد الله ان اكتب الى بسيرة عمر بن الخطاب لأعمل بها، فكتب اليه سالم "ان عملت بسيرة عمر فانت افضل من عمر لان زمانك ليس كزمان عمرو ولا رجالك كرجال عمر قال وكتب الى فقهاء زمانه فكلهم كتب اليه بمثل قول سالم“ (منقول از قرطبی)

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے سالم بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب کی طرف خط لکھا



کہ تم میری طرف حضرت عمرؓ کی سیرت لکھ کر بھیجنا کہ میں اس پر عمل کروں، تو ان کی طرف حضرت سالم نے لکھا کہ اگر تم نے حضرت عمرؓ کی سیرت پر مکمل طور پر عمل کر لیا تو تم حضرت عمرؓ سے افضل ہو جاؤ گے کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمرؓ کے زمانہ کی طرح نہیں، اور نہ ہی تمہیں ان کے اصحاب کی طرح ساقی مل سکتے ہیں، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ کے کثیر فقہاء کی طرف یہی خط لکھا، لیکن سب نے جواب دہی دیا جو حضرت سالم نے جواب دیا تھا۔

مطلب واضح ہے:

کہ حضرت سالمؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں حضرت عمرؓ کا زمانہ حاصل نہیں، اور ان کے اصحاب کی طرح تمہیں اصحاب میسر نہیں تو تم ان کی سیرت پر کامل عمل تو نہیں کر سکتے، اگر بالفرض ان کی طرح تم کامل عمل کر سکتے تو ان سے افضل ہوتے، لیکن تمہارا ان سے افضل ہونا ممکن نہیں۔ (راقم)

عن عمر بن الخطاب "بسند حسن" قال رسول الله ﷺ الجنة حرمات على الانبياء حتى ادخلها وحرمات على الامم حتى يدخلها امتي" (رواه الطبرانی فی الاوسط)

حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت انبیاء کرام پر حرام ہوگی یہاں تک کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں، اور امتوں پر جنت حرام ہوگی، یہاں تک کہ میری امت داخل ہو جائے۔

(منقول از مظہری)

مطلب واضح ہے کہ جنت میں مجھ سے پہلے انبیاء کرام داخل نہیں ہو سکیں گے، اور میری امت سے پہلے کوئی امت داخل نہیں ہو سکے گی۔

وروی (ایضاً) عن ابن عباس مرفوعاً الجنة محرمة على جميع الامم حتى ادخلها انا و امتي الاول فالاول

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی کہ (نبی کریم ﷺ نے فرمایا) جنت تمام امتوں پر حرام ہوگی یہاں تک کہ میں اور میری امت اس میں داخل ہو جائیں، درجہ بدرجہ اس میں داخل ہوں گے۔ (منقول از مظہری)

(یعنی پہلے زیادہ مرتبہ والے پھر ان سے کم مرتبہ والے، پھر ان سے کم)

عن جابر قال قال رسول الله ﷺ اني لارجوان يكون من تبني ربع اهل الجنة ثم قال ارجوان يكون لث اهل الجنة ثم قال ارجوان يكون الشطر" (رواه احمد والبيهقي والترمذي بسند صحيح)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امید کرتا ہوں میرے تبعین (میری امت کے



میری تابعداری کرنے والے) تمام جنتیوں کا چوتھائی حصہ ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمام جنتیوں کا تہائی درجہ ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا کہ میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمام جنتیوں کے نصف برابر ہوں گے۔ (منقول از مظہری)

عن بهزبن حکیم عن ابیہ عن جدہ قال قال رسول اللہ ﷺ انکم تتمون سبعین امة التم خیرھا واکرمھا علی اللہ عزوجل“ (رواہ الترمذی وحسنہ وابن ماجہ والدارمی)  
بہز بن حکیم اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک تم ستر امتوں کی تکمیل کرنے والے ہو، تم ان تمام سے بہتر اور مکرم ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں۔ (منقول از مظہری)

مطلب واضح ہے کہ تم بہت سی امتوں پر زیادہ تعداد میں ہو گے، دوسرے احادیث سے واضح ہے کہ آپ کی امت دو تہائی ہوگی، اور ساری امتیں مجموعی طور پر ایک تہائی ہوں گی، حدیث شریف میں ستر کا ذکر کثرت کیلئے استعمال ہے، معین تعداد کیلئے نہیں، محاورہ عرب یہی تھا کہ کثرت کو ستر سے تعبیر کر دیا جاتا تھا۔

وقال رسول اللہ ﷺ اهل الجنة عشرون ومائة صفاتمانون منها من هذه الامة والباقيون من سائر الامم“ (رواہ الترمذی وحسنہ والحاکم وصححه وروی الطبرانی مثله من حدیث ابی موسیٰ وابن عباس ومعایہ بن جندہ وابن مسعود)

حضرت ابو موسیٰ اور ابن عباس اور معاویہ بن جندہ اور ابن مسعود سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت والے تمام لوگوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں اسی صفیں اس (میری) امت کی ہوں گی، اور باقی (چالیس) صفیں تمام امتوں کی مجموعی ہوں گی۔

وقال ﷺ ان الله تجاوز عن امتی الخطاء والنسيان وما استكروا عليه“  
نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطا اور بھول اور جبری طور پر کام کرانے سے درگزر فرمایا۔ (رواہ ابن ماجہ والبیہقی)

عن بریدة عن رسول اللہ ﷺ قال ما من احد من اصحابی يموت بارض الابعث قائدان نور الهم يوم القيامة“ (رواہ الترمذی)

حضرت بریدہ سے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا صحابہ میں سے کوئی ایک (بھی) نہیں جو کسی زمین میں فوت ہو جائے مگر یہ کہ اسے قائد اور نور بنا کر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ (منقول از مظہری)

عن ابی هريرة قال قال رسول اللہ ﷺ كل امتی يدخلون الجنة الا من ابی قالوا ومن یابی؟ قال من اطاعتی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی“ (رواہ البخاری)



حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ نے پوچھا، انکار کرنے والے کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا جنہوں نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جنہوں نے میری نافرمانی کی وہ انکار کرنے والے ہیں (یعنی وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔)

(منقول از خازن)

خیال رہے کہ جب حدیث شریف میں ”وَمَنْ عَصَانِي“ کا معنی یہ لیا جائے کہ میری امت کے مؤمنین جب گنہگار، نافرمان ہو جائیں تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

عن ابی امامۃ قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول وعدنی ربی ان یدخل من امتی الجنة سبعون الفا لحساب علیہم ولا عذاب ومع کل الف سبعون الفا“ (بخاری)

حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا میرے رب نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب عذاب کے جنت میں داخل کرے گا، اور ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور داخل کرے گا۔ (منقول از خازن)

عن ابی بکر الصدیقؓ قال قال رسول اللہ ﷺ اعطیت سبعین الفایدخلون الجنة بغیر حساب وجوہہم کالقمر لیلة البدر قلوبہم علی قلب رجل واحد فاستزدت ربی فزادنی مع کل واحد سبعین الفا“ (رواہ احمد)

حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ستر ہزار جنت میں بغیر حساب کے داخل کرنے کا انعام دیا گیا، جن کے چہرے چودھویں کی رات کی طرح چمکدار ہوں گے، اور ان کے دل ایک آدمی کا دل ہوں گے، (یعنی وہ متفق و متحد ہوں گے) میں نے اپنے رب سے (اپنی امت کے لوگوں کی بخشش کی) زیادتی طلب کی تو رب تعالیٰ مجھے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ستر ہزار جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا۔

عن ابن عباس عن النبی ﷺ انه قال عرضت علی الامم فرأیت النبی ومعہ الرہیط والنبی ومعہ الرجل والرجلان والنبی ولیس معہ احداذرفع لی سواد عظیم فظننت انہم امتی، فقیل لی ہذا موسی وقومہ، ولكن انظر الی الافق فتظرت فاذا سواد عظیم فقیل لی انظر الی الافق الآخر فاذا سواد عظیم فقیل لی ہذا امتک ومعہم سبعون الفایدخلون الجنة بغیر حساب ولا عذاب، ثم نهض فدخل منزله فخاض الناس فی اولئک الذین یدخلون الجنة بغیر حساب ولا عذاب فقال بعضهم فلعلہم الذین صحبوا رسول اللہ ﷺ وقال بعضهم فلعلہم الذین ولدوا فی الاسلام ولم یشرکوا باللہ



شیاء ذکر و الاشیاء فخرج علیہم رسول اللہ ﷺ فقال ما الذی تخوضون فیہ؟ فاخبروہ فقال ہم الذین لا یرقون ولا یسترقون ولا یکتون ولا یطیرون وعلی ربہم یتوکلون، فقام عکاشہ بن محصن فقال ادع اللہ ان یجعلنی منہم، قال انت منہم، ثم قام رجل آخر فقال ادع اللہ ان یجعلنی منہم، قال سبقک بہا عکاشہ“ (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر امتیں پیش کی گئیں، میں نے کسی نبی کو دیکھا، ان کے ساتھ (ان کی امت) ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا، اور کسی نبی کو دیکھا، ان کے ساتھ ایک یا دو آدمی تھے، اور کسی نبی کو دیکھا ان کے ساتھ کوئی ایک شخص نہیں تھا، اسی دوران ایک بہت بڑی جماعت میرے سامنے آئی، میں نے خیال کیا، یہ میری امت ہوگی، مجھے بتایا گیا یہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم (آریہ) ہے، لیکن تم (آسمان کے) ایک کنارے کی طرف دیکھو، تو میں نے ایک بہت بڑی جماعت کو دیکھا، پھر مجھے کہا گیا دوسرے کنارے کی طرف دیکھو ادھر بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی، پھر مجھے بتایا گیا یہ تمہاری امت ہے، اور ان کے ساتھ ستر ہزار وہ لوگ تھے جو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے، پھر آپ اٹھے اور اپنے گھر تشریف لے گئے، تو لوگوں نے غور و فکر شروع کیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے جو بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے؟ بعض حضرات کہنے لگے وہ نبی کریم ﷺ کی مصاحبت میں رہنے والے ہوں گے (یعنی صحابہ کرام ہوں گے) بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ وہ حضرات ہوں گے جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ٹھہرایا، اسی طرح لوگوں نے چند چیزوں کا ذکر کیا (یعنی اپنی اپنی رائے پیش کی کہ وہ فلاں لوگ ہوں گے، وہ فلاں لوگ ہوں گے) تو نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، آپ نے فرمایا ”تم کس چیز میں غور و فکر کر رہے ہو؟ صحابہ کرام نے آپ کو خبر دی (کہ ہم ان لوگوں کے متعلق غور و فکر کر رہے ہیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے جو بغیر حساب و عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے) تو آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو جنت منتر نہ کریں گے اور نہ کروائیں گے، اور داغ نہیں دیں گے اور قال نہیں نکالیں گے، اپنے رب پر توکل کریں گے، عکاشہ بن محسن کھڑے ہوئے، آپ نے عرض کیا آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان سے کر دے، تو آپ نے فرمایا تم ان میں سے ہی ہو گے، پھر ایک اور شخص (انصار میں سے) کھڑے ہوئے، عرض کیا، آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں کہ مجھے ان میں سے کر دے، آپ نے فرمایا ”عکاشہ تم سے سبقت لے گئے“ (منقول از ابن کثیر و صابونی)

خیال رہے جنت منتر اور قال کی بحث پہلے پارہ میں تفصیلی طور پر بیان کی جا چکی ہے۔



❁ و اخرج احمد بسند عن علي (رضي الله عنه) قال قال رسول الله ﷺ اعطيت مالاً يعط احد من الانبياء نصرت بالرعب واعطيت مفاتيح الارض وسميت احمد وجعل التراب لي طهوراً وجعلت امتي خيراً الامم

سند احمد میں سند حسن سے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے وہ دیا گیا جو انبیاء کرام میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیا گیا، میری رعب سے امداد کی گئی، مجھے زمین کی چابیاں دے دی گئیں، اور میرا نام احمد رکھا گیا، اور مٹی میرے لئے پاک کرنے والی بنائی گئی (کیونکہ تیمم سے پاکیزگی حاصل ہونا اس امت کی خصوصیت ہے) اور میری امت کو سب امتوں سے افضل بنایا گیا۔ (منقول از درمنشور)

❁ و اخرج عبد بن حميد وابن ابی حاتم عن عطية في الآية قال خير الناس للناس شهدتهم للنبيين الذين كذبهم قومهم بالبلاغ عطية رحمه الله سے مروی ہے کہ سب لوگوں سے بہتر تم لوگ ہو کیونکہ تم انبیاء کرام کے حق میں گواہی دو گے جب ان کی قومیں ان کی تبلیغ کی تکذیب کریں گے۔ (منقول از درمنشور)

**فائدہ:** (وتؤمنون بالله) ای ایماناً متعلقاً بکل ما يجب ان يؤمن به من رسول و كتاب و حساب و جزاء آیت کریمہ میں جو ارشاد ہے ”وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ“ (اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر) اس سے مراد ہر اس چیز پر ایمان رکھنا ضروری ہے جس پر ایمان رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یعنی تمہارا ایمان رسولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر اور حساب اور جزاء (یعنی یوم آخرت) پر ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

**دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:**

(للناس) انما عبر باللام دون من اشارة الى ان هذه الامة نفع ورحمة لنفسها وللخلق عموماً في الدنيا بالدعاء لجميع الامم وفي الآخرة بالشهادة للانباء

(للناس) میں لام ذکر کیا ہے ”من“ نہیں ذکر کیا، یعنی ”مِنَ النَّاسِ“ نہیں کہا، اس سے اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ امت اپنے لئے بھی نفع اور رحمت ہے، اور تمام مخلوق کیلئے بھی، کیونکہ تمام امتوں کیلئے دعاء کریں گے دنیا میں، اور آخرت میں انبیاء کرام کے حق میں گواہی دیں گے۔ (صادی)

**خطاب کا فائدہ:** (کنتم) خطاب کا صیغہ ہے، غیب کے صیغہ سے خبر نہیں دی گئی جس کا فائدہ یہ ہے۔

واختيرت صيغة الخطاب تشریفاً لهم و اشارة الى رفع الحجب عنهم حيث خاطبهم ولم يخبر عنهم والهم مقربون من حضرة الله



کہ اس امت کی شرافت و فضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ ان کو خطاب کر کے گویا کہ ان سے حجاب اٹھایا گیا، غیب کے صیغہ سے صرف خبر نہیں دی گئی تا کہ ان کا اللہ تعالیٰ کا مقرب ہونا سمجھ آئے۔ (صادی)



لَنْ يَضُرَّوْكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِنْ يُقَاتِلُواكُمْ يُولَوْكُمْ الْأَذْبَارُ ثُمَّ لَا يَنْصُرُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۱۱)

(۱) وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے مگر یہی ستانا اور اگر تم سے لڑیں تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر ان کی مدد نہ ہوگی۔ (کنز الایمان)

(۲) ہرگز وہ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے تمہیں مگر ستانا، اور اگر وہ لڑائی کریں تمہارے ساتھ وہ پھیر جائیں گے تم سے پیٹھ، پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گا۔ (نجوم الفرقان)

### شان نزول:

یہودی رئیسوں نے جب ایمان لانے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کو ان کے اسلام لانے پر ستانا شروع کیا تو اس وقت اس آیہ کریمہ کو نازل کیا گیا۔

(لَنْ يَضُرَّوْكُمْ إِلَّا أَذًى) یعنی لن یضروکم ایہا المؤمنون هؤلاء الیہود الا اذی یعنی باللسان من طعنهم فی دینکم او تہدید او القاء شبہة وتشکیک فی القلوب وکل ذلک یوجب الاذی والغم

یعنی اے مومنو یہ یہود تمہیں ہرگز کوئی ضرر (تکلیف) نہیں پہنچا سکیں گے سوائے ستانے کے، یعنی زبان سے وہ تمہارے دین میں طعن کریں گے، تمہیں دھمکیاں دیں گے، اور دین کے متعلق تمہارے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالیں گے، یہ تمام چیزیں تمہیں ستانے اور غم میں ڈالنے کا ذریعہ ہوں گی۔ (ماخوذ از خازن)



﴿وَإِنْ يُقَابِلُوكُمْ يُؤَلُّوْكُمْ إِلَّا ذَبَارًا ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ﴾

اگر وہ تمہارے ساتھ لڑائی کریں تو وہ تم سے پیٹھ پھیر جائیں گے، پھر ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔

”هكذا وقع فانهم يوم خيبر اذلهم الله وارغم انوفهم وكذلك من قبلهم من يهود

المدنية بنى فينقاع وبنى النصير وبنى قريظة كلهم اذلهم الله“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی واضح طور پر سچا ہو چکا ہے، خیبر میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو شکست دے کر ذلیل کیا

اور ان کا ناک خاک آلود کیا، اور اسی طرح خیبر سے پہلے مدینہ طیبہ کے یہود بنی قینقاع اور بنی نصیر اور

بنی قریظہ کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا، مسلمانوں کے مقابل ان کو شکست ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی

امداد نہیں فرمائی۔

(صابونی، ابن کثیر)

یہود کے ستانے کے مختلف انداز:

کبھی نبی کریم ﷺ پر طعن کر کے مسلمانوں کو ستایا گیا، اور کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر طعن کر کے مسلمانوں کو ستایا گیا

، کسی نبی کی شان میں کوئی نازیبا الفاظ استعمال کئے جائیں تو مسلمان کو اذیت پہنچتی ہے، اور مسلمان کا خون کھول اٹھتا

ہے، کبھی یہود کلمات کفر اپنی زبانوں پر جاری کر کے مسلمانوں کو ستاتے، اور حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر کبھی

ستاتے۔ اگرچہ آیت کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی لیکن ”الکفر ملة واحدة“ (کافر سب ایک گروہ

ہیں) کے مصداق کے مطابق نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر، اور بعض نصرانیوں نے مستقل

خدا کہہ کر اور بعض نصرانیوں تین خداؤں میں سے ایک خدا عیسیٰ ہیں کہہ کر ستایا، یہود کی طرح نصرانیوں نے بھی

مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈال کر مسلمانوں کو ستایا۔

آیت کریمہ غیبی خبروں پر مشتمل:

واعلم ان هذه الآية اشتملت على الاخبار عن غيوب كثيرة، منها ان المؤمنين آمنون

ضررهم ومنها انه لا يحصل لهم قوة وشوكة بعد الانهزام، وكل هذه الاخبار وقعت

كما اخبر الله عنها فان اليهود لم يقاتلوا الا انهزموا وما قدموا على محاربة وطلب رياسة

الاخذلوا وكل ذلك اخبار عن الغيب فيكون معجزا“

یقینی بات ہے کہ یہ آیت کریمہ بہت سی غیبی خبروں پر مشتمل ہے، یعنی یہ بیان کیا گیا کہ مؤمنین یہودیوں

کے ضرر سے امن میں رہیں گے، اور یہ بتایا گیا کہ اگر مؤمنین سے انہوں نے لڑائی کی تو ان کو شکست



ہوگی، اور یہ بتایا گیا کہ شکست کے بعد ان کو قوت و شوکت حاصل نہیں ہوگی، یہ تمام غیبی خبریں ہیں جو نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں۔ (کبیر)

**فائدہ:** قرآن پاک کی اس ایک آیت کریمہ میں کئی غیبی خبریں نبی کریم ﷺ کو دی گئیں، سارے قرآن پاک میں کتنی ہی غیبی خبریں دی گئیں، اہل علم سے مخفی نہیں، غیبی خبریں نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے، معجزہ کا انکار روز روشن کے انکار کے مترادف ہے۔ (راقم)

**مقام توجہ:** آج تک یہود اپنے قدموں پر نہیں کھڑے ہو سکے اور قیامت تک ان شاء اللہ وہ ذلیل ہوتے رہیں گے، باوجود اس کے کہ خونخوار درندہ امریکہ ان کی پشت پناہی کر رہا ہے، انہیں اسلحہ دے رہا ہے، لیکن کبھی چند فلسطینی بنی اسرائیل (یہودیوں) کی نیند حرام کر دیتے ہیں، چند بے سرو سامان مسلمانوں کے ہاتھوں اسے ذلت اٹھانی پڑتی ہے، اور آج کل لبنانی حزب اللہ کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہے، اگرچہ اسلامی حکومتوں میں گھسے ہوئے قادیانی بھی امریکیوں کی طرح یہودیوں (بنی اسرائیل) کی پشت پناہی کر رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں، سبحان اللہ مولائے کائنات تیرے وعدے کتنے سچے، کچے حق پر مبنی ہیں جن کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مسلح یہودی امریکہ کی امداد کے باوجود مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے ذلیل ہو رہے ہیں۔ (راقم)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿ثُمَّ لَا يَنْصَرُونَ﴾ میں لفظ ”ثم“ ذکر کیا گیا جو تراخی رتبی پر دلالت کر رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ”ان الاخبار بتسليط الخذلان عليهم اعظم من الاخبار بتوليئهم الادبار“ پہلے ان کا لڑائی میں پیٹھ پھیر جانے کا ذکر کیا گیا، پھر ان کی امداد نہ کرنے کا ذکر فرمایا، اس میں ان کی ذلت کا ذکر کیا گیا، ان کی رسوائی و ذلت کی خبر ان کے پیٹھ پھیرنے کی خبر سے عظیم ہے۔ (کبیر)





ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ اَيْنَ مَا تُقِفُوا اِلَّا بِحَبْلِ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُ وَاِ  
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ  
اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْوْا كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ (آیہ نمبر ۱۱۲)

(۱) ان پر جمادی گئی خواری جہاں ہوں امان نہ پائیں مگر اللہ کی ڈور اور آدمیوں کی ڈور سے اور غضب  
الہی کے سزاوار ہوئے اور ان پر جمادی گئی محتاجی یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے کفر کرتے اور  
پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے یہ اس لئے کہ نافرمان بردار اور سرکش تھے۔ (کنز الایمان)

(۲) مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں پائے جائیں، مگر اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے، اور وہ  
ٹھہرے اللہ کے غضب میں، اور مسلط کردی گئی ان پر مسکینی، یہ بسبب اس کے کہ بیشک وہ کفر  
کرتے اللہ کی آیتوں سے اور وہ شہید کرتے انبیاء کرام کو ناحق، یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے  
نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (نجوم الفرقان)

﴿ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ اَيْنَ مَا تُقِفُوا﴾

”مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں بھی وہ پائے گئے۔“

”والمعنى جعلت الدلة ملصقة بهم كالشئى يضرب على الشئى فليصق به“

”ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ“ کا معنی یہ ہے کہ ذلت ان کے ساتھ ملا دی گئی (یعنی چپکادی گئی) جب ایک چیز کے اوپر  
دوسری چیز ہو اور وہ نیچے والی چیز سے مل جل جائے چپک جائے تو اس وقت یہ لفظ بولے جاتے ہیں ”ضرب الشئى  
على الشئى“ کبھی ایک چیز دوسری کے اوپر آ جائے، ملے اور چپکے نہیں تو اس کیلئے بھی یہی الفاظ استعمال کر دیئے  
جاتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے ”ضرب عليهم الخباء“ ان پر خیمہ لگا دیا گیا۔ ”الدلة هي الذل“ ذلت اور ”ذل“  
کا ایک ہی معنی ہے، ان پر ذلت چھا جانے سے کیا مراد ہے؟

”ان المراد ان يحاربوا ويقتلوا وتغنم اموالهم وتسبى ذرارهم وتملك اراضيهم“

اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے لڑائی کی جائے اور ان کو قتل کر دیا جائے اور ان کی اولاد کو قید کر لیا جائے اور  
ان کا مال، مال غنیمت بنا لیا جائے، اور ان کی زمین کی ملکیت حاصل ہو جائے۔ (کبیر)



”جہاں بھی وہ پائے جائیں۔“

﴿أَيْنَ مَا تُقِفُوا﴾

یہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق ہے ”أَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقِفْتُمُوهُمْ“ ان کو قتل کرو جہاں بھی تم ان کو پاؤ۔ (کبیر)  
(أَيْنَمَا تُقِفُوا) وجدوا“ جہاں بھی وہ پائے جائیں ”تقف يثقف ثقفا“ پالینا ”تُقِفُوا“ مجہول ہے پائے جائیں۔  
”فی ای مکان وای زمان وجدوا فی دار الاسلام الزمو الدل“ یعنی دار اسلام میں جہاں بھی اور جس وقت بھی پائے جائیں ذلت ان کے ساتھ لازم کر دی گئی۔  
(بیضاوی، شیخ زادہ)

ان کی ذلت کی اور وجوہ:

ایک وجہ پہلے قریب ہی ذکر ہو چکی ہے، دوسری وجہ یہ ہے ”وقيل المراد ضرب الجزية عليهم لانه يوجب الصغار ولذلة“ کہ ان پر جزیہ مقرر کر کے ان کو ذلیل کر دیا جائے گا۔  
”وقيل المراد به انك لا تری فيهم ملكا قاهرا ولا رئيسا معتبرا وانما تراهم مستحقين في جميع البلاد ذليلين مهانين“  
اور ان کی ذلت کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ بیشک تم ان میں کوئی قاہر بادشاہ اور کوئی معتبر رئیس نہیں دیکھو گے، بیشک تم ان کو تمام شہروں میں ذلیل ہوتا ہوا اور رسوا ہوتا ہوا دیکھو گے۔  
”وقيل المراد به كونهم اذلاء فيما بين المسلمين المؤمنين بسبب كفرهم وتمسكهم بالدين المنسوخ بل بالطريقة المخترعة الباطلة في نفسها“  
اور بعض حضرات نے ان کی ذلت کی چوتھی وجہ یہ بیان کی کہ وہ مسلمانوں، مومنوں میں کفر کی وجہ سے، اور منسوخ دین پر عمل کرنے اور اس پر سہارا لگانے کی وجہ سے ان پر ذلت مسلط کر دی گئی، بلکہ ان کا اپنا من گھڑت دین ان کے ایمان و عمل کا ذریعہ تھا، جو سراسر باطل ہے، یہی وجہ ان کی ذلت کی تھی۔

سب سے بہتر قول:

والظاهر ابقاء الذل على عمومہ اذ لا وجه لتخصيصه بلامنخصص“  
ظاہر بات یہی ہے کہ ان کی ذلت کو عام رکھا جائے، کسی تخصیص کے بغیر ان کے ساتھ کسی خاص ذلت کو مختص نہ کیا جائے، یعنی مراد یہ لی جائے کہ ان پر ہر قسم کی ذلت مسلط کر دی گئی۔ (شیخ زادہ)



﴿الْأَبْحَلُ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ﴾ ” مگر اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے۔“

یعنی ان پر ذلت مسلط کر دی گئی وہ جہاں بھی ہوں گے، سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا سہارا لے لیا تو وہ ذلت سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔

اللہ کی رسی سے مراد کیا ہے؟

(الْأَبْحَلُ مِنَ اللَّهِ) یعنی الابعہد من اللہ وهو ان یسلموا فتزول عنهم الذلۃ

اللہ تعالیٰ کی رسی سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یوم میثاق کو کئے ہوئے وعدہ کے مطابق اسلام لے آئیں تو مکمل طور پر ان سے ذلت دور کر دی جاتی ہے، یعنی اسلام قبول کر کے انہوں نے اپنے آپ سے ذلت کو دور کر لیا۔ (خازن)

لوگوں کی رسی سے مراد کیا ہے؟

(وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ) یعنی المؤمنین ببدل الجزیۃ ”لوگوں کی رسی سے مراد یہ ہے کہ مؤمنوں سے جزیہ دینے کا معاہدہ کر کے دنیا میں اپنے آپ کو قتل ہونے اور اولاد کے قید کئے جانے اور مال کو مال غنیمت بنائے جانے کی ذلت سے بچا لیتے ہیں۔ (خازن)

اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کا ایک اور مطلب:

ان پر ذلت اس طرح مسلط کر دی گئی جیسا کہ خیمہ کسی پر لگا دیا جائے، یہ ذلت ان پر تمام احوال میں مسلط رہے گی سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور مسلمانوں کی ذمہ داری کا سہارا لے لیا، جب سے مراد عہد ہے، کیونکہ یہ سبب ہے نجات کا، اور مراد پر کامیاب ہونے کا، عہد کا لفظ استعمال کریں یا ذمہ داری کا بظاہر تو دونوں جگہ پر ایک ہی لفظ ”حبل“ استعمال ہے، لیکن حقیقت میں فرق ہے، فرق کی وجہ ہے ”وعطف قوله (وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ) علی قوله (بِحَبْلِ مِنَ اللَّهِ) یقتضی المغایرة“ ”وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ“ کا عطف ہے ”حَبْلٍ مِنَ اللَّهِ“ پر ان دونوں میں مغایرت ہے کیونکہ معطوف علیہ اور معطوف میں مغایرت پائی جاتی ہے۔

وہ وجہ فرق یہ ہے:

”قال الامام فی وجهہ الامان الحاصل للذمی قسمان، احدهما الذی نص اللہ علیہ



وہو الامان الحاصل له باعطاء الجزية عن يد و قبول اياها، والثاني الامان الذي فوض الى رأى الامام واجتهاده فيعطيه الامان مجاناً تارة وببدل زائد او ناقص اخرى على حسب اجتهاده فالاول هو المسمى بحبل الله والثاني هو المسمى بحبل المؤمنين فالامانان واقعان بمباشرة المسلمين الا انهما متغايران بالاعتبار

امام (رازی) نے بیان کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امان جو ان کو حاصل ہوتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر اللہ تعالیٰ نے نص بیان فرمائی۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ (سورة التوبة، آية نمبر ۲۹)

لڑوان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس چیز کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول نے اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے یعنی وہ جو کتاب دئے گئے جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر یعنی پہلی قسم امان کی وہ ہے جو نص (قرآن پاک) سے ثابت ہے، ان کا جزیہ دینا، یہ ہے ”حَبْلِ مِنَ اللَّهِ“ دوسری قسم جو حاکم ان سے صلح کرے، کبھی بغیر مال لینے کے ان سے کچھ شرائط پر صلح کر لی جاتی ہے، کبھی مقرر جزیہ سے کم مال مقرر کر کے اور کبھی زائد مال مقرر کر کے ان سے صلح کی جاتی ہے اور انہیں امان دی جاتی ہے، اسے ”حَبْلِ مِنَ النَّاسِ“ کہا گیا، بظاہر دونوں امانیں حاکم کی طرف سے ہی دی جاتی ہیں، لیکن ان میں فرق واضح طور پر پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از روح البیان)

﴿وَبَاءٌ وَابْغَضِبَ مِنَ اللَّهِ﴾ ”اور وہ ٹھہرے اللہ کے غضب میں۔“

معناه انهم مكثوا، ولبثوا واداموا في غضب الله“ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ٹھہرے اور رکے اور ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہے۔

”واصل ذلك ماخوذ من البوء وهو المكان، ومنه تبوأ فلان منزلاً كذا، وبوأه اياه“

اصل میں ”باءٌ وَا“ ماخوذ ہے ”بوء“ سے، جس کا معنی مکان، جس طرح کہا جاتا ہے ”تبوأ فلان منزلاً كذا“ فلاں شخص اس طرح کے گھر میں رہا، اور یہ کہا جاتا ہے ”بوأه اياه“ میں نے اسے فلاں جگہ ٹھہرایا۔ (کبیر)

دائم نے تفسیر کبیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بیضاوی اور روح المعانی کے مطابق ہے۔

”وَبَاءٌ وَابْغَضِبَ مِنَ اللَّهِ“ ای رجعوا به وهو كناية عن استحقاقهم له واستيجابهم اياه“



وہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے لوٹے، اشارۃ معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے اور انہوں نے اپنے افعال سے اللہ کے غضب کو قبول کیا۔  
(روح المعانی)

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ ”اور مسلط کر دی گئی ان پر مسکینی۔“

یعنی وہ غالب اوقات مسکین رہیں گے، ایسا یہودی کم ہی ملے گا جو اپنا غنی ہونا ظاہر کرے گا، وہ اپنی مسکینی کا ہی اظہار کرتے رہیں گے۔  
(روح المعانی)

ان کے مسکین رہنے کی اور وجہ یہ ہے کہ ان پر جزیہ مقرر ہوگا، وہ جزیہ ادا کرنے کی وجہ سے مسکین ہوں گے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے یہی تفصیل بیان کی، اور وجہ یہ ہے کہ یہود کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، وہ خود مسکین ہو گئے، خیر کی یہودیوں کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، بنو قینقاع اور بنو نضیر کا مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا، جس کی وجہ سے وہ مسکین ہو گئے۔  
(ماخوذ از کبیر)

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ﴾

”یہ بسبب اس کے کہ بیشک وہ کفر کرتے اللہ کی آیتوں سے اور وہ شہید کرتے انبیاء کو ناحق۔“

پہلے تین مکروہات یہود کے ذکر فرمائے، ان کے ساتھ ذلت کو لازم کر دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کا غضب ان کے ساتھ لازم کر دیا گیا، اور مسکینی ان کیلئے لازم کر دی گئی، پھر ان تینوں چیزوں کے لازم ہونے کی وجہ بیان کی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے، اور انبیاء کو ناحق کرتے۔  
(کبیر)

**سوال:** یہ ارشاد تو میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے، حالانکہ انہوں نے تو انبیاء کرام کو شہید نہیں کیا تھا، تو اس کا کیا مطلب ہے؟

**جواب:** ان هؤلاء المتأخرین وان كان لم يصدر عنهم قتل الانبياء عليهم السلام لكنهم كانوا راضين بذلك  
نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے اگرچہ انبیاء کرام کا قتل صادر نہیں ہوا، لیکن وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اس وجہ سے خطاب ان کو کیا گیا۔

﴿ذَلِكَ بِمَا عَصَوْوْ كَانُوا يَعْتَدُونَ﴾

”یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔“



(ذلک) اشارۃ الی کفرہم وقتلہم الانبیاء علیہم السلام علی ما یقتضیہ القرب فلا تکرار  
ایک احتمال یہ ہے کہ ”ذلک“ کا اشارہ ان کے کفر اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنے کی طرف ہو، جو  
کا ”قرب“ تقاضا کرتا ہے، اس صورت میں کوئی تکرار نہیں۔  
(روح المعانی)

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان پر ذلت کا مسلط ہونا، اور ان پر مسکینی کا مسلط ہونا، اور غضب کا ان کے ساتھ لازم  
ہونا اس کی وجہ اور سبب ان کا کفر اور قتل الانبیاء تھا، اور کفر اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرنے کی وجہ اور اس کا سبب ان کی  
نافرمانی اور حد سے تجاوز تھا۔ **دوسرا** احتمال یہ ہے کہ کفر، قتل الانبیاء اور نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا تمام ہی سبب  
ہوں، ان پر ذلت وغیرہ کے مسلط کئے جانے کے، تو اس صورت میں مندرجہ ذیل سوال و جواب ہوں گے۔

**سوال:** (ذَلِکَ بِمَا عَصَوْا) تو تکرار پر دلالت کر رہا ہے، اور تکرار کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، کیونکہ تکرار آتا  
ہے تاکید کیلئے، اور تاکید کیلئے ضروری ہے کہ وہ مؤکد سے قوی ہو، چونکہ عصیاں میں کفر سے کمی ہے، لہذا اس کی تاکید تو  
ہو نہیں سکتی، تو اس تکرار کا فائدہ کیا؟

**جواب:** ذلت اور غضب اور مسکینی کا سبب ”کفر اور قتل انبیاء“ ہے، اور کفر اور قتل انبیاء کا سبب نافرمانی تھی، لیکن  
جب وہ مکمل طور پر نافرمانیاں ہی فرمائیاں کرتے رہے ان کے گناہ بڑھتے رہے، تو ان کا نور ایمان ضعیف ہوتا چلا گیا۔  
”ولم یزل کذلک الی ان بطل نور الایمان وحصلت ظلمۃ الکفر“

تو اسی وجہ سے ان کا نور ایمان باطل ہو گیا اور ان کو کفر کی ظلمت و تاریکی حاصل ہو گئی، جیسا کہ ارشاد باری  
تعالیٰ ہے۔ ﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ ہرگز ایسا نہیں (قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں  
نہیں) بلکہ رنگ ان کے دلوں پر ہے بوجہ اس کے کہ جو وہ کسب کرتے تھے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی  
نافرمانی بھی کفر سے کم نہیں تھی، بلکہ وہ کفر کے درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، تاہم آخر میں اس جواب کو علامہ رازی رحمہ اللہ  
نے جس انداز پر بیان کیا ہے، روح المعانی نے وہی نقل کیا جو بیان کیا جا چکا ہے۔ کبیر میں یوں ذکر کیا گیا۔

”فقولہ (ذَلِکَ بِمَا عَصَوْا) اشارۃ الی علة العلة“ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ”ذَلِکَ بِمَا عَصَوْا“ علت کی علت  
کی طرف اشارہ ہے، یعنی نافرمانی کو کفر اور قتل انبیاء کا سبب بتایا گیا۔

بھی مستحبات کی ترک کا انجام کفر ہو جاتا ہے:

ولهذا المعنی قال ارباب المعاملات من ابتلی بترک الآداب وقع فی ترک



السنن، ومن ابتلی بترك السنن وقع في ترك الفريضة، ومن ابتلی بترك الفريضة وقع في استحقاق الشريعة ومن ابتلی بذلك وقع في الكفر“

اوپر جو بیان ہوا ”علت کی علت کی طرف اشارہ ہے“ اس کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا یہی وجہ ہے کہ ارباب معاملات نے کہا ہے ”جو شخص مستحبات کو چھوڑنے میں مبتلا ہوتا ہے، وہ سنت کو چھوڑنے کا عادی ہو جاتا ہے، اور جو سنت کے چھوڑنے میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ فرض کے چھوڑنے میں واقع ہو جاتا ہے، اور جو فرض کو چھوڑنے میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ شریعت کو حقیر سمجھنا شروع کر لیتا ہے، جو شریعت کو حقیر سمجھے وہ کافر ہو جاتا ہے، اسی سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو فرض نماز کے بعد اور نماز جنازہ کے بعد دعاء کرنے سے روکتے ہیں، سوم، جہلم اور تعزیت کی دعاؤں سے منع کرتے ہیں، یہ مستحبات ہیں، ان کے تارک اور ان سے منع کرنے والے اپنے انجام کی فکر کریں۔

**جواب دوم:** اس میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾ پہلے گزرے ہوئے یہود کے ذلت، مسکینی اور غضب میں مبتلا ہونے کی علت ہو، اور ”ذَلِكَ بِمَسَاعَصُوا“ بعد والے یہود (جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے) کے ذلت وغیرہ میں مبتلا ہونے کی علت اور وجہ ہو، اس میں کوئی تکرار لازم نہیں آتا۔

”فَكَانَ تَعَالَى بَيْنَ عِلَّةٍ عَقُوبَةٍ مِنْ تَقَدُّمِ لَمْ يَبْنِ أَنْ مِنْ تَأْخِرٍ لِمَاتَبِعٍ مِنْ تَقَدُّمِ كَانَ لِأَجَلٍ مَعْصِيَةٍ وَعَدَاوَتِهِ مَسْتَوْجِبًا لِمِثْلِ عَقُوبَتِهِمْ حَتَّى يَظْهَرَ لِلْخَلْقِ أَنَّ مَا نَزَلَهُ اللَّهُ بِالْفَرِيقَيْنِ مِنَ الْبَلَاءِ وَالْمَحْنَةِ لَيْسَ إِلَّا مِنْ بَابِ الْعَدْلِ وَالْحِكْمَةِ“

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے لوگوں کی سزا کا ذکر کیا، اور اس سزا کے مستحق ہونے کی وجہ بھی بیان کی، اس کے بعد، پیچھے آنے والوں کی سزا کا ذکر کیا کہ ان کی سزا بھی پہلے لوگوں کی تابعداری کی وجہ سے وہی ہے جو پہلوں کی ہے البتہ اس کی وجہ ان کی معصیت اور عداوت ہے، اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کی سزاؤں کا ذکر کیا اور ان کے اسباب بھی بیان کئے، جس سے یہ ظاہر کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

❖ واخرج ابن جرير وابن حاتم عن الحسن "ضربت عليهم الدلة" قال اذله الله  
فلا منعة لهم وجعلهم الله تحت اقدام المسلمين

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ”ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةُ“ کی تفسیر بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر دیا، ان کو کوئی طاقت اور مدد بہ حاصل نہیں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کر دیا۔

(از درمنشور)

❖ واخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن قتادة في قوله (ذَلِكَ



بِمَاعَصَوْوْ كَانُوا يَعْتَدُونَ) قَالَ فَاجْتَنِبُوا المعصية والعدوان فان بهما هلك من هلك قبلکم من الناس“

حضرت قتادہ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْوْ كَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ کی تلاوت کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ معصیت اور حد سے تجاوز سے بچ جاؤ، ان دو چیزوں کی وجہ سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہو گئے۔ (درمنثور)

آیات سے مراد کونسی آیات ہیں؟ جن سے وہ کفر کرتے ہیں:-

”آیات اللہ الناطقة بنبوۃ محمد ﷺ وتحريفهم لها وبسائر الآيات القرآنية“ آیات سے مراد ان کی آسمانی کتاب توراۃ کی وہ آیات ہیں جو نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی تھیں، ان سے یہود نے انکار کیا، اور ان کی تحریف کی، اور اسی طرح قرآن پاک کی تمام آیات کا انہوں نے انکار کیا۔ (تفسیر ابی السعود)

(ذٰلِكَ) اشارة الى ما ذكر من الكفر والقتل (بِمَاعَصَوْوْ كَانُوا يَعْتَدُونَ) ای كائن بسبب عصيانهم واعتدائهم حدود الله تعالى على الاستمرار فان الاصرار على الصغائر يفضي الى مباشرة الكبائر والاستمرار عليها يؤدي الى الكفر“ یہ ان کا کفر اور قتل انبیاء بسبب نافرمانی کے تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ ہی نافرمانی کرتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے رہے، کیونکہ صغائر پر ہمیشہ قائم رہنا کبیرہ گناہوں کی طرف پہنچا دیتا ہے، اور کبیرہ پر ہمیشہ قائم رہنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

”فعلى المؤمن ان لا يفتح باب المعصية على نفسه خوفا مما يؤدي اليه بل ويترك ايضا بعض ما يباح له“

مؤمن کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ پر معصیت کا دروازہ نہ کھولے، اس خوف سے کہ کہیں معصیت میں مبتلا نہ ہو جائے، بلکہ جن مباح چیزوں کی وضاحت کر دی گئی لیکن کچھ شبہ ان کے ناجائز ہونے کا ہو تو ایسی مباح چیزوں کو بھی چھوڑ دینا تقویٰ ہے۔

”وقال ﷺ الحلال بين والحرام بين وبينهما امور مشبهات فمن اتقى الشبهات استبرأ لعرضه ومن وقع فى الشبهات وقع فى الحرام كالراعى حول الحمى يوشك ان يقع فيه“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے عزت اور دین کو بچا لیا، اور جو شخص شبہات میں واقع ہو گیا (گویا کہ) وہ حرام میں واقع ہو گیا



جیسا کہ چرواہا حد بندی کے ارد گرد جانوروں کو چرائے تو قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے۔ (منقول از روح البیان)



لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۱۳)

- (۱) سب ایک سے نہیں کتابیوں میں کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں رات کی گھڑیوں میں اور سجدہ کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)
- (۲) وہ سب برابر نہیں، اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کی گھڑیوں میں ایسے حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

### شان نزول:

قال ابن عباس لما سلم عبد الله بن سلام واصحابه قالت احبار اليهود ما آمن بمحمد ﷺ الا شررنا ولولا ذلك ماتر كوا دين آبائهم فانزل الله هذه الآية

(اخرجه الطبرانی والبيهقي)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عبد اللہ بن سلام (جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے) اور ان کے ساتھی ایمان لے آئے تو یہودی علماء کہتے لگے کہ محمد (ﷺ) کے ساتھ ایمان لانے والے نہیں مگر وہ جو ہم سے شر لوگ ہیں، اگر وہ شریر نہ ہوتے تو وہ اپنے آباء کے دین کو نہ چھوڑتے، ان کے یہ کہنے پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر خازن) درمنثور

﴿لَيْسُوا سَوَاءً﴾ ”وہ سب برابر نہیں۔“

ان الفاظ مبارکہ کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ان الفاظ پر وقف تام ہے۔

”والمعنى ان اهل الكتاب الذين سبق ذكرهم منهم المؤمنون واكثرهم الفاسقون ليسوا سواء“

اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ”بیشک اہل کتاب جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ“ ان میں بعض ایمان لانے والے ہیں، اور ان میں سے اکثر کافر ہیں، وہ اہل کتاب سب برابر نہیں، اسی صورت میں بعض حضرات نے ایک اور معنی یہ بیان کیا ہے



”وقیل معناه لا یستوی الیہود وامة محمدًا القائمة بامر اللہ الثابتہ علی الحق“

کہ یہود اور نبی کریم ﷺ کی امت ”جو کہ اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم ہے، اور حق پر ثابت ہے“ برابر نہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے ”لَیْسُوا مِثْلَ سِوَاءٍ“ پر وقف نہ ہو، بلکہ معنوی لحاظ پر اس کا بعد سے تعلق ہو، کیونکہ بعد میں آنے والے جار مجرور (مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ) کا تعلق ”لیسوا“ سے ہو، اس صورت میں اختصار ہوگا، اور عبارت پوشیدہ ہوگی معنوی عبارت یوں ہوگی ”لَیْسُوا مِثْلَ سِوَاءٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ وَمِنْهُمْ أُمَّةٌ مَلْعُومَةٌ غَیْرُ قَائِمَةٍ“ کہ سب اہل کتاب برابر نہیں، کیونکہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو حق پر قائم ہے، اور دوسرا گروہ وہ ہے جو حق پر قائم نہیں، چونکہ عرب حضرات دو مخالف چیزوں کا ذکر کرنا ہو تو ایک کو ذکر کر دیتے ہیں کہ دوسری قرائن سے خود بخود سمجھ آ جائے گی، اسی ضابطہ کو یہاں استعمال کیا گیا۔ (خازن)

﴿مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ﴾ ”اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں۔“  
قائم رہنے سے مراد:

(۱) اس کا ایک مطلب یہ ہے ”جماعة قائمة ای مستقيمة عادلة“ اہل کتاب میں سے ایک جماعت عدل

و انصاف پر قائم ہے، یہ لفظ لیا ہوا ”قامت العود“ لکڑی درست ہوگئی، سیدھی ہوگئی۔ (روح البیان)

(۲) قال ابن عباس قائمة ای مہدیة قائمة علی امر اللہ تعالیٰ لم یضیعوہ ولم یترکواہ  
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ ”قائم رہنے سے“ مراد یہ ہے کہ اہل کتاب سے ایک گروہ ہدایت پر قائم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم ہیں، اس کو انہوں نے چھوڑا نہیں۔

(۳) وقیل قائمة علی کتاب اللہ عزوجل و حدودہ“ اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے، کہ اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی حدود پر قائم ہے۔

(۴) وقیل قائمة فی الصلوة“ اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو نماز میں قیام کرنے والا ہے۔ (خازن)

(۵) قائمة بامر اللہ مطبوعة لشرعہ متبعة نبی اللہ“ اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم رہنے والے ہیں، اور اس کی شریعت کے فرمانبردار ہیں، اور اللہ کے نبی کے تابعدار ہیں۔ (صابونی، ابن کثیر)

یہ پانچوں معنی دوسرے معنی کے کچھ قریب ہے، الفاظ کچھ مختلف تھے تو طلباء کے فائدہ کیلئے علیحدہ ذکر کر دیا ہے۔



(۶) قائمہ علی کتاب اللہ وحده "اللہ تعالیٰ وحدہ ذات کی کتاب پر قائم رہنے والے ہیں۔ (معالم اشتریل للہغوی) اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ (کچھ وہ ہیں کہ حق پر قائم) تمام معانی کو شامل ہے واقعہ نے مطلق چھوڑ دیا ہے، یہ ترجمہ کیا ہے (اہل کتاب سے ایک گروہ وہ ہے جو قائم رہنے والے ہیں) تاکہ طلباء کرام جس معنی پر محمول کرنا چاہیں اسی پر محمول کر لیں۔ (محمول کرنا یعنی چسپاں کرنا)

﴿يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ﴾

"تلاوت کرتے ہیں اللہ کی آیتیں رات کی گھڑیوں میں ایسے حال میں کہ وہ سجدہ کرتے ہیں۔"

اس میں چند مطالب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) یعنی يصلون عبر بالسجود عن الصلوة لان التلاوة لا تكون في السجود "آئینہ کریمہ میں "یسجدون" سے مراد یہ ہے کہ "وہ نماز پڑھتے" سجدہ سے مراد نماز ہے، کیونکہ سجدہ میں قرآن پاک کی تلاوت نہیں ہوتی، اس قول کے مطابق ان کا مطلق نماز ادا کرنا مراد لیا گیا ہے، کسی نماز کی تخصیص نہیں، یعنی وہ رات کو نوافل ادا کرتے ہیں۔

(۲) وقيل هي صلوة التهجد بالليل "بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس نماز سے مراد خاص نماز یعنی تہجد ادا کرنا مراد ہے۔

(۳) وقيل هي صلوة العشاء لان اليهود لا يصلونها "بعض حضرات نے کہا اس نماز سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہود عشاء کی نماز ادا نہیں کرتے تھے۔

(۴) وقيل يحتمل انه اراد بالسجود الخشوع والخشوع لان العرب تسمى الخشوع سجدوا "بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ "وَهُمْ يَسْجُدُونَ" سے مراد خشوع کرنا ہے، کیونکہ عرب حضرات خشوع کا نام سجدہ رکھتے ہیں۔ (ماخوذ از خازن)

(۵) او نزلت في قوم يصلون صلوة الاوابين وهي التاسعة ركعة بعد صلوة المغرب "بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ یہ آیہ کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو مغرب کے بعد بارہ رکعت نماز اوابین پڑھتے تھے۔ (روح البیان)

اوابین اور تہجد کا ذکر قریب ہی (لنماء اللہ) میان کیا جا رہا ہے، خشوع کا ذکر پہلے پارہ میں "إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ" کی وضاحت کے ضمن میں آچکا ہے۔



## آیہ کریمہ میں کن لوگوں کا ذکر ہے؟

ایک تو شان نزول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی مراد ہیں جنہوں نے یہودیت کو چھوڑ کر ایمان قبول کر لیا تھا، اس میں چند اور لوگ بھی اس آیہ کریمہ کے نزول کا مصداق ہیں، یعنی یہ آیہ کریمہ مندرجہ ذیل کو شامل ہے، عرب میں سے اہل بخران کے چالیس آدمیوں کو، اور حبشہ کے بتیس آدمیوں کو اور روم کے آٹھ آدمیوں کو شامل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے پھر نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ آیہ کریمہ انصار کے چند آدمیوں کو بھی شامل ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام لانے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے تھے، اور جنابت کا غسل کرتے تھے، اور جو بھی ان کو دین حنیف (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین) کے مسائل کا علم تھا اس پر عمل کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو لے آیا تو انہوں نے آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اہل کتاب میں شامل کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے اپنے علم کے مطابق دین ابراہیم علیہ السلام پر قائم تھے۔

(خازن)

## صلوة اوابین: ”وست بعد المغرب لیکتب من الاوابین“ (در مختار)

اور چھ رکعت مغرب کے بعد ادا کرے تاکہ اوابین کے درجہ میں اسے لکھ دیا جائے۔

”الاوابین جمع اواب ای رجاع الی اللہ تعالیٰ بالتوبۃ والاستغفار“ اوابین جمع ہے ”اواب“ کی اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا توبہ اور استغفار کے ذریعے (شامی) یہی وجہ ہے مغرب کے بعد نوافل کا نام اوابین رکھنے کا، کہ جو لوگ مغرب کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں ان کو وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے توبہ کرنے والوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔

**تنبیہ:** اگرچہ در مختار میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ چھ رکعت ایک سلام سے یا دو سلاموں سے یا تین سلاموں سے ادا کرے، لیکن اپنا مختار صاحب در مختار نے ان الفاظ سے پیش کیا ”والاول ادم واشق“ پہلا قول کہ ایک سلام سے چھ رکعت ادا کرے اس میں نماز لمبی ہوتی ہے اور مشقت اس میں زیادہ ہوتی ہے، مشقت آمیز میں افضلیت پائی جاتی ہے، لیکن علامہ شامی نے ان الفاظ سے اس قول کو رد کیا ہے ”وکان جمعہا بتسلیمۃ واحدة خلاف الافضل“ کہ چھ رکعت ایک سلام سے ادا کرنا افضلیت کے مخالف ہے، اس لئے کہ یہ ثابت ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دو دو رکعت نوافل ادا کرنا افضل ہے، لہذا چھ کو ایک سلام سے ادا کرنے کی افضلیت کا قول باطل ہو گیا۔



”فكان المستحب فيه ثلاث تسليمات ليكون على نسق واحد“  
 مستحب اس میں تین سلام ہیں تاکہ ایک ہی طریقہ پر تمام رکعتیں ادا ہو جائیں، یعنی دو دو رکعت ادا ہو جائیں گی جو صاحبین کے قول کے مطابق افضل ہیں۔ (ماخوذ از شامی باب النوافل جلد اول صفحہ نمبر ۴۹۸)  
 وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی بعد المغرب ست رکعات لم یتکلم فیما بینہن بسوء عدلن له بعبادۃ لئنئی عشرة سنة، رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب لانعرفہ الا من حدیث عمر بن ابی خنعم وسمعت محمد بن اسمعیل یقول ہو منکر الحدیث وضعفہ جدا“

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کیں، اور ان میں کوئی بری بات نہ کی تو وہ بارہ سال کی عبادت کے برابر ہوں گی۔

**تنبیہ:** اگرچہ ترمذی نے یوں بیان کیا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور عمر بن ابی خنعم کے واسطے سے آتی ہے، اور ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسمعیل بخاری سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ عمر بن ابی خنعم معروف راویوں کے خلاف روایت کرتا ہے اور بہت زیادہ ضعیف ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ میرک کا قول نقل کرنے کے بعد ان کے تضاد پر گرفت کرتے ہیں۔

”قال میرک نقلا عن المنذری ورواہ ابن ماجۃ وابن خزیمہ فی صحیحہ“  
 میرک رحمہ اللہ منذری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ روایت ابن ماجہ نے بھی ذکر کی ہے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں بھی نقل کی ہے۔

”قال میرک ناقلا عن التصحیح والعجب من محی السنۃ کیف سکت علیہ و هو ضعیف باجماع اہل الحدیث قلت ینافیہ ماتقدم انہ رواہ ابن خزیمہ فی صحیحہ مع انہم اجمعوا علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال“

میرک نے صحیح سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ تعجب ہے محی السنۃ پر کہ انہوں نے اس حدیث پر کیسے خاموشی اختیار کی حالانکہ اس حدیث کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول میرک کے پہلے قول کے مخالف ہے، کیونکہ وہ پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اسے نقل کیا ہے، جس کی وجہ سے حدیث کا ضعیف ہونا اتفاقی نہ رہا، اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ضعیف حدیث پر فضائل اعمال میں عمل جائز ہے۔

”قال میرک وعن محمد بن عمار بن یاسر قال رأیت عمار بن یاسر یصلی بعد المغرب ست رکعات وقال رأیت حبیبی رسول اللہ ﷺ یصلی بعد المغرب ست



رکعات وقال من صلى بعد المغرب ست ركعات غفرت له ذنوبه وان كانت مثل  
زبد البحر“

میرک کہتے ہیں محمد بن عمار بن یاسر نے کہا میں نے (اپنے باپ) عمار بن بن یاسر کو مغرب کے بعد چھ رکعت  
ادا کرتے ہوئے دیکھا، اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے حبیب رسول اللہ ﷺ کو مغرب کے بعد چھ رکعات ادا کرتے ہوئے  
دیکھا، اور آپ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد چھ رکعت ادا کیں اس کے گناہ معاف کر دئے جائیں گے خواہ  
سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، (یہ بھی خیال رہے کہ عبادات کہ ذریعے معاف ہونے والے صفات گناہ  
ہوتے ہیں، کبار توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ من صلى بعد المغرب عشرين ركعة بنى الله له  
بيتاً في الجنة“ (رواه الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مغرب کے بعد بیس رکعت  
ادا کیں اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں گھر بنائے گا۔

”وقال ابن حجر وفيها حديث آخر، وهو انه عليه السلام كان يصليها عشرين ويقول  
هذه صلاة الاولين فمن صلاها غفر له“ و كان السلف الصالح يصلونها قال جمع  
ورويت اربعاً ورويت ركعتين فأقلها ركعتان واكثرها عشرون“

ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا اس میں ایک اور حدیث ہے، وہ یہ کہ بیشک رسول اللہ ﷺ (مغرب کے بعد) بیس  
رکعت ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے یہ پہلے لوگوں کی نماز ہے، جس نے یہ نماز ادا کی اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ یہ  
نماز سلف صالحین ادا کرتے رہے، البتہ بعض روایات میں دو رکعت کا ذکر ہے، اور بعض میں چار رکعت کا ذکر ہے، اور  
بعض میں چھ کا ذکر ہے، اور بعض روایات میں بیس کا ذکر بھی پایا گیا ہے روح البیان کے بارہ رکعت کا قول بھی کیا ہے،  
ان تمام اقوال میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ کم از کم اوائلین کی نماز کی دو رکعت ہیں، اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعت ہیں۔

(مشکوٰۃ باب النوافل، مع مرقاة جلد نمبر ۳، صفحہ نمبر ۱۱۳، ۱۱۵)

**رات کی نماز اور تہجد :** رات کی نماز عام ہے اور تہجد کی نماز خاص ہے۔

”وما كان بعد صلاة العشاء فهو من الليل“ جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد ادا کئے جائیں گے وہ ”صلوة  
اللیل“ (رات کی نماز) کہلاتی ہے۔

”وهذا يفيد ان هذه السنة تحصل بالتفعل بعد صلاة العشاء قبل النوم“



اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ یہ سنت (غیر مؤکدہ) عشاء کی نماز کے بعد، سونے سے پہلے نوافل ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

”وان التہجد ازالة النوم بتکلف مثل نائم ای تحفظ عن الائم نعم صلوة اللیل و قیام اللیل اعم من التہجد“

”تہجد“ کا معنی ہے تکلف سے نیند کا زائل کرنا، جیسا کہ ”نائم“ کا معنی ہے ”گناہوں سے درو رہنا“، یعنی عشاء کی نماز کے بعد سو جائے پھر نوافل ادا کرنے کیلئے بیدار ہو (جاگے) تو وہ نوافل جو ادا کرے گا ان کو نماز تہجد کہا جائے گا، لیکن عشاء کی نماز کے بعد سوئے یا نہ سوئے جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد ادا کرے گا وہ ”صلوة اللیل“ وہ رات کی نماز کہلائے گی، یہی مطلب ہے کہ ”صلوة اللیل“ (رات کی نماز) عام ہے تہجد کی نماز سے کیونکہ تہجد کی نماز عشاء کے بعد سو کر جاگنے کے بعد ادا ہوتی ہے۔

**تہجد نوافل ہیں:** ان التہجد لا یحصل الا بالتطوع فلو نام بعد صلوة العشاء لم قام فصلی فوائت لا یسمى تہجدا“

بیشک تہجد سوائے نوافل کے حاصل نہیں ہوتے، اگر ایک شخص سو گیا عشاء کی نماز کے، پھر جاگ کر اس نے قضاء نمازیں ادا کیں تو ان کو تہجد نہیں کہا جائے گا۔ (خیال رہے کہ اگرچہ وہ تہجد نہیں لیکن تہجد سے افضل فوت شدہ نمازوں کی قضاء ہے کیونکہ فرض سے بری الذمہ ہونا نسبت نوافل کے افضل ہے۔ (راقم)

تمام رات جاگنے والے کے نوافل تہجد کا درجہ رکھتے ہیں:

اگرچہ مجہم طبرانی میں ایک روایت حجاج بن عمر کی یہ ہے کہ ”تہجد“ سونے کے بعد ہی ہیں، بغیر سونے کے تہجد نہیں، لیکن صحیح قول یہی ہے۔ محل پر تقریباً جمہور کا اتفاق ہے کہ تمام رات جاگنے والے شخص نے جو نوافل عشاء کی نماز کے بعد رات میں ادا کئے وہ اس کے تہجد ہوں گے۔

عشاء کی نماز سے پہلے تہجد نہیں:

وقتہ بعد صلوة العشاء حتی لو نام ثم تطوع قبلها لا یحصل السنة“ اگر ایک شخص عشاء کی فرض ادا کرنے سے پہلے سو گیا اور جاگنے پر نماز سے پہلے ہی نوافل ادا کئے تو ان سے تہجد ادا کرنے کی سنت حاصل نہیں ہوگی، اسلئے کہ تہجد کا وقت عشاء کی فرض نماز کے بعد سو کر اٹھنے پر ہوتا ہے۔



تہجد کا وقت مقرر نہیں:

جو اوپر بحث ذکر کی گئی ہے اس سے واضح ہو گیا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا، پھر جاگ کر تہجد کی نیت سے نفل ادا کئے تو ان کو تہجد ہی کہا جائے گا، یہ ضروری نہیں کہ پچھلے پہر ہی جو نوافل ادا کئے جائیں وہی تہجد ہوں۔  
البتہ افضل طریقہ یہ ہے:

ان الافضل من الثلث الاوسط السدس الرابع والخامس "بہتر یہ ہے کہ رات کے درمیانی تہائی حصہ کے آخر میں تہجد ادا کرے، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے۔  
قال رسول الله ﷺ احب الصلوة الى الله تعالى صلوة داود (عليه السلام) كان ينام نصف الليل ويقوم ثلثه وينام سدسه

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو نمازوں میں سے پسندیدہ نماز حضرت داود علیہ السلام کی نماز تھی، وہ رات کا آدھا حصہ سوتے تھے، اور رات کے تہائی حصہ میں قیام کرتے تھے اور چھٹا حصہ پھر سو جاتے تھے، یعنی اگر رات نو گھنٹے کی ہوتی تو آپ پہلے ساڑھے چار گھنٹے کے آخر تک عشاء کی نماز کے بعد سو جاتے، پھر رات کے تین گھنٹے قیام کرتے، یعنی کھڑے ہو کر نوافل ادا کرتے، پھر ڈیڑھ گھنٹہ سو جاتے۔

رات کی نماز افضل ہے:

صلوة الليل افضل من النهار "رات کی نماز دن کی نماز سے افضل ہے، مسلم شریف میں مرفوع حدیث ہے "افضل الصلوة بعد الفريضة صلوة الليل" فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز ہے۔

تہجد کی کتنی رکعت ہیں:

تہجد کی رکعات کے متعلق مختلف روایات آتی ہیں، ان تمام سے نتیجہ یہ نکلا۔  
"اقول فينبغي القول بان اقل التهجد ركعتان واوسطه اربع واكثره ثمان" "والله اعلم"  
میں کہتا ہوں (شامی کہتے ہیں) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تہجد کی کم از کم دو رکعت ہیں، درمیانی چار رکعت ہیں اور اکثر آٹھ رکعتیں ہیں۔ حاوی قدس میں ہے "يصلى ما سهل عليه ولو ركعتين والسنة فيها ثمان ركعات" کہ جتنی رکعت آسانی سے پڑھ سکے وہی پڑھ لے، خواہ دو رکعت ہی ادا کر لے البتہ مسنون رکعت ہیں۔



حدیث ابی داؤد سے پتہ چلتا ہے ”ان اقل تہجدہ اربع سوی ثلاث الوتر“ کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کی تہجد کے نماز کم از کم چار رکعت ہوتی سوائے تین وتر کے، لیکن دوسری روایت میں دو رکعت کا بھی ذکر ملتا ہے۔

”قال ﷺ من استيقظ من الليل وايقظ اهله فصليار كعتين كتب من الذاكرين الله كثير او الذاكرات (رواه النسائي وابن ماجه وابن حبان في صحيحه والحاكم) نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو بیدار ہوا اور اپنے اہل کو بھی بیدار کیا تو انہوں نے دو، دو رکعت ادا کیں تو اس شخص اور اس کی اہل کو اللہ کا کثیر ذکر کرنے والے مردوں اور عورتوں میں لکھ دیا جائے گا، اس روایت میں کم از کم دو رکعت ادا کرنے کا ذکر ہے۔

**تہجد کی عادت بنا کر چھوڑ دینا مکروہ ہے:**

”قال ﷺ لابن عمر يا عبد الله لا تكن مثل فلان كان يقوم الليل ثم تركه“ (بخاری و مسلم) نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو فرمایا اے عبد اللہ فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ رات کو قیام کرتا تھا (یعنی تہجد ادا کرتا تھا) پھر اس نے ادا کرنا چھوڑ دیا۔

”ولذا قال ﷺ احب الاعمال الى الله اذومها وان قل“ رواه الشيخان وغيرهما“ بخاری اور مسلم میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ عمل پسند ہے کہ وہ ہمیشہ جاری رکھے اگرچہ وہ عمل کم ہی کیوں نہ ہو۔ ”فيسبغى للمكلف الاخذ من العمل بما يطيقه“ عاقل و بالغ کو چاہئے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق عمل کرے۔

**تنبیہ:** اگرچہ رات کی نماز عام ہے جس طرح پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، لیکن احادیث میں قیام اللیل کا جو ذکر ملتا ہے اس سے مراد تہجد کی نماز ہی ہے ”ان صلوة الليل المحثوث عليها هي التهجّد“ بیشک رات کی نماز ادا کرنے پر جو برا ہیختہ کیا گیا اس سے مراد تہجد ہیں۔ (تہجد کی تمام بحث ماخوذ از شامی جلد اول صفحہ نمبر ۵۰۶، ۵۰۷)

**رات کی نماز کے متعلق احادیث:**

عن عائشة رضي الله عنها قالت كان النبي ﷺ يصلي فيما بين ان يفرغ من صلوة العشاء الى الفجر احدى عشرة ركعة يسلم من كل ركعتين ويوتر بواحدة فيسجد السجدة من ذلك قدر ما يقرأ أحدكم خمسين آية قبل ان يرفع رأسه فاذا سكت المؤذن من صلوة الفجر وتبين له الفجر قام ركعتين خفيفتين لم اضطجع على شقه الايمن حتى ياتي المؤذن للاقامة فيخرج“ (بخاری و مسلم)



حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز کے فارغ ہونے کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے گیارہ رکعت ادا فرماتے تھے، ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے، البتہ وتر کی نماز میں دو رکعت کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر طاق بناتے، ان میں سجدہ کرتے اتنی قدر جتنی قدر تم سجدہ کرتے ہوئے سر اٹھانے سے پہلے پچاس آیتیں پڑھو، جب مؤذن فجر کی نماز کی اذان سے فارغ ہوتا، اور فجر ظاہر ہو جاتی (یعنی روشنی ہو جاتی) آپ کھڑے ہوتے تو دو خفیف رکعت ادا فرماتے پھر آپ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن آپ کو نماز کیلئے اٹھاتا تو آپ مسجد میں تشریف لے جاتے۔

### وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ رات کے وقت گیارہ رکعت ادا فرماتے تھے، آٹھ رکعت نوافل ہوتے، اور تین رکعت وتر، اور یہ واضح ہوا کہ آپ تہجد دو دو رکعت کر کے ادا کرتے تھے۔

”فیسجد السجدة من ذلك قدر ما يقرأ احدكم خمسين آية“ والظاهر ان الفاء لتفصيل المجمل يعني فیسجد كل واحدة من سجدة تلك الركعات طويلة“  
ظاہر یہی ہے کہ ”فیسجد“ پر فاء اجمال کی تفصیل کیلئے، یعنی تمام رکعتوں میں آپ ہر سجدہ اتنا لمبا فرماتے جتنا تم پچاس آیات پڑھتے میں وقت صرف کرتے ہو۔

اور ایک معنی یہ بھی ممکن ہے:

”ومن في من ذلك لتبعض والفاء للتفريع ومعناه قد كان بعض سجده طويلا بقدر ما يقرأ احد خمسين آية“

کہ ”من ذلك“ میں ”من“ جمعیں کیلئے ہو (جس کا معنی ”بعض“ ہو) اور فاء تفریع کیلئے ہو کہ آپ کے بعض سجدے اتنے لمبے ہوتے جتنی مقدار تم پچاس آیتیں پڑھتے ہو، خیال رہے بعض حضرات نے اس سے مراد سجدہ شکر لیا ہے کہ آپ نماز کے بعد سجدہ شکر ادا کرتے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جہاں بھی سجدہ کا ذکر ہے جس سے مراد بظاہر فقط سجدہ شکر کا ذکر سمجھا جاتا ہے، اس سے مراد دو رکعت نوافل ہیں۔ (فاذا سكنت المؤذن اى لرب) جب مؤذن اذان سے فارغ ہوتا (من صلوة الفجر اى اذالها) فجر کی اذان سے (بين له الفجر) جب فجر سفید ہو جاتی تو آپ کھڑے ہوتے تو دو رکعت خفیف ادا فرماتے، یعنی ان میں چھوٹی چھوٹی سورتیں (قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ) اور سورۃ اخلاص وغیرہ) آپ پڑھتے۔



”قلت الظاهر ان المراد بالتبين لاسفار فيفيدان الاسفار مستحب حتى في حق السنة“

(میں کہتا ہوں) ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر یہی ہے کہ ”تبيين“ سے مراد فجر کا سفید ہو جانا ہے تو اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ صبح کی نماز روشنی میں ادا کرنا مستحب ہے، یہاں تک کہ فجر کی سنتیں بھی روشنی میں ادا کرے، پھر آپ اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے، تاکہ رات کے قیام کی تھکن کی وجہ سے جسم میں سستی نہ رہے بلکہ چستی آجائے۔ (مشکوٰۃ باب قیام اللیل مع مرقاۃ جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۲۱)

❖ وعن عائشة قالت كان النبي ﷺ اذا صلى ركعتي الفجر فان كنت مستيقظة حدثني والاضطجع“ (رواه مسلم، مشکوة باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ (رات کے قیام کے بعد) جب فجر کی دو رکعت ادا فرماتے اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ کلام فرماتے اور اگر میں سوئے ہوتی تو آپ لیٹ جاتے۔

❖ وعن عائشة قالت ﷺ يصلي من الليل ثلاث عشرة ركعة منها الوتر وركعتا الفجر“ (رواه مسلم، مشکوة باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ رات تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے، جن میں (تین رکعت) وتر بھی ہوتے اور دو رکعت فجر کی بھی ہوتیں۔ (یعنی آٹھ رکعت تہجد کی ہوتیں)

❖ وعن مسروق قال سألت عائشة عن صلاة رسول الله ﷺ بالليل قالت سبع وتسع واحدى عشرة ركعة سوى ركعتي الفجر“ (رواه البخاری (باب قیام اللیل)

حضرت مسروق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی رات کی نماز کے متعلق پوچھا، تو آپ نے بتایا کہ آپ کبھی فجر کی دو رکعت کے علاوہ سات رکعت ادا کرتے (چار نفل، تین وتر) اور کبھی نو رکعت ادا فرماتے (چھ رکعت نفل اور تین وتر) اور کبھی گیارہ رکعت ادا فرماتے (آٹھ رکعت نفل اور تین رکعت وتر۔

❖ وعن عائشة قالت كان النبي ﷺ اذا قام من الليل ليصلي افتح صلوته بركعتين خفيفتين“ (رواه مسلم، مشکوة باب قیام اللیل)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب رات کو قیام کا ارادہ فرماتے تو دو رکعت خفیف سے ابتداء فرماتے۔

”واما رواية خمس عشرة فمحمولة على انه ﷺ كان يفتح صلاة الليل بركعتين خفيفتين“ ایک روایت میں پندرہ رکعت کا بھی ذکر ہے، اس کا شاید یہی مطلب ہوگا کہ تہجد کی نماز کو شروع کرنے سے پہلے دو رکعت نفل چھوٹی چھوٹی سورتوں سے افتتاحی طور پر ادا فرماتے (واللہ اعلم بالصواب)

(مرقاۃ جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۲۲)



عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ینزل ربنا تبارک وتعالیٰ کل لیلۃ الی السماء الدنیا حتی یرقی ثلث اللیل الآخر یقول من یدعونی فاستجب لہ من یسألنی فأعطیہ من یتغفرنی فأغفر لہ (بخاری و مسلم) وفی روایۃ لمسلم ثم یسط یدہ ویقول من یقرض غیر عدوم ولا ظلوم حتی ینفجر الفجر“ (مشکوٰۃ باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ہمارا رب تعالیٰ ہر رات کو جب رات کا آخری تہائی حصہ رہ جاتا تو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے (یعنی اس کی رحمت یا اس کے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے) وہ کہتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے دعاء کرے کہ میں اس کی دعاء کو قبول کروں کون ہے جو مجھ سے سوال کرے کہ میں اسے عطاء کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے کہ میں اس کی بخشش کروں۔ مسلم کی ایک روایت ہے ”پھر وہ اپنے ہاتھ (جو اس کی شان کے لائق ہیں) کشادہ کر دیتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو مجھے قرض دے حالانکہ وہ محتاج نہیں، اور وہ ظالم نہیں، یہ سلسلہ فجر تک جاری رہتا ہے۔

### وضاحت حدیث:

”ینزل ربنا“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر نازل ہوتا ہے، یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے نازل ہوتے ہیں، یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نداء دینے والا فرشتہ نازل ہوتا ہے یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے

”قیل مقصود الحدیث الترغیب والتحثیث وتخصیص هذا الوقت بمزید الشرف والفضل وان ما یاتی بہ المکلف انفع وار جی وبالقبول احری“

حدیث پاک میں رات کے پچھلے تہائی حصہ میں دعاء کرنے، رب تعالیٰ سے طلب کرنے، اور استغفار کرنے پر براہیختہ کیا گیا، اور اس وقت کی شرافت اور فضیلت کو بیان کیا گیا ہے، اور مکلف جو اس وقت میں دعاء وغیرہ کرے گا اس کی قبولیت کی زیادہ امید کی جاتی ہے، اور انسان کے لائق اور مناسب یہی ہے کہ اس وقت کی برکات سے فائدہ حاصل کرے۔ ”ثم یسط یدہ“ ای لطفہ ورحمتہ ”ہاتھوں کو کشادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے لطف اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے۔“ ”ویحتمل ان یکون بالتجلی الصوری لتزہ ذاته عن الجارحة والنزول الحسی“ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اپنی تجلی صوری فرماتا ہے، کیونکہ رب تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے، اور ظاہری طور پر اترنے سے بھی پاک ہے۔ ”ویقول من یقرض غیر عدوم“ اور وہ کہتا ہے کون ہے جو مجھے قرض دیتا ہے، حالانکہ وہ محتاج نہیں۔ ”ویقول“ وہ کہتا ہے۔ یعنی خود وہ کہتا ہے، یا اپنے کسی خاص فرشتے کے ذریعے وہ کہلاتا



ہے ”من یقرض“ اویعطی العبادۃ البدنیۃ او المالیۃ علی سبیل القرض واخذ العوض ”کون ہے جو قرض دے“ اس کا مطلب یہ ہے کون ہے جو عبادت بدنیہ یا مالیہ ادا کرے، اسی کو قرض سے تعبیر کیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور ثواب حاصل کرے۔ ”غیر عدوم“ ای رباغیا غیر فقیر عاجز عن العطاء“ یعنی اللہ تعالیٰ غنی ہے، فقیر نہیں، اور عطاء سے عاجز نہیں، بندے کا عبادت بدنیہ اور مالیہ کرنا بندے کے اپنے فائدہ کیلئے رب تعالیٰ کو اس ضرورت نہیں۔ ”ولا ظلم“ بعدم الوفاء او بنقص من الثواب والجزاء“ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا کہ اسے ثواب عطاء نہ کرے یا اس کے ثواب میں کمی کرے۔ بلکہ وہ مکمل جزاء عطاء فرماتی ہے۔

عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ ﷺ علیکم بقیام اللیل فانہ داب الصالحین قبلکم وهو قربة لکم الی ربکم ومکفرة للسیات ومنہا عن الائم

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے پر رات کے قیام اور نوافل کو لازم پکڑو بیشک یہ تم سے پہلے نبی لوگوں کی عادت ہے، اور وہ تمہارے لئے تمہارے رب کی قربت اور گناہوں کے مٹانے، اور گناہوں سے رکنے کا ذریعہ ہے۔

وعن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ ثلاثۃ بضحک اللہ الیہم الرجل اذا قام باللیل یصلی والقوم اذا صفوا فی الصلوۃ والقوم اذا صفوا فی قتال العدد

(رواہ فی شرح السنۃ، مشکوٰۃ باب التحریض علی قیام اللیل)

حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، ایک وہ شخص جو رات کو قیام کرتا ہے اور نماز (نوافل) ادا کرتا ہے، اور دوسرا وہ شخص جو اس وقت نماز ادا کرتا ہے جب قوم نماز کی صفیں بناتی ہے، اور تیسرا وہ شخص جو اس وقت نماز ادا کرتا ہے جب قوم جہاد کی صفیں بناتی ہے۔

عشاء کی نماز یہود ادا نہیں کرتے تھے، اس کا کیا مطلب ہے؟

وعن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ ﷺ اعتموا بہذہ الصلوۃ فانکم قد فضلتم بہا علی سائر الامم ولم تصلھا امۃ قبلکم (رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ باب تعجیل الصلوات)

حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم یہ نماز تاریکی آجانے پر ادا کرو (یعنی شفق کے غائب ہونے پر ادا کرو) بیشک تمہیں تمام امتوں پر فضیلت دی گئی اس نماز کے ذریعے، کیونکہ تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز ادا نہیں کی۔

**اعتراض:** جبریل امین نے نبی کریم ﷺ کو جب نمازوں کے ابتدائی اوقات اور انتہائی اوقات بتائے تو بعد



میں عرض یہ کیا ”ہذہ وقت الانبیاء من قبلک“ آپ سے پہلے انبیاء کرام کی نمازوں کے اوقات بھی یہی تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سب نمازیں تمام امتوں پر فرض تھیں، ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کیسے ہے؟

**جواب اول:** راقم کے نزدیک آسان جواب یہ ہے کہ پانچ نمازیں جو ہم پر فرض ہیں اسی طرح پانچ نمازیں ہر امت پر فرض نہیں تھیں، بلکہ بعض نمازیں بعض امتوں پر، اور بعض دوسری نمازیں دوسری امتوں پر، اسی طرح تمام نمازوں کے اوقات کو پہلے انبیاء کرام کی طرف منسوب کرنا صحیح ہے۔ (راقم)

**جواب دوم:** دوسری حدیث شریف میں ذکر ہے کہ ”یہ وقت آپ سے پہلے انبیاء کرام کا ہے“ اس میں یہ ذکر نہیں کہ یہ وقت پہلی امتوں کیلئے ہے، لہذا مطلب یہ ہے۔

”ان صلوة العشاء کانت تصلیہا الرسل نافلة لهم ای زائدة ولم تكتب علی اممهم

کالتہجد فانہ وجب علی رسول اللہ ﷺ ولم یجب علینا“

بیشک انبیاء کرام عشاء کی نماز بطور نفل ادا کرتے رہے لیکن ان کی امتوں پر عشاء کی نماز فرض نہیں تھی، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ پر تہجد واجب تھی اور ہم پر واجب نہیں۔

**جواب سوم:** ویحتمل انہ اراد انہ لم تصلہا علی النحو الی تصلونہا من التأخیر والتظار الاجتماع فی وقت حصول الظلام وغلبة المنام علی الانام“

اور احتمال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام امتوں نے عشاء کی نماز اس طرح نہیں ادا کی جیسے تم ادا کرتے ہو کہ نماز تاخیر سے ادا کرتے ہو اور شفق کے غائب ہونے، اندھیرا چھا جانے کی انتظار کرتے ہو، اور جب نیند لوگوں پر غالب آجاتی ہے اس وقت تم نماز ادا کرتے ہو۔ (ماخوذ از مرقاۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۸)

اس تیسرے جواب پر ایک اور حدیث پاک دلالت کر رہی ہے:

عن عبد اللہ بن عمر قال مکثا ذات لیلۃ ننتظر رسول اللہ ﷺ صلوة العشاء الآخرة فخرج البناحین ذہب ثلث اوبعدہ فلاندری اشئ شغلہ فی اہلہ او غیر ذلک فقال حین خرج انکم لتنظرون صلوة ما ینتظرہا اہل دین غیرکم ولولا ان یثقل علی امتی لصلیت بہم ہذہ الساعة ثم امر المؤذن فاقام الصلوة وصلی“ (رواہ مسلم مشکوۃ باب تعجیل الصلوة)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، ہم رات عشاء کی نماز کیلئے نبی کریم ﷺ کی انتظار میں رہے، تو آپ ہماری طرف تشریف لے آئے جبکہ رات کا تہائی حصہ یا اس سے زائد گزر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ اپنی اہل میں مشغول رہے یا کہ کوئی اور وجہ تھی (جب آپ تشریف لائے) تو آپ نے فرمایا بیشک تم نماز کی انتظار



کرتے رہے، اتنی انتظار تمہارے بغیر کسی اور دین والوں نے نہیں کی، پھر آپ نے فرمایا اگر میں امت پر بوجھ نہ سمجھتا تو ان کو اسی وقت میں نماز پڑھاتا، پھر آپ نے مؤذن کو حکم دیا تو انہوں نے اقامت کہی، پھر آپ نے نماز پڑھائی۔

حدیث پاک سے فائدہ حاصل ہوا:

آپ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ ”انتظار هذه الصلوة من بين سائر الصلوات من خصوصياتكم التي خصكم الله بها فكلما زدتكم يكون الاجر اكمل مع ان الوقت زمان يقتضى الاستراحة فالمثوبة على قدر المشقة ولان الذاكر في الغافلين كالصابر في الفارين“

اس (عشاء کی) نماز کی انتظار تمہاری خصوصیات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ خصوصیت عطاء کی ہے کہ تم یہ نماز دیر سے ادا کرتے ہو، جب نیک عمل میں مشقت زیادہ ہوتی ہے، اس میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ وقت آرام کا ہوتا ہے، آرام کو چھوڑ کر جب مشقت برداشت کرے گا تو اسے ثواب بھی زیادہ ہوگا وہ ایسے ہوگا جیسے غافل لوگوں میں کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہو، اور جہاد سے بھاگنے والوں میں کوئی ثابت قدم رہنے والا ہو۔ (مرقاۃ جلد دوم صفحہ نمبر ۱۴۰)

**تنبیہ:** ثم ان التأخير المذكور في هذا الحديث لم يخرج به عن وقت الاختيار وهو نصف الليل اوله

عشاء کی نماز کو تاخیر سے ادا کرنے کا جو ذکر حدیث پاک میں ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ مختار وقت سے زیادہ دیر نہ ہو، وہ رات کا تہائی حصہ یا نصف رات تک ہے۔ (مرقاۃ جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۴۰)

**واقم** کے نزدیک وہی مسئلہ مختار ہے جو فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ تاخیر اتنی مقدار میں ہو کہ جماعت میں نمازیوں کے کم ہونے کا ذریعہ نہ بنے، اگر دیر سے ادا کرنے میں نمازی زیادہ ہوں تو دیر سے ادا کرنا بہتر ہوگا، اور اگر جلدی نماز ادا کرنے میں نمازی زیادہ ہوں تو جلدی نماز ادا کرنا بہتر ہوگا۔ مطلقاً تاخیر کو اگرچہ نبی کریم ﷺ نے پسند فرمایا لیکن وہ دور صحابہ کرام کا تھا، جو آپ کی انتظار میں رہتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں تو نماز ادا کر لینا بھی غنیمت ہے، اگر لوگ تاخیر سے جماعت سے بھاگ جائیں تو جلدی نماز ادا کی جائے۔ آجکل تو اتنی زیادہ جہالت چھا گئی کہ مقرر امام کو (امام الحی) اگر ایک یا دو منٹ دیر ہو جائے تو کسی کو پکڑ کر آگے مصلیٰ پر کھڑا کر دیا جاتا ہے، جہلاء کو یہ پتہ نہیں کہ امام الحی کی اجازت کے بغیر نماز پڑھادینا مکروہ تحریمہ ہے۔ امام الحی کو آج کے دور میں صرف پانچ منٹ کا اختیار اپنے پاس رکھنا چاہئے، امام ہمیشہ دیر کرنے کا عادی نہ بن جائے، کبھی کسی عذر کی وجہ سے امام کو دیر ہو جائے تو نمازی پانچ منٹ تک انتظار کریں، پھر امام نے اگر اجازت دے رکھی ہے تو کسی کو امام بنا کر نماز باجماعت پڑھ لی جائے۔



يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۱۳)

(۱) اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں، اور بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں اور یہ لوگ لائق ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) ایمان رکھتے اللہ پر، اور آخرت کے دن پر، اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا، اور منع کرتے ہیں برائی سے، اور جلدی کرتے ہیں نیکی کے کاموں میں، اور یہی لوگ صلاحیت رکھنے والوں میں سے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اہل کتاب سب برابر نہیں، اس کی وجہ بیان فرمائی کہ بعض اہل کتاب وہ ہیں ”جو حق پر قائم ہیں“ (اور ان کی صفت یہ ہے کہ) وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں، (اور ان کی صفت یہ ہے) کہ وہ نماز ادا کرتے ہیں، (اور ان کی صفت بیان کی کہ) وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور ان کی صفت یہ بیان کی گئی کہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں، ان کی چھ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا ”وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ“ صالحین کے چند معانی بیان کئے گئے۔

صالحین بمعنی صلاحیت احوال:

”وَأُولَئِكَ الْمُوصِفُونَ بِتِلْكَ الْأَوْصَافِ مِنَ الَّذِينَ صَلَحَتْ أحوالهم عند الله“

وہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہیں، یہ ان لوگوں سے ہوں گے جن کے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوئے، یعنی باصلاحیت ہوئے۔ (البحر المحیط) واقعہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

صالحین بمعنی مسلمین:

زنجیری نے بیان کیا ہے ”وَيَجُوزُ أَنْ يُرِيدَ بِالصَّالِحِينَ الْمُسْلِمِينَ“ جائز ہے کہ مراد ”صالحین“ سے مسلمان لوگ ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے لائق ہوں، زنجیری نے بیان کیا ہے کہ وصف صلاح زیادہ طور پر وصف اسلام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے انبیاء کرام نے ”صالحین“ میں ہونے کی دعائیں کیں، حضرت سلیمان



ﷺ کی دعاء کو رب تعالیٰ نے بیان کیا ﴿وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ﴾ (اور داخل کر مجھے اپنی رحمت سے اپنے قرب کے سزاوار بندوں میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (اور البتہ تحقیق ہم نے اسے چن لیا دنیا میں اور بیشک وہ آخرت میں قرب کے لائق بندوں سے ہوں گے) اور حضرت ابراہیم اور حضرت اِسماعیل اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) کے متعلق فرمایا ”وَكُنَّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ“ اور ہر ایک کو ہم نے قرب کے لائق بنایا، حضرت اسمعیل اور حضرت ذوالکفل اور حضرت ادریس (علیہم السلام) کے متعلق ارشاد فرمایا ”وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِنَ الصَّالِحِينَ“ اور داخل کیا ہم نے ان کو اپنی رحمت میں، بیشک وہ قرب کے لائق لوگوں میں سے ہیں۔ (ماخوذ از کشاف والبحر المحیط)

### صالحین بمعنی اصحاب محمد:

قال ابن عباس (أُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ) ای من اصحاب محمد ﷺ  
وہ لوگ صالحین سے ہوں گے یعنی نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام سے ہوں گے۔ (البحر المحیط)

### صالحین بمعنی نیک لوگ:

یہود نے جب یہ کہا ”ما آمن به الا شرارنا“ (نہیں ایمان لایا اس کے ساتھ سوائے ہمارے برے لوگوں کے) تو رب تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کا وصف بیان کیا ”وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ“ ای من عداد الذین صلحت عند الله حالهم ”یعنی یہ نیک لوگوں کے ساتھی ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ (روح المعانی)

### صالحین بمعنی صلاحیت اجسام:

(مِنَ الصَّالِحِينَ) ممن صلحت اجسادهم بصلاح قلوبهم وزكاء نفوسهم ”صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کی درستگی اور نفسوں کی پاکیزگی کی وجہ سے ان کے جسم درست ہوں، اب مطلب یہ ہوا کہ ان صفات کے متصف لوگ ان میں سے ہوں گے جن کے اجسام درست ہوں گے۔ (منظہری)

### صالحین بمعنی رب کی رضا و ثناء کے مستحق:

(مِنَ الصَّالِحِينَ) ای من جملة من صلحت احوالهم عند الله تعالى واستحقوا رضاه و ثناءه



اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو ان صفات سے متصف ہوں گے، وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے احوال اللہ تعالیٰ کے ہاں درست ہوں گے اور وہ رب تعالیٰ کی رضا اور اس کی ثناء کے مستحق ہوں گے۔ (روح البیان)

”من“ بمعنی ”مع“:

(وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ) ای مع الصالحین وہم اصحاب محمد ﷺ فی الجنة

اور وہ جو ان صفات سے متصف ہوں گے، یہ صالحین (نیک لوگوں) کے ساتھ جنت میں ہوں گے، وہ نیک لوگ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں، یعنی ان لوگوں کو جنت میں صحابہ کرام کا قرب حاصل ہوگا۔ (قرطبی)

سب تراجم کو حاوی ترجمہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ مختصر، خوبصورت اور تمام تراجم کا جامع ترجمہ ”آپ نے ترجمہ کیا“ اور یہ لوگ لائق ہیں“ آپ نے اپنے ترجمہ میں ”من“ بیان یہ بتایا ہے، یہ ترجمہ نہیں کیا کہ ”یہ لوگ لائق لوگوں سے ہوں گے“ بلکہ ترجمہ کیا ”لائق لوگ ہیں“ افسوس کہ اگر ترجمہ عام مفسرین کے مطابق ”من“ بمعنی ”بعض“



حاصل کلام یہ ہے کہ:

”ان المسارعة مخصوصة بفرط الرغبة فيما يتعلق بالدين لان من رغب في الامر  
آثر الفور على التراخي“

بیشک مسارعت فرط رغبت (زیادتی رغبت) سے مخصوص ہے ان کاموں میں جو دین سے تعلق رکھتے ہیں،  
جب نیکی کے کاموں میں رغبت پائی جائے تو دیر پر جلدی کام کرنے کو ترجیح دے،

اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ اپنے رب سے مغفرت طلب کرنے  
کی طرف جلدی کرو، خیال رہے کہ ”سرعة“ کا مقابل ”اناءة“ ہے، اسی سے حدیث شریف میں ”والتانی  
من الرحمن“ آیا ہوا ہے، لیکن اس کا معنی مجازی مراد ہے مطلقاً ”تاخیر کرنا“ واما العجلة فهي المبادرة للشئ  
مطلقاً ”عجلت یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف مطلقاً جلد بازی کرنا، عجلت کا مقابل تاخیر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ”والعجلة مخصوصة بان يقدم مالا ينبغي تقديمه“ عجلت مخصوص ہے ان کاموں  
سے جن کا جلدی کرنا مناسب نہ ہو، جیسا کہ نماز وقت سے پہلے ادا کرنا، نماز میں رکوع اور سجود کے مکمل ہونے کا یقین نہ  
ہو، رکوع سے صحیح سیدھا کھڑا ہونا اور رکوع میں صحیح جھک جانا اور کم از کم ایک مرتبہ تسبیح مکمل کر لینا، اسی طرح سجدہ میں، یہ  
رکوع اور سجود مکمل ہے، تین مرتبہ تسبیحات کو مکمل کرنا سنت ہے اس سے زائد مستحب ہے کاش کہ نادان لوگ مسائل بھی  
پڑھیں رکوع و سجود میں سو جانے والے بعض اوقات ائمہ پر اعتراض کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ”العجلة ليست  
ممنوعة على الاطلاق“ عجلت مطلقاً منع نہیں، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ﴿وَعَجِلْتُ  
إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ﴾ میں نے تیری طرف (آنے میں) جلدی کی اسے میرے رب تا کہ تو راضی ہو جا۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جہاں عجلت کی مذمت بیان کی وہاں بعض امور کو مستثنیٰ بھی کیا ”العجلة من  
الشيطان الا في امور“ عجلت شیطان کی طرف سے ہے سوائے چند امور کے، آئیے دیکھئے ”توبہ جلدی کرنا، مہمان  
کے سامنے طعام جلدی رکھنا، اور میت کی تجھیز و تکفین جلدی کرنا، اور باکرہ عورت کی شادی جلدی کرنا، اور نماز اول وقت  
مستحب میں پڑھنا“ ان تمام کاموں کو جلدی کرنا بہتر ہے، خواہ یوں کہا جائے کہ یہ وہ امور ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے عجلت  
مذمومہ (بری جلد بازی) سے مستثنیٰ (علیحدہ) فرمایا، یا یوں کہا جائے کہ ان میں جلدی کرنا مستحب ہے اسے مسارعت  
کہا جائے گا، جس کی رب تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے ﴿وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ﴾ وہ نیکی کے کاموں میں جلدی  
کرتے ہیں۔ (ماخوذ از صاوی و کبیر در روح المعانی)



اصل بات یہ ہے کہ عربی الفاظ کی کہیں کہیں اردو الفاظ سے صحیح ترجمانی نہیں ہو سکتی، جس کی وجہ سے اس قسم کے اعتراض و جواب کی ضرورت درپیش آتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے اس اعتراض سے بچنے کیلئے ترجمہ یہ کیا ہے ”اور نیک کاموں پر دوڑتے ہیں“ واقسم نے اصل میں اعتراض و جواب کی وضاحت کیلئے ”وَيُسَارِعُونَ“ کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔

✽ اغتنم خمساً قبل خمس شبابك قبل هرمك وصحتك قبل سقمك وفراغك

قبل شغلک و حیاتک قبل موتک و غناک قبل فقرک

حدیث شریف میں ہے ”پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اور صحت کو بیماری سے پہلے، اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے، اور زندگی کو موت سے پہلے، اور غنی ہونے کو محتاجی سے پہلے۔ یہ حدیث حسن ہے، ابن مبارک نے کتاب الزہد میں بیان کی ہے، علامہ بغوی نے عمرو بن میمون اودوی سے بالاسناد مرسل روایت ذکر کی ہے۔ (البحر المحیط بمع حاشیہ)

✽ عن ابي امامة قال قال رسول الله ﷺ بادروا بالاعمال

(رواه البيهقي)

ہر مانا غضا و موتا خالسا و مرضا حابسا و تسويفاً مویسا

ابو امامہ کتنے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نیک اعمال کی طرف جلدی کر لو اس بڑھاپے سے پہلے جس کی وجہ سے سرکانپ رہا ہو، اور اچانک موت کے آجانے سے پہلے، اور اعمال سے روک دینے والی مرض سے پہلے، اور اس محتاجی سے پہلے جس میں کہنا پڑھے اچھا ہو جائے گا، اچھا ہو جائے گا۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

اولئک اشارة الى امة باعتبار اتصافهم بمافصل من النعوت الجليلة ومافيه من

معنى البعد للايدان درجتهم وسمو طبقتهم فى الفضل واشاره على الضمير للاشعار

بعلة الحكم والمدح اى اولئک المنعوتون بتلك الصفات الفاضلة بسبب

اتصافهم بها

یہاں دو چیزیں سمجھنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ ”اولئک“ کا اشارہ ”امۃ“ کی طرف ہے جو قریب ہے تو اشارہ بعید کیوں لایا گیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ”اہل کتاب سے ایک گروہ“ جس کا ذکر ہو رہا اس امت (گروہ) کے اوصاف جلیلہ ذکر کئے گئے ہیں، ان اوصاف جلیلہ میں درجات کی بلندی اور طبقات کی فضیلت میں رفعت کی وجہ سے ”بعد مرتبہ“ (مرتبہ میں بلندی) حاصل ہے، اس ”بعد مرتبہ“ کو مکان کی دوری کے درجہ میں رکھ کر اشارہ بعید کا لایا گیا ہے۔



دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ ”اولئک“ اشارہ لایا گیا ہے، ضمیر نہیں لائی گئی ”وہم من الصالحین“ نہیں کہا گیا، اس کی وجہ کیا ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اشارہ کو ضمیر پر ترجیح دینے کی یہ وجہ ہے کہ حکم اور مدح کی علت (سبب) بیان کیا گیا ہے کہ وہ صالحین سے کیوں ہیں یا صالحین کیوں ہیں؟ اسلئے کہ وہ اعلیٰ قسم کی فضیلت رکھنے والی صفات یعنی صفات جلیلہ و رفیعہ سے متصف ہیں یہ سبب ہے ان کا صالحین سے ہونے کا۔ (تفسیر ابی السعود)

”وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ“ التي يعملونها مبادرين غير متساقلين لمعرفة بقدر ثوابهم

وہ نیکی کے کاموں پر عمل کرنے میں جلدی کرتے ہیں، نیکی کے کاموں کو بوجھ نہیں سمجھتے، اس لئے کہ انہیں نیکی کے اعمال کے ثواب کی قدر کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ”وقيل يبادرون بالعمل قيل الفوت“ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ عمل کے فوت ہونے سے پہلے ہی اسے جلدی سے ادا کر لیتے ہیں۔ (قرطبی)



وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۱۵)

- (۱) اور وہ جو بھلائی کریں ان کا حق نہ مارا جائے گا، اور اللہ کو معلوم ہیں ڈروالے۔ (کنز الایمان)
  - (۲) اور جو وہ بھلائی کریں تو اسے ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا، اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔ (نجوم الفرقان)
- ما قبل سے تعلق:

جب جاہل یہودیوں نے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے متعلق کہا ”انہم خسروا بسبب هذا الايمان“ بیشک یہ لوگ اس ایمان کی وجہ سے خسارہ میں آ گئے، تو رب تعالیٰ نے ان کی صفات جلیلہ کا ذکر فرما کر ان کے متعلق یہ ارشاد فرمادیا ”اولئک من الصالحین“ وہ باصلاحیت لوگوں سے ہیں، تو اسی سے گویا کہ یہ اعلان فرمادیا ”بل فازوا بالدرجات العظمیٰ“ وہ خسارہ میں نہیں، بلکہ وہ بہت بڑے درجات حاصل کر کے کامیاب ہو گئے مقصد ان ایمان لانے والوں کی تعظیم تھی تاکہ ان کے دل سے ان جاہلوں کے کلام کا اثر زائل ہو جائے، پھر اس آیت کریمہ میں اہل کتاب جو ایمان لانے والے تھے ان کے دل کو مزید تسلی دی، کہ یہ لوگ جو بھی نیکی کا



کام کریں گے خواہ قلیل ہو یا کثیر اس کا ثواب ضائع نہیں کیا جائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ جس نے ذرا برابر نیکی کا عمل کیا وہ اسے پالے گا (یعنی اس کا ثواب پالے گا) ”فان سائر الخلق يدخلون فيه نظر الى العلة“ بیشک تمام مخلوق اس حکم میں داخل ہے، کیونکہ سبب عام ہے کہ جو شخص بھی جو بھلائی کا کام کرے گا اس کا ثواب اسے عطاء کر دیا جائے، اس کے ثواب میں نہ کمی کی جائے گی، اور نہ ہی اس کا ثواب ضائع کیا جائے گا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ﴾ ”اور جو وہ بھلائی کریں۔“

اس سے مراد ہر قسم کی نیکی کے کام ہیں، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، خواہ وہ متعدی ہوں یعنی ان کا نفع غیروں تک بھی پہنچے یا وہ غیر متعدی یعنی ان کا نفع اس کی ذات تک محدود ہو، دوسروں کو اس کا نفع نہ پہنچے، خواہ وہ نیکی کے کام ظاہر ہوں یا باطن ہوں۔

﴿فَلَنْ يُكْفَرُوهُ﴾ ”تو اسے ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا۔“

اس مقام پر ”یکفرو“ کا لفظ ”کفران“ سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے ”کفران نعمت“ یعنی ناشکری کرنا لیکن یہ معنی یہاں ممکن نہیں کہ معنی یوں کیا جائے ہرگز ان کی اس بھلائی کی ناشکری نہیں کی جائے گی اور ان کی اس بھلائی کی نعمت کا کفران نہیں کیا جائے گا۔ یہ معنی کیوں درست نہیں، یہ اس لئے درست نہیں کہ ”یکفرو“ مجہول کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کا ایک مفعول جمع کی ضمیر، اور دوسرا مفعول واحد کی ضمیر ہے۔

”لا يجوز ان يضاف الكفران الى الله تعالى لانه ليس لاحد عليه تعالى نعمة حتى يكفرها“

اللہ تعالیٰ کی طرف کفران کی نسبت جائز نہیں، اس لئے کسی ایک کا اللہ تعالیٰ پر کوئی انعام نہیں، کہ اللہ اس انعام کا شکر ادا نہ کرے تو ”کفران نعمت“ ہو جائے۔ جب یہ معنی مراد لینا درست نہیں تو مجازی معنی ہوگا ”فلن يضيع ولا ينقص ثوابه البتة سمي ذلك كفرا كما سمي توفية الثواب شكرا“ وہ یہ ہے کہ ہرگز ان کا ثواب نہیں کیا جائے گا، اور ہرگز ان کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی، ثواب کے ضائع کر دینے اور ثواب کے کم کر دینے کو مجازی طور پر ”کفران“ کہا جاتا ہے جیسا کہ مکمل ثواب کے عطاء کرنے کو ”شکر“ کہا جاتا ہے، اسی معنی کا اعتبار ان آیات میں کیا گیا ہے۔ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾ (بیشک اللہ شاکر اور علم والا ہے) اسی طرح ﴿فَأُولَٰئِكَ كَانُوا مِنْهُمْ مَشْكُورًا﴾ ان کی کوشش کا شکر یہ قبول کیا جائے، یعنی ان کو ثواب دیا جائے گا۔ (بیضاوی و شیخ زادہ)



دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ”کفران“ اور ”شکر“ کا ایک ایک مفعول آتا ہے ”فَلَنْ يُكْفَرُوهُ“ کے دو مفعول ایک نائب فاعل اور دوسرا مفعول ضمیر منصوب متصل، کیسے آگئے ہیں۔

**جواب:** کہ یہاں قاعدہ تفسیم جاری کیا گیا ہے، وہ یہ کہ ”کفر“ متضمن ہے اس فعل کو جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے، وہ ہے ”حرم“ اور ”منع“ گویا کہ یوں کہا گیا ہے ”فَلَنْ يَحْرُمُوهُ“ ان کو اس بھلائی سے ہرگز محروم نہیں کیا جائے گا، یا اصل میں یوں تھا ”وَلَنْ يَمْنَعُوا جِزَاءَ وَهُ“ ہرگز ان سے ان کی جزاء کو نہیں روکا جائے گا۔ (شیخ زادہ)

**تنبیہ:** ایک قرأت میں تاء سے پڑھا گیا ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ﴾ اس صورت میں یہ جملہ استینافیہ (نیا جملہ) ہوگا، اور خطاب عام مؤمنین کو ہوگا، مطلب یہ ہوگا ”اے مومنو جو نیکی کا کام تم کرو تو وہ بھلائی کا کام ہرگز تم سے ضائع نہیں کیا جائے گا۔ تاء والی قراءت کو تائید ان آیات سے بھی ملتی ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾ اور جو تم کرو بھلائی کا کام اللہ اسے جانتا ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ الْيُكْم﴾ اور جو تم کرو بھلائی پورا پورا دیا جائے گا تمہیں (اس کا ثواب) ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ﴾ اور جو تم بھلائی کرو تم اسے پالو گے اللہ کے ہاں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ﴾ ”اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔“

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ان کے بھلائی کے اعمال کا ثواب ہرگز ضائع نہیں کیا جائے گا، تو اس کے بعد یہ الفاظ مبارکہ ذکر فرمائے ﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ﴾ جو دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ الفاظ مبارکہ دلیل کے قائم مقام کیسے ہیں؟ وہ اس طرح کہ ثواب اور جزاء کا نہ پہنچانا یا ہوگا سہو و نسیان (بھولنے) کی وجہ سے ”وَذَلِكَ مُحَالٌ فِي حَقِّهِ لِأَنَّهُ عَلِيمٌ بِكُلِّ الْمَعْلُومَاتِ“ ”اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں“ (کہنا کہ وہ) (معاذ اللہ) بھول گیا ہے) محال ہے، اس لئے کہ وہ ہر وقت تمام معلومات کو جاننے والا ہے، ابتدائی طلباء کرام بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ”علیم“ صفت مشبہ والا معنی دے رہا ہے جس میں دوام و ثبات ہوتا ہے اس لئے الفاظ کے مطابق لغوی معنی یہ ہے ”اور اللہ ہر وقت پرہیزگاروں کو جاننے والا ہے“

عوام کی آسانی کیلئے راقم نے ترجمہ کر دیا ”اور اللہ جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔“ واما ان يكون للعجز والبخل والحاجة“ اور یہ ثواب و جزاء نہ پہنچانے کی وجہ عاجز ہونا اور کجس ہونا، اور محتاج ہونا ہے ”وَذَلِكَ



محال لانہ الہ جمیع المحدثات“ اللہ تعالیٰ کو عاجز اور بخیل اور محتاج کہنا محال ہے، کیونکہ وہ معبود حقیقی ہے یہ صفات حدوث پر دلالت کرتی ہیں، وہ تو قدیم ہے۔

”فاسم (اللہ) تعالیٰ يدل على عدم العجز والبخل والحاجة“ وقوله (عليهم) يدل على عدم الجهل“

رب تعالیٰ کا اسم گرامی ”اللہ“ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ عجز، بخل، احتیاجی سے پاک ہے، اور لفظ ”علیم“ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ جہالت سے پاک ہے، یہاں سے ہی دلیل مکمل ہو گئی کہ وہی جزا دینے والا ہے کسی کو جزاء سے محروم نہیں کرے گا کیونکہ وہ سہو و نسیان، جہالت، عجز، بخل اور احتیاجی سے پاک ہے، متقین کا ذکر کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو جاننے والا ہے، اس کی وجہ یہ ہے ”هذا القول بشارة للمتقين بجزيل الثواب ودلالة على انه لا يفوز عنده الا اهل التقوى“ کہ اس میں متقین کی بشارت کا ذکر ہے کہ انہیں بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ یہ مرتبہ بغیر تقویٰ کے حاصل نہیں ہوگا۔

تقویٰ خیر اور اچھے اعمال کا مبداء ہے:

اللہ تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہونے والے اہل تقویٰ ہیں ﴿وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ﴾ سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے ”ان الخير يقربهم اليه“ کہ بھلائی کے کام ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتے ہیں، اس پر حدیث قدسی دلالت کر رہی ہے ”من تقرب الي شبرا تقربت اليه باعا“ رب تعالیٰ فرماتا ہے ”جو میرے قریب ایک بالشت ہوتا ہے، میں اس کے قریب اتنا ہوتا ہوں جتنا دو بازوؤں کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ”انا جليس من ذكرني و انيس من شكرني و مطيع من اطاعني“ جو میرا ذکر کرتا ہے میری رحمت اس کے ساتھ ہوتی ہے، اور جو میرا شکر یہ ادا کرتا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں، اور جو میری اطاعت کرتا ہے میں اسے اطاعت کا ثواب عطا کرتا ہوں۔

”و مطيع من اطاعني“ ای کما اطعتموني بتصفية الاستعداد والتوحيد نحو اطاعتكم

بافاضة الفيض على حسبه والاقبال اليكم“

جس طرح تم خالص مجھ سے امداد طلب کر کے اور خالص میری طرف توجہ کر کے میری اطاعت کرتے ہو، اسی طرح میں تمہیں اس کے مطابق ثواب پہنچاتا ہوں اور تمہاری طرف توجہ کرتا ہوں، یہ گویا کہ میری طرف سے تمہاری اطاعت ہے۔ سبحان اللہ کیسی ہے شان رحیمی و کریمی۔

(وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ) بالدين اتقوا ما يحجبهم عنه فتجلى لهم بقدر زوال الحجاب“



اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ تقویٰ والے لوگوں کو جاننے والا ہے، یعنی جب لوگ ان چیزوں سے بچ جائیں گے جو ان کے اور رب تعالیٰ کے درمیان حجاب کا ذریعہ بنتی ہیں، تو حجاب زائل ہوتا چلا جائے گا، جتنا حجاب زائل ہوگا اسی قدر ان پر اللہ تعالیٰ کی صفاتی تجلیات واضح ہوں گی۔  
(روح البیان)

### خوبصورت سبق آموز حکایت:

ابوبکر کتانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں ایک نو جوان کو دیکھا اتنا خوبصورت جوان میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ ”فقال التقوی“ اس نے جواب دیا میں تقوی ہوں، قلت فاین تسکن؟ قال فی کل قلب حزن میں نے کہا تو کہاں رہتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں ہر غمناک دل میں رہتا ہوں، پھر میں نے ایک سیاہ و شناک عورت کو دیکھا، میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ فقال الضحک اس نے کہا ”میں ہنسی ہوں“ فقلت ابن تسکنین فقال فی کل قلب فرح مرح میں نے پوچھا تو کہاں رہتی ہے؟ تو اس نے کہا میں خوش اور اترانے والے دل میں رہتی ہوں، ابوبکر کتانی فرماتے ہیں میں جب بیدار ہوا تو میں نے دل میں پختہ عقیدہ جمایا کہ آئندہ میں نہیں ہنسوں گا ہاں اگر کہیں ہنسی غالب ہوگئی جو مجھے بے اختیار آگئی تو وہ مستثنیٰ رہے گی۔

”فعلى السالك ان يتمسك بحبل التقوى ويانس بد فى الدنيا لعل الله يجعله ایسالة فی قبره وحشره فالتقوى من دیدن الصلحاء وهم الدین یسارعون الى الخیرات ماداموا فی الحیاة“

سالك پر لازم ہے کہ تقویٰ کی رسی کو لازم پکڑے، اور تقویٰ سے ہی دنیا میں انس پکڑے، تاکہ اللہ تعالیٰ تقویٰ کو اس کی قبر میں اور حشر میں اس کا انیس بنادے، تقویٰ صلحاء کا طریقہ ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں جب تک زندہ رہتے ہیں۔  
(روح البیان)

”قال الشيخ ابو الحسن رحمه الله الفضل مايسال العبد من الله خيرات الدين ففى خيرات الدين خيرات الآخرة ففى خيرات الآخرة خيرات الدنيا وفى خيرات ظهور خصائص الاولياء وهى اربعة اوصاف العبودية ونعوت الربوبية والاشراف على ماكان ومايكون والدخول على الله فى كل يوم سبعين مرة والخروج“

شیخ ابوالحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں، افضل یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ سے دین بھلائی طلب کرتا رہے، کیونکہ دین کی بھلائی میں آخرت کی بھلائی ہے، اور آخرت کی بھلائی میں دنیا کی بھلائی ہے، اور دنیا کی بھلائی میں اس پر اولیاء کرام کی خصوصیات ظاہر ہو جاتی ہیں، اولیاء کرام کی اعلیٰ قسم کی خصوصیات چار ہیں۔



(۱) اوصاف عبودیت: کہ انسان میں رب تعالیٰ کی عبادت کرنے کا خصوصی مقام حاصل ہو جائے۔

(۲) نعوت ربوبیت: کہ اس خاص بندے کو رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہونے کی حیثیت حاصل ہو جائے۔

(۳) والاشراف علی ماکان وما یکون: باقی مخلوق جو پیدا ہو چکی ہے یا ہونی ہے اس پر اس انسان کو اشرافیت حاصل ہو جائے، خیال رہے کہ عام عرف میں ولی کا اطلاق غیر نبی پر ہوتا ہے، اسلئے ولی کی اشرافیت انبیاء کرام اور جلیل القدر ملائکہ کے سواء باقی مخلوق پر ہوگی۔

(۴) والدخول علی اللہ فی کل یوم سبعین مرة والخروج“ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور ہر دن ستر مرتبہ آنے جانے کا موقع مل جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفاتی تجلیات اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ (روح البیان)  
”فلیسارع العبد الی الخیرات والحسنات وجميع الحالات ولا یتسر ذلک الا لارباب الارادات واصحاب المجاہدات“

لہذا بندے کو چاہئے کہ وہ ہر قسم کے نیکی و بھلائی کے کاموں میں جلدی کرے، یہ کام خاص ارادۃ اور مجاہدہ کرنے والے حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

نیاید نکو کاری از بدگان	محال ست دوزندگی از سگان
بدصلوں سے نیکی نہیں آسکتی	زندگی کی دوزکتوں سے حاصل ہونا محال ہے
تواں پاک کردن ز زنگ آئینہ	لیکن نیاید ز سنگ آئینہ
آئینہ کو زنگ سے پاک کیا جاسکتا	لیکن پتھر کو آئینہ نہیں بنایا جاسکتا
بکوشش زروید گل از شاخ بید	نہ زنگے بگر ماہہ گردد سفید

کوشش کے باوجود بید درخت کی شاخ پر پھول نہیں اگتا زنگ کو ریگ مال سے بھی سفید نہیں کیا جاسکتا۔ (روح البیان)  
تمام اشعار کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ میں تقویٰ کے ذریعے اہلیت پیدا کرنا کہ تجھے رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکے، اگر تیرا دل گناہوں سے زنگ آلود ہو تو رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکے گا۔





إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۱۶)

(۱) وہ جو کافر ہوئے ان کے مال اور اولاد ان کو اللہ سے کچھ نہ بچائیں گے، اور وہ جہنمی ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا۔ (کنز الایمان)

(۲) بیشک وہ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہیں بے پرواہ کریں گے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے کچھ (بھی) اور وہ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (نجوم الفرقان)

مختصر مطلب تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہو رہا ہے، کہ بیشک کافروں کو ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بالکل نہیں بچا سکیں گے، اور وہ لوگ جہنمی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، لیکن مومنوں کو ان کے مال اور ان کی اولاد نفع پہنچائیں گے۔

”وَأَن كَانَ التَّصَدِيقُ بِالْأَمْوَالِ يَطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ فِي حَقِّ الْمُؤْمِنِينَ وَيَغْفِرُونَ بِمَوْتِ أَوْلَادِهِمْ أَوْ اسْتِغْفَارِهِمْ“

کیونکہ مومن حضرات جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال صدقہ کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کا غضب ختم ہو جاتا ہے اور اس کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور ان کے بچوں کے فوت ہونے کی وجہ سے یا ان کی اولاد کی اپنے والدین کیلئے مغفرت طلب کرنے سے ان کی بخشش کردی جاتی ہے۔ (تفسیر تہمیر الرحمن)

## شان نزول:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ یہود کے رئیس لوگ نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں مال حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے تھے۔

”وَالْمَا كَانَ مَقْصُودُهُمْ بِمَعَادَاتِهِ تَحْصِيلَ الرِّيَاسَةِ وَالْأَمْوَالِ فَقَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ“

ان کا مقصد نبی کریم ﷺ کی دشمنی سے یہ ہوتا تھا کہ ریاست اور مال حاصل کر لیں اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد گرامی ﷻ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ کہ ان کے مال اور ان کی اولاد ان کو بے پرواہ نہیں کر سکے گی۔



(۲) دوسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ قریش مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، کیونکہ ”فان ابا جہل کان کثیر الافتحار بالاموال وانفق ابو سفیان مالا کثیرا فی یومی بدر واحد علی المشرکین“

بیشک ابو جہل اپنے مال پر بہت زیادہ فخر کرتا تھا اور ابو سفیان نے بدر اور احد میں کثیر مال مشرکوں پر خرچ کیا، تو آیت کریمہ نازل ہوئی کہ تمہاری اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں بچا سکیں گے۔

(۳) تیسرا قول شان نزول میں یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ عام مشرکین کے متعلق نازل ہوئی، کہ کفار اگر مال بطور فدیہ دے کر اپنے آپ کو عذاب سے بچانا چاہیں گے تو نہیں بچا سکیں گے۔ (غازن)

راقم کے نزدیک تمام اقوال ہی معتبر ہیں، اس لئے کہ آیت کریمہ میں بنی قریظہ اور بنی نضیر کا ذکر بھی موجود ہے اور قریش مشرکین کو بھی آیت کریمہ شامل ہے اور اپنے عموم الفاظ کے لحاظ پر آیت کریمہ تمام کفار و مشرکین کو شامل ہے۔

صرف مال اور اولاد کا ذکر کیوں؟

وانما خص الاموال والاولاد بالذکر لان الانسان يدفع عن نفسه تارة بالفداء بالمال وتارة بالاستعانة بالاولاد فاعلم الله تعالى ان الكافر لا ينفعه شئ من ذلك في الآخرة ولا مخلص له من عذاب الله“

اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ انسان کبھی مال کا فدیہ دے کہ اپنے آپ سے عذاب کو دور کرتا ہے، اور کبھی اولاد سے امداد کر کے مدافعت کرتا ہے، رب تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ کافر کو عذاب سے نہ اس کا مال بچا سکتا ہے اور نہ اولاد۔

﴿وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

”اور وہ لوگ آگ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

واقم نے لفظی ترجمہ کیا ہے، مرادی ترجمہ وہی خوبصورت ہے جو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا ہے، ”اور وہ جہنمی ہیں۔“ ”وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ“ ای مصاحبوہا علی الدوام وملازموہا ”وہ اصحاب نار ہوں گے، یعنی آگ کے مصاحب ہوں گے ہمیشہ کیلئے اور آگ کو لازم پکڑنے والے ہوں گے۔ (روح البیان)

”هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“ کہہ کر ان کے آگ سے نکلنے کے طمع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے، وہ



اپنے دل و دماغ سے یہ باطل تصور نکال دیں کہ وہ مال بطور فدیہ دے کر اور اپنی اولاد سے امداد طلب کر کے اپنے آپ کو جہنم سے بچالیں گے۔



مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (آیہ نمبر ۱۱)

(۱) کہاوت اس کی جو اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو وہ ایک ایسی قوم کی کھیتی پر پڑی جو اپنا ہی برا کرتے تھے تو اسے بالکل مار گئی اور اللہ نے ان پر ظلم نہ کیا وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں، ایسی ہے جیسے ہوا ہوا اس میں سخت ٹھنڈک ہو پہنچے وہ ایک قوم کی کھیتی کو جنہوں نے ظلم کیا اپنی جانوں پر تو فنا کر دے اس (کھیت) کو، اور نہیں ظلم کیا اللہ نے ان پر، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

**شان نزول:** شان نزول میں چند احتمال ہیں۔

(۱) وقيل اراد نفقة ابی سفیان واصحابه ببدر واحدا في معاداة رسول الله“ اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کیا۔

(۲) وقيل اراد نفقة اليهود على علمائهم ورؤسائهم“ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی جو وہ مال اپنے علماء اور رئیسوں پر خرچ کرتے تھے۔

(۳) وقيل اراد نفقات جميع الكفار وصدقائهم في الدنيا“ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تمام کفار کے متعلق نازل ہوئی جو دنیا میں مال خرچ کرتے رہے، اور اپنے خیال میں صدقات کرتے رہے۔

(۴) وقيل اراد نفقة المرائی الذي لا يريد بما ينفق وجه الله“ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو دکھلاوے کے طور پر دنیا میں مال خرچ کرتے رہے، ان کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنا نہیں تھا۔ (خازن)



## مختصر مطلب:

تمام اقوال شان نزول کے جمع ہیں، آئیے ذرا دیکھئے اسی سے مختصر مطلب بھی واضح کیا جاتا ہے، ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کرنے کی مثال، اور یہود و نصاریٰ کے اپنے علماء اور رئیسوں پر مال خرچ کرنے کی مثال، اور عام کفار کے مال خرچ کرنے کی مثال اور لوگوں کا دکھلاوے کے طور پر مال خرچ کرنے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی قوم گناہوں اور مظالم سے اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو ان کی سزا کیلئے ان کی کھیتی پر سخت سرد ہوا یا سخت گرم لو چلے تو ان کی کھیتی برباد ہو جائے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا کوئی ظلم نہیں بلکہ ان کے معاصی و مظالم کی وجہ سے انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا جس کی وجہ سے ان کی کھیتی برباد ہو گئی، ایسے ہی کفار و یہود و نصاریٰ اور ریاء کاروں کا مال خرچ کرنا ضائع چلا جائے، ان کو نفع نہ پہنچائے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا ظلم نہیں، بلکہ ان لوگوں کا خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ہے ”صر“ کے دو معانی ذکر کئے گئے ہیں، ایک یہ ”ان الصرا البرد الشدید“ بیشک ”صر“ کا معنی ہے سخت ٹھنڈک، یعنی ہوا کی مثال جو شدید ٹھنڈی ہو۔ یہ قول اکثر مفسرین اور اہل لغت کا ہے، اسی کے مطابق ایک روایت حضرت ابن عباس کی ہے اور حضرت ابن انباری کا ایک قول یہی ہے، لیکن ان دونوں حضرات نے دوسرا معنی اس کا یہ بیان کیا ہے ”ان الصر هو السموم الحارة التي تقتل“ بیشک ”صر“ وہ گرم لو ہے جو کھیتی کو برباد کر دیتی ہے۔ (خازن)

﴿أَصَابَتْ حَرُّ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ﴾

”وہ پہنچی ایک قوم کی کھیتی کو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔“

(ظلموا انفسہم) الکفر والمعاصی فباؤا بغضب من اللہ وانما وصفوا بذلك لان

الاهلاک عن سخط اشدوا فظع

جس قوم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کفر اور گناہوں کے سبب وہ اللہ کے غضب سے لوٹے، ان کا یہ وصف

بیان کیا کہ ان کی کھیتی کا برباد ہونا اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کی وجہ سے تھا۔

﴿فَاَهْلَكَتْهُ﴾ ”وہ اسے برباد کر دے۔“

طلباء کیلئے: ”اهلکت“ مؤنث کا صیغہ ہے، تاء تانیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کا قاعِل ”ہی“ ضمیر ہے جو دیر کی طرف لوٹ رہی ہے، اور تاء کے بعد ضمیر واحد مذکر کی منصوب متصل ہے جو ”حرث“ کی طرف لوٹ رہی ہے، کہ وہ سخت ٹھنڈی ہوا، یا گرم لو اس کھیتی کو پہنچے تو اس کو برباد کر دے مراد تشبیہ سے یہ ہے کہ جو انہوں نے مال



خرچ کیا وہ سب ضائع ہو گیا، مکمل طور پر برباد ہو گیا سوائے اس کے کہ ان کو نفع کے لوٹنے کی کوئی امید ہو، جس طرح کافروں کی کھیتی کو سخت سرد ہوا یا گرم لو پہنچے تو اس کھیتی کو برباد کر دے ”عقوبة لهم ولم تدع منه اثرا“ ان کی سزا کیلئے اور اس کا نام نشان چھوڑے، اس سے نفع کی امید مکمل ختم ہوگئی، کیونکہ ”فاستأصلته“ ہوانے اسے جڑوں سے اکھیر کر رکھ دیا ہے۔  
(ماخوذ از روح البیان)

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ﴾ ”اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔“

اس کی وجہ ہے کہ انہوں نے جو مال غیر شرعی طور پر خرچ کیا وہ ان کی سزا کیلئے ضائع ہو گیا۔

﴿وَلَكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ ”لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔“

یعنی وہ اپنے کفر اور ریاء کاری کی وجہ سے اپنا مال بے جا خرچ کر کے اپنے مال کو ضائع کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔  
دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

وتقديم المفعول لرعاية الفواصل للتخصيص ”انفسهم“ مفعول ہے جو فعل سے مقدم ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں تخصیص کا معنی نہیں پایا گیا، بلکہ آیات کے آخری الفاظ کو ملانے کیلئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی آخر میں ”الْمُفْلِحُونَ، يَسْجُدُونَ، خَالِدُونَ، يَظْلِمُونَ“ سب الفاظ ایک جیسے آگئے، جو عبارت کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہیں۔  
(ماخوذ از روح البیان)

کافروں کا ان کو نفع کیوں نہیں پہنچائے گا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں کے مال خرچ کرنے میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیاوی منافع کیلئے خرچ کریں، اور دوسرا یہ کہ دینی، اخروی منافع کیلئے مال خرچ کریں۔

”فان كان لمنافع الدنيا لم يبق منه الا البتة في الآخرة في حق المسلم فضلا عن الكافر“

اگر دنیا کے منافع کیلئے مال خرچ کیا جائے تو اس کا اثر آخرت میں مسلمان کے حق میں بھی باقی نہیں رہے گا تو کافر کو یقیناً اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر کافر آخرت کے منافع والے کاموں میں مال خرچ کریں، سرائے بنادیں، پل تعمیر کر دیں، غریبوں، ضعیفوں پر احسان کریں، یتیموں کی پرورش و تربیت کیلئے مال خرچ کریں، بیوہ عورتوں کو مال



دیں، یہ سب کام اگرچہ آخرت میں عظیم نفع کا سبب ہیں، لیکن ان میں ایمان شرط ہے، اگر ایمان نہ ہو تو سب اعمال مکمل طور پر ضائع ہو جائیں گے، جیسا کہ کھیتی کاشت کرنے ولا نفع کثیر کی توقع رکھتا ہے تو اسے سخت ٹھنڈی ہوا یا گرم لو پہنچے تو اسے تباہ و برباد کر دے، سوائے غم اور افسوس کے کوئی چیز باقی نہ رہے۔

ایک اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے:

﴿وَقَلْبِنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنِّ عَمَلٍ فَلَجَعَلْنَاهُ نَبْءًا مِّنْشُورًا﴾ (سورة الفرقان آیت نمبر ۲۳)

”اور جو کچھ انہوں نے کام کئے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک غبار کے بلھرے ہوئے ذرے کر دیا۔“

عمل میں اخلاص ضروری ہے:

فلیسادر العاقل الی الانفاق من ماله والاخلاص فی عملہ “ عقل مند شخص کو چاہئے کہ وہ اپنا مال خرچ کرنے میں جلدی کرے اور اپنے عمل میں اخلاص رکھے، وہی عمل قبول ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا پائی گئی، جس عمل میں دکھلا دیا گیا وہ ضائع چلا جائے گا، کیونکہ وہ عمل صالح بنا ہی نہیں، بلکہ ریاء کاری عذاب کا ذریعہ بنے گی، کیونکہ یہ برے عمل میں داخل ہوگی۔

ریاء کاری سے بے برکتی:

منصور بن عمار رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک مومن جو اللہ کی رضا کی خاطر میرا بھائی بنا ہوا تھا، میرے ساتھ اعتقاد رکھتا تھا، اور وہ خواہ مشکل ہو یا آسانی ہر حال میں میری زیارت کیا کرتا تھا، اور وہ بہت زیادہ عبادت گزار تھا، تہجد ادا کرتا تھا اور روتا رہتا تھا، میں نے چند دن اسے گم پایا (وہ میری زیارت کو نہ آیا) تو میں نے اس کے متعلق پوچھا، تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے، اور بیماری کی وجہ سے کافر کمزور ہو چکا ہے، میں اس کی زیارت اور بیمار پرسی کیلئے اس کے گھر گیا، اس کے دروازہ کو کھٹکھٹایا تو اس کی بچی باہر نکلی، تو اجازت طلب کر کے میں اس کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اسے گھر کے صحن کے درمیان بستر پر لیٹا ہوا پایا، اس کا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا، اور آنکھیں اس کی نیلی ہو چکی تھیں، ہونٹ اس کے سخت ہو گئے تھے، تو میں نے اسے کہا اے میرے بھائی ”لا الہ الا اللہ“ کا روز زیادہ کرو، اس نے آنکھیں کھول کر مجھے غصہ سے سرخ آنکھوں سے دیکھا، پھر اس نے مجھے اسی طرح دیکھا، اور پھر اس نے مجھے اسی حال میں دیکھا، میں نے اسے کہا تم کلمہ کا ذکر کیا کرو، ورنہ میں تمہیں غسل دے کر، کفن پہنا کر دفن کر دوں گا، تمہاری نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔ تو اس نے کہا اے میرے بھائی منصور میرے اور کلمہ کے درمیان کوئی چیز حائل ہو چکی ہے، یعنی میری زبان پر کلمہ جاری نہیں



ہو رہا، میں نے ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم“ پڑھتے ہوئے کہا ”فاین تلک الصلوۃ والصیام والتہجد والقیام“ کہاں ہیں وہ تمہاری نمازیں اور روزے، کہاں ہیں وہ تمہارے تہجد اور دوسرے نوافل؟

”فقال یا اخی کل ذلک کان لغير وجه اللہ الما کنت افعل ذلک لیقال واذکر بہ“

عبادات اللہ کی رضا کے لئے نہیں تھیں، بلکہ ان میں میرا مقصد یہ تھا کہ میرے اعمال کا اور میرا چہ چاہو، اور

لوگ یہ کہیں بڑا نمازی اور تہجد گزار ہے، جب میں گھر میں اکیلا ہوتا تو میں گناہوں میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

ورآوازہ خواہی درالیم فاش بروں حلہ کن دروں حشوباش

اگر تو چاہتا ہے کہ ملک میں تیری تعریف کی جائے تو تو منافقت والا لباس اتار دے

”فلا غرور للعاقل بکثرة الاعمال والاولاد والاموال اذالم تکن لیبۃ صحیحۃ“

جب تک انساب صحیح نہ ہو، اس میں خلوص نہ ہو تو وہ اپنے اعمال کی کثرت اور اولاد کے زیادہ ہونے اور بہت

مال کے ہونے پر ناز نہ کرے اور اس غرور میں نہ رہے کہ یہ چیزیں میرے لئے نفع مند ہیں۔ نفع مند اسی وقت ہیں

جب ایمان اور خلوص پایا گیا۔ خیال رہے جو لوگ آخرت کو ترجیح دیتے ہیں، بلکہ باقی تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف اللہ

تعالیٰ کی رضا و محبت کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں ”فوجدوا الفقر اعز من الغنی والذل الذمن العزۃ

وبذلوا اموالہم وارواحہم فی سبیل اللہ“ وہ فقر کو غنی ہونے سے عزیز سمجھتے ہیں، اور دنیا داروں کے عزت

دینے سے زیادہ وہ دنیا داروں کی طرف دی جانی والی ذلت کو پسند کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے مال اور اپنی جانیں اللہ تعالیٰ

کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہی ملتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ﴿اَلْهٰکُمْ التَّکَاثُرُ﴾ حَتّٰی زُرْتُمْ الْمَقَابِرَ کی تلاوت کی، پھر ارشاد فرمایا۔

”یقول ابن آدم مالی وھل لک من مالک الاما کلت فافنیت اولبتست فابلیت

او تصدقت فامضیت“

انسان کہتا ہے (یہ) میرا مال (ہے) اے انسان تیرا مال تو صرف وہ ہے جو تو نے کھا کر ختم کر لیا، اور تو

نے بہن کر پرانا کر لیا ہے، یا تم نے صدقہ کر کے آخرت کیلئے جاری کر دیا ہے۔

قال ﷺ ﴿یا عائشۃ ان اردت اللھوق بی فلیلفک من الدنیا کزاد الراکب وایاک

ومجالسۃ الاغنیاء ولا تستخلقی ثوبا حتی ترقعیہ“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عائشہ اگر تو میرے ساتھ ملنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو تمہیں اتنا مال کافی ہونا چاہئے جتنا مسافر کو زادراہ

کافی ہوتا ہے، اور اغنیاء کی مجلسوں سے اپنے آپ کو دور رکھو، کسی پڑ۔ کو پرانا نہ سمجھو بلکہ اسے ٹکڑے لگا کر بہن لیا کرو۔



وقال ﷺ اللهم من اجنى فارقه العفاف والكفاف ومن ابغضنى فاكثر ماله وولده“  
نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ”اے اللہ جو میرے ساتھ محبت رکھے اس کو پاکدامنی اور  
قناعت کا رزق عطاء فرما، اور جس نے میرے ساتھ بغض رکھا تو اس کے مال اور اولاد کو زیادہ کر (یعنی  
مال اور اولاد کی زیادتی کی اس کے دل میں حرص رکھ دے۔

نتیجہ واضح ہے:

فقد وقفت ايها العبد على حقيقة الحال وان المال لا يغنى عن المرء شيئا فاعليك  
بالقناعة وتقليل الدنيا ولا تغتر باصحاب الاموال والجاه“

اے انسان جب تو حقیقت مال سے واقف ہو چکا ہے تو یقین کر لے کہ مال انسان کو کسی چیز سے بے  
پرواہ نہیں کر سکتا، تو تو قناعت کو لازم پکڑ، اور دنیا کی قلت (قلیل ہونے) کو لازم پکڑ، لوگوں کے دنیاوی  
مرتبہ اور دنیا کے مال پر دل نہ لپٹا، بس تو رب کا ہو کر اپنے آپ کو یوں سمجھ،  
از پی ذکر و شوق حق مارا در دو عالم دل و زبان بس

اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی ملاقات کے شوق کیلئے ہمیں دونوں جہانوں میں دل اور زبان کافی ہے۔  
وز طعام و لباس اہل جہاں کہنہ دہی و نیم تانی بس

جہاں والوں کے طعام اور لباس کی بنسبت ہمیں پرانی گدڑی اور آدھی روٹی کافی ہے اے انسان تو رب تعالیٰ کی رضا  
کی خاطر کام کر دنیا کو دکھلا دے کیلئے کام نہ کر

زعمرو ای پسر چشم اجرت مدار چو درخانہ زید باشی بکار

اے لڑکے عمرو سے امید اجرت کی نہ رکھ جبکہ تو کام زید کے گھر میں کرتا ہے اے انسان عبادت میں زیادہ سے زیادہ  
کوشش کر بغیر عبادت کے تو رب تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتا  
چہ قدر آورد بندہ خوردیش کہ زیر قبادار داند ام پیش

وہ انسان کیا خوراک حاصل کرے گا جو اپنے جبہ کے نیچے ہاتھ باندھے رکھے۔ (ماخوذ از روح البیان)

اعمال کے ضائع ہونے میں معتزلہ اور اہل سنت کا مذہب:

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ عمل کرنے کے بعد ضائع ہو جاتے ہیں، اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ مجازی طور پر



عمل ضائع ہو جانا ذکر کیا جاتا ہے، حقیقت میں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ معتزلہ نے اس آیہ کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے کہ جس طرح سرد ہوا یا گرم لوکھیتی کو برباد کر دیتی ہے اسی طرح کفر وغیرہ سے عمل ضائع ہو جاتے ہیں، لہذا یوں کہا جائے گا ”انہ لولا الکفر لکان ذلک الانفاق موجباً للمنافع الآخرة وحينئذ يصح القول بالاحباط“ کہ اگر وہ کافر نہ ہوتے تو ان کا مال خرچ کرنا ان کیلئے آخرت میں نفع مند ہوتا، لیکن ان کے کفر نے ان کے مال خرچ کرنے کو ضائع کر دیا، معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انہوں نے کفر کی حالت میں جو مال خرچ کیا ہے وہ حقیقت میں باطل ہو گیا کہ انہوں نے مال خرچ ہی نہیں کیا۔

اہل سنت اس مسئلہ میں یہ کہتے ہیں:

”ان العمل لا يستلزم الثواب الا بحکم الوعد، والوعد من الله مشروط بحصول الايمان، فاذا حصل الكفر ففوات المشروط لفوات شرطه لان ازاله بعد ثبوته“

انسان کو عمل کا ثواب اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ پایا جائے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے، جب ایمان ہی نہیں پائے جائے گا تو ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا، جب ثواب حاصل نہ ہو تو مجازی طور پر کہا جائے کہ اس کا عمل ضائع ہو گیا، اہل سنت کے مذہب میں کافر کا مال خرچ تو ختم نہیں ہوتا البتہ ثواب سے اسے محرومیت رہتی ہے۔

(کبیر)





يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةَ مَن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُوَامَاعِنتُمْ  
فَذَبَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن  
كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۝

(آية نمبر ۱۱۸)

(۱) اے ایمان والو! غیروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے ان کی آرزو ہے جتنی ایذا تمہیں پہنچے پیران کی باتوں سے جھلک اٹھا اور وہ جو سینے میں چھپائے ہیں اور بڑا ہے، ہم نے نشانیاں تمہیں کھول کر سنا دیں اگر تمہیں عقل ہو۔  
(کنز الایمان)

(2) اے ایمان والو نہ بناؤ راز دان اپنوں کے سواء اوروں کو، وہ نہیں کمی کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں اور وہ پسند کرتے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا، تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ان کے مونہوں سے، اور وہ جو چھپائے ہیں اپنے سینوں میں اور بڑا ہے، اور تحقیق ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں نشانیاں تمہارے لئے اگر تم عقل رکھتے ہو۔

(نجوم الفرقان)

**شان نزول:** (۱) شان نزول کے متعلق ایک روایت یہ ہے۔

اخرج ابن اسحق وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم عن ابن عباس قال كان رجال من المسلمين يواصلون رجالا من يهود لما كان بينهم من الجوار والحلف في الجاهلية فانزل الله فيهم ينهاهم عن مبايعتهم تخوف الفتنة عليهم منهم يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ (الاية)

ابن اسحاق اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی کہ مسلمانوں میں سے کچھ حضرات یہودیوں کے پڑوسی تھے، زمانہ جاہلیت میں ان کی آپس میں دوستی تھی کہ ایک دوسرے کے حلیف تھے، اب اسلام لانے کے بعد بھی یہ ان سے میل جول رکھتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرما کر مومنوں کو یہود سے ملنے سے منع کر دیا کہ تم ان کو اپنا راز دار نہ بناؤ ورنہ وہ تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ (مقول از درمنشود)

(۲) واخرج عبد بن حميد وابن جرير وابن ابی حاتم عن مجاهد في الآية قال نزلت في المنافقين من اهل المدينة هي المؤمنین ان يتولوا هم

شان نزول کے متعلق دوسری روایت عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت



مجاہد سے بیان کی ہے کہ اس آیت کریمہ سے مدینہ طیبہ کے منافقوں سے محبت رکھنے سے مؤمنوں کو منع کیا۔

(منقول از درمنثور)

اصل میں کئی مسلمان تو منافقوں کو سمجھ چکے تھے، لیکن بعض مسلمان ان کو مخلص مؤمن سمجھتے تھے، ان کو منع کیا کہ تم ان کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری باتیں یہودیوں تک پہنچاتے ہیں۔

(۳) واخرج ابن حاتم والطبرانی بسند جيد عن حميد بن مهران المالكي الخياط قال سألت ابا غالب عن قوله (يا ايها الذين آمنوا لاتخذوا بطانة من دونكم) الآية. قال حدثني ابو امامة عن رسول الله ﷺ انه قال هم الخوارج

ابن ابی حاتم اور طبرانی نے سند صحیح سے حمید بن مہران مالکی خیاط سے روایت ذکر کی، وہ کہتے ہیں مجھے ابو امامہ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کی ہے کہ اس آیت کریمہ کو نازل کیا گیا ہے کہ خارجیوں سے محبت کرنے اور ان کو اپنا رازدار بنانے سے منع کیا ہے۔

(منقول از درمنثور)

(۴) واخرج عبد بن حميد وابو يعلى وابن جرير وابن ابى حاتم والبيهقي في الشعب عن انس عن النبي ﷺ قال لاتنقشوا في خواتيمكم عربيا ولا تستضيئوا بنار المشركين فذكر ذلك للحسن فقال نعم لاتنقشوا في خواتيمكم محمدا ولا تستشيروا المشركين في شئ من اموركم قال الحسن وتصدق ذلك في كتاب الله يا ايها الذين آمنوا لاتخذوا بطانة من دونكم

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی انگوٹھیوں میں عربی کا نقش نہ کراؤ، اور مشرکوں کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو (صحابہ کرام کے دور کے بعد تابعین کے دور میں) یہ حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر پیش کی گئی، آپ نے فرمایا ہاں حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی انگوٹھیوں پر نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی ”محمد“ نقش نہ کراؤ (عربی ذات سے مراد آپ ہی ہیں، اور دوسری روایات میں واضح طور پر آپ کے نام کو انگوٹھیوں میں نقش کرانے سے منع کیا گیا ہے) اور آپ کے فرمان کہ مشرکوں کی آگ سے روشنی حاصل کرنے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرکوں سے اپنے معاملات میں کسی چیز کے متعلق مشورہ نہ کیا کرو، اس کی تائید کتاب اللہ میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ﴾ (اے ایمان والو تم نہ بناؤ رازدار اپنوں کے سوا غیروں کو) اس روایت کے مطابق مشرکین کو رازدار بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

(منقول از درمنثور)



تمام روایات ہی شان نزول ہیں:

راقم نے نزدیک روایات میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ سب ہی اجتماعی طور پر مراد ہیں، یعنی اے ایمان والو یہود کو منافقین کو، خارجیوں کو، مشرکین کو، غرضیکہ ہر قسم کے کافر کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ (بَطَانَةٌ) وَلِجَّةٌ وَهُوَ الَّذِي يَعْرِفُ الرَّجُلَ اسرارہ ثقہ بہ جو شخص دوسرے کو اپنے راز بتادے اور اس پر بھروسہ کرے، اور اس پر کامل اعتبار کرے، اسے ”بَطَانَةٌ“ اور (وَلِجَّةٌ) کہا جاتا ہے، اصل میں راز دار کو تشبیہ دی گئی ہے کپڑے یعنی استر سے، استر کو بطانہ کہا جاتا ہے اور کپڑے کے ظاہر حصہ کو ”ظہارہ“ کہا جاتا ہے۔ اسی کپڑے کے اندر پہننے والے کپڑے کرتی، بنیان وغیرہ کو ”شعار“ کہا جاتا ہے، اور کپڑے کے اوپر پہننے والے چادر، کوٹ وغیرہ کو ”دثار“ کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انصار کو ”شعار“ سے تشبیہ دی اور عام لوگوں کو ”دثار“ سے آپ نے ارشاد فرمایا ”الانصار شعار والناس دثار“ انصار شعار ہیں، یعنی جگری یار ہیں، اور عام لوگ ”دثار“ ہیں یعنی اوپری یار ہیں۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

خیال رہے کہ ”الناس“ پر الف لام عہد چنی ہے، مہاجرین صحابہ کرام ”دثار“ نہیں، بلکہ وہ ”شعار“ ہی ہیں انصار کی کسی خاص موقع پر تعریف کرتے ہوئے صرف ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ ﴿مِنْ دُونِكُمْ﴾ دون اما بمعنی غیر او بمعنی الادون والدنی ”دُون“ کے دو معنی ہیں۔ ایک بمعنی ”غیر“ کے، اسی کے مطابق واہم نے ترجمہ کیا ہے ”اے ایمان والو تم نہ بناؤ راز دار اپنوں کے سوا غیروں کو“ ”کم“ ضمیر جو مضاف الیہ ہے ”دُون“ کا یہ مؤمنین کی طرف لوٹ رہی ہے، اب واضح طور پر ترجمہ یہ ہوگا ”اے ایمان والو ایمان والوں کے سوا کافروں کو راز دار نہ بناؤ“ ”دون“ کا دوسرا معنی ہے ”گھٹیا“ اب اس صورت میں معنی ہوگا اے ایمان والو اپنے اعلیٰ و اشرف لوگوں کے سوا گھٹیا لوگوں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔

(ماخوذ از روح المعانی)

اس ترجمہ میں بہت ہی حسن و جمال پایا گیا ہے کہ بہت مختصر الفاظ سے مومنوں کی شان بیان ہو گئی کہ وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں، وہی تمہارے اپنے ہیں، اور کافروں کی مذمت بھی پائی گئی کہ وہ گھٹیا ہیں اور وہ تم سے دور ہیں، وہ تمہارے نہیں۔

دینی طلباء کرام کیلئے چند مسائل:

(۱) ﴿مِنْ دُونِكُمْ﴾ ای من دون المسلمین ومن غیر اہل ملتکم ”﴿مِنْ دُونِكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ”مسلمانوں کے سوا“ یا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہب والوں کے سوا دوسرے مذاہب والے، یہ معنی مراد لینا بہت اچھا ہے، کیونکہ اس سے یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو مؤمنین ہی تمہارے اپنے ہیں، وہی تمہارے بھائی ہیں



یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے ”قد احسنتم الینا وانعمتم علینا وهو یرید احسنتم الی اخواننا“ تم نے ہم پر احسان کیا اور تم نے ہم پر انعام کیا، تو اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ تم نے ہمارے بھائیوں پر احسان کیا، یعنی ہمارے بھائیوں پر احسان کرنا ہم پر احسان کرنا ہے، اسی طرح آیہ کریمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مؤمن بھائیوں کو رازدار بنانا غیروں کو رازدار بنانا ہے، وہ راز دوسرے کافروں تک بھی پہنچ جائے گا۔ (کبیر بوضاحت)

(۲) ”لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً“ میں ”بَطَانَةٌ“ نکرہ ہے جو تحت نفی واقع ہے، جو عموم کا فائدہ دے رہا ہے یعنی کسی ایک کافر کو بھی اپنا رازدار نہ بناؤ۔ (کبیر)

(۳) ﴿مِنْ دُونِكُمْ﴾ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ متعلق ہو ”لَا تَتَّخِذُوا“ سے، اب معنوی طور پر عبارت یہ ہو ”لَا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِكُمْ بَطَانَةً“ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ وصف ہو ”بَطَانَةً“ کا اب معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یہ ہو ”لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ“ یہی صورت زیادہ بہتر ہے، کیونکہ جس چیز کا ذکر کرنا اہم ہو، اسے پہلے ذکر کیا جاتا ہے، اس صورت میں نفی رازدار بنانے کی اہم ہے اگرچہ مراد اس سے غیر مذاہب والے ہی ہیں، دوسری صورت میں نفی غیروں کی ہوئی، رازدار بنانے کا ذکر ضمنی طور پر ہو گیا، حالانکہ مقصود رازدار بنانے کی نفی ہے۔ (کبیر)

عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال المرء علی دین خلیلہ فلینظر احدکم من ینخالل (سنن ابی داؤد)  
حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی قائم کر رہا ہے۔ (منقول از قرطبی)

یعنی انسان کو چاہئے کہ مسلمان، نیک، دیندار سے دوستی قائم کرے تاکہ اس کے اچھے اعمال اس پر بھی اثر انداز ہوں، کافر، بے دین شخص سے دوستی قائم نہ کرے تاکہ اسکے برے اعمال اس پر اثر انداز نہ ہوں۔

﴿لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَالًا﴾ (وہ کی نہیں کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں)

(لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَالًا) ای لا یقصرولکم فی الفساد ”وہ کی نہیں کرتے تمہیں فساد پہنچانے میں۔

دینی طلباء کی توجہ کیلئے:

الای، بالو، الو، کا معنی ہے کوتاہی کرنا، کمی کرنا، یہ زیادہ طور پر ایک مفعول سے متعدی ہوتا ہے، اور کبھی دو مفعولوں سے بھی متعدی ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے ”لا آلوک نصحا“ جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے تو



زیادہ طور پر منع یا ”نقص“ کے معنی کو متضمن ہوتا ہے ”لایالوک نصحا“ کا معنی ہے وہ تمہیں نصیحت کرنے سے رکتا نہیں، یا معنی یہ ہوگا وہ تمہیں نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا، تاہم تفسیر والا معنی بھی کبھی دو مفعولوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا علامہ بیضاوی نے ﴿لَا يَأْتُونَكُمُ خَبَالًا﴾ کا ترجمہ کیا ہے ”لایقصرون لکم فسادا“۔ وہ کوئی کمی نہیں چھوڑے تم میں فساد ڈالنے کی۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

”والخبال الفساد واصله ما يلحق الحيوان من جنون فيورثه فسادا واضرا“  
 خبال کا معنی ہے فساد، اصل میں ذی روح چیز کو جو جنون لاحق ہوتا ہے اسے خبال کہا جاتا ہے، چونکہ اس سے فساد اور ضرر پیدا ہوتا ہے اسلئے پھر فساد اور ضرر پر بھی خبال بولا جانے لگا ”مخبول“ اور ”خابل“ ناقص العقل کو کہتے ہیں۔

### حضرت عمرؓ کے درخشندہ فیصلے:

وروی ان اباموسی الاشعری استکتب ذمیا فکتب الیہ عمر یعنفہ وتلا علیہ هذه الآية  
 وقدم ابو موسی الاشعری علی عمر رضی اللہ عنہما بحساب فرلعه الی  
 عمر فاعجبه، وجاء عمر کتابا لفقال لابی موسی این کتابک یقرأ هذا الكتاب علی  
 الناس؟ فقال انه لا یدخل المسجد فقال لم؟ اجنب هو؟ قال انه نصرانی؟ فالتهره وقال  
 لاتدنیهم وقد اقضاهم اللہ ولا تکرهمهم وقد اهانهم اللہ ولا تامنهم وقد خولهم اللہ“

روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک ابو موسی اشعری نے ایک ذمی کو حساب لکھنے پر مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے ان کی طرف خط لکھا ان کو سختی سے منع کیا اور یہی آیت بطور دلیل تلاوت فرمائی۔ حضرت ابو موسیؓ (اس غیر مسلم ذمی کی قابلیت بیان کرنے کے لئے) حضرت عمرؓ کے پاس حساب لیکر آئے اور حضرت عمرؓ کے پاس وہ حساب پیش کیا۔ آپ نے اس حساب پر تعجب کیا حضرت عمر نے ابو موسی سے پوچھا کہ وہ تمہارا کتاب کہاں ہے؟ وہ آکر لوگوں پر یہ لکھا ہو حساب خود پڑھ کر سنائے۔ ابو موسی اشعری نے کہا وہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے پوچھا کیوں داخل نہیں ہو سکتا کیا وہ جہنی ہے؟ حضرت ابو موسی نے کہا وہ نصرانی ہے آپ نے ان کو جہڑکا اور فرمایا ”ان کو قریب نہ کرو“ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تم سے دور کر دیا ہے اور ان کو عزت نہ دو، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر دیا ہے اور ان کو امین نہ سمجھو رب تعالیٰ نے ان کو خائن کہہ دیا ہے۔

وعن عمرؓ قال لاتستمعلوا اهل الكتاب فانهم يستحلون الرشاء واستعينوا علی  
 امورکم وعلی رعیتکم بالذین یخشون اللہ تعالیٰ وقیل لعمر رضی اللہ ان



ههنا رجلا من نصارى الحيرة لا احدا كتب منه ولا اخط بقلم افلا يكتب عنك فقال  
لا اخذ بطانة من دون لامؤمنين فلا يجوز استكتاب اهل الدمة، ولا غير ذلك من  
تصرفاتهم فى البيع والشراء والاستنابة اليهم“

حضرت عمرؓ نے فرمایا اہل کتاب کو کسی کام پر نہ لگاؤ، کیونکہ وہ رشوت کو حلال سمجھتے ہیں، تم اپنے معاملات میں  
اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے امداد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوں، حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ  
یہاں حیرہ کے نصاریٰ میں سے ایک شخص بہت اچھا کاتب ہے، کوئی ایک اس سے اچھا کاتب نہیں، اور کسی کا قلم اس سے  
اچھا نہیں لکھ سکتا، کیا ہم اسے کاتب نہ بنالیں، آپ نے فرمایا میں مومنوں کے سوا کسی ایک کو رازدار نہیں بناتا، ذمیوں کو  
کاتب بنانا جائز نہیں، اور اس کے بغیر خرید و فروخت کے تصرفات ان کیلئے جائز نہیں، اور ان کو نائب بنانا جائز نہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ ”اور وہ پسند کرتے ہیں تمہارا مشقت میں پڑنا۔“

”ود، یود، ودا“ محبت کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”وددته کذا“ ای اجتنہ کذا“ میں فلاں سے اس طرح کی محبت  
کرتا ہوں۔ ”العنت“ شدة الضرر والمشقة ”العنة“ کا معنی ہے ”شدید نقصان پہنچانا اور مشقت میں مبتلاء  
کرنا“ ”ما“ مصدر یہ ہے واقعہ نے ترجمہ مصدری ہی کیا ہے، ”تمہارا مشقت میں پڑنا“ معنوی طور پر تقدیر عبارت کی  
یہ ہوگئی ”احبوا ان يضروكم فى دينكم ودينكم ودينكم ودينكم“ وہ پسند کرتے ہیں تمہارے دین اور تمہاری دنیا  
میں تمہیں شدید نقصان پہنچنے کو ”لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَأٌ لَّا“ اور ”وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ“ میں چند وجہ سے فرق پایا گیا ہے۔

(۱) الاول لا يقصرون فى الفساد دينكم فان عجزوا عنه ودوا للقاءكم فى اشد انواع الضرر“

پہلی وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے دین میں فساد پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، اگر وہ فساد پھیلانے سے عاجز  
آجائیں تو تمہارا شدید میں مشقت پڑنا نہیں پسند آتا ہے۔

(۲) الثالث لا يقصرون فى الفساد اموركم فان لم يفعلوا ذلك لمانع من خارج فحب  
ذلك غير زائل عن قلوبهم“

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے ہر قسم کے معاملات میں فساد پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، اگر کسی خارجی  
مانع کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں تو ان کے دلوں میں تمہیں فساد میں مبتلاء کرنے کی محبت برقرار رہتی ہے وہ زائل نہیں ہوتی۔

(۳) الثالث لا يقصرون فى الفساد اموركم فى الدنيا فاذا عجزوا عنه لم يزل عن قلوبهم



حب اعدائکم

تیسرا وجہ فرق یہ ہے کہ وہ تمہارے دنیاوی امور میں فساد پھیلانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، جب وہ اس سے عاجز آجائیں تو ان کے دلوں میں تمہارا مشقت میں پڑنا پسند آتا ہے، یہ تمنا ان سے زائل نہیں ہوتی۔ (کبیر بتدیم و تاخیر)

”البغضاء“ کا معنی بہت شدید بغض ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”البغض مع البغضاء“ بہت شدید بغض،

(کبیر)

اسی طرح کہا جاتا ”الضر مع الضراء“ بہت زیادہ ضرر۔

”افواہ“ جمع ہے ”فم“ کی ”فم“ اصل میں ”فوه“ ہے، اس پر دلیل ہی ”افواہ“ ہے، کیونکہ جمع تکسیر اور تصغیر اسموں کو اپنے اصل کی طرف لوٹاتی ہے، یہ جمع ایسے ہی ہے جیسے سوط کی جمع اسواط آتی ہے، اور طوق کی جمع اطواق آتی ہے، جب کوئی شخص عمدہ بات کرے تو کہا جاتا ہے ”رجل مفوه“ اور کہا جاتا ہے ”افوه“ جبکہ وہ وسیع منہ والا ہو۔ (کبیر)

بغض ضد ہے محبت کی، مطلب یہ ہے کہ تمہاری عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

”افواہ“ کہا ”السنة“ نہیں کہا کیا وجہ ہے؟

بظاہر عجیب و غریب ہوتا ہے کہ یہ کہا گیا ہے ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (تحقیق بغض ظاہر ہو گیا ان کے مونہوں سے) یہ کیوں نہیں کیا ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَلْسِنَتِهِمْ﴾ کہ ان کی زبانوں سے بغض ظاہر ہو گیا۔

”وخص تعالیٰ الافواہ بالذکر دون الالسنۃ اشارۃ الی تشدقہم و ثلثہم فی اقوالہم ہذہ“

اس کی وجہ یہ ہے منہ کا ذکر کیا، زبان کا نہیں کیا جس سے یہ اشارہ کیا ہے، کہ کافروں کا تمہارے ساتھ بغض صرف زبانوں سے ظاہر نہیں ہو رہا، بلکہ ان کی باجھوں سے بھی بغض بکھر رہا ہے۔ (قرطبی)

❀ نہی النبی ﷺ ان یشتحی الرجل فاہ فی غص اخیه ”معناہ ان یفتح“ نبی کریم ﷺ نے اپنے مومن بھائی کی عزت کے خلاف منہ کھولنے سے منع فرمایا۔

❀ وقال ﷺ ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم میں سے ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ (قرطبی)

اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اور زیادہ واضح ہے ﴿وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا﴾ اور نہ غیبت کرے تمہارا بعض بعض کی۔



## فعل قلبی کے بعد فعل بدنی کا ذکر:

پہلے ذکر فرمایا ﴿وَذُؤَامَا عَنِتُمْ﴾ (وہ پسند کرتے تمہارا مشقت میں پڑتا) اس میں ان کے فعل قلبی (دل کے کام) کا ذکر کیا گیا کہ وہ مؤمنین سے دل میں شدید بغض رکھتے ہیں، اس کے بعد ذکر فرمایا ﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (تحقیق ظاہر ہو گیا بغض ان کے مونہوں سے) اس میں ان کے فعل بدنی کو بیان کیا گیا کہ مؤمنوں کے بغض کو وہ مونہوں سے بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں ”فجمعوا بین کراهة القلوب وبداة اللسن“ یعنی ان میں مؤمنوں کو دلوں سے ناپسند کرنا، اور مؤمنوں کے خلاف فحش کلامی دونوں چیزیں جمع تھیں۔ (البحر المحیط)

ان کی فحش کلامی ان کی باچھوں سے بھی بکھر رہی ہوتی تھی، قرطبی کی ایک عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے، طلباء کرام روح المعانی کی ایک خوبصورت عبارت بھی یاد کر لیں۔

(قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ) ای ظہرت امارات العداوة لكم من فلتات السنتهم  
وفحوى كلماتهم لانهم لشدة بغضهم لكم لا يملكون انفسهم ولا يقدرّون ان  
يحفظوا السنتهم“

(تحقیق ظاہر ہو چکا بغض ان کے مونہوں سے) یعنی تمہاری عداوت کی علامات و نشانیاں ان کی زبانوں کی جان بوجھ کر لغزشوں سے اور ان کے انداز کلام سے ظاہر ہوتی رہتی ہے کیونکہ وہ مؤمنین سے شدید بغض رکھتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر مالک نہیں، اور نہ ہی اپنی زبانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

یعنی مطلب وہی جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ فحش کلامی میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ ان کی زبانوں سے تابڑ توڑ حملے ان کے بس میں نہیں ہوتے، ان کا بیہودہ کلام ان کی باچھوں سے بھی بکھر پڑتا ہے۔

ان کے مونہوں سے بغض کے ظاہر ہونے کے دو مطلب:

(۱) ایک یہ کہ وہ مومنوں کے خلاف باتیں توڑ موڑ کر پیش کرتے جس سے وہ مؤمنوں کے خلاف اپنی باتوں کو پیش کر کے خوش ہوتے، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ آپ ضرور بر ضرور ان کو پہچانو گے ان کی باتوں کی ادائیگی میں۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کافروں سے مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی تکذیب کرتے ہیں اور مؤمنوں کو جاہل اور احمق کہتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)



﴿وَمَا تَخْفَىٰ صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ﴾ ”اور وہ جو چھپائے ہیں اپنے سینوں میں اور بڑا ہے۔“

یعنی وہ جو منافقوں کی زبان پر بغض کی علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ کم ہیں اور ان کے سینوں میں چھپی نفرت بہت بڑی ہے اور ان کی زبانوں سے جو کینہ کی علامات ظاہر ہوتی ہیں وہ کم ہیں اور جو ان کے سینوں میں کینہ چھپا ہوا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ (کبیر)

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ﴾

”تحقیق ہم نے کھول کر بیان کر دی ہے تمہارے لئے نشانیاں اگر تم عقل رکھتے ہو۔“

یعنی ہم نے واضح آیات ذکر فرمادی ہیں، جن میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں سے محبت کرنے سے منع کیا گیا ہے، یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نے واضح آیات ذکر کر دی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنے والے اور ان کے دشمنوں میں تمیز کر رہی ہیں۔ (روح المعانی)

﴿إِن كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ﴾ ”اگر تم عقل رکھتے ہو۔“

یعنی اگر تم صاحب عقل و فہم ہو اور سمجھ رکھتے ہو تو دشمن اور دوست میں فرق محسوس کرو، کافروں کو دشمن سمجھو، اور مؤمنین کو دوست سمجھو، کافروں سے دور ہو جاؤ اور مؤمنوں کے قریب ہو جاؤ، آجکل الٹی گنگا بہہ رہی ہے، مسلمانوں، دینداروں، علماء کا قتل عام کیا جا رہا ہے، یہود و ہنود و نصاریٰ کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالا ہوا ہے۔





هَآأَنتُمْ أَوْلَآءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا الْقُؤُكُمْ  
قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَٰلِيَكُمْ إِلَّا نَامِلًا مِّنَ الْغَيْظِ قُلْ مُؤْتُوا بَعِيْظَكُمْ إِنَّ اللَّهَ  
عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

(آیہ نمبر ۱۱۹)

- (۱) سنتے ہو یہ جو تم ہو تم تو انہیں چاہتے ہو اور وہ تمہیں نہیں چاہتے اور حال یہ کہ تم سب کتابوں پر ایمان لاتے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے تم فرما دو کہ مر جاؤ اپنی گھٹن میں اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات۔ (کنز الایمان)
- (۲) خبردار تم یہ ہو، تم پسند کرتے ہو ان کو اور وہ تمہیں پسند کرتے تمہیں، حالانکہ تم ایمان رکھتے ہو تمام کتابوں پر، اور وہ جب تمہیں ملتے ہیں، کہتے ہیں ہم ایمان لائے، اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو کاٹتے ہیں تم پر (انگلیوں کے) پورے آپ فرما دو مر جاؤ تم حسرت سے، بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔

(نجوم الفرقان)

طلباء کرام پہلے ترکیب دیکھیں پھر مطلب واضح ہوگا:

ترکیب میں چند احتمال ہیں ”ہا“ تنبیہ کیلئے ہے ”انتہم“ مبتداء ہے اور ”اولاء“ پہلی خبر ہے، اور نحو ہم دوسری خبر ہے دوسری ترکیب یہ ہے کہ ”انتہم“ مبتداء ہے، اور ”اولاء“ پھر مبتداء ہے، اور ”تُحِبُّونَهُمْ“ خبر ہے، مبتداء خبر مل کر مکمل جملہ خبر ہے پہلے مبتداء کی ان دونوں صورتوں میں ”اولاء“ اسم اشارہ ہے جو قریب کیلئے استعمال ہے، اب معنی یہ ہو گیا ”خبردار تم یہ ہو تم انہیں پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے“ ایک اور احتمال یہ ہے کہ ”اولاء“ موصول ہو، اور بعد میں آنے والا جملہ صلہ ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”خبردار تم وہ لوگ ہو کہ تم انہیں پسند کرتے ہو اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔“

(ماخوذ از شیخ زادہ)

”ہا“ تنبیہ ذکر کرنے کا فائدہ:

جب کوئی شخص غافل ہو، یا اس کی توجہ کامل نہ ہو متکلم کی طرف تو اسے خواب غفلت سے جگانے کیلئے حرف تنبیہ ذکر کیا جاتا ہے، مؤمنین چونکہ توجہ کی کمی، یعنی غفلت کی وجہ سے منافقوں کو مخلص مؤمن سمجھ کر، ان سے محبت کرتے



اور ان کو راز بتا دیتے، تو رب تعالیٰ نے ”ہا“ تنبیہ سے ان کو بتایا کہ ”ان المخاطبین مخطئون فی اتخاذہم بطانة“ بیشک مؤمنین جن کو خطاب کیا جا رہا ہے وہ کافروں کو دوست اور رازدار بنا کر غلطی کر رہے ہیں، اس غلطی سے ان کو باز رہنا ضروری ہے۔  
(از روح المعانی و شیخ زادہ)

﴿هَآأَنْتُمْ أَوْلَآءُ﴾ میں اشارہ کا فائدہ:

والاشارة للتحقیر فاستعملت هنا للتوبيخ كأنه ازدرى بهم لظهور خطئهم فی ذلك الاتخاذ  
”اولاء“ اشارہ تحقیر کیلئے ہے، لیکن یہاں تو بیخ کیلئے استعمال ہے، یعنی مؤمنین کو کفار سے محبت کرنے سے ڈرایا گیا ہے، اور انکی کفار کے ساتھ دوستی پر ان کی ظاہر خطاء پر عیب لگایا گیا ہے، یہ مکمل مسئلہ صرف ’اولاء‘ سے سمجھ آ گیا، بعد میں آنے والے الفاظ تفسیر بن گئے۔  
(روح المعانی)

**تنبیہ:** صحابہ کرام کی محبت منافقوں سے ان کے کفر کے ظاہر ہونے کے بعد نہیں تھی، بلکہ جب تک ان کا کفر ظاہر نہیں ہوا تھا، ان کو مخلص سمجھ کر محبت کی گئی، یا منافقین اور یہود وغیرہ سے محبت یہ تھی۔

”والمراد بمحبة المؤمنین لهم المحبة العادية الناشئة من نحو الانسان والصدقة“  
مؤمنوں کی ان لوگوں سے دلی محبت، ایمانی محبت نہیں تھی، بلکہ عام عادت کے مطابق جو کسی احسان کرنے والے سے، یا ظاہری طور پر دوستی قائم کرنے والے سے محبت ہوتی ہے، وہی محبت ان سے تھی۔

اس ظاہری اور عام عادت کے مطابق محبت کو بھی رب تعالیٰ نے عجیب و غریب سمجھتے ہوئے مؤمنین کو منع فرمایا کہ تم منافقوں کی چھان بین کیوں نہیں کر رہے، یہود سے زمانہ جاہلیت کے معاہدوں کا پاس کیوں کر رہے ہو وہ معاہدے تو خود بخود ختم ہو گئے، اور وہ تو ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ بِكُمْ رَبِّبَ الْمَنُونِ﴾ تمہارے حوادث اور مصائب و آلام کے منتظر رہتے ہیں، وہ تمہیں کافر بنانے کے درپے ہوتے ہیں (پیچھے لگے رہتے ہیں) اگرچہ اس میں کامیاب تو نہیں ہوتے، لیکن تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی وقت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لہذا تم ان سے ہر وقت محتاط رہو، کہیں ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔  
(از روح المعانی)

﴿هَآأَنْتُمْ أَوْلَآءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ﴾

”خبردار تم یہ ہو کہ تم ان کو پسند کرتے اور وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔“

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:



(۱) احدها قال المفضل (تحبونهم) تريدون الاسلام وهو خير الاشياء (وَلَا يُحِبُّونَكُمْ) لانهم يريدون بقائكم على الكفر ولا شك انه يوجب الهلاك

ان میں ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے جو مفضل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ تم ان کو پسند کرتے ہو، یعنی تم چاہتے ہو کہ وہ اسلام لے آئیں، تم ان کیلئے سب چیزوں سے اعلیٰ چیز پسند کر رہے ہو، لیکن وہ تمہیں پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر بنو، حالانکہ یقینی بات ہے کہ کفر ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔

(۲) الثانی (تُحِبُّونَهُمْ) بسبب ما بینکم وبينهم من الرضاعة والمصاهرة (وَلَا يُحِبُّونَكُمْ) بسبب كونكم مسلمين

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو کہ تمہارے ان سے رشتے قائم ہیں، کوئی ان میں تمہارے دودھ شریکے ہیں، اور بعض خاندانوں کی بعض سے شادیاں ہیں، لیکن وہ رشتہ داری کا پاس نہیں کرتے بلکہ تمہیں مسلمان سمجھ کر تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے۔

(۳) الثالث (تُحِبُّونَهُمْ) بسبب انهم اظهروا لكم الايمان (وَلَا يُحِبُّونَكُمْ) بسبب ان الكفر مستقر في باطنهم

تیسرا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، اس وجہ سے کہ وہ تمہارے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں، لیکن وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے، کیونکہ ان کے دلوں میں کفر مضبوطی سے قرار پکڑے ہوئے ہے۔

(۴) الرابع قال ابو بكر الاصم (تُحِبُّونَهُمْ) بمعنى انكم لا تريدون القاء هم في الآيات والمحن (وَلَا يُحِبُّونَكُمْ) بمعنى انهم يريدون القاءكم في الآفات والمحن ويتربصون بكم الدوائر

چوتھا مطلب جو ابو بکر اصم نے بیان کیا ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، یعنی تم نہیں چاہتے کہ وہ مصائب و آلام میں مبتلا ہو، لیکن وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں کرتے کیونکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم مصائب و آلام میں گرفتار ہو جاؤ، بلکہ وہ تو انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ تمہیں حوادث پہنچیں۔

(۵) الخامس (تُحِبُّونَهُمْ) بسبب انهم يظهرون لكم محبة الرسول ومحبة المحبوب محبوب (وَلَا يُحِبُّونَكُمْ) لانهم يعلمون انكم تحبون الرسول وهم يبغضون الرسول ومحبة المبغوض مبغوض

پانچواں مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اس وجہ سے کہ وہ تمہارے سامنے رسول اللہ ﷺ کی محبت کا اظہار



کرتے ہیں، تم یہ کہتے ہو کہ ہمارے محبوب مصطفیٰ ﷺ سے محبت کرنے والے ہمارے بھی محبوب ہیں، لیکن وہ تم سے محبت نہیں کرتے، اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ تم نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے ہو، وہ حقیقت میں آپ سے بغض رکھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ جس سے ہم بغض رکھتے ہیں اس سے محبت کرنے والوں سے بھی ہم بغض رکھتے ہیں۔

(۶) السادس (نُحِبُّوهُمْ) ای تَخَالِطُونَهُمْ، وَتَفْشُونَ أَسْرَارَهُمْ

امور دینکم (وَلَا يُحِبُّوْكُمْ) ای لَا يَفْعَلُونَ مِثْلَ ذَلِكَ بِكُمْ  
چھٹا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو، یعنی ان سے میل جول رکھتے ہو، اور دینی امور کے راز ان پر ظاہر کر دیتے ہو، لیکن وہ تمہارے ساتھ اس طرح درپیش نہیں آتے۔

تمام وجوہ سے نتیجہ یہی نکلا کہ مؤمن کفار سے محبت کرتے ہیں، لیکن وہ ان سے بغض رکھتے ہیں، اسلئے مومنوں کو بھی چاہئے کہ کفار سے دور ہو جائیں، ان کو اپنا دشمن سمجھیں، ان سے میل جول محبت کرنا، اپنے راز ان پر ظاہر کرنا شدید نقصان دہ ہیں۔

﴿وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ﴾ "حالانکہ تم ایمان رکھتے ہو تمام کتابوں پر۔"

(وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ) ای بجنس الكتب جميعا وهو حال "تفسیر ابی السعود)  
"الكتاب" سے جنس کتاب ہے، لیکن کثرت کو مستلزم ہے، اور جملہ حال ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے دونوں چیزوں کو ترجمہ میں مد نظر رکھا، یعنی حال ہونے اور کثرت کو، اسلئے ترجمہ کیا "اور حال یہ کہ تم سب کتابوں پر ایمان لانے والے ہو" واقعہ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "الكتاب" کو لفظ واحد سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں چند وجہ ہیں ایک یہ کہ یہاں مراد جنس کتاب ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے "كثير الدرهم في ابدى الناس" جنس درہم کی کثرت پائی گئی ہے لوگوں کے ہاتھوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "الكتاب" کو مصدر تسلیم کیا جائے مصدر چونکہ تشبیہ اور جمع بغیر تاویل کے نہیں ہوتا، اسلئے جمع نہیں لایا گیا، تاہم جمع "الكتاب" لانے میں جواز اور وسعت تھی تقدیر الکلام "انکم تؤمنون بکتبہم کلہا" اب تقدیر کلام کے مطابق معنی یہ ہو گیا کہ "بیشک تم تو ان کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو" لیکن وہ تمہارے ساتھ بغض رکھتے ہیں، وہ تمہاری کتاب پر ایمان نہیں رکھتے، باوجود اس کے تم ان سے محبت رکھتے ہو "وفیه توبیخ شدید بانہم فی باطلہم اصلب منکم فی حقکم" اس میں مومنوں کو ڈانٹ دی گئی کہ وہ باطل راہ پر ہونے کے باوجود اپنے نظریات پر بڑی سختی سے جمے ہوئے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے، تمہاری کتاب پر



ایمان نہیں رکھتے، اور ادھر تم ہو کہ حق پر ہونے کے باوجود اتنے نرم ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو۔ (کبیر)

خیال رہے کہ مومنوں کو ان سے محبت رکھنے پر ڈانٹا گیا ہے، ان کی اصلی کتابوں پر ایمان لانے پر ڈانٹ نہیں دی گئی، کیونکہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھنے کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (یعنی ایمان ان لوگوں کا ہی مکمل ہے) جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی۔

### راقم کا موقف:

دائم کے نزدیک ”الکتاب“ پر الف لام جنسی ہے، کثرت کا معنی لینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ زیادہ مناسب معنی یہ ہے ”حالانکہ تم مکمل کتاب پر ایمان رکھتے ہو“ یعنی تمہارا ایمان کامل قرآن پاک پر ہے، جب مکمل قرآن پاک پر ایمان ہو تو یقیناً پہلی تمام آسمانی حقیقی کتب پر ایمان ہوگا یعنی تمہارا مکمل قرآن پر ایمان ہے جو دوسری کتابوں پر ایمان لانا فرض قرار دیتا ہے، لیکن ان کا ایمان قرآن پاک پر نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ محبت نہیں رکھتے۔

﴿وَإِذْ أَلْفَوْكُمْ قَالُوا آمَنَّا﴾ ”اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔“

رب تعالیٰ نے منافقین کا وصف بیان کیا کہ وہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ایمان لایا جیسا کہ تم نے ایمان لایا، اور ہم نے تصدیق کی جیسا کہ تم نے تصدیق کی۔

﴿وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَنْكُمْ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغِيْظِ﴾

”اور جب وہ علیحدہ ہوتے ہیں تم پر (انگلیوں کے) پورے کاٹتے ہیں۔“

یعنی جب مومنوں سے علیحدہ ہوتے ہیں تو عداوت ظاہر کرتے ہیں، اور مومنوں پر شدید غصے میں ہوتے ہیں، اس لئے کہ مومنوں کو ایک دوسرے سے محبت کرتا ہوا دیکھتے ہیں، اور ان کا ایک کلمہ (لا الہ الا اللہ) پر اتفاق دیکھتے ہیں، بلکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے کلام سے بھی اتفاق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کی آپس میں ایک دوسرے سے صلح ہی صلح نظر آتی ہے، تو مومنین پر شدید غصے میں آکر اپنی انگلیوں کے پورے چبانے شروع کر دیتے ہیں۔ ”عض الانامل عبارة عن شدة الغيظ“ پوروں کو کاٹنے سے مراد ہی شدید غصے میں آنا ہے، اگرچہ حقیقی طور پر انگلیوں کو کاٹنا مراد نہیں، بلکہ یہ مجازی طور پر استعمال ہے جیسا کہ کئی مثالیں مجازی معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔ (خازن)



البتہ انسان کبھی شدید غصہ میں ہوتا ہے یا کسی کام پر نادم ہوتا ہے تو وہ انگلیوں کے پورے اپنے دانتوں کے نیچے دباتا ہے، یا اپنے انگوٹھے کو دانتوں کے نیچے دباتا ہے، اسی حالت کا یہاں ذکر کیا گیا۔ (مدارک التذلل للنسفی)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ﴿عَضُّوا عَلَیْكُمْ﴾ کا ترجمہ کیا ہے (تم پرا انگلیاں چبائیں) آپ کا ترجمہ مرادی مقصد کے مطابق ہے، کہ وہ انگلیوں کو دانتوں کے نیچے دباتے تھے، یعنی چباتے تھے، پھر آپ نے ”اَنَامِلَ“ کا ترجمہ انگلیاں کیا ہے، کہ وہ اتنے شدید غصہ میں ہوتے ہیں کہ پہلے تو وہ اپنے انگلیوں کے پورے دانتوں کے نیچے دباتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ وہ پوری انگلیاں ہی اپنے مونہوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ دافہم نے ”عَضُّوا“ کا اور ”اَنَامِلَ“ کا لغوی ترجمہ کیا ہے تا کہ طلباء کرام کو لغوی معنی بھی سمجھ آ جائے، اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مرادی معنی بھی سمجھ آ جائے، لغوی معنی یوں بیان کیا گیا ہے ”العض هو بالاسنان“ (البحر المحیط)

”عض“ کا معنی ہے دانتوں سے کاٹنا ”انامل جمع انملة طرف الاصابع“ انا مل جمع ہے ”انملة“ کی اس کے معنی ہے انگلیوں کی طرفین، یعنی انگلیوں کے پورے۔ (خازن)

﴿قُلْ مُوتُوا بِغِیْظِكُمْ﴾ ”آپ فرما دو تم مر جاؤ حسرت سے۔“

(مِنْ الْغِیْظِ) مَنْ اَجَلُهُ تَأْسَفُو تَحْسُرُ اَحِیْثَ لَمْ یَجِدُوا اِلٰی التَّشْفِیْ سَبِیْلًا (قُلْ مُوتُوا بِغِیْظِكُمْ) دَعَاءُ

عَلِیْهِمْ بَدَوَامِ الْغِیْظِ وَزِیَادَتِهِ بِتَضَاعُفِ قُوَّةِ الْاِسْلَامِ وَاهْلِهِ حَتّٰی یَهْلِكُوْا بِهِ

(وہ تم پر (انگلیوں کے) پورے کاٹتے ہیں) بوجہ افسوس اور حسرت کے وہ اس سے شفا (نکلنے) کی کوئی راہ نہیں پاتے، اس لئے اے محبوب آپ ان کے خلاف دعاء کر دیں کہ تم ہمیشہ اسی حسرت میں رہو، اور تمہاری حسرت بڑھتی چلی جائے، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت میں تو اضافہ ہوتا ہی رہے گا، لہذا تم حسرت میں ہی ہلاک ہو جاؤ۔ (بیضاوی)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ”بیشک اللہ جاننے والا ہے سینوں کی باتوں کو۔“

”ذات“ کا لفظ مؤنث ہے، جیسے ”ذو“ مذکر ہے، جمع مکسر حکم مؤنث میں ہے، اس لئے مطلب یہ ہوگا ”والمراد (بِذَاتِ الصُّدُوْر) الخواطر القائمة بالقلب والدواعی والصوارف الموجودة فیہ“ کہ ”اللہ جاننے والا ہے جو دلوں میں واقع ہونے والے خطرات ہیں، اور دلوں میں ہر قسم کے اسباب اور دلوں کو پھیرنے والے ذرائع کو رب تعالیٰ جانتا ہے۔ یہ چیزیں دلوں کی طرف منسوب ہیں، اس لئے ان کو ”ذَاتِ الصُّدُوْر“ کہا گیا ہے۔



”والمعنى انه تعالى عام بكل ما يحصل في قلوبكم من الخواطر والبواعث والصوارف“

معنی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں واقع ہونے والے خطرات اور اسباب اور دلوں کے پھیرنے والے ذرائع کو جانتا ہے۔  
(کبیر)

دینی مدارس کے طلباء کرام توجہ فرمائیں:

صاحب کشاف نے ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ کے ترکیبی لحاظ پر دو مطالب بیان کئے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ یہ الفاظ مبارکہ ”قُلْ“ کا مقولہ ہیں، یعنی درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا، جیسا کہا جائے ”حامد حافظ عالم کریم“ حامد حافظ ہے اور عالم ہے، اور کریم ہے، ہر عطف اگرچہ بظاہر ذکر نہیں لیکن معتبر ہے اب مطلب یہ ہو گیا، آپ فرمادیں ”مرجاؤ تم اپنی حسرت اور غیظ و غضب میں“ اور آپ فرمادیں بیشک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے، وہ جانتا ہے جب تم ہم سے علیحدہ ہو کر حسرت و پریشانی کی وجہ سے یعنی مومنوں کے بڑھتے ہوئے اتفاق و اتحاد کو دیکھ کر حسد سے جلتے ہوئے اپنی انگلیوں کے پوروں کو منہ میں ڈال کر کاٹ رہے ہوتے ہو۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ”قُلْ“ کا مقولہ نہ ہو۔

”فمعناه قل لهم ذلك يا محمد ولا تتعجب من اطلاعي اياك على ما يسرون فاني

اعلم ما هو اخفى من ذلك وهو ما اضره في صدورهم ولم يظهره بالسنتهم“

اس صورت میں معنی یہ ہے اے رسول (ﷺ)! آپ فرمادیں تم مرجاؤ حسرت سے، اب اس سے آگے

”آپ فرمادیں“ نہیں بلکہ نیا جملہ شروع ہو رہا ہے کہ آپ ان کو جب یہ فرمائیں ”تو میں جو تمہیں ان

کے رازوں پر مطلع کر رہا ہوں تو میں اس سے بھی زیادہ پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ جو انہوں نے اپنے

سینوں میں چھپا رکھا ہے میں اسے بھی جانتا ہوں حالانکہ انہوں نے اسے زبان سے ظاہر نہیں کیا ہوتا۔

(ماخوذ از کبیر)

بِسْمِ اللَّهِ! علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ”ولا تعجب من اطلاعي اياك على

مايسرون“ ”اے میرے حبیب آپ اس پر تعجب نہ کریں جو میں تمہیں ان کے پوشیدہ رازوں پر مطلع کر رہا ہوں

”نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے منافقوں کے دلوں پر مطلع کر دیا، اب بھی آپ کے علم کے کوئی پیمانے سے ناپنے کی

کوشش کرے تو اس کی اپنی بد نصیبی، دوسرا کوئی کیا کر سکتا ہے۔



﴿قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ﴾ میں ایک اور احتمال:

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے دل کو خوش کرنے کیلئے اور قوی امید رکھنے کیلئے ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر خوش ہو جائیں کہ رب تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطاء فرمائی ہے اور کفار و منافقین کو ذلت عطاء کرنی ہے وہ اسی وجہ سے جل جل کر مرجائیں گے، اب صورت میں مطلب یہ ہوگا ”حدث نفسک بذلک“ اے محبوب آپ اپنے نفس سے یہ بات کریں کہ ان کو گویا دل سے یہ کہتے رہیں۔ (کبیر)

اصل میں دو احتمال ہیں کہ ﴿قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ﴾ یا تو دعاء ہو ان کے خلاف، یا خیر ہو ”ان المعنی اخبرهم انهم لا يدركون ما يؤملون“ اس صورت میں معنی ہو گیا کہ اے محبوب آپ ان کو خبر دے دو کہ بیشک وہ نہیں پائیں گے جس کی وہ امید رکھتے ہیں۔ (قرطبی)

تقریباً یہی مطلب ہے جو احتمال کبیر سے پیش کیا گیا ہے۔





إِنْ تَمَسَّكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ  
تَصْبِرُوا وَاتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (آیہ نمبر ۱۲۰)

(۱) تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں برا لگے اور تم کو برائی پہنچے تو اس پر خوش ہوں، اور اگر تم صبر اور  
پرہیزگاری کئے رہو تو ان کا داؤں تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا بیشک ان کے سب کام خدا کے گھرے  
میں ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) اگر تمہیں پہنچے بھلائی تو ان کو غم میں ڈال دے اور اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت تو وہ خوش ہوتے ہیں  
اس پر اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گا ہو جاؤ تو نہیں نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ  
(بھی) بیشک اللہ جو تم عمل کرتے ہو ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (نجوم الفرقان)

### مختصر مطلب:

تقریباً ترجمہ سے ہی واضح ہے، خطاب ہے مومنوں کو ہے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قسم کی  
بھلائی، کسی قسم کے منافع پہنچیں، تو وہ ان کو غم میں مبتلا کر دیتی ہے، اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ منافقین اس پر  
خوش ہوتے ہیں، اے مومنو تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو، اگر تم نے صبر اور تقویٰ اختیار کیا تو ان کا مکر و فریب، ان کی  
چال بازی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی، بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو جو وہ کرتے ہیں احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿إِنْ تَمَسَّكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ﴾ ”اگر پہنچے تمہیں بھلائی تو غم میں ڈالے ان کو۔“

”مس یمس مساً“ کا اصل میں لغوی معنی ”ہاتھ سے چھونا“ ہے، پھر ایک چیز دوسری کو پہنچے تو اسے  
بھی ”مس“ کہتے ہیں ”قال صاحب الکشاف المس ههنا بمعنى الاصابة“ صاحب کشاف نے بیان کیا  
ہے کہ اس مقام میں ”مس“ کا معنی پہنچنا اور پہنچانا ہے۔ ”حسنة“ سے مراد دنیاوی منافع ہیں جو مختلف احوال کے  
مطابق حاصل ہوتے ہیں، جیسے صحت بدن، بارشوں کی وجہ سے سال کا خوشحال ہونا، مال غنیمت کا حاصل ہونا، دشمن پر  
غلبہ حاصل ہونا، اور احباب کے درمیان محبت والفت حاصل ہونا، وغیرہا۔ ”سینة“ ضد ہے ”حسنة“ کی یعنی فقر  
حاصل ہونا، دشمن سے شکست حاصل ہونا، پریشانی کا لاحق ہونا، اقارب کے درمیان اختلاف پیدا ہونا، قتل و غارت



وغیرہ حاصل ہوتا، ساء الشئ یسوء کا معنی قبیح ہونا، یہ ”حسنۃ“ کی ضد ہے۔

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے:

”انہم یحزنون ویغتمون بحصول نوع من انواع الحسنۃ للمسلمین ویفرحون بحصول نوع من انواع السيئة لهم“  
کہ مسلمانوں کو جب کوئی بھلائی پہنچے تو وہ حزن اور غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کو اگر کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔  
(کبیر)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”وجملة الشرط متصلة بالشرط قبل وما بينهما اعتراض والمعنى انهم متناهون في عداوتكم فلم توالونهم فاجتنبواهم“  
یہ جملہ شرطیہ یعنی ”اِنْ تَمَسُّكُمْ الْخ“ متصل ہے پہلے جملہ شرطیہ سے یعنی ”وَإِذَا الْقُوَّةُ الْخ“ سے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے، مطلب یہ ہو گیا ”کہ بیشک وہ تمہاری دشمنی میں انتہاء درجہ تک پہنچے ہوئے ہیں، تم ان سے محبت کیوں کرتے ہو ان سے اجتناب کرو۔“

﴿وَإِنْ تَصْبِرُوا وَاتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾

”اور اگر تم صبر کرو، اور پرہیزگار ہو جاؤ تو نہیں نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا مکر کچھ (بھی)“

واقم نے یہ ترجمہ خازن کی اس عبارت سے لیا ہے:

”وان تصبروا یعنی علی اذا هم وقيل ان تصبروا علی طاعة الله وما ينالك من فيهما من شدة (وتتقوا) ای تخافوا ربكم وقيل وتتقوا ما نهاكم عنه وتوكلوا عليه (لا يضركم) ای لا ينفصمكم (كيدهم) ای عداوتهم ومكرهم (شيئا) ای لانكم في عناية الله وحفظه“  
اور اگر تم صبر کرو ان کی طرف سے تکالیف پہنچانے پر، اور اگر تم صبر کرو اللہ تعالیٰ کی طاعت پر اور اس طاعت میں تکالیف کے پہنچنے پر، اور پرہیزگار ہو جاؤ یعنی اپنے رب سے ڈرو، اور جن چیزوں سے رب تعالیٰ نے تمہیں روکا ہے ان سے بچ جاؤ، اور رب تعالیٰ پر توکل رکھو، تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا ان کی عداوت اور ان کا مکر کچھ بھی، اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عنایت اور حفاظت میں ہو۔

فائدہ: ﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (تمہیں نہیں نقصان پہنچائے گا ان کا مکر کچھ بھی) اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی



حفاظت میں ہو، اس سے رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی، اور ان کی یہ راہنمائی کی ”یستعان علی کید العدو بالصبر والتقویٰ“ کہ دشمن کے مکر و فریب پر صبر اور تقویٰ سے امداد طلب کی۔

”قال الحكماء اذ اردت ان نکبت من یحسدک فازد د فضلا فی نفسک لا یضر کم“  
 حکماء نے بیان کیا ہے کہ اگر تو ارادہ رکھتا ہے کہ اپنے ساتھ حسد کرنے والے کو اپنے راستہ سے ہٹا دے تو تو اپنے نفس میں فضیلت پیدا کر تو وہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (مدارک التنزیل للنفسی)

﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ ”بیشک اللہ جو وہ عمل کرتے ہیں ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔“

”والمعنی محیط جزاؤہ“ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزاء ان کے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے صرف یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزاء عطاء فرمائے گا، بلکہ احاطہ کا ذکر فرمایا ہے، اس کا کیا فائدہ ہے؟ ”وعبر بالاحاطة عن الاطلاع التام والقدرة والسلطان“ احاطہ سے تعبیر کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے اعمال پر کامل علم حاصل ہے، اور اسے ان پر سلطنت حاصل ہے، اور وہ ان کو جزاء دینے پر کامل قادر ہے۔ (البحر المحیط)

**اعتراض:** محیط تو اسے کہتے ہیں جو تمام جوانب (طرفوں) سے احاطہ کرے، یہ صفت اجسام کی ہے، اللہ تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے، تو کس طرح ”محیط“ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے؟

**جواب:** محیط کا مجازی معنی مراد لیا گیا ہے ”انہ تعالیٰ لما کان عالما بكل الاشياء قادر اعلیٰ کل الممكنات جاز فی مجاز اللغة انه محیط بها“ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ جب تمام چیزوں کو جاننے والا ہے، اور تمام ممکنات پر قادر ہے تو مجازی طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”محیط“ باب افعال سے اسم فاعل ہے، اسم فاعل حدوث پر دلالت کرتا ہے، ثبوت پر نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کیلئے جن صفات کا بھی تذکرہ ہوا ان میں دوام و ثبات ہوتا ہے، اسی لئے ﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ میں ”کان“ دوام و استمرار پر دلالت کر رہا ہے، راقم نے اسی لئے اپنے ترجمہ میں دوام کو پیش نظر رکھا، اور ترجمہ یوں کیا ”بیشک اللہ جو وہ عمل کرتے ہیں ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے“ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ ذکر ہوا ﴿إِنَّ اللَّهَ مُحِيطٌ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾ ذکر نہیں کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم چیز کو پہلے ذکر کیا جاتا



ہے، پھر دوسری چیز کو۔

”ولیس المقصود ہنا بیان کونہ تعالیٰ عالمابل بیان ان جمیع اعمالہم معلومۃ للہ تعالیٰ ومجازیہم علیہا فلا جرم قدم ذکر العمل“ (واللہ اعلم)  
مقصد یہاں یہ بیان کرنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے، بلکہ مقصد بیان کرنے کا ان کے اعمال ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال کا علم ہے وہ انہیں جزاء عطاء کرے گا، اس لئے ”عمل“ کو پہلے ذکر کیا، اور احاطہ جو علم پر دلالت کر رہا ہے اسے بعد میں ذکر کیا۔ (کبیر)

**فائدہ:** ”حسنۃ“ کے ساتھ ”مس“ کو ذکر کیا، اور ”سیئۃ“ کے ساتھ ”اصابة“ کو ذکر کیا اس میں کوئی وجہ فرق بھی ہے یا نہیں؟ بعض حضرات نے تو بیان کیا ہے کہ کوئی فرق تو نہیں، عبارت میں حسن و جمال پیدا کرنے کیلئے بطور تفسیر (فنی کمال) ذکر کر دیا ہے، لیکن بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ وجہ فرق جو واضح طور پر سمجھ آرہی ہے اسے بیان کیا جائے، اس انداز ترتیب سے یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ منافق خوش بھی بہت زیادہ ہوتے تھے، اور غمناک بھی بہت زیادہ۔

”لان المس اقل من الاصابة كما هو الظاهر فاذا ساء هم اقل خیرنا لہم فغیرہ اولیٰ منہ، واذا فرحوا باعظم المصائب مما یرئی لہ الشامت ویرق الحاسد فغیرہ اولیٰ فہم لآخر جی موالا لہم اصلا فکیف تتخذولہم بطانۃ“

وجہ اس کی یہ ہے کہ ”مس“ اصابت سے کم ہے یہ تو بالکل ظاہر ہے جب مسلمانوں کو تھوڑی بھلائی سے وہ بہت زیادہ غمناک ہوتے ہیں، تو یقیناً زیادہ بھلائی کے پہنچنے سے تو ان کے غم اور پریشانی میں اور ہی زیادہ اضافہ ہوتا تھا، اور جب مسلمانوں کو زیادہ مشکل درپیش آتی تو وہ اس پر خوش ہوتے تھے تو یقیناً تھوڑی مصیبت پہنچنے پر بھی وہ اسی طرح خوش ہوتے تھے۔ تو اس سے مسلمانوں کو سمجھا دیا گیا کہ وہ تو دوستی کے قابل نہیں، ان کو اپنا راز دار بنانا کس طرح درست ہو سکتا ہے ایک اور وجہ فرق یہ بیان کی گئی۔

”ان ذلک اشارۃ الی ان ما یصیبہم من الخیر بالنسبۃ الی لطف اللہ تعالیٰ معہم خیر قلیل، وما یصیبہم من السیئۃ بالنسبۃ لما یقابل بہ من الاجر الجزیل عظم بعید کما لا ینحفی“

کہ اس ترتیب میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کو بظاہر بھلائی یعنی فوائد دنیاوی کم ہی حاصل ہوتے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت زیادہ ثواب حاصل ہوگا، اور جو ان کو مشکلات پہنچتی ہیں بیشک وہ بظاہر زیادہ اور عظیم نظر آتی ہوں گی،



لیکن ان پر صبر کرنے سے بہت بڑا ثواب رب تعالیٰ نے عطاء فرماتا ہے، یہ وجہ فرق واضح ہے، مخفی نہیں۔ (روح المعانی)  
سبحان اللہ قرآن پاک کیسی عظیم کتاب ہے جس کا ایک ایک جملہ، ایک لفظ کتنے بیش بہا (بہت قیمتی) موتی بکھیر رہا ہے۔  
دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”لا یضرکم“ کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ اسے ”ضاد“ کے کسرہ اور راء کی جزم سے بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں یہ ”ضارہ یضیرہ“ سے لیا جائے گا، البتہ معنی ”ضر یضر“ والا ہی ہوگا۔ (روح المعانی)



وَاذْغَلَوْتُمْ مِنْ أَهْلِكُمْ بُيُوتَ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (آیہ نمبر ۱۲۱)

(۱) اور یاد کرو اے محبوب جب تم صبح کو اپنے دولت خانہ سے برآمد ہوئے مسلمانوں کو لڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) اور یاد کرو جب آپ صبح نکلے اپنی اہل سے، آپ قائم کر رہے تھے مؤمنوں کو مقام قتال میں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

## شان نزول:

اگرچہ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیہ کریمہ بدر کے واقعہ پر نازل ہوئی، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیہ کریمہ غزوہ خندق کے متعلق نازل ہوئی، لیکن جمہور مفسرین کرام کا قول یہ ہے کہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی اسی پر زیادہ وثوق اختیار کیا گیا۔ (قرطبی)

جب بدر کو قریش کے سرکردہ لوگوں کو قتل کر کے ان کا ایک اکنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا، باقی کفار جب شکست حاصل ہونے کے بعد مکہ میں پہنچے تو بدر میں جو لوگ قتل کر دئے گئے ان کے بیٹے ابوسفیان کے پاس جمع ہو کر کہنے لگے کہ ہمیں بدر کا انتقام لینا چاہئے، ابوسفیان کے پاس آنے والے عکرمہ بن ابی جہل اور عبداللہ بن ابی ربیعہ اور صفوان بن امیہ تھے ان دنوں میں ہی قریش کو کافی تجارتی نفع ہو چکا تھا (جس کا ذکر قریب ہی بدر کے واقعہ میں ان



شاء اللہ آجائے گا) یہ لوگ کہنے لگے۔

”یا معشر قریش ان محمد اقدو ترکم وقتل اخبارکم فاعینونا بهذا المال علی حربہ  
ثارنا بمن اصاب منافعلوا“

اے قریش کے قبیلے! بیشک محمد نے تمہیں برباد کر کے رکھ دیا، اور تمہارے بھائیوں کو قتل کر دیا، یہ تجارتی نفع والا تمام مال ہمیں دے دیں تاکہ ہم محمد اور اس کے ساتھیوں سے جنگ کر کے بدلہ لیں، قریش نے وہ تمام مال ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو دے دیا جو مسلمانوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے، ابوسفیان کی زیر قیادت قریش کا لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تیار کر لیا گیا لشکر کے ساتھ ابوسفیان کی زوجہ ہند بنت عتبہ بھی تھی، اور بھی قریش کی عورتیں ساتھ تھیں، جو لشکر کا گانا گا کر جوش دلارہی تھیں، ان کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے اور بھی ہر قسم کا جنگی سامان، افر مقدار میں ان کے پاس موجود تھا یہ لوگ مدینہ طیبہ کے مقابل بطن سبخہ میں ایک پہاڑ کے پاس اتر گئے۔

❁ قال رسول اللہ ﷺ انی رأیت بقرا تسحر و رأیت فی ذباب سیفی للما و رأیت انی ادخلت یدی فی درع حصینة فاولتها المدینة“

نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا، آپ فرماتے ہیں میں نے گائے کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا، اور میں نے اپنی تلوار کو دیکھا کہ اس میں دندائے پڑ گئے، اور میں نے دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اپنی مضبوط زرہ میں داخل کر لیا، اس کی تعبیر میں نے مدینہ طیبہ لی ہے۔

”وعبرا ذبح البقرة بلمح اناس من اصحابه والتم الذي بلباب سيفه بقتل رجل من اهل بيته“  
نبی کریم ﷺ نے گائے کے ذبح کئے جانے سے اشارہ کیا کہ کچھ صحابہ کرام شہید کر دئے جائیں گے، اور تلوار کے کند ہونے اور اس میں دندائے پڑ جانے سے اشارہ کیا کہ آپ کے اہل بیت میں سے کسی شخص کو شہید کر دیا جائے گا، ایسا ہی ہوا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کا مشورہ:

آپ نے صحابہ کرام کو مشورہ کیلئے طلب کر لیا، اس مشورہ میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی بن سلول کو بھی طلب کر لیا گیا تھا، نبی کریم ﷺ نے اپنی رائے یہ بیان فرمائی۔

”فان رأیتم ان تقیموا بالمدینة وتدعوهم حیث نزلوا فان اقاموا اقاموا ابشر مقام وان هم دخلوا علینا قاتلناهم فیہا“

اگر تم مدینہ میں ہی رہو تو بہتر ہے، ان کو چھوڑ دو، وہ جہاں بھی اترے ہیں ٹھیک ہے، وہ جہاں ٹھہریں گے



وہی مقام ان کیلئے شہر ہوگا اگر انہوں نے ہم پر (مدینہ طیبہ میں) حملہ کیا تو ہم ان سے قتال کریں گے، نبی کریم ﷺ کی رائے کو عبداللہ بن ابی بن سلول نے بھی پسند کیا، وہ بھی چاہتا تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے، نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کو نا پسند فرما رہے تھے، آپ کا موقف یہ تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنی چاہئے۔

”فقال رجال من المسلمين ممن اكرمه الله تعالى بالشهادة يوم احد وغيرهم ممن كان فاته يوم بدر اخرج بنا يا رسول الله الى اعدائنا لا يرون انا جئنا عنهم وضعفنا“

لیکن وہ صحابہ کرام جن کو شہادت سے احد کے دن رب تعالیٰ نے مکرم کرنا تھا اور کچھ دوسرے صحابہ کرام جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان تمام کا مطالبہ یہ تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمیں دشمن کے مقابل لے چلیں، کبھی بھی ہمارا دشمن ہمیں بزدل اور کمزور نہیں پائے گا۔ ادھر عبداللہ بن ابی بن سلول بار بار زور دے رہا تھا کہ ہمیں مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاع کرنا چاہئے، باہر نہیں نکلنا چاہئے، یہ اپنے دلائل قائم کر رہا تھا، اور کہہ رہا تھا۔

يا رسول الله اقم بالمدينة لا تخرج اليهم فوالله ما خرجنا منها الى عدو لنا قط الا اصاب منا ولا دخل علينا الا اصابنا منه“

یا رسول اللہ ﷺ آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہیں۔ باہر جنگ کیلئے نہ جائیں، کیونکہ ہم نے جب بھی باہر نکل کر جنگ کی دشمن نے ہم پر غلبہ پایا، اور جب ہم نے شہر میں رہ کر دفاع کیا تو ہم نے غلبہ پایا۔

لیکن یہ دلیل اس کی بہت کمزور تھی کیونکہ بدر میں نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر جنگ کی تھی اور وہ غلبہ حاصل کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہاں البتہ یہاں اس کی رائے کو اس لئے قوت حاصل تھی کہ اس کی رائے نبی کریم ﷺ کی رائے سے ملتی تھی۔ لیکن شہادت کے مشتاق حضرات بار بار دشمن کے مقابل جنگ کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے باہر نکلنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

”دخل رسول الله فلبس لامة حربيه وذلك يوم الجمعة حين فرغ من الصلوة ثم خرج عليهم“

نبی کریم ﷺ گھر تشریف لے گئے اور جنگی اسلحہ زیب تن کیا (یعنی تلوار کو گلے میں لٹکایا، زره پہنی، نیزہ ہاتھ میں لیا) یہ جمعہ کا دن تھا، آپ نماز جمعہ سے جب فارغ ہوئے تو گھر جا کر اسلحہ زیب تن کر کے ان کے پاس تشریف لے آئے۔

”وقد ندم الناس وقالوا استكرهنا رسول الله ﷺ ولم يكن لنا ذلك فان شئت فاقعد ﷺ“

نبی کریم ﷺ کو اسلحہ زیب تن کئے ہوئے تشریف لانے پر لوگ پشیمان ہو گئے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو اس حال



میں نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ حالانکہ ہمیں یہ حق حاصل نہ تھا۔ اب تمام حضرات مؤدبانہ طور پر عرض کر رہے تھے یا رسول اللہ اگر آپ یہاں ہی تشریف رکھنا چاہتے ہیں تو آپ یہی بیٹھ جائیں، باہر نہ نکلیں۔

”لَقَالَ ﷺ مَا يَنْبَغِي لَنَبِيٍّ إِذَا بُسِّ لَامَتَهُ أَنْ يَضَعَهَا حَتَّى يُقَاتِلَ فُخْرَجَ ﷺ بِالْفِ مِّنْ أَصْحَابِهِ“  
نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نبی کی شان کے لائق یہ نہیں کہ اسلحہ زیب تن کر کے پھراتا روئے یہاں تک کہ وہ جہاد کرے، تو نبی کریم ﷺ اپنے ساتھ ایک ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر احد کی طرف تشریف لے گئے۔ احد کا واقعہ شوال ۳ھ میں درپیش آیا۔

عبداللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سوساتھیوں سمیت لوٹ آیا۔ اب نبی کریم ﷺ کے ساتھ سات سوا فرادہ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے احد پہاڑ کے درہ پر حضرت عبداللہ بن جبیر کو کھڑا کیا اور ان کے ساتھ پچاس آدمی کھڑے کئے۔ آپ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ تم نے یہاں ہی ٹھہرنا ہے، تاکہ وہ ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کر دیں، اور ساتھ ہی یہ فرمایا ”ان كان علينا اولنا فالتبت مكانك“ کہ جنگ خواہ ہمارے مخالف ہو یا موافق ہو تم نے یہی ٹھہرنا ہے، تاکہ تمہاری جانب سے آکر وہ حملہ نہ کر دیں۔ احد کے دن نبی کریم ﷺ دوزرہ استعمال فرما رہے تھے۔ جھنڈا آپ نے مصعب بن عمیر کو دیا۔ احد میں صحابہ کرام کو فتح حاصل ہو گئی، مال غنیمت جمع کرنا شروع کیا، تو جو صحابہ کرام حضرت عبد اللہ بن جبیر کی زیر قیادت درہ پر مقرر کئے گئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ باقی حضرات مال غنیمت جمع کر رہے ہیں ہم رہ رہے ہیں

”وَجَعَلُوا يَنْسَلُونَ رَجُلًا فَرَجُلًا حَتَّى اخْلَوْا مِرَاكِزَهُمْ وَلَمْ يَبْقَ مَعَ عَبْدِ اللَّهِ سِوَى النَّبِيِّ“  
عشر رجلا مع ابصاء رسول الله ﷺ بشئونهم مكانهم“

لیکن ان حضرات نے درہ کو چھوڑنا شروع کر دیا، ایک ایک اس سے ہٹا رہا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اس مرکز کو خالی کر دیا جس میں انہیں کھڑا کیا گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن جبیر ﷺ کے ساتھ صرف بارہ آدمی رہ گئے تھے کہ ہم یہاں ہی کھڑے رہیں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہاں کھڑے رہنے کا حکم فرمایا۔

کفار نے جب درہ خالی پایا تو اس جانب سے حملہ کر دیا، جنگ کا نقشہ بدل گیا، ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، بہت زیادہ تعداد میں شدید زخمی ہو گئے، خود نبی ﷺ بھی زخمی ہو گئے، آپ کے دانت مبارک کا کچھ حصہ شہید ہو گیا، سر اور چہرے پر زخم آئے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

خیال رہے کہ درہ کے چھوڑے میں صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی، جن حضرات نے درہ کو چھوڑا ان کا اجتہاد یہ تھا کہ اب مکمل فتح ہو چکی ہے، اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں، اور جو حضرات وہاں قائم رہے ان کا موقف یہ تھا



کہ جب تک نبی کریم ﷺ یہاں سے ہٹنے کا حکم نہیں دیں گے اس وقت تک ہمارا یہاں کھڑے رہنا ضروری ہے، احد کا واقعہ تیسرے پارہ میں بیان کر دیا گیا، یہاں تو آیہ کریمہ کا شان نزول بیان کرنے کیلئے مفسرین کرام نے جن چیزوں کو دوبارہ ذکر کیا وہ ذکر کر دی گئیں۔

آیہ کریمہ کے الفاظ مبارکہ کے متعلق:

واذ غدوت "ای واذا کراذخروجت غدوة" اور یاد کرو جب تم صبح نکلے "من اهلك" من عند اهلك وکان الخروج من حجرة عائشة رضی اللہ عنہا "اپنی اہل کے گھر سے، آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے نکل کر غزوہ میں تشریف لے گئے تھے یہ ہفتہ کے دن کے صبح تھی، اور جب آپ ہتھیار زیب تن کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے باہر تشریف لائے تھے وہ ہفتہ کے دن کی صبح تھی۔ خیال رہے کہ اگر "غدوت" بمعنی "صرت" کے ہو جائے تو دونوں وقتوں کو شامل ہو جائے گا، اب معنی صرف یہ ہو گا جب آپ ہو گئے نکلنے والے اپنی اہل کے گھر سے، یعنی ہتھیار زیب تن کر کے آپ نکلے، پھر صبح جنگ کیلئے نکلے۔

**فائدہ:** رب تعالیٰ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا کہ "کافروں کا مکر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا" لیکن اس کے ساتھ شرط یہ رکھی کی "اگر تم نے صبر کیا اور پرہیزگاری اختیار کی" غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی کیونکہ وہ میدان میں جھے رہے، میدان چھوڑ کر بھاگے نہیں، ابتدائی طور پر اچانک حملہ میں کچھ پسپا ہونے کا نام وہ فرار نہیں تھا جس کی مذمت احادیث میں آئی ہوئی ہے، شہادت حاصل ہونا عظیم کامیابی تھی، لیکن منافقین کی نظر میں مسلمانوں کا ظاہری نقصان (معاذ اللہ) شکست تھا، اس آیہ کریمہ میں ضمنیہ مسئلہ بھی بتا دیا کہ "اے محبوب آپ صبح جنگ کیلئے گھر سے جب نکلے" یعنی آپ کی رائے کے خلاف کچھ حضرات نے مدینہ طیبہ میں رہنے کیلئے صبر نہیں کیا، اور باہر سے پرہیز نہیں کیا تو ظاہری طور پر کچھ کالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

﴿تَبَوُّى الْمُؤْمِنِينَ﴾ "ای توطنہم"

(۱) آپ مؤمنوں کو مقام قتال ٹھہرنے کی جگہ عطاء کر رہے تھے۔

(۲) "وقیل تنزلہم" اور معنی یہ بیان کیا گیا کہ آپ مؤمنوں کو مقام قتال میں اتار رہے تھے۔

(۳) "قیل نسوی لہم" اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ مؤمنوں کی صفوں کو میدان قتال میں برابر کر رہے تھے۔



(۴) ”قيل تهنئي لهم“ اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ مومنوں کو مقام قتال میں جہاد کیلئے تیار کر رہے تھے۔  
(روح المعانی)

”مقامات لڑائی میں۔“

﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾

(مقاعد) ای موطن مواقف و مقامات له ”مقاعد“ کا معنی ٹھہرنے کی جگہ، رکنے کی جگہ، اور قائم ہونگی جگہ، ”قتال“ کا معنی جنگ لڑائی، اب ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ کا معنی یہ ہو گیا ”آپ قائم کر رہے تھے مومنوں کو مقامات جنگ میں“ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا مرادی ترجمہ بہت ہی خوبصورت ہے ”مسلمانوں کو لڑائی کے مورچوں پر قائم کرتے۔“

”اور اللہ سننے والا ہے۔“

﴿وَاللَّهُ سَمِيعٌ﴾

یعنی تمام سنی جانے والی چیزوں کو سننے والا ہے، اور اس غزوہ میں کی جانے والی باتوں کو بھی سننے والے ہیں۔

﴿عَلِيمٌ﴾ ”جاننے والا ہے۔“

یعنی تمام باتیں جو علم میں آنے والی ہیں ان تمام کو جاننے والا ہے، اس غزوہ میں لوگوں کے دلوں میں پائی جانے والی تمام باتوں اور رازوں کو جاننے والا ہے۔

**فائدہ جلیلہ:** قوله (وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ) بروی انہ **عند** غدامن منزل عائشة رضی اللہ عنہا فمشی علی رجلہ الی احدہذا قول مجاہد الواقدي فدل هذا النص علی ان عائشة رضی اللہ عنہا کانت اہل النبی **ع** وقال تعالیٰ (الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ) فدل هذا النص علی انہا کانت مطہرة مبراة عن کل قبیح الاثری ان ولد نوح لما کان کافرا قال (انہ لیس من اہلک) وكذلك امرأۃ لوط (کیں) آیت کریمہ میں ”اہل“ سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ نبی کریم **ع** صبح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے پیدل ہی احد کی طرف تشریف لے گئے (یہی قول مجاہد اور واقدی کا ہے اس آیت کریمہ سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم **ع** کی اہل ہیں۔

اور دوسری آیت کریمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے ﴿الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ (پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کیلئے ہیں) کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاکیزہ اور ہر عیب اور



برائی سے پاک تھیں، خاص کر کے اس پر اور دلیل دلالت کر رہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا، تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ بیشک وہ تمہاری اہل سے نہیں اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿لَنْ نَجِيَّهٖ وَأَهْلَهُ إِلَّا مَوَاتَهُ﴾ فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا ہم جانتے ہیں اس بستی میں کون ہیں ”ہم اس (لوط) کو اور اس کی اہل کو ضرور بر ضرور نجات دیں گے سوائے ان کی عورت کے“ یہاں بھی لوط علیہ السلام کی کافرہ عورت کو آپ کی اہل سے نکال دیا کہ وہ آپ کی اہل سے نہیں۔



إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۲۲)

(۱) جب تم میں کے دو گروہوں کا ارادہ ہوا کہ نامردی کر جائیں اور اللہ ان کا سنبھالنے والا ہے، اور مسلمانوں کو اللہ پر ہی بھروسہ چاہئے۔ (کنز الایمان)

(۲) جب ارادہ کیا دو گروہوں نے تم میں سے بزدلی کا، حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے، اور اللہ پر ہی چاہئے کہ مؤمنین توکل رکھیں۔ (نجوم الفرقان)

## شان نزول:

إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا ”ای تجبنوا وتضعفوا وتتخلفا“ والطائفتان بنو سلمة من الخزرج وبنو حارثة من الاوس وکانا جناحی العسکر وذلک ان رسول اللہ ﷺ اخرج الی احد فی الف رجل وقیل فی تسعمائة رجلا، فلما بلغوا الشوط اتخذ عبد اللہ بن ابی بثلث الناس ورجع فی ثلاث مائة وقال علام تقتل انفسنا واولادنا؟ فتبعهم ابو جابر السلمی فقال انشدکم باللہ فی نیکم وفی انفسکم، فقال عبد اللہ بن ابی ”لو تعلم قتالا لاتبعناکم“ وهمت بنو سلمة وبنو حارثة بالانصراف مع عبد اللہ بن ابی، فعصمهم اللہ فلم ينصرفوا فادکرهم اللہ عظیم نعمته“

”فشل“ کا معنی بزدلی، ضعف، اور پیچھے رہ جانا“ اب مطلب یہ ہوا کہ جب ارادہ کیا دو گروہوں نے تم میں سے بزدلی کا، اور انہوں نے کمزوری دکھائی، پیچھے لوٹ جانے کا ارادہ کیا“ دو گروہوں سے مراد خزرج سے بنو سلمہ،



اور اس سے بنو حارثہ، یہ دونوں گروہ نبی کریم ﷺ کے لشکر کے بازو تھے، نبی کریم ﷺ ایک ہزار اور ساڑھے نو سو کے درمیان لشکر کو لے کر احد کی طرف تشریف لے گئے، احد کے قریب مقام شوط میں جب پہنچے تو عبداللہ بن ابی نے لشکر کا تہائی حصہ یعنی تین سو جو اس کے ساتھ لوگ تھے کو ساتھ لیا اور واپس لوٹ پڑا، اور کہہ رہا تھا کہ ہم کس وجہ سے اپنی جانوں اور اپنی اولاد کو قتل کرائیں، ابو جابر سلمیٰ ان کے پیچھے آئے، ان کو رب تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہا کہ تم نبی کریم ﷺ سے پیچھے ہٹ کر آپ کو اور اپنی جانوں کو تکلیف میں نہ ڈالو، لیکن عبداللہ بن ابی یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہمیں جنگ کرنے کا طریقہ آتا تو ہم ضرور جنگ کرتے، ہمیں تو لڑنا آتا ہی نہیں، جب وہ اور اس کے ساتھی واپس لوٹ آئے، تو بنو سلمہ اور بنو حارثہ نے بھی عبداللہ بن ابی کے ساتھ لوٹ جانے کا ارادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا، وہ واپس نہ لوٹے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرما کر ان کو اپنی عظیم نعمت کی یاد دلائی کہ رب تعالیٰ کا تم پر خصوصی فضل و کرم ہوا کہ اس نے تمہیں واپس لوٹنے سے بچا لیا، اور تمہارا ایمان سلامت رہا۔

(معالم التنزیل للبغوی)

”حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے۔“

﴿وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا﴾

”واللہ ولیہما“ ناصر ہما و حافظہما اور اللہ ان دونوں کا محافظ ہے اور مددگار ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور البحر المحیط:

واللہ ولیہما معنی الولاية الثبیت والنصر“ ولایۃ کا معنی ہے ثابت رکھ دیا اور مدد کرنا۔ (البحر المحیط)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ”الثبیت“ والا ترجمہ کیا ہے ”اور اللہ ان کا سنبھالنے

والا ہے“ اور راقم نے ”النصر“ والا ترجمہ کیا ہے ”حالانکہ اللہ ان کا مددگار ہے“ اور راقم نے حال والا معنی روح المعانی

سے لیا ”وجوز ان تكون حالا من فاعل“ اس جملہ کو فاعل سے حال بنانا جائز رکھا گیا ہے۔

عن جابر قال نزلت فینا اذہمت طائفتان منکم ان تفشلا واللہ ولیہما قال لحن الطائفتان

بنو حارثہ و بنو سلمة و ما یسر لی انہا لم تنزل لقول اللہ واللہ ولیہما“ (بخاری و مسلم)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ﴿اِذْهَمْتُ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ

وَلِيَهُمَا﴾ ہمارے متعلق نازل ہوئی مجھے یہ بات خوش نہیں لگی کہ یہ آیت کریمہ ہمارے متعلق نازل نہ ہوتی، کیونکہ آیت

کریمہ میں ”وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا“ آیا ہوا ہے۔ اس حدیث پاک میں بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت



میں لیا، ان کی مدد کی اور ان کو ثابت قدم رکھا یہ ان کے اعلیٰ مقام کا ذکر کیا کہ ان کو رب تعالیٰ نے شرافت عظیمہ عطاء کی، آیت کریمہ میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ”وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا“ یعنی دو گروہوں نے اگرچہ بزدلی کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت میں لے کر واپس لوٹنے سے روک لیا۔ (خازن)

**اعتراض:** ”الہم“ کا معنی ہے ”عزم“ آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دو گروہوں نے بزدلی کا اور واپس لوٹنے کا عزم کر لیا تھا ”وَذَلِكْ مَعْصِيَةُ فَكَيْفَ مَدَحَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰی بِقَوْلِهِ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا“ جہاد سے منہ پھیرنے کا عزم معصیت ہے۔ یہ تو رب تعالیٰ نے ان کی کیسے تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا ”وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا“

**جواب:** ”الہم“ کے دو معنی ہیں، ایک ”عزم“ اور دوسرا ”حدیث النفس“ کسی چیز کا دل میں واقع ہونا پختہ ارادہ نہ کرنا، اس لئے یہاں ”الہم“ کا معنی ”حدیث النفس“ لینا ہی بہتر ہے۔ ”وَاللّٰهُ تَعَالٰی لَا يُوَٰخِذُ بِحَدِيثِ النَّفْسِ“ اللہ تعالیٰ دل میں واقع ہونے والے ارادہ یعنی قصد پر گرفت نہیں فرماتا، اس کی گرفت عزم پر ہوتی ہے، جس میں پختہ ارادہ پایا جائے اور کام کے اسباب میں بڑی کوشش پائی جائے۔

❦ قال ابن عباس انهم اضروا ان يرجعوا فلما عزم الله لهم على الرشد ولبتوامع رسول

الله ﷻ مدحهم الله تعالى بقوله والله وليهما

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک ان لوگوں نے دل میں پوشیدہ رکھا کہ ہمیں بھی واپس لوٹ جانا چاہئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بھلائی عطاء فرمادی اور ان کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رکھا، تو رب تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی اپنے اس قول سے ”وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا“ اللہ ان کا مددگار ہے، وہی ان کو ثابت قدم رکھنے والا ہے۔ (خازن)

مراتب القصد خمس ما جس ذكروا فخطا فحديث النفس فاستمعوا

بليهم فمعزم كلها رفعت سوى الاخير ففيه الاخذ قد وقعوا

ارادہ کے مراتب پانچ ہیں، ایک ما جس ذکر کیا گیا ہے اور دوسرا خاطر، اور تیسرا حدیث النفس دل میں واقع ہونے والی اشیاء، اور چوتھا، اس کے ساتھ متصل ”ہم“ ہے، اور اس کے بعد پانچوں عزم ہے، کسی میں بھی گرفت نہیں، سوائے عزم کے، عزم میں گرفت ہے۔ (صادی)

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ ”اور اللہ پر ہی چاہئے کہ تو کل رکھیں ایمان والے۔“

”توکل“ کا وزن ہے ”تفعل“ جب کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد کرے اور اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد



کردے، اس وقت کہا جاتا ہے ”وکل امرہ الی غیرہ“ اس نے اپنا معاملہ غیر کے سپرد کر دیا ”والتوکل هو العجز والاعتماد علی الغیر“ توکل کا معنی یہ ہے کہ خود عاجز ہو اور غیر پر اعتماد کرے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”وَعَلَى اللَّهِ“ جار و مجرور، ظرف ہیں، ظرف کی تقدیم حصر پر دلالت کر رہی ہے، مطلب یہ ہوا ”فامر اللہ عبادہ المؤمنین ان لا یتوکلوا وان لا یفوضوا امرہم الا الیہ“ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، اور اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کریں اور اسی کے حسن تدبیر پر اعتماد کریں۔ (خازن) صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا مسئلہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی بحث میں نجوم الفرقان کی جلد اول میں دیکھیں۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢٣﴾ (آیت نمبر ۱۲۳)

(۱) اور بیشک اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب تم بالکل بے سروسامان تھے تو اللہ سے ڈرو کہیں تم شکر گزار ہو۔ (کنز الایمان)

(۲) اور تحقیق امداد کی تمہاری اللہ نے بدر میں، حالانکہ تم بالکل بے سروسامان تھے، تو اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

سب سے پہلے راقم کی ”تسکین الجنان“ کا ایک ورق دیکھئے:

﴿وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾

تم کمزور تھے۔	(محمود الحسن صاحب)
حالانکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے۔	(موردی صاحب)
حالانکہ تم پست تھے۔	(عبد الماجد دریا آبادی صاحب)
اور تھے تم ذلیل۔	(شاہ رفیع الدین صاحب)
تم بالکل بے سروسامان تھے۔	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ لِقَلَّةِ الْعَدَدِ وَالسَّلَاحِ (جلالین) تم تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کم تھے، یعنی بے سروسامان تھے۔



وانما فسر بقلة العدد والسلاح لثلاثين في مدلول هذه الآية (ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين) ويقتضيه العز والقوة والغلبة

﴿وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ کی تفسیر بے سرو سامان ہونے سے یعنی قلت عدد اور ہتھیاروں کی قلت سے کی گئی، تاکہ بظاہر ”ذلت“ کا مفہوم رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے منافی (مخالف) نہ ہو ﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کیلئے عزت ہے) اس لئے کہ ذلت کی نفیض (الٹ) ”عزت، قوت، غلبہ“ ہے پھر صحابہ کرام کیلئے ﴿وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ کا استعمال کیسے صحیح ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں تو معنی ”تعداد کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے۔“

روی ان المسلمين ثلثمائة وثلاثة عشر جلاسة وسبعون من المهاجرين وبقيتهم من الانصار وما كان فيهم الا فرس واحد والكفار قريب الف مقاتل ومنهم مائة فرس مع الاسلحة الكثيرة

بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی، چھتر مہاجرین اور باقی انصار تھے، ان کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا، جبکہ کفار ایک ہزار کے قریب تھے، اور ان کے پاس ایک سو گھوڑے اور کثیر ہتھیار موجود تھے۔

(حاشیہ جلالین)

(خیال رہے کہ دو گھوڑوں والی روایت زیادہ مشہور ہے، اگرچہ صاوی نے تین گھوڑوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

﴿وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (بقلة العدد) (مدارک) تم تعداد میں کم تھے یعنی بے سرو سامان تھے۔

اب اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ کی طرف نظر کی جائے کہ آپ کا ترجمہ کس طرح شان صحابہ کے مطابق ہے، لیکن اس کے برخلاف دوسرے تراجم کو دیکھیں، ”تم ذلیل تھے“ ”تم بہت پست تھے“ کتنے شان صحابہ کرام کے خلاف تراجم ہیں ”اور تم بہت کمزور تھے“ یہ ترجمہ بھی مقصد کو واضح کرنے میں ناکام ہے، کیونکہ ”تم بہت کمزور تھے“ اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”جسمانی طور پر کمزور تھے“ اور (العباد باللہ) یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ تم ایمان کے طور پر کمزور تھے، یہ تراجم مقصد بیان سے کوسوں دور ہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ حقیقت کو سمجھانے میں اور مقصد بیان کی وضاحت کرنے میں اور صحابہ کرام کی شان کو ثابت کرنے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ (تسکین البیان فی محاسن کنز الایمان صفحہ نمبر ۸۸، ۸۹)





اِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ اَلَنْ يَكْفِيَكُمْ اَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلاَفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنَزَّلِينَ ۝

(آیہ نمبر ۱۲۳)

(۱) جب اے محبوب تم مسلمانوں سے فرماتے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتے اتار کر۔ (کنز الایمان)

(۲) جب آپ فرما رہے تھے مؤمنوں کو، کیا کافی نہیں تمہیں کہ امداد فرمائے تمہاری تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے اس حال میں کہ وہ اتارے ہوئے ہوں۔ (نجوم الفرقان)

رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی بدر میں پہلے ایک ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْأَلْفِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفِينَ﴾ (سورۃ الانفال آیہ نمبر ۹)

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں تمہیں مدد دینے والا ہوں ہزار فرشتوں کی قطار سے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں سے مؤمنوں کی امداد کی جو اسی زیر بحث آیہ کریمہ میں ہے، پھر رب قدوس نے مؤمنوں کی پانچ ہزار فرشتوں سے امداد فرمائی جو اس کے بعد آیہ کریمہ میں ذکر آ رہا ہے۔

﴿اِذْ تَقُولُ﴾ ”ظرف ہے“ ”نصر کم“ کی، تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی جب تم مؤمنوں کو کہہ رہے تھے۔

﴿لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ”حین اظہروا العجز عن المقاتلة“

مؤمنوں کو آپ اس وقت تسلی دے رہے اور یہ ارشاد فرما رہے تھے جب انہوں نے کافروں سے جنگ کرنے میں اپنے عجز کا اظہار کیا۔

﴿اَلَنْ يَكْفِيَكُمْ اَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلاَفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ﴾

”کیا تمہیں کافی نہیں کہ تمہاری امداد کرے تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے۔“

”الكفاية سد الخلة والقيام بالامر“ کفایت کا مطلب ہے کہ حاجت کو پورا کرنا اور تمام معاملات کی

حفاظت کرنا ”الامداد اعانة الجيش بالجيش“ جنگ میں امداد کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک لشکر کی دوسرے لشکر

کے ذریعے امداد کی جائے، صحابہ کرام کافروں کی بڑی تعداد سے ”جو اسلحہ سے مسلح تھے“ جنگ کرنے کیلئے نہیں گئے تھے،

بلکہ ایک قافلہ کی سرکوبی کیلئے گئے تھے (جس کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آگے آ رہا ہے) اس لئے صحابہ کرام اپنی تعداد میں

کمی اور بے سروسامانی اور کافروں کی تعداد میں زیادتی اور ظاہری قوت اور اسباب جنگ کے پائے جانے کی وجہ سے یہ



خیال کر رہے تھے کہ ہماری امداد کہاں سے آئے گی تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی، صحابہ کرام کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تین ہزار فرشتوں سے امداد فرمائے گا۔

﴿مُنْزِلِينَ﴾ ”اس حال میں کہ وہ اتارے ہوئے ہوں۔“

﴿مُنْزِلِينَ﴾ اسی حال کو نہم نازلین من السماء باذنہ تعالیٰ (مُنْزِلِينَ) حال واقع ہو رہا ہے یعنی اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے آسمانوں سے اترنے والے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ہوں گے۔ (ماخوذ از روح البیان)

مطلقاً امداد کا معنی یہ ہے ”والامداد فی الاصل اعطاء الشئ حالاً بعد حال“ امداد اصل میں یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز وقتاً فوقتاً عطاء کرنا۔ شر میں بھی امداد کرنے کا ذکر قرآن پاک میں ہے ﴿وَيَمْدُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ اسی طرح اور ارشاد ہے ﴿وَنَمُدُّهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ اور خیر میں امداد جس طرح یہاں ذکر ہے، اور ارشاد گرامی ہے ﴿وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ﴾۔



بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَاتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ فُورِهِمْ هَذَا يَمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝

(آیہ نمبر ۱۲۵)

(۱) ہاں کیوں نہیں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور کافراں کی دم تم پر آپڑیں تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے نشان والے بھیجے گا۔ (کنز الایمان)

(۲) ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو، اور پرہیزگار ہو جاؤ، اور وہ تمہارے پاس جلدی اسی وقت (حملہ کرنے) آجائیں تو امداد کرے گا تمہاری رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

”بلی“ ایجاب لما بعد ان وتحقیق ای بلی یکفیکم ذلک لم وعدم الزیادة بشرط الصبر والتقویٰ حتالهم وتقویة لقلوبهم فقال (ان تصبروا) علی لقاء العدو ومناہضتهم (وتتقوا) معصیة الله ومخالفة نبیہ ﷺ



کیوں نہیں یہ امداد تمہیں کافی ہے، پھر رب تعالیٰ نے ان سے زیادہ امداد کرنے کا وعدہ فرمایا، یعنی تین ہزار فرشتوں کا اتارا جانا ہی تمہارے لئے امداد کافی ہے، البتہ وہ اور زیادہ پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری امداد کرے گا شرط یہ ہے کہ تم صبر کرو، یعنی دشمن سے جب تمہاری ملاقات ہو تو صبر سے کام لو اور تقویٰ اختیار کرو، یعنی اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت سے بچ کر رہو۔

﴿وَيَأْتُوَكُمْ مِنْ فُورِهِمْ هَذَا﴾ ”وہ آجائیں تمہارے پاس جلدی سے۔“

یعنی مشرکین اگر تمہارے پاس اسی گھڑی آجائیں حملہ کرنے کی غرض سے، تو ان کے آنے پر بغیر کسی تاخیر کے تمہاری امداد فرمائے گا۔

﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴾

”وہ تمہاری امداد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہوں گے۔“

”التسويم الذي هو الذي هو اظهار سيما الشئ“ تسويم کا معنی ہے کس چیز کی علامات کو ظاہر کرنا۔

”روى ان الملائكة كانوا بعمائمهم بيض الا جبريل عليه السلام كان بعمامة صفراء على

مثال الزبير بن العوام ونزلوا على الخيل البلق موافقة لفرس المقداد واكراماله“

روایت میں آتا ہے کہ فرشتے جب اترے تو ان کی سفید پگڑیاں تھیں، سوائے جبریل کے کہ ان کی پگڑی

زرد رنگ کی تھی، جیسے حضرت زبیر بن عوام کی پگڑی تھی، وہ چتکبرے گھوڑے پر اترے جیسا کہ حضرت

مقدادؓ کا گھوڑا تھا، اس میں حضرت مقداد کی خصوصی عزت افزائی تھی۔

فرشتوں نے لڑائی کی تھی یا نہیں؟

اس مسئلہ میں دو قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔

”وانما كانت الفائدة في كثرة الملائكة لتسكين قلوب المؤمنين ولان الله تعالى

جعل اولئك الملائكة مجاهدين الى يوم القيامة فكل عسكر صبر واحتساب فاليهم

الملائكة ويقاتلون معهم“

بدر میں کثیر فرشتوں کو مومنوں کے دلوں کو تسلی دینے کیلئے بھیجا گیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو قیامت تک

جہاد کرنے والا بنایا، ہر وہ لشکر جس نے صبر کیا اور تقویٰ اختیار کیا وہ ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے ہیں۔



”وقال ابن عباس ومجاهد لم تقاتل الملائكة الا يوم بدر وفيما سوي ذلك يشهدون ولا يقاتلون انما يكون عددا او مددا“

حضرت ابن عباس ومجاهد (رحمہما اللہ) فرماتے ہیں، بدر کے سوا کسی اور جنگ میں فرشتوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا، صرف بدر میں فرشتوں نے لڑائی کی، اور باقی جنگوں میں فرشتے حاضر ہوتے رہے، مؤمنوں کی تعداد بڑھاتے رہے، اور مؤمنوں کے دلوں کو تسلی دے کر ان کی امداد کرتے رہے، اس روایت سے واضح ہو رہا ہے کہ بدر میں فرشتے صحابہ کرام کے ساتھ ملکر جہاد کرتے رہے۔

”وقال بعضهم انما كانت الفائدة في كثرة الملائكة انهم كانوا يدعون ويسبحون ويكثرون الذين يقاتلون يومئذ“

بعض روایات کے مطابق فرشتوں کا زیادہ تعداد میں آنے کا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس دن بدر میں جنگ کرنے والوں کیلئے دعاء کر رہے تھے، اور ان کی کامیابی کیلئے اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھ رہے۔

اس روایت سے دو فائدے حاصل ہوئے (ایک یہ کہ مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھ کر دعاء کی جائے) اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا ”فعلى هذا لم تقاتل الملائكة يوم بدر وانما حضروا للدعاء بالتبیت“ کہ اس روایت کے مطابق یہ واضح ہو رہا ہے کہ فرشتوں نے بدر کے دن لڑائی میں حصہ نہیں لیا، وہ صرف صحابہ کرام کی تسلی کیلئے آئے تھے اور ان کی ثابت قدمی کیلئے دعاء کر رہے تھے۔ (ماخوذ از قرطبی)

راقم کا موقف:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ فرشتے اپنی ملکی طاقت سے لڑائی نہیں کر رہے، اور نہ ہی سب فرشتے لڑائی کر رہے تھے، بلکہ بعض فرشتے بشری طاقت کے مطابق (جو اس وقت ان کو عطاء کی گئی) لڑائی کر رہے تھے انشاء اللہ بدر کے تفصیلی واقعات کے ضمن میں قریب ہی آرہا ہے۔

فائدہ جلیلہ:

”نزول الملائكة بسبب من اسباب النصر لا يحتاج اليه الرب تعالى وانما يحتاج اليه المخلوق“  
فرشتوں کا اترنا امداد کے اسباب میں سے ایک سبب تھا، اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں تھا، بلکہ مخلوق اس کی محتاج تھی  
”فليعلق القلب بالله وليثق به“ کہ مخلوق کا دل رب تعالیٰ کی ذات سے معلق (لگا) رہے، اور رب



تعالیٰ کی امداد پر ان کو غالب و ثوق (اعتبار) رہے۔

رب تعالیٰ امداد فرماتا ہے کبھی اسباب کے ذریعے اور کبھی بغیر اسباب کے یعنی وہ صرف ”کن“ سے کبھی امداد فرماتا ہے ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (بیشک اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ فرماتا کسی چیز کا تو کہتا ہے ”کن“ (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ بدر میں سبب کے ذریعے امداد کی تا کہ مخلوق کو بھی پتہ چل جائے کہ رب تعالیٰ نے اسباب کے ذریعے بھی امداد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ (تم ہرگز اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

**اعتراض:** اقویاء یعنی بڑی شان والے بلند ہمت لوگ تو صرف رب تعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں، وہ اسباب کا سہارا نہیں لیتے ”ان الاسباب الما بنیت فی حق الضعفاء لالاقویاء“ اسباب تو کمزور لوگوں کیلئے ہوتے ہیں جو توکل نہیں رکھتے، بڑے لوگوں کیلئے اسباب نہیں ہوتے، تو صحابہ کرام کو امداد کے سبب سے مطلع کرنے کا کیا جائزہ تھا۔

**جواب:** یہ ضابطہ ہی درست نہیں کہ اسباب توکل کے خلاف ہیں، اولیاء کرام، بلکہ انبیاء کرام نے بھی مرض میں علاج کرانے کو توکل کے مخالف نہیں قرار دیا، اور لوگوں نے اپنی بیماری وغیرہ میں نبی کریم ﷺ سے دعاء کرائی، ان کا دعاء کرانا توکل کے مخالف نہیں تھا، ورنہ یہ حقیقت ہے ”ان النبی ﷺ واصحابہ کانوا الاقویاء وغیرہم ہم الضعفاء“ کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام قوی حضرات تھے اور باقی حضرات ضعیفاء (ضعیف لوگ) تھے۔ (ماخوذ از قرطبی بوضاحت)

﴿يَا تُؤْكُمُ مِنْ فَوْرِهِمْ هَذَا﴾ میں ”مِنْ فَوْرِهِمْ“ کا ایک معنی ”من وجہہم“ وہ منہ اٹھائے تمہارے پاس اسی گھڑی میں آدھمکیں ”دوسرا معنی ہے ”من غضبہم“ وہ غصہ سے اسی گھڑی تمہارے پاس آجائیں یعنی تم پر چڑھائی کر دیں۔ اصل میں ”فور“ کا معنی ”فارت القدر“ (ہنڈیا نے جوش مارا) سے لیا ہے، غیظ و غضب کی حالت پر لفظ ”فور“ کا اطلاق ہوتا ہے ”والاصل الفور الی الشنی والاخلافہ بجد“ ”فور“ کا اصل میں معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی طرف ارادہ کرنا اور اسے بڑی کوشش سے حاصل کرنا۔

### واقعہ بدر

**تاریخ بدر:** غزوہ بدر کیلئے نبی کریم ﷺ ہجرت کے انیسویں مہینہ میں بارہ رمضان المبارک کو روانہ ہوئے، بعض نے آٹھ رمضان کہا اور قتال سترہ رمضان المبارک ۲ھ کو واقع ہوا، جمعہ کا دن تھا، بعض نے ہفتہ کا دن کہا ہے۔ (ماریج النبوة جلد دوم)



## بدر کا نام بدر کیوں؟

بدر ایک بستی کا نام ہے جو بدر بن مخلد بن نصر بن کنانہ سے اس لئے منسوب ہے کہ اس نے اس جگہ پڑاؤ کیا تھا، اور بدر بن حارث کی طرف اس لئے منسوب ہے کہ اس نے یہاں ایک کنواں کھودا تھا جو بدر (چوہدویں کے چاند) کی طرح گول تھا۔  
(مدارج النبوة بتصرف)

غرضیکہ جہاں بدر کی جنگ ہوئی وہاں قریب ایک بستی کا نام بھی بدر تھا، اس بستی کو آباد کرنے والے کا نام بھی بدر تھا اور ایک کنواں تھا اس کا نام بھی بدر تھا، درحقیقت بستی اور کنواں بدر نامی شخص کی طرف منسوب تھے۔

غزوہ بدر حق و باطل میں تمیز کرنے کا ذریعہ واقع ہوا:

نبی کریم ﷺ کے تمام غزوات میں سے یہ غزوہ بہت زیادہ عظیم غزوہ تھا، اس دن دین کو عزت و شوکت حاصل ہوئی، اسی وجہ سے اس دن کو ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ (حق و باطل میں فرق کرنے والا دن) کہا گیا ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّقِي الْجَمْعَيْنِ﴾ فرقان کا دن وہ دن ہے جس دن دو جماعتیں ملیں۔ اس دن کفر کی بنیادوں کو تباہ و برباد کر کے کافروں کو ذلیل و خوار بنادیا، حالانکہ مسلمانوں کی تعداد کم اور دشمنوں کی تعداد زیادہ تھی، اور کفار جنگ کے پورے ساز و سامان سے لیس ہو کر اترتے اور تکبر کرتے آئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو عزت دی اور اپنے دین کو قوی اور مضبوط بنایا، رب تعالیٰ کی امداد کا ذکر قریب ہی تین آیات میں گزر چکا ہے۔

**مسلمانوں کی تعداد:** تین سو تیرہ تھی جن میں ستر (۷۷) مہاجرین، اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار تھے، لیکن نبی کریم ﷺ ساتھ کے صرف تین سو پانچ صحابہ کرام تھے، باقی آٹھ میں سے ایک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں جو آپ کے حکم سے اپنی زوجہ سیدہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ کی علالت اور تیمارداری کیلئے ر کے تھے لیکن آپ کا شمار بدری صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ اور سات صحابہ کرام کو مشرکین کے قافلہ کی تلاش میں بھیجا ہوا تھا، جن میں پانچ انصار تھے، اور دو مہاجرین سے حضرت طلحہ اور سعید بن زید ہیں، یہ سات بھی بدری صحابہ کہلاتے ہیں، یعنی ان کا درجہ بدر والے صحابہ کے برابر ہے، اور بدر کے مال غنیمت میں یہ برابر کے شریک تھے۔  
(مدارج النبوة جلد دوم)

مسلمانوں کے پاس جنگی سامان چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں، اور ستر اونٹ، اور تین گھوڑے (جس روایت میں زیادہ گھوڑوں کا ذکر ہے وہ تین ہیں، ورنہ دو اور ایک کا بھی ذکر ہے۔



## مشرکوں کی تعداد و جنگی سامان :

مشرکین ایک ہزار کے قریب تھے، ان کے ساتھ ایک سو گھوڑے اور سات سو یا کچھ زیادہ اونٹ تھے، کفار بڑی شوکت اور کروفر میں تھے، مکمل جنگی ساز و سامان ان کے پاس تھا، وہ بڑے غرور اور تکبر میں تھے، ان کا ہر شخص زرہ پوش خواہ سوار تھا یا پیادہ ان کے ساتھ آلات حرب (عیش و عشرت) بھی تھے، اور ان کے ساتھ گانا گانے والی ڈومیناں بھی تھیں، وہ گانا گاکر مسلمانوں کے خلاف زبان طعن دراز کرتیں، اور مشرکوں کو جوش دلاتیں، قریش کے سرداروں میں سے ہر روز کوئی نہ کو سب لشکر والوں کو کھانا دیتا تھا، وہ بظاہر اس شان و شوکت سے آئے تھے لیکن رب تعالیٰ نے ان کو ذلیل کیا۔

(مدارج النبوة جلد دوم)

## جنگ بدر کا سبب :

بدر کا واقعہ مسلمانوں کے بغیر قصد و ارادہ اور منصوبہ بندی کے واقع ہوا تھا، نبی کریم ﷺ اور تمام مسلمان اس جنگ کیلئے پہلے سے تیار نہ تھے، وہ تو قریش کے اس بڑے قافلہ کی سرکوبی کیلئے مدینہ طیبہ سے نکلے تھے جو شام سے آرہا تھا، اس میں قریش کا کثیر مال تجارت تھا، اس کا امیر قافلہ ابوسفیان تھا، اس میں عمرو بن العاص بھی شامل تھا (ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) یہ قافلہ میں سواروں پر مشتمل تھا، یہ لوگ جب بدر کے قریب پہنچ گئے تو نبی کریم ﷺ کو اطلاع ملی آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا وہ قافلہ آرہا ہے جس کے ساتھ اموال کثیرہ بھی ہے اور دشمنوں کی تعداد بھی بہت کم ہے، لہذا اس کی سرکوبی کیلئے چلو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اس طرح تمہیں سامان عطاء فرمائے، ایک روایت میں دعاء کا تذکرہ ہے، آئیے وہ حدیث پاک دیکھئے۔

(ماخوذ از مدارج النبوة جلد دوم)

عن عبد اللہ ابن عمرو ان النبی ﷺ خرج یوم بدر فی الثمانۃ وخمسۃ عشر قال اللہم

انہم حفاۃ فاحملہم اللہم انہم عراۃ فاکسہم اللہم انہم جیاع فاشبعہم لفتح اللہ لہ

فانقلبوا وامنہم رجل الا وقد رجع بجمل او جملین واکتسبوا وשבوا

(رواہ ابو داؤد، مشکوٰۃ باب المعجزات)

عبداللہ بن عمرو (بن العاص) فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ بدر کے دن تین سو پندرہ اصحاب کے ساتھ نکلے، (تین سو پندرہ کا مطلب کسر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے تین سو تیرہ کو تین سو پندرہ اصحاب سے تعبیر کر دیا گیا) آپ نے عرض کیا اے اللہ! بیشک یہ پاؤں سے نیگے ہیں، ان کو سواریاں عطاء کر، اے اللہ یہ نیگے ہیں ان کو کپڑے عطاء کر، اے اللہ یہ بھوکے ہیں ان کو سیر کر، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطاء کی تو وہ جب واپس لوٹ کر آئے، کوئی شخص بھی ان میں سے نہیں تھا مگر یہ کہ وہ ایک یا دو اونٹ لے کر واپس آیا ہر شخص کو کپڑے حاصل تھے اور سب میر تھے۔



## وضاحت حدیث:

”اللهم انهم ای غالبهم (حفاة) بضم الحاء جمع خاف وهو من لافعل لهم (فاحملهم) بهمز وصل وكسر ميم ای اعنهم على الحمل والمعنى اعط كلامهم المربوب“  
آپ کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ ان میں سے اکثر لوگ پاؤں سے ننگے ہیں، انہیں جوتے میسر نہیں، ان کی امداد فرما، ان میں سے ہر ایک کو سواری عطاء فرما۔

”اللهم انهم عرارة فاكسهم“ اے اللہ یہ ننگے ہیں، یعنی ان کو مکمل زینت والا لباس میسر نہیں، زیادہ سے زیادہ کمر سے باندھنے والی چادریں ان کو میسر ہیں، ان کو زیب و زینت والا مکمل لباس تو عطاء فرما ”اللهم انهم جیاع فاشبعهم“ اے اللہ! یہ بھوکے ہیں ان کو سیر کر، یعنی ان کے ظاہر و باطن کو سیر کر، تاکہ ان کو طاعت پر قوت عطاء فرما۔ ”افتح الله له“ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فتح عطاء فرمائی، یعنی آپ کی مشرکین مکہ پر اور ضادید قریش (قریش کے سرکردہ سرداروں) پر امداد فرمائی، یہاں تک کہ مشرکین کے ستر آدمی قتل کر دئے گئے، اور ستر آدمی قید کر لئے گئے، ”فانقلبوا“ فرجع اصحابہ ”صحابہ کرام لوٹے۔“ و ما منهم رجل الا وقد رجع بجمل او جملین و اکتسوا و شبعوا“ یعنی صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ نے کفار کا مال بطور غنیمت عطاء فرمایا جس سے ہر شخص کو ایک یا دو اونٹ حاصل ہو گئے، ان کو مکمل زیب و زینت والا لباس عطاء کر دیا گیا، اور مال کے ملنے کی وجہ سے ان کو کھانا بھی میسر ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی کتنا ہی سچا ہے ﴿عَسَىٰ اَنْ تَكُوْنُوْا شِيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند سمجھو اور اللہ نے اس میں خیر کثیر رکھ دی ہو۔

”وفی الحدیث ان الصبر علی ما کره فیہ خیر کثیر ثم هذه نتیجتہ فی الدنیا و الآخرة خیر و ابقى“

حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس چیز کو تم ناپسند سمجھتے ہو، اسی پر صبر کرنے سے کثیر بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں پھر یہ نتیجہ دنیا اور آخرت میں بھلائی کا ذریعہ ہے اور قائم رہنے والا ہے۔ (ماخوذ از مرقاة جلد ۱ صفحہ نمبر ۲۱۳)

عائکہ بنت عبدالمطلب کا خواب دیکھنا:

نبی کریم ﷺ کی پھوپھی عائکہ بنت عبدالمطلب نے خواب دیکھا کہ کچھ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر آئے، اور مقام ابطح میں آئے اور بلند جگہ کھڑے ہو کر انہوں نے یہ کہا اے قریش کے لوگو جلدی کرو اور اپنے قتل کی جگہ آؤ، جب ابو جہل لعین کو اس خواب کا پتہ چلا تو وہ (حضرت) عباس سے کہنے لگا، اے ابوالفضل یہ عورت تم



میں کب سے نبی بن گئی، پھر وہ بطور (طنز) کہنے لگا کیا تمہارے مردوں کا نبوت کا دعویٰ کرنا کافی نہیں تھا، بڑا تعجب ہے اب تمہاری عورتیں بھی نبوت کا دعویٰ کرنے لگ گئی ہیں، پھر وہ کہنے لگا کہ میں تین دن انتظار کرتا ہوں اگر اس خواب کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تو میں تمام قبائل عرب میں خط بھیج دوں گا کہ تم لوگ یعنی بنی ہاشم سب سے زیادہ جھوٹے ہو۔

(سیرت ابن ابی ہشام و طبقات ابن سعد بالاختصار ترجمہ عاتکہ بنت عبدالمطلب)

اصل میں ابو جہل کا تکبر اسے بدر میں جانے پر ابھار رہا تھا، تاکہ اپنے قتل کی جگہ تک جلدی پہنچ جائے۔

**صمصم غفاری کا خواب:**

صمصم غفاری نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں ایک اونٹ پر سوار ہوں اور ایک ایسی گھاٹی سے گذر رہا ہوں جو خون سے لبریز ہے، جب میں بیدار ہوا تو میں نے سمجھ لیا کہ قریش کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں گے، اس خواب کو سن کر بنی ہاشم بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ خواب عاتکہ بنت عبدالمطلب کے خواب کی تائید کر رہا تھا۔

(مدارج النبوة جلد ۲)

**اہل مکہ کا فیصلہ:**

اہل مکہ نے جنگ کی تیاری شروع کر لی اور فیصلہ یہ کیا کہ ہر دو شخص جن کو مکہ میں کوئی کام ہے ان میں سے ایک جنگ کیلئے باہر نکل آئے یا اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دے، قریش کے تمام سردار جنگ کیلئے آمادہ ہو گئے، لیکن ابولہب نے ٹال مٹول سے کام لیا اور پیچھے رہنے کا فیصلہ کیا، اس نے اپنی جگہ پر ابو جہل کے بھائی عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا، اور اس کے ذمہ سود کی رقم ابولہب کے چار ہزار درہم تھے جو اس نے معاف کر دئے تھے۔ امیہ بن خلف بھی چھپ رہا تھا، مکہ سے باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا، کیونکہ اسے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ذریعے یہ خبر مل چکی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ میرے اصحاب امیہ بن خلف کو قتل کر دیں گے، نبی کریم ﷺ کی خبر نے سچا ہونا ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابو جہل نے بہت زیادہ اصرار کیا، اور ولید کو کہا اے ابوصفوان تو مکہ کے بہت سے لوگوں کا سردار ہے، جب لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تو نہیں جا رہا، پیٹھ پھیر رہا ہے اور پیچھے رہ رہا ہے تو دوسرے لوگ بھی پیچھے رہ جائیں گے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، ابو جہل کے بار بار اصرار پر امیہ بن خلف جانے پر تیار ہو گیا۔

**وضاحت حدیث:** وہ حدیث جس میں امیہ بن خلف کے قتل ہو جانے کی پیشگوئی کی گئی ہے، وہ یہ ہے۔



عن سعد بن معاذ انه قال كان صديقاً لامية بن خلف و كان امية اذا امر بالمدينة نزل على سعدو كان سعد اذا امر بمكة نزل على امية فلما قدم رسول الله ﷺ المدينة انطلق سعد معتمراً فنزل على امية بمكة فقال لامية انظري ساعة خلوة لعلی ان اطوف بالبيت فخرج به قریباً من نصف النهار فلقيهما ابو جهل فقال يا ابا صفوان من هذا معك؟ فقال هذا سعد فقال له ابو جهل الا اراك تطوف بمكة آمناً وقد اوتيت الصباة وزعمتم انكم تنصرونهم وتعينونهم اما والله لو لاناك مع ابي صفوان ما رجعت الى اهلك سالما فقال له سعد و رفع صوته عليه اما والله لئن منعتني هذا لا منعك ما هو اشد عليك منه طريقك على المدينة فقال له امية لا ترفع صوتك يا سعد على ابي الحكم سيد اهل الوادي، فقال سعد دعنا عنك يا امية فوالله لقد سمعت رسول الله ﷺ يقول اللهم قاتلوك قال بمكة قال لا ادري، ففزع لذلك امية فزعاً شديداً فلما رجع امية الى اهله قال يا ام صفوان الم ترى ما قال لي سعد؟ قال زعم ان محمداً اخبرهم انهم قاتلي فقلت له بمكة قال لا ادري فقال امية والله لا اخرج من مكة فاتاه ابو جهل فقال يا ابا صفوان انك حتى يراك الناس قد تخلفت وانت سيد اهل الوادي تخلفوا معك فلم يزل به ابو جهل حتى قال اما اذا غلبتني فوالله لا اشتري اجدو بغير بمكة ثم قال امية يا ام صفوان جهزني فقالت له يا ابا صفوان وقد نسيت ما قال لك اخوك يثربي؟ قال لا ما اريد ان اجوز معهم الا قريفاً فلما خرج امية لا ينزل منزلاً الا عقل بغيره فلم يزل بذلك حتى قتله الله عز وجل ببدر“

(بخاری باب ذکر النبی ﷺ من یقتل ببدر)

عبداللہ بن مسعود بن معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ امیہ بن خلف کے دوست تھے، امیہ جب مدینہ سے گذرتا تو سعد کے پاس ٹھہرتا، سعد کا جب مکہ سے گذر ہوتا تو یہ امیہ کے پاس ٹھہرتے، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لے آئے تو سعد عمرہ کرنے کی غرض سے چلے، مکہ میں امیہ کے پاس جا کر ٹھہرے، پھر امیہ کو کہنے لگے کہ دیکھ رکھنا کوئی (لوگوں سے) علیحدہ گھڑی مل جائے، ہو سکتا ہے میں بیت اللہ شریف کا طواف کر لوں، وہ دن کے آدھے حصہ میں (یعنی دوپہر کے وقت) سعد کو لے گیا، تو ان دونوں کو ابو جہل (راستہ میں آتے ہوئے) مل گیا، تو اس نے کہا، اے ابو صفوان! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا ”یہ سعد ہے“ ابو جہل نے امیہ کو کہا کیا تم مکہ میں امن میں (بغیر کسی خوف کے) طواف کر رہے تھے؟ اور تحقیق تم نے ایک بے دین (اپنے آباء اجداد کے دین سے پھر جانے والے) کو امن دیا ہوا ہے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ بیشک تم ان کی امداد کرو گے اور معاونت کرو گے، (پھر سعد کو کہنے لگا) قسم



ہے اللہ کی اگر تو ابوصفوان (امیہ کی کنیت ہے) کے ساتھ نہ ہوتا تو اپنی اہل کی طرف صحیح وسلامت لوٹ کر نہ جاتا، تو سعد نے اسے زوردار گردار آواز سے کہا، خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر تو نے مجھے یہاں سے منع کیا تو میں تمہارے (شام کی طرف جانے والے) مدینہ سے گزرنے والے راستے بند کر دوں گا۔

امیہ نے سعد کو کہا، اے صفوان! تم اپنی آواز اس وادی کی کے سردار ابوالحکم پر بلند نہ کرو، (کفار ابو جہل کو ابوالحکم کہتے تھے، مسلمان ابو جہل کہتے تھے، حق یہ تھا کہ امیہ اپنے مہمان کا ساتھ دیتا لیکن اس نے جب ابو جہل کا ساتھ دینا شروع کر دیا تو سعد غصہ میں آ گئے) تو سعد نے کہا اے امیہ تم اپنے آپ سے ہمیں ہٹا دو (یعنی تم ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ، تم ہمیں کیا بچاؤ گے) میں نے تو رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرما رہے تھے، بیشک میرے صحابہ امیہ بن خلف کو قتل کر دیں گے، اس نے پوچھا کیا مکہ میں (مجھے قتل کریں گے) حضرت سعد نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں، امیہ یہ خبر سن کر بہت پریشان ہو گیا، شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا (نبی کریم ﷺ کی غیبی خبروں پر کفار بھی یقین رکھتے تھے) امیہ جب اپنی اہل کے پاس آیا، تو اس نے کہا اے ام صفوان (یہ کنیت ہے اس کی زوجہ کی) کیا تمہیں علم حاصل ہوا مجھے سعد نے کیا کہا؟ اس نے پوچھا کہ سعد نے تمہیں کیا کہا؟ اس نے بتایا کہ وہ گمان کرتا ہے کہ بیشک محمد نے ہمیں خبر دی ہے کہ ان کے اصحاب تمہیں قتل کر دیں گے، تو میں نے اس سے پوچھا کیا وہ مجھے مکہ میں قتل کر دیں گے؟ اس نے کہا یہ تو مجھے علم نہیں، امیہ نے کہا قسم ہے اللہ کی میں مکہ سے باہر نہیں جاؤں گا، جب بدر (کی طرف نکلنے) کا دن آ گیا تو ابو جہل اسے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلو، کیونکہ میں نے اور لوگوں کو بھی کہہ دیا ہے کہ چلو مسلمانوں کو ہمارے قافلہ کے روکنے کا مزہ چکھاتے ہیں، لیکن امیہ مکہ سے باہر جانے سے ڈر رہا تھا (انکار کر رہا تھا) ابو جہل نے کہا اے ابوصفوان تم اس وادی میں (اپنے قبیلے کے) کے سردار ہو، جب لوگ تمہیں دیکھیں گے کہ تم پیچھے رہ گئے ہو تو وہ بھی پیچھے رہ جائیں گے۔ ابو جہل بار بار کہتا رہا، یہاں تک کہ امیہ نے کہا کہ اگر تم مجبور ہی کرتے ہو تو قسم ہے اللہ کی میں مکہ میں سب سے عمدہ اونٹ خریدوں گا، پھر امیہ نے (گھر آ کر اپنی زوجہ کو) کہا اے ام صفوان میرا سامان تیار کر دو، اس نے کہا اے ابوصفوان کیا تم اپنے بیٹے کی بھائی کی باتوں کو بھول گئے ہو؟ اس نے کہا نہیں (بھولا نہیں) میں کوئی دور جانے کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ قریب سے ہی واپس آ جاؤں گا، یہ جہاں بھی اترتا، اونٹ کوری سے باندھ دیتا، اس کا ارادہ یہ ہوتا کہ لوٹ آئے، لیکن یہ اسی طرح بدر میں پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ نے اسے وہاں بدر میں پہنچا دیا۔

حدیث پاک میں استعمال ہوا ہے ”صباة“ (بضم الصاد) یہ جمع ہے صابی کی ”هو المائل عن دينه الى دين غيره“ یہ اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف پھر جائے، امیہ کی زوجہ نے حضرت سعد کو امیہ کا



یثربی بھائی کہا ”والمراد الاخوة بینہما بحسب المعاهدة والموالاة“ اخوة سے مراد ان کا وعدہ اور دوستی کا بھائی چارہ ہے۔  
(عمدة القاری جزء ۷ ص ۷۶ نمبر ۷۶)

ابو جہل کا کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر لوگوں کو بھڑکانا:

ایک روایت میں ہے کہ ابو جہل لعین نے خانہ کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر آواز لگائی کہ اے مکہ والو جلدی کرو، جلدی نکلو، اور اپنے اموال اور اپنے قافلہ کے پاس پہنچو اگر تم سے پہلے محمد (ﷺ) کے اصحاب پہنچ گئے تو پھر تمہاری خیر نہیں، اس پر ایک ہزار جنگی لوگ نکل آئے اور بھد کرو فر غرور و تکبر اور پورے ساز و سامان، آلات غنا اور ملاہی (لہو و لعب کے سامان) کے ساتھ چل پڑھے۔

نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام سے مشورہ اور صحابہ کرام کی طرف آپ کو اطمینان بخش جواب:

عن انس ان رسول اللہ ﷺ شاور حین بلغه اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابو بکر فاعرض عنه ثم تکلم عمر فاعرض عنه فقال سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخيضها البحر لا خضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها لی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللہ ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدر وروت علیہم روايا قریش وفيہم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذلوه فكان اصحاب رسول اللہ ﷺ یسألونہ عن ابی سفیان واصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان ولكن هذا ابو جہل وعتبة وشيبة وامية بن خلف فی الناس فاذا قال هذا ضربوه ورسول اللہ ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک انصرف وقال والذی نفسی بیدہ لتضربوه اذا صدقکم وترکوا اذا کذبکم قال فقال رسول اللہ ﷺ هذا مصرع فلان ویضع علی الارض ههنا وههنا قال فما ما ط احدثهم عن موضع ینزل رسول اللہ ﷺ

(مسلم جلد ثانی باب غزوة بدر صفحہ نمبر ۱۱۰)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام سے) مشورہ کیا جب آپ کو ابو سفیان (کے قافلہ) کی آنے کی خبر ملی، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس کے متعلق (اچھا) کلام فرمایا، لیکن آپ نے ان سے اعراض فرمایا، (کہ میرا مشورہ تم سے نہیں) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق بہتر کلام فرمایا، لیکن آپ نے ان سے اعراض فرمایا کہ (میرا مقصد تم سے مشورہ لینا نہیں، کیونکہ آپ انصار کے رائے لینا چاہتے تھے کہ یہ مدینہ طیبہ سے باہر جنگ کیلئے جائیں گے یا نہیں) پھر حضرت سعد بن عبادۃ (جو انصار کے سردار تھے) کھڑے ہوئے، عرض کیا



یا رسول اللہ اگر آپ ہم سے بات کرنے کا ارادہ فرما رہے ہیں تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیں، تو ہم دریا میں ڈال دیں گے، راوی کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بلایا، تو لوگ چلے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے، وہاں قریش کے کچھ لوگ پانی لینے کیلئے آگئے، ان میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام بھی تھا، اسے صحابہ کرام نے پکڑ کر پوچھا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ اس نے کہا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا تو مجھے کوئی علم حاصل نہیں، البتہ ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف یہاں (قریب) ہی آچکے ہیں، تو صحابہ کرام نے اسے مارا (اس خیال سے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے) اس نے کہا اچھا میں تمہیں (صحیح) خبر دیتا ہوں، یہاں قریب ہی ابوسفیان اور اس کے ساتھی موجود ہیں، صحابہ کرام نے اسے چھوڑ دیا، پھر اس سے پوچھا، اس نے کہا ابوسفیان کے متعلق تو مجھے کوئی علم نہیں، البتہ لوگوں میں (یعنی بہت بڑے لشکر میں) ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف آ رہے ہیں، صحابہ کرام نے پھر اسے مارا، رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے، آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم اسے مارتے ہو جب یہ سچ کہتا ہے، اور تم اسے چھوڑ دیتے ہوئے جب یہ جھوٹ بولتا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی آپ نے اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر بتایا، یہاں اور یہاں روای کہتے ہیں کوئی ایک بھی آپ کے ہاتھ کی جگہ سے نہیں ہٹا (بلکہ وہیں مرا۔

**وضاحت حدیث:** ”برک الغماد“ برک باء پرفتحہ، راء کو ساکن، مفتوح اور مکسورتیوں طرح پڑھا گیا ہے۔

”واما الغماد فبغین معجمة مكسورة ومضمومة لغتان مشهورتان، وهو موضع من وراء مكة بخمس ليال بناحية الساحل وقيل بلديمان وقال ابراهيم الحربي برک الغماد وسعفات هجر كناية يقال ليمتابعد“

”برک الغماد“ یا تو مکہ مکرمہ سے پانچ راتوں (پانچ دن پانچ راتوں) کے فاصلہ پر جنگل کے کنارے پر جگہ کا نام ہے، پانچ دنوں کا فاصلہ تقریباً تہتر میل ہے، اور بعض حضرات نے کہا یمن میں ایک شہر کا نام ہے، ابراہیم حربی کا قول یہ ہے کہ عرب حضرات ”برک الغماد“ اور ”سعفات ہجر“ دو لفظ بولتے ہیں، جن کا کنایہ معنی ”دوری“ لیتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ بہت دور و دراز سفر کر کے جہاد کیلئے جانا ہے تو ہم وہاں جائیں گے خواہ وہ یمن کا شہر ہو یا دور و دراز جنگل ہو۔ ”وفيه جواز ضرب الكافر الذي لاعهد له وان كان اسيرا“ حدیث پاک سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس کافر سے کوئی معاہدہ نہیں، وہ ذمی نہیں، اسے امن نہیں دیا گیا اسے مارنا جائز ہے



خواہ وہ قیدی ہی کیوں نہ ہو۔

”وفیه معجزتان من اعلام النبوة احدهما اخبارہ ﷺ بمصرع جباہرتہم فلم  
یتعد احد مصرعہ الثانیۃ اخبارہ ﷺ بان الغلام الذی کانوا یضربونہ ”یصدق اذا ترکوه  
ویکذب اذا ضربوه وکان کذلک فی نفس الامر“ (نووی)

اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کے دو معجزے ثابت ہو رہے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کے  
جن سرکردہ لوگوں کے نام بتائے اور جگہ کا انتخاب کیا کہ فلاں شخص یہاں مرے گا، اور فلاں شخص یہاں مرے گا، سب  
وہیں مرے، کوئی بھی وہاں سے ہٹ کر نہیں مرا، اور نہ ہی بچ کر نکلا، امیہ بن خلف جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے بہت  
پہلے خبر دے رکھی تھی کہ اسے میرے اصحاب قتل کر دیں گے، وہ بدر میں نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اسے مجبور کر کے بدر میں  
لے جایا گیا وہ بھی وہاں قتل کر دیا گیا۔

ابوسفیان کا مشورہ لیکن ابو جہل کا اصرار:

ارباب سیر نے بیان کیا ہے کہ جب ابوسفیان اپنے قافلہ کو بچا کر ایک طرف سے نکل گیا تو اس نے مکہ میں  
پیغام بھیجا کہ قافلہ خطرہ سے نکل آیا ہے، لہذا تم لوگ لوٹ آؤ، محمد (ﷺ) کا پیچھا نہ کرو، قریش کے دوسرے عقلمند لوگ اور  
مدبر حضرات بھی انہیں منع کر رہے تھے، عتبہ اور شیبہ بھی منع کرنے والوں سے ہی تھے، عداس نصرانی جو عتبہ اور شیبہ کے غلام  
تھے، اور درپردہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، یہ بھی اپنے مالکوں کو منع کر رہے تھے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے نبی ہیں، ان  
سے جنگ کر کے بدبختی میں مبتلا نہ ہو، لیکن ابو جہل جس نے بدر میں قتل ہونا تھا یہ اصرار کر رہا تھا کہ ہم جنگ کرنے سے  
باز نہیں رہ سکتے، خدا کی قسم ہم بدر میں پہنچے سے پہلے واپس نہیں لوٹ سکتے، وہاں ہم تین دن ٹھہریں گے، اپنے اونٹ ذبح  
کریں گے، شراب پیئیں گے، اور گانائیں گے، وہاں میلے کی طرح جشن منائیں گے، تاکہ ہماری شوکت و شجاعت کا چرچا  
ہر طرف عرب قبائل میں پھیل جائے تاکہ وہ ہم سے ڈرتے رہیں۔ ابو جہل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے بدر سے لوٹ  
کر آنا ہی نہیں البتہ وہاں کفر و شرک اور فسق و فجور کا بازار گرم کریں گا، ذلت کی خاک میں سو کر جہنم میں جانے کا اسے پتہ  
نہیں تھا، بات اس کی یوں سچی ہوئی کہ کفار کی ذلت کی موت کا تمام قبائل میں چرچا ہو گیا۔ (ماخوذ از مدارج النبوة جلد دوم)

مسلمانوں اور کافروں کے لشکر بدر کے دو کناروں پر ٹھہر گئے:

نبی کریم ﷺ نے جب بدر کی جانب کوچ فرمایا تو مدینہ طیبہ کی جانب بدر کے ایک کنارے پر آپ اتر گئے۔



رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَأَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى﴾ ”عدوہ“ کا معنی ہے ”وادی کا کنارہ“ اور ”دنیا“ دنو سے ہے جس کا معنی ہے ”قرب“ اور ”قصوی“ کا معنی ہے ”بعید“ یعنی مسلمانوں کو خطاب کر کے بتایا گیا کہ تم مدینہ کے قریب جانب تھے، اور وہ یعنی کفار مدینہ کی دور جانب تھے، یعنی وہ بدر کے اس کنارے پر تھے جو مکہ کی طرف تھا۔

شیطان وسوسہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت:

جس جانب مسلمان اترے تھے وہ علاقہ ریگستان تھا، جس میں ان کے پاؤں اور گھوڑوں کے سم ریت میں دھنس جاتے تھے، مسلمانوں پر پیاس کا بھی غلبہ ہو جاتا تھا، اور جس طرف کفار تھے وہ پختہ زمین تھی، یعنی وہ مٹی والی طرف تھی، پانی بھی اس طرف تھا، شیطان نے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تم کہتے ہو ہم حق پر، اللہ کا نبی ہمارے ساتھ ہے اور ہم اللہ کے محبوب ہیں، حالانکہ پختہ زمین قریش کی جانب ہے، پانی ان کے پاس موجود ہے، تم پیاسے ہو رہے ہو، اور تم ریگستان میں ہو، تمہارے پاؤں زمین میں دھنس رہے ہیں، تم کس طرح جنگ کرو گے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بارش نازل فرمائی، مسلمانوں نے سیر ہو کر پیاس کو پانی پلایا، اور پانی اپنے پاس جمع کر لیا، اور ان کی ریتلی زمین بارش سے سخت ہو گئی، کافروں کی چٹیل زمین میں کچھڑ ہو گیا، اس طرح رب تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کا وسوسہ زائل کر دیا، اور مسلمانوں کے دلوں کو اطمینان و سکون عطا فرمایا، رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَيَنْزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءٌ لِّيُطَهِّرَ كُفْرًا بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ﴾ اور اللہ نے تم پر آسمان سے پانی نازل کیا تاکہ تم اس سے پاکیزگی حاصل کرو، اور وہ تمہارے دلوں سے شیطان کا وسوسہ دور فرمائے۔

نبی کریم ﷺ کی دعاء:

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ بسم الله انشدك عهدك ووعدك اللهم ان شئت لم تعبدنا بخدا ابوبكر بيله فقال حسبك فخرج وهو يقول سيهزم الجمع ويولون الدبر

(بخاری باب غزوة بدر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ بدر کے دن رب کے حضور عرض کر رہے تھے اے اللہ میں تجھ سے وعدہ پورا کرنے کی درخواست کرتا ہوں، اے اللہ تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت نہ کی جائے؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہاتھ مبارک پکڑ لیا، اور عرض کیا کہ تمہیں کافی ہے، تو آپ (اپنے عریضہ یعنی قبہ سے) نکلے، تو آپ فرما رہے تھے غم قریب جماعتیں شکست کھا جائیں گی اور پیٹھ پھیر جائیں گی۔



## وضاحت حدیث :

”انشدک“ بضم الشین ای اطلب منک الوفاء بماعہدت و وعدت من الغلبۃ علی الکفار والنصر للرسول و اظہار الدین“

اے اللہ! جو تو نے مومنوں کو کفار پر غالب کرنے کا، اور اپنے رسول ﷺ کی امداد کرنے کا اور دین کو غلبہ عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، میں اس وعدہ کی وفاء تجھ سے طلب کرتا ہوں، یہاں حدیث شریف میں ”عہد اور وعدہ“ ایک ہی معنی میں استعمال ہے ”ان شئت لم تعبد“ کا مطلب تقریباً وہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں واضح طور پر موجود ہے ”اللہم ان تہلک ہذہ العصابة من اہل الاسلام لاتعبد فی الارض“

اے اللہ اگر تو نے مسلمانوں کی اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو زمین میں تیری عبادت کرتے والا کوئی نہیں رہے گا۔

”حسبک“ ای یکفیک من القول فاترکہ ”حسبک“ کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی کریم ﷺ ”آپ کا اتنا عرض کرنا کافی ہے، اب آپ چھوڑ دیں“ علامہ خطابی کہتے ہیں کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ نبی کریم ﷺ سے آپ کی امداد کرنے کا فرمایا اس کے پورا کرنے کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بنسبت رسول اللہ ﷺ کے زیادہ وثوق تھا۔ ”انہ لایجوز ذلک قطعاً“ بیشک یہ کہنا ہرگز جائز نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ پر شفقت کرتے ہوئے اور ان کو تقویت پہنچانے کیلئے یہ دعاء کر رہے تھے، خاص کر کے اسلام میں یہ پہلا غزوہ تھا ”فابتہل فی الدعاء لیسکنہم اذ کانوا یعلمون ان وسیلته مقبولة ودعاءہ مستجاب“ اسلئے نبی کریم ﷺ بڑی انکساری سے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہوئے دعاء فرما رہے تھے تاکہ صحابہ کرام کے دلوں کو سکون حاصل ہو جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا وسیلہ مقبول ہے، اور آپ کی دعاء کو قبول کیا جاتا ہے۔ کیا اس طرح کی دعاء کہیں اور بھی فرمائی؟ ہاں ابو نعیم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ذکر کی کہ آپ نے غزوہ احد میں یہ دعاء فرمائی ”اللہم انک ان تشاء لاتعبد فی الارض“ (واللہ اعلم)

(یعنی جزء ۷ صفحہ نمبر ۸۱)

نبی کریم ﷺ کیلئے عریشہ بنایا گیا:

عریشہ اس جھونپڑی کو کہتے ہیں جو اکثر طور پر باغ میں ٹہنیوں اور پتوں سے بناتے ہیں، نہایہ میں ہے ”العریش کل یستظل بہ“ عریش اسے کہتے ہیں جس کے سایہ میں آرام کیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی اجازت سے بدر میں آپ کیلئے عریشہ تیار کیا، نبی کریم ﷺ نے ان کے حق میں دعاء خیر فرمائی، آج عریشہ کی جگہ مسجد بنی ہوئی ہے،



جیسا کہ کئی اور مقام پر یادگاروں کو قائم کرنے کیلئے مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ (ماخوذ از مدارج النبوة جلد دوم بالاختصار)

## قریش کے ایک لشکری نے قریش کو جنگ سے منع کیا:

قریش نے اپنے ایک لشکری کو بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر بتائے، اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بتایا کہ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے قریب نظر آتی ہے اس نے کہا اے گروہ قریش میں نے ان بلاؤں کو دیکھا ہے جو اموات کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور یثرب کے ان اونٹوں کو دیکھا ہے جو ہر قاتل کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، مطلب یہ کہ ان کے ساتھ جنگ کرنا تمہاری ہلاکت کا سبب ہے، جب تم سب ہلاک ہو جاؤ گے، تو تمہارے پیچھے زندہ رہنے والوں کا کیا فائدہ ہوگا؟ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم لوٹ چلو اور جنگ نہ کرو، حکیم بن خرام جو اس وقت کافروں میں تھا (بعد میں ایمان قبول کیا) اس نے بھی عتبہ کو یہی مشورہ دیا کہ واپس لوٹ چلو تو بہتر ہے، ورنہ تمہارا نام مٹ جائے گا، عتبہ نے کہا میرا ارادہ تو یہی ہے، البتہ تم ابو حنظلہ یعنی ابو جہل کے پاس جاؤ، اس کو واپس جانے کیلئے تیار کرو، حکیم بن خرام ابو جہل کے پاس آیا اسے واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا ابو جہل کو جب پتہ چلا کہ اسے میرے پاس عتبہ نے بھیجا ہے، تو اس نے عتبہ کے پاس آکر کہا ”افتضح سخرک“ یعنی تمہارے پیچھے پڑے میں ہوا بھر گئی، یعنی تم بزدل ہو گئے ہو، عتبہ نے کہا عنقریب پتہ چل جائے گا کس کا پیچھا پھولا ہوا ہے، بزدل کون ہے۔ (ماخوذ از مدارج النبوة جلد دوم)

## نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت:

جب لشکر اسلام میدان کارزار میں اتر آیا تو نبی کریم ﷺ نے صفوں کو برابر فرمایا، پھر ارشاد فرمایا جب تک میں حکم نہ دوں دشمنوں پر حملہ نہ کرنا، اور اگر وہ تمہارے قریب آجائیں تو تیرا اندازی شروع کر دینا، لیکن اتنے اندازے سے تیر پھینکنا کہ تیر ختم نہ ہو جائیں۔ (مدارج النبوة جلد دوم)

اس سے نبی کریم ﷺ کی جنگی مہارت واضح ہوتی ہے، کہ دشمن پر حملہ کرنے میں جلد بازی نہ کرنا بلکہ رکے رہنا، وہ تمہیں ڈرا ہوا، سہا ہوا سمجھیں گے، وہ تمہارے قریب ہونے کی کوشش کریں گے، جب وہ قریب آجائیں، تو اچانک تیرا اندازی شروع کر دو، انہیں سنبھلنے کا موقع نہ ملے، تیروں سے چھلنی ہو جائیں، پھر مسلمانوں کے پاس اسلحہ کم ہونے کی وجہ سے انہیں مشورہ دیا کہ آہستہ آہستہ اسلحہ استعمال کرنا، جلدی سے تمام اسلحہ جنگ میں نہ پھونک دینا، تاکہ دشمن کو پتہ چلے کہ تمہارے پاس بہت اسلحہ ہے۔



## نبی کریم ﷺ کے انصاف کی درخشاں مثال:

ارباب سیر نے ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کی صفیں درست فرما رہے تھے، تو آپ کے ہاتھ مبارک میں ایک چھڑی تھی، سواد ابن غریہ جو خوش طبع اور خوش فہم صحابی ہوئے ہیں، وہ صفوں سے آگے نکل آئے، نبی کریم ﷺ نے وہ چھڑی ان کے سینے پر لگاتے ہوئے فرمایا ”استویسا سواد“ اے سواد صف کو سیدھا کرو، سواد نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی چھڑی سے مجھے تکلیف ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق سے بھیجا ہے، عدالت و انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے آپ میرا قصاص دیجئے۔

نبی کریم ﷺ نے اسی وقت اپنے لباس مبارک کو اپنے سینہ اقدس سے دور کرتے ہوئے فرمایا اے سواد ابھی تم قصاص لے لو، سواد نے جلدی سے آگے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک کو چوم لیا، آپ نے فرمایا اے سواد تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہو سکتا ہے یہ میرا آخری وقت ہو، میں اس جنگ میں شہید ہو جاؤں، اس لئے میں نے چاہا کہ آخر میں میرا جسم آپ کے جسم سے مس ہو جائے، تو نبی کریم ﷺ ان کیلئے دعاء خیر فرمائی۔ (مدارج النبوة جلد ۲)

اس سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے دوران جنگ اگر کسی کیلئے دعاء فرمائی ”رحمہ اللہ“ تو اسے شہادت حاصل ہوئی، غزوہ خیبر میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عامرؓ کیلئے دعاء فرمائی ”یرحمہ اللہ“ تو ایک صحابی نے کہا ”وجبت یا رسول اللہ“ یا رسول اللہ اس کیلئے شہادت واجب ہوئی۔ (باب غزوة البخیر مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۲۰)

معنی وجبت ای ثبتت له الشهادة وستقع قريبا وكان هذا معلوما عندهم ان من دعاه  
النبي ﷺ هذا الدعاء في هذا الموطن استشهد“ (نووی)

”وجبت“ کا معنی یہ ہے کہ ”اس کیلئے شہادت ثابت ہو چکی ہے“ یعنی عنقریب شہادت واقع ہو جائے گی، صحابہ کرام کو یہ معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ میں جس کیلئے بھی رحمت کی دعاء کی، وہ اس جنگ میں شہید ہو گیا۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ صحابی نے نبی کریم ﷺ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو آپ نے اپنے آپ کو قصاص کیلئے پیش کر دیا، یہ نبی کریم ﷺ کے عدل و انصاف کی درخشاں مثال ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ صحابی نے قصاص نہ لیا اور لینے کا ارادہ تھا، بلکہ آپ کے جسم کو چومنا مقصود تھا، لیکن قصاص کے مطالبہ پر آپ کا اپنے آپ کو پیش کرنا عظیم عدل ہے۔

ولید، عتبہ، شیبہ کا پہلے نکلنا اور اپنے مقابل طلب کرنا:

جیسا کہ اس وقت جنگ کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے نامی گرامی بہادر لوگ صفوں سے باہر نکلتے، اور اپنے



مقابل لوگوں کے نکلنے کا مطالبہ کرتے، ایسے ہی بدر میں بھی صورت درپیش آئی، آئیے حدیث پاک دیکھئے۔

عن علی قال لما كان يوم بدر تقدم عتبة بن ربيعة وتبعه ابنه واخوه فنادی من يبارز فانتدب له شباب من الانصار فقال من اتم فاخبروه فقال لا حاجة لنا فيكم انما اردنا بنی عمنا فقال رسول الله ﷺ قم يا حمزة قم يا علي قم يا عبيدة بن الحارث فاقبل حمزة الى عتبة واقبلت الي شيبه واختلف بين عبيدة والوليد ضربتان فالتحن كل واحد منهما صاحبه لم ملنا على الوليد فقتلناه واحتملنا عبيدة رواه احمد وابوداؤد

(مشکوٰۃ باب القتال فی الجہاد صفحہ نمبر ۳۴۳)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ صف سے باہر نکلا، اس کے پیچھے اس کا بیٹا (ولید) اور اس کا بھائی شیبہ صفوں سے باہر نکلے، پکارا کون ہے جو ہمارے مقابلہ کیلئے آئے، ان کے اس چیلنج کو چند انصار کے نوجوان نے قبول کیا، (عتبہ نے) کہا تم کون ہو؟ انہوں نے اپنے متعلق خبر دی (کہ ہم انصار سے ہیں) اس نے کہا ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں، ہم تو اپنے خاندان قریش کو اپنے مقابلہ کیلئے بلا رہے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے حمزہ تم اٹھو، اے علی تم اٹھو، اے عبیدہ بن الحارث تم اٹھو، حمزہ عتبہ کے مقابل آگئے، (انہوں نے عتبہ کو قتل کر دیا) اور میں شیبہ کے مقابل آگیا (اس طرح حضرت علیؓ نے شیبہ کو قتل کر دیا) عبیدہ اور ولید کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوا، ہر ایک نے دوسرے کو زخمی کر کے تھکا دیا کمزور کر دیا، ہم ولید پر جھپٹ پڑے، ہم نے اسے قتل کر دیا، اور ہم عبیدہ کو اٹھا کر (خیمہ میں) لے آئے، عبیدہ شہید ہو گئے۔

**تنبیہ:** حضرت عبیدہ کی عمر اس وقت اسی سال تھی، عبیدہ کو زخمی حالت میں خیمہ میں لایا گیا تھا، ان کی پنڈلیوں کا مغز بہہ رہا تھا، چونکہ میدان جنگ میں جلدی یہ جان نہ دے سکے، تو ان کو خیال آیا کہ شاید مجھے شہادت حاصل نہیں ہوگی، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا میں شہید نہیں؟ تو آپ نے فرمایا ہاں تم شہید ہو۔

(مدارج النبوة جلد دوم)

### ابو جہل کا قتل:

عن عبدالرحمن بن عوف انه قال بينا انا واقف في الصف يوم بدر نظرت عن يميني وشمالی فاذا انا بين غلامين من الانصار حديثه اسنانهما تمنيت لو كنت بين اضلع منهما فغمزني احدهما فقال يا عم هل تعرف ابا جهل قال قلت نعم وما حاجتك اليه يا ابن اخي قال اخبرت انه يسب رسول الله ﷺ والذى نفسي بيده لئن رأيت لا يفارق



سوادى سواده حتى يموت الاعجل منافال فتعجبت لذلك فغمزنى لذلك  
فغمزنى الآخر فقال مثلها قال فلم انشب ان نظرت الى ابى جهل يزول فى الناس  
فقلت الا ترى ان هذا صاحبكما الذى تسألون عنه قال فابتدراه فضرباه بسيفهما حتى  
قتلاه ثم انصرفا الى رسول الله ﷺ فاخبراه فقال ايكما قتله فقال كل  
واحد منهما انما قتله فقال هل مسحتما قال لا فنظر فى السيفين فقال ايكما قتله فقال  
كلا كما قتله وقضى بسلبه لمعاذ بن عمرو بن جموح والرجلان معاذ بن عمرو الجموح  
ومعاذ بن عفراء“

(مسلم جلد ثانی صفحہ نمبر ۹۶ باب الاستحقاق القاتل سلب القتل)

حضرت عبدالرحمن بن عوف فرماتے ہیں، بیشک میں بدر کی جنگ کے دوران قتال کی صف میں کھڑا تھا، میں نے دائیں اور بائیں دیکھا کہ میں تو دونوں جوانوں تھوڑی عمروں کے انصار کے درمیان ہوں، میں نے تمنا کی کاش کہ میں بہادر اور جنگی تجربہ کار شخصوں کے درمیان ہوتا، تو اتنے میں ان دونوں میں سے ایک نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اے میرے چچا کیا تم ابو جہل کو جانتے ہو، میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں، تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ اس نے کہا مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا گالیاں دیتا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میں اسے دیکھ لوں تو میرا جسم اس کے جسم سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ مر جائے جس کی موت ہم میں سے جلدی آتی ہے، عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں میں نے اس کی بات پر بہت تعجب کیا جو اس نے میرے ساتھ کی، اتنے میں دوسرے نے میرے ساتھ کلام کیا اسی طرح جس طرح پہلے نے کیا تھا، یہ کہتے ہیں میں ابو جہل کو دیکھنے لگا کہ وہ کہاں ہے، کیونکہ وہ گھوم پھر رہا تھا، تو میں نے اسے دیکھتے ہی ان دونوں کو بتایا وہ ہے تمہارا صاحب (ابو جہل) جس کے متعلق تم پوچھ رہے تھے، یہ کہتے ہیں ان دونوں نے جلدی اپنی تلواروں سے اس پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا، پھر یہ دونوں وہاں سے لوٹ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ابو جہل کے قتل کی خبر دی، آپ نے فرمایا تم میں سے کس نے قتل کیا ہے، تو ان میں سے ہر ایک نے کہا میں نے قتل کیا ہے، پھر آپ نے فرمایا کیا تم دونوں نے اپنی اپنی تلواروں کو صاف کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، آپ نے دونوں کی تلواروں کو دیکھ کر فرمایا تم دونوں نے ہی اسے قتل کیا ہے، پھر آپ نے ابو جہل کا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو دے دیا، وہ انصاری دونوں جوانوں میں سے ایک معاذ بن عمرو بن جموح تھے، اور دوسرے معاذ بن عفراء تھے۔

**وضاحت حدیث:** ”تمنیت لو كنت بين اضلع منهما“ اضلع کا اصلی معنی بڑی پسلیوں والا، لیکن مراد اس سے بہادر آدمی ہے، بخاری کی بعض روایات میں ”اصلع“ آیا ہے، زیادہ صلاحیت رکھنے والا، تجربہ



کار، اگرچہ ”اضلع“ کو زیادہ صحیح قرار دیا گیا ہے، لیکن راقم نے ترجمہ علامہ نووی رحمہ اللہ کے اس قول کے مطابق کیا ہے ”ولعله قالهما جميعا ومعنى اضلع القوي“ ہو سکتا ہے حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ نے دونوں لفظ کہے ہوں، ایک راوی نے ایک لفظ استعمال کیا ہو، دوسرے دوسرا لفظ استعمال کیا ہو، راقم کا ترجمہ دونوں لفظوں کا اعتبار کرتے ہوئے ہے، آئیے دیکھئے ”میں نے تمنا کی کاش میں بہادر اور جنگی تجربہ کار شخصوں کے درمیان ہوتا“ ”لايفسارق سوادى سواده اى شخصى شخصه“ میری ذات اس کی ذات سے، میرا جسم اس کے جسم سے جدا نہیں ہوگا، یہاں تک کہ جس کی موت جلدی آئی ہے وہ مر جائے گا، میری موت پہلے آئے یا اس کی موت پہلے آئے۔

(ماخوذ از نووی)

**اعتراض:** بعض روایات میں آتا ہے کہ ابن مسعود ؓ نے ابو جہل کو قتل کیا، دونوں روایات میں کس طرح تطبیق دی جائے گی۔

**جواب:** ابو جہل پر تلوار معاذ بن عفراء نے چلائی، اور معاذ بن عمرو بن جموح نے بھی چلائی، لیکن ابو جہل زمین پر معاذ بن عمرو بن جموح کی تلوار سے گرا (اور ٹھنڈا ہوا اسی وجہ سے ابو جہل کا سامان ان کو دیا گیا، اگرچہ حضور ﷺ نے دونوں کے متعلق فرمایا کہ تم دونوں نے ہی قتل کیا ہے ”وجاء ابن مسعود بعد ذلك وفيه رمق فجز رقبته“ اس کے بعد ابن مسعود آئے جبکہ ابو جہل کے کچھ آخری سانس موجود تھے تو انہوں نے اس کی گردن کاٹ دی۔ (ماخوذ از نووی)

**اعتراض:** اس روایت میں ذکر ہے کہ ابو جہل معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء نے قتل کیا ہے، لیکن دوسری روایت میں یہ ہے کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے قتل کیا ہے، تو کس طرح دونوں روایات میں تطبیق دی جاسکتی ہے، آئیے پہلے وہ روایت دیکھئے پھر جواب دیا جائے گا۔

عن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ من ينظر لنا ماصنع ابو جهل فانطلق ابن مسعود فوجد قد ضرب به ابنا عفراء حتى برد قال فاخذ بلحيته فقال انت ابو جهل فقال وهل فوق رجل قتلتموه او قال قتله قومه قال وقال ابو مجلز قال ابو جهل فلو غيرا كارقتلنى“

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو دیکھ کر یہ بتائے ابو جہل سے کیا ہوا؟ ابن مسعود گئے، انہوں نے اسے اس حالت میں پایا کہ عفراء کے دو بیٹوں نے اسے تلواریں مار کر ٹھنڈا کر دیا ہے (لیکن ابھی وہ مکمل نہیں مرا تھا) ابن مسعود نے اس کی داڑھی کو پکڑ کر کہا کیا تو ابو جہل ہے؟ اس نے کہا کیا تم نے ایک



بڑے شخص کو قتل نہیں کیا؟ یا اس نے کہا کیا اسے اس کی قوم نے قتل کیا ہے ابو مجلز کی روایت میں ہے کہ ابو جہل نے کہا کاش مجھے دہقانی قتل نہ کرتے، یعنی انصار کے نوجوان جو کھیتی باڑی کرتے ہیں کاش کہ وہ مجھے قتل نہ کرتے بلکہ قریش کے لوگ مجھے قتل کرتے، کیسا متکبر تھا مرتے دم بھی اس کا تکبر اس کے رگ وریشہ سے نہ نکلا۔

عبداللہ سندھی کا جواب لیکن ضعیف:

قوله قد ضرب ابناعفراء يمكن ان يكون به تغليب بناء على ما سبق ان احدهما كان ابن عفراء والآخر غيره فهذا التغليب في الاضافة كما يغلب اطلاق نفس الاسم كما في عمرين ونحوه“ (حاشیہ مسلم سندی)

عفراء کے دو بیٹوں کو جو ذکر ہے اس میں قاعدہ تغلیب جاری کیا گیا ہے جیسے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو عمرین کہا گیا ہے، اسی طرح اس روایت میں معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو بن جموح کو ”ابنا عفراء“ کہہ دیا گیا ہے، حالانکہ ایک ابن عفراء ہے دوسرا ابن عفراء نہیں۔

**صحیح جواب:**

(والرجلان) ای الغلامان (معاذ بن عمرو بن الجموح ومعاذ بن عفراء) ہی امہ واما اخوان امهما واحدوا ابوہما مختلف“

(مشکوٰۃ باب قسمة الغنائم والغلول فیہا، مرقاة جلد ۸ صفحہ نمبر ۵۸)

معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء دونوں بھائی تھے، دونوں کی ماں عفراء تھی، البتہ باپ دونوں کے علیحدہ علیحدہ تھے، ایک روایت میں معاذ بن عمرو بن جموح ذکر کیا گیا جس میں نسبت باپ کی طرف کی گئی، اور دوسری روایت میں ”ابنا عفراء“ کہا گیا ہے، یعنی عفراء کے دونوں بیٹے، اس روایت میں ماں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

فرشتوں کو دیکھنا اور ان کی آواز سننا:

وعن ابن عباس ان النبی ﷺ قال يوم بدر هذا جبريل آخذ برأس فرسه عليه اداة“

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ باب المعجزات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، بیشک نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن فرمایا یہ جبریل ہیں اپنے گھوڑے کے سر کو پکڑے ہوئے ہیں، جبریل پر آلات حرب ہیں، یعنی وہ اسلحہ سے مسلح ہیں۔

”ولعله ﷺ اظہرہ لانس حتی ابصرہ کما یبشیر الیہ قوله هذا لانه فی الاصل موضوع للمحسوس“



وبہذا یتبین وجہ ایراد الحلیث فی باب المعجزات

شاید نبی کریم ﷺ نے (اپنے ہم رکاب) حضرت انس رضی اللہ عنہ پر ظاہر فرمایا ہو، اور انہیں جبریل دکھائے ہوں، اسی وجہ سے ”ہذا“ سے اشارہ کیا گیا، جو اصل میں محسوس چیز کی طرف اشارہ کیلئے وضع کیا گیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دکھانا آپ کا معجزہ تھا اسی وجہ سے مشکوٰۃ میں یہ حدیث کتاب المعجزات میں ذکر ہے۔

وعن ابن عباس قال بینما رجل من المسلمین یومئذ یشتد فی الرّجل من المشرکین امامہ اذ سمع ضربة بالسوط فوقہ وصوت الفارس یقول اقدم حیزوم اذنظر الی المشرک امامہ خر مستلقیا فنظر الیہ فاذا هو قد خطم انفہ وشق وجہہ کضربة السوط فاخضر ذلک اجمع فجاء الانصاری فحدث رسول اللہ ﷺ فقال صدقت ذلک من مدد السماء الثالثة فقتلوا یومئذ سبعین“ (رواہ مسلم مشکوٰۃ کتاب المعجزات)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مسلمانوں میں سے ایک شخص اس دن ایک مشرک کے پیچھے تیز تیز دوڑ رہا تھا جو اس کے آگے آگے تھا، مسلمان نے اچانک مشرک پر کوڑا کی ضرب (مار) کی آواز سنی، اور ایک سوار کی آواز سنی جو یہ کہہ رہا تھا ”اقدم حیزوم“ حیزوم آگے بڑھو، مسلمان نے مشرک کو دیکھا جو اس کے آگے تھا، وہ سیدھا گر چکا تھا، اور مسلمان نے اسے دیکھا کہ اس کی ٹاک کٹ چکی تھی، اور اس کے چہرے پر کوڑا چلنے کا نشان موجود تھا، وہ مشرک تمام سیاہ ہو چکا تھا، وہ انصاری نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ کے سامنے واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا ہاں تم نے سچ کہا، یہ تیسرے آسمان سے امداد آئی تھی، اس دن ستہر آدمی کافروں کے قتل کر دئے گئے اور ستہر قید کر لئے گئے۔

### وضاحت حدیث:

چند مشکل الفاظ یا ان میں ضمیروں کے مرجع کی طرف طلباء کرام توجہ دیں تاکہ معنی درست کیا جاسکے ”یشتد ای یسرع ویعدو“ یشتد کا معنی یہاں یہ ہے ”تیز چلنا، اور دوڑنا“ ”فی الرّجل“ بعض حضرات نے بیان کیا کہ ”رجل“ کی راء کے نیچے کسرہ ہے اور جیم ساکن ہے یعنی مشرک پیدل دوڑ رہا تھا، اور مسلمان بھی اس کے قدموں کے نشانوں پر تیز دوڑ رہا تھا بعض حضرات نے ”راء“ کے فتح سے پڑھا ہے کہ وہ اس مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا، (اذسمع) ای المسلم (ضربة) ای صوت ضربة بالسوط (فوقہ) ای فوق المشرک ”مسلمان نے اچانک مشرک پر کوڑا کی مار کی آواز سنی۔ مسلمان نے سوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے ”اقدم حیزوم“ ”وحیزوم اسم فرس الملک“ حیزوم فرشتے کے گھوڑے کا نام ہے اور ”اقدم



”کو دو طرح پڑھا گیا ہے، ایک ہمزہ اور دال کے ضمہ (پیش) سے، معنی اس کا ہے ”تقدم“ آگے بڑھ“ راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے۔

دوسرا ہمزہ کے فتح (زبر) اور دال کے کسرہ (زیر) سے اس، اس کے پھر دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی ”اعزم“ سیدھے ہو کر، مضبوط ہو کر رہو، اور دوسرا مطلب علامہ نووی نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ گھوڑے کیلئے کلمہ زجر ہے۔ ”فاخضر ذلک اجمع“ احضر“ کی راء مشدود ہے، احضرار کا معنی سبز ہو جانا یا سیاہ ہو جانا، کیونکہ ”فان الخضرۃ قد تستعمل بمعنی السواد کعکسہ للمبالغة“ بیشک خضرۃ کبھی سواد کے معنی میں آتا ہے، اور سواد کبھی خضرۃ کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے (سواد کا معنی سیاہ، خضرۃ کا معنی سبز) اگرچہ علامہ قاری رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے ”ای صار موضع الضرب کلہ اخضر او اسود“ جہاں اسے کوڑا لگا (اور اس کا ناک کٹا اور چہرہ زخمی ہوا) وہ تمام جگہ سبز یا زخمی ہو گئی۔ راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے یہ خیال کرتے ہوئے کہ فرشتہ کے کوڑے کی ضرب کی وجہ سے وہ مشرک مکمل سیاہ ہو گیا۔ (واللہ اعلم)

انصاری نے جب نبی کریم ﷺ کو واقعہ بتایا تو آپ نے فرمایا ”صدقت ذلک من مدد السماء الثالثة“ تم نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان سے امداد آئی ”اس میں صحابی کی کرامت سمجھ آرہی ہے کہ انہوں نے فرشتے کی آواز سنی، اس کی ضرب کو دیکھا، اور نبی کریم ﷺ کا معجزہ واضح ہو رہا ہے ”لان المدد کان من السماوات کلها وهذا من الثالثة خاصة“ کیونکہ امداد تو تمام آسمانوں سے آرہی تھی لیکن یہ امداد جو اس صحابی کو حاصل ہوئی وہ خاص کر کے تیسرے آسمان سے آئی تھی، یہی وجہ ہے جبہ صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو کتاب المعجزات میں ذکر کیا ہے۔ (مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۱۶۶، ۱۶۷)

### استاذی المکرم کا استدلال:

اس حدیث کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت علامہ محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے فرمایا تھا کہ فرشتوں کا ناک اور چہرے پر ضرب لگانا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو تسلی دینے کیلئے آئے تھے، لڑنے کیلئے نہیں آئے تھے، کہیں کہیں ضرب سے کام لیا، وہ بھی معمولی، اگر لڑنے کیلئے آتے تو گلا کاٹتے، ناک کاٹتے، چہرہ زخمی کرنا کیا مقصد ہے؟

غزوہ احد میں بھی فرشتوں کو دیکھا گیا:

”وعن سعد بن ابی وقاص قال رأیت عن یمین رسول اللہ وعن شمالہ یوم احد رجلین



عليهما ثياب بيض يقاتلان كما شد القتال مارايتها قبل ولا بعد يعني جبريل وميكائيل“  
(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ کتاب المعجزات)

حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اور دوسری جانب غزوہ احد کے دن دو آدمیوں کو دیکھا ان پر سفید کپڑے تھے، بہت شدید قتال کر رہے تھے، میں نے یہ منظر نہ اس سے پہلے دیکھا، نہ بعد۔ ”والاظہر ان معناه قتالا مثل اشد قتال رجال الالس“ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں کی طرح انسانی طاقت کے مطابق شدید لڑائی کر رہے تھے ورنہ ایک پر کی نوک سے مشرکین کو زیر و زبر (اوپر نیچے) کر دیتے۔  
(مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۱۶۷)

### پانچ ہزار فرشتے آئے یا نہیں:

زیادہ مفسرین کرام نے تو یہی لکھا ہے کہ پہلے ایک ہزار فرشتوں سے پھر تین ہزار فرشتوں سے اور پھر پانچ ہزار فرشتوں سے امداد کی گئی، یعنی پانچ ہزار فرشتے کل تعداد میں تھے۔ لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے۔  
”فجعل مجی خمسة آلاف من الملائكة مشروطا بثلاثة اشیاء الصبر والتقوى و  
مجی الکفار علی الفور فلما توجد هذه الشرائط لا جرم لم يوجد المشروط“

پانچ ہزار فرشتوں کا آنا تین شرطوں سے مشروط تھا، (۱) صبر (۲) تقویٰ (۳) کافروں کا فوراً حملہ کرنا۔ جب یہ تینوں شرطیں مجموعی طور پر نہیں پائی گئیں، کیونکہ کافروں کا فوراً اور اچانک حملہ کرنا ثابت نہیں، جب شرط نہیں پائی گئی تو مشروط یعنی پانچ ہزار فرشتوں کا آنا بھی ثابت نہیں۔ (کبیر)  
(واللہ اعلم بالصواب)

### نبی کریم ﷺ کا کفار کیلئے دعاء ہلاکت کرنا:

عن عبد الله بن مسعود ؓ قال استقبل النبي ﷺ الكعبة فدعا على نفر من قريش على شية  
بن ربيعة وعتبة بن ربيعة والوليد بن عتبة وابی جهل بن هشام فاشهد بالله لقلوبهم  
صرعى قد غيرتهم الشمس وكان يوم احاراً“ (بخاری، باب دعاء النبی ﷺ علی کفار قریش الخ)

حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر (بدر کے دن) قریش کے چند لوگوں یعنی شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ اور ابو جہل بن ہشام کیلئے دعاء ہلاکت کی (کہ اے اللہ کو ہلاک کر دے) میں گواہی دیتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان سب کو ہلاک ہوئے دیکھا، ان کے جسموں کو دھوپ نے بدل دیا تھا، وہ دن بڑا گرم تھا۔



## قدرت کا عجیب فیصلہ:

حضرت بلال ؓ امیہ بن خلف کے غلام تھے، حضرت بلال ؓ کے ایمان لانے پر اس نے آپ پر بڑے مظالم ڈھائے، حضرت بلال ؓ کی مظلومیت کو دیکھ کر حضرت ابو بکر ؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا، لیکن حضرت بلال نے بدر کے دن کچھ اور ساتھیوں کی مدد سے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا۔

عن عبد الرحمن بن عوف قال کاتب امیہ بن خلف فلما کان یوم بدر فذکر قتله ابنه فقال بلال لانجوت ان نجامیہ“  
(بخاری باب قتل ابی جہل)

عبد الرحمن بن عوف کہتے ہیں میں نے امیہ بن خلف سے معاہدہ کیا ہوا تھا، جب بدر کا دن ہوا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے قتل کا ذکر کیا گیا (کہ ان کو قتل کر دیا جائے) تو حضرت بلال نے کہا میری نجات نہیں اگر امیہ نے نجات پالی۔

## وضاحت حدیث:

کاتب معناه عاہدت امیہ بن خلف (بفتح تین) ولفظ الذی فی کتاب الوکالۃ کاتب امیہ بن خلف کتابان یحفظنی فی صاغیتی بمکۃ واحفظہ فی صاغیتہ“ و صاغیۃ الرجل خاصتہ والذین یمیلون ویاتونہ“

”کاتب“ کا معنی ہے کہ میں نے امیہ بن خلف سے (خاء اور لام پر زبر) معاہدہ کیا“ بخاری کتاب الوکالۃ میں یہ حدیث زیادہ الفاظ سے زیادہ واضح ہے، اس میں آگے والے الفاظ ”کاتب“ سے لے کر ”فی صاغیتہ“ تک ہیں ”صاغیۃ الرجل“ انسان کے خاص آدمی جو اس کی طرف میلان کریں اور اس کے پاس آئیں، لیکن اس مقام پر حملہ کرنے والے خاص لوگ ہیں، وہ معاہدہ ایک دستاویز کی صورت میں لکھا گیا، کہ اگر مکہ میں مجھ پر کوئی حملہ کرے تو تم مجھے بچانا، اور تم پر کسی نے حملہ کیا تو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ آگے بخاری کتاب الوکالۃ کی حدیث میں مزید وضاحت موجود ہے۔

”قال فلما کان فی یوم بدر خرجت الی جبل لاخرزہ حین نام الناس فابصرہ بلال فخرج حتی وقف علی مجلس من الانصار فقال ”امیہ بن خلف“ لانجوت ان نجامیہ فخرج معہ فریق من الانصار فی آثار فلما خشیت ان یلحقونا خلفت لہم ابنہ لاشتغالہم فقتلوا لہم ابواحتی یتبعونا وکان رجلاً ثقیلاً فلما اشر کونا قلت لہ ابرک فبرک فالقیہ علیہ نفسی لامنہ فتخللوا بالسیوف من تحتی حتی قتلوا“



عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں جب بدر کا دن واقع ہوا تو میں ایک پہاڑ کی طرف نکلا کہ جب لوگ سوئے ہوئے ہوں (یعنی دو پہر قیلولہ کے وقت) تو میں اسے بچالوں، یعنی پہاڑ میں کہیں چھپا دوں، لیکن بلال نے اسے دیکھ لیا، یہ انصار کی ایک مجلس میں جا کھڑے ہوئے، اور کہا ”وہ امیہ بن خلف ہے“ ”میری نجات نہیں اگر امیہ نے نجات پالی“ انصار کے چند آدمی (حضرت بلال کے ساتھ) ہمارے پیچھے چل پڑے، جب مجھے خوف لاحق ہوا کہ یہ تو ہمیں مل جائیں گے، تو میں نے امیہ کے بیٹے کو پیچھے چھوڑ دیا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ مشغول ہو جائیں گے (یعنی اس سے پوچھیں گے تمہارا باپ کہاں ہے، اسے قتل کرنے کا وہ ارادہ نہیں رکھیں گے) لیکن انصار صحابہ نے امیہ کے بیٹے کو قتل کر دیا، پھر انہوں نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئے، امیہ بن خلف جسم شخص تھا، جب انہوں نے ہمیں پالیا (یعنی بہت ہی ہمارے قریب ہو گئے) تو میں نے اسے کہا ایسے بیٹھ جا جیسے اونٹ بیٹھتے ہیں، وہ اسی طرح بیٹھ گیا، میں نے اپنے آپ کو اس کے اوپر ڈال دیا تاکہ میں اسے بچا سکوں، لیکن صحابہ کرام نے میرے نیچے سے تلواریں گھسا کر اسے قتل کر دیا۔

”قال الکرماني فقتله بلال لانه كان قد عذب بلالا كثيرا في المستضعفين بمكة“  
علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال ؓ نے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا، کیونکہ اس نے مکہ میں حضرت بلال ؓ کو کمزور سمجھ کر بہت زیادہ تکالیف پہنچائی تھیں، کیا خوب کسی نے کہا۔  
هنيئذا دك الرحمن فضلا فقد ادركت لارك يا بلال

مبارک ہو تم پر کتنا زیادہ اللہ کا فضل ہے تم نے پالیا ہے اپنے مظالم کا بدلہ اے بلال  
**اعتراض:** پہلے جو حدیث بیان کی گئی اس میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گزر گیا کہ میرے صحابہ امیہ بن خلف کو قتل کریں گے بخاری کی کتاب الوکالہ میں مذکور حدیث میں بھی جمع کا صیغہ ہے ”حتی قتلوه“ تو علامہ کرمانی رحمہ اللہ کا قول کیسے صحیح ہے کہ حضرت بلال ؓ نے امیہ بن خلف کو قتل کیا۔

**جواب:** ان الحديث لا يدل على ان بلالا اختص بقتل امية ويمكن ان يكون بلال مع الذين تخللوه بالسيوف تحت عبدالرحمن ابن عوف فصار من جملة القاتلين  
یہ بات قابل تسلیم ہے کہ حدیث پاک سے یہ واضح نہیں کہ صرف اکیلے حضرت بلال ؓ بھی شریک تھے لہذا ان کی طرف نسبت کرنا درست ہے۔  
(ماخوذ از عمدۃ القاری جلد ۱)

یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت بلال ؓ کو مکہ مکرمہ میں ہی حضرت ابو بکر ؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا، اسلئے آپ کے ارشاد ”لا نجوت ان نجاة امیہ“ کا یہ مطلب نہیں کہ امیہ اگر نجات پا گیا تو مجھ پر پہلے کی طرح



مظالم ڈھائے گا تو مجھے اس سے نجات حاصل نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ مجھ پر ظلم کرنے والا آج بچ نہ جائے، وہ بچ گیا تو مجھے افسوس رہے گا کہ وہ ظالم کیوں قتل نہیں ہوا، اس طرح میں افسوس سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔ بدر میں قریش کے سردار قتل ہونے والوں پر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی دعاء ہلاکت کا بھی اثر تھا:

عن عبد الله قال بينما رسول الله ﷺ ساجد وحوله ناس من قریش اذ جاءه عقبه ابن معيط بسلا جزور فخذفه على ظهر رسول الله ﷺ فلم يرفع رأسه فجاءت فاطمة فاخذته عن ظهره ودعت على من صنع ذلك فقال اللهم عليك الملائكة من قریش اباجهل بن هشام وعتبة بن ربيعة وشيبة بن ربيعة بن ابی معيط وامية بن خلف شعبة الشاك قال فلقد رايتهم قتلوا يوم بدر فالقوا في بئر غير ان امية او ابيا تقطعت او صاله فلم يلق في البئر

(مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۱۶ باب مالک النبی ﷺ اذی من المشرکین والمنافقین)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) ؓ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تہجد کر رہے تھے، آپ سجدہ میں گئے، آپ کے ارد گرد قریش کے کچھ لوگ تھے، عقبہ بن ابی معیط ایک اونٹنی کی جیلی لے کر آگیا، اور نبی کریم ﷺ کی پیٹھ پر رکھ دی، آپ نے سر نہیں اٹھایا یہاں تک کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ نے حضور ﷺ کی پیٹھ سے اس جیلی کو ہٹایا، اور آپ ان لوگوں کے خلاف دعاء کر رہی تھیں جنہوں نے یہ کام کیا تھا، اے اللہ قریش میں سے ابوجہل بن ہشام اور عتبہ بن ربيعة اور شیبہ بن ربيعة اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف یا ابی بن خلف کو تو اپنی گرفت میں لے لے ”یہ شعبہ راوی کو شک گذار کہ امیہ بن خلف ہے یا ابی بن خلف ہے“ راوی بیان کرتے ہیں کہ تحقیق میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر لوگ بدر کے دن قتل کر کے ایک کنویں میں ڈال دئے گئے، البتہ امیہ یا ابی کے جوڑ کٹ گئے تھے اسے کنویں میں نہیں ڈالا گیا۔

### وضاحت حدیث:

السلا بفتح السين المهملة وتخفيف اللام مقصور وهو اللفافة التي يكون فيها الولد في بطن الناقة وسائر الحيوان وهي من الآدمية مشيمة

سلا لام مقصورہ سے ہے، اسی وجہ سے المنجد میں رسم الخط بھی ”سلسی“ استعمال کیا گیا ہے، یہ اس لفافہ کو کہتے ہیں جس میں اونٹنی وغیرہ کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے، ہماری زبان میں اسے ”جیلی“ کہتے ہیں بلکہ پنجابی میں ”جیر“ کہتے ہیں، اور انسانوں میں اس لفافہ کو ”مشیمہ“ کہتے ہیں۔

**اعتراض:** جیلی میں تو خون اور رطوبت ہوتی ہے جو نجس ہیں، تو نبی کریم ﷺ نے پیٹھ پر نجس جیلی کے ہوتے



ہوئے نماز کیسے جاری رکھی؟

**جواب:** اِنَّهُ لَمْ يَعْلَمْ مَا وَضَعَ عَلَى ظَهْرِهِ فَاَسْتَمَرَّ فِي سَجْدَةٍ اَتَصْحَابًا لِلطَّهَارَةِ“  
بیشک نبی کریم ﷺ کو معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی پیٹھ پر جیلی رکھ دی گئی، آپ تو طہارت سے نماز ادا کر رہے تھے۔

راقم نے علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول ”لم يعلم“ پر اپنے قلمی حاشیہ میں یہ لکھا۔  
”قوله لم يعلم لان النبي اذا كان يصلي فيتوجه توجها كاملا الى الله ، ولهذا لم يعلم لغير الله في الصلوة“

آپ کامل توجہ سے فناء فی اللہ کے درجہ میں نماز ادا کرتے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی طرف توجہ نہ ہو سکی، لہذا یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میری پیٹھ پر کوئی چیز رکھ دی گئی، البتہ یہ خیال رہے کہ علامہ نووی کا مختار یہ ہے کہ آپ نے محسوس ہونے پر بعد میں نماز کو لوٹا لیا تھا، اگرچہ اس وقت نماز کو نہیں لوٹایا کیونکہ وقت میں وسعت تھی۔ (نووی)

**مقام توجہ:** مسلم شریف کی اس حدیث سے پہلے مذکور حدیث میں ہے ”قال ابو اسحاق الوليد بن عقبة غلط في هذا الحديث“ ابو اسحاق نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ولید بن عقبہ (بالقاف) درست نہیں، اس کے بعد حدیث میں صحیح نام مذکور ہے ”وليد بن عقبه“ (بالتاء)

”قال العلماء والوليد بن عقبة بالقاف هو ابن ابي معيط لم يكن ذلك الوقت موجودا وكان طفلا صغيرا جدا“

ولید بن عقبہ (بالقاف) جو ابن ابی معیث تھا اس وقت موجود نہیں تھا، یا بہت چھوٹا بچہ تھا۔

**اعتراض:** حدیث شریف میں ہے ”قال فلقدر ایتم قتلوا يوم بدر فالفوا في بئر“ راوی کہتے ہیں میں نے ان تمام کو دیکھا کہ وہ قتل کر دئے گئے اور ایک کنویں میں پھینک دئے گئے، حالانکہ عمارہ بن ولید بدر میں قتل نہیں کیا گیا بلکہ یہ حبشہ کے کسی جزیرہ میں مرا ہے۔

**جواب:** ان المراد انه رأى اكثرهم بدليل ان عقبة بن ابي معيط منهم ولم يقتل ببدر“  
راوی نے جو جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے اس سے مراد اکثر لوگ ہیں، کیونکہ عقبہ بن ابی معیط بدر میں قتل نہیں کیا گیا۔ (نووی)

راقم کے نزدیک صحیح جواب:

راقم کے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ اس روایت میں عمارہ بن ولید کا ذکر ہی نہیں بلکہ بخاری کی ایک روایت



میں عمارہ بن ولید کا ذکر ہے، اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کا ذکر بھی ہوا ہے، اس لئے اس روایت کے مطابق راوی نے سب کو (جو اس روایت میں ہیں) بدر میں دیکھا کہ انہیں قتل کر کے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا۔

**تنبیہ:** ولید بن عقبہ بن ابی معیط بدر میں نہیں تھا، البتہ اس کا باپ عقبہ بن ابی معیط بدر میں تھا، یہ بھی قتل نہیں ہوا تھا، البتہ قیدی بنایا گیا تھا ”وانما قتله النبی ﷺ صبرا بعد انصرافہ من بدر یعرق الظبیه“ بدر سے لوٹتے ہوئے مقام ”عرق الظبیه“ میں اسے نبی کریم ﷺ نے قتل کر دیا، یعنی آپ نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا (نوی) عقبہ بن ابی معیط کا تذکرہ اس روایت میں ہے۔

عن عبد اللہ قال استقبل رسول اللہ ﷺ البیت فدعا علی ستۃ نفر من قریش فیہم ابو جہل وامیہ بن خلف وعتبہ بن ربیعہ وشیبہ بن ربیعہ وعقبہ ابن ابی معیط فاقسم باللہ لقد رايتم صرعی علی بدر قد غیرتہم الشمس وکان یوما حارا“

(مسلم جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۱۷ باب ما لقی النبی ﷺ من اذى المشرکین والمنافقین)

حضرت عبد اللہ ﷺ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ شریف کا استقبال کیا (یعنی توجہ بیت اللہ شریف کی طرف کی) پھر قریش کے چھ آدمیوں کی خلاف دعاء ہلاکت کی، وہ چھ یہ ہیں، ابو جہل اور امیہ بن خلف اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور عقبہ بن ابی معیط، میں اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھاتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان (میں سے اکثر) کو بدر میں ہلاک ہوئے دیکھا، دھوپ نے ان کے جسموں کو بدل دیا تھا (یعنی ان کے جسم بد بودار ہو گئے تھے) وہ دن بہت گرم تھا۔

بیر اور قلب میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

ابھی جس حدیث پر بحث ہو رہی ہے اور اس کے ضمن میں کچھ روایات آرہی ہیں، اس میں ذکر ہے ”بیر“ کا کہ انہیں ”بیر“ میں ڈال دیا گیا، اور دوسری روایت میں قلب کا ذکر ہے۔

”فوالذی بعث محمد ابالحق لقد رايت الذی سمی صرعی یوم بدر ثم سحبا الی القلب قلب بدر“ راوی کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تحقیق میں نے ان کو بدر میں ہلاک ہوتے دیکھا جن کا نام نبی کریم ﷺ نے اپنی دعاء (جو ان کے خلاف کی گئی) میں کیا، پھر ان کو کھینچ کر قلب میں ڈال دیا گیا، قلب سے مراد بدر کا قلب ہے۔

خیال رہے اسی روایت میں ”و ذکر السابغ ولم احفظه“ کہ ساتویں شخص کا بھی آپ نے دعاء ہلاکت



میں کیا لیکن مجھے یاد نہیں، اس پر علامہ نووی نے لکھا ”وقد وقع فی رواية البخاری تسمية السابع انه عمارة بن الوليد“ بخاری میں ساتویں کا ذکر ہے، اس کا نام عمارہ بن ولید ہے۔

**جواب:** بیر اور قلیب میں ایسا فرق نہیں جس سے تضاد لازم آئے، بلکہ فرق صرف عام و خاص کا ہے خاص عام کے ضمن میں پایا جاتا ہے، بیر عام ہے ہر کنویں کو کہتے ہیں خواہ کنواں صرف کھودا گیا ہو اور اس میں دیواروں کی چٹائی نہ کی گئی ہو، یا دیواروں کی چٹائی کر کے اسے تیار کر دیا گیا ہو، لیکن قلیب خاص ہے کہ یہ صرف اس کنویں کو کہتے ہیں جو کھودا گیا ہو لیکن اس میں دیواروں کی چٹائی نہ کی ہو، بدر میں جس کنویں میں کفار کو ڈالا گیا تھا اس میں دیواروں کی چٹائی نہیں تھی، اسی لئے بعض روایات میں اس پر بیر کا اطلاق ہے اور بعض میں اس پر قلیب کا اطلاق کیا گیا۔ (ماخوذ از نووی بالوضاحت)

چوبیس صنادید قریش کو کنویں میں ڈالا گیا:

عن ابی طلحة ان نبی اللہ ﷺ امر یوم بدر باربعة وعشرين رجلا من صنادید قریش فقد فرافی طوی من اطواء بدر خبیث منجث وکان اذا اظهر علی قوم اقام بالعرصة ثلاث لیل فلما کان ببدر الیوم الثالث امر بر اخلته فشد علیہا ر حلہا لم مشی واتبه اصحابه وقالوا مانری ینطلق الابعض حاجته حتی قام علی شفة الرکی فجعل ینادیہم باسمائہم واسماء آبائہم یافلان ویافلان بن فلان ایسرکم انکم اطعتم اللہ ورسولہ فانا قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقاً فہل وجدتم ما وعد ربکم حقاً قال فقال عمر یارسول اللہ ﷺ ما تکلم من اجساد لا اروح لها فقال رسول اللہ ﷺ والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع لما قول منہم“

(بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جہل)

حضرت ابو طلحہ بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن نبی کریم ﷺ نے چوبیس صنادید (سرداران) قریش کے متعلق حکم دیا کہ ان کو بدر کے ایک ناپاک اور ناپاک کرنے والے کنویں میں ڈال دیا جائے، آپ جب جنگ سے فارغ ہوتے تو کامیابی کی صورت میں وہاں تین دن تک ٹھہرتے، جب تیسرا دن ہوا تو آپ نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا، آپ کیلئے سواری تیار کر دی گئی، آپ سواری پر سوار ہو کر چلے، صحابہ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، صحابہ کرام کہہ رہے تھے آپ کسی حاجت کو پورا کرنے کیلئے چلے ہیں، یہاں تک کہ آپ کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے، آپ ان کے اور ان کے آباء (باپوں) کے نام لے پکار رہے تھے۔ اے فلاں ابن فلاں، اے فلاں ابن فلاں کیا تمہیں اب یہ پسند آرہا ہے کہ کاش تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے، ہمارے ساتھ جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا، ہم



نے اسے حق پالیا، کیا تمہارے ساتھ جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تم نے اسے حق پالیا ہے؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا آپ ان جسموں سے کلام فرما رہے ہیں جن میں روح نہیں، رسول اللہؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے تم ان سے زیادہ میری بات کو نہیں سن رہے۔

### وضاحت حدیث:

صنادید جمع ہے صندید (بروزن عفریت کے) ”وہو السید الشجاع العظیم“ اس کا معنی سردار، بہادر اور بڑا یعنی کفار قریش کے سردار اور بہادر اور بڑے لوگ جنگ میں مارے گئے تھے، خیال رہے کہ کفار بدر میں ستر کی تعداد میں قتل کر دئے گئے تھے لیکن کنویں میں چوبیس ان کے سر کردہ لوگ ڈال دئے گئے تھے۔ ”خبیث و مخبث“ اس کنویں کو خبیث و مخبث کہا گیا، اسلئے کہ وہ نجاست وغیرہ کے پھینکے جانے کی وجہ سے ناپاک تھا، اور اس کی نجاست اوروں کو ناپاک کرنے والی تھی۔

**اعتراض:** حدیث شریف کے پہلے حصہ میں کنویں کو ”طوی“ (طاء کی زبر اور واؤ کے نیچے زیر، اور یاء مشدد) کہا گیا ”وہی البشر المطویۃ بالحجارة“ اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں دیوار کی چٹائی کی گئی ہو، اور حدیث کے آخر میں آرہا ہے ”رکی“ (راء پر زبر اور یاء مشدد) ”وہو البشر قبل ان تطوی“ یہ اس کنویں کو کہتے ہیں، جس میں دیوار کی چٹائی نہ کی گئی ہو، اسی طرح بعض روایات میں ”قلب“ کا ذکر ہے ”قلب“ بھی اسی کنویں کو کہتے ہیں جس میں پتھروں وغیرہ سے دیوار کی چٹائی نہ کی گئی ہو، ایک ہی کنویں پر ”طوی“ اور ”رکی“ کا اطلاق کیسے صحیح ہے؟

**جواب:** لا منافاة لانہا کانت مطویۃ ثم استہدمت فصارت کالرکی  
ان میں کوئی منافات (مخالفت) نہیں، کیونکہ پہلے اس کی دیوار چنی گئی تھی، اب گر چکی تھی، مطلب یہ ہوا کہ ان کو اس کنویں میں ڈال دیا گیا جس کی دیوار چنی گئی تھی، لیکن اب اس کی دیوار گر چکی تھی، سابقہ لحاظ پر وہ ”مطوی“ تھا، موجود لحاظ پر ”رکی“ اور قلب تھا۔ (عمدة القاری جلد ۷ صفحہ نمبر ۹۲)

”قال عمر یا رسول اللہ ماتکلم“ کلمۃ اما استفہامیۃ ”ما“ سوالیہ ہے، اور ”تکلم“ میں ایک تاء حذف ہے، یہ مضارع ہے، اصل میں ”تتکلم“ ہے۔

کنویں میں کفار کو کیوں ڈالا گیا؟

والما وضعا فی القلب تحقیر الہم ولنلا یتاذی الناس برائحتہم ولیس ہودفنا لان الحربی



لا یجب دفنه“ (نووی جلد ۲ صفحہ ۱۱۶ باب مالقی النبی ﷺ اذی المشرکین والمنافقین)

کفار کو کنویں میں ڈالنے کی دوجہ ہیں، ایک یہ کہ ان کی حقارت بیان کرنی مقصود تھی کہ یہ حقیر لوگ ہیں زندگی میں بھی مسلمانوں کے نزدیک گھٹیا تھے، موت کے بعد بھی گھٹیا ہیں، ایسے ہی جیسے کسی گھٹیا جانور کے مرنے کے بعد اسے گھسیٹ دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ زیادہ لاشیں بکھرنے کی وجہ سے بو پھیل رہی تھی، اس لئے ان کو کنویں میں پھینک دیا گیا تاکہ مسلمان کچھ نہ کچھ بدبو سے محفوظ رہ سکیں، ان کو دفن اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ حربی کافر کو دفن کرنا مسلمانوں پر لازم نہیں۔ (حوالہ مذکور)

اس حدیث سے شیخ کا سماع موتی پر استدلال:

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں قلمطراز ہیں ”جاننا چاہئے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور متفق علیہ (یعنی بخاری و مسلم میں مذکور) ہے، اس میں مردوں کے سننے اور ان کو علم و شعور حاصل ہونے کا واضح ثبوت موجود ہے، کیونکہ جو کچھ حضور ﷺ نے خطاب فرمایا ان کا علم ان کو حاصل ہوا، اسی طرح صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ ”دفنانے والے جب مردہ کو دفن کر کے لوٹتے ہیں تو مردہ ”لوگوں کی جوتیوں کی آہٹ سنتا ہے“ اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان اہل بقیع کی زیارت کے سلسلہ میں مروی ہے کہ ان کو سلام کرو اور اس میں ان کو خطاب کرو اور کہو کہ اے قبروں والو تم پر سلام ہواے مسلمانو تمہیں وہ سب کچھ مل گیا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، اور انشاء اللہ ہم بھی تمہارے ساتھ شامل ہونے والے ہیں۔ (مدارج النبوة جلد دوم)

**شہداء مسلمان :** اس جنگ میں مسلمانوں میں سے چودہ شہید ہوئے، چھ مہاجرین، اور آٹھ انصار۔

**مہاجرین شہداء کرام کے اسماء گرامی:**

حضرت عبیدہ بن حارث بن مطلب بن عبد مناف، حضرت عیسر بن ابی وقاص، حضرت ذوالشمالین عیسر بن عبد عمرو بن نضله، حضرت عاقل بن ابی بکیر، حضرت مہجج مولی عمر بن الخطاب، حضرت صفوان بن بیضاء رضی اللہ عنہم۔

**انصار شہداء کرام کے اسماء گرامی:**

حضرت سعد بن خثیمہ، حضرت مبشر بن عبد المذکر، حضرت حارثہ بن سراقہ، حضرت عوف و معوذہ پسران عفراء، حضرت عیسر بن حمام، حضرت رافع بن معطل، حضرت یزید بن حارث بن سحم۔



## مقتولین کفار:

ستہر کی تعداد میں کافر قتل کئے گئے ان میں مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ (شیمہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، عاص بن سعید بن عاص، ابو جہل بن ہشام، ابوالنختری، حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب، حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف، طعیمہ بن عدی، زمعہ بن اسود بن مطلب، نوفل بن خویلد، عاص بن ہشام بن مغیرہ (جو حضرت فاروق اعظم کا ماموں تھا) (بعض نے اس کا ذکر قیدیوں میں کیا ہے) امیہ بن خلف، علی بن امیہ بن خلف، منبہ بن حجاج، معبد بن وہب۔)

## کفار قیدی:

ستہر کی تعداد میں کافر قید کر لئے گئے تھے، ان میں سے مشہور لوگ یہ ہیں۔ (نوفل بن حارث بن عبدالمطلب، عباس بن عبدالمطلب، عقیل بن ابی طالب، ابوالعاص بن ربیع، عدی بن خیبار، ابو عزیز بن عمیر، ولید بن ولید بن مغیرہ، عبد اللہ بن ابی بن خلف، ابو عزمہ عمرو بن عبد اللہ شاعر، وہب بن عمیر بن وہب بنحی، ابووداعہ بن ضمیرہ سہمی، سہیل بن عمرو عامری۔)

(غزوات النبی مصنفہ علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ)

بدر کے قیدیوں کے مشورہ پر حضرت عمرؓ نے قتل کرنے کی اپنی رائے دی، اور حضرت ابو بکرؓ نے مشورہ دیا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، نبی کریمؐ نے بھی اسی رائے کو پسند کرتے ہوئے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ (مکمل تفصیل ان شاء اللہ دسویں پارہ میں آئے گی)

## شبلی نعمانی صاحب اور علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ:

غزوات النبی میں علامہ توکلی لکھتے ہیں غزوہ بدر کے مختصر بیان کے بعد یہاں ایک خاص بحث پیش آگئی ہے جسے دیدہ دانستہ پس انداز کرنا مناسب نہیں، اور وہ یہ ہے کہ آیا مدینہ سے مسلمان قافلہ ابوسفیان سے تعرض کرنے کیلئے نکلے تھے یا فوج قریش سے مقابلہ کیلئے؟ اس بحث میں مولوی شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں سب سے نرالا پہلو اختیار کیا، اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس بارے میں اب تک مؤرخین و ارباب سیر بلکہ تمام علماء اسلام نے غلطی کھائی ہے، لہذا ذیل میں احقاق حق کیلئے مولوی صاحب کی عبارت بلفظ نقل کر کے اس کا جواب باصواب دیا جاتا ہے۔ ”واللہ هو الہادی الی الصواب“

## قال الشبلی النعمانی: غزوہ بدر پر دوبارہ نظر:

سادہ واقعات کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور پر اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوہ بدر کا مقصد



جیسا کہ عام مؤرخین نے بیان کیا ہے، کاروان تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمہ عدالت میں فرق ہے، مجھکو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلے لکھنے سے بالکل مختلف ہے،

میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ دیوانی نگاری ہے فیصلہ نویسی نہیں، لیکن موقع ایسا آ پڑا ہے کہ ایک واقعہ تاریخی نے مقدمہ عدالت کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اس لئے مجھکو اپنے منصب سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مؤرخین اور ارباب سیر میرے حریف مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آئے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پاسکتا ہے، سلسلہ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کیلئے سب سے پہلے ہم کو بتادینا چاہئے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ حضری کے قتل نے تمام مکہ کو جوش انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آ گئیں، دونوں فریق ایک دوسرے سے پر حذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے، غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثناء میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام کو گیا اور ابھی شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہو گئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے، قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مدینہ منورہ میں یہ مشہور ہو گیا کہ قریش ایکل شکر عظیم لیکر مدینہ آرہے ہیں آنحضرت ﷺ نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔ (سیرت النبی جلد اول ص ۲۵۰)

**اقول:** مؤرخین و ارباب سیر بلکہ محدثین و مفسرین میں سے بھی کسی نے یہ بیان نہیں کیا کہ غزوہ بدر کا مقصد کاروان کو لوٹنا تھا، وہ سب بالاتفاق یہی کہتے ہیں کہ مسلمان مدینہ منورہ سے محض قافلہ قریش سے تعرض کے لیے نکلے تھے، اس اثناء میں اتفاقیہ غزوہ بدر پیش آ گیا، قافلوں سے تعرض کی وجہ یہ ہوئی کہ کفار قریش ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں مزاحم ہوتے تھے، بلکہ دیگر قبائل کو بھی ان کی مخالفت پر برا بیختہ کرتے تھے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف اغراض کے لیے اپنے اصحاب کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اطراف مدینہ میں بھیجی شروع کیں، بلکہ بعض دفعہ خود بھی شرکت فرمائی، کہیں دشمن کی نقل وہ حرکت کی خبر لانے کے لیے کہیں بعض قبیلوں سے معاہدہ قائم کرنے کے لیے اور کہیں محض مدافعت کے لیے ایسا کیا گیا، ہاں ایک غرض یہ بھی تھی کہ قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کر دیا جائے اور یہ وہی بات ہے جس کی دھمکی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے بعد ابو جہل کو خاص خانہ کعبہ میں یوں



دی تھی کہ اگر تم نے ہم کو طواف کعبہ سے روکا، تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ بند کر دیں گے۔

(صحیح بخاری، کتاب المغاری، باب ذکر النبی ﷺ من یقتل بلسر)

چونکہ قریش بالعموم مسلمانوں کو حج و عمرہ سے روکتے تھے، اس لئے مجبوراً مسلمانوں کو ان کے تجارتی قافلوں سے تعرض کرنا پڑا تا کہ مذہبی مداخلت سے باز آجائیں مصنف کا یہ قول (اس سلسلے میں لڑائیاں بھی پیش آ گئیں) ثبوت طلب ہے، کیونکہ حضرمی کے قتل کے بعد جنگ بدر سے پہلے مسلمانوں اور کفار قریش میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی اور اس کا یہ قول (اسی اثناء میں ابوسفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام گیا) بھی درست نہیں، کیونکہ ابوسفیان واقعہ حضرمی سے پہلے شام چلا گیا تھا، چنانچہ طبقات ابن سعد میں غزوہ ذوالعشرہ میں تصریح ہے کہ جو قافلہ بچ کر نکل گیا، جب وہ شام سے واپس آیا تو مسلمان اسی سے تعرض کے لیے نکلے اور غزوہ بدر پیش آیا، اسی طرح مصنف کا یہ کہنا کہ کہ مدینہ منورہ میں مشہور ہوا کہ قریش کی ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آرہے ہیں، دعویٰ بلا دلیل ہے، ایسی دعاوی پر بنائے کلام کرنا محقق کی شان سے بعید ہے۔

### قال الشبلی النعمانی:

اس بحث کے فیصلہ کے لیے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے تاکہ وہ انفصال بحث میں اصول موضوعہ کے طور پر کام آئیں وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے، تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

(۲) کتب حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرق مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں، تو آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر ان کا استمراج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت ﷺ انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر حضرت سعد یا کوئی اور معزز انصاری اٹھے اور کہا ”یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ سے کہا تھا (تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے) خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں، تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں“ یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے۔ ﴿وَإِنْ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَادِهُونَ﴾ اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا عموماً تمام ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ



کے ہاتھ بیعت کی تھی، تو صرف یہ اقرار کیا تھا۔ ”جب کوئی دشمن خود مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوگا، تو انصار مقابلہ کریں گے“ یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے، ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے ”یہ واقعات کہاں پیش آئے؟“ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپ لکے تو صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آتے ہیں، اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں، آگے کے واقعات یہیں پیش آئے، لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن پاک) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے۔ ترکیب نحوی کی رو سے وَاِنْ مِّنْ جَوْاوِہِہٖ جَس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آگے بڑھے، کیونکہ وَاوْہِہٖ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس کے گروہ کے جی چراتانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِن بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۖ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْلَمَاتٍ ۖ كَالْمَائِسَافُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ وَآذِيعُكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنهَآلَكُمْ وَتُوذُونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ﴾ (سورة الانفال رکوع نمبر ۱)

”جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا اور ان حاکم مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور موت کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھلے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔“

(۲) آیت مذکور میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے، اس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، ارباب سیر کہتے جہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح و سلامت بچ کر نکل گیا تھا، اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ”دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے“ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف دو وقت ہو سکتا ہے، جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کا روانہ



تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا تعالیٰ نے بیان کیا ہے، ایک قافلہ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آرہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا۔

﴿تَوَدُّونَ أَنْ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ﴾  
(سورة الانفال رکوع ۱)

”تم چاہتے ہو کہ بے خزہ والا گروہ تم کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔“

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر اور انصار ساتھ ہیں، ان میں فاتح خیبر اور حضرت سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے بہت سے صحابہ کادل بیٹھا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لیے جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

﴿وَإِنْ فَرِيقَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَنَاجِدُ هُوْنَ يُجَادِلُوْكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُوْنَ إِلَى الْمَوْتِ﴾  
”مسلمانوں کی ایک جماعت کا رہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے، پیچھے بھی جھگڑا کرتے تھے، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔“

اگر صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف و اضطراب یہ پہلو تھی کس بناء پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر قافلہ قریش پر حملہ کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہیں۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۰، ۲۵۱)



**اقول:** مولوی شبلی صاحب کا دعویٰ ہے کہ مسلمان مدینہ سے کاروان تجارت سے تعرض کے لیے نہ نکلے تھے، بلکہ بڑے سرد سامان سے فوج قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے اس دعویٰ کے ثبوت میں مولوی صاحب نے قرآن کریم کی تین آیتوں سے چار دلیلیں پیش کی ہیں، جن پر ہم ہم بالترتیب نمبردار بحث کرتے ہیں۔

(۱) ”وَإِنْ“ میں واؤ بے شک حالیہ ہے اور یہ جملہ کاف ”اخر جک“ سے حال میں واقع ہوا ہے، مگر اس سے یہ ضروری نہیں کہ خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا زمانہ ایک ہی ہو، ہم ذرا اس کی تشریح کر دیتے ہیں، ہدلیۃ النحو میں ہے۔ ”الحال لفظ يدل على بيان هيئة الفاعل او المفعول به او كليهما“ یعنی حال وہ لفظ ہے جو فاعل یا مفعول یا ہر دو کی ہیئت کے بیان پر دلالت کرے، ہدلیۃ النحو کی شرح درلیۃ میں اس کے متعلق یوں لکھا ہے۔

”ثم المراد بالهيئة ههنا الحالة وهي اعم من ان تكون حقيقة او مقدره نحو قوله تعالى فادخلوها خالدين ای مقلدین الخلو ویسمی الاول حالاً محققه والثانی حالاً مقدره“

**ترجمہ:** پھر ہیئت سے مراد یہاں حالت عام ہے، اس سے کہ حقیقیہ ہو یا مقدرہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے ”فادخلوها خالدين“ یعنی تمہارے واسطے خلود مقدر ہے پہلی قسم کو حال محققہ اور دوسری قسم کو حال مقدرہ کہتے ہیں۔ انتہی اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں حال کس قسم کا ہے محققہ یا مقدرہ، علمائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ یہاں حال مقدرہ ہے چنانچہ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں۔

(وَإِنْ فَرِيقَانِ الْمُؤْمِنِينَ لَكَا رِهُونَ) والجملة فی موضع الحال وهي حال مقدره لان الكراهة وقعت بعد الخروج كما استراه انشاء الله تعالى او يعتبر ذلك ممتداً

یعنی یہ جملہ حال کی جگہ ہے اور یہ حال مقدرہ ہے کیونکہ کراہت خروج کے بعد واقع ہوتی ہے جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تو عنقریب اسے دیکھے گا یا اسے ممتد اعتبار کیا جائے۔ انتہی

مطلب یہ ہے کہ اس کو حال مقدرہ سمجھنا چاہیے یا اس کے لیے زمان و سبع خیال کرنا چاہیے کہ جس کے بعض اجزاء میں کراہت اور بعض میں خروج واقع ہے۔ تفسیر جلالین کے حاشیہ جمل میں ہے۔

”ف قوله وان فريقا الخ حال مقدره لما علمت ان الكراهة لم يقارن الخروج“

یعنی یہ حال مقدرہ ہے کیونکہ کراہت خروج کے ساتھ واقع نہیں ہوئی، جیسا کہ تجھے معلوم ہے۔ انتہی

ہمارے اس قول کی تائید مؤرخین و ارباب سیر اور تمام محدثین و مفسرین کر رہے ہیں، احادیث صحیحہ ہماری تائید کر رہی ہیں جیسا کہ بیان ہوگا، قرآن کریم کی دوسری آیت جو عنقریب پیش ہوگی ہماری تائید کر رہی ہے، اب



ناظرین خود انصاف کریں کہ ان حالات میں شبلی بیچارے کی رائے محض کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔

(۲) مصنف نے تین آیتیں نقل کی ہیں جنہیں وہ ایک آیت خیال کر رہا ہے، مگر حقیقت میں یہاں تیسری آیت معرض بحث میں ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کیا، جبکہ دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال و امکان تھا، مگر یہ کہنا کہ یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے الخ درست نہیں بظاہر مصنف نے ”وَإِذْ يَعِدُكُمُ“ کی واؤ سے مغالطہ کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ وقت خروج اور وقت وعدہ ایک ہی ہیں حالانکہ یہ غلط ہے، کیونکہ اذ طرف ہے فعل مضمر ”اذکروا“ کا نہ کہ ”اخرجک“ کا، ایک لمحہ کے لیے آیات ”لَا حَقَّ لَهُ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ“ (الایہ) ”إِذْ يُغَشِّبُكُمُ النُّعَاسَ“ (الایہ) پر بھی نظر ڈالو، ان آیتوں میں اذ بدل ہے وَإِذْ يَعِدُكُمُ سے، مصنف کے قول کے مطابق وعدہ، استغاثہ مسلمین، نیند کا طاری ہونا اور مینہ کا برسنا، یہ سب مدینہ ہی میں ہونا چاہیے و ہذا کماتری۔

مورخین و محدثین کے نزدیک حضرت جبرائیل دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ وادی ذفران میں لائے، اس کے بعد حضور ﷺ نے صحابہ سے استمراج فرمایا، اس وقت بے شک دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا امکان تھا، غور کرو وعدہ کرنے والا قادر مطلق ہو اور مولوی شبلی امکان و احتمال میں کلام کریں، وادی ذفران کیا اس سے آگے بڑھ کر جب ہر دو فریق میدان بدر میں اترے، مسلمان مدینہ کے طرف کے ناکے پر اور مشرکین مکہ کی طرف کے ناکے پر اس وقت بھی وہ قادر مطلق اگر چاہتا تو قافلہ کو مسلمانوں کے ہاتھ میں گرفتار کروادیتا، یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی، کیونکہ وہ قافلہ لشکر اسلام سے فقط تین میل ساحل سمندر کی طرف تھا، مگر وہ مکہ بھی پہنچ جاتا ہے، تو اس کا مسلمانوں کے ہاتھ آنا قدرت الہی سے خارج نہ تھا، اب آیت زیر بحث کے معنی بھی سن لو، یہاں واؤ استیناف کے لیے جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے، اذ فعل ماضی پر داخل ہوا کرتا ہے، مگر یہاں ماضیہ کی حکایت کے لیے صیغہ مضارع استعمال ہوا ہے، پس اس کے معنی یوں ہوئے ”اے مومنو! یاد کرو وہ وقت کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے دو گروہ میں سے ایک کا وعدہ کیا کہ یہ تمہارے واسطے ہے اور تم نے دوست رکھا کہ بن شدت والا تمہارے واسطے ہو اور اللہ نے چاہا کہ اپنے کلاموں سے سچ کو سچا کرے اور کافروں کا بیچھا کاٹ دے“ بیان بالا سے مصنف کی قرآن فہمی اور خودانی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۳) مصنف کے اعتراض کا ما حاصل یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں کفار کے دو فریق (قافلہ تجارت اور فوج قریش) کا ذکر ہے اور یہ بھی تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت قافلہ پر حملہ کرنا پسند کرتی تھی مگر خدا چاہتا ہے کہ فوج کفار کے شکست ہو، لہذا آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے نکلے، تو (نعوذ باللہ) آپ نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کیا، مگر ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ وعدہ زیر بحث مدینہ منورہ میں نہ ہوا تھا، وعدہ مذکورہ اور



قافلہ تجارت پر حملہ کرنا کی خواہش کا وقت اور مدینہ منورہ سے خروج کا وقت ایک نہیں جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے "وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ (الایہ) کلام مستأنف ہے، اس کو اخراج سے کوئی ربط نہیں پس ارباب سیر و محدثین درست فرماتے ہیں کہ وادی ذفران میں وعدہ "احدی الطائفتین" ہوا، اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے استمراج فرمایا، بے شبہ آنحضرت ﷺ کو وہی چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا، چنانچہ جب مہاجرین میں سے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے جنگ پر پوری آمادگی ظاہر فرمائی، تو حضور اقدس ﷺ بہت خوش ہوئے۔

(صحیح بخاری میں ہے، اشرق وجه، وسترہ،) کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ اِذْ تَسْتَفِيتُونَ رَبَّكُمْ (الایہ)

آپ اسی طرح انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تقریر پر تاثیر پر حضور انور بابی ہو و امی نہایت خوش ہوئے۔ (سیرت ابن ہشام فبشر رسول اللہ بقول سعد ونشطه ذالك ثم قال سيروا و ابشروا فان الله تعالى قد وعد في احدي الطائفتين والله لكافي الآن انظر الى مضارع القوم ۱۲۰)

آپ کا ان تقریروں سے خوش ہونا اور فوج کفار کی شکست کی بشارت دینا صاف بتا رہا ہے کہ آپ بھی فوج قریش کا مقابلہ چاہتے تھے اور مسلمانوں کی فوج کا اکثر حصہ بھی یہی چاہتا تھا ہاں ایک قلیل جماعت تھی جو بوجہ بے سروسامانی تقاضائے طبع بشری فوج کفار کے مقابلہ سے ہچکچاتی تھی۔

(۳) یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ ﴿وَإِنْ فَرِيقَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ حال مقدرہ ہے، یہ کراہت و مجادلہ مدینہ منورہ میں پیش نہیں آیا، پس مصنف کی تمام خامہ فرسائی بے سود ہے، مسلمان جس سروسامان سے مدینہ منورہ سے نکلے، اس کا ذکر عنقریب آتا ہے، یہ کہنا (کہ مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ منورہ پر آرہے ہیں) بالکل غلط ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، حسب وعدہ ہم یہاں قرآن کریم کی ایک دوسری آیت غزوہ بدر کے متعلق نقل کرتے ہیں جو ہمارے مدعا کی مؤید ہے اور وہ یہ ہے۔

﴿إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خِلَافَ لَكُمْ فِي الْمَبْعَدِ وَلَكِنْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا﴾ (سورة الانفال، ع ۵)

"جس وقت تم تھے ورے کے ناکے اور وہ پرے کے ناکے اور قافلہ نیچے اتر گیا تم سے اور اگر آپس میں تم وعدے کرتے تو نہ پہنچتے وعدے پر، لیکن اللہ تعالیٰ کو کرنا ایک کام جو ہو چکا تھا۔" (ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب اللہ تعالیٰ)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان مدینہ منورہ سے فوج کفار کے مقابلہ کے لیے نہ نکلے تھے اور نہ انہیں فوج کفار کے مکہ سے آنے کا اس وقت علم تھا۔ مولوی شبلی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے "جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے، تو وقت میں



اختلاف ہو جاتا، لیکن (خدا نے یہ اس لیے کر دیا) تاکہ جو ہونے والا تھا، خدا اس کو کر دے“ (سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۳۸) کسی بھی لغت یا تفسیر کو اٹھا کر دیکھئے تو اعد کے معنی ہیں ایک دوسرے سے وعدہ کرنا اسی طرح میعاد کے معنی وقت کے نہیں، قرآن پاک کے معنی میں رائے زنی سے اللہ تعالیٰ بچائے، بغرض توضیح اس آیت کی تفسیر کے متعلق چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں، علامہ قسطلانی (مواہب لدنیہ مطبوعہ مصر، جزء اول صفحہ نمبر ۷۸) غزوہ بدر کی نسبت لکھتے ہیں۔

”وکالت من غیر قصد من المسلمین الیہا ولا میعاد کما قال اللہ تعالیٰ ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد ولكن لیقضى الله امر اکان مفعولا وانما قصد الله والمسلمون التعرض لعیر قریش“

**ترجمہ:** غزوہ مسلمانوں کے قصد اور وعدے کے بغیر واقع ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ولو تواعدتم الایہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے فقط قافلہ قریش سے تعرض کا قصد کیا تھا۔ انصاری۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔ ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد ای لو تواعدتم وهم القتال ثم علمتم حالکم وحالهم لاختلفتم انتم فی المیعاد منہم ویأسامن الظفر علیہم لیتحققوا ان ما اتفق لہم من الفتح لیس الا صنعاً من اللہ خارقة للعادة فلیزدادوا ایماناً وشکراً ولكن جمع بینکم علی هذه الحالة من غیر میعاد لیقضى الله امر کان مفعولا حقیقاً بان یفعل وهو نصر اولیائہ وقهر اعدائہ“

**ترجمہ:** (اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے، تو تم وعدے میں اختلاف کر سکتے) یعنی اگر تم اور وہ آپس میں لڑائی کا وعدہ کرتے پھر تم اپنا اور ان کا حال جان لیتے، تو بے شک تم ان سے ڈر کر اور ان پر فتح پانے سے مایوس ہو کر وعدے میں اختلاف کرتے (بن وعدہ لڑائی اس لیے ہوئی) کہ مسلمان جان لیں کہ جو انہیں فتح نصیب ہوئی وہ محض بطور خارق عادت اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہوئی تاکہ وہ ایمان و شکر میں زیادہ ہو جائیں۔ انتہی حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی میں ہے۔

(قوله لاختلفتم) ای لخالف بعضکم بعضاً وعزمت علی التخلف عن محاربة النفر لکثرتهم وقلتکم ولكن جمعکم اللہ تعالیٰ من غیر میعاد لکم لیقضى الله امر اکان مفعولا فی علمہ وحکمہ او کان حقیقاً بان یفعل فانه تعالیٰ دہر تدبیر اعجیب الوقوع الحرب بین الجمعین من حیث الہ اخبار المؤمنین باقبال العیر حتی خرجوا واقلن الکفار بسماع خبر خروجہم لکی ینفروا وسبب الاسباب



حتى اجتمعوا للحرب وايد الله تعالى للمؤمنين بنصره بان ربط الله على قلوبهم وقواها وازال عنها الاضطراب والارتياب والقي في قلوب الذين كفروا الرعب وامدهم بانزال الملائكة والمطرو وغير ذلك من وجوه لطفه وفعل ذلك خارقا للعادة ليظهر الحق ويقطع دابر الكافرين

**ترجمہ:** (قوله اختلقتم) یعنی تم ایک دوسرے کی مخالفت کرتے اور ان کی کثرت اور اپنی قلت کے سبب فوج قریش کی لڑائی سے پیچھے رہ جانے کا ارادہ کرتے، مگر اللہ نے تم کو وعدے بغیر جمع کر دیا تاکہ وہ بات کر دے جو اس کے علم و حکم میں ہو چکی ہے، یا ہونے والی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے بے دونوں فریقوں میں لڑائی ہونے کے لیے عجیب تدبیر کی، بدینہ طور کہ مومنوں کو قافلہ کے آنے کی خبر دی، یہاں تک کہ وہ (مدینہ منورہ سے) نکلے اور کفار کو مسلمانوں کے نکلنے کی خبر سننے سے بے چین کر دیا تاکہ وہ لڑائی کے لیے نکلیں اور اسباب پیدا کر دیئے، یہاں تک کہ لڑائی کے لیے جمع ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد سے مومنوں کی تائید کی، بدینہ طور کہ ان کے دل مضبوط کر دیئے اور ان کو تقویت دی اور ان سے اضطراب و شبہ دور کر دیا اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور فرشتے اور بارش اتار کر اور کئی قسم کی مہربانیوں سے ان کی مدد کی اور یہ بطور خارق عادت کیا تاکہ حق کو ظاہر کر دے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے۔ انتہی غرض تمام علماء نے اس آیت کے یہی معنی بیان کیے ہیں، حتیٰ کہ صحابہ کرام بھی یہی معنی سمجھے ہیں، چنانچہ حدیث کعب سے عیاں ہوگا۔

### قال الشبلي النعماني:

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپ مدینہ میں ہی تشریف رکھتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں تفسیر سورۃ انفال میں تصریح مذکور ہے۔ آیت یہ ہے۔

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً﴾  
”بجز معذوروں کے وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ اپنے مال اور جان جسے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔“ (سورۃ انفال)

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے



اندھے پن کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا: ”غَيْرُأُولَى الضَّرَرِ“ (یعنی معذوروں کے سوا) یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں، بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔ (سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۴)

**اقول:** آیۃ لا یتسوی القاعدون سورۃ نساء میں ہے اور صحیح بخاری تفسیر سورۃ نساء میں مذکور ہے، یہ کہنا کہ یہ آیت صحیح بخاری تفسیر سورۃ انفال میں تصریحاً مذکور ہے بالکل غلط ہے اور امام بخاری علیہ الرحمہ پر بہتان ہے، اس قرآن دانی پر مولوی شبلی صاحب کو محقق بننے کا دعویٰ ہے، العجب العجب، مولوی صاحب کا خیال ہے کہ آیۃ لا یتسوی القاعدون ”مدینہ منورہ میں بدر کو جانے سے پہلے نازل ہوئی، لہذا اصحابہ کرام مدینہ منورہ ہی سے قتال قریش کے لیے نکلے تھے، مگر ایسا خیال مولوی صاحب کی نادانی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آیات و سور قرآن کی ترتیب نزولی اس ترتیب سے مختلف ہے جواب قرآن میں موجود ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق مدینہ منورہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ اس ترتیب سے نازل ہوئیں، سب سے پہلے بقرہ، پھر انفال، پھر آل عمران، پھر احزاب، پھر ممتحنہ پھر نساء، پھر اذ از لزلت، پھر الحدید الخ۔ (تفسیر الاتقان للسیوطی مطبوعہ مصر جزء اول صفحہ نمبر ۱۲، ۱۱)

صحیح بخاری تفسیر سورۃ انفال میں ہے:

عن سعید بن جبیر قال قلت لابن عباس سورۃ الانفال قال نزلت فی بدر  
یعنی حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس سے سورۃ انفال کی بابت دریافت کیا،  
آپ نے فرمایا کہ سورۃ انفال غزوۃ بدر میں نازل ہوئی ہے، پس ثابت ہوا کہ سورۃ نساء جس میں آیت  
زیر بحث ہے جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے، لہذا مولوی صاحب کی تمام خامہ فرسائی بے سود ہے۔

### قال الشبلی النعمانی:

(۶) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے، ان کی نسبت یہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِیَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾  
(ان لوگوں کی طرح نہ بنو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لئے نکلے تو خدا تعالیٰ یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ انہیں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی؟ اور خدا تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ درحقیقت وہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا، اس لیے خدا تعالیٰ نے اس غرور و نمائش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۴، ۲۵۵)



اقول:

سیرت ابن ہشام غزوہ بدر میں ہے۔

قال ابن اسحق ولما رأى ابوسفیان انه قد احرز غيره ارسله الى قريش انما خرجتم لتمعنوا غيركم ورجالكم واموالكم فقد نجاها الله فارجعوا فقال ابو جهل بن هشام والله لا نرجع حتى نرد بدر او كان بدر اموسما من مواسم العرف يجتمع لهم به سوق كل عام فنقيم عليه ثلاثا فنخر الجزور ونطعم الطعام ونسقى الخمر وتغرف علينا القيان وتسمع بنا العرب وبمسيرنا وجمعنا فلا يزالون يهابوننا ابدا بعدها فامضوا

ابن اسحاق نے کہا کہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ اس نے اپنے قافلہ کو بچا لیا ہے تو اس لیے قریش کو کہا بھیجا کہ تم صرف اپنے قافلہ اور اپنے آدمیوں اور مالوں کو بچانے کے لیے نکلے ہو، سو اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا، اس لیے تم واپس چلے جاؤ، ابو جہل بن ہشام نے جواب دیا اللہ کی قسم ہم واپس نہ ہوں گے، یہاں تک کہ ہم بدر میں اتریں گے (بدر عرب کی منڈیوں میں سے ایک منڈی تھی جہاں وہ جمع ہوا کرتے تھے اور وہاں ایک بازار تھا) اور وہاں تین راتیں ٹھہریں گے اور اونٹ ذبح کریں اور کھانا کھلائیں گے اور شراب پلائیں گے اور غلام باجے بجا کر ہمیں گانائیں گے اور عرب ہمارا حال اور ہمارا آنا اور ہماری جمعیت سنیں گے پس وہ آج سے ہم سے ڈرتے رہیں گے لہذا آگے چلو۔

آیت زیر بحث میں ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کی اسی حالت کی طرف اشارہ ہے، اس کا اترانا اور دکھاوا ہونا تو ظاہر ہے، اس میں اسلام کی ترقی کا انسداد بھی ہے، کیونکہ جب تمام عرب ہیئت زدہ ہو جائیں گے، تو کسی کو ان کی مرضی کے خلاف اسلام لانے کی جرأت نہ ہوگی، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ ؓ اور دیگر مفسرین کرام اس آیت کی یہی تفسیر بیان فرماتے ہیں ہم یہاں صرف چند عبارتیں نقل کر رہے ہیں جن سب کا ما حاصل یہی ہے۔

روی عن ابن عباس ؓ عنہما لما رأى ابوسفیان انه احرز ارسل الى قريش ان ارجعوا فقد سلمت العير فقال ابو جهل والله لا نرجع حتى نرد بدر او لشرب الخمر وتغرف علينا القينات ونطعم بهامن حضرنامن العرب فوافوها ولكن سقوا كاس المنايا بدل الخمر وناحت عليهم النوائح بدل القينات وكانت امولهم غنائم بدلا عن بدلها (تفسیر روح المعانی جزء ثالث صفحہ نمبر ۲۳۵)

اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم وابو الشيخ عن قتاده ؓ في الآية قال كان مشركوا قريش الذين قاتلوا النبي ﷺ يوم بدر خرجوا ولهم بغى وفخروا وقد قيل لهم يومئذ ارجعوا فقد انطلقت غيركم وقد ظفرتم فقالوا لا والله حتى يتحدث اهل الحجاز بمسيرنا وعدونا (درمنثور للسيوطي)



(کالذین خرجوا من ديارهم) هم اهل مكة حين خرجوا الى الحماية العير فاتاهم رسول  
ابى سفيان وهم بالحجفة ان ارجعوا فقد سلمت عيركم فابى ابو جهل وقال حتى  
نقدم بدر ان شرب بها الخمر وتعرف علينا القيان ونطعم بهامن حضرنا من العرب  
فذلك بطرهم ورنائهم الناس باطعامهم فوافوا هانسقوا كثوس المنايا مكان  
الخمر وناحت عليهم النوائح مكان القيان“  
(تفسير كشاف للزمخشري)

وایں حال ابو جہل و تابعان اوست (حاشیہ ترجمہ شان ولی اللہ رحمہ اللہ) پس ظاہر ہو گیا کہ اس آیت کے معنی جو مولوی  
شبلی صاحب سمجھے ہیں، وہ ان کی محض اپنی رائے ہے جو سراسر غلط ہے۔

**قال الشبلي النعماني:** قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں  
میں غزوہ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے لیکن کعب بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر  
سے نہیں گزرا کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلہ تجارت کو لوٹنے کے لیے نکلے تھے، کعب بن مالک کی حدیث  
متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

- (۱) حضرت کعب بن مالک غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے اس لیے ان کی روایت اس موقع پر مشاہدہ و واقفیت کی روایت نہیں۔
- (۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصد یہ ہے کہ غزوہ بدر کی اہمیت کم ہو جائے، تاکہ عدم شرکت سے ان کا  
وزن کم نہ ہو، حالانکہ بدر کو تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن پاک نے اس کو یوم  
الفرقان کہا ہے، خدا نے تمام شرکائے بدر کے گناہ معاف کر دیئے ہیں، بدری صحابہ کی یہ عزت تھی کہ حضرت عمر کے عہد  
میں ان کے وظائف سب سے زیادہ تھے کسی صحابی کے نام کے ساتھ بدری کہنا خاص امتیاز کا سبب شمار کیا جاتا تھا،  
حضرت کعب کی حدیث یہ ہے۔

”عن عبد الله بن كعب قال كعب لما تخلف عن رسول الله ﷺ في غزوة تبوك غير اني  
كنت تخلفت في غزوة بدر ولم يعاقب احد تخلف عنها لما خرج النبي ﷺ يريد عير  
قریش حتى جمع الله بينه وبينهم على غير ميعاد“  
(غزوہ تبوک، بخاری)

حضرت کعب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا بجز غزوہ تبوک کے  
اور ہاں غزوہ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس پر شریک نہ ہوا، اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت  
ﷺ قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا تعالیٰ نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

(سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۵)



**اقول:** بے شک قرآن مجید کے بعد احادیث کا درجہ ہے احادیث ہی قرآن مجید کی صحیح تفسیر ہیں، حدیث کعب بن مالک جیسی اور بھی حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے نکلے تھے مگر اس تعرض سے اصلی غرض قریش کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنا تھا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ حدیثیں یہ ہیں۔

(۱) اخرج ابن جریر وابن ابی حاتم وابن مردیة والبیہقی فی الدلائل عن ابی ایوب الانصاری قال قال لনারسول اللہ ﷺ ونحن بالمدينة وبلغه ان عیرابی سفیان قد اقبلت فقال ماترون فیہا لعل اللہ یغنمنا ویسلمنا فخر جنا الحدیث“ (درمنثور للسيوطی)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور ابن مردیہ نے اور بیہقی نے دلائل میں روایت کی ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا اور ہم مدینہ میں تھے اور حضور کو خبر آپہنچی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ آگیا ہے پس حضور نے فرمایا کہ اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ شاید اللہ تعالیٰ ہم کو غنیمت دے اور سلامت رکھے، پس ہم (قافلہ کے لیے) مدینہ سے نکلے۔

(۲) اخرج ابن جریر وابن المنذر وابن مردیة عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فی قوله واذیعدکم اللہ احدی الطائفتین قال اقبلت عیراہل مکة من الشام فبلغ اهل المدينة ذلک فخرجوا ومعهم رسول اللہ ﷺ یرید العیر الحدیث“ (درمنثور للسيوطی)

ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن مردیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ اہل مکہ کا قافلہ تجارت شام سے آیا، پس اہل مدینہ کو جو اس کی خبر پہنچی تو وہ نکلے اور ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ تھے جو بقصد قافلہ تجارت نکلے تھے۔

(۳) اخرج ابن اسحق وابن جریر وابن المنذر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال لما سمع رسول اللہ ﷺ بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیہم وقال هذه عیر قریش فیہا أموالہم فاخرجوا الیہا لعل اللہ یملکمموها فان ندب الناس فحف بعضہم وثقل بعضہم وذلك انہم لم یظنوا ان رسول اللہ ﷺ یلقى حربا الحدیث“ (درمنثور للسيوطی)

ابن اسحاق اور ابن جریر اور ابن منذر نے روایت کیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے سنا کہ ابوسفیان شام سے آرہا ہے، تو مسلمانوں کو ان کی طرف نکلنے کے لیے بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ تجارت ہے جس میں ان کے مال ہیں سو ان کی طرف نکلو، شاید اللہ تعالیٰ تمہیں غنیمت دے پس لوگوں نے حضور کی دعوت کو قبول کیا، لہذا بعض نے نکلنے میں جلدی کی اور بعض نے سستی کی، اس سستی کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خیال نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو لڑائی پیش آئے گی۔



حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم (کتاب التوبہ، باب حدیث توبہ کعب بن مالک وصاحبیہ) میں بھی موجود ہے، اس کی صحت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ یہ حدیث مسئلہ زیر بحث میں نہایت قابل غور ہے، کیونکہ یہ ”ولو تواعدتم لاختلفتم فی الميعاد“ (الآیۃ) کی صحیح تفسیر ہے جس کا بیان پہلے آچکا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ مولوی شبلی صاحب نے اس بحث میں ثابت کرنا چاہا ہے، وہ قرآن و حدیث صحیح کے خلاف ہے، یہ کہنا کہ اس سے حضرت کعب کا مقصود فقط اپنے تخلف کا عذر کرنا ہے اور وہ بجا ہے، کیونکہ مسلمان مدینہ منورہ سے محض تجارت سے تعرض کے لیے نکلے تھے۔

### قال الشبلی النعمانی:

اس (حدیث کعب بن مالک) کے برخلاف حضرت انس کی حدیث ہے جو بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے۔

(۱) عن انس ان رسول الله ﷺ شاور حین بلغه اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابو بکر فاعرض عنه فتکلم عمر فاعرض عنه فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول الله ﷺ والذی نفسی بیده لو امرتنا ان نخيضها البحر لا خضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها لی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول الله ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا

حضرت انس سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابو سفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا، حضرت ابو بکر بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمر بولے تو آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ فرمائی پھر حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ؟ کیا آپ کا روئے سخن ہم انصار کی طرف ہے خدا کی قسم اگر آپ دریا میں سواری ڈالنے کا ہمیں حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے تو ہم جائیں گے اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے، حضرت انس کہتے ہیں کہ اس کے بعد لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

(۲) ووردت علیہم روا یا قریش وفیہم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوه فکان اصحاب رسول الله ﷺ یسألون عن ابی سفیان واصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان ولكن هذا ابو جہل وعتبة وشيبة وامیة بن خلف فاذا قال ذلک ضربوه فقال نعم انا اخبرکم هذا ابو سفیان فاذا ترکوه فقال مالی بابی سفیان من علم هذا ابو جہل و..... رسول الله ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک الضرب قال والذی نفسی بیده لتضربوه اذا صدقکم وترکوه اذا کذبکم

اور (پہلے) قریش کا ہراول دستہ آکر اترآ، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، اصحاب رسول اللہ ﷺ نے



اسے گرفتار کر لیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن یہ ابو جہل عقبہ، شبیبہ، امیہ بن خلف آرہے ہیں، جب وہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں، تب اس کو چھوڑ دیتے، تو پھر وہ کہتا تو مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں، لیکن ابو جہل وغیرہ رؤسائے قریش آرہے ہیں، آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے، آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے، تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش ظاہر کی اور یہ حقیقت ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا، اس بناء پر یہ محقق طور پر ثابت ہو چکا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی حالانکہ ارباب سیرت کے مطابق واقع یہ ہونا چاہیے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لیے نکلے! آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لیے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔ حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بوضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں، بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی، تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لیے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ ”جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی“ چنانچہ اسی واقعہ کو انہیں الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے مسند۔ (جلد اول صفحہ نمبر ۱۱) میں ابن ابی شیبہ نے مصنف میں (منتخب کنز العمال غزوہ بدر میں) اور ابن جریر نے تاریخ (جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۲۸۹) میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور اس کے راوی معمر کہ بدر کے ہیر و اسد اللہ علی بن ابی طالب ہیں۔

عن علی قال لما قدمنا المدينة اصبنا من ثمارها فاجتويناها واصابنا بها وعك و كان النبی ﷺ يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله ﷺ الى بدر و بدر بنر فسبقنا المشركين اليها“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے، تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے، اس لیے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی



کہ مشرکین آرہے ہیں تو جناب رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے، بدر ایک کنواں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

(اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں) اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ ﷺ نکلے تھے اور بدر پر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلہ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے۔

(سیرت النبی، جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۶، ۲۵۸)

**اقول:** اس مقام پر مولوی شبلی صاحب کی حدیث دانی کو دیکھئے کہ حدیث کعب بن مالک جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہے، اس کو تو آپ صرف صحیح بخاری میں سمجھتے ہیں اور حدیث انس جو صرف مسلم میں ہے، اسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں بنا رہے ہیں حدیث انس کا جو مطلب آپ سمجھتے ہیں، وہ بھی عجیب ہے، اس حدیث سے ایک اردو ترجمہ خوان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کی خبر مدینہ میں پہنچی، تو آپ نے قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا، نہ کہ غزوہ بدر کے لیے، خبر پہنچے قافلہ تجارت کے آنے کی، اور مشورہ لیا جائے غزوہ بدر کے لیے! یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ بے شک یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ارباب سیر نے تو مشورہ کا مقام مدینہ سے باہر وادی ذفران بتایا ہے اور اس حدیث میں خاص مدینہ منورہ ہے قاعدہ اصول کے مطابق ان دونوں میں تطبیق دینی چاہئے اگر تطبیق ممکن ہو تو ایک کو ترجیح دی جائے، یہاں ترجیح کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تعارض تطبیق سے رفع ہو سکتا ہے، چنانچہ زرقانی علی المواہب اللدنیہ صفحہ نمبر ۴۱۴ میں ہیں۔

قال الحافظ ويمكن الجمع بانه ﷺ استشارهم مرتين الاولى بالمدينة اول مابلغه خبر العير و ذلك بين من لفظ مسلم انه شاور حين بلغه اقبال ابى سفيان والثالثة كانت بعد ان خرج كمافي حديث الجماعة

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ تطبیق ممکن ہے بدین طور کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے دو دفعہ مشورہ طلب کیا، پہلی دفعہ مدینہ میں جبکہ آپ کو قافلہ تجارت کی خبر پہنچی اور یہ مسلم کے الفاظ شاور حين بلغه اقبال ابی سفیان (آپ نے مشورہ کیا جبکہ ابوسفیان کے آنے کی خبر پہنچی) سے واضح ہے، دوسری دفعہ مدینہ سے باہر جیسا کہ اوروں کی حدیث میں ہے۔

یہ تطبیق کیسی اچھی ہے، چونکہ انصار نے بیعت کے وقت آنحضرت ﷺ سے یہ عہد کیا تھا کہ جب آپ مدینہ میں ہوں گے، تو ہماری امان میں ہوں گے، لہذا ان سے دو دفعہ مشورہ طلب کیا گیا، پہلی دفعہ مدینہ سے نکلنے کے وقت، یہ مشورہ محض قافلہ تجارت سے تعرض کے لیے تھا، دوسری دفعہ وادی ذفران میں جبکہ قریش کے مکہ سے آنے کی خبر لگی، یہ



مشورہ فوج قریش سے مقابلہ کے لیے تھا، حدیث انس کے دوسرے ٹکڑے میں جو حبشی غلام کا قصہ مذکور ہے، وہ بدر پہنچ کر وقوع میں آیا ہے، اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ مدینہ ہی میں آنحضرت ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، مولوی شبلی صاحب کا بار بار کہنا کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے بڑے سامان کے ساتھ اچھی طرح تیاری کر کے نکلے تھے، بالکل بے اصل ہے، ہم اپنے قول کے ثبوت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری حدیث پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

عن ثابت عن انس بن مالک قال بعث رسول الله ﷺ بسبسة عينا ينظر ما صنعت عير ابى سفيان فجاء ومافى البيت احد غيري رسول الله ﷺ قال لا ادري ما استنى بعض نساته قال فحدثه الحديث قال فخرج رسول الله ﷺ فتكلم فقال ان لنا طلبة فمن كان ظهره حاضرا فليركب معنا فجعل رجال يستاذنونهم في ظهرانهم في علو المدينة فقال لا الا من كان ظهره حاضرا فانطلق رسول الله ﷺ واصحابه حتى سبقوا المشركين الى بدر (الحديث) (صحيح مسلم، كتاب الجهاد باب سقوط فرض الجهاد عن المعلومين)

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سبہہ رضی اللہ عنہ کو بطور جاسوس بھیجا کہ ابوسفیان کے قافلہ کا حال دریافت کرو، پس حضرت سبہہ آئے اور دولت خانہ میں سوائے میرے اور رسول اللہ ﷺ اور کوئی نہ تھا، راوی نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ انس نے ازواج مطہرات میں سے کسی کو مستثنیٰ نہ کیا، راوی کا قول ہے کہ انس نے مجھ سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نکلے، پس آپ نے کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا مطلوب ایک ہے جس کا سواری کا اونٹ موجود ہو، وہ سوار ہو کر ہمارے ساتھ چلے، پس لوگ آپ سے ان اونٹوں کے لانے کیلئے جو مدینہ کے بالائی حصہ میں تھے، اجازت مانگنے لگے، آپ نے فرمایا نہیں، مگر وہ جس کا سواری کا اونٹ حاضر ہے، پس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب روانہ ہوئے یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر میں پہنچ گئے۔

اس حدیث مسلم سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان مدینہ منورہ سے کیسی جلدی اور کس بے سرو سامانی میں نکلے ہیں اور نکلے بھی قافلہ کے لیے ہیں۔ علامہ ابن قیم (زاد المعاد، غزوہ بدر) یوں لکھتے ہیں۔

وجملة من حضر بدر من المسلمين ثلثمائة وبضعة عشر رجلا من المهاجرين ستة وثمانون ومن الاوس احد وستون ومن الخزرج مائة وسبعون والماقل عدد الاوس عن الخزرج وان كانوا اشد منهم واقوى شوكة ..... عند اللقاء لان منازلهم كانت في عوالي المدينة وجاء النفير بغلة وقال النبي ﷺ لا يتبعنا الا من كان ظهره



حاضر افاستأذنه رجال ظهورهم كانت في علو المدينة ان يسأني بهم حتى يذهبوا الى  
ظهورهم فسأبي ولم يكن عزمهم على اللقاء ولا اعدوا له عدة ولا تاهبوا له اهبة ولكن  
جمع الله بينهم وبين عدوهم على غير ميعاد“

مسلمانوں کی تعداد جو بدر میں حاضر ہوئے، تین سو دس سے کچھ اوپر تھی، مہاجرین میں سے ۸۳، اوس میں  
سے ۶۱، اور خزرج میں سے ۱۷۰ تھے، اوس اگرچہ شوکت میں خزرج کی نسبت شدید قوی تھے اور لڑائی کے وقت زیادہ  
ثابت تھے، مگر ان کی تعداد خزرج سے اس لیے کم تھی کہ ان کے گھرمینہ کی بالائی آبادی میں تھے اور روانگی اچانک  
ہو گئی، اور نبی اکرم ﷺ نے فرمادیا کہ ہمارے ساتھ وہی چلے گا جس کے پاس سواری کا اونٹ موجود ہو، اس پر ان لوگوں  
نے جن کے اونٹ مدینہ کے بالائی حصہ میں تھے، آپ سے اجازت طلب کی کہ آپ مہلت دیں کہ ہم اپنے اونٹ لے  
آئیں، مگر آپ نے اجازت دینے سے انکار کیا اور ان کا ارادہ لڑائی کا نہ تھا اور نہ لڑائی کے لیے کوئی سامان تیار کیا تھا اور  
نہ اس کے لیے کوئی تیاری کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر وعدہ مقابل کر دیا۔

بیان بالا سے صاف ظاہر ہے کہ مدینہ سے نکلنے وقت کوئی خاص تیاری نہیں کی گئی، ورنہ فقط دو گھوڑے  
ستر اونٹ اور تین سو پانچ اصحاب ساتھ نہ ہوتے، بلکہ اس سے کئی گنا سامان ساتھ ہوتا، مولوی شبلی صاحب کا یہ کہنا بھی  
غلط ہے کہ فوج قریش مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نہیں نکلی تھی، چنانچہ صحیح بخاری (کتاب المغازی، باب من  
يقتل بدر) میں حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما میں یہ الفاظ ہیں۔

فلما كان يوم بدر استفر ابو جهل الناس قال ادر كوا غيركم فكمه امية ان يخرج  
جب بدر کا دن آیا ابو جہل نے لوگوں کو نکلنے کی دعوت دی اور کہا ”تم اپنے قافلہ تجارت کو بچاؤ“ پس امیہ  
نے نکلنا پسند نہ کیا۔

اس حدیث بخاری سے صاف ظاہر ہے کہ قریش مکہ سے اپنے قافلے کو بچانے کے لیے نکلے تھے، حضرت علی کرم  
اللہ وجہہ کی جو حدیث پیش کی گئی ہے، اس میں اختصار ہے اور صرف مدینہ سے باہر کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، اس  
میں یہ مذکور نہیں کہ مدینہ میں مشرکین کے آنے کی خبر پہنچی، بدر کے حالات کا دریافت کرنا اور مشرکین کی آمد کی خبر کا آنا یقیناً  
مدینہ سے باہر وقوع میں آیا جیسا کہ قرآن واحادیث صحیحہ سے ثابت ہے، حضرت علی کی دوسری حدیث میں جو بروایت ابن  
عسا کر کنز الایمان (جزء خامس صفحہ نمبر ۲۶۶) میں مذکور ہے، بخار کا آنا بھی مدینہ میں نہ تھا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن علي قال لما كان ليلة بدر اصابنا وعك من حمى وشيئ من مطر الحديث  
حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب بدر کی رات آئی، تو ہمیں تپ کی تکلیف اور کچھ بارش ہوئی۔



بہر حال تپ کا آنا کہیں ہو، مشرکین کے مکہ سے آنے کی خبر مدینہ میں نہ پہنچی تھی اور مسلمان مدینہ منورہ سے محض قافلہ تجارت سے تعرض کے لیے نکلے تھے۔

**نتیجہ:** ہماری تحقیقات بالا سے جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ پڑھنی ہے، غزوہ بدر کے متعلق واقعات میں ترتیب حسب ذیل ہے۔

ہجرت کے بعد قریش نے مسلمانوں کو حج و عمرہ سے روک دیا، اس پر مسلمانوں نے ان کی شامی تجارت کا راستہ بند کرنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ مذہبی مداخلت سے باز آجائیں، اسی غرض کے لیے مسلمانوں نے ان کے قافلوں سے چھیڑ خانی شروع کی، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ کی بذریعہ وحی ابوسفیان کے قافلہ تجارت کے آنے کی خبر لگی تو آپ نے بالخصوص انصار سے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کے لیے استمراج فرمایا، چنانچہ آپ فوری تمام تیاری کر کے نہایت جلدی سے مدینہ سے نکلے، وادی ذفران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اقدس ﷺ کی خدمت بابرکت میں قریش کے مکہ سے آنے کی خبردار دونوں جماعتوں (قافلہ تجارت و فوج قریش) میں سے ایک کے وعدے کے ساتھ نازل ہوئے، حضور نے مہاجرین و انصار سے دوبارہ استمراج فرمایا کہ وہ دونوں جماعتوں میں سے کسے چاہتے ہیں، اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو طائفہ ثانیہ پر فتح کی بشارت دی، لہذا حضور جاں نثارانہ تقریریں کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا ”اللہ کی قسم! گویا میں قریش کے مرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں“ قصہ کوتاہ آنحضرت ﷺ وہاں سے بدر پہنچے، جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم دی۔

**قال الشبلی النعمانی:** ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں، لیکن بیظمن قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لیے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو یہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لیے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا، اس بناء پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جن میں ۷۲ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بناء پر آپ نے انصار کو مخاطب کیا، کیونکہ معاہدہ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔

(سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۸)



**اقول:** مولوی شبلی صاحب نے اس مقام تک جو نصوص قطعی بیش کی ہیں ان کا حال تو ناظرین پر واضح ہو چکا ہے، اب مولوی صاحب بلا سند اپنے قیاسات بیان کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ قریش کے مکہ سے آنے کی خبر مدینہ میں نہ پہنچی تھی، ہاں قافلہ ابوسفیان کے شام سے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی، لہذا اپنا ہر معاہدہ بیعت حضور اقدس ﷺ نے مدینہ ہی میں قافلہ تجارت سے تعرض کرنے کے لیے انصار سے مشورہ طلب فرمایا جیسا کہ حدیث مسلم کے حوالے سے پہلے بیان ہوا، لہذا مولوی صاحب کی خامہ فرسائی بے سود ہے۔

**قال الشبلی النعمانی:** (۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے، عموماً قریش کا اثر نہ تھا، اس بناء پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھتا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آرہا ہے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں، مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جا کر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آ جاتی ہے۔ (سیرت النبی جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۸، ۲۵۹)

**اقول:** اس میں شک نہیں کہ جب مسلمان مدینہ منورہ سے نکلے تو ان کا مقصود فقط کاروان تجارت سے تعرض کرنا تھا، مولوی شبلی صاحب کا یہ قیاس بالکل درست ہے کہ انہیں شام کی طرف بڑھنا چاہیے تھا، مگر چونکہ قافلہ کا ٹھیک مقام اور پہنچنے کا وقت معلوم نہ تھا، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے پہلے دو آدمیوں کو شام کی طرف بغرض تجسس بھیجا۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

لما تحین رسول اللہ ﷺ انصراف العیر من الشام الی کان خرج لہا یرید ہا حتی بلغ ذوالعشیرۃ بعث طلحۃ بن عبید اللہ التیمی وسعید بن زید بن عمرو بن نفیل یتجسسان خبر العیر فبلغا التجار من ارض الحوراء فنزلا علی کشد الجہنی فاجارہما وانزلہما واکتم علیہما حتی مرت العیر ثم خرجا وخرج معہما کشد خفیرا حتی اوردہما ذالمروۃ وساحت العیر واسرعت فسا روا باللیل والنہار فرقا من الطب فقدم طلحۃ وسعید المدینۃ لیخبرا رسول اللہ ﷺ خبر العیر فوجداه قد خرج

چونکہ رسول اللہ ﷺ شام سے اس قافلہ کی واپسی کے منتظر تھے جس کے قصد سے ذوالعشیرہ تک تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کو بطور جاسوس قافلہ کی خبر لانے



کے لیے بھیجا، چنانچہ وہ دونوں تجار واقع سرزمین حوراء تک پہنچے اور کشد جہنی کے ہاں اتارا اور ان کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ قافلہ گزر گیا، پھر وہ دونوں نکلے اور ان کے ساتھ کشد بھی بطور رہنما نکلا، یہاں تک کہ ان کو ذوالمرہ لے آیا اور قافلہ ساحل کی طرف ہولیا اور جلدی چلا، اہل قافلہ گرفتاری کے ڈر سے دن رات چلتے تھے، پس طلحہ اور سعید مدینہ منورہ میں آئے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کو قافلہ کی خبر دیں مگر حضور اقدس ﷺ ان کے پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔

ذوالمرہ (دیکھو معجم البلدان) وادی القری میں ہے جو مدینہ منورہ سے شام کے راستے میں ہے، چونکہ ذوالمرہ سے قافلہ مدینہ کا راستہ چھوڑ کر ساحل بحر کو ہولیا تھا، اور پہنچنے کے لیے شب و روز چلتا تھا، اس لیے حضرت طلحہ و سعید رضی اللہ عنہما کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے وہ ساحل بحر کے رخ دور نکل گیا تھا کہ اس اثنا میں حضرت بسیمہ رضی اللہ عنہا اس کی خبر لائے، یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کو نہایت جلدی مدینہ منورہ سے لکنا پڑا اور انہوں نے بجائے شمال مدینہ کے مدینہ منورہ کے جنوب مغرب کو ساحل بحر کا رخ کیا تاکہ اسے جا گھیریں۔ مولوی شبلی صاحب نے اس قسم کے اور قیاسات بھی پیش کیے ہیں جو نظر بر اختصار پس انداز کیے جاتے ہیں۔

اللهم انی اسئلك بحبیك سیدنا و مولانا محمد بن المصطفیٰ ﷺ و باہل بدر ﷺ ان  
تبلغنی فی الدارین اقصى مرامی و تغفر لی و لوالدی و لمشائخی و لاحبابی  
ولسائر المؤمنین و المؤمنات و ان تؤید الاسلام و المسلمین“ (غزوات النبی)



وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ  
الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (آیہ نمبر ۱۲۶)

(۱) اور یہ فتح اللہ نے نہ کی مگر تمہاری خوشی کیلئے اور اسی لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو چین ملے اور مدد نہیں مگر اللہ غالب حکمت والے کے پاس سے۔ (کنز الایمان)

(۲) اور نہیں بنایا اس کو (امداد کو) اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے تمہارے دلوں کو اس کی وجہ سے، اور نہیں ہے امداد مگر اللہ کی طرف سے جو غالب ہے (اور) حکمت والا۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ﴾ اس میں ضمیر منصوب ”نصر“ مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے جو ”نصرکم“ کے ضمن میں



**جواب دوم:** پہلے اعتراض کا یہ دوسرا جواب ہے کہ ”ولتطمئن“ میں واو زائد عاطفہ نہیں کہ اس پر کسی قسم کا کوئی گناہ لازم آئے۔

﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾

”اور نہیں امداد مگر اللہ کی طرف سے جو غالب (اور) حکمت والا۔“

”والغرض منه ان يكون توكلهم على الله لا على الملائكة“ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ صحابہ کرام کو متنبہ (خبردار) کرنا مقصود تھا کہ فرشتوں کی امداد کی طرف توجہ نہ کرنا، بلکہ کامل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھنا کہ حقیقی طور پر وہی ہے امداد کرنے والا، یہ ظاہری فقط اسباب ہیں۔

”وهذا تنبيه على ايمان العبد لا يكمل الا عند الاعراض عن الاسباب والاقبال بالكلية على مسبب الاسباب“ اور اس سے ایمان والوں کو تنبیہ کی گئی کہ بندے کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا، اور اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچتا جب تک وہ اسباب سے اعراض نہ کرے، یعنی اسباب کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے، بلکہ مؤثر حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔

﴿الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾

”فالعزيز اشارة الى كمال قدرته“ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ”عزیز“ ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ اسے کمال قدرت حاصل ہے۔

”والحكيم اشارة الى كمال علمه فلا يخفى عليه حاجات العباد ولا يعجز عن اجابة الدعوات“ اور رب تعالیٰ نے اپنی صفت حکیم ذکر فرما کر یہ بتایا کہ اللہ کو کامل اور حقیقی علم حاصل ہے وہ اپنے بندوں کی حاجات کو جانتا ہے، ان کی کوئی حاجت ان پر مخفی نہیں، اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے سے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ جس ذات کی یہ شان ہے اس کا امداد کرنا سوائے اس کی رحمت کے نہیں، اور نہ ہی اس کی اعانت حاصل ہے سوائے اس کے فضل و کرم کے۔ (کبیر)

**اعتراض:** انهم لو كانوا اجساما كثيفة وجب ان يراهم الكل وان كانوا اجساما لطيفة هوائية تعذر ثبوتهم على الخيل

فرشتے اگر اجسام کثیفہ تھے تو ضروری تھا کہ ان کو سب لوگ دیکھتے، اگر اجسام لطیفہ ہوائیہ تھے تو ان کو گھوڑوں پر سوار محذور (مشکل) ہے، پتہ چلا کہ فرشتے گھوڑوں پر سوار ہو کر امداد کیلئے آئے تھے یہ قول درست نہیں۔



**جواب:** یہ اعتراض قوانین شریعت کے خلاف ہے، اور نہ ہی وہ اعتراض کر سکتا ہے جو یہ اعتراف کرے ”انہ تعالیٰ قادر علی ما یشاء فعال لم یرید“ کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے ہر چیز پر جسے وہ چاہے، اور وہ کرتا ہے جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے، جب قرآن پاک کی آیات میں واضح طور پر فرشتوں کا آنا اور امداد کرنا ثابت ہے اور احادیث سے ثابت ہے جو متواتر کے قریب ہیں تو ان کا انکار بہرہ اور گونگا ہی کر سکتا ہے ”فکان الاصح اصم عن سماعہ او اعمی عن رؤیة رباعہ“ گویا کہ کفر کی وجہ سے جو بہرہ ہے وہ آیات و احادیث کو سننے سے بھی بہرہ ہے، اور کفر کی وجہ سے جو حق راہ کو دیکھنے سے اندھا ہے وہ قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث مبارکہ کو حق دیکھنے سے بھی اندھا ہے۔ (روح المعانی)

**اعتراض:** اکیلے جبریل نے لوط علیہ السلام کی قوم کو زیروزبر کر دیا تھا، فرشتے جب بدر میں آ گئے تھے تو لوگوں کو لڑائی کرنے کا حکم کیوں دیا گیا، اور اتنے فرشتوں کے آنے کا کیا فائدہ تھا ایک جبریل ہی کفار قریش کو قتل کر سکتے تھے۔

**جواب:** لوط علیہ السلام کی قوم جب مستحق عذاب ہو گئی تو وہ دائرہ تکلیف (مکلف ہونے) سے باہر آ گئے، اس لئے جبریل نے ان کو زیروزبر کر دیا، لوگوں کو ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا کیونکہ وہ تمام گمراہ تھے سوائے لوط علیہ السلام کے اور ان کی بچیوں کے، لیکن یہاں تو صحابہ کرام مکلف تھے اس لئے ان کو لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا، جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ اتنی تعداد میں فرشتے کیوں آئے صرف جبریل ہی کافی تھے، اس کی وجہ پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ فرشتے لڑائی کرنے کیلئے نہیں آئے تھے صرف مسلمانوں کے اطمینان قلب کیلئے آئے تھے، ہاں کہیں کہیں کفار پر ضرب بھی لگادی جیسا کہ پہلے حدیث پاک سے یہ مسئلہ ثابت کیا جا چکا ہے۔ (ماخوذ از روح المعانی)

”فان الانسان معتاد بثبت الاسباب فيطمئن قلبه عند ملاحظة الاسباب بالنصر عند كثرة الاعوان“

اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کی ایک عادت ہے کہ وہ اسباب کا سہارا لیتا ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ امداد کے ظاہری اسباب پائے گئے ہیں، اور کثیر مددگار پائے گئے ہیں تو اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔

(منظری)

یہی وجہ ہے کثیر تعداد میں فرشتوں کے آنے کی، صحابہ کرام چونکہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی پر کامل ایمان رکھتے تھے آپ نے جب رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی سنا دیا تو انہوں نے اس پر ایمان لایا کہ ہاں یقیناً کثیر تعداد میں فرشتے ہماری امداد کو آ گئے، کہیں کہیں کسی فرشتے کو انسانی شکل میں گھوڑے پر سوار بعض صحابہ نے دیکھ بھی لیا۔





(آیت نمبر ۱۲۷)

لَيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ ۝

(۱) اس لئے کہ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے یا انہیں ذلیل کرے کہ نامراد پھر جائیں۔ (کنز الایمان)

(۲) تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں کا یا ذلیل کر دے ان کو کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

”لَيَقْطَعَ“ میں ”لام کی“ جو حقیقت میں لام جارہی ہوتا ہے اس کا تعلق ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾

الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ سے ہے۔

”والمعنى ان المقصود من نصركم بواسطة امداد الملائكة هو ان يقطعوا طرفا من

الذين كفروا اى يهلكوا طائفة منهم ويقتلوا قطعة منهم“

مطلب یہ ہے کہ تمہاری فرشتوں کے ذریعے امداد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کافروں کی ایک طرف کو کاٹ دیا جائے یعنی ایک گروہ کو ہلاک کر دیا جائے کہ وہ میدان جنگ میں قتل کر دئے جائیں۔ ”لَيَقْطَعَ“ کا تعلق ”وَلتطمئن قلوبكم به“ سے بھی کیا گیا ہے، البتہ اس صورت میں حرف عطف واو کو حذف کیا گیا ہے، اس صورت میں مطلب یوں ہو جائے گا، یہ امداد تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے بشارت بنائی اور تمہارے دلوں کو اطمینان پہنچانے کیلئے، تاکہ اس امداد کے ذریعے تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو خاص کر کے کافروں کے ایک حصہ کے کٹ جانے سے تمہارے دلوں کو اور زیادہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ ”طرفا“ ای طائفة وقطعة ”طرفا“ کا معنی ایک گروہ اور ایک ٹکڑا، ایک حصہ، ”طرف“ ذکر کیا، وسط ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وسط تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ایک طرف سے شروع کرے، اس سے جنگی تدبیر میں بتادی، جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ”قاتلوا الذين يلونكم“ قتال کرو ان لوگوں سے جو تمہارے قریب ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

یعنی پہلے ایک طرف کے قریب لوگوں سے جنگ کی جائے، ان کو ختم کر کے آگے بڑھا جائے، ایسا نہ ہو کہ ایک مرتبہ ہی درمیان میں ٹھس جائے، کفار ادھر ادھر سے گھیرے میں لے کر اسے شکست سے درچار نہ کر دیں۔ ”اویکبتہم“ یدلہم بالہزیمۃ (جلالین) یا ان کو شکست دے کر ذلیل و خوار کر دے، الکبت: فناء ۵ مبدلة من الدال وهو الغیظ الذی یحرق الکبد“ ”الکبت“ اصل میں ”الکبد“ ہے، وال کو تاء بنایا گیا، کبد کا معنی ہے ”جگر“ کیجہ ”پھر“ کبت ”اس غیظ و غضب پر بولا گیا جس سے جگر اور کیجہ جل اٹھے۔ (صادی)



اسی مناسبت سے لغت میں یہ معنی بھی استعمال ہے۔ ”الکبت فی اللغة صرع الشئ علی وجهه“ ”الکبت“ کا لغوی معنی یہ ہے ”کسی چیز کا چہرے کے بل گر جانا“ ”اوندھا ہونا“ ”سرنگوں ہونا، الٹا ہونا کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر ہونا وغیرہ اس قسم کے معانی میں عام طور پر استعمال ہوتا رہتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے ”کبتہ فانکبت“ میں نے اسے چہرے کے بل گرایا تو وہ گر گیا۔

”والمراد به الاخزاء والاهلاك واللعن والهزيمة والغیظ والاذلال فكل ذلك ذكره المفسرون فی تفسیر الکتب“

مفسرین کرام نے ”کبت“ کی تفسیر میں مرادی معانی مختلف بیان کئے ہیں تقریباً مقصد سب کا ایک ہی ہے، وہ معانی یہ بیان کئے گئے ہیں ”رسوا کرنا، ہلاک کرنا، لغت کرنا، شکست دینا، غیظ و غضب کرنا اور ذلیل کرنا۔ (کبیر)

﴿فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ﴾ ”کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر۔“

وقوله (خائبين) الخيبة هي الحرمان ”خيبة“ کا معنی ہے محروم ہونا، اسی وجہ سے واقعہ نے یہی ترجمہ کیا ہے ”کہ وہ لوٹیں محروم ہو کر“ ”خیبة“ اور ”یاس“ میں فرق یہ ہے ”ان الخيبة لا تكون الا بعد التوقع واما الياس فانه قد يكون بعد التوقع وقبله“ کہ بیشک ”خیبة“ اس محرومیت اور رسوائی پر بولتے ہیں جو توقع کے بعد حاصل ہو، کام کے ہونے کی توقع تھی لیکن وہ کام نہ ہوا بلکہ محرومیت حاصل ہوئی، اور یاس کبھی توقع کے بعد امید کے ختم ہونے پر بولتے ہیں، اور کبھی اس پر بولتے ہیں کہ توقع تو نہیں تھی لیکن پہلے ہی کام ہونے کی امید ختم ہو گئی۔ فنقیض الياس الرجاء ونقیض الخيبة الظفر“ واللہ اعلم، یاس کی نقیض ”رجاء“ ہے، یعنی ”یاس“ کا معنی ناامید ہونا، اور رجاء کا معنی ہے ”امید رکھنا“ اور خيبة کی نقیض ”ظفر“ ہے ”خیبة“ کا معنی ہے کامیاب نہ ہونا، اور ”ظفر“ کا معنی ہے ”کامیاب ہونا۔ (کبیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کبیر کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت خوب نظر آئے گا، آپ نے یوں ترجمہ کیا ”کہ نامراد پھر جائیں۔“

**تنبیہ:** بعض مفسرین کرام نے اس آیت کریمہ کو غزوہ احد کے متعلق ذکر کیا ہے، لیکن زیادہ جمہور محققین نے بدر کے ساتھ متعلق کیا ہے، اگر غزوہ احد کے ساتھ متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جب تم نے درہ کو چھوڑ دیا تھا اور بظاہر نبی کریم ﷺ کے حکم کی تم سے اجتہادی خطاء سے مخالفت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی کہ سولہ یا اٹھارہ کافر قتل



ہو گئے تھے، اور تمہیں میدان جنگ میں قائم رکھ کر ان کو رسوا کر کے لوٹا دیا۔ (ماخوذ از کبیر)

**تنبیہ:** (لیقطع طرفا من الدین کفروا) بالقتل والاسر (جلالین)

تاکہ کاٹ دے ایک طرف کافروں کی، یعنی ان کو قتل کرا کے اور قید کرا کے ان کی طرف کاٹ دیا جائے، یعنی ستم کی تعداد میں وہ قتل ہو گئے اور ستم قید ہو گئے، یہی تفسیر البحر المحیط میں بھی ہے۔



لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۲۸)

(۱) یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں یا انہیں توبہ کی توفیق دے یا ان پر عذاب کرے کہ وہ ظالم ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) نہیں ہے آپ کیلئے کسی امر سے کوئی چیز، یہاں تک کہ وہ ان کی توبہ قبول کرے، یا ان کو عذاب

دے بیشک وہ ظالم ہیں۔ (نجوم الفرقان)

مقام پر خطر ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا:

(لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ) ای لا تملك لهم نفعاً تصلحهم ولا ضراً تهلكهم فنفى ذلك من حيث الإيجاد والاعدام وامان حيث الدلالة والشفاعة فهو الدليل الشفيع المشفع جعل الله مفاتيح خزائنه بيده فمن زعم ان النبي ﷺ كآحاد الناس لا يملك شيئاً أصلاً ولا نفع به لا ظاهراً ولا باطناً فهو كافر خاسر الدنيا والآخرة واستدلاله بهذه الآية ضلال مبين“ (صاوی)

”آپ کیلئے کسی امر میں کوئی خبر نہیں“ یہ راقم نے لغوی ترجمہ کیا ہے، مطلب اس کا تفسیر صاوی میں بہت خوب بیان کیا گیا ہے، کہ آپ کے ہاتھ میں کسی چیز کا موجود کرنا یعنی تخلیق کرنا یا کسی چیز کا معدوم کرنا یعنی فوت کرنا نہیں، کہ آپ ذاتی طور پر ان کو نفع نہیں پہنچا سکتے جو ان کیلئے نفع مند ہو اور نہ ہی آپ ذاتی طور پر ان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جو ان کو ہلاک کر دے۔

”والمعنى ان الله مالك امرهم على الاطلاق فاما ان يهلكهم او يكتبهم او يتوب عليهم

(روح البیان)

ان اسلموا او يعذبهم تعذيباً شديداً اخر ويا ان اصروا“

معنی یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے تمام امور کا مطلق مالک ہے، ان کو ہلاک یا ان کو ذلیل و رسوا کرے یا ان کو ایمان کی توفیق عطا کر دے کہ وہ ایمان لے آئیں تو ان کی توبہ قبول کر لے، اور اگر وہ کفر پر اصرار



کریں تو ان کو شدید اخروی عذاب دے

(فانهم ظالمون) قد استحقوا التعذيب بظلمهم “ (بیشک وہ ظالم ہیں) یعنی بوجہ ظلم کرنے کے وہ مستحق عذاب ہیں۔ عنوان کے مطابق تفسیر صاوی کی بعد والی عبارت پر توجہ کریں “ کہ نبی کریم ﷺ سے ایجاد کرنے اور معدوم کرنے کی نفی کی گئی ہے، جہاں تک راہنمائی کرنے اور شفاعت کرنے کا تعلق ہے اس میں آپ کو اختیار دیا گیا ہے، آپ کو رب تعالیٰ نے ”شافع مشفع“ بنایا ہے کہ آپ شفاعت فرماتے ہیں اور آپ کی شفاعت کو قبول کیا جاتا ہے آپ کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے خزانوں کی چابیاں دے دیں، جو شخص یہ گمان کرے کہ نبی کریم ﷺ امت کے عام آدمیوں کی طرح ہیں، کسی چیز کے ظاہر اور باطن مالک نہیں وہ کافر ہے دنیا اور آخرت میں خسارت میں ہے، اگر کوئی اس آیت کریمہ سے نبی کریم ﷺ کے اختیار کی نفی ثابت کرنے کی کوشش تو وہ واضح گمراہ ہے، اور اس کا یہ باطل استدلال کھلی گمراہی ہے۔

### شان نزول میں چند احتمالات:

اگرچہ بظاہر چند احتمالات نظر آرہے ہیں لیکن تمام ہی حقیقت میں معتبر ہیں۔ کئی واقعات کے بعد آیت کریمہ جب نازل ہو تو وہ سب ہی مجموعی طور پر شان نزول ہوتے ہیں۔

(۱) شان نزول میں ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ کا دانت مبارک شہید کر دیا گیا اور آپ کا سر مبارک زخمی کر دیا گیا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ بیر معونہ کے متعلق نازل ہوئی، جہاں حفاظ و قراء کو شہید کر دیا گیا تھا۔

### شان نزول کی مکمل تفصیل:

**بہا قول:** جب پہلا قول مراد لیا جائے لیا جائے کہ یہ آیت کریمہ غزوہ احد کے متعلق نازل ہوئی تو اس میں پھر تین احتمال ہیں۔

ایک احتمال یہ ہے:

”وقیل اراد ان يدعوا عليهم فنزلت هذه الآية“ کہ نبی کریم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ احد والے کفار



کے خلاف دعاء کریں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس سے آپ کو منع کیا گیا کہ یہ معاملہ رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے آپ نے احد میں شریک کفار کے متعلق دعاء ہلاکت کرنے کا ارادہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ اس حدیث پاک سے دیکھئے۔

عن انس ابن مالک ان رسول اللہ ﷺ کسرت رباعيته وشج فی رأسه فجعل یسلط الدم عنه ویقول کیف یفلح قوم شجوا نبیہم وکسروا رباعيته وھو یدعوہم الی اللہ تعالیٰ فانزل اللہ تعالیٰ "لیس لک من الامر شیء"

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ کا جب رباعیہ دانت کا کچھ حصہ شہید کر دیا گیا (آپ کا سر مبارک زخمی کر دیا گیا تو آپ وہ خون صاف کر رہے تھے اور ارشاد فرما رہے تھے وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کے سر اور چہرہ کو زخمی کر دیا اور دانت کا ایک حصہ شہید کر دیا حالانکہ وہ نبی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے) تو اس وقت آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان کیلئے دعاء ہلاکت کریں (تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

دوسرا احتمال اس میں یہ ہے:

روی احمد و البخاری عن ابن عمر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول اللھم العن فلانا، وفی رواية اللھم العن اباسفیان اللھم العن الحارث بن ہشام اللھم العن سہیل بن عمرو واللھم العن صفوان ابن امیہ فنزلت هذه الآیة الی آخر فتیب علیہم کلھم "مسند احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی کہ آپ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "اے اللہ فلاں پر لعنت کر" ایک روایت میں (صریحہ مذکور) ہے کہ آپ یہ کہہ رہے تھے "اے اللہ ابوسفیان پر لعنت بھیج، اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت بھیج، اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت بھیج، اے اللہ صفوان بن امیہ پر لعنت بھیج" تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، یہ تمام لوگ ایمان لے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمایا۔

تیسرا احتمال اس میں یہ ہے:

وقال سعید بن المسیب ومحمد بن اسحاق لما رأى رسول اللہ ﷺ والمسلمون يوم احد مانال اصحابہم من جزع الاذان والانوف وقطع المذاکیر قالوا لئن انا لئنا اللہ منهم لنفعلن بہم مثل ما فعلوا ولنمثلن بہم مثله، لم یمثلھا احد من العرب باحد، فانزل



اللہ هذه الآية وقيل اراد النبي ﷺ ان يدعو عليهم بالاستيصال فنزلت هذه الآية “

سعید بن مسیب اور محمد بن اسحاق کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے احد کے دن دیکھا کہ بعض صحابہ کرام (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ) کے کان اور ناک کاٹ دئے گئے، اور ان کا آلہ تناسل کاٹ دیا گیا یعنی ان کو مثلہ بنا دیا گیا، تو انہوں نے کہا اگر ہمیں موقع ملا تو ہم بھی کافروں کو مثلہ بنا کر ان کی شکلوں کو بگاڑ دیں گے، کیونکہ اس سے پہلے عرب میں کسی ایک نے بھی کسی کو مثلہ نہیں بتایا تھا، یہ پہلا موقع تھا جہاں کفار نے مثلہ بنانے کا رواج قائم کیا، رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرما کر مسلمانوں کو اس ارادہ سے منع فرمادیا، کہ انہوں نے اگر غلط کام کیا ہے تو تم اس کے جواب میں ایسا نہ کرنا، اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اس حالت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ ان کی تباہی و بربادی کی دعاء کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔ (ماخوذ از کبیر و مظہری)

### روایات میں تطبیق کیسے؟

ابھی تک جو روایات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوہ احد میں کافروں کے تباہ و برباد ہو جانے کی دعاء کا ارادہ کیا، بلکہ چند لوگوں پر نام لے کر لعنت بھی فرمائی، لیکن دوسری روایت ان روایات کے خلاف نظر آتی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔

عن ابن مسعود قال كَانِي انظر الى رسول الله ﷺ يحكي نبيا من الانبياء ضربه قومه وهو يمسح الدم عن وجهه ويقول ”رب اغفر لي لقومي فانهم لا يعلمون“ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گویا کہ اب بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ انبیاء کرام میں سے ایک نبی کی حکایت بیان کر رہے تھے کہ اللہ کے نبی کو اس کو قوم نے مارا، وہ اللہ کا نبی اپنے چہرے سے خون صاف کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا، اے میرے رب میری قوم کی مغفرت فرما بیشک وہ نہیں جانتے۔

”قال علماء نافع الحاکي في حديث ابن مسعود هو الرسول ﷺ وهو المحكي عنه“ علماء کرام نے بیان کیا ہے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ خود اپنا واقعہ بیان فرما رہے تھے، اگرچہ غائب کے صیغے استعمال کئے ہیں، لیکن دوسری روایت میں وضاحت موجود ہے۔  
انه لما كسرت ربا عتيه وشج وجهه يوم احشق ذلك على اصحابه شفا شديدا وقالوا دعوت عليهم فقال اني لم ابعث لعانا ولكن بعثت داعيا ورحمة الله  
اغفر لقومي فانهم لا يعلمون“

نبی کریم ﷺ کے دانت مبارک کا کچھ حصہ احد کے دن شہید کر دیا گیا، آپ کا سر مبارک اور چہرہ زخمی کر



دیا گیا تو آپ کے صحابہ کرام پر شاق گذرا بڑی شدید کوفت ہوئی صحابہ کرام کو، انہوں نے عرض کیا ”کاش آپ ان لوگوں کے خلاف دعاء ہلاکت کر دیتے“ تو آپ نے فرمایا بیشک مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، لیکن مجھے دعاء کرنے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا، اے اللہ میری قوم کی مغفرت فرما دے بیشک وہ نہیں جانتے۔  
(ماخوذ از قرطبی)

**وجہ تطبیق :** جب تک نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء ہلاکت کرنے سے منع نہیں کیا گیا اس وقت تک آپ نے ان کے خلاف دعاء کی لیکن وہ بھی اس وقت جبکہ کافروں نے اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، ذاتی تکلیف کی وجہ سے آپ نے کسی کے خلاف دعاء نہیں کی، جب آپ کو منع فرما دیا گیا تو اس کے بعد آپ نے کفار کے خلاف دعاء ہلاکت نہیں کی۔  
(راقم)

”قال القفال رحمه الله وكل هذه الاشياء حصلت يوم احد فنزلت هذه الآية عند الكل فلا يمتنع حملها على كل الاحتمالات“  
قفال رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ احد کے ساتھ متعلق تمام واقعات پہلے گئے، آیہ کریمہ بعد میں نازل ہوئی، اسلئے آیہ کریمہ تمام احتمالات کو شامل ہے۔  
(کبیر)

**دوسرا قول :** دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیہ کریمہ بر معونہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی، بر معونہ کا واقعہ مختصر اس روایت میں دیکھئے، تفصیلی واقعہ مدارج النبوت سے (الماء اللہ قریب ہی ذکر کیا جائے گا۔

عن ابن عمر انه سمع رسول الله ﷺ اذا رفع رأسه من الركوع في الركعة الاخيرة من الفجر يقول اللهم العن فلانا وفلانا وفلانا بعد ما يقول سمع الله لمن حمده ربنا لك الحمد فانزل الله عليه ليس لك من الامر شئ الى قوله فانهم ظالمون“  
(رواه البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا جب آپ نے اپنا سر مبارک فجر کی دوسری رکعت کے رکوع سے اٹھایا تو آپ فرما رہے تھے اے اللہ فلاں، فلاں، فلاں پر لعنت فرما، یہ دعاء آپ رکوع سے سرائٹھا کر ”سمع الله لمن حمده“ اور ”ربنا لك الحمد“ کے بعد پڑھ رہے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ مکمل آیہ کریمہ ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ نازل فرمائی، تو آپ کو دعاء سے منع فرما دیا، یہ دعاء بر معونہ کے بعد کی گئی۔

بر معونہ کا تفصیلی واقعہ:

ہجرت کو چوتھے سال ماہ صفر میں بر معونہ کا واقعہ درپیش آیا، بر معونہ کا نام سریۃ المندرب بن عمرو، اور سریۃ



القری بھی ہے، بر معونہ ہذیل کے شہروں میں سے ایک موضع ہے، جو مکہ اور عسفان کے درمیان واقع ہے، اس جگہ کا ابو براء عامر بن مالک بن جعفر مدینہ منورہ میں آیا، وہ قبیلہ نجد اور بنی عامر سے تھا، اور نبی کریم ﷺ کی مجلس میں آیا، نبی کریم ﷺ نے اسے دعوت اسلام دی لیکن اس نے اسلام تو قبول نہ کیا، البتہ دین اسلام کی اس نے بہت تعریف کی، کہ آپ کا دین مبارک ہے، اور آپ ملت حنیف پر قائم ہیں، اس نے کہا میری قوم بہت بڑی ہے آپ صحابہ کی ایک جماعت کو میرے ساتھ بھیجیں تاکہ وہ ان کو تبلیغ کریں ہو سکتا ہے وہ ایمان لے آئیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی دعوت کو قبول کر لوں، اور آپ کے حکم کی اطاعت کروں لیکن میں اپنی قوم کا لحاظ کرتا ہوں، وہ ایمان لائیں گے تو میں بھی ایمان لے آؤں گا، نبی کریم ﷺ نے اصل واقعہ کے متعلق پہلے ہی خبر دے دی، اور ارشاد فرمایا کہ میں نجدیوں سے بے خوف نہیں ہوں مجھے خطرہ ہے کہ وہ سرکشی کریں گے۔

ابو عامر نے کہا آپ فکر نہ کریں آپ کے صحابہ میری پناہ اور میری حفاظت میں ہوں گے، آپ ان کی تبلیغ دین کیلئے ضرور بھیجیں، نبی کریم ﷺ پر لازم ہو گیا تھا کہ آپ تبلیغ دین کیلئے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو بھیجیں، اگرچہ اصل سامنے آنے والے حالات سے بھی باخبر کر دیا، آپ نے اپنے ستر صحابہ کرام کو ان کے ساتھ بھیج دیا، جو حفاظ اور قراء تھے، یہ فقراء تھے جو جنگل سے لکڑیاں لا کر ازواج مطہرات کی خدمت میں پیش کرتے تھے، اور بیچ کر اصحاب صفہ کیلئے بھی کھانا لاتے تھے، یہ زیادہ انصاری حضرات تھے، جب رات آئی تو نماز، ذکر، اور تلاوت قرآن میں مشغول ہوئے صحابہ کرام کی اس جماعت کا امیر حضرت منذر بن عمرو کو بنایا، اور کچھ خطوط بھی نجد اور بنی عامر کے رئیسوں کے نام لکھ کر ان کو دیئے۔

ابو براء عامر بن مالک کا ایک بھتیجا عامر بن طفیل بن مالک تھا جو سرکش، دین کا مخالف اور مسلمانوں کا دشمن تھا، برخلاف اس کے ابو براء عامر سرکش نہیں تھا اور مسلمانوں سے اسے دشمنی اور عداوت نہ تھی، مسلمانوں کی جماعت جب بر معونہ پر پہنچی تو انہوں نے اونٹوں کو چرانے کیلئے عمرو بن امیہ ضمری اور حارث بن صمہ کے سپرد کیا، اور حضور ﷺ کا خط خرام بن لجان کے سپرد کیا، یہ بنی عامر کی طرف مبعوث تھے۔

خیال رہے کہ اس وقت کی اصطلاح میں امیر خاص ہوتا تھا، اور مبعوث امیر سے عام ہوتا تھا، خرام اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے کر گئے تاکہ نبی کریم ﷺ کے خطوط عامر بن طفیل تک پہنچائیں، انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو پیچھے رکھا کہ پہلے میں جاتا ہوں، ان سے امان طلب کرتا ہوں، اگر انہوں نے امان دے دی تو تم بھی آ جانا کہ میں تمہارے لئے بھی امان طلب کر لوں گا اگر انہوں نے امان نہ دی مجھے شہید کر دیا تو تم اپنے ساتھیوں سے جا کر مل جانا۔ خرام نے ان لوگوں سے امان طلب کی کہ مجھے امان دوتا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی تم تک پہنچاؤں،



لیکن عامر بن طفیل نے کسی آدمی کو اشارہ کیا جس نے نیزہ مارا وہ پار ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ اسکے بعد خرام نے اپنے چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے کہا ”اللہ اکبر فزت برب الکعبہ“ رب کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں، یعنی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بجا آوری میں، میں نے شہادت حاصل کر لی، عامر بن طفیل نے اپنے قبیلہ بنی عامر سے امداد طلب کی کہ تم میرے ساتھ بر معونہ کی طرف چلو تا کہ وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو قتل کر دیں، لیکن اس کے قبیلہ کے لوگوں نے انکار کر دیا کہ مسلمانوں کو ابو عامر نے پناہ دے رکھی ہے اسلئے ہم اس کے وعدہ کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، اس نے دوسرے قبائل سلیم، رعل، اور ذکوان کے پاس آدمی بھیج کر ان سے امداد طلب کر لی۔ اس نے اپنے ساتھ کثیر جماعت جمع کر لی اور بر معونہ کی طرف روانہ ہو گیا، وہاں مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا، مسلمان جب گھیرے میں آگئے تو رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے مولا کائنات ہمارا سلام رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا دے، تو رب تعالیٰ کے حکم سے جبریل نے ان دردمندوں کا سلام بارگاہ نبوی میں پیش فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی صحابہ کرام کو خبر دے دی کہ تمہارے ساتھی مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور حق تعالیٰ سے مناجات کر رہے ہیں کہ ہمارے حال کی خبر ہمارے ساتھیوں کو پہنچا، ہم تیری رضا چاہتے ہیں، جس میں تو راضی ہے ہم بھی اس میں راضی ہیں۔ صحابہ کرام نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا، کفار زیادہ تعداد میں تھے اور مسلح تھے، صحابہ کرام جو انمردی، ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہوئے سب ہی شہید ہو گئے، ابھی تک منذر بن عمرو کو ان لوگوں نے شہید نہیں کیا تھا بلکہ ان کو امان دینے کی پیشکش دی، لیکن انہوں نے اسے ٹھکرا دیا، آخر کار یہ بھی کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے، مسلمانوں کو ایک سبق دے دیا کہ مسلمانوں کے لشکر کے امیر، جنگی جرنیل و قائد کفار کے سامنے سر نہ جھکانا بلکہ جرأت اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو جانا کہیں ضمیر فروش بن کر، ایمان فروش کر کافروں سے صلح کر کے، مسکراہٹ سے سر جھکا کر معاہدہ پر دستخط نہ کرنا، مسلمانوں کا اسلحہ کافروں کے حوالہ کر کے ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کی گردن میں ذلت کا طوق نہ ڈال دینا۔

عمر بن عمیر ضمیری اور حارث بن صمہ جو اونٹوں کو چراگاہ کی طرف لے گئے تھے، واپس آئے تو دیکھا کہ گردوغبار چھایا ہوا ہے اور لشکر والے مقام پر پرندے اڑ رہے ہیں، اور کافروں کا لشکر بلندی پر چڑھ رہا ہے یعنی بلند گھائیوں کے راستہ واپس جا رہا ہے، ادھر دیکھا کہ ہمارے تمام ساتھی شہید ہو گئے ہیں، ان دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے عمرو بن عمیر نے کہا ہمیں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس چلا جانا چاہئے، لیکن حارث بن صمہ نے کہا شہادت حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ہے اسے اپنے ہاتھ نہ جانے دیا جائے، یہ دونوں کافروں پر جھپٹ



پڑے، حارث نے دو کافروں کو قتل کر دیا، کافروں نے جب ان کو قید کرنا چاہا تو حارث کے سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن پھر بھی دو اور کافروں کو قتل کر دیا، بعد میں خود بھی شہید ہو گئے، لیکن عمرو بن عمیر کو قید کر لیا گیا، عامر بن طفیل نے ان کو اپنا غلام بنا کر سرمنڈا کر آزاد کر دیا، اس لئے کہ اس کی ماں پر ایک غلام آزاد کرنا لازم تھا، ان کو اجازت دی کہ تم آزاد ہو مدینہ (منورہ) جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔

عامر بن طفیل نے عمرو بن عمیر سے پوچھا تم اپنے ساتھیوں کو پہنچانتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں سب کو پہنچانتا ہوں، وہ ان کے ساتھ آیا، ایک ایک کا نام و نسب پوچھا جو آپ نے بتا دیا، اس نے پوچھا کیا تمہارا کوئی آدمی غائب بھی ہے، انہوں نے کہا ہاں عامر بن فہیرہ جو حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ بھی ہمارے ساتھ تھے لیکن یہاں موجود نہیں، اس نے پوچھا وہ کیسا شخص تھا؟ انہوں نے بتایا وہ ہم سے فاضل ترین شخص تھا اور سب سے اول اسلام لانے والوں سے تھا، تو عامر بن طفیل نے کہا جب ان کو شہید کیا گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کو آسمان کی طرف اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے، عامر بن طفیل نجدی ملعون، شقی القلب کتنا ہی بد نصیب اور بد بخت تھا کہ صحابہ کرام کی جماعت مقدسہ کی برکات و کرامات کو دیکھ کر بھی اس کے دل میں اثر نہ ہوا اور ایمان نہ لایا بنی کلاب کا ایک شخص جبار بن سلمی جو کافروں کے درمیان تھا، اس سے منقول ہے کہ جب میں نے عامر بن فہیرہ کو نیزہ مارا تو وہ دوسری طرف پار ہو گیا، تو میں نے سنا وہ کہہ رہا ہے ”فزت برب الکعبہ“ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا، میں نے دیکھا کہ اسے آسمانوں پر لے جایا جا رہا ہے، اس منظر کو دیکھ کر میں دل میں سوچنے لگا کہ عامر کے الفاظ ”فزت برب الکعبہ“ کا حقیقی مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ تو میں نے بعد میں ایک مسلمان ضحاک بن سفیان کا لابی سے ان الفاظ کا مطلب پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کا مطلب یہ تھا ”فزت برب الکعبہ“ رب کعبہ کی قسم میں جنت میں جانے میں کامیاب ہو گیا، یہ سن کر جبار بن سلمی نے اسلام قبول کر لیا، سبحان اللہ سعادت مند لوگ کرامات کو دیکھ کر ایمان لے آتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے

﴿إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ﴾

”جو ذکر کی تابعداری کرتے ہیں اور بے دیکھے رحمن سے ڈرتے ہیں انہیں کو آپ کا ڈرانا موثر ہے تو

انہیں مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دیجئے۔“

بخاری نے بھی عامر بن طفیل کے قول کو ذکر کیا کہ میں نے دیکھا عامر کو آسمانوں پر لے جایا جا رہا ہے، قسطلانی کہتے ہیں کہ واقعہ کی روایت میں ہے ان کو زمین نے چھپا لیا، پھر کافروں نے دیکھا، ابو براء چونکہ اپنی ذمہ داری پر صحابہ کرام کی اس جماعت کو لے کر گیا تھا، اور اس وقت کافر بھی وعدے کا پاس کرتے تھے، اس لئے ابو براء اپن بھتیجے عامر



بن طفیل کی غداری سے بہت زیادہ شرمندہ ہوا، لیکن ایمان نہ لاسکا، فرق یہ تھا کہ عامر بن طفیل پر شیطان غالب رہا یہ مسلمان کا شدید مخالف رہا، اور اس نے بھی ایمان نہ لایا، اور ابو براء پر دنیا غالب رہی وہ بھی ایمان نہ لایا، کافر دونوں ہی رہے البتہ ایک سرکش اور مسلمانوں سے عناد رکھنے والا تھا، اور دوسرا کچھ نرم گوشہ رکھنے والا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے دعاء فرمائی ”اللہم اکفنی عامراً“ اے اللہ! ہمیں عامر سے بچا۔ وہ یہ تھی وہ غدار، دھوکہ باز تھا، کسی قانون کا اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتا تھا، ایسا شخص پر خطر ہوتا ہے کہ وعدہ اور کرے، اور کام اور کرے، جب فقراء اصحاب رسول کے شہید ہونے کی خبر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ غمزدہ اور پریشانی ہوئے، تو نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ اور چالیس دن کے قریب قنوت نازلہ پڑھی اور چند قبائل کے خلاف دعاء ہلاکت فرمائی۔ (ماخوذ از مدارج النبوة جلد نمبر ۲)

### قنوت نازلہ کا ثبوت احادیث سے:

حدثنا عمر و بن عثمان حدثنا بقية عن ابی حمزة قال حدثنی محمد قال حدثنی سعید بن المسیب و ابو سلمة بن عبد الرحمن ان اباهريرة كان يحدث ان رسول الله ﷺ كان يدعو في الصلوة حين يقول سمع الله لمن حمده ربناك والحمد ثم يقول وهو قائم قبل ان سجده اللهم انج الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش ابن ابی ربيعة و المستضعفين من المؤمنين اللهم اشد و طاتك على مضر و اجعلها عليهم كسنى يوسف ثم يقول الله اكبر فيسجد و ضاحية مضر يؤم من مخالفتون لرسول الله ﷺ (نسائي باب القنوت في الصبح)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث بیان کرتے تھے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نماز میں دعاء کرتے تھے جبکہ ”سمع الله لمن حمده“ اور ”ربنا ولك الحمد“ کہہ لیتے تھے، پھر آپ کھڑے ہو کر سجدہ سے پہلے یہ کہتے تھے، اے اللہ ولید ابن ولید اور سلمہ بن هشام اور عیاش بن ربیعہ اور کمزور و ضعیف مومنین کو نجات دے، اے اللہ مضر کو ذلیل کر اور ان کو اس طرح قحط سالی میں مبتلا کر جیسے یوسف علیہ السلام کی قوم قحط سالی میں مبتلا ہوئی تھی، پھر آپ اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے (مضر قبیلہ کے خلاف دعاء کرنے کی وجہ یہ تھی) کہ مضر رسول اللہ ﷺ کے (دین کے) مخالف تھے۔

حدثنا محمد حدثنا سفيان قال حفظناه من الزهري عن سعيد عن ابی هريرة قال لما رفع رسول الله ﷺ رأسه من الركعة الثالثة من صلوة الصبح قال ابخ الوليد بن الوليد و سلمة بن هشام و عياش بن ربيعة و المستضعفين بمكة اللهم اشد و طاتك على مضر و اجعلها عليهم سنين كسنى يوسف“ (نسائي باب القنوت في الصبح)



حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا صبح کی نماز کی دوسری رکعت سے اٹھاتے تو یہ دعاء کرتے (دعاء کا ترجمہ وہی جو پہلی حدیث میں بیان کیا ہے) قنوت نازلہ جب تک جائز رہا اسی کے مطابق مسلم نے یہ عنوان قائم کیا۔

باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات اذ انزلت نازلة العیاذ باللہ واستحبابہ فی الصبح دائماً و بیان ان محله بعد رفع الرأس من الركوع فی الركعة الاخيرة واستحباب الجهرية (مسلم شریف جلد اول صفحہ نمبر ۲۵۷)

باب اس کے بیان میں کہ قنوت تمام نمازوں میں پڑھنا مستحب ہے جبکہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو (العیاذ باللہ) خصوصاً صبح کی نماز میں ہمیشہ پڑھنا مستحب ہے، اور باب اس چیز کے بیان میں کہ قنوت نازلہ کا محل آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے، اور باب اس چیز کے بیان میں کہ قنوت نازلہ کا محل آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے، اور مستحب یہ ہے کہ بلند آواز سے پڑھے، یہ تھا مسلم شریف کا عنوان جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مصیبت کے تمام نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا گیا ہے، اور صبح کی نماز میں زیادہ مرتبہ پڑھا گیا ہے۔

**تنبیہ:** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ یا کچھ دن زائد قنوت نازلہ پڑھا، پھر اسے پڑھنا چھوڑ دیا یعنی اب قنوت نازلہ پڑھنا درست نہیں کیونکہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

**قنوت نازلہ کی منسوخیت احادیث سے:**

عن عاصم قال سألت انس بن مالک عن القنوت فقال قد كان القنوت قبل الركوع او بعده قال قبله قال فان فلانا اخبرني عنك انك قلت بعد الركوع فقال كذب الماقت رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بعد الركوع شهر اراه كان بعث قوما يقال لهم القراء زهاء سبعين رجلا الى قوم مشركين دون اولئك وكان بينهم وبين رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عهد فقتل رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم شهر ايدعو عليهم

(بخاری باب القنوت قبل الركوع وبعده، مسلم باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات)

عاصم کہتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے متعلق پوچھا کہ رکوع کے بعد ہے یا پہلے؟ انہوں نے کہا رکوع سے پہلے، یہ کہتے ہیں، میں نے کہا مجھے تو ایک شخص نے تمہارے متعلق خبر دی ہے کہ تم کہتے ہو رکوع کے بعد قنوت ہے، انہوں نے کہا اس شخص نے جھوٹ بولا ہے، ہاں البتہ یقینی بات ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ رکوع کے



بعد قنوت پڑھا جب آپ نے تقریباً ستر اشخاص کو مشرک قوم کی طرف بھیجا وہ لوگ جن کو بھیجا گیا تھا ان کو قراء کہا جاتا تھا، لیکن مشرک ان کے درپے ہوئے (ان کو شہید کر دیا گیا) حالانکہ ان لوگوں نے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان عہد تھا (ان کی وعدہ شکنی اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو شہید کرنے کی وجہ سے) نبی کریم ﷺ نے ان کے خلاف ایک مہینہ تک دعاء کی، اس حدیث سے واضح ہوا تر کا قنوت رکوع سے پہلے ہے، قنوت نازلہ رکوع کے بعد ہے، وہ ایک مہینہ تک پڑھا گیا، پھر چھوڑ دیا گیا، اب منسوخ ہو چکا ہے۔

عن محمد قال قلت لانس هل قنت رسول الله ﷺ في صلاة الصبح قل نعم بعد الركوع يسيراً“ (بخاری باب القنوت قبل الركوع بعده، مسلم باب استحباب القنوت في جميع الصلوات) محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا نبی کریم ﷺ نے صبح کی نماز میں قنوت پڑھا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں رکوع کے بعد تھوڑا عرصہ پڑھا ہے۔

عن ابي مجلز عن انس بن مالك قال قنت رسول الله ﷺ شهر ا بعد الركوع في صلاة الصبح يدعو على رعل وذكوان ويقول عصية عصت الله ورسوله (بخاری باب غزوة الرجيع ورعل وذكوان، باب استحباب القنوت في جميع الصلوات) ابو مجلز حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد ایک مہینہ قنوت پڑھا، رعل اور ذکوان (قبائل) کے خلاف دعاء کی اور فرمانے لگے ”قبیلہ عصیہ“ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا نافرمان ہے۔

عن محمد بن سيرين عن انس بن مالك ان رسول الله ﷺ قنت شهر ا بعد الركوع في صلاة الفجر يدعو على بني عصية“ (مسلم باب استحباب القنوت في جميع الصلوات) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد ایک ماہ قنوت (نازلہ) پڑھا اور بنی عصیہ کے خلاف دعاء کرتے رہے۔

عن قتادة عن انس ان رسول الله ﷺ قنت شهر ا يدعو على (احياء من) احياء العرب ثم تركه“ (مسلم باب استحباب القنوت في جميع الصلوات)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ ایک مہینہ عرب کے بعض قبائل کے خلاف دعاء فرماتے رہے پھر اسے چھوڑ دیا، اس مضمون کی اور کئی احادیث ہیں جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ قنوت نازلہ منسوخ ہو چکا ہے۔

**فائدہ :** ابھی تک جو احادیث ذکر کی گئی ہیں، ان سے ضمایہ مسئلہ ثابت ہوا کہ وتر میں قنوت رکوع سے پہلے پڑھا



گیا، اور قنوت نازلہ رکوع کے بعد پڑھا گیا پھر چھوڑ دیا گیا، اور یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا گیا، لیکن صبح کی نماز میں زیادہ پڑھا گیا پھر منسوخ ہو گیا۔

**تنبیہ:** غیر مقلدین وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے ہیں، اپنے اس موقف پر جب دلیل پیش کرتے ہیں تو قنوت نازلہ والی احادیث پیش کرتے ہیں، یا تو لفظ قنوت کو دیکھ کر انہوں نے یہی سمجھا کہ وتر کا قنوت اور قنوت نازلہ ایک چیز ہے، یعنی وہ قنوت وتر اور قنوت نازلہ میں فرق نہیں سمجھے کہ قنوت وتر ہمیشہ کیلئے جاری ہے اور قنوت نازلہ ایک ماہ یا کچھ دن زائد پڑھا گیا پھر چھوڑ دیا گیا، اے خفیو میری دعاء بھی آپ کیلئے ہے آپ بھی کوشش کریں کہ غیر مقلدین کے جال میں پھنسنے سے بچ جائیں۔

**شان نزول کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں:**

ایک قول کے مطابق اس آیت کریمہ کا شان نزول غزوہ احد کا واقعہ ہے، اور دوسرے قول کے مطابق بئر معونہ کا واقعہ ہے، اور جن احادیث میں بعض قبائل پر لعنت کا ذکر ہے ان میں بنی لحيان کا بھی ذکر آتا ہے، بنی لحيان بئر معونہ میں شریک نہیں تھے بلکہ سریہ رجب میں شریک تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سریہ رجب میں شرکاء کے خلاف دعاء کی گئی، بظاہر ان اقوال میں تعارض نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ سریہ رجب اور بئر معونہ بہت قریب قریب ہیں، اسی لئے صاحب مواہب لدنیہ نے بیان کیا ہے کہ سب خبریں (یعنی سریہ رجب اور بئر معونہ کی) رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہی وقت پہنچیں، اسی وجہ سے ایک دعاء میں مختلف طوائف و قبائل کو شامل کر لیا گیا، بخاری کی حدیث میں جو بنی لحيان کا ذکر ہے اس کی توجیہ بھی یہی ہے۔ (ماخوذ از مدارج النبوة حصہ دوم، ذکر بئر معونہ)

”و یحتمل ان یقال ان قصۃ رعل و ذکوان کان عقیب غزوۃ احد باربعۃ اشھر فی صفر سنۃ اربع من الهجرة فلعلھا نزلت فی جمیع ذلک و تاخیر نزول الآیۃ عن سبب نزولھا قلیلا غیر مستبعد“

غزوہ احد کے چارہ ماہ بعد صفر کے مہینہ میں ہجرت کے چوتھے سال رعل و ذکوان مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہوئے، اسلئے نبی کریم ﷺ نے احد میں بھی کافروں کے خلاف دعاء کی اور سریہ رجب میں شریک ہونے والے کافروں کے خلاف بھی دعاء کی اور بئر معونہ والے کافروں کے خلاف بھی دعاء کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، کسی آیت کریمہ کا کچھ واقعات کے بعد کچھ تاخیر سے نازل ہونا کوئی بعید نہیں۔ (مظہری)



## نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء سے کیوں منع کیا گیا؟

والحكمة في منعه ﷺ من الدعاء عليهم ولعنهم ان الله تعالى علم من حال بعض الكفار انه سيسلم فيتوب عليهم او سيولد من بعضهم ولد يكون مسلما بر اتقيا فلاجل هذا المعنى منعه الله تعالى من الدعاء عليهم لان دعوته ﷺ مجابة ولو دعاء عليهم بالهلاك هلكوا جميعا“ (خازن)

نبی کریم ﷺ کو کافروں کے خلاف دعاء کرنے سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو علم حاصل ہے کہ بعض کافر مسلمان ہو جائیں گے، کفر سے تائب ہو جائیں گے ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی، اور کئی کافروہ ہیں جو خود تو کافر ہی رہیں گے لیکن ان کی اولاد مسلمان ہو جائے گی، اور وہ لوگ نیک اور پرہیز گار ہو جائیں گے، اس وجہ سے آپ کو دعاء کرنے سے منع کیا کہ اگر آپ نے دعاء کر دی تو اسے قبول کیا جائے گا کافر سب ہلاک ہو جائیں گے، حالانکہ ان میں سے بعض نے اسلام قبول کرنا ہے، اور بعض کی اولاد نے اسلام قبول کرنا ہے۔

## سریہ رجب کے متعلق بخاری کی ایک روایت:

حدثني ابراهيم بن موسى اخبرنا هشام بن يوسف عن معمر عن الزهري عن عمرو بن ابي سفيان الثقفي عن ابي هريرة ؓ قال بعث النبي ﷺ سرية عينا و امر عليهم عاصم بن ثابت وهو جد عاصم بن عمر بن الخطاب فانطلقوا حتى اذا كان بين عسفان ومكة ذكروا الحي من هذيل يقال لهم بنو لحيان فتبعوهم بقريب من مائة رام فاقتصوا آثارهم حتى اتوا منزلا نزلوه فوجدوا فيه نوى تمر تزوده من المدينة فقالوا هذا تمر يثرب فتبعوا آثارهم حتى لحقوهم فلما انتهى عاصم واصحابه لجوا الى فد فدو جاء القوم فاحاطوا بهم فقالوا لكم العهد والميثاق ان نزلتم اليان لانقتل منكم رجلا فقال عاصم اما ان افلا نزل في ذمة كافر اللهم اخبر عنانيك فقاتلوهم حتى قتلوا عاصم في سبعة نفر بالنبل، وبقي خبيب وزيد ورجل آخر فاعطوهم العهد والميثاق فلما اعطوهم العهد والميثاق نزلوا اليهم فلما استمكنوا منهم حلوا و اتوا قسيهم فربطوهم بها فقال الرجل الثالث الذي معهم هذا اول الغدر فابي ان يصحبهم فجرروه وعالجوه على ان يصحبهم فلم يفعل فقتلوه وانطلقوا بخبيب وزيد حتى باعوهما بمكة فاشترى خبيبا بنو الحارث بن عامر بن نوفل وكان خبيب هو قتل الحارث يوم بدر فمكث عندهم اسيرا حتى اذا جمعوا قتله استعار موسى من بعض بنات الحارث ليستحدها فاعارته قالت ففعلت عن صبي لي فدرج اليه حتى اتاه فوضعه على فخذه



فلما رأته فزعت فزعة عرف ذاك منى وفي يده موسى فقال اتخشين ان اقتله ما كنت لافعل ذلك ان شاء الله وكانت تقول ما رأيت اسير اقط خيرا من خبيب لقد رأيت به يا كل من قطف عنب وما بمكة يومئذ ثمرة وانه لموثق في الحديد وما كان الارزق رزقه الله فخرج جوابه من الحرم ليقتلوه فقال دعوني اصلى ركعتين ثم انصرف اليهم فقال لولا ان تروا ان مابى جزع من الموت لزدت فكان اول من سن الركعتين عند القتل هو ثم قال اللهم احصهم عددا، ثم قال:

ما ابالى حين اقتل مسلما على اى شق كان لله مصرعى

وذلك فى ذات الاله وان يشا يبارك على اوصال شلو ممزوع

ثم قام اليه عقبة بن الحارث فقتله وبعث قريش الى عاصم ليثولوا بشى من جسده يعرفونه وكان عاصم قتل عظيما من عظمائهم يوم بدر فبعث الله عليه مثل الظلة من الدبر فحمته من رسلهم فلم يقدر وامنه على شىء

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ایک سریہ (چھوٹے لشکر) کو جاسوسی کیلئے بھیجا، اور ان پر عاصم بن ثابت کو امیر بنایا، یہ نانا تھے حضرت عاصم بن عمر بن الخطاب کے، یہ لوگ چلے یہاں تک کہ عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو ہذیل قبیلہ کو ان کی اطلاع مل گئی، ان کو بنی لحيان کہا جاتا تھا ان لوگوں نے صحابہ کرام کا ایک سو تیرا اندازوں سے خبر ملتے ہی پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے جہاں یہ اترے تھے، وہاں انہوں نے کھجوروں کی گھلیاں پائیں جو صحابہ کرام مدینہ طیبہ سے زاوراہ لے کر گئے تھے، انہوں نے کہا یہ تو یثرب کی کھجوریں ہیں، انہوں نے صحابہ کرام کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہوئے ان کو پالیا، عاصمؓ اور دوسرے صحابہ نے پہاڑ کی پناہ لی، لیکن انہوں نے صحابہ کرام کو گھیرے میں لے لیا، انہوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم ہمارے پاس آ جاؤ تو ہم تم میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کریں گے عاصم نے کہا میں کسی کافر کے وعدہ اور امان پر اعتبار کرتے ہو نیچے نہیں اترنا، پھر دعاء کی اے اللہ اپنے نبی کو ہماری خبر پہنچا دے، کفار نے ان حضرات سے لڑائی کی تو یہ مقابلہ کرتے ہوئے سات آدمی شہید ہو گئے، ایک حضرت عاصم اور چھ دوسرے (چونکہ کفار ایک سو تیرا انداز اور تین سو غیر مسلح تھے، لیکن مسلمان صرف دس تھے اور وہ بھی بہت معمولی اسلحہ رکھتے تھے) ان میں سے حضرت خبيب اور حضرت زید، اور ایک تیسرے شخص (جن کا نام ابن اسحاق کی روایت میں واضح طور پر عبد اللہ بن طارق ظفري آیا ہوا ہے) باقی رہ گئے، کفار نے ان کو امان دینے کا وعدہ کیا، وہ نیچے اتر آئے، کافر جب ان پر قادر ہو گئے تو ان کے تیر کے کمانوں کے وتر (چمڑے کے دھاگے) کھولے، اور ان کو باندھ لیا، تیسرے شخص (عبد اللہ بن طارق) نے کہا یہ پہلا غدر (دھوکہ) ہے، انہوں نے



کافروں کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا، کفار نے ان کو گھسیٹا اور بہت کوشش کی کہ یہ ہمارے ساتھ چلیں، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، کفار نے ان کو شہید کر دیا۔

حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو یہ قید کر کے مکہ میں لے گئے تاکہ ان کو بیچ دیں، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خرید لیا کیونکہ انہوں نے بدر میں حارث کو قتل کیا تھا، یہ ان کے پاس قیدی کی حیثیت سے رہے، جب ان سب نے حضرت خبیب کو شہید کرنے پر اتفاق کر لیا، تو انہوں نے حارث کی بیٹیوں میں سے کسی ایک بیٹی سے استرہ طلب کیا تاکہ زیر ناف بال دور کر لیں، اس نے ان کو عاریۃ استرہ دے دیا، وہ کہتی ہے میں اپنے ایک چھوٹے بچے سے غافل ہو گئی، وہ اچانک خبیب کے پاس چلا گیا خبیب نے اسے ران پر بٹھالیا، میں نے جب یہ منظر دیکھا تو میں بہت زیادہ ڈر گئی، خبیب نے میرے ڈر کو پہچان لیا اور اس کے ہاتھ میں استرہ بھی تھا، اس نے کہا کیا تو ڈر گئی کہ میں اس بچے کو قتل کر دوں گا، میں ان شاء اللہ ایسا کبھی نہیں کروں گا، وہ کہتی ہے میں نے خبیب سے اچھا کوئی قیدی نہیں دیکھا، وہ کہتی ہے میں نے انگور کا (کچھ) کھاتے ہوئے دیکھا، حالانکہ مکہ میں ان دنوں میں (انگور کا) پھل موجود نہیں تھا آپ لوہے کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، آپ کو کھانے کی کوئی خبر نہیں دی جا رہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو رزق عطاء فرما رہا تھا، جب کفار نے آپ کو حرم سے نکالا تاکہ ان کو قتل کر دیں، آپ نے کہا مجھے اجازت دو کہ میں دو رکعت نفل ادا کر لوں، دو رکعت ادا کر کے آپ خود ہی کافروں کے پاس پہنچ گئے، آپ نے کہا اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم کہو گے میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں اور زیادہ نماز ادا کرتا، سب سے پہلے قتل کے وقت دو رکعت نفل ادا کرنے کو آپ نے ہی جاری کیا جو آپ کی سنت ہے پھر آپ نے عرض کیا (میرے قتل میں شریک) سب کو تو برباد کر دے، پھر آپ نے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

(مجھے کوئی پرواہ نہیں جب میں حالت اسلام میں شہید کر دیا جاؤں، کہ اللہ کیلئے میں کس کروٹ پر گر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ اللہ کی رضا کی خاطر ہے، وہ چاہے، تو میرے اعضاء کو علیحدہ کر کے مجھے برکت عطاء کر دے)

پھر عقبہ بن حارث ان کی طرف کھڑا ہوا اور انہیں شہید کر دیا، قریش نے وہاں کچھ لوگوں کو بھیجا جہاں حضرت عاصم کو شہید کیا گیا تھا تاکہ ان کے جسم کا کچھ حصہ کاٹ کر لے آئیں، ہم اس کو پہنچائیں کہ یہ عاصم ہی ہے، کیونکہ انہوں نے بدر میں ان کے ایک بڑے لیڈر (عقبہ بن معیط کو نبی کریم ﷺ کے حکم سے) قتل کر دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک لشکر بھیج دیا جس نے ان پر سایہ کر دیا، اور اللہ کی بھیجی ہوئی مخلوق نے ان کی حفاظت کی، کفار ان کے کسی عضو کو کاٹنے پر قادر نہ ہو سکے۔



## وضاحت حدیث:

بخاری کے باب سے بعض حضرات غلطی میں پڑھے انہوں نے یہ سمجھا کہ بر معونہ اور سریہ رجب کا واقعہ ایک ہے۔

”ولیس كذلك لان غزوة الرجيع كانت سرية عاصم وخبيب في عشرة انفس وهي

مع عضل والقارة وبشر معونہ كانت سرية القراء السبعين وهي مع رعل وذكوان“

حالانکہ ایک واقعہ نہیں، کیونکہ سریہ رجب میں امیر عاصم ہیں، اور خبيب اس میں ہے، یہ دس افراد پر مشتمل قافلہ تھا، ان کا مقابلہ عضل اور قارہ گاؤں کے لوگوں سے ہوا، اگرچہ بخاری نے عضل اور قارہ کا ذکر نہیں کیا لیکن ابن اسحاق کی روایت میں یہ ذکر موجود ہے، اور بر معونہ کے سریہ میں ستہر قراء تھے جن کو شہید کیا گیا، اس میں امیر منذر بن عمرو تھے، اور نائب امیر خرام بن ملحان تھے، اس میں کفار قبائل اور ذکوان تھے۔

## غزوہ اور سریہ میں فرق:

دو طرح کا ان میں فرق جس جنگ میں نبی کریم ﷺ نے شرکت کی اسے غزوہ کہا جاتا ہے اور جس میں آپ نے شرکت نہیں کی اسے سریہ کہا جاتا ہے، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ بڑا لشکر جو کم از کم چار سو افراد پر مشتمل ہو اسے غزوہ کہا جاتا ہے، اور اس سے کم کو سریہ کہا جاتا ہے۔

✽ غزوہ بدر کی بحث میں ہے ”بعث عشرة عينا“ یہاں مذکور ہے ”بعث النبي ﷺ سرية عينا“ اور غزوہ کی روایت میں ہے ”بعثهم عيوننا الى مكة لياتوه بخبر قریش“ ان تمام الفاظ کا مجموعی مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سریہ (رجیع) میں دس صحابہ کرام کو جاسوسی کیلئے بھیجا کہ وہ قریش کی خبر لا کر دیں ”امر“ میں میم مشدد ہے، یعنی امیر بنایا ”اللهم اخبرنيك“ عاصم نے دعاء کی اے اللہ اپنے نبی کو ہماری خبر پہنچا دے۔

”وفی رواية الطيالسی عن ابراهيم بن سعد فاستجاب الله عاصم فاخبر رسولہ خبره اصحابه بذلك يوم اصابوا“

طیالسی نے ابراہیم بن سعد سے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے عاصم کی دعاء کو قبول کر لیا، اور اپنے رسول اللہ ﷺ کو ان کی خبر دے دی، اور آپ نے اپنے صحابہ کرام کو ان حضرات کی شہادت کی خبر دے دی ”من بعض بنات الحارث“ حدیث شریف میں حارث کی بعض بیٹیوں کا جو ذکر ہے، اس کا نام زینب بنت حارث ہے جو حضرت خبيب رضی اللہ عنہ کے قاتل عقبہ بن حارث کی بہن ہے۔

**مقام توجہ:** بخاری شریف کی اس روایت میں، اور ایک روایت میں جو ذکر ہے اس سے مراد مشہور



خبیب یعنی خبیب بن عدی ہیں، وہی بدر میں حاضر ہوئے، انہوں نے ہی حارث کو قتل کیا تھا، صرف حافظ دیا مٹی نے تمام معروف روایات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بدر میں شریک ہونے والے خبیب بن اساف ہیں، اسی نے حارث کو قتل کیا وہ خزرجی ہیں، اور خبیب بن عدی اوسی ہیں، راقم کے نزدیک بخاری وغیرہ کا قول ہی صحیح نظر آتا ہے، ”من قطف عنب“ بکسر القاف وهو العنقود“ قطف کے قاف کے نیچے زیر ہے، مراد کچھ اور خوشہ ہے

”لموثق بالحديد“ ای مقید بالحديد“ آپ کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا، ”دعونی اصلی“ بعض روایات ”اصل“ بغیر یاء کے ہے کہ مضارع جواب امر میں مجزوم ہے، جن روایات میں یاء ہے، ان میں ”لامکی“ محذوف ہے، اصل میں ”لاصلی“ ہے، آپ نے دو رکعت جو ادا کیں وہ مقام تنعیم میں ادا کیں۔  
”اللهم احصهم عددا“ دعاء علیہم بالاستئصال والهلاك بحيث لا یبقی منهم احد“

حضرت خبیبؓ نے جو قاتلین کے خلاف دعاء کی ”اللهم احصهم عددا“ اس کا لغوی معنی تو یہ ہے ”اے اللہ ان کی تعداد کو گن لے“ اور مرادی معنی یہ ہے اے اللہ ان کو تباہ و برباد کر دے تاکہ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے۔ ایک روایت میں ”واقتلهم بددا“ آیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے ان کو متفرق متفرق کر کے قتل کر دے“

”مثل الظلة“ بضم الظاء المعجمة وهي السحابة“ قوله من الدبر بفتح الدال المهملة  
وسكون الباء الواحدة وهي الزنا بیر، وقيل ذکور النحل“

ظلمة کا معنی ہے بادل اور ”دبر“ کا معنی ہے ”بھڑ“ یا شہد کی مذکر کھیاں“ مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی بھیجی ہو مخلوق بھڑوں اور شہد کی مکھیوں نے ان پر بادل کی طرح سایہ کر دیا، ”فحمته ای منعتہ“ اس مخلوق نے ان کے جسم کی حفاظت کی، کافروں کو ان کے جسم تک نہ پہنچے دیا، وہ ان کے جسم سے کسی ایک عضو کو بھی نہ کاٹ سکے۔

(عمدة القاری، جزء ۱ صفحہ نمبر ۱۶۸، ۱۶۹)





وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یَغْفِرُ لِمَنۢ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۢ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ  
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (آیہ نمبر ۱۲۹)

(۱) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، جسے چاہے بخشے اور جسے  
چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان۔ (کنز الایمان)

(۲) اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، بخشش کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب  
دیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ ”اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں“

”ای ملکا (بالضم) و ملکا (بالکسر) و خلقا و اقتدارا“ سب چیزوں پر اسے ہی بادشاہی حاصل ہے اور سب  
چیزیں اسی کی مملوک ہیں، اور سب چیزیں اسی کی مخلوق ہیں، اور سب چیزوں پر اسے ہی قدرت حاصل ہے کسی ایک  
کو اس میں دخل اندازی کی کوئی طاقت حاصل نہیں۔ ”فالامر کله یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید“ تمام امور اسی کے  
قبضہ قدرت میں ہیں، وہ جو چاہے وہی کرتا ہے، اور وہ جو ارادہ کرتا ہے وہی حکم دیتا ہے۔ (روح المعانی)

”ولم یقل (من) لان الامر الاشارة الى الحقائق والماہیات فدخل فیہ الكل“  
لفظ ”ما“ ذکر کیا ہے ”من“ نہیں ذکر کیا، اسی لئے کہ ”ما“ سے مراد تمام حقائق اور ماہیات ہیں کہ سب  
چیزیں خواہ ان کا تعلق حقائق سے ہو یا ماہیات سے ہو وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور اسی کی مملوک ہیں ”یَغْفِرُ  
لِمَنۢ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۢ یَّشَآءُ“ (بخشنش کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے)

اہل سنت و جماعت کا مذہب:

اس مسئلہ میں اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ سب کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے، اللہ  
تعالیٰ اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کرے، اسے یہ حق حاصل ہے۔

”انہ سبحانہ لہ ان یدخل الجنة بحکم الہیتہ جمیع الکفار والمردۃ، ولہ ان یدخل  
النار بحکم الہیتہ جمیع المقربین والصّٰدِیقِین“

کہ وہ پاک ذات اپنے معبود ہونے اور خالق و مالک ہونے کے لحاظ سے جو چاہے تصرف کرے، خواہ وہ تمام کفار اور



سرکشوں کو جنت میں داخل کر دے“ یہ اس کا حق ہے، خواہ وہ چاہے کہ اپنے معبود ہونے کے لحاظ سے مقربین و صدیقین کو جہنم میں داخل کر دے، اس پر کوئی شخص اعتراض نہیں کر سکتا۔

”فعل الله لا يوجب على الله شيئاً البتة فلا الطاعة توجب الثواب ولا المعصية توجب العقاب“  
اللہ تعالیٰ پر کوئی فعل واجب نہیں، نہ طاعت پر ثواب دینا اس پر واجب ہے اور نہ ہی معصیت پر عقاب دینا اس پر واجب ہے، بلکہ تمام امور اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

**اعتراض:** اليس انه ثبت انه لا يغفر لكفار ولا يعذب الملائكة ولا نباء“ کیا یہ بات یقینی طور پر ثابت نہیں کہ بیشک وہ کافروں کی بخشش نہیں فرمائے گا، اور فرشتوں اور انبیاء کرام کو عذاب نہیں دے گا، پھر اس کا مطلب کیا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو نیک لوگوں کو عذاب دے دے اور چاہے تو کفار کو بخش دے۔

**جواب:** قلنا مدلول الآية انه لو اراد الفعل ولا اعتراض عليه وهذا القدر لا يقتضي انه يفعل او لا يفعل“ آیت کریمہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے ”اگر وہ ارادہ کرتا تو ایسے کر لیتا“ کیونکہ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے، اپنی مخلوق اور مملوک میں جو چاہے تصرف کرے، اتنے مسئلہ میں کوئی اعتراض نہیں، اور نہ ہی اس سے یہ لازم آرہا ہے کہ وہ ایسے کرے گا یا نہیں کرے گا۔ اسی وجہ سے روح المعانی تفسیریوں کی گئی:

(يغفر لمن يشاء) ان يغفر له من المؤمنين فلا يعاقبه على ذنبه فضلامنه“ (ويعذب من يشاء) ان يعذبه عدلامنه“  
(روح المعانی)

”وہ مغفرت فرماتا ہے جس کے چاہے“ یعنی وہ چاہے تو مومنوں کی مغفرت فرما دے، انہیں عذاب نہ دے یہ اس کے فضل کا فیصلہ ہے، اور جسے چاہے عذاب دے یہ اس کے عدل کا فیصلہ ہوگا۔

**معتزلہ کا مذہب:** وہ کہتے ہیں یہ جائز ہی نہیں کہ بغیر توبہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کی مغفرت کرے۔

اہلسنت اور معتزلہ کا آسان لفظوں میں فرق:

اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا مغفرت فرمانا اور عذاب دینا کسی شرط سے مقید نہیں، اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے اس کیلئے کوئی مانع نہیں، معتزلہ کے نزدیک مغفرت مشروط ہے توبہ نہ کرنے سے، یعنی ان کے نزدیک جائز ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے کسی کی مغفرت کرے، لیکن اہل سنت کے نزدیک یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے اپنے فضل سے مغفرت فرما دے۔



**معتزلہ کی دلیل :** انہوں نے اپنے مذہب پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی ایک روایت پیش کی۔

”روی عن الحسن انه قال يغفر لمن يشاء بالتوبة ولا يشاء ان يغفر الا للتائبين ويعذب من يشاء ولا يشاء ان يعذب الا المستوجبين للعذاب“

حضرت حسن بصری کہتے ہیں ”وہ جس کی چاہے مغفرت کرے“ اس کا مطلب ہے توبہ کے ذریعے وہ مغفرت فرماتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ مغفرت فرمائے سوائے توبہ کرنے والوں کے، اور عذاب دیتا ہے جسے چاہے وہ نہیں چاہتا کہ عذاب دے سوائے مستحقین عذاب کے۔

وعن عطاء يغفر لمن يتوب اليه ويعذب من لقيه ظالما“ عطاء کہتے ہیں وہ مغفرت فرماتا ہے اس کی جو توبہ کرے، اور وہ عذاب دیتا ہے اسے جو اس سے حالت ظلم میں ملاقات کرے، یعنی گناہوں سے توبہ نہ کر کے گناہ ساتھ لے جائے اس حال میں رب تعالیٰ سے ملاقات کرے، گناہ بھی حقیقت میں ظلم ہی ہیں۔

**معتزلہ کی دوسری دلیل :**

ان المذنب اذا علم انه لا يعاقب على ذنبه كان ذلك تقريرا له واغراء للغير عليه وهذا ينافي حكمة ارسال الرسل عليهم السلام“  
وہ کہتے ہیں گناہگار کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اسے عذاب نہیں دیا جاتا تو وہ گناہ پر قائم رہے گا، اور گناہ کرنے پر دلیر ہوگا، اور غیر کو بھی گناہوں پر ابھارے گا، یہ رسولوں کے بھیجنے کی حکمت کے مخالف ہے۔

**اہل سنت و جماعت کی طرف سے رد:**

”فلاية ظاهرة في نفى الوجوب على الله تعالى وانه يجوز ان يغفر سبحانه للمذنب ويعذب المصلح“  
آیت کریمہ ظاہر طور پر واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں اس کیلئے جائز ہے کہ گناہگار کی مغفرت کر دے اور نیک کو عذاب دے، اگرچہ وہ کسی نیک کو عذاب دیتا نہیں، فقط اس کی قدرت و اختیار میں ہے، البتہ گناہگار کو اپنے فضل سے بخش دے تو اس کی مرضی کی بات ہے، کافر کی وہ اپنے وعدہ کے مطابق مغفرت فرماتا نہیں، اگرچہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ مغفرت کر دے، جو روایات انہوں نے پیش کی ہیں ان کی اسناد کا ہی پتہ نہیں، لہذا ان سے استدلال باطل ہے، ان کی عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اہلسنت و جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جس کی مغفرت چاہے اسے بخش دے اس کے ساتھ توبہ کی کوئی قید نہیں، اور کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میری گناہوں کو رب نے ضرور بخشا ہے،



جب کسی کو علم ہی نہیں کہ رب نے کس کی مغفرت کرنی ہے تو گناہوں پر قائم رہنا اور گناہوں پر دلیر ہونا یہ قول ہی باطل ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ و روح المعانی)

﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ ”اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے“

اس سے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی جہت احسان جہت گرفت پر غالب ہے۔ (از روح المعانی)



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۳۰)

(۱) اے ایمان والو! سود و سوداؤں نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے۔ (کنز الایمان)

(۲) اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود و سوداؤں، اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے پہلے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو مومنوں کو عطاء کیں، ارشاد فرمایا: ﴿وَإِذْ تَكُونُوا بَعَثَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ﴾ ”الآیہ“ اور ان کی امر دین میں اصلاح کا ذکر فرمایا، پھر جہاد کا ذکر کیا، اب امر، نبی ترغیب و ترہیب کا ذکر شروع کیا، اس آیت کریمہ میں نہیں کا ذکر ہے، جس میں سود کھانے سے منع کیا گیا، اس لحاظ پر صرف ترتیب کا تعلق ہے کلام میں استیناف پایا گیا ہے۔ جب یہ لحاظ کیا جائے کہ مشرکین نے جنگوں میں سودی مال خرچ کیا تو مومنوں کو اس لئے منع کیا گیا کہ کہیں ان کے دل میں بھی سودی مال کی لگن پیدا نہ ہو جائے۔

عین ممکن ہے کہ مومنوں کے دلوں میں یہ بات آگئی ہو کہ ہم بھی سودی مال جمع کرتے ہیں تاکہ مشرکین سے انتقام لے سکیں، اس لحاظ پر یہ آیت کریمہ ما قبل سے متعلق ہے، البتہ نزول کے لحاظ سے سودی ممانعت والی آیات میں سے سب سے پہلے یہ نازل ہوئی، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے سود کی حرمت والی کوئی آیت نازل ہو چکی ہو، اس کے بعد صحابہ کرام نے سود کا مال جمع کرنے کی تمنا کی ہو۔



## دونادون سود کی ممانعت کیوں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں سودی کاروبار کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کو سود پر مال دیا جاتا جب ادائیگی کا وقت آ جاتا لیکن وہ شخص قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا، تو مال دینے والا کہتا تم میرا سود بڑھا دو میں تمہاری ادائیگی کی مہلت بڑھا دیتا ہوں، ایک سودر ہم قرض لیا ہوا کبھی ہزار یا اس سے کم و بیش ہو جاتا، اس طرح ان کے ظالمانہ طریقہ سے ان کو منع کیا۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ ”اور ڈرو اللہ سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ”سود کھانے سے نہیں فرمائی“ اس میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا واجب ہے، اس لئے کہ فلاح (کامیابی) اس پر موقوف ہے، اگر کسی شخص نے سود کھایا اور اللہ سے نہ ڈرا تو اس سے فلاح زائل ہو جائے گی، یہ آیت کریمہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ سود حاصل کرنا حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، جو لوگ سود کو گناہ صغیرہ کہتے ہیں، ان کا قول سراسر باطل ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

اعلیٰ حضرت اور بیضاوی رحمہما اللہ:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ”لعلکم تفلحون“ کا ترجمہ کیا (اس امید پر کہ تمہیں فلاح ملے) علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ”لعلکم تفلحون“ کی تفسیر ”راجین الفلاح“ سے کی، اس سے شیخ زادہ نے یوں وضاحت کی، قولہ ”راجین الفلاح“ کہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ”لعلکم تفلحون“ کی تفسیر ”راجین الفلاح“ (فلاح کی امید کرتے ہوئے) سے کیوں کی؟

لما كانت كلمة لعل للترجي والاشفاق وهما لا يصلحان الا عند الجهل بالعاقبة

وذلك على الله محال جعل الترجي راجعاً الى العباد

اسلئے کہ ”فعل“ ترجی (امید) کیلئے استعمال ہوتا ہے، یا ڈرانے کیلئے، یہ دونوں معانی وہاں استعمال ہوتے ہیں جہاں کوئی شخص انجام سے بے خبر ہو، یہ معانی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے محال ہیں، اسلئے ترجی کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی، لہذا یہ معنی درست نہیں ہوگا کہ ”شاید تم کامیاب ہو جاؤ“ اسی طرح یہ معنی بھی درست نہیں کہ ”امید ہے تم کامیاب ہو جاؤ“ ہاں یہ معنی درست ہے ”اور تم ڈرو اللہ سے فلاح کی امید کرتے ہوئے۔“



## راقم اور روح المعانی:

(لعلکم تفلحون) ای لکی تفلحوا“ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ، البتہ روح المعانی میں بھی دوسرا معنی بیضاوی کے موافق ہی لیا گیا ہے ”راجین الفلاح“

**فائدہ:** ولا یخفی ان اقتران الرجاء بالتخویف یفیدان العبد ینبغی ان یکون بین الرجاء والخوف فہما جناحاه اللذان یطیر بہما الی حضائر القدس“ (روح المعانی)

ادھر فرمایا گیا ”واتقوا اللہ“ اور اللہ سے ڈرو“ اور ادھر فرمایا گیا ”لعلکم تفلحون“ کامیابی کی امید کرتے ہوئے، یعنی خوف اور رجاء دونوں چیزوں کو ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بتایا گیا کہ بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ امید اور خوف کے درمیان رہے، یہ دونوں بندے کو رب تعالیٰ کے حضور اڑا کر لے جاتے ہیں۔

**مقام توجہ:** آیہ کریمہ میں ربو کے ساتھ ”اضعافا مضاعفة“ (دونا دون) ذکر کیا یہ اس طرح کی

قید نہیں کہ درجہ شرط اسے حاصل ہو کہ دونا دون سود نہ لیا جائے تو حلال ہو جائے، نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں، بلکہ ”والربو محرم جمیع“ ربو کی تمام قسمیں حرام ہیں، سورۃ بقرہ میں ربو کو تفصیلی طور پر بیان کر دیا گیا ہے، وہاں مطلق ہے، یہاں جو ”اضعافا مضاعفة“ ذکر کیا گیا ہے ”فہذہ الحال لا مفہوم لہا ولیست قیدافی النہی“ یہ ان لوگوں کا ایک حال بیان کیا گیا ہے یہ نبی کی قید نہیں کہ دونا دون نہ ہو تو جائز، ایسا کہنا کلمہ کفر ہے۔ (البحر المحیط)

**خیال رہے:** کہ اس رواج کے مطابق سود کے طور پر جانور بھی لئے جاتے تھے، تم یہ قرض لے لو اور مجھے اتنے عرصہ میں یہ مال بھی واپس کرنا ہے اور ساتھ بطور ربو بنت لبون (دو سالہ اونٹنی) دے دینا میں اتنی مدت قرض بڑھا دیتا ہوں۔ (البحر المحیط)

اس وقت ربوان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا، ان کیلئے ربو کا چھوڑنا مشکل کام تھا، اسی وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا، اس وجہ سے کہ انسان کی عادت میں جو خلاف شرع کام آگئے ہوں ان کو تقویٰ کے ذریعے چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔ (البحر المحیط)

**تنبیہ:** ثم ذکر ان التقوی سبب لرجاء الفلاح وهو الفوز وامر بہا مطلقا لا مقیدا بفعل الربو“

پھر یہ ذکر فرمایا کہ تقویٰ ذریعہ ہے فلاح حاصل کرنے کیلئے، تقویٰ کا حکم مطلق ہے، یہ فعل ربو سے مقید نہیں، یعنی یہ مطلب نہیں کہ صرف سود حاصل کرنے کے ساتھ تقویٰ کا تعلق ہے، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ ہر معاملہ میں تقویٰ اختیار کرو،



اس ظالمانہ نظام (سودی نظام) کو اسلام نے ختم کر دیا، کیونکہ اس سے اگر ایک طبقہ میں تن آسان، حرام خوری، حرص و بخل کے جذبات پرورش پاتے ہیں تو قوم کے دوسرے طبقہ میں حسد و عناد اور منافرت کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ وہ امت جسے دنیا میں تبلیغ توحید و ہدایت کا ایک عظیم المرتبت مشن سرانجام دینا ہو اس میں ایسے عناصر کو کب برداشت کیا جاسکتا ہے جو ملی وحدت کو پارہ کر دیں۔  
(ضیاء القرآن)



وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۳۱)

- (۱) اور اس آگ سے بچو جو کافروں کیلئے تیار کر رکھی ہے۔ (کنز الایمان)
- (۲) اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿وَاتَّقُوا النَّارَ﴾ ”آگ سے بچو“

ای احتوزوا عن متابعۃ المرابین و تعاطی ما يتعاطونه من اكل الربو المفصی الی دخول النار“  
(آگ سے بچو) اس کا مطلب یہ ہے کہ سود خوروں کی تابعداری سے بچ جاؤ، سود کھانے والے کی طرح تم بھی نہ ہو جانا بلکہ سود حاصل کرنے سے بچ کر رہو، کیونکہ سود خوری انسان کو جہنم کی آگ کی طرف لے جاتی ہے۔  
﴿الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾ ”(بچو اس آگ سے) جو تیار کی گئی ہے کافروں کیلئے۔“

**اعتراض:** جہنم میں تو چور، زانی، ڈاکو دوسروں پر ناحق تہمت لگانے والے، قاتل وغیرہ بھی داخل کئے جائیں گے، تو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے“ کا کیا مطلب ہے؟

**جواب اول:** (اعدت للکافرین) وہی الطبقة التي اشتد حرها وتضاعف عذابها وهي

غير النار التي يدخلها عصاة امة محمد ﷺ فانها دون ذلك“

وہ آگ جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے وہ جہنم کا اور طبقہ ہے جس میں شدید گرمی ہوگی، اور اس میں سخت عذاب ہوگا، اور وہ آگ جس میں نبی کریم ﷺ کی امت کے نافرمان لوگ جائیں گے وہ اور طبقہ ہوگا، اس میں حرارت کم ہوگی بنسبت



کافروں کیلئے تیار کی ہوئی آگ سے، اور اس میں عذاب بھی بنسبت اس کے کم ہوگا۔

”وفیه اشارة الى ان اكلة الربو علی حفرة الکفرة“

اسی سے ضمنی طور پر یہ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ سود کھانے والے کافروں کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہیں۔

**جواب دوم:** اس میں ایک احتمال یہ بھی پایا گیا ہے کہ ”اعدت للکافرین“ صفت تخصیص کیلئے نہیں، بلکہ

”ان النار مطلقا مخلوقة للکافرین معدة لهم اولاد بالذات وغیرهم یدخلها علی وجه التبع“

وہ آگ مطلقاً کافروں کیلئے پیدا کی گئی ہے اور انہیں کیلئے ابتدائی طور بالذات تیار کی گئی ہے، اور دوسرے بالتبع اس میں داخل کئے جائیں گے، یعنی اگرچہ وہ آگ پیدا کئے جانے اور تیار کئے جانے کے لحاظ پر تو کافروں سے خاص ہے، لیکن اس آگ میں داخل کیا جانا کافروں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مؤمن گنہگار بھی اس میں داخل کئے جائیں گے۔

(روح المعانی)

اس آیت کریمہ میں وعید ہے یا رجاء:

کان ابو حنیفہ ص یقول هی اخوف آية فی القرآن حیث اوعده الله المؤمنین

(مدارک و خازن)

بالنار المعدة للکافرین ان لم یتقوه ویجتنبوا محارمه“

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ قرآن پاک میں بہت زیادہ خوف دلانے والی ہے

کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو اس آگ سے ڈرایا ہے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے کہ اگر وہ حرام

کاموں سے نہ بچے تو اس آگ میں داخل کئے جائیں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

وقال الواحدی فی هذه الآية تقوية لرجاء المؤمنین رحمة من الله لانه قال اعدت

(خازن)

للکافرین فجعلها معدة للکافرین دون المؤمنین“

واحدی نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید دلائی گئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

”أَعِدْتُ لِلْكَافِرِينَ“ کہ وہ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے نہ کہ مؤمنوں کیلئے، واحدی کے قول کے مطابق ہی زمخشری

معتزلی کا قول بھی ہے۔ معتزلہ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو بے خوف بنایا جائے تاکہ وہ بلا خطر عیاش ہو جائیں، گناہ

کرنے میں دلیر ہو جائیں، آج کل ہمارے ملک پاکستان میں سب معتزلہ کے نظریات کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش

کیا جا رہا، عذاب قبر کا انکار کیا جا رہا ہے یہ وہی مذہب ہے جو صدیوں پہلے معتزلہ نے پیش کیا۔

قال ابن عباس هذا تهديد للمؤمنین ان يستحلوا ما حرم الله علیهم

**تہدید شدید:**

(خازن)

من الربو وغیره مما اوجب الله فیہ النار“



حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، اس آیت کریمہ سے مؤمنوں کو بہت زیادہ ڈرایا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے ان کو حلال سمجھ کر اور جن چیزوں کو تم پر واجب کیا ہے ان سے انکار کر کے کہیں اس آگ کا اپنے آپ کو مستحق نہ بنادینا جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

**معز لہ کا مذہب باطل ہے:**

معز لہ کا مذہب یہ ہے کہ جنت اور جہنم ابھی پیدا نہیں کی گئیں، بلکہ قیامت کو پیدا کی جائیں گی، لیکن ان کا یہ مذہب باطل ہے "لأن قوله تعالى (اعدت) اخبار عن الماضي فلا بد ان يكون قد دخل ذلك الشيء في الوجود" اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی (أُعِدَّتْ) ماضی کا صیغہ ہے، قانون یہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جاسکے مجازی معنی مراد نہیں لیا جاتا، لہذا واضح ہوا کہ جہنم کی آگ پیدا کی جا چکی ہے۔

**سود کھانا کتنا عظیم جرم ہے:**

بعض حضرات نے کہا ہے کہ سود کھانے والوں کو کافروں کی آگ سے ڈرایا گیا ہے، نہ کہ گنہگاروں کو آگ سے ڈرایا گیا، خیال رہے کہ جہنم کی آگ کے ساتھ طبقے ہیں، ایک گنہگاروں کیلئے آگ کا طبقہ ہے، جس میں گرفت تو ہونی ہے لیکن ذلت حاصل نہیں ہونی، بلکہ گناہوں کی آلودگی سے پاک و صاف کرنا مقصود ہوگا جس طرح سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر کھوٹ سے پاک کیا جاتا ہے، اور ایک طبقہ آگ کا منافقوں کیلئے ہے جو جہنم کے تمام طبقات سے نیچے ہے، اس میں بہت شدید عذاب ہوگا، رب تعالیٰ نے اس ذکر یوں فرمایا ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الشَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ اور جہنم کی آگ کے پانچ طبقات کافروں کیلئے تیار کئے گئے ہیں جن میں کفار کو عذاب ہوگا اور ان کی اس میں ذلت بھی ہوگی، اسی لئے رب تعالیٰ نے اسے ﴿عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (رسوا کرنے والے عذاب) قرار دیا ہے۔ (ماخوذ از البحر المحیط)

چو پاک آفریت بھش باش پاک کہ تکت ناپاک رفتن بجاک

جب رب تعالیٰ نے تجھے پاک پیدا کیا تو ہوش میں پاک ہو کر رہ کہ شرم کی بات ہے خاک میں گناہوں سے ناپاک ہو کر جانا۔

پیالی بیفش از آئینہ کرد کہ صیقل نکیرد چو زنگار خورد

(دل کے) آئینہ کو لگا تا صاف کرتا رہ کہ جب زنگ نے اسے کھالیا تو اسے نکل (صاف) نہیں کیا جاسکے گا۔ (از روح البیان)

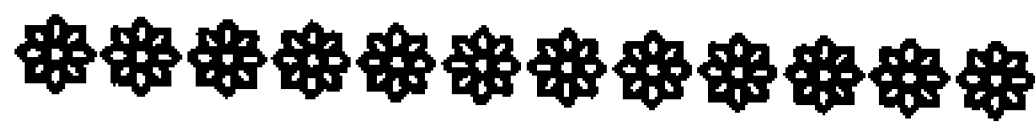
”جلاء القلب بما يحصل به ذكر الله وتلاوة القرآن والصلوة على النبي

﴿واخير الاذكار كلمة التوحيد وهي العروة الوثقى﴾



دل کی صفائی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور قرآن پاک کی تلاوت سے، اور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے سے اور کلمہ توحید سے جو کہ تمام ذکروں سے بہتر ذکر ہے اور مضبوطی ہے۔

ابراہیم خواص رحمہ اللہ نے بیان فرمایا دل کی دوا پانچ چیزوں میں ہے، قرآن پاک کو تدبر سے تلاوت کیا جائے، اور پیٹ کو خالی رکھے، یعنی کم کھائے، اور رات کو قیام کرے اور سحری کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف عاجزی سے رجوع کرے، اور نیک لوگوں کی مجلس اختیار کرے، ان عادات پر عمل کرنے سے انسان آگ سے بچ جائے گا، اور رب تعالیٰ کا اسے قرب حاصل ہوگا۔  
(ماخوذ از روح البیان)



وَاطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۳۲)

(۱) اور اللہ و رسول کے فرمانبردار ہو اس امید پر کہ تم رحم کئے جاؤ۔ (کنز الایمان)

(۲) اور اطاعت کرو اللہ اور (اسکے) رسول کی، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

اس سے پہلی آیہ کریمہ میں وعید کا ذکر کیا گیا، یعنی آگ سے ڈرایا گیا، اور اس آیہ کریمہ میں وعدہ کا ذکر ہے، یعنی رحم کرنے کا، البتہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

**معتزلہ:** معتزلہ کہتے ہیں کہ اس آیہ میں بھی وعید ہے، اس لئے کہ جب رحم کرنے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ کی اطاعت پر موقوف کیا گیا ہے تو اسی سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ آیہ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔

”من عصی الله ورسوله فی شی من الاشیاء انه لیس اهلا للرحمة وذلک یدل علی

قول اصحاب الوعد“

کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کسی چیز میں نافرمانی کی وہ رحمت کا مستحق نہیں، تو پتہ چلا کہ یہ

آیہ کریمہ وعید پر دلالت کر رہی ہے۔

اہل سنت و جماعت کا قول:

اس مسئلہ میں اہل سنت و جماعت کا موقف یہ ہے کہ ایک چیز کا ظاہر طور پر ثبوت جب ہو رہا ہے تو آیہ کریمہ



اسی پر محمول ہوگی کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس پر رحم کرنے کو مرتب کیا گیا لہذا یہ خوشخبت لوگوں کیلئے وعدہ ہے، یعنی ان پر رحم کئے جانے کی ان کیلئے بشارت ہے، اگرچہ ضمنی طور پر سمجھ آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمانوں کیلئے رحم کرنے کا وعدہ نہیں، لیکن فضل و کرم سے رحم کرنے کی نفی بھی نہیں کی گئی اسلئے اس آیت کریمہ کو مطلقاً وعید پر محمول کرنا درست نہیں، ضمنی طور پر وعید ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ بھی مطلق نہیں، کیونکہ رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم گنہگاروں پر رحم کر دے تو اس کی مرضی کی بات ہے۔ (کبیر بالوضاحت)

اطاعت کن چیزوں میں کی جائے:

اگرچہ بعض حضرات نے اس مقام پر اس آیت کریمہ کو خاص کیا ہے (أَطِيعُوا اللَّهَ) فی الفرائض (والرسول) فی السنن اللہ کی اطاعت کرو فرائض میں اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو سنتوں میں۔

”وقیل فی تحریم طرہو الرسول فیما بلغکم من التحریم“

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ رب تعالیٰ نے ربو کو حرام کیا اس کے حرام کرنے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ نے جو تم تک اس کی حرمت کو پہنچایا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔

”وقیل واطیعوا اللہ والرسول فیما یأمرکم بہ وینہا کم عنہ“

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ حکم مطلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جن جن چیزوں کا تمہیں حکم دیا ہے یا جن جن چیزوں سے تمہیں روکا ہے ان تمام اوامرو نوای میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ (البحر المحیط)

یہی مذہب جمہور کا ہے کہ خصوصاً مورد کا لحاظ نہیں کہ آیت کریمہ کس موقع پر نازل کی گئی بلکہ عموم الفاظ کا لحاظ کیا گیا ہے کہ یہ حکم عام ہے جمیع اوامرو نوای کو شامل ہے۔

**فائدہ جلیلہ:**

دوبارہ ”اطیعوا“ ذکر نہیں کیا گیا یعنی ”وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ“ نہیں کہا گیا بلکہ لفظ ”اللہ“ پر عطف کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے ”فان طاعة الرسول طاعة الله“ بیشک رسول اللہ ﷺ کی طاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہی طاعت ہے، رب تعالیٰ نے اس مسئلہ کو واضح طور پر ان الفاظ مبارکہ سے بیان کیا ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ جو شخص رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کا مطیع ہے۔ (البحر المحیط)

(لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ) ای لکی تنالوا رحمة الله اور اجین رحمته“ (روح المعانی)

یعنی جو دو احتمال ”لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ میں بیان کئے ہیں وہی دو یہاں بھی پائے گئے ہیں، ایک یہ کہ



”لعل“ کئی کے معنی میں ہو، اب معنی یہ ہو ”تا کہ تم پر رحم کیا جائے“

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”لعل“ ترجیحی کیلئے استعمال ہو نسبت ترجیحی کی بندوں کی طرف ہو، رب تعالیٰ کی طرف نہ ہو، اب آیہ کریمہ کا وہی ترجمہ ہوگا جو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی نے کیا (اور اللہ و رسول کے فرمانبردار ہو اس امید پر کہ تم رحم کئے جاؤ) یعنی نسبت امید اور توقع کی بندوں کی طرف کی جاسکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاسکتی ”لعل“ اور ”عسی“ کی نسبت (امید اور شاید) کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاسکتی بیضاوی کے حوالہ سے ایک آیہ سے پیچھے ”لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ“ میں دیکھئے۔

مودودی صاحب کا ترجمہ دونوں جگہ باطل ہے:

انہوں نے ”لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ“ کا ترجمہ کیا ”امید ہے کہ فلاح پاؤ گے“ یہاں امید کی نسبت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی جو یقیناً غلط ہے اور جمہور مفسرین کرام کی مخالفت ان کے ترجمہ سے لازم آرہی ہے۔ مودودی صاحب نے ”لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ“ کا ترجمہ کیا ہے ”توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا“ رب تعالیٰ کا علم تو قطعی اور یقینی ہے، اس کی طرف یہ نسبت کرنا ”امید ہے“ توقع ہے، کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

”لعل وعسی فی امثال ذلک عزة التوصل الی ما جعل خبر الہ (بیضاوی) لما کانت

لعل للترجی والاشفاق وهما لا یصلحان الا عند الجہل بالعاقبة وذلک علی اللہ

(شیخ زادہ)

محال جعل الترجی راجعاً الی العباد“

اس قسم کے مقامات میں لعل اور عسی کا استعمال اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو خبر بتائی گئی ہے اس کا بندوں تک پہنچنا غالب ہے، وجہ اصل میں یہ ہے کہ ”لعل“ ترجیحی کا معنی دیتا ہے جس میں امید پائی جاتی ہے، اور عسی میں بھی رجاء پائی جاتی ہے، اسی طرح ”لعل“ کبھی ڈرانے کے معنی بھی استعمال ہوتا ہے، یہ دونوں معانی اس مقام میں نہیں لئے جاسکتے کیونکہ یہ وہاں مراد لئے جاسکتے ہیں جہاں انجام سے بے خبری ہو، رب تعالیٰ انجام سے بے خبر نہیں، ہاں البتہ امید کی نسبت بندوں کی طرف کی جاسکتی ہے۔





وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ  
لِلْمُتَّقِينَ ۝

(آیہ نمبر ۱۳۳)

(۱) اور دوڑو اپنے رب کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی میں سب آسمان وزمین  
آجائیں پر ہیزگاروں کیلئے تیار کر رکھی ہے۔  
(کنز الایمان)

(۲) اور جلدی کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور جنت کی طرف اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین  
کی (چوڑائی) کی طرح ہے، وہ تیار کی گئی ہے پر ہیزگاروں کیلئے۔  
(نجوم الفرقان)

راقم نے ترجمہ سورۃ حدید کی آیۃ کے مطابق کیا ہے۔

”سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“ (وَسَارِعُوا إِلَىٰ  
مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ) یعنی وبادروا واسبقوا الی ما یوجب المغفرة من ربکم وہی الاعمال  
الصالحۃ المأمور بفعلها“

”جلدی کرو اپنے رب کی بخشش کی طرف“ یعنی جلدی کرو، سبقت لے جاؤ ایسے اسباب کی طرف  
جو تمہارے رب کی طرف سے بخشش کا ذریعہ بنیں، وہ نیک اعمال ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

اسباب مغفرت میں چند اقوال:

(۱) قال ابن عباس هو الاسلام “حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں بخشش کا سبب اسلام ہے ”مغفرة“ نکرہ  
ذکر کیا گیا، مراد اس سے مغفرت عظیمہ ہے جو عظمت میں انتہاء درجہ تک پہنچی ہوئی ہے، یہ وہ مغفرت ہے جو  
اسلام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

(۲) روی عن علی بن ابی طالب انہ قال هو اداء الفرائض “حضرت علی ؓ فرماتے ہیں بخشش کا مطلب سب  
فرائض کو ادا کرنا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ لفظ مطلق ذکر کیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ کل فرائض کا ادا کرنا  
مراد ہو۔

(۳) والثالث انه الاخلاص وهو قول عثمان بن عفانص “حضرت عثمان ؓ فرماتے ہیں کہ اس سے  
مراد اخلاص ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ جمیع عبادات میں اخلاص معتبر ہے، لہذا اخلاص ذریعہ بخشش ہے اللہ  
تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر یہ



کہ اللہ کی بندگی کریں خالص اسی کیلئے دین کریں۔

(۴) الرابع قال ابو العالیہ هو الهجرة "چوتھا قول ابو العالیہ کا ہے کہ بخشش کا سبب ہجرت ہے۔

(۵) والخامس انه الجهاد هو قول الضحاک ومحمد بن اسحاق "پانچواں قول ضحاک اور محمد بن

اسحاق رحمہما اللہ کا ہے مغفرت کا سبب جہاد ہے، اس لئے کہ یہاں آگے پیچھے جہاد کا ہی ذکر ہے، لہذا

مغفرت کا سبب جہاد کو ہی قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۶) السادس قال سعید بن جبیر انها التکبیر الاولی "چھٹا قول حضرت سعید بن جبیر رحمہما اللہ کا ہے کہ

بیشک اس سے مراد نماز کی پہلی تکبیر ہے، جو بخشش کا ذریعہ ہے۔

(۷) السابع قال عثمان انها الصلوات الخمس "ساتواں قول بھی حضرت عثمان رحمہما اللہ کا ہے اس سے مراد

پانچ نمازیں ہیں، اس لئے کہ بخشش کا سبب پانچ نمازوں کا ادا کرنا ہے۔

(۸) والثامن قال عکرمہ انها جميع الطاعات لان اللفظ عام فيتناول الكل "آٹھواں قول حضرت

عکرمہ رحمہما اللہ کا ہے کہ تمام طاعات مراد ہیں کیونکہ لفظ عام ہے جو جمیع طاعات کو شامل ہے۔

(۹) التاسع قال الاصم سارعوا ای بادروا الی التوبة من الربوا والذنوب "نواں قول اصم کا ہے کہ

اس سے مراد یہ ہے کہ تم سود اور گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف جلدی کرو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے سود کے استعمال کرنے سے منع کیا، پھر ارشاد فرمایا ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ تو اس سے یہ واضح ہوا کہ پہلے جس نبی (ممانعت) کا ذکر ہے اسی کو جلدی چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

### تمام اقوال کا جامع قول:

تمام اقوال کا جامع قول وہی ہے جو خازن سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد "وہی الاعمال الصالحة

المأمور بفعلها" تمام نیک اعمال ہیں جن پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی وجہ سے علامہ رازی رحمہ اللہ نے تمام

اقوال ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا۔

"والاولی ما تقدم من وجوب حمله علی اداء الواجبات والتوبة عن جميع

المحظورات لان اللفظ عام فلا وجه فی تخصیصه"

زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس کو عام رکھا جائے معنی اس کا یہ ہو کہ واجبات کے ادا کرنے اور تمام ممنوعات



سے توبہ کرنے کی طرف جلدی کرو اسلئے کہ یہ اسباب بخشش ہیں، چونکہ لفظ عام ہے اسلئے کسی معنی کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

### ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

”اور جلدی کرو جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔“  
جلا لیں میں یوں تفسیر بیان کی گئی:

(وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ) ای کعرضہما لو وصلت احداہما بالاخری، والعرض السعة “اور (جلدی کرو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔“

یعنی اگر تمام آسمانوں اور زمینوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھا جائے تو ان کی وسعت کی طرح جنت کی وسعت ہے، یعنی مقصود ہی وسعت کو بیان کرنا ہے، مقدار بیان کرنا کہ جنت کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی جتنی ہے، یہ مقصود ہی نہیں۔ جلا لیں کے تفسیری الفاظ ”کعرضہا“ پر صاوی میں یوں تحریر کیا گیا ہے ”اشار بذاک الی ان الکلام حذف مضاف واداة التشبیہ“ کہ مفسر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ”کعرضہا“ کے الفاظ نکال کر اس طرف اشارہ کیا کہ اس کلام میں مضاف حذف ہے اور حرف تشبیہ بھی حذف ہے۔ صاوی میں ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک حقیقی کہ مراد ہی ہو جو جلا لیں میں بیان کی گئی ہے کہ تمام آسمانوں اور تمام زمینوں کی چوڑائی کی علیحدہ علیحدہ کر کے جوڑا جائے پھر بھی جنت کی چوڑائی ان سے زیادہ ہوگی، اور دوسرا معنی مجازی مراد لیا جائے کہ جنت کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت سے بھی زیادہ ہے، راقم کے نزدیک یہی مجازی معنی لینا عوام کو سمجھانے کیلئے بہتر ہے۔

### مختصر مطلب:

(وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ) ای کعرضہا صفة لجنة وتخصیص العرض بالذکر للمبالغة فی وصفها بالسعة والبسطة علی طريقة التمثیل فان العرض فی العادة ادنی من طول جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، یہاں چوڑائی کا ذکر کیا گیا ہے جس میں جنت کی وسعت اور بساطت کو کامل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، اور تمثیل کے طور پر کہ آسمانوں اور زمین کی وسعت کی طرح جنت بھی وسیع اور بسیط (کشادہ) ہے عرض عام طور پر طول سے چھوٹی ہوتی ہے،



(تفسیر ابی اسود)

جب عرض کی اتنی بڑی وسعت ہے تو طول یقیناً بہت ہی وسیع ہوگا۔

روی ان هرقل ارسل الى النبي ﷺ انك كتبت تدعوني الى جنة عرضها السموات والارض فاين النار؟ فقال رسول الله ﷺ سبحان الله فاين الليل اذا جاء النهار

روایت بیان کی گئی کہ ہرقل نے اپنا ایک قاصد نبی کریم ﷺ کی طرف بھیجا کہ تم نے اپنے خط میں مجھے جنت کی دعوت دی ہے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے (جب جنت اتنی وسیع ہے) تو آگ کہاں ہوگی؟ (یعنی اس کیلئے تو کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہے گی) تو نبی کریم ﷺ نے (کیسا ہی حکیمانہ) جواب دیا۔

سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ جواب آپ کی خصوصی صفت ”جوامع الکلم“ کے مطابق ہے کہ مختصر الفاظ کثیر معانی پر مشتمل ہیں۔

”قيل معناه والله اعلم بذلك انه اذا دار الفلك حصل النهار في جانب والليل في ضد ذلك الجانب فكذلك الجنة في جهة العلو والنار في جهة اسفل“

نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب آسمان پھرتا ہے تو ایک جانب دن ہوتا ہے اور دوسری جانب رات ہوتی ہے، اسی طرح جنت اوپر کی جانب ہے اور جہنم نیچے کی جانب ہے۔

وروي طارق ابن شهاب ان ناسا من اليهود سألوا عمر بن الخطاب رضي الله عنه وعنده اصحابه فقالوا اوارايتكم قولكم ”وَجَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ“ فاين النار؟ فقال عمر بن الخطاب ارايتم اذا جاء الليل فاين يكون النهار واذا جاء النهار فاين يكون الليل فقالوا ان لمثلها في التوراة

طارق ابن شہاب سے روایت ذکر کی گئی کہ یہود کے چند لوگ حضرت عمرؓ سے آکر سوال کرنے لگے جب کہ آپ کے اصحاب بھی آپ کے پاس موجود تھے، انہوں نے کہا تمہاری اس تمہارے (قرآن کے) قول کے مطابق کیا رائے ہے جو یہ کہا گیا ”وَجَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ“ جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، جب جنت کی اتنی وسعت ہے تو آگ کہاں ہوتا ہے؟ اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے تو وہ کہنے لگے ہاں تو رات میں بھی اسی طرح ہے۔

”ومعناه حيث يشاء الله“ مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا وہیں آگ کو رکھ دیا اور جہاں چاہا وہاں جنت کو رکھ دیا، اس کی قدرت میں بڑی وسعت ہے، جس وسعت کی کوئی حد نہیں۔ (خازن)

اعتراض: رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾ اور آسمانوں میں تمہارا رزق



ہے اور جس چیز کا تمہیں وہ دیا گیا ہے ”واراد بالذی وعدنا به الجنة“ جس چیز کا ہمیں وعدہ دیا گیا ہے وہ جنت ہے، اب آیہ کریمہ کا مفہوم یہ ہو گیا اور آسمانوں میں تمہارا رزق ہے اور آسمانوں میں جنت ہے، جب جنت آسمانوں میں ہے تو وہ آسمانوں میں سا گئی، آسمان اس پر حاوی ہو گئے، تمام آسمانوں سے جنت کی وسعت کیسے ثابت ہوگی؟

**جواب:** المراد من قولنا انها في السموات انها فوق السماوات وتحت العرش

ہم نے جو یہ بیان کیا ہے ”انها في السماوات“ یہاں اصل میں ”فی“ بمعنی ”علی“ کے ہے جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا صَلْبِنُكُمْ فِي جُدُوعِ النَّخْلِ﴾ میں ”فی“ بمعنی ”علی“ کے ہے، فرعون نے جادو گروں کو کہا میں تمہیں ضرور بر ضرور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھا دوں گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھجور کے تنوں میں سولی چڑھا دوں گا لہذا ہم جنت کے متعلق جو یہ کہتے ہیں ”انها في السماوات“ اس کا مطلب یہ ہے ”انها فوق السماوات وتحت العرش“ کہ بیشک جنت آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے، رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”وما توعدون“ کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس جنت کا تمہیں وعدہ دلایا جا رہا ہے وہ آسمانوں کے اوپر ہے۔ (خازن بالوضاحت)

فان في حديث ابي ذر عن النبي ﷺ ما السماوات السبع والارضون السبع في الكرسي الا كدراهم القيت في فلاة من الارض وما الكرسي في العرش الا حلقة القيت في فلاة من الارض ”فهذه مخلوقات اعظم بكثير جدا من السماوات والارض وقدرة الله اعظم من ذلك كله“

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا سات آسمان او سات زمینیں کرسی میں ہوں تو ایسے ہوں گی جیسے کہ درہم جنگل میں ڈال دیئے جائیں، اور کرسی عرش میں ہو تو ایسے ہوگی جیسے لوہے کی انگوٹھی کو جنگل میں ڈال دیا جائے، یہ مخلوقات آسمانوں اور زمینوں سے بہت عظیم ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے زیادہ عظیم ہے۔ (منقول از قرطبی)

واخرج مسلم وابن المنذر والحاكم وصححه عن انس ان رسول الله ﷺ قال يوم بدر قوموا الى جنة عرضها السموات والارض فقال عمير بن الحمام الانصاري يا رسول الله جنة عرضها السموات والارض قال نعم قال بنخ بنخ لا والله يا رسول الله لا بد ان اكون من اهلها قال فانك من اهلها فاخرج تمرات من قرنه فجعل ياكل منهن ثم قال لئن حييت حتى اكل تمراتي هذه انها حياة طويلة فرمى بما كان معه من التمر ثم قاتلهم حتى قتل

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا ”کھڑے ہو جاؤ اس جنت کی طرف



جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی (چوڑائی) کی طرح ہے، عمیر بن الحمام انصاری نے فرمایا یا رسول اللہ (کیا) جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں وہ صحابی کہنے لگے بڑی خوشی کا مقام ہے، بڑی خوشی کا مقام ہے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی یا رسول اللہ میں ضرور اس کا اہل بنوں کا حضور ﷺ نے فرمایا بیشک تم اس کے اہل ہو، انہوں نے اپنے توشہ دان سے کچھ کھجوریں نکالیں، ان کو کھانا شروع کیا، پھر کہنے لگے اگر میں زندہ رہا تو پھر کھجوریں کھالوں گا (کیونکہ یہاں سے زندہ رہنے کے بعد) بیشک زندگی طویل ہوگی، ان کے پاس جو کھجوریں تھیں وہ انہوں نے پھینک دیں، پھر کفار سے قتال کیا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے، وہ صحابی کا قسم اٹھا کر کہنا کہ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی میں اس کا ضرور اہل بنوں گا، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ ہاں تم اس کے اہل ہو ”رب تعالیٰ نے اسے سچا کر دکھایا، کہ وہ صحابی بارشاد نبوی شہید کر جنت کے اہل بنے۔

(منقول از درمنشور)

❁ وفي الصحيح ان ادنى اهل الجنة منزلة من يتمنى ويتمنى حتى اذا انقطعت به الاماني  
سج (بخاری) میں ہے کہ بیشک اہل جنت کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہوگا کہ ان کو تمنا حاصل ہوگی، اور تمنا اسی وقت  
حاصل ہوگی جب اپنی آرزوں اور امیدوں کو ختم کر لیں۔  
(منقول از قرطبی)

﴿أَعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ ”وہ تیار کی گئی پرہیزگاروں کیلئے۔“

آیہ کریمہ میں لفظ ”أَعِدَّتْ“ ماضی کا صیغہ ہے، جس کو اپنے حقیقی معنی اور حقیقی زمانہ سے بلاوجہ نہیں پھیرا جاسکتا ”ودلت الآیة علی ان الجنة والنار مخلوقتان“ اور آیہ کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بیشک جنت اور نار (جہنم) پیدا کی جا چکی ہیں، معتزلہ کا یہ کہنا کہ ابھی پیدا نہیں کی گئیں بلکہ یوم آخرت (قیامت کے دن) پیدا کی جائیں گی، ان کا یہ قول باطل ہے۔ متقی سے مراد یہ ہے کہ وہ شرک سے بچے، جیسے سورۃ حدید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ﴾

”اور جنت (کی طرف سبقت کرو) جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، وہ تیار کی

گئی ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔“

یا متقی کا معنی یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچنے والے ہیں، جب یہ معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بغیر سزا کے جنت میں چلے جائیں گے، اور اگر پہلا معنی شرک سے بچنے والا لیا جائے کہ وہ شرک سے تو بچتے ہیں لیکن گناہوں سے نہیں بچتے تو پھر مطلب یہ ہوگا ”فہی لہم ایضاً فی العاقبة“ کہ ان کو بھی آخر کار جنت حاصل ہوگی، یعنی اگر گناہوں کی سزا ان کو حاصل ہونی ہوئی تو سزا کے بعد گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (مدارک)



الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ  
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

(آیہ نمبر ۱۳۴)

(۱) وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور رنج میں اور غصہ پینے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور نیک لوگ اللہ کے محبوب ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) (پرہیزگار) وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں، اور وہ روکنے والے ہیں غصہ کو، اور درگزر کرنے والے ہیں لوگوں سے اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ ”وہ جو خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں۔“

واقم نے ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ سے لیا ہے ﴿فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ ای فی اليسر والعسر ”آسانی میں اور مشکل میں، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے روح المعانی کے ہی ان الفاظ سے لیا ”وقيل في حال السرور والاغتمام“ اور بیان کیا گیا کہ وہ خوشی کی حالت میں اور غم کی حالت میں خرچ کرتے ہیں، طلباء کرام کے فائدہ کیلئے دونوں معانی پیش کر دئے گئے ”وقيل في الحياة وبعد الموت بأن يوصى“ اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اور موت کے بعد خرچ کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔

”وقيل فيما يسر كالنفقة على الولد والقريب وفيما يضر كالنفقة على الاعداء“

اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں پر خرچ کرتے ہیں جن پر خرچ کرنا انہیں خوش لگتا ہے، جیسے اولاد پر اور قریبوں رشتہ داروں پر خرچ کرتے ہیں، اور خرچ کرتے ہیں ان پر جن پر خرچ کرنے سے ان کو ضرر محسوس ہوتا ہے جیسا کہ دشمنوں پر ان کا خرچ کرنا۔ (روح المعانی)

مشکل اور آسانی میں خرچ کرنے کا اور مطلب یہ ہے:

”لا يتركون الاتفاق في كلتا الحالتين في الغنى والفقر والرخاء والشدة ولا في حال فرح وسرور ولا في حال محنة ولا بلاء سواء كان الواحد منهم في عرس او حبس فانهم لا يدعون الاحسان الى الناس“

کہ وہ حالت غناء اور فقر (امیر و غریب ہونے کی حالت) میں خرچ کرتے ہیں، کسی حال میں وہ خرچ کرنا نہیں چھوڑتے رزق کی کشادگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں، اور خوشی اور فرحت کے حال میں اور محنت اور مصیبت کے حال



میں خرچ کرنا چھوڑتے، پرہیزگاروں میں سے کوئی ایک خواہ شادی میں ہو یا قید میں وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں، اور مال خرچ کرنے پر لوگوں کے سامنے اپنے احسان کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے، رب تعالیٰ نے جب یہ ذکر فرمایا ”أَعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ“ جنت پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی، تو یہاں جنت میں جانے کا ایک سبب سخاوت کو بیان کیا لیکن سخاوت لوگوں پر شاق ہوتی ہے، اسلئے کہ انسان اپنے آپ کو حاکم جہنم سمجھتے ہوئے جب فقیروں کی غمخواری کرتے ہوئے ان پر خرچ کرتا ہے، اور دشمن کے ساتھ جہاد کرنے میں جب مال خرچ کرتا ہے تو اسے بہت مشکل نظر آتا ہے۔ (غازن)

### شان سخاوت اور مذمت بخیل پر احادیث مبارکہ:

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال السخی قریب من اللہ قریب من الناس قریب من الجنة بعيد من النار والبخیل بعيد من اللہ بعيد من الناس بعيد من الجنة قریب من النار ولجاهل سخی احب الی اللہ تعالیٰ من عابد بخیل“ (اخرجه الترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے اور لوگوں کے قریب ہے اور جنت کے قریب ہے، اور آگ سے دور ہے، اور بخیل (کنجوس) اللہ سے دور ہے اور لوگوں سے دور ہے، اور آگ کے قریب ہے، جاہل نخی اللہ تعالیٰ کی بنسبت کنجوس عابد کے زیادہ محبوب ہے۔ (منقول از غازن)

عن ابی ہریرۃ انه سمع رسول اللہ ﷺ يقول مثل البخیل والمنفق کمثل رجلین علیہما جنتان من حديد من لیدیہما الی ترافیہما فاما المنفق فلا ینفق الا سبغت او وفئت علی جلدہ حتی تخفی ثیابہ وتعفو الرہ واما البخیل فلا یرید ان ینفق شیئا الا لوقت کل حلقة مکانہا فهو یوسعها فلا تتسع الجنة الدرع من الحديد“ (بخاری ومسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسے ہی جیسے دو شخص ہوں جنہوں نے لوہے کی زرہ پہن رکھی ہوں، وہ زرہ ان کے پستانوں (سینہ کے وسط) سے سینہ کے اوپر گلے کے قریب ہڈیوں تک ہوں، خرچ کرنے والا نہیں خرچ کرتا مگر یہ کہ اس کے چڑے پر وہ زرہ مکمل ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے کپڑوں کو چھپا لیتی ہے، اور اس کا اثر (اس کے قدموں کے نشانوں کو) مٹا دیتی ہے، اور کنجوس خرچ کرنے کا ارادہ نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ زرہ اپنی جگہ سے چٹ جاتی ہے، وہ اسے وسیع کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ زرہ لوہے کی ہوتی ہے اس لئے اس کے وسیع کرنے سے وہ وسیع نہیں ہوتی۔ (منقول از غازن)

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما من یوم یصبح العباد فیہ الا ملکان ینزلا فیقول



احدهما اللهم اعط منفقا خلفا ويقول الآخر اللهم اعط ممسكا خلفا“ (بخاری و مسلم)  
حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندوں پر کوئی صبح نہیں آتی مگر یہ کہ اس میں دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے اے اللہ اپنی راہ میں خرچ کرنے والے کو اس کے بدلے اور عطاء کر، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ مال روک کر رکھنے والے (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے) کے مال کو تباہ و برباد کر۔ (منقول از خازن)

و عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال قال اللہ تبارک و تعالیٰ انفق ینفق علیک“  
حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم مال (میری راہ میں) خرچ کرو، تم پر مال خرچ کیا جائے گا۔ (منقول از خازن)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اللہ اسے اور مال عطاء کرتا ہے۔

رواہ البیہقی عن جابر و الطبرانی عن عائشۃ و عن ابن عباس مرفوعا السخاء خلق اللہ الاعظم“  
بیہقی نے حضرت جابرؓ سے اور طبرانی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث بیان کی، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سخاوت کو عظیم مرتبہ عطاء کر کے پیدا کیا۔ (منقول از مظہری)

وقال رسول اللہ ﷺ السخاء شجرة من اشجار الجنة اغصانها متدلّيات فی الدنیا فمن اخذ بغصن منها فاداة ذلک الغصن الی الجنة و البخل شجرة من الشجار النار اغصانها متدلّيات فی الدنیا فمن اخذ بغصن من اغصانها ذلک الغصن الی النار“ رواہ الدارقطنی و البیہقی عن علیؓ و ابونعیم فی الحلیۃ عن جابرؓ و الخطیب عن ابی سعیدؓ و ابن عساکر عن انسؓ و الدیلمی فی مسند الفردوس عن معاویہؓ“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جس نے ان ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی کو پکڑا تو وہ شاخ اسے جنت میں لے جائے گی، اور بخل (کنجوسی) جہنم کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، اس کی شاخیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، جس نے اس کی شاخوں میں سے ایک شاخ کو پکڑا تو وہ اسے جہنم میں لے جائے گی۔ (یہ روایت دارقطنی اور بیہقی نے حضرت علیؓ سے بیان کی، ابن عدی اور بیہقی کی ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے، اور ابونعیم نے حلیہ میں حضرت جابرؓ سے اور خطیب نے حضرت سعیدؓ سے اور ابن عساکر نے حضرت انسؓ سے اور دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت معاویہؓ سے بیان کی۔

(منقول از مظہری)



عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ سبق درهم مائۃ الف، فقال رجل و کیف ذالک یا رسول اللہ فقال رجل لہ مال کثیر اخل من عرضہ مائۃ درهم تصدق بہا ورجل لیس لہ الا درہمان فاخذ احدهما فتصدق بہ (رواہ النسائی وصححہ وابن خزیمۃ والحاکم)  
حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم ایک لاکھ درہموں پر سبقت لے جاتا ہے، ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا ایک شخص کے پاس بہت زیادہ مال ہوتا ہے وہ اس مال سے ایک لاکھ روپے خرچ کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ صدقہ کرتا ہے اور ایک شخص کے پاس صرف دو درہم ہوتے ہیں وہ ان میں سے ایک صدقہ کرتا ہے۔ (منقول از مظہری)

حدیث پاک سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اصل میں ثواب کا دار و مدار نیت پر ہے اور مشکل میں خرچ کرنے پر ہے یقینی طور پر دو درہموں میں سے ایک خرچ کر دینا خلوص نیت پر مبنی ہے، اور دینے والے نے کتنی مشکل سے وہ ایک درہم خرچ کیا کہ خود حاجت مند تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اس نے اپنے حاجت کی پرواہ نہ کی، یہی وجہ ہے کہ کثیر مال والے کے ایک لاکھ درہم پر وہ غالب آ گیا۔ مقصود یہ ہے کہ خلوص نیت سے رب تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے، کثیر مال والا کثیر خرچ کرے، اور قلیل مال والا قلیل مال خرچ کرے۔

روى عن عائشة رضی اللہ عنہا انہا تصدقت بحبة عنب "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ انگور کا ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا۔

وعن بعض السلف انه تصدق ببصلة "بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک پیاز صدقہ کیا۔

وفي الخبر "اتقوا النار ولو بشق تمرة" حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ سے بچ جاؤ خواہ کھجور کے ایک حصہ سے۔

ردو السائل ولو بظلف محرق "سائل کو لوٹاؤ خواہ (بکری کے) پاؤں کی جلی ہوئی ہڈی سے۔ مطلب واضح ہے کہ سائل کو کوئی نہ کوئی چیز دے کر لوٹاؤ، خواہ وہ تھوڑی سے تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔

"اور وہ روکنے والے ہیں غصہ کو۔"

﴿وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ﴾

کظم (ض) کظم الباب، دروازہ بند کیا "کظم النہر" نہر کو روکا، کظم القریۃ، مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھا "کظم



البعير "اونٹ جگالی کرنے سے رک گیا" کظم فلان علی جرته "فلاں کے پیٹ میں بات نہیں بچتی" کظم غیظہ "فلاں نے اپنے غصہ کو پی لیا۔ (النجد)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے، یہ لغوی ترجمہ بھی ہے، اور بامحاورہ بھی ہے، اور تفسیر روح المعانی نے بھی ایک ترجمہ یہی کیا ہے "والممتجر عین للفیظ" اور غصہ کو پینے والے ہیں۔

راقم نے بیضاوی سے ترجمہ لیا ہے، علامہ بیضاوی رقمطراز ہیں "الممسکین علیہ الکافین عن امضا ئة" النجد سے جو معانی ذکر کئے ہیں، ان کے مناسب ہی مفسرین کرام نے مختلف الفاظ سے وضاحت کی۔

"یقال کظم غیظہ اذا سکت علیہ ولم یظہرہ لابقول ولا بفعل"

کہا جاتا ہے "کظم غیظہ" وہ اپنے غصہ پر خاموش رہا، نہ زبان سے نہ نعل سے اس کا اظہار کیا۔

"قال المبرد تاویلہ انہ کتم علی امتلاہ منہ یقال کظمت السقاء اذ ملأه وسد دت علیہ"

مبرد نے کہا ہے "کظم غیظہ" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے غصہ کو چھپایا یا جو اس کے کہ وہ غصہ سے بھرا ہوا تھا، جس طرح کہا جاتا ہے "کظمت السقاء" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے مشکیزہ بھر کر اس کا منہ بند کر دیا "ویقال فلان لایکظم علی جرته اذا کان لا یحتمل شیئا" جب کوئی شخص اپنے غصہ کو برداشت نہ کرے تو کہا جاتا ہے "فلان لایکظم علی جرته" فلاں شخص اپنے جگالی سے نہیں رکتا، یعنی غصہ کے وقت بڑبڑا رہا ہے جیسے جانور جگالی کرتا ہے تو اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "کظم ماء" اس نے پانی بند کر لیا "کظم بابا" اس نے دروازہ بند کر لیا "کظم طریقا" اس نے راستہ روک لیا، ان معانی کے مطابق "وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظِ" کا ترجمہ ہو گا وہ غصہ کو بند کرنے والے ہیں، وہ غصہ کر روکنے والے ہیں، کسی چیز کے بند کرنے اور روکنے کے آلہ کو "سدادة" یا "کظامة" کہا جاتا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے "اخذ فلان یکظم فلان اذا اخذ بمجرى نفسه" فلاں شخص فلاں پر اپنے غصہ کو اندر اندر ہی گھما رہا ہے، صرف غصہ بھرا سانس لے رہا ہے، لیکن ظاہر نہیں کر رہا، یہ بھی اس معنی کے مناسب ہے کہ کہا جاتا "کظم البعیر کظوما اذا امسک علی مافی جوفہ ولم یجتہ" اونٹ نے جگالی نہیں کی چارہ کو اپنے پیٹ میں روک رکھا ہے، و اقم کے نزدیک زیادہ بہتر ہے یوں کہا جائے "کظم البعیر علی جرته ویحرکہ" اونٹ جگالی کر رہا ہے وہ اپنے چارہ کو اندر اندر ہی گھما رہا ہے۔

غصہ کو روکنے کی فضیلت میں احادیث مبارکہ:

عن سہیل بن معاذ عن انس الجہنی عن ابیہ ان رسول اللہ ﷺ قال من کظم غیظا و هو



یستطیع ان ینفذه دعاه الله يوم القيامة على رؤس الخلائق حتى یخیره فی ای الحور شاء“ (ترمذی، ابوداؤد)

انس جہنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے غصہ کو روک رکھا حالانکہ وہ اس کو نافذ کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا، یہاں تک کہ اسے اختیار دے گا کہ جو حور چاہتا ہے وہ لے لے۔ (منقول از خازن)

خیال رہے کہ ”علی رؤس الخلائق“ کا عجیب مفہوم یہ ہے کہ وہ پیچھے کھڑا ہوگا، تمام لوگوں کے سروں کے اوپر سے آواز دے کر اسے قریب بلا کر یہ مژدہ سنایا جائے گا کہ تجھے اختیار ہے جو حور چاہتا ہے لے لے۔

عن ابی ہریرۃ ؓ قال قال رسول اللہ ﷺ لیس الشدید بالصرعة النما الشدید الذی یملک نفسہ عند الغضب“ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص بہادر نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، بلکہ بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کا مالک ہو۔ (منقول از خازن)

اپنے آپ کے مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غصہ پر قبضہ کر سکے۔

عن ابن عمر مرفوعاً عن کف غضبه ستر اللہ عورتہ“ (رواہ ابن ابی الدلیا)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) جس شخص نے اپنے غصہ کو روک رکھا اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ (منقول از مظہری)

اخرج عبد الرزاق وابن جریر وابن المنذر عن ابی ہریرۃ فی قوله والکاظمین الغیظ ان النبی ﷺ قال من کظم غیظاً ہو یقدر علی الفاذہ ملأه الله ائماناً و اخرجہ البیهقی عن ابن عمر مثله“

حضرت ابو ہریرہ ؓ نے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ“ کی وضاحت میں حدیث شریف بیان کی، بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے غصہ کو روکا حالانکہ وہ اسے جاری کرنے پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ اسے امن و ایمان سے بھر دے گا، بیہقی نے حضرت ابن عمر ؓ سے بھی اس طرح حدیث بیان کی۔ (منقول از درمنثور)

اخرج البیهقی عن علی بن الحسین ان جاریۃ جعلت تسكب علیہ الماء یتہی للصلاة فسقط الابریق من یدہا علی وجہہ فشجہ فرفع رأسہ الیہا فقالت ان الله بقول والکاظمین الغیظ قال قد کظمت غیظی قالت والعافین عن الناس قال قد عفا الله عنک قالت والله یحب المحسنین قال اذهبی فانت حرة“



بیہقی نے حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) ؑ سے روایت ذکر کی کہ ان کی ایک لونڈی آپ کو نماز کی تیاری کیلئے وضوء کرارہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے لوٹا گرا جو آپ کے چہرے پر آگیا، اور آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا، آپ نے (غصہ سے) اپنے سر کو اس کی طرف اٹھایا، تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے (متقین کی شان میں) فرمایا ”وَالْكَاسِطِينَ الْغَيْظَ“ وہ غصہ کو روکنے والے ہیں، آپ نے فرمایا ”قد كظمت غيظي“ تحقیق میں نے اپنے غصہ کو روک لیا ہے، اس نے پھر کہا (اللہ کا ارشاد گرامی ہے) ”وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ“ وہ لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، آپ نے فرمایا ”قَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْكَ“ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمائے (یعنی میں نے درگزر کر لیا، تمہیں معاف کر دیا برکت حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا اللہ تمہیں معاف فرمائے) اس نے پھر کہا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) ”وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ تو آپ نے فرمایا ”جا تو آزاد ہے“ (منقول از درمنشور)

❖ واخرج البيهقي في شعب الایمان عن عمرو بن عبسة ان رجلا سال النبي ﷺ ما الایمان فقال الصبر والسماحة وخلق حسن

عمرو بن عبسہ ؓ فرماتے ہیں بیشک ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ایمان (کامل) کیا ہے، آپ نے فرمایا صبر کرنا، سخاوت کرنا، اور اچھے اخلاق رکھنا۔ (منقول از درمنشور)

❖ واخرج الاصبهانی فی الترغیب عائشة سمعت رسول الله ﷺ يقول وجبت محبة الله علی من اغضب فحلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے جو غصہ کی حالت میں برداشت سے کام لیتا ہے۔ (منقول از درمنشور)

❖ واخرج الطبرانی فی الاوسط والبيهقي فی الشعب وضعفه عن عائشة مرفوعا قال الشنوم سوء الخلق

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مرفوع حدیث بیان کی یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا نحوست، بد بختی بد خلقی میں ہے، اگرچہ اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف کہا ہے (لیکن دوسری اسناد سے یہی حسن یا صحیح بھی ثابت ہے۔

(منقول از درمنشور)

❖ واخرج البزار وابن خبان عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ الا اخبركم بخياركم قالوا بلى يا رسول الله ﷺ قال اطولكم اعمارا واحسنكم اخلاقا

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں تم میں سے بہتر لوگوں کی خبر نہ دوں، صحابہ کرام نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ ﷺ ضرور خبر دیں، آپ نے فرمایا جو تم میں سے بڑی عمر



(منقول از درمنشور)

والے ہوں اور اچھے اخلاق والے ہوں۔

واخرج ابن ابی شیبۃ واحمد والطبرانی بسند جید عن جابر بن سمرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ان الفحش والتفحش ليسا من الاسلام في شيء وان احسن الناس اسلا ما احسنهم خلقا

حضرت جابر بن سمرہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک فحش کلامی اور بد اخلاقی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بیشک لوگوں میں وہی لوگ اچھے اسلام والے ہیں جو اچھے اخلاق والے ہیں۔ (منقول از درمنشور)

واخرج ابو داود والنسائی عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ کان يدعو اللهم اني اغوذ بك من الشقاق والنفاق وسوء الأخلاق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ دعاء فرماتے تھے (تعلیم امت کیلئے) اے اللہ بیشک میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں بد بختی اور منافقت اور بد اخلاقی سے۔ (منقول از درمنشور)

واخرج البيهقي في الاسماء والصفات عن عائشة قالت قال النبي ﷺ الرفق يمن والخرق شؤم واذا اراد الله باهل بيت خير ادخل عليهم باب الرفق ان الرفق لم يكن في شيء قط الازاله وان الخرق لم يكن في شيء قط الاشانه وان احياء من الايمان وان الايمان في الجنة ولو كان الحياء رجلا كان رجلا صالحا وان الفحش من الفجور وان الفجور في النار ولو كان الفحش رجلا يمشي في الناس لكان رجلا سوا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا نرمی سے برکت حاصل ہوتی ہے، اور سختی سے نحوست و بد بختی حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی گمراہوں پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو ان پر نرمی کا دروازہ کھول دیتا ہے، بیشک نرمی کسی چیز میں نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اسے مزین بنادیتی ہے، اور سختی کسی چیز میں نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اسے بد نما بنادیتی ہے، بیشک حیا ایمان کا حصہ ہے، اور بیشک ایمان جنت میں جانے کا سبب خاص ہے، جس انسان کو حیا حاصل ہو وہ شخص نیک ہوتا ہے اور بیشک بے حیائی فجور ہے اور بیشک فجور آگ میں جانے کا ذریعہ ہے، اگر کسی شخص کو فحش کلامی حاصل ہو تو وہ لوگوں میں چلتے برا نظر آ رہا ہوگا۔ (منقول از درمنشور)

﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ ”اور درگزر کرنے والے ہیں لوگوں سے۔“

”العفو عن الناس اجل ضرور فعل الخير“ لوگوں کو معاف کر دینا بھلائی کے کاموں میں بہت بڑا کام ہے۔ انسان جب درگزر سے کام لیتا ہے تو اسے اپنے حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں، درگزر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ



جو سزا کا مستحق ہو، اسے سزا نہ دی جائے بلکہ معاف کر دیا جائے۔ ”عَنِ النَّاسِ“ سے مراد کون سے لوگ ہیں، اس میں ابو العالیہ اور کلبی اور زجاج نے یہ بیان کیا ”وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ“ ”یرید عن الممالیک“ لوگوں کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو معاف کر دیتے ہیں، ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ مطلب لینا زیادہ بہتر ہے ”اذہم الخدمة فہم یذنبون کثیرا والقدرة علیہم متیسرة“ جب کہ خدام سے غلطیاں بہت ہوتی ہیں، اور مالک حضرات کو ان پر قدرت میسر ہوتی ہے ”وانفاذ العقوبة سهل“ اور انہیں سزا دینا آسان ہوتا ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ”وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ“ ”عن ظلمہم واساءتہم، وهذا عام وهو ظاهر الآية“ لوگوں سے درگزر کرنے کا حکم ظاہر آیت کریمہ سے عام ہے کہ کسی شخص کے ظلم اور اس کے برائی سے درپیش آنے کو معاف کر دیا جائے، اس وجہ سے کہ رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی اسے عام ہی ذکر فرمایا ”وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ“ جب انہیں کوئی غضب دلادے تو وہ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ (منقول از قرطبی)

واقم کے نزدیک بھی یہ حکم عام ہے ہر صاحب طاقت کو چاہئے کہ وہ اپنے تحت افراد کی غلطیوں کو معاف کر دے، اگر معاف کرنے سے وہ زیادہ جرائم پیشہ ہو جائیں تو سرزنش کی جائے۔

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ ”اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

یعنی ان کو ثواب عطاء کرتا ہے۔ سری سقطی رحمہ اللہ نے فرمایا۔

”الاحسان ان تحسن وقت الامکان فلیس کل وقت بمکنک الاحسان“

احسان یہ ہے کہ جب بھی طاقت حاصل ہو تو تم احسان کرو، کیونکہ ہر وقت احسان کرنے کی تمہیں قدرت حاصل نہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

بادر بخیراذ ما کنت مقتدرا	فلیس فی کل وقت انت مقتدر
تم بھلائی کی طرف جلدی کرو جب تمہیں قدرت حاصل ہو	ہر وقت تمہیں (بھلائی کی) قدرت حاصل نہیں ہوتی
ابو العباس جہانی نے کتنے ہی حسین شعر بیان کئے:	
لیس فی کل ساعة واوان	تہیا صنائع احسان
ہر گھڑی ہر وقت میں نہیں حاصل ہوتے	احسان کرنے کے ذرائع
واذا امكنت فبادر الیہا	حذرا من تعذر الامکان



جب تمہیں قدرت حاصل ہو تو احسان کے ذرائع کی طرف جلدی کرو اس ڈر سے کہ کہیں اس قدرت میں پھر عذر درپیش نہ آجائے۔ (قرطبی)

قال رسول الله ﷺ ان هؤلاء من امتي قليل الامن عصم الله

(رواه الصلبي في تفسيره عن مقاتل والبيهقي في مسند الفردوس من حديث ابن مالك (رحمهم الله)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں یہ لوگ (درگزر کرنے والے) بہت کم ہیں ہاں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ جسے اپنی حفاظت میں لے لے۔

”عن الثوري رحمه الله الاحسان ان تحسن الى المسمى فان الاحسان الى المحسن متاجرة“  
ابوسفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں احسان یہ ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی سے درپیش آئے تم اس پر احسان کرو، جب کوئی احسان کرے تو اس پر احسان کرنا تو عام عادت جاری ہے۔ (مظہری)

خیال رہے:

خیال رہے کہ جبریل علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ سے سوال کرنا ”احسان کیا ہے؟ اور آپ کا جواب دینا  
”الاحسان ان تعبد ربك كالنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك“ یہ تفصیلی طور پر سورۃ فاتحہ کی بحث نجوم الفرقان میں دیکھئے۔

**فائدہ جلیلہ:** غصہ کو روکنے کے مطلب سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو فتا کر دیتے ہیں ان کی میں اور اکڑ ختم ہو جاتی ہے، اسلئے وہ اپنے غصہ کو روک رکھتے ہیں ”لان الغيظ منشاہ ذائل النفس من الكبير والحسد والحقد والبخل ونحو ذلك“ غصہ کی وجہ سے انسان سے گھٹیا کام سرزد ہوتے ہیں، غصہ کی بڑی وجہ تکبر اور حسد، کینہ اور بخل وغیرہ جیسی برائیاں ہیں۔ لوگوں کو معاف کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ اپنے دل کو فتاء کے درجہ میں پہنچایا جائے ”لان بفناء القلب يسقط الناس عن نظر اعتباره ويورى الافعال كلها منسوبة الى الله تعالى“ اسلئے کہ جب دل کو دنیا سے دور کر کے اللہ کی یاد میں فتاء کر دیا جائے تو اس وقت اس کی نظر لوگوں کی طرف نہیں ہوگی بلکہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب سمجھے گا، وہ کسی انسان کا مواخذہ کرنا جائز نہیں سمجھے گا بلکہ یہی سمجھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی کے حکم کو تسلیم کرنا ہے۔

”ولعل الاتفاق في السراء والضراء عبارة عن عدم اشتغال قلوبهم بامعة الدنيا والله اعلم“

اللہ تعالیٰ نے متقین کی جو یہ شان بیان کی کہ وہ مشکل اور آسانی میں، خوشی اور غم میں اللہ کی راہ میں مال خرچ



کرتے ہیں، اس سے اشارہ ہے اس طرف کہ ان کو دنیا کے مال سے محبت نہیں ہوتی، مال ان کے سامنے صرف دنیا کی زندگی گزارنے کیلئے ضروری ہوتا ہے، دنیا کے مال سے محبت نہیں لگاتے کہ مال کے جانے سے وہ غم میں مبتلا ہو جائیں، بلکہ ان کو مال کے آنے اور جانے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔  
(ماخوذ از مظہری)

احسان کی دو قسمیں ہیں: یعنی غیر پر احسان کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اسے نفع پہنچائے، اور دوسری قسم یہ ہے کہ اس سے ضرر کو دور کرے، نفع پہنچانے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں ہے ﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ وہ خرچ کرتے ہیں آسانی میں اور مشکل میں۔

”وَيَدْخُلُ فِيهِ انْفَاقُ الْعِلْمِ وَذَلِكَ بَانَ يَشْتَغِلُ بِتَعْلِيمِ الْجَاهِلِينَ وَهُدَايَةِ الضَّالِّينَ وَيَدْخُلُ فِيهِ انْفَاقُ الْمَالِ فِي وَجْهِ الْخَيْرَاتِ وَالْعِبَادَاتِ“

اس میں علم خرچ کرنے کا ذکر بھی ہے، کیونکہ مال کی کوئی قید نہیں، وہ لوگ بھی احسان کرنے والے یعنی نفع پہنچانے والے ہیں جو جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں، اور گمراہوں کو ہدایت دیتے ہیں، اور اس میں مال خرچ کرنے کا ذکر بھی ہے، تمام خیرات و بھلائی کی قسموں میں مال خرچ کرنا، اور عبادات میں مال خرچ کرنا جیسے ذکوۃ، صدقہ فطر وغیرہ ادا کرنا۔  
احسان کی دوسری قسم:

احسان کی دوسری قسم یہ ہے کہ غیر سے ضرر کو دور کرنا، اس کی پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دنیا میں ضرر کو دور کیا جائے ”وَهُوَ اَنْ لَا يَشْتَغِلَ بِمُقَابَلَةِ تِلْكَ الْاَسَاءَةِ بِاَسَاءَةٍ اُخْرٰى“ وہ یہ ہے کہ کسی کی برائی کے مقابل برائی نہ کی جائے بلکہ اس سے اچھائی کی جائے اس کا ذکر ”وَالْكَافِرِ الْمُنِ الْغَيْظُ“ میں آگیا ”اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے اخروی ضرر دور کی جائے ”وَهُوَ اَنْ يَسْرِى ذِمَّتُهُ عَنِ التَّبَعَاتِ وَالْمَطَالِبَاتِ فِي الْاٰخِرَةِ“ وہ یہ ہے کہ آخرت میں جن چیزوں کے پیچھا کرنے اور مطالبہ کرنے کا اسے حق حاصل ہے وہ دنیا میں ہی معاف کر دے، اس کا ذکر ”وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ“ میں آگیا، لہذا آیہ کریمہ غیر پر احسان کرنے کی تمام قسموں کو شامل ہو گئی جب یہ تینوں امور یعنی ”مشکل اور آسانی میں مال خرچ کرنا“ اور ”غصہ کو روکنا“ اور ”لوگوں سے درگزر کرنا“ غیر پر احسان کرنے میں مشترک ہیں تو اس کے بعد ان تمام امور کا ثواب ذکر کیا ”وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے ”فَانْ مَّحَبَّةَ اللّٰهِ لِلْعَبْدِ اَعْمُ دَرَجَاتِ الثَّوَابِ“ بیشک اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت کرنا ثواب کے تمام درجات کو شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر قسم کا، ہر درجہ کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ (کبیر)



”فعلى العاقل ان يسارع الى العمل بالحسنات من الاحسان والنواع الخيرات  
سريعاً قبل الفوات لان في التاخير آفات“

عقل مند انسان پر لازم ہے کہ وہ نیکیوں کے کام کرنے میں جلدی کرے، یعنی احسان کرے اور ہر قسم کی  
بھلائیاں ان کے فوت ہونے سے پہلے جلدی کرے، کیونکہ تاخیر میں آفات ہیں، یعنی نفس اور شیطان  
اسے راہ راست سے روکنے کی کوشش کریں گے۔

جواں مرد اور جوانمردی بیاموز  
اے جواں مرد جوانمردی سیکھ  
زمردان جہان مردی بیاموز  
جہان کے مردوں سے مرد بننا سیکھ  
درون از کین جو یاں نگاہ دار  
زبان از طعن بدگو یاں نگاہ دار

تو اپنے باطن کو کینہ تلاش کرنے والوں کے کینہ سے محفوظ رکھ  
تکوئی کن آں کہ با تو بد کرد  
بدکلامی والوں کے طعنوں سے تو اپنی زبان کو محفوظ رکھ  
کزاں بد رخنہ در اقبال خود کرد  
نیکی کی اس سے جس نے تیرے ساتھ برائی کی کہ اس نے برائی سے اپنے بخت میں نقصان پیدا کیا  
کنوں وقت تخم ست اگر پروری  
گر امید داری کہ خرمن بری  
اب بیج بونے کا وقت ہے اگر تو فصل پالنا چاہتا ہے اگر تو امید رکھتا ہے کہ کھلیاں حاصل کرے۔ (تو  
نیکیوں میں جلدی کر)

”یعنی ان كنت تأمل الجنة فاعبد ربك بانواع العبادات مادمت في الحياة فان  
الفرصة غنيمة والمتاخرين عن اليسر الى الله مغبون“

یعنی اگر تو جنت حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے تو اپنے رب کی تمام عبادات پر عمل کر جب تک زندہ ہے، بیشک فرصت کو  
تو غنیمت جان، جو اللہ تعالیٰ کی طرف چلنے سے تاخیر کرتا ہے، اسے غبن کر لیا جاتا ہے (یعنی نفس و شیطان اسے راہ  
راست سے ہٹا دیتے ہیں) (روح البیان)





وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا الذُّنُوبَ بِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۳۵)

- (۱) اور وہ کہ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جانو پر ظلم کریں اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور گناہ کون بخشے سوائے اللہ کے اور اپنے کئے پر جان بوجھ کر اڑ نہ جائیں۔ (کنز الایمان)
- (۲) وہ جنہوں نے کیا بے حیائی کا کام یا ظلم کیا اپنی جانوں پر تو اللہ کو یاد کیا اور بخشش طلب کی اپنے گناہوں کی، اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ کے، اور نہیں اصرار کیا انہوں نے اس پر جو انہوں نے کیا اور وہ جانتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

(۱) پچھلی آیات میں پہلے جنت کا وصف بیان کیا ”اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ“ پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے، اس کے بعد متقین کی ایک قسم کا ذکر کیا ”اٰحدهما الذین اقبلوا علی الطاعات والعبادات“ یعنی متقین کی دو قسمیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ابتدائی طور پر ہی طاعات اور عبادات کی طرف متوجہ ہوئے، وہ گناہوں سے محفوظ رہے، ان کے اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے کہ وہ مشکل میں اور آسانی میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ غصہ کو روک رکھتے ہیں، اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔

ولٰسٰیہما الذین اذنبوا ثم تابوا وھو المراد بقولہ ”وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً“ متقین کی دوسری قسم یہ ہے کہ ان سے گناہ تو سرزد ہوئے لیکن وہ ان پر تادم ہو گئے، اور توبہ کر لی، ان لوگوں کا ذکر ہی اس آیت کریمہ میں ہو رہا ہے جس کی بحث جاری ہے ”یعنی (وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً) الْاٰیۃ“ میں اسی کا ذکر ہے۔ توبہ کرنے والا فرقہ بھی، گناہ نہ کرنے والے فرقہ کی طرح متقی بن جاتا ہے۔

”وَذَلٰکَ لَآنَ الْمَلٰٓئِیۡہِ اِذَا تَابَ عَنِ الذَّنْبِ صَارَ حَالَهُ کَحَالِ مَنْ لَّمْ یَذْنِبْ قَطْ فِیْ اسْتِحْقَاقِ الْمَنْزِلَةِ وَالْکِرَامَةِ عَنْہُ اللّٰہُ“

اس کی وجہ یہ ہے کہ گنہگار جب گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو اس کا حال وہی ہو جاتا ہے جیسا کہ حال اس شخص کا ہوتا ہے جس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں ہوتا، یعنی توبہ کر لینے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے ہی بلند مرتبہ اور



کرامت کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے جیسا کہ گناہ نہ کرنے والوں کو بلند مرتبہ اور کرامت کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔

(۲) ماقبل سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ پچھلی آیت کریمہ میں بیان فرمایا ”وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ (اللہ محبت رکھتا ہے احسان کرنے والوں سے) یعنی غیروں پر احسان کرنے والے اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ اب اس آیت کریمہ میں بیان کیا جا رہا ہے ”وَنَدَّبَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ إِلَى الْإِحْسَانِ إِلَى النَّفْسِ“ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے نفس پر احسان کرنے والے بھی پسند ہیں ”فَإِنَّ الْمَذْنِبَ الْعَاصِيَ إِذَا تَابَ كَانَتْ تِلْكَ التَّوْبَةُ إِحْسَانًا مِنْهُ إِلَى نَفْسِهِ“ اس لئے کہ گنہگار جب سچے دل سے توبہ کر لیتا ہے تو اس کا توبہ کرنا اس کے اپنے نفس پر اس کا احسان کرنا ہے، اسی لئے وہ رب تعالیٰ کو پسند ہے۔

**شان نزول: (۱)** شان نزول کی ایک وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو شخصوں یعنی انصاری اور ثقفی کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا، وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے، ایک ساتھ ہی رہتے تھے، نبی کریم ﷺ جہاد وغیرہ کے سفر میں جن جن لوگوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہوتا، قرعہ اندازی کے ذریعے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے جاتے اور دوسرے کو دونوں گھروں کا نظام چلانے کیلئے چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ قرعہ اندازی کے ذریعے نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھ ثقفی کو سفر میں لیا۔ اور انصاری کو پیچھے چھوڑا، انصاری سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ ثقفی کی غیر موجودگی میں ان کی زوجہ کی طرف کھڑا ہوا کہ اس کا بوسہ لے لے، لیکن اس عورت نے اپنے چہرے پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ تو وہ انصاری اپنے اس فعل پر نادم ہو گیا۔ جب ثقفی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوٹے تو انصاری کو گھر میں نہ پایا، معاملہ کا پتہ چلا کہ وہ تو ایک پہاڑ میں پریشان ہو کر سرگرداں ہو کر پھر رہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہ کی وجہ سے جو میں توبہ کر رہا ہوں اسے قبول فرمالے۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم آئے گا وہی ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مؤمنین کہنے لگے کہ بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم سے زیادہ مکرم ہیں کیونکہ وہ کوئی گناہ کر لیں تو ان کے دروازے کی چوکھٹ پر ان کے گناہ کو لکھ دیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے ”اجدع انفسک، الفعل کذا“ تیرا ناک کٹ جائے (تو ذلیل ہو جائے) تو اس طرح کر۔ یعنی جرائم سے دور رہ اور اچھے نیکی کے کام کر۔ صحابہ کرام کا مطلب یہ تھا کہ جب بنی اسرائیل کے گناہوں کے گناہوں کو ان کے دروازے پر لکھ دیا جاتا ہے تو وہ اس رسوائی سے بچنے کیلئے گناہوں سے بھی کافی حد تک دور رہتے ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا ”وَبَيْنَ اَنَّهُمْ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ حَيْثُ جَعَلَ كَفَارَةً لِّبِهِمُ الْاِسْتِغْفَارَ“



”اور مومنین کو تسلی دی کہ تمہارا مقام میرے نزدیک مکرم ہے بنی اسرائیل کو تو گناہوں پر تو بیخ کر کے رسوا کیا جاتا ہے، لیکن تمہارے گناہوں کا کفارہ توبہ کو بنا دیا گیا، تو سچے دل سے توبہ کرو اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش طلب کرو، اللہ تعالیٰ گناہ معاف کر دے گا۔“ (کبیر)

یعنی شان نزول کی دونوں وجوہ میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں وجہ کے پائے جانے پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

### مختصر مطلب:

اگرچہ ترجمہ سے کافی حد تک مطلب تو سمجھ آ رہا ہے لیکن ذرا آسان کرنے کیلئے قدرے وضاحت کی جاتی ہے جو لوگ بے حیائی کا کام کر لیں، یا گناہوں کے ذریعے اپنے آپ پر ظلم کر لیں، لیکن پھر وہ اللہ کو یاد کریں، یعنی اپنے گناہوں پر پشیمان ہو جائیں اور اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت (بخشش) طلب کریں، اور وہ یقین کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں، اور وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہ کریں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ گناہوں پر اصرار جائز نہیں، بلکہ توبہ سے ہی گناہوں کے وبال سے نکل سکتا ہے۔

### فاحشہ اور ظلم میں فرق:

مفسرین کرام نے مختلف الفاظ سے ان دونوں گناہوں میں فرق کیا ہے، ان وجوہ میں بھی کوئی تعارض نہیں، بلکہ تمام وجوہ فرق پائی جاتی ہیں۔ ”فاحشہ“ فعلہ بالغة فی القبح كالزنا“ ہر وہ گناہ جس میں زیادہ قباحت اور بے حیائی پائی جائے اسے ”فاحشہ“ کہا جاتا ہے (او ظلموا انفسہم) بان اذنبوا ای ذنب کان“ اور ہر قسم کے گناہ کو ظلم کہا جاتا ہے ”وقبل الفاحشۃ الکبیرۃ وظلم النفس الصغیرۃ“ اور بیان کیا گیا ہے کہ کبیرہ گناہ کو فاحشہ کہا جاتا ہے، اور صغیرہ کو ظلم کہا جاتا ہے ”ولعل الفاحشۃ ما یتعدی وظلم النفس مالیس کذلک“ وہ گناہ جو متعدی ہو یعنی گناہ کرنے والوں سے تجاوز کر کے دوسروں کو بھی نقصان پہنچائے، اسے فاحشہ کہا جاتا ہے، اور آگے دوسروں کی طرف متجاوز نہ ہو اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ (بیضاوی)

بیضاوی نے جو وجوہ فرق بیان کی ہیں وہ کبیر میں بھی بیان کی گئی ہیں، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے ”الفاحشۃ ہی الزنا وظلم النفس ہی القبلة واللمسة والنظرة“ فاحشہ سے مراد زنا، اور ظلم نفس سے مراد بوسہ اور چھونا اور نظر کرنا۔

**تنبیہ:** صغیرہ گناہوں پر انسان مصر نہ رہے یعنی صغیرہ گناہوں کا بار بار ارتکاب کرنے سے وہ کبیرہ بن جاتے



ہیں ”والصغیرہ یجب الاستغفار منها“ (صغیرہ سے بھی استغفار کرنا ضروری ہے) علامہ رازی رحمہ اللہ نے تو ان الفاظ کے بعد یوں تحریر کیا۔

”بدلیل ان النبی ﷺ کان مامورا بالاستغفار وهو قوله ”واستغفر لذنبک“ وما کان استغفار دالا علی الصغائر بل علی ترک الفضل“ (کبیر)

اس کی مکمل بحث ان شاء اللہ اپنے مقام پر ہی آئے گی۔

واقم نے ”وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً“ کا ترجمہ کیا ہے ”اور وہ جنہوں نے کیا بے حیائی کا کام“ یہ ترجمہ کبیر کی اس عبارت سے لیا گیا ”الفاحشة ههنا نعت محذوف والتقدير ”فعلوا فعلة فاحشة“

آیہ کریمہ کے نزول پر شیطان کی پریشانی و بے قراری:

❁ واخرج الترمذی عن عطاء بن خالد انه قال بلغنی انها لما نزلت صاح ابليس بجنوده وحشا علی رأسه التراب ودعا بالویل والشور حتی جاءته جنوده من کل بروبح فقالوا مالک یا سیدنا قال آیة نزلت فی کتاب اللہ لا یضر بعدها احد من بنی آدم ذنب قالوا وما هی؟ فاخبرهم ”قالوا انفتح لهم باب الالهواء فلا یتوبون ولا یستغفرون ولا یرون الا انهم علی الحق فرضی منهم بذلك“

عطاء بن خالد کہتے ہیں کہ مجھے یہ خبر ملی کہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو شیطان نے چیخ و پکار کر کے اپنے لشکر کو بلانا شروع کیا، اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا، ہائے ہلاکت، ہائے بربادی کی آوازیں دینے لگا، بحرور (تری اور خشکی) سے اس کے تمام لشکر جمع ہو گئے، انہوں نے کہا اے ہمارے سردار تمہیں کیا ہو گیا؟ اس نے کہا اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں ایک آیہ نازل ہو گئی جس میں یہ بیان کیا آج کے بعد کسی مؤمن کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکے گا کیونکہ وہ گناہوں سے توبہ کر کے متقی پر ہیزگار بن جائیں گے، انہوں نے پوچھا وہ کون سی آیہ ہے تو شیطان نے ان کو اس آیہ (وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً الْآیۃ) کے متعلق خبر دی، تو وہ کہنے لگے ہم ان کیلئے خواہشات کا دروازہ کھول دیں گے، وہ توبہ نہیں کریں گے، بخشش طلب کریں گے اور جو کام بھی کریں گے اسے وہ حق سمجھیں گے، شیطان اپنے چیلوں کی یہ بات سن کر راضی ہو گیا۔ (منقول از روح البیان)

”انہوں نے یاد کیا اللہ کو۔“

﴿ذَكَرُوا اللَّهَ﴾

اس یاد کرنے کی دو وجہ ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وعید اور اس کے عذاب اور اس کے جلال کو یاد کرتے



ہیں یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس سے حیا کرنے کے ذرائع ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا ”فَاسْتَغْفِرُوا الذُّنُوبَ بِهِمْ“ وہ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، یعنی استغفار اللہ تعالیٰ سے اس کے عذاب، نہی اور وعید کو یاد کرنے کا اثر اور نتیجہ ہے، اسی مفہوم کو دوسری آیت کریمہ میں یوں بیان کیا گیا۔

﴿إِنَّ الدِّينَ اتَّقُوا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكُّرًا فَإِذَا هُم مَّبْصُرُونَ﴾ (الاعراف آیت نمبر ۲۰۱)

بیشک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کیے ہیں جب چھوٹا ہے انہیں کوئی خیال شیطان کی طرف سے تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ دوسری وجہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا عظمت بیان کرنا اور اس کی بزرگی بیان کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے جب سوال کیا جائے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرنا ضروری ہے۔

”فہنا لما كان المراد الاستغفار من الذنوب قدموا عليه الثناء على الله تعالى ثم اشتغلوا بالاستغفار عن الذنوب“

اس آیت کریمہ میں بھی مقصود جب گناہوں سے توبہ کرنا ہے تو پہلے اللہ کو یاد کرنے کا ذکر کیا، پھر گناہوں سے استغفار کا ذکر کیا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿فَاسْتَغْفِرُوا الذُّنُوبَ بِهِمْ﴾ ”تو بخشش طلب کی انہوں نے اپنے گناہوں کی۔“

مراد اس سے صحیح توبہ کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ مقبولیت حاصل کر لے ”وہو الندم علی فعل ماضی مع العزم علی ترک مثله فی المستقبل“ وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماضی کے گناہوں پر نادم ہو جائے، اور مستقبل میں گناہ کو چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لے، صرف زبان سے استغفار کرنے سے گناہوں کا زوال نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرنے سے، اسی سے معافی طلب کرنے سے گناہوں کا زوال ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَمَنْ يُغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”اور کون بخشتا ہے گناہوں کو سوائے اللہ کے۔“

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہاں بظاہر استفہام ہے، لیکن سوال مقصود نہیں بلکہ استفہام انکاری پایا گیا ہے، کون بخشتا ہے یعنی کوئی بھی گناہوں کو نہیں بخشتا سوائے اللہ کے، مقصد بیان کرنے کا یہ ہے کہ بندہ رب تعالیٰ کے بغیر کسی اور سے بخشش طلب نہ کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں بندے کو عذاب دینے پر قادر ہے تو وہی عذاب کو دور کرنے پر قادر ہے



”فَصَحَّحَ أَنَّهُ لَا يَجُوزُ طَلَبُ الِاسْتِغْفَارِ إِلَّا مِنْهُ“ صحیح یہی ہے کہ بخشش صرف رب تعالیٰ سے ہی طلب کی جاسکتی ہے۔

﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا﴾ ”اور نہیں اصرار کیا انہوں نے اس پر جو انہوں نے کیا۔“

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

”فَاسْتَغْفِرُوا الذُّنُوبَ بِهِمْ“ یہ جملہ معطوف علیہ ہے ”وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا“ جملہ معطوف ہے،

درمیان میں ﴿وَمَنْ يُغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے (وَلَمْ يُصِرُّوا) یدیموا (عَلَىٰ مَا فَعَلُوا) بل اقلعوا عنہ (جلالین) یعنی وہ اپنے گناہوں پر قائم نہیں رہتے، بلکہ توبہ کر کے یعنی رب تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش طلب کر کے گناہوں کو زائل کر دیتے ہیں۔

”اور وہ جانتے ہیں۔“

﴿وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

دینی طلباء کرام بہتر سمجھتے ہیں:

کہ جس طرح ترکیب ہوگی، اسی طرح معنی ہوگا، ایک ترکیب اس جملہ کی یہ ہے کہ یہ حال واقع ہو رہا ہے، اس صورت میں معنوی طور پر عبارت یہ ہوگی ”وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا مِنْ الذُّنُوبِ حَالِ مَا كَانُوا أَعَالِمِينَ بِكُونِهَا مُحْظُورَةً مُحَرَّمَةً“ وہ اصرار نہیں کرتے گناہوں کے فعل پر حالانکہ وہ جانتے ہیں، کہ یہ کام ممنوع اور حرام ہے، اس لئے کہ جو شخص کسی فعل کی حرمت کو نہیں جانتا اسے کبھی معذور سمجھا جاتا ہے، لیکن جو شخص کسی فعل کی حرمت کو نہیں جانتا وہ معذور نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ یہ جملہ معطوفہ ہے، اس سے عقل، تمیز اور گناہوں سے بچنے پر قادر ہونا مراد ہو، اب معنی یہ ہوگا، اور وہ جانتے ہیں، یعنی عقل و تمیز رکھتے ہیں، اسی لئے وہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے بلکہ توبہ کرتے ہیں، رب تعالیٰ سے معافی طلب کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر)

وضاحت کیلئے مزید اقوال دیکھئے:

(وَهُمْ يَعْلَمُونَ) قال ابن عباس وهم يعلمون انها معصية وان لهم ربا يغفرها“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”وَهُمْ يَعْلَمُونَ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ گناہ کا کام ہے، اور بیشک ان کا رب ہی ان کی بخشش فرمائے گا ”وقيل معناه وهم يعلمون ان الله يملك مغفرة“



الذنب“ اور اس کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت کا مالک ہے۔

”وقیل وہم یعلمون ان اللہ لا یتعاضمہ العفو عن الذنوب وان کثرت“ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر گناہوں کا معاف کرنا بھاری نہیں خواہ گناہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں ”وقیل وہم یعلمون انہم ان استغفرو اغفرلہم“ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ بیشک انہوں نے اگر مغفرت طلب کی تو ان کی مغفرت کر دی جائے گی۔ (خازن)

### استغفار کی فضیلت کا بیان:

عن علی بن ابی طالب ؓ انہ قال انی کنت اذا سمعت حدیثا من رسول اللہ ﷺ ینفعنی اللہ منہ ما شاء ان ینفعنی واذا حدثنی احد من الصحابة استحلقتہ فاذا حلف لی صدقته وانہ حدثنی ابوبکر وصدق ابوبکر انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول ما من عبد مؤمن او قال ما من رجل یذنب ذنبا فیقوم فیتطہر ثم یصلی رکعتین ثم یتستغفر اللہ الا غفر اللہ لہ ثم قرأ هذه الآية والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا اللہ الی آخر الآية“

(اخرجه ابو داود والترمذی)

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں بیشک میں نے جب رسول اللہ ﷺ سے حدیث سنی اللہ تعالیٰ نے مجھے نفع عطاء کیا جو نفع وہ دینا چاہتا، جب مجھے کسی ایک صحابی نے حدیث بیان کی تو میں نے اس سے قسم طلب کی جب مجھے قسم اٹھا کر بتایا گیا تو میں نے اس کی تصدیق کر دی، بیشک مجھے حضرت ابوبکر ؓ نے حدیث بیان کی، بیشک آپ نے سچ بیان فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کوئی مومن بندہ نہیں کہ وہ گناہ کر لے پھر کھڑا ہو جائے، پاکیزگی اختیار کر لے، پھر دور کعتیں پڑھے پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرماتا ہے، پھر آپ نے یہی آیت کریمہ ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً﴾ مکمل آیت کریمہ پڑھی۔ (منقول از خازن)

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لو لم تلذبوا للہب اللہ بکم ولجاء بقوم یلذبون فیستغفرون فیغفرلہم“ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جاتا، ایک اور قوم کو لے آتا جو گناہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماتا۔ (منقول از خازن)



## سحری کے وقت استغفار:

سید الاستغفار وان وقته الاسحار فالاستغفار عظیم وثوابه جسيم“ سید الاستغفار کا وقت سحری کا وقت ہے، سحری کے وقت استغفار عظیم استغفار ہے، اور اس کا ثواب بہت بڑا ثواب ہے۔

## سید الاستغفار:

روى الترمذی عن النبی ﷺ انه قال من قال استغفر الله الذي لا اله الا هو الحي القيوم واتوب اليه غفر له وان كان قد فر من الزحف“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے کہا ”اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَآتُوبُ إِلَيْهِ“ تو اس کی بخشش کر دی جاتی ہے اگرچہ وہ جنگ سے بھاگ آئے۔ (منقول از قرطبی)

وروى مكحول عن ابی هريرة قال مارأيت اكثر استغفار من رسول الله ﷺ وقال مكحول مارأيت اكثر استغفار من ابی هريرة وكان مكحول كثير الاستغفار“

حضرت مکحول ﷺ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ ؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا کوئی نہیں دیکھا، مکحول ﷺ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے زیادہ استغفار کرنے والا نہیں دیکھا، مکحول خود بھی بہت زیادہ استغفار کرتے تھے۔ (منقول از قرطبی)

## خطباء کے فائدہ کیلئے:

قال سهل بن عبد الله، الْجَاهِلُ مَيِّتٌ، وَالنَّاسِيُّ نَائِمٌ، وَالْعَاصِي سَكْرَانٌ، وَالْمُصِرُّ هَالِكٌ“  
سهل بن عبد اللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، جاہل میت کی طرح ہے، بھولنے والا سونے والے کی طرح ہے، اور نافرمان نشے والے کی طرح ہے، اور گناہوں پر اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والے کی طرح ہے۔ (قرطبی)

**فائدہ:** الاصرار هو ان ينوي الايتوب فاذا نوى التوبة النصوح خرج عن الاصرار“  
گناہوں پر اصرار کرنے والا جب خالص توبہ کرنے کی نیت کر لیتا ہے تو وہ اصرار سے نکل جاتا ہے۔

انسان تفکر کرے اور دعاء بھی کرے:

گناہوں پر اصرار ختم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطاء کر دیتا ہے جب وہ قرآن پاک میں تفکر



کرتا ہے اور اسے جنت کا تفصیلی تذکرہ جو رب تعالیٰ نے فرمایا وہ اور مطیعین سے وعدہ اور آگ کا عذاب نافرمانوں کیلئے اور ان پر تہدید (دھمکیاں) وغیرہ جب اس کے ذہن میں آجائیں گی تو اسکے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید آجائے گا تو یہ رب تعالیٰ سے دعاء کرے گا، اس کی طرف رجوع کرے گا یہ توفیق بھی اسے رب تعالیٰ سے ہی حاصل ہوگی کہ وہ توبہ کر لے اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کر لے۔ (منقول از قرطبی)

**تنبیہ:** حقوق العباد جب تک ادا نہیں کرے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا، اس لئے توبہ کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ اگر اس کے ذمہ حقوق العباد ہیں تو ان کو ادا کرے۔ (منقول از قرطبی)

عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ فیما یحکی عن ربہ تعالیٰ قال اذا اذنب عبد ذنباً فقال اللہم اغفر لی ذنبی قال تبارک وتعالیٰ اذنب عبدی ذنباً علم ان له رباً یغفر الذنب ویأخذ بالذنب، وفی رواۃ اعمل ما شئت قد غفرت لک، قال عبد الا علی لا ادری اقال فی الثالثۃ او الرابعۃ اعمل ما شئت

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب تعالیٰ (کی رحمت) کی حکایت اس طرح بیان کی کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے اور (توبہ کرتا) کہتا ہے اے اللہ میرے گناہ معاف کر دے، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کر لیا ہے، اسے معلوم ہے کہ بیشک اس کا رب ہے جو گناہوں کی مغفرت بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے، (رب تعالیٰ ان الفاظ سے اس کی مغفرت کر دیتا ہے) بندہ پھر گناہ کر لیتا ہے پھر عرض کرتا ہے اے اللہ میرے گناہ کو معاف کر دے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کر لیا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے، اور گناہوں پر پکڑ بھی وہی کرتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ (بندہ جب بار بار غلطی کرتا ہے اور رب تعالیٰ سے ہی معافی طلب کرتا ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو جو چاہے عمل کر میں نے تیری مغفرت کر دی۔

گذشتہ سے پیوستہ:

آیہ کریمہ کے شان نزول کی دو وجہ شروع میں بیان کر دیں، روح البیان، معالم التنزیل وغیرہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی کہ ”کہ ایک شخص جس کا نام تیہان تھا، وہ کھجوریں بیچتا تھا، اس کا لقب تمار تھا، اس تیہان تمار کے پاس ایک حسین عورت کھجوریں خریدنے کیلئے آئی تو اس نے عورت کو اپنے گلے لگا لیا اور بوسہ لے لیا، لیکن پھر اپنی غلطی پر نادم ہو گیا (توبہ کی غرض سے کہ غلطی معاف ہو جائے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنا معاملہ آپ پر پیش کیا، تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی، آیہ کریمہ کے شان کی تین وجوہ ذکر کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔



”وانت تعلم انه لا مانع من تعدد سبب النزول وایما كان لفظ ينظم ما فعله  
الرماء النظام اوليا“

اور تمہیں معلوم ہے کہ نزول کے اسباب کے تعدد میں کوئی ممانعت نہیں، کئی واقعات کے بعد آیہ کریمہ  
کا نزول ہوا ایسا ممکن ہے اس میں کوئی خرچ نہیں، شان نزول کوئی بھی ہو عموم الفاظ سے مطلب یہی ہے کہ جو بھی گناہ  
کر لے اور ان گناہوں پر جمانہ رہے بلکہ فوراً رب تعالیٰ کو یاد کرے اور اس سے گناہوں کی مغفرت طلب کرے تو اللہ  
تعالیٰ اس کی مغفرت کر دے گا۔  
(منقول از روح المعانی)



أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ  
فِيهَا وَنِعَمَ أَجْرُ الْعَالَمِينَ ۝  
(آیہ ۱۳۶۔)

(۱) ایسوں کو بدلہ ان کے رب کی بخشش اور جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں،  
اور کامیوں کا کیا اچھا نیک ہے۔  
(کنز الایمان)

(۲) یہی بلند مرتبہ ہیں وہ جن کا بدلہ بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے، اور جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے  
نیچے نہریں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کتنا ہی اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا۔ (نجوم الفرقان)  
دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”اولئک“ کی ترکیب میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جملہ استیغاثہ ہو اس صورت میں اس کا ”مشارالیه“ اُعِدْتُ  
لِلْمُتَّقِينَ میں جو متقین کا ذکر ہے اور پچھلی آیہ میں جو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہے۔ وہ مجموعی طور پر ہے، یعنی یہی متقین اور  
تائبین کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے۔ الخ

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ پچھلی آیہ کریمہ جو موصول ”واللذین“ ہے اس موصول اور صلہ کی یہ خبر ہو تو اس  
صورت میں ”مشارالیه“ صرف تائبین ہوں گے۔ یعنی توبہ کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ مغفرت ہے ان کے  
کی طرف سے۔ الخ  
(منہری)



واقم نے ”اولئک“ کا ترجمہ کیا ہے ”یہی بلند مرتبہ ہیں“ یہ ترجمہ تفسیر ابی السعود سے لیا گیا ہے۔

”اولئک“ اشارۃ الی المذكورین آخر باعتبار الصافہم بمامر من الصفات الحمیدۃ

وما فیہ من معنی البعد للاشعار بعد منزلتہم وعلو طبقہم فی الفضل“

”اولئک“ کا اشارہ پچھلی آیات میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان کی طرف ہے، ان کی اچھی صفات کی وجہ سے ذکر فرمایا کہ وہ اچھی جزاء کے مستحق ہیں ”اولئک“ اشارہ بعید کیلئے ہے حالانکہ ان لوگوں کا ذکر قریب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فضیلت میں ان کا مرتبہ بلند ہونے اور ان کا طبقہ بلند ہونے کی وجہ سے گویا کہ ان مرتبہ کے لحاظ پر بعد (دوری) حاصل ہے، طلباء کرام جانتے ہیں اسے ”بعد ربتی“ کہا جاتا ہے، حقیقت میں قرب اور شان اور فضیلت میں بعد دونوں چیزوں کا اعتبار کرتے ہوئے راقم نے ترجمہ کیا ہے ”یہی بلند مرتبہ ہیں“ (واللہ اعلم بالصواب)

دوام مطلوب ہیں:

ایک یہ کہ عذاب سے محفوظ رکھنا، اس کا تذکرہ ”مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَبِّهِمْ“ میں کیا ہے، کہ ان کے گناہوں کی ستر پوشی کی جاتی ہے اور ان کی بخشش کی جاتی ہے۔ دوسری چیز مطلوب یہ ہے کہ ان کو ثواب پہنچانا اس کا ذکر ﴿جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ (اور ان کی جزاء) جنتیں ہیں جاری ہیں ان کے نیچے نہریں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ”نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ“ ذکر فرما کر یہ واضح کر دیا ”ان الذی یحصل لهم من ذلک وهو الغفران والجنات یكون اجر العلمم وجزاء علیہ“ بیشک ان کو جو مغفرت اور جنتیں (باغات) جو حاصل ہوں گی یہ ان کے نیک عمل پر اجر اور جزاء ان کو حاصل ہونی ہے۔ (کبیر) **تنبیہ:** قال القاضی، وهذا یطل قول من قال ان الثواب تفضل من الله وليس بجزاء علی عملهم“

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ“ (کتنا ہی اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا) سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کا یہ قول باطل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ثواب صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے، کسی عمل کا بدلہ نہیں ہوگا، یہ قول درست نہیں کیونکہ واضح طور پر ان الفاظ مبارکہ میں عمل پر اجر و ثواب کا ذکر کیا۔ (کبیر) اور رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا﴾ ”بیشک اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر اس کا جو اچھا عمل کرتا ہے“ بھی



اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کو نیک عمل پر اجر و ثواب حاصل ہوگا۔ راقم کا اس پر موقف یہ ہے کہ نیک اعمال اجر و ثواب کا ذریعہ ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی ان کے شامل حال رہتا ہے، کیونکہ اگر وہ چاہے تو بغیر عمل کے بھی مغفرت فرما دے۔

### ما قبل اور ما بعد سے تعلق:

اس آیت کریمہ کا ما قبل سے تعلق یہ ہے کہ پہلے ذکر کیا گیا تو بہ کرنے والوں کا جو اپنے گناہوں پر اصرار نہیں، اب ذکر کیا جا رہا ہے کہ جو خلوص دل سے توبہ کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں پر جے نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت اور جنات عطاء کرتا ہے۔ ما بعد سے تعلق یہ کہ غزوۂ احد میں بعض صحابہ کرام پسپا ہو گئے تھے، اس ذکر سے پہلے ہی یہ بیان کر دیا ”من فرثم تاب ولم یصرفله مغفرة الله“ جو شخص پسپا ہو گیا لیکن اس نے توبہ کر لی اور اپنی خطا پر جما نہیں رہا اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔  
(ماخوذ از قرطبی)

راقم نے چند سطر پہلے اپنا موقف ذہنی سوچ سے لکھا، روح البیان سے اسے تائید ان الفاظ سے حاصل ہو گئی  
”وَنِعَمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ“ المخصوص بالمدح محذوف ای ونعم اجر العاملين ذلك  
ای ما ذکر من المغفرة والجنات والتعبیر عنهما بالاجر المشعر بانهما  
تستحقان بمقابلة العمل وان كان بطریق التفضل لمزید الترغیب فی الطاعات  
(روح البیان)

والزجر عن المعاصی“  
”نعم“ فعل مدح ہے اس کا مخصوص بالمدح ”ذلك“ محذوف ہے جس کا اشارہ مغفرت اور جنات کی طرف ہے یعنی وہ مغفرت اور جنات کے مستحق ہوں گے کہ ان کے اعمال اچھے ہوں گے ہاں البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل بھی حاصل ہوگا جس کی وجہ سے ان کو نیکیوں میں رغبت زیادہ حاصل ہوگی، اور معاصی سے زجر حاصل ہوگی۔

### انسان عمل سے بے نیاز نہ ہو:

”روی ان الله تعالى اوحى الى موسى عليه السلام“ ما اقل حياء من يطمع في جنتي  
بغير عمل يا موسى كيف اجود برحمتي على من يبخل بطاعتي“  
روایت بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ وہ شخص کتنی ہی کم حیا والا ہے جو بغیر عمل کے میری جنت کی طمع رکھتا ہے۔ اے موسیٰ میں اسے اس پر جنت عطاء کرنے کی کیسے سخاوت کروں جو



(روح البیان، بحر المحیط)

میری طاعت کرنے میں بکل کرتا ہے۔

وعن شهر بن حوشب طلب الجنة بلا عمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة

بلاسبب نوع من الغرور وارتجاء الرحمة ممن لا يطاع حمق و جهالة

شہر بن حوشب کا قول یہ ہے کہ جنت کی طلب بغیر عمل کے گناہوں میں سے ایک گناہ، اور بغیر سبب کے شفاعت کی انتظار دھوکہ کی قسموں میں سے ایک قسم ہے، اور رحمت کی امید اس ذات سے کرنا جس کی اطاعت ہی نہ کی جائے حماقت و جہالت ہے۔

(روح البیان، بحر المحیط)

حضرت رابعہ بصریہ رحمہ اللہ اکثر طور پر یہ شعر پڑھا کرتی تھیں۔

ترجو النجاة ولم تسلك مسالكها ان السفينة لا تجرى على اليبس

تو نجات کی امید کرتا ہے اور اس کے راستوں پر نہیں چلتا۔ بیشک کشتی خشکی پر نہیں چلا کرتی۔ (روح البیان)

**فائدہ:** سب سے عمدہ چیز ایمان ہے، یہ توحید سے حاصل ہوتا ہے اسلئے کہ توحید شرک کے منافی ہے، وہ ایمان و توحید انسان کو توبہ اور استغفار کی طرف پہنچاتے ہیں، مومن و موحد کیلئے یہی بلندئی مقام ہے کہ وہ توبہ استغفار کی طرف پہنچاتے ہیں، مومن و موحد کیلئے یہی بلندئی مقام ہے کہ وہ توبہ و استغفار کے ذریعے متقین میں آجائے تاکہ وہ جنت میں داخل ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان رکھنے والے اور اللہ تعالیٰ کی واحدانیت پر ایمان رکھنے والے بندہ کے لائق یہی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے احکام تسلیم کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے روکا ہے ان سے رک جائے، اور یہ بھی ایمان رکھے ”وان كان التوفيق الى جانب العمل ايضا من عنايته تعالى“ کہ عمل کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

نخست او ارادت بدل در نہاد پس این بندہ بر آستان سر نہاد

سب سے پہلے بندہ اپنے دل کے ارادہ کو رب کے در پر رکھے اس کے بعد بندہ اپنے رب تعالیٰ کے آستانہ پر سر رکھے۔ یعنی ایمان پہلے لائے اور پھر رب تعالیٰ کی عبادت کرے۔

طالب حق کیلئے یہ ضروری ہے:

کہ وہ کامل ادب کو بجالائے تاکہ ادب کے ذریعے بلند مراتب تک پہنچ جائے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ مغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے ہر روز ستھر یا سومرتبہ استغفار کرتے، اس کی



وجہ یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ادب کو بجالایا جائے۔

وبکمال ادبه وصل الی ماوصل حتی صار اتباعه سببا لمحبة الله كما قال الله تعالى  
”قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونی يحبکم الله“

نبی کریم ﷺ رب تعالیٰ کے کامل ادب کو بجالانے کی وجہ سے اس عظیم درجہ پر پہنچے کہ آپ کی تابعداری اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ بن گئی، اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحِبِّکُمُ اللّٰهُ﴾ (اے محبوب) آپ فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری تابعداری کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ نبی کریم ﷺ اتنے بلند و بالا منصب پر قائم ہونے کے باوجود ”ومع ذلك كان خوفه واجلاله في غاية والکمال“ کامل درجہ کا اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے جلال کا لحاظ دل میں رکھتے تھے۔ اے نبی کریم ﷺ کے امتی، آپ کی اتباع کرنے والے تیرے لئے تو اور ہی ضروری ہے کہ تو اپنے آقا ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اور اپنے آقا و مولیٰ کی تابعداری کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھ، اللہ تعالیٰ کے جاہ و جلال کو بھی دل میں بسالے، **واهم** کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھی قوی امید رکھ اور اس کے جمال کی طرف بھی دھیان رکھ۔ (ماخوذ از روح البیان)

علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ نے اپنے لئے اور دوسرے مؤمنین کیلئے دعاء کی رقم کی بھی اپنے لئے اور تمام مؤمنین کیلئے وہی دعاء ہے۔  
”ولفنى الله واياكم الى مايجب ويرضى ويداوى بلطفه وكرمه هذه القلوب  
المرضى فان بيده مفاتيح الاصلاح والفوز بالغبية والظفر بالفلاح“

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطاء فرمائے کہ ہم وہی کام کریں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں اور جن پر وہ راضی ہو جائے، اے اللہ اپنے لطف و کرم سے ہمارے مریض دلوں کو دوا دے دے (تاکہ ان کو شفا حاصل ہو جائے) اصلاح اور مقاصد کے حصول کی کامیابی اور فلاح پر کامیاب کرنے کی چابیاں رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہی ہے (اس لئے اسی پر امید ہے کہ وہ ہمیں بھی یہ مقاصد عطاء فرمائے گا)۔ (روح البیان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”خَالِدِينَ فِيهَا“ حال مقدرۃ من الضمير المجرور في (جزاؤهم) لانه مفعول به معنى  
اذ هو في قوة يجزيهم الله جنات خالدین فیہا“

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ”خَالِدِينَ فِيهَا“ ”جزاؤهم“ کی مجرور ضمیر یعنی مضاف الیہ سے حال مقدرہ ہے کیونکہ وہ معنی مفعول ہے، معنوی لحاظ پر مطلب یوں ہو گیا، وہ ان کو جزاء عطاء کرے گا یعنی جنات عطاء کرے گا تو



(روح المعانی)

اس حال میں انہیں وہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔

حالِ مقدرہ کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ جس کام نے مستقبل میں حاصل ہونا ہو اور اس حال میں کسی چیز نے واقع ہونا ہو۔

مؤمنین کے تین طبقات ہیں:

(۱) متقین (۲) ثابتین (۳) مصرین

(۱) متقین: کو اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب عطاء کرنے کا اور مغفرت کرنے کا اپنے فضل و کرم سے وعدہ کر رکھا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا ﴿وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر احسان کرنے والوں کا۔

(۲) ثابتین: یعنی توبہ کرنے والوں سے رب تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مغفرت کا اور جنت عطاء کرنے کا وعدہ فرمایا۔ جس کا ذکر اس ذریعہ بحث آیت کریمہ اور اس سے پچھلی آیت کریمہ میں ہے۔

(۳) مصرین: یعنی گناہوں پر اصرار کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس میں دو مذہب ہیں۔

ایک مذہب یہ ہے:

ان غیر المصرین تغفر ذنوبهم ويدخلون الجنة واما الهاتدل علی ان المصرین لا تغفر ذنوبهم ولا يدخلون الجنة كما زعمه البعض

یعنی بعض لوگوں نے یہ کہا کہ جب رب تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ توبہ کرنے والوں سے فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمایا ”وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا“ کہ وہ اپنے برے افعال پر اصرار نہ کریں یعنی گناہوں پر جسے نہ رہیں تو رب تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا تو اس سے پتہ چل گیا کہ جو گناہوں پر اصرار کریں گے تو ان کے گناہوں کو رب تعالیٰ نہیں بخشنے گا اور نہ ہی ان کو جنت میں داخل کرے گا

یہ مذہب صحیح نہیں: علامہ آلوسی رحمہ اللہ سے رد فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

كما زعمه البعض فلا، لان السكوت عن الحكم ليس بيانا لحكمهم عند بعض

بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والوں کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے ان کا یہ گمان درست نہیں، اس لئے کہ بعض محققین نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک حکم بیان کر دیا جائے دوسرا نہ بیان کیا جائے تو وہ بیان کئے جانے والے حکم سے خود بخود بیان نہیں ہو جاتا، گناہوں پر اصرار نہ کرنے والوں اور توبہ کرنے والوں کا حکم بیان



کر دیا گیا ہے کہ ان کی مغفرت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اور ان کو جنات عطاء فرمائے گا، لیکن اس سے اصرار کرنے والوں کا حکم خود بخود صادر نہیں ہوتا کیونکہ ان کے متعلق بیان ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے حکم سے سکوت کیا گیا ہے۔

**دوسرا مذهب:** یہی صحیح ہے کہ گناہوں پر اصرار کرنے والے اگر گناہوں کو جائز سمجھتے ہوں تو وہ کافر ہوں گے اور ان کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ جنت میں بھی داخل ہوں گے اور اگر وہ گناہوں کو گناہ ہی سمجھتے ہوئے غلطی سے گناہوں پر اصرار کرتے ہوں، ان گناہوں پر جے ہوئے ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہیں رب تعالیٰ چاہے تو ان کو اپنے فضل سے معاف کر دے اور چاہے تو ان کو گناہوں کا عذاب دے دے۔

**تفضل کی دو قسمیں ہیں:**

ایک قسم یہ ہے کہ وہ عمل پر مرتب ہوتا ہے جیسا کہ کھانے پر سیر ہونا مرتب ہوتا ہے اس کا نام اجر و جزاء ہے۔

**تفضل کی دوسری قسم:**

هو محض التفضل حقيقة واسما“ وہ فقط مہربانی ہے حقیقہ بھی اور نام کے لحاظ سے بھی صرف رب کا فضل اور مہربانی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا کبیرہ گناہوں کا معاف کرنا اور جنت میں اللہ تعالیٰ کا اپنا دیدار سے مشرف فرمانا جو بھی اس کی شان کی لائق ہوگا اس دیدار کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا یہ سب عمل کے بغیر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوگا اس کا نام ہی عفو، کرم، تفضل اور مہربانی ہے اسے اجر و ثواب نہیں کہا جاسکتا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

**نکتہ:** ”ونعم اجر العاملين“ لان المتدارك كالعامل لتحصل بعض مافوت على نفسه وكم بين المحسن والمتدارك والمحبوب والاجير ولعل تبديل لفظ الجزاء بالاجر لهذه النكتة“ (بیضاوی)

اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ اور اچھا ہے اجر (نیک) عمل کرنے والوں کا، گناہوں سے توبہ کر کے اپنی تقصیر کا تدارک کرنے والے ایسے ہی ہیں جیسے اپنی ذاتی کوئی چیز فوت ہو جائے تو اسے حاصل کر لے۔ ابتدائی طور پر احسان کرنے والے، اور غلطیوں کا تدارک کرنے والوں میں بہت بڑا فرق ہے اور رب تعالیٰ کی رضا کیلئے عمل کرنے والے رب تعالیٰ کے محبوب بن جاتے ہیں، اور جنت کیلئے عمل کرنے والے اجر (مزدور) کے درجے میں ہوتے ہیں، ان دونوں میں بھی بہت بڑا فرق ہے، اسی نکتہ کیلئے جزاء کے بعد اجر ذکر کیا کہ ان کا عمل ہی حصول جنت کیلئے ہے تو ان کی جزاء حقیقت میں اجر کا درجہ رکھتی ہے۔



قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ  
الْمُكَذِّبِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۳۷)

(۱) تم سے پہلے کچھ طریقے برتاؤ میں آچکے ہیں تو زمین میں چل کر دیکھو، کیسا انجام ہے جھٹلانے والوں کا۔ (کنز الایمان)

(۲) تحقیق گزر گئے تم سے پہلے طریقے، تو چلو زمین میں تو دیکھو کیسے ہوا انجام جھٹلانے والوں کا۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

پچھلی آیہ میں اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا ذکر ہے جو طاعت پر اور معصیت سے توبہ پر مغفرت اور جنت عطاء کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، اب اس آیہ کریمہ میں فعل طاعت پر اور گناہوں سے توبہ کرنے پر ابھارا گیا ہے ”وہو تأمل احوال القرون الخالية من المطيعين والعاصين“ وہ ہے گزرے ہوئے لوگوں کے احوال میں غور و فکر کرنا، یعنی مطیع اور عاصی لوگوں کی حالات میں غور و فکر کرو تا کہ تمہیں طاعت کرنے اور گناہ سے بچنے یا گناہ سے توبہ کرنے کا پتہ چل جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿قَدْ خَلَتْ﴾ (تحقیق گزر گئے)

واحدی نے بیان کیا ہے کہ لغت میں ”الخلو“ کا معنی ہے ”انفراد“ وہ مکان جو خالی ہو رہے والوں سے مفرد ہوا ہے ”المكان الخالي“ کہا جاتا ہے۔ اور گزرے ہوئے زمان پر بھی بولا جاتا ہے، کہا جاتا ہے ”الزمان الخالي“ گذرا ہوا زمانہ“ کیونکہ وہ بھی اب موجود نہیں۔ موجود ہونے سے خالی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ”الامم الخالية“ گزری ہوئی قومیں۔ ”سنن جمع ہے ”سنة“ کی، ”واما السنة فهي الطريقة المستقيمة“ سنت ایک جاری طریقہ کو کہا جاتا ہے۔ اور وہ مثال جو جاری ہوا سے بھی سنت کہا جاتا ہے۔

اس لفظ کے اشتقاق میں چند وجوہ ہیں:

(۱) یہ وزن ہے ”فعلة“ کا، لیا ہوا ہے ”سن الماء سنة“ سے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب پانی لگا تار گرایا جائے۔ ”السن الصب للماء“ پانی کے بہانے کو ”السن“ کہا جاتا ہے۔ عرب حضرات جاری پانی سے



جاری راستہ کو تشبیہ دے کر ”الطريقة المسنونة“

(۲) یا ماخوذ ہے ”سن الرمح“ سے نیزے کو پھل لگانا۔ ”سن الاسنان“ دانتوں میں سواک کرتا۔ ”استسن“ عمر رسیدہ ہونا ”حماً مسنون“ بدبودار مٹی ”الفعل المنسوب الى النبي ﷺ سمي سنة“ نبی کریم ﷺ کے فعل کو سنت کہا جاتا ہے یہ معنی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ (ماخوذ از کبیر المنجد)

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ان الفاظ مبارکہ سے مراد یہ ہے ”قَدْ انْقَضَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنُ اللہ تعالیٰ فی الامم السالفة“ تحقیق گزر گئے تم سے پہلے اللہ تعالیٰ کے طریقے تم سے پہلے گزری ہوئی امتوں میں، (کبیر)

”قبل سنن“ ای ”امم“ و ”السنة الامة“ بعض حضرات کا قول ہے کہ ”سنة“ کا معنی ”امت“ ہے۔ ”سنن“ جمع ہے ”سنة“ کی اسلئے ”سنن“ کا معنی ہے ”امتیں“ اب ”قَدْ انْقَضَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنُ“ کا مطلب یہ ہو گیا تحقیق گزر گئیں تم سے پہلے امتیں۔ سنن کا معنی ”امتیں“ جو لیا گیا ہے، وہ ایک شاعر کے شعر سے لیا گیا ہے کسی شاعر نے کہا۔

ما عاين الناس من فضل كفضلكم ولا راوا مثلكم في سالف السنن

لوگوں نے تمہارے فضل جیسا کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے دیکھا تمہارے جیسے گزری ہوئی امتوں میں۔ اس شعر میں ”سنن“ کو ”امم“ (امتیں) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (ماخوذ از معالم التنزيل للبغوي)

پہلے طریقے، یا پہلی امتیں گزر گئیں اس سے مراد کیا ہے؟

اس مسئلہ میں دو قول ہیں، فالاکثرون من المفسرين على ان المراد سنن الهلاك والاستئصال“ بدلیل قولہ تعالیٰ ﴿فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِبِينَ﴾ ایک قول اس میں اکثر مفسرین کا ہے کہ مراد ”سنن“ سے ان کی ہلاکت اور بربادی ہے یعنی تم سے پہلے امتوں کی ہلاکت اور تباہی اور بربادی گزر چکی ہے، یہ معنی ان الفاظ مبارکہ سے سمجھا رہا ہے ﴿فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِبِينَ﴾ (تو دیکھو کیسے ہوا انجام جھٹلانے والوں کا) یعنی انہوں نے دنیا کی حرص اور دنیا کی طلب کیلئے انبیاء کرام اور رسولوں کی مخالفت کی، پھر وہ تباہ و برباد ہو گئے ان کی دنیا کے اثرات ختم ہو گئے، ”وبقى اللعن فى الدنيا والعقاب فى الآخرة عليهم“ اور ان پر دنیا میں لعنت باقی رہی اور آخرت میں ان کو عذاب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو پہلے لوگوں کے حالات میں غور و فکر کرنے کی رغبت دلائی کہ ان کے حالات میں غور و فکر کر کے ایمان پر قائم رہو اور دنیا کی ریاست اور دنیاوی جاہ و جلال سے اعراض کر لو، دوسرا قول اس



مسئلہ میں مجاہد رحمہ اللہ کا ہے ”وقال مجاهد بل المراد سنن الله تعالى في الكافرين والمؤمنين“ کہ ”سنن“ سے مراد پہلی امتیں ہیں مطلقاً، یہ کافروں اور مؤمنوں دونوں کو شامل ہے، دنیا نہ مؤمنوں کے ساتھ قائم رہی اور نہ ہی کافروں کے ساتھ رہی، البتہ مؤمنوں کی اچھی تعریف دنیا میں قائم و دائم ہے، اور آخرت میں ان کو بہت بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ اور کافروں پر دنیا میں لعنت قائم رہے گی، اور آخرت میں وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

پہلے قول پر دلیل یہ قائم کی گئی ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ تو دیکھو کیسا ہے انجام جھٹلانے والوں کا“ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی کافروں امتوں کے احوال میں غور و فکر کا حکم دیا گیا ہے، تو اس کا جواب دوسرے قول والوں نے یہ دیا ہے ”ثم انه تعالى قال “فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ“ لان التامل في حال احد القسمين يكفي في معرفة حال القسم الآخر“ کہ مراد تو عام ہے کہ پہلے گزرے ہوئے مؤمنوں اور کافروں دونوں کے احوال میں غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ذکر صرف ایک فریق کا بظاہر نظر آتا ہے کہ حکم دیا گیا تو دیکھو تم انجام جھٹلانے والوں کا“ لیکن ایک فریق کے ذکر اور اس کے احوال میں تامل کرنے سے دوسرے فریق میں تامل کرنے کا حکم خود بخود پتہ چل جاتا ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کے اس قول پر درمنثور میں ایک روایت مذکور ہے۔

✽ اخراج عبدین حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن مجاهد فی قوله

”قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ“ یعنی تداول من الکفار والمؤمنين فی الخیر والشر“

عبد بن حمید اور ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

ارشاد گرامی ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ کا مطلب یہ ہے، کہ آگے پیچھے گزر جانے والے مؤمنین

کے خیر کے حالات اور کفار کے شر کے حالات کو دیکھو۔ (منقول از درمنثور)

راقم کا اپنا موقف تو اگرچہ پہلے قول سے متفق ہے جو اکثر مفسرین کرام کا ہے، تاہم حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ کے ترجمہ میں بریکٹ میں الفاظ بڑھا کر اور تفسیر میں دوسرے قول کو ترجیح دی گئی۔

ضیاء القرآن میں ترجمہ یوں پیش کیا گیا ”گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج و زوال کے قاعدے پس سیر کرد زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔ تفسیریوں کی گئی ”سنن“ جمع ہے سنت کی، اور سنت وہ راستہ ہے جو شاہراہ عام ہو، وہو طرز زندگی ہے جس کا ہمیشہ التزام اور پابندی کی جائے، غزوہ احد کی تکلیفات، بدر کی فتح مبین، سود خواری کے نقصان عظیم اور مرد مومن کی صفات کا ذکر فرمانے کے بعد بتایا جا رہا ہے کہ زمین کے اس کھلے ہوئے صفحہ پر تم سے پہلے گزری ہوئی اقوام کے حالات جلی قلم سے مرقوم ہیں، تم انہیں پڑھ لو، فتح و سرخروئی کی عزت انہیں دی گئی جو ان صفات کے مالک تھے اور ناکامی و ذلت انہیں



کے حصہ میں آئی جو ان سے محروم تھے، قدرت کے قوانین یکساں اور اٹل ہیں، کسی کیلئے انہیں توڑا نہیں جاتا۔  
(ضیاء القرآن)

اصل مقصود عبرت پکڑنا ہے:

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ”فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا“ میں چل کر ہی پہلے لوگوں کے حالات دیکھنا لازم نہیں۔ ”بل المقصود تعرف احوالهم، فان حصلت هذه المعرفة بغير المسير في الارض كان المقصود حاصلًا“ بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم ان کے احوال کو پہچانو، اگر تمہیں چلنے کے بغیر ہی پہلے لوگوں کے حالات کا پتہ چل جائے تو مقصد حاصل ہو گیا۔ یعنی پہلے لوگوں کے حالات کو دیکھ کر، ان کے حالات کو سن کر، ان کے حالات کو کتابوں میں پڑھ کر عبرت حاصل ہو گیا، ہاں البتہ یوں کہا جاسکتا ہے۔

”ان المشاهدة آثار المتقدمين اثر القوي من اثر السماع“ کہ چل کر جانا ان اجڑی بستیوں کو دیکھنا، ان کی قبروں اور بوسیدہ ہڈیوں کو دیکھنا یہ زیادہ قوی ہے نسبت سننے کے، لہذا رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ”فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ“ یقیناً اسی فائدہ پر مرتب ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی۔  
”شنیدہ کے باشد مثل دیدہ“

سنی ہوئی باتوں میں وہ اثر نہیں جو دیکھی ہوئی میں ہے۔

ان آثارنا تدل علينا فانظروا بعدنا الى الآثار  
ہم پر ہمارے آثار (نشانات) ہم پر دلالت کر رہے ہیں ہمارے بعد ہمارے نشانات کو دیکھنا  
(ماخوذ از کبیر بوضاحت)

یعنی شاعر نے بھی حالات، علامات، نشانات کو دیکھنے کا حکم دیا۔  
**اعتراض:** رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے ”فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ“ تو رب تعالیٰ کے امر کو ماننا ضروری ہے، یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ مقصود عبرت پکڑنا ہے خواہ دیکھ کر، خواہ سن کر، خواہ کتب میں پڑھ کر عبرت حاصل کر لے،  
**جواب:** ”امر ندب لا علی سبیل الوجوب بل المقصود تعرف احوال الماضين“

کہ یہ امر استحبابی ہے، وجوبی نہیں۔ مقصد پہلے لوگوں کے حالات کو پہچاننا ہے، خواہ کسی طرح بھی پہچان لے۔  
(غازن بوضاحت)

**فائدہ:** وفيه ايضاً جرح للكافرين عن كفره لانه اذا تأمل احوال الكفار واهلاكهم

صار ذلك داعياً له الى الايمان

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِبِينَ﴾ سے کافروں کو بھی



زجر (ڈانٹ ڈپٹ) کی گئی کہ تم بھی اپنے سے پہلے کفار کے احوال اور ان کی بربادی کو دیکھو، اس میں غور و فکر کرہ، اگر تم نے ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر، ان کے احوال میں نظر کی تو تمہیں بھی عبرت حاصل ہوگی کہ تمہیں ایمان کی طرف آنے کی یہ دعوت ہوگی۔ (خازن)



هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ (آیہ نمبر ۱۳۸)

(۱) یہ لوگوں کو بتانا اور راہ دکھانا اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہے۔ (کنز لایمان)

(۲) یہ بیان ہے لوگوں کیلئے۔ اور ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿هَذَا﴾ ای القرآن او قوله قد خلت او مفهوم قوله فانظروا (بَيَانٌ لِلنَّاسِ) عامۃ (هَذَا) من الضلالة (وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ) خاصۃ فانهم هم المنتفعون به (مظہری)

”هَذَا“ کا ارشاد یا قرآن پاک کی طرف ہے، یا ”قَدْ خَلَّتْ“ کی طرف ہے، یا ”فَانْظُرُوا“ کے مفہوم کی طرف ہے یعنی یہ ہے کہ اے لوگو تم پہلے لوگوں کے حالات کو دیکھو گے تو یہ تمہارے لئے بیان ہوگا۔ ﴿بَيَانٌ لِلنَّاسِ﴾ سے پتہ چلا کہ یہ حکم عام ہے مومنوں اور کافروں کو، ﴿هَذِي وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾ یہ ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ یہ حکم پرہیزگاروں کیلئے خاص کیا گیا، کیونکہ اس سے نفع پرہیزگاروں نے ہی حاصل کیا ہے۔

بیان و ہدایت و موعظت میں فرق:

(۱) ایک وجہ فرق یہ ہے کہ ”بَيَانٌ“ اس دلالت و راہنمائی کو کہتے ہیں جو شبہات حاصل تھے ان کو زائل اس کے ذریعے زائل کر دیا جائے۔

ہدایت: سیدھی راہ کا بیان ہے کہ اس راہ پر چل کر بھٹکنے سے بچ جائے۔

موعظت: اس کلام کو کہا جاتا ہے جس میں دین کے خلاف راہ پر چلنے سے زجر پائی جائے۔ یعنی کلام میں ڈانٹ ڈپٹ ہو، اور زور پایا جائے تاکہ وہ غیر شرعی راہ پر چلنے سے رک جائے۔

”فالحاصل ان البیان جنس جنس تحتہ نوعان، احدهما الکلام الہادی الی ما ینبغی فی الدین وهو الہدی، الثانی الکلام الزاجر عما لا ینبغی فی الدین وهو الموعظة“



حاصل یہ ہے کہ بیشک بیان جنس (عام) ہے۔ اور اس کے نیچے دونوں ہیں۔ ایک وہ کلام ہے جو ہدایت ہے دے اس راہ پر چلنے کی جو دین میں پسندیدہ ہے اسے ہدایت کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ کلام ہے کہ جس سے روکا جائے ایسی راہ سے جو دین میں پسندیدہ نہیں۔ اسے موعظت کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ ”ان البیان هو الدلالة، واما الهدى فهو الدلالة بشرط كونها مفضية الى الاهتداء“ بیان مطلقاً دلالت (راہنمائی) کو کہتے ہیں۔ لیکن ہدایت وہ دلالت ہے جو اس ہدایت کو قبول کرنے کی طرف پہنچاتے۔

**مقام توجہ:** ایک وجہ تو تفسیر مظہری سے بیان کی جا چکی ہے کہ ”بیان عام ہے لوگوں کیلئے“ اور ہدایت اور موعظت خاص ہیں متقین کیلئے۔ کیونکہ ہدایت کا جب مطلب ہی یہ ہے کہ جسے ہدایت دی جائے وہ اسے قبول کر لے، اور موعظت کا جب مطلب ہی یہ ہے کہ جب کسی کو غیر شرعی کاموں سے روکا جائے تو وہ رک جائے یہ حاصل ہی صرف متقین کو ہے۔

”لیکن دوسری وجہ“ یہ بیان کی گئی کہ بیان، ہدایت اور موعظت سب کا تعلق متقین سے ہے ﴿لِلنَّاسِ﴾ میں بھی الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ یعنی یہ قرآن بیان ہے خاص لوگوں کیلئے یعنی وہی خاص لوگ پر ہیزگار ہیں جو قرآن پاک کے بیان سے ہدایت اور موعظت حاصل کرتے ہیں۔ یہی مفہوم ﴿إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ﴾ آپ ڈرائیں ان کو جو تمہاری نصیحت کو قبول کریں۔

اور آیت ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ ”بیشک اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں“ بھی اسی مضمون کو واضح کر رہی ہے۔  
(ماخوذ از کبیر)





وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۳۹)

(۱) اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تم غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔ (کنز الایمان)

(۲) اور نہ کمزور دل ہو جاؤ، اور نہ غم کرو، حالانکہ تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

مختصر تفسیر لیکن جامع:

(وَلَا تَهِنُوا) ای ولا تضعفوا فی انفسکم لتفتقروا الی اتخاذهم بطانة ومنشأ هذا الضعف الحزن من اذياتهم (وَلَا تَحْزَنُوا) اذلا تصل اذياتهم الی اتلافکم بل هم التالفون (وانتم الاعلون) ای الاغلبون لكن انما تغلبون (ان کنتم مؤمنین) مخلصین لانه انما وعد النصر للمؤمنین“ (تفسیر تبصیر الرحمن)

اور نہ کمزور دل ہو جاؤ کہ تمہیں محتاجی حاصل ہو کافروں کو رازدار بنانے کی، اس کمزور دلی کی وجہ ان کی طرف سے اذیتیں (مکالیف) حاصل ہونا جو غم میں ڈالنے کا سبب بنتی ہیں، اور غم نہ کرو اس لئے کہ ان کی طرف سے کوئی اذیت (تکلیف) تمہیں نہیں پہنچے گی جو تمہیں ہلاکت میں ڈالے، بلکہ وہ ہی مٹ جائیں گے، اور تم ہی غالب رہو گے، لیکن تمہیں غلبہ اسی وقت حاصل رہے گا جب تم مخلص مؤمن ہو گے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ مخلص مؤمن کو ہی امداد پہنچانے کا ہے، واہم نے ”وَلَا تَهِنُوا“ کا ترجمہ (اور نہ کمزور دل ہو جاؤ) یہ تفسیر تبصیر الرحمن کے ان تفسیری الفاظ سے لیا ہے ”ولا تضعفوا فی انفسکم“ اور ”وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ“ کا ترجمہ واہم نے کیا ہے، حالانکہ تم ہی غالب ہو گے، یہ ترجمہ تفسیر ابی السعود کے ان الفاظ سے لیا ہے (وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ) جملہ حالیہ من فاعل الفعلین ای والحال انکم الاعلون الغالبون یعنی ”وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ“ جملہ حالیہ ہے، جو دونوں فعلوں یعنی ”وَلَا تَهِنُوا“ اور ”وَلَا تَحْزَنُوا“ کے فاعل سے، اب معنی یہ ہو گیا ”اور نہ کمزور دل ہو جاؤ اور نہ غم کرو حالانکہ تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ ماقبل سے تعلق:

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک آیہ کریمہ میں ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ذکر فرمایا، اور دوسری آیہ کریمہ میں بیان فرمایا ﴿هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ﴾ تو پچھلی دونوں آیتیں، اس آیہ کریمہ ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا﴾ کیلئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اب ان تینوں آیتوں کا مفہوم ہو گیا۔



”اذا بحثتم عن احوال القرون الماضية علمتم ان اهل الباطل وان افقت لهم الصولة لكن كان مآل الامر الى الضعف والفتور، وصارت دولة اهل الحق عالة وصوله اهل الباطل مندرسة“

جب تم پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات کی تفشیش کر لو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ بیشک باطل راہ پر چلنے والوں کو اگر چہ وقتی طور پر دبدبہ بھی حاصل ہو، لیکن انجام ان کا بزودی اور ان کا نقصان اور تباهی ہے، حق راہ پر چلنے والوں کو بلندی حاصل ہوتی ہے اور باطل راہ پر چلنے والے مٹ کر رہتے ہیں لہذا اے مومنو! حد کے مقام پر وقتی طور پر جو دبدبہ حاصل ہو گیا وہ تمہارے دلوں کو کمزور نہ کرے، اور تمہیں بزدل نہ بنا دے، اور تمہیں عاجز نہ کر دے، بلکہ ضروری ہے کہ جس طرح تمہارے دل پہلے سے مضبوط اور قوی آرہے ہیں، اب بھی اسی طرح تم قوی دل اور مضبوط دل ہو کر رہو ”فان الاستعلاء سيحصل لكم والقوة والدة راجعة اليكم“ بیشک غلبہ تمہیں ہی حاصل ہونا ہے، قوت و مضبوطی اور بلند بخت تمہاری طرف ہی لوٹ کر آنے ہیں۔ (کبیر)

### شان نزول کے متعلق روایات:

❖ اخرج ابن جرير عن الزهري قال كثر في اصحاب محمد ﷺ القتل والجرح حتى خلع الى كل امرئ منهم لباس فانزل الله القرآن فآسى فيه بين المؤمنين باحسن ما آسى به قوما كانوا قبلهم من الامم الماضية فقال ولا تهنوا ولا تحزنوا الى قوله لبرز الدين كتب عليهم القتل الى مضاجعهم“

ابن جریر کی زہری سے روایت ہے کہ احد کے مقام میں کثیر تعداد میں صحابہ کرام شہید ہو گئے اور زخمی ہو گئے، مسلمانوں کے دل پر ایک عجیب پریشانی کی کیفیت طاری ہو گئی تو رب تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تسلی دی جو نسبت پہلی تسلی یعنی گزرے ہوئے لوگوں کے حالات کو دیکھنے کی رغبت دلانے سے بھی زیادہ اچھی تسلی ہے، یعنی تسلی دینے کیلئے ہی اللہ تعالیٰ نے ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا﴾ سے لے کر ﴿لَبَرَزَ الدِّينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ﴾ آیات نازل فرمائیں۔ (منقول از درمنشور)

❖ واخرج ابن جرير من طريق العوفي عن ابن عباس قال اقبل خالد بن الوليد يريد ان يعلو عليهم الجبل فقال النبي ﷺ اللهم لا يعلون علينا فانزل الله وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“

ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو نقل کیا کہ خالد بن ولید (جو احد میں کافر تھا) پہاڑ پر



چڑھ کر مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی اے اللہ ان کو ہم پر غلبہ نہ دے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔ (منقول از درمنثور)

☆ واخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن جريج قال انهزم اصحاب رسول الله ﷺ في الشعب يوم احد فسألوا ما فعل النبي ﷺ وما فعل فلان فنعي بعضهم لبعض وتحدثوا ان النبي ﷺ قتل فكانوا في هم وحزن فبينما هم كذلك علا خالد ابن الوليد بخيل المشركين فوقهم على الجبل وكان على احد مجبتي المشركين وهم اسفل من الشعب فلما راوا النبي ﷺ فرحوا فقال النبي ﷺ اللهم لا قوة لنا الا بك وليس احد يعبدك بهذا البلد غير هؤلاء النفر فلاتهلكهم وثاب نفر من المسلمين رماة فصعدوا فرموا خيل المشركين حتى هزمهم الله وعلا المسلمون الجبل فذلك قوله وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين“

ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج کی روایت کو نقل کیا کہ صحابہ کرام احد میں وقتی طور پر پسپا ہو گئے، نشیبی وادیوں میں چلے گئے، ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، نبی کریم ﷺ کا کیا حال ہے، فلاں صحابی کا کیا حال ہے، فلاں کا کیا حال ہے، تو بعض صحابہ نے دوسرے بعض صحابہ کرام کے شہید ہو جانے کی خبر دی اور یہ خبر بھی ملی کہ نبی کریم ﷺ بھی شہید ہو گئے، تو صحابہ کرام بہت زیادہ غم اور حزن میں مبتلا ہو گئے، صحابہ کرام اسی پر پریشانی کے حال میں تھے، خالد بن ولید مشرکین کے لشکر کے ایک جانب دائیں یا بائیں (یعنی مینہ یا میسرہ) پر امیر مقرر تھا، اس نے مشرکین کی ایک جماعت کو ساتھ لیا پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا ارادہ کیا جبکہ صحابہ کرام وادیوں کے نشیبی علاقہ میں تھے، صحابہ کرام نے جب نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ صحیح سلامت ہیں تو وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، غم جاتا رہا، ادھر نبی کریم ﷺ دعاء فرما رہے تھے ”اے اللہ تیرے بغیر ہمیں کوئی قوت حاصل نہیں، اس شہر میں اے اللہ ان چند لوگوں کے بغیر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں، اس لئے اے اللہ تو ان کو ہلاکت میں نہ ڈال (صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کو صحیح سلامت دیکھ کر خوش ہوئے تو ان کے جنگی جذبات ابھر گئے، ادھر مصطفیٰ ﷺ کی دعاء کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا) تو صحابہ کرام کے تیر اندازوں کی ایک جماعت واپس لوٹ آئی، انہوں نے ایک بلند مقام سے مشرکوں پر تیر اندازی شروع کر دی، اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو ٹھکست دے دی، مشرک بھاگ پڑے، اور مسلمانوں نے پہاڑ پر قبضہ کر لیا، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (اور تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو) آب و تاب سے جگمگانے لگا۔ (منقول از درمنثور)



کچھ ذکر احد کا تیسرے پارہ میں گزر گیا اور کچھ آنے والی آیات میں (لَمَّا) آجائے گا۔

**تنبیہ:** روایات میں تطبیق دینے کیلئے راقم نے ”علا خالد ابن الولید“ کا ترجمہ کیا ہے خالد بن ولید نے پہاڑ پر چڑھنے کا ارادہ کیا، اور اگر ظاہری الفاظ کو دیکھ کر یوں معنی کیا جائے کہ ”خالد بن ولید اپنے ساتھ مشرکوں کی ایک جماعت کو لے کر پہاڑ کے اوپر چڑھ گیا“ اب مطلب یہ ہو گیا کہ مسلمانوں نے مشرکین کو بلند مقام سے تیر اندازی کے پہاڑ سے نیچے دھکیل دیا، اور خود پہاڑ پر قابض ہو گئے۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

”اعلون“ اصل میں ”اعلوون“ ہے واؤ تیسری جگہ سے چوتھی جگہ آگئی، ما قبل کی حرکت مخالف ہے، واؤ کو یاء سے تبدیل کیا، یاء متحرک ما قبل مفتوح یاء کو الف سے تبدیل کیا، الف اور واؤ کے درمیان التقاء ساکتین ہو گیا، الف کو حذف کر دیا ”اعلون“ ہو گیا۔

﴿وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ﴾ میں چند وجوہ:

(۱) ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے بیشک تمہارا حال اعلیٰ ہے ان کے حال سے قتل میں، یعنی احد میں بظاہر جو تمہیں تکلیف پہنچی (حقیقت میں کوئی تکلیف نہ تھی کیونکہ شہادت سے حیات جاودانی حاصل ہو گئی) کافروں کو بدر میں اس کی بنسبت دو گنی تکلیف پہنچی، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلِهَا﴾ کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو اس سے دو گنی) (اس آیت کی تفصیل اسی کی وضاحت میں ان شاء اللہ آجائے گی)

(۲) اولان قتالکم اللہ و قتالہم للشیطان ”مومنوں کے غلبہ کی اور وجہ یہ ہے کہ ان کا قتال یعنی جہاد اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور کافروں کی جنگ شیطان کیلئے ہے، یہی وجہ ہے کہ مومن جنگ میں قتل کر دیا جائے تو وہ شہید ہے اسے جاودانی زندگی حاصل ہو گئی، اسے مردہ کہنا بلکہ اسے مردہ گمان کرنا بھی ناجائز ہے، اور کافر جنگ میں قتل کر دیا جائے تو مردود مر گیا، نیست و نابود ہو گیا، اسے کچھ منصب حاصل نہ ہوا۔

(۳) اولان قتالہم للدين الباطل و قتالکم الدين الحق ”اور وجہ تمہارے بلند ہونے کی یہ ہے کہ کافروں کا دین باطل ہے وہ اسی کیلئے لڑائی کرتے ہیں، اور تمہارا دین حق ہے، تمہاری لڑائی دین حق کیلئے ہے، دین حق کیلئے



لڑائی حقیقت میں بلندی ہی ہے۔

(۴) ”والمراء وانتم الاعلون بالحجة والتمسک بالدين والعاقبة الحميدة“  
اور مراد یہ ہے کہ تمہیں دلائل اور دین کے ساتھ تمسک (یعنی دین حق پر قائم رہنے) اور اچھا انجام حاصل ہونے کی وجہ سے بلندی حاصل ہے۔

(۵) یعنی ان یكون المعنى وانتم الاعلون من حيث انكم في العاقبة تظفرون بهم وتستولون عليهم“

اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں آخرت میں کافروں پر بلندی حاصل ہوگی، اس لئے کہ تمہیں ان پر غلبہ حاصل ہوگا، اور تمہیں کامیابی حاصل ہوگی، وہ خسارے میں ہوں گے۔

﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ ”اگر تم ایمان رکھتے ہو“

اس میں بھی چند وجوہ ہیں۔

(۱) الاول وانتم الاعلون ان بقيتم على ايمانكم، والمقصود بيان ان الله تعالى انما تكفل باعلاء درجاتهم لأجل تمسكهم بدين الاسلام“

ایک وجہ ان میں سے یہ ہے کہ تم ہی بلند رہو گے اگر تم اپنے ایمان پر قائم رہے، سب سے مقصود وجہ ہی یہ ہے باقی وجوہ ضمنی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں بلند درجات اسی لئے عطا فرمائے گا کہ تم دین اسلام پر قائم رہو، یعنی دین اسلام پر قائم رہنا تمہاری بلندی کا سبب ہے۔

(۲) والثالث وانتم الاعلون فكونوا مصدقين لهذه البشارة ان كنتم مصدقين بما يعدكم الله ويشرکم به من الغلبة“

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم ہی بلند ہو گے تم اس بشارت کی تصدیق کرنے والے رہو، یعنی اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور اس کی بشارت پر یقین رہا اور اس کی تمہیں تصدیق رہی تو تمہیں غلبہ بھی حاصل رہے گا، اصل اس وجہ کی دادرمدار بھی تصدیق پر ہے، اور تصدیق ہی ایمان ہے۔

(۳) والثالث التقدير ”وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ فان الله تعالى وعد بنصرة هذا الدين فان كنتم من المؤمنين علمتم ان هذه الواقعة لا تبقى بحالها، وان الدولة تصير للمسلمين والاستيلاء على العدو يحصل لهم“

اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ (تم کمزور دل نہ ہو جاؤ، اور نہ ہی غم کرو، اور بلند تم ہی ہو اگر تم ایمان رکھتے ہو) یعنی اللہ تعالیٰ نے اس دین کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا کہ اگر تم ایمان پر قائم



رہے تو اللہ تعالیٰ کی امداد تمہیں حاصل رہے گی، لہذا تم اس پر بھی یقین کر لو کہ احد میں جو وقتی طور پر کفار کو غلبہ حاصل ہوا، اس نے ہمیشہ قائم تو نہیں رہنا، کامیابی اور دشمن پر غلبہ تو مسلمانوں کو ہی حاصل رہتا ہے۔

(ماخوذ از کبیر)

اس آخری وجہ کو نظر میں رکھتے ہوئے احد کا نقشہ پھر سے ذہن میں لائیے تو مسئلہ نکھر کو سامنے آ جائے گا، کہ احد میں ابتدائی طور پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، یہاں تک کہ مال غنیمت جمع کرنا صحابہ کرام نے شروع کر دیا، پہاڑ کے درہ پر پچاس صحابہ کرام کو کھڑا کیا گیا تھا، ان کے اجتہاد میں خطا ہو گئی کہ وہ مسلمانوں کی کامیابی کو دیکھ کر درہ کو چھوڑ کر مال غنیمت کو جمع کرنے میں شریک ہو گئے، نبی کریم ﷺ نے تو انہیں کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا، آپ کے حکم کی انتظار کئے بغیر آپ یہاں سے ہٹ جانے کا حکم کب فرماتے ہیں، ان کا درہ کو چھوڑنا ان کے اجتہاد میں خطا ہوئی۔

رب تعالیٰ نے ان کو تھوڑی دیر کیلئے آزمائش میں ڈال دیا، کفار اس درہ سے پہاڑ کی پچھلی جانب سے آ کر مسلمانوں پر یکبارگی حملہ آور ہو گئے تو مسلمان ستر کی تعداد میں شہید ہو گئے، اور کچھ زخمی ہو گئے، لیکن جب مسلمانوں نے پہاڑ سے تیر اندازی کی تو کفار احد کے مقام کو چھوڑ کر بھاگ گئے، کفار کو شکست ہوئی، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ کی جلوہ گری واضح ہو گئی۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

حضور ﷺ کے عہد مبارک میں اور اس کے بعد جب بھی باطل سے صحابہ کرام کی جنگ ہوئی صحابہ ہی فتح یاب ہوئے، حتیٰ کہ ہر وہ لشکر جس میں ایک صحابی بھی شامل ہوا اس نے کبھی شکست نہیں کھائی، اور یہ صحابہ کرام کے مؤمن کامل ہونے کی دلیل ہے۔

(ضیاء القرآن)

ایمان کے بغیر مادی وسائل بے کار ہیں:

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان کو قوت دنیا کی ساری مادی قوتوں سے زیادہ توانا ہے، جس قوم کے افراد کے دلوں میں ایمان اور یقین کی شمع روشن ہوتی ہے دنیا کی کوئی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی، مادی وسائل بھی اسی وقت کارگر ثابت ہوتے ہیں جب ان کو استعمال کرے والا اپنے مقصد حیات پر محکم یقین رکھتا ہو۔ (ضیاء القرآن)

حالیہ دور میں افغانستان اور عراق میں مسلمان جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں، امریکہ جیسے سرمست ہاتھی سے ٹکرائے ہوئے ہیں، (اللہ) ایسا ہی بھاگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔



شہید ہونے والے مہاجرین صحابہ کرام کے اسماء گرامی:

احد میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے سز کی تعداد میں ان میں اکثریت انصار کی تھی مہاجرین پانچ تھے، حمزہ بن عبدالمطلب، مصعب بن عمیر نبی کریم ﷺ کے علمبردار، عبد اللہ بن جحش نبی کریم ﷺ کے پھوپھی کے بیٹے، عثمان بن شماس اور سعد جو کہ عتبہ کے غلام تھے۔  
(تفسیر ابی السعود رحمہ اللہ)



إِنْ يُمْسِكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُجِبُ الظَّالِمِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۲۰)

- (۱) اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی تو وہ لوگ بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں، اور یہ دن ہیں جن میں ہم نے لوگوں کیلئے باریاں رکھی ہیں، اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مرتبہ دے اور اللہ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔ (کنز الایمان)
- (۲) اگر پہنچی تمہیں کوئی تکلیف تو تحقیق پہنچ چکی ہے قوم کو تکلیف اسی کی مثل، اور یہ دن ہیں پھیرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کے درمیان، اور (اس لئے) تاکہ پہچان کرادے اللہ ایمان والوں کی، اور بنائے تم میں سے بعض کو شہید اور اللہ نہیں محبت رکھتا ظالموں سے۔ (نجوم الفرقان)

﴿إِنْ يُمْسِكُمْ قَرْحٌ﴾

القرح (بفتح القاف) زخم، پھوڑا، شدید خارش جو اونٹ کے بچوں کیلئے مہلک ہو، جمع قروح، القرح (بضم القاف) ہر چیز کا اول حصہ، کنواں کھودتے وقت پہلی مرتبہ جو پانی نکالا جائے، ہر مہینہ کے ابتداء کی تین راتیں، القرح بفتح القاف والراء اونٹ کو خارش ہونے کی حالت، قرحہ قرحاً (ف) زخمی کرنا، قرح البشر، اسی جگہ کنواں کھودنا جہاں پہلے نہ کھودا گیا ہو قرحہ بالحق، حق کے ساتھ استقبال کرنا، قرح فروحاً (ف) قرح قرحاً (س) الفرس، گھوڑے کے چاروں دانت لکنا، اقترح الخطبة ”فی البدیہ“ خطبہ دینا۔ (المنجد)



آیہ کریمہ میں دونوں قراءتیں ہیں، القرح بالفتح والضم لغتان كالضعف وقد فرئ بہما۔ ”القرح“ میں قاف کی زبر اور پیش دونوں لغتیں استعمال ہیں، جیسے ضعف میں ضاد پرزبر اور پیش دونوں طرح استعمال ہے، اسی طرح ”قـرح“ میں قاف پرزبر اور پیش دونوں جائز ہیں، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے ”وقیل ہو بالفتح الجراح وبالضم المہا“ اور فرق بھی بیان کیا گیا ہے، کہ جب زبر کے ساتھ استعمال ہو تو معنی ہوگا ”زخمی کرنا“ اور جب پیش سے استعمال ہوگا تو معنی ہوگا زخم کا درد اسی طرح تیسری قراءت قاف اور راء دونوں کی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

محرع، نکرہ ہے اسی لئے اہل حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ”کوئی تکلیف“ واہم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

﴿إِنْ يُمَسِّسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ﴾  
 ”اگر پہنچی تمہیں کوئی تکلیف تو تحقیق پہنچ چکی ہے قوم کو تکلیف اسی کی مثل۔“

”القوم“ معرفہ ہے، الف لام عہد خارجی ہے، قوم سے مراد کفار مکہ ہیں، یعنی اے مسلمانو! اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو قریش کی قوم کفار کو بھی اس سے پہلے اسی طرح تکلیف پہنچ چکی، اس میں مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی اور جہاد پر قائم رہنے کا بھی گویا کہ حکم دیا گیا ہے، اور مومن کو جہاد پر برائیجتہ بھی کیا گیا ہے، اس لئے کہ اگر قوم کی تکلیف سے مراد بدر کی تکلیف ہو تو مطلب یوں ہوگا۔

”والمعنى ان نالوا منكم يوم احد فقد نلتهم منهم قبله يوم بدر ثم لم يضعف ذلك قلوبهم ولم يشبطهم عن معاودتكم بالقتال فانتم احق بان لا تضعفوا فانكم ترجون من الله ما لا يرجون“

اگر احد کے دن کفار کو تم پر کچھ دیر کیلئے برتری حاصل ہوئی تو تحقیق تم بدر کے دن ان پر مکمل طور پر برتری حاصل کر چکے ہو، وہ کافر نہ کمزور دل ہوئے اور نہ ہی تمہارے ساتھ دشمنی کی وجہ سے جنگ سے رکے ہیں لہذا تم زیادہ حق رکھتے ہو کہ نہ ہی تم کمزور دل ہو جاؤ (اور نہ ہی جہاد سے دور ہونا) کیونکہ تم اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی امید رکھتے ہو، وہ کافر اس کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ (تفسیر ابی السعود)

اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو خطاب کیا گیا کہ اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچی ہے تو کافروں کو



اس سے پہلے احد میں تکلیف پہنچ چکی ہے، کیونکہ میں سے زائد کفار احد میں قتل ہو چکے تھے، ان کے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ کو بھی حضرت علی المرتضیٰ نے قتل کر دیا تھا۔  
(ماخوذ از تفسیر ابی السعود)

**اعتراض:** کفار تو میں پچیس کی تعداد میں مرے تھے، لیکن صحابہ کرام تو ستر کی تعداد میں شہید ہوئے تو ”قَرْحُ مِثْلُهُ“ (کفار کو اسی کی مثل تکلیف پہنچی) کہنا کس طرح صحیح ہے۔

**جواب:** يجب ان يفسر القرع في هذا التاويل بمجرد الانهزام لا بكثرة القتلى  
اس صورت میں ”قَرْحُ مِثْلُهُ“ کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں تکلیف پہنچی تو تم وقتی طور پر پسپا ہو گئے، ان کو تو پہلے بھی شکست ہوئی اور بعد میں بھی مکمل شکست ان کو ہی ہوئی کہ وہی میدان کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔  
(ماخوذ از کبیر)

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ ”اور یہ دن ہیں پھرتے ہیں ہم ان کو لوگوں کیلئے۔“  
**المداولة:** نقل الشئ من واحد الى آخر ”ایک چیز کو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کر دینے کو مداولہ کہا جاتا ہے، رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿لِكَيْلَا يَكُونَ دَوْلَةٌ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ (سورۃ الحشر، آیہ نمبر ۸)

(تاکہ مال) نہ پھیرتا رہے تمہارے غنیوں کے درمیان) ای تہ اولونھا ولا تجعلون للفقراء منها نصيبا ”ایسا نہ ہواے اغنیاء کہ تم آپس میں ہی ایک دوسرے کی طرف مال منتقل کرتے رہو کہ فقراء کا حصہ ہی اس میں مقرر نہ کرو، اسی طرح کہا جاتا ہے ”الدنیا دول“ دنیا ایک قوم سے دوسری کی طرف پھرتی رہتی ہے اب اس لغوی معنی کو سمجھنے کے بعد آیہ کریمہ کا معنی واضح ہو گیا۔

”والمعنى ان ايام الدنيا هي دول بين الناس لا يدوم مسارها ولا مضارها فيوم يحصل فيه السرور له والغم لعدوه ويوم آخر بالعكس من ذلك ولا يبقى شئ من احوالها ولا يستقر الر من آثارها“

کہ دنیا کے دن لوگوں میں پھرتے رہتے ہیں، نہ ہی ہمیشہ خوشی کے دن ہوتے ہیں، اور نہ ہی ہمیشہ غم کے کبھی ایک شخص کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمن کو غم لاحق ہوتا ہے، کبھی معاملہ اس کے الٹ ہوتا ہے کہ اسے غم لاحق ہوتا ہے اور اس کے دشمن کو خوشی حاصل ہوتی ہے، یعنی دنیا کے دنوں کے حالات میں بقاء نہیں اور نہ ہی ان کے اثرات میں قرار ہے۔  
(کبیر)

**انتباہ شدید:** واعلم انه ليس المراد من هذه المداولة ان الله تعالى تارة ينصر المؤمنين واخرى ينصر الكافرين وذلك لان نصرة الله منصب شريف واعزاز عظيم فلا يليق بالكافر بل المراد



من هذه المداولة انه تارة يشدد المحنة على الكفار واخرى على المؤمنين

آیہ کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی مومنوں کی امداد کرتا ہے اور کبھی کافروں کی امداد کرتا ہے، اس لئے کہ رب تعالیٰ کا امداد کرنا منصب شریف اور بہت بڑا اعزاز ہے، رب تعالیٰ اعلیٰ منصب اور بڑا اعزاز کافروں کو نہیں عطاء کرتا، ہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان دن پھیرتا رہتا ہے کہ کبھی کفار کو مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کو تکلیف دی جاتی ہے، اور کبھی مومنوں کو تکلیف دی جاتی ہے۔ (کبیر)

لوگوں میں دنوں کے پھیرنے کا فائدہ کیا ہے؟

اس میں چند وجوہ ہیں فائدہ کی۔

(۱) اگر ہمیشہ کافروں کو مشقت اور تکلیف میں ڈالا جاتا، اور مومنوں پر کوئی شدت نہ آتی، اور نہ ہی انہیں کوئی تکلیف دی جاتی۔

”لحصول العلم الاضطراری بان الايمان حق وما سواه باطل ولو كان كذلك ليطل التكليف والثواب والعقاب“

تو اس صورت میں اضطراری طور پر (بغیر سوچنے اور فکر کرنے کے) ایمان حاصل ہوتا کہ ایمان حق ہے، اور اس کے علاوہ سب کچھ باطل ہے، اضطراری ایمان کا نہ انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، اور نہ ہی اسے ثواب اور عذاب دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے کبھی محنت و مشقت مومنوں پر مسلط کی جاتی ہے اور کبھی کافروں پر

”لتكون الشبهات باقية والمكلف يدفعها بواسطة النظر في الدلائل الدالة على صحة الاسلام فيعظم ثوابه عند الله“

تاکہ شبہات باقی رہیں، اور عاقل بالغ انسان اسلام کے حق ہونے کے دلائل میں غور و فکر کر لے اور مشکوک و شبہات کو زائل کر لے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب دیا جائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مومن کی کبھی لغزشیں اور گناہ بھی ہوتے ہیں، اس لئے اسے مشقت و تکالیف میں مبتلا کیا جاتا ”فيكون عند الله تشديد المحنة عليه في الدنيا ادباً له“ تاکہ دنیا میں ہی اس کے بعض گناہوں کا کفارہ بن جائے اور اسے آخرت میں عذاب سے بچالیا جائے، مومن کا یہ اعزاز ہے اور اس کے ادب کا لحاظ کیا گیا ہے۔

سُبْحَانَ اللَّهِ! اے مومن ذرا تو اپنا مقام دیکھ کہ اللہ تعالیٰ بھی تیرے ادب کا لحاظ کرتا ہے۔ ”واما



تشدید المحنة علی الکافر فانه يكون غضبا من الله عليه“ لیکن کافروں کو محنت و مشقت میں ڈالنا ان کو ذلت میں ڈالنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر غضب مسلط ہے۔

(۳) دنیا کی لذتیں اور دنیا کی تکالیف اور درد ہمیشہ قائم نہیں رہتے بلکہ بدلتے رہتے ہیں اور اخروی نعمتیں اور سعادت (اجر و ثواب) ہمیشہ کیلئے قائم رہنے والے ہیں، انسان کو اس پر سوچنے اور فکر کرنے کی گویا کہ دعوت دی گئی کہ تو ذرا غور تو کر ”فان الله يميت بعد الاحياء ويسقم بعد الصحة فاذا حسن ذلك فلم لا يحسن ان يبدل السراء بالضراء“ کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے بعد موت عطاء کرتا ہے اور صحت کے بعد بیماری عطاء کرتا ہے جب یہ سب کچھ اچھا ہے تو یہ کیوں نہیں اچھا کہ وہ خوشی کو پریشانی سے بدل دے۔ (ماخوذ از کبیر)

دنوں کے پھیرنے اور کافروں کی ابتدائی شکست پر حدیث پاک:

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ بغوی رحمہ اللہ نے معالم التنزیل میں اور علامہ علاؤ الدین علی بن محمد المعروف بالحاظن نے تفسیر خازن میں بخاری کی یہ حدیث نقل فرمائی۔

حدثنا عبيد الله بن موسى عن اسرا ئيل عن ابي اسحاق عن البراء ؓ قال لقينا المشركين يومئذ واجلس النبي ﷺ جيشا من الرماة وامر عليهم عبد الله وقال لا تبرحوا ان رأيتمونا ظهرنا عليهم فلا تبرحوا وان رأيتموهم ظهرنا علينا فلا تعينونا فلما لقينا هربوا حتى رأيت النساء يشتددن في الجبل رفعن عن سوقهن قد بدت خلاخلهن فاخذوا يقولون الغنيمة الغنيمة فقال عبد الله بن جبير عهد الى النبي ﷺ ان لا تبرحوا فابوا فلما ابوا صرف وجوههم فاصيب سبعون قتिला واشرف ابو سفيان فقال افي القوم محمد فقال لا تجيبوه فقال افي القوم ابن ابي قحافة قال لا تجيبوه فقال افي القوم ابن الخطاب فقال ان هؤلاء قتلوا فلو كانوا احياء لأجابوا فلم يملك عمر نفسه فقال كذبت يا عدو الله ابقى الله عليك ما يحزنك قال ابو سفيان اعل هبل، فقال النبي ﷺ اجيبوه قالوا ما نقول؟ قال قولوا ”الله اعلى واجل“ قال ابو سفيان لنا العزى ولا عزى لكم فقال النبي ﷺ اجيبوه قالوا ما نقول؟ قال قولوا ”الله مولنا ولا مولى لكم“ قال ابو سفيان يوم بيوم بدر والحرب سجال وتجدون مثله لم آمر بها ولم تستوني“ (بخاری جلد کتاب المغازی، باب غزوه احد)



## ترجمہ بمع تشریح:

براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم اس دن (احد کے دن) مشرکوں سے ملے یعنی ان سے ہمارا مقابلہ کیلئے آنا سامنا ہوا، نبی کریم ﷺ نے (پہاڑ کے درہ میں) تیر اندازوں کا ایک لشکر بٹھایا، اور ان پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا یہ خوات بن جبیر بن نعمان کے بھائی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب ہو گئے تو پھر بھی تم نے ہٹنا نہیں، اور اگر تم ان (کافروں) کو دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے ہیں تو تم نے ہماری امداد نہیں کرنی، زہیر کی ایک روایت میں یوں مذکور ہے ”وان رأیتمونا نخطفنا الطیر“ اگر تم ہمیں اس حال میں دیکھو کہ ہمیں پرندے نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم نے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو مسند احمد اور طبرانی اور مستدرک حاکم میں ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں۔

”ان النبی ﷺ اقامہم فی موضع لم قال لہم احموا ظہورنا فان رأیتمونا نقتل فلا تنصرونا فان رأیتمونا قد غنمنا فلا تشرکونا“

بیشک نبی کریم ﷺ نے ان کو ایک جگہ پر کھڑا کیا، پھر ان کو فرمایا کہ تم ہماری پیٹھوں کی امداد کرنا یعنی ہم میدان جنگ میں کافروں کے مقابل ہوں گے اور تم یہاں ہی ہمارے پیچھے کھڑے رہنا، حضرت براء کہتے ہیں کہ جب ہمارا مقابلہ کافروں سے ہوا تو وہ شکست کھا کر بھاگ گئے، یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کو شدید بھاگتے ہوئے دیکھا جو پہاڑوں کی وادیوں کی طرف جارہی ہیں، دوڑتے ہوئے ان کی پازیبیں اور پنڈلیاں نظر آرہی تھیں، ایک روایت میں ہے

”یسندن“ بضم اولہ وسکون السین المهملة بعدہا نون مکسورة ودال مهملة ای یصعدن یقال اسند فی الجبل یسند اذا صعد“

”یسندن“ جس کا معنی ہے کہ وہ عورتیں بھاگ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ رہی تھیں ادھر پہاڑ کے درے میں کھڑے صحابہ کرام مسلمانوں کی فتح کو دیکھ کر ”الغنیمة الغنیمة“ (اس پر زبر ہے) یعنی غنیمت کو حاصل کرو، جب تمہارے اصحاب غالب آچکے ہیں تو تم کس چیز کی انتظار کر رہے ہو، زہیر کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں

”فقال عبد اللہ انسیتم ما قال لکم رسول اللہ؟ قالوا واللہ لئانین الناس فلنصیبن من الغنیمة“

حضرت عبداللہ بن جبیر نے ان لوگوں کو کہا ”کیا تم رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو بھول گئے ہو، جو آپ نے تمہیں



فرمایا تھا، لیکن وہ کہنے لگے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم ضرور بر ضرور لوگوں کو ملیں گے اور مال غنیمت ضرور ہی حاصل کریں گے، حضرت عبداللہ بن جبیر نے کہا نبی کریم ﷺ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، لیکن لوگوں نے انکار کیا ”فلما ابوا صرف وجوہہم“ جب انہوں نے انکار کیا تو ان کے چہرے پھر گئے، یعنی ”تَحْیِرُوا فَلَہُمْ بِدْرُوا اِیْنَ یَذْہِبُوْنَ وَاِیْنَ یَتَوَجَّہُوْنَ“ وہ حیران ہو گئے ان کو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کس طرف متوجہ ہو رہے ہیں، تو اس حال میں ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا گیا۔

ابوسفیان بن حرب جو اس وقت رئیس المشرکین تھا، ایک بلندی پر چڑھ کر کہنے لگا کیا اس قوم میں محمد ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر وہ کہنے لگا کیا اس قوم میں ابن ابی قحافہ (یعنی ابو بکر) ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر وہ کہنے لگا کیا اس قوم میں ابن خطاب (یعنی عمر) ہیں، پھر وہ خود ہی کہنے لگا یہ سب قتل کر دیئے گئے اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے، ابھی رسول اللہ ﷺ نے کوئی ارشاد نہیں فرمایا تھا تو حضرت عمرؓ اس کی بات کو سن کو صبر نہ کر سکے، آپ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ کہا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تجھ پر زندہ رکھا ہوا ہے جو تجھے پریشان کرتے رہیں گے۔

ابوسفیان نے کہا ”اعل ہبل“ ”اعل“ علا یعلو سے امر کا صیغہ ہے ”ہبل“ (بضم الہاء وتخفیف الباء الموحدة) ان کے بت کا نام ہے، جو انہوں نے کعبہ میں رکھا ہوا تھا، حرف نداء اس میں مخذوف ہے یعنی ”یا ہبل“ ہے اصل معنی اس کا یہ ہے ”اے ہبل بلند رہ“ مرادی معانی مختلف بیان کئے گئے ہیں، اے ہبل تیرا دین غالب رہے، اے ہبل تیرا امر بلند رہے اور تیرا دین غالب رہے، اس کے اس قول پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اس کو جواب دو“ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ ہم اسے کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم اسے کہو ”اللہ اعلیٰ واجل“ اللہ سب سے بلند اور سب سے بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا ہمارا عزیٰ ہے، تمہارا کوئی عزیٰ نہیں (عزیٰ بھی ان کے بت کا نام تھا کہ یہ ہمیں نفع پہنچاتا ہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے جواب دو، صحابہ کرام نے عرض کیا ”ہم کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو ”اللہ مولنا ولا مولیٰ لکم“ اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں پھر ابوسفیان نے کہا ”آج کا دن بدر کے دن کا بدل ہے“ اور لڑائی اس طرح ہے جس طرح ڈول کے مقابل ڈول نکالا جائے، یعنی لڑائی میں دن پھرتے رہتے ہیں، بدر میں ہمارے ستر آدمی قتل ہو گئے تھے، اور آج احد میں تمہارے ستر آدمی قتل (شہید) ہو گئے، اور ابوسفیان کہنے لگا، اگر تم اپنے کسی شخص کو مثلہ پاؤ تو میں نے اسے حکم نہیں دیا، اس نے مجھے غم میں نہیں ڈالا۔ مثلاً اسے کہا جاتا ہے جس کے



اعضاء کاٹ دئے جائیں، جیسا کہ حضرت حمزہؓ کی شہادت کی بعد جگر کو کاٹ کر دیا چایا "فلم تستطع ان تسيفها فلفظتها" لیکن وہ اسے نگل نہ سکی بلکہ اس نے آپ کے جگر کو پھینک دیا، ابن اسحاق کی ایک روایت میں ہے کہ ابوسفیان نے کہا "والله ما رضيت وما سخطت وما نهيت وما امرت"، قسم اللہ کی میں مثلہ بنانے پر نہ راضی ہوں اور نہ ہی ناراض ہوں، اور نہ ہی میں نے حکم دیا اور نہ ہی میں منع کیا اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے۔  
 "ولم يكن ذلك عن رأي سرائنا، ثم ادر كنه حمية الجاهلية اما انه اذا كان لم يكرهه"

کہ ابوسفیان نے کہا مثلہ بنانے میں ہمارے کسی بڑے آدمی (کسی سردار) کی رائے شامل نہیں، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پھر اسے جاہلیت کی حمیت لاحق ہوگئی، جاہلیت کی حمیت یہ تھی کہ اپنے خاندان کی ہی حمایت کرنی ہے، خواہ وہ باطل راہ پر ہی کیوں نہ ہوں، حضرت حمزہؓ کو مثلہ بنانے والی ابوسفیان کی زوجہ حندہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس نے کہا

"ولم تسؤني" ای والحال ان المثلة التي فعلوها لم تسؤني وان كنت ما امرت  
 مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، یعنی مثلہ بنانے کا اگرچہ میں نے کوئی حکم نہیں دیا، لیکن جو مثلہ بتایا گیا ہے اس نے مجھے کوئی غمزدہ نہیں کیا، اور نہ ہی مجھے کوئی برا لگا۔

(تشریح ماخوذ از عمدة القاری المعروف بالعینی ج ۱ ص ۱۲۲)

صحابہ کرام کے پسپا ہونے اور ستر کی تعداد میں شہید ہونے کی وجہ:

اس کی ایک وجہ تو یہی ہے جو اس حدیث پاک سے واضح ہو رہی ہے کہ جب وہ درہ کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کیلئے وہاں سے ہٹے ہی تھے تو رسول اللہؐ کے ارشاد گرامی کی بظاہر مخالفت ہوگئی جس کی وجہ سے وہ متحیر ہو کر پھرنے لگے، انہیں معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں، صحابہ کرام کی اس لغزش کی وجہ ان کی بے اختیار غلطی (جسے خطا کہا جاتا ہے) بھی ہو سکتی ہے، اور ان کی اجتہادی خطا بھی ہو سکتی ہے، اور شیطان کا وسوسہ بھی ہو سکتا ہے، اور سب سے بڑی وجہ رب تعالیٰ کی طرف سے آزمائش تھی جس کے اسباب بے اختیار غلطی اور اجتہادی خطا اور شیطانی وسوسہ وغیرہ تھے۔ لیکن دوسری وجہ بھی حدیث پاک سے دیکھئے۔

❁ روی عن ابن ابی طالب علیؓ، قال جاء جبریل الی النبی ﷺ یوم بدر فقال له  
 خیر اصحابک فی الاساری ان شاء والقتل، وان شاء والفداء علی ان یقتل منهم  
 عام المقبل مثلهم فقالوا الفداء ویقتل منا" (اخرجه الترمذی وقال حدیث حسن)



حضرت علی المرتضیٰ سے مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو بدر میں قید ہونے والے کفار کے بارے میں اختیار دے دیں، اگر وہ قتل کرنا چاہیں تو قتل کر دیں، اور اگر فدیہ لینا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں، لیکن اگر انہوں نے فدیہ لیا تو آنے والے سال میں ان کے اتنے آدمی ہی شہید کر دئے جائیں گے (چونکہ قیدی کفار بھی ستر تھے تو ستر صحابہ کرام ہی شہید کر دئے گئے) تو صحابہ کرام نے (جبریل کے اس پیغام کو سن کر) کہا کہ ہم ان کا فدیہ لیتے ہیں تاکہ آنے والے سال ہمارے اتنے آدمی ہی شہید ہو جائیں (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے) سبحان اللہ صحابہ کرام کے دل میں شہادت کی کتنی ہی زیادہ تمنا تھی، رب تعالیٰ نے ان کی اس تمنا کو پورا کرتے ہوئے ”فَانْجِزَالله وَعْدَهُ بِشَهَادَةِ اُولَآئِهِ بَعْدَ اَنْ خِيَرَهُمْ فَاِخْتَارُوا الْقَتْلَ“ ان سے وعدہ لیا کہ اگر تم فدیہ لینا چاہتے ہو تو تمہیں آنے والے سال میں کفار قیدیوں کی تعداد میں شہید کر دیا جائے گا، تو صحابہ کرام نے فدیہ لینا پسند کر لیا کہ ٹھیک ہے ”ہمیں اتنی ہی تعداد میں شہید کر دیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اپنے پیاروں کو شہید کر دیا“ اسی آیت کریمہ میں قریب ہی آنے والے الفاظ مبارکہ ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ اس پر روشن دلیل ہیں۔

(منقول از قرطبی)

﴿وَلْيَعْلَمْ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اور (اس لئے) تاکہ پہچان کرادے اللہ ایمان والوں کی۔“

دائم نے یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے نقل کیا، آپ کے ترجمہ کنز الایمان کی خوبی کو دیکھنے کیلئے پہلے دائم کی تسکین البیان فی محاسن کنز الایمان کو دیکھئے۔

﴿وَلْيَعْلَمْ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾

اور اس لئے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے۔	(محمود الحسن صاحب)
تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے۔	(عبدالماجد دریا آبادی)
تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں۔	(اشرف علی صاحب)
اور اس واسطے کہ معلوم کرے جن کو ایمان ہے۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
اور اس لئے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی۔	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

جنگ احد کا ذکر ہو رہا تھا کہ اے مسلمانو! اگر تمہیں احد میں تکلیف پہنچی تو کفار کو بدر میں اسی طرح تکلیف پہنچی، یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، اس کے بعد ذکر ہے ﴿وَلْيَعْلَمْ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اس پر جلالین نے ”علم



ظہور“ سے تفسیر کی، اس پر حاشیہ یہ ہے ”علم ظہور ای علم وجود ای علمنا متعلقا بالوجود الخارجی“ یعنی یہاں علم کا تعلق وجود خارجی سے ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی سے جانتا ہے تاکہ اس کو خارج میں ظاہر فرمائے۔

”والعلم فیہ مجاز عن التمییز من باب اطلاق اسم السبب علی المسبب ای

(روح المعالی)

لیتمیز الثابتین علی الایمان من غیرہم“

یہاں علم کا مجازی معنی ”جدا کرنا، تمیز پیدا کرنا“ ہے، یعنی سبب کا نام مسبب پر اطلاق ہے (مجاز مرسل ہے) یعنی معنی یہ ہوا کہ ایمان پر ثابت رہنے والوں کو ان کے غیروں سے ممتاز کر دے، اب اس تفسیر (یعنی روح المعانی کی تفسیر) کے مطابق اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کے ترجمہ پر غور کریں ”اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی“ کہ یہ نفیس ترجمہ ہے جس میں کوئی سطحی ذہن والا بھی وہم و گمان نہیں کر سکتا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈال کر جانا پہلے علم نہیں تھا۔

(تسکین البہتان صفحہ نمبر ۸۹، ۹۰)

**مزید وضاحت:** تفسیر صاوی اور تفسیر کبیر سے دیکھئے۔

”قوله علم ظہور“ جواب عن سؤال مقدر حاصلہ ان علم اللہ قدیم لا یتجدد فكيف

ذلک؟ فاجاب بان المراد لیظهر متعلق علیہ بتمیز المؤمن غیرہ، والمعنی ان نصرۃ

الکافر تارة لیست لمحبة اللہ بل لیتمیز المؤمن من المنافق“

(ولیعلم اللہ) علم ظہور“ جلالین میں یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ ایک سوال کا جواب دیا گیا ہے، سوال یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے، وہ کوئی نیا نیا حاصل ہونے والا نہیں تو رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے (یا یوں کہہ لیں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی پہچان کرادے، مطلب ایک ہی ہے) اور مؤمن اور غیر مؤمن کو ایک دوسرے سے جدا کر دے، کیونکہ کافر کی ظاہری برتری اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے نہیں، بلکہ مؤمن اور منافق کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنا مقصود ہے۔

(صاوی)

جب دلائل عقلیہ اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حوادث کو ان کے واقع ہونے سے پہلے جانتا ہے، تو واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تغیر محال ہے۔ ہاں البتہ علم سے مراد معلومات لئے جائیں اور قدرت سے مقدرات مراد لئے جائیں تو ان میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، جہاں بھی بظاہر جب یہ نظر آئے کہ علم میں تجدد ہے تو اس سے مراد معلومات میں ہی تجدد ہوگا۔



آیہ کریمہ کے چند مطالب:

(۱) لیظهر الاخلاص من النفاق والمؤمن عن الكافر "ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کے اخلاص کو ظاہر کر دے، جس سے پتہ چل جائے کہ منافق اور کافر میں اخلاص نہیں۔

(۲) والثانی لیعلم اولیاء اللہ فاضاف الی نفسه تفخیمًا "دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہاں حذف مضاف ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کے علم کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے اولیاء کرام کی عظمت و شان کو بیان کیا، ہو سکتا ہے کہ مقصد بیان یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ولی جان لیں ایمان والوں کو۔

(۳) وللهالبحکم بالامتیاز فوضع العلم مکان الحکم بالامتیاز لان الحکم بالامتیاز لا یحصل الا بعد العلم

اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (مؤمن اور کافر کے درمیان) امتیاز کا حکم نافذ کر دے علم کو امتیاز کے فیصلہ کی جگہ رکھ دیا جائے، کیونکہ امتیاز کا حکم علم کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

(۴) ورابعها لیعلم ذلک واقامتهم کما کان لیعلم انه سيقع لان المجازاة تقع علی الواقع دون المعلوم الذی لم یوجد

اس کا چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہاں علم کے حاصل ہونے کی بات نہیں بلکہ علم کے تعلق کی بات ہے یعنی ایک علم ازلی ہے وہ کام کے واقع ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور دوسرے علم کا تعلق جو معلوم سے ہوتا ہے وہ تعلق تب ہی ہوتا ہے جب معلوم معرض وجود میں آئے کیونکہ جزاء واقع پر مرتب ہوتی ہے نہ کہ معلوم پر۔ (کبیر)

اسی چوتھے معنی کے مطابق حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ یوں کیا "اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے۔ آپ نے تفسیر میں ذکر فرمایا "جمہور کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم دو طرح کا ہے، ایک یہ کہ مستقبل میں یوں واقع ہوگا یہ علم تو ازل سے حاصل ہے، اس علم پر کوئی جزاء یا سزا، مدح یا ذم مرتب نہیں ہوتی، لیکن جب کوئی معلوم چیز علم باری کے مطابق خارج میں موجود ہو جاتی ہے تو اس وقت یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اب یہ چیز عدم سے وجود میں آگئی اور اسی پر جزاء و سزا مرتب ہوتی ہے، یہاں آیہ میں علم کا یہی معنی مراد ہے جسے علم ظہور کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے "قول الجمهور ان المراد بالعلم علم الظهور" (المنار) جمہور کا قول یہی ہے کہ علم سے مراد علم ظہور ہے۔ (ضیاء القرآن)



دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

”علم“ کا کبھی ایک مفعول ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے ”علمت زیداً“ میں نے زید کو جان لیا، یعنی ذات زید کو جاننا اور اسے پہچانا اور ”علم“ کبھی دو مفعولوں کا محتاج ہوتا ہے، جسے کہا جاتا ہے ”علمت زیداً کریماً“ میں نے زید کے کریم ہونے کا یقین کر لیا آیہ کریمہ میں ”علم“ کہ دو مفعول ہیں ایک مفعول محذوف ہے، معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگی ”وَلْيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مَتَمِيزِينَ بِالْإِيمَانِ مِنْ غَيْرِهِمْ“ تاکہ اللہ تعالیٰ پہچان کرادے ایمان والوں کی کہ وہ ایمان کی وجہ سے غیروں سے ممتاز ہیں۔ یعنی لوگوں کے درمیان دنوں کے پھیرنے کی حکمت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالص ایمان والوں کو ”جو صبر سے کام لینے والے ہیں اور اسلام پر ثابت قدم ہیں“ ممتاز کر دے ان لوگوں سے جو صرف ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور حقیقت میں ایمان سے دور ہیں، یعنی منافق ہیں۔ دوسرے احتمال کا پایا جانا بھی ممکن کہ ”علم“ کا ایک مفعول ہو، اب معنوی طور پر عبارت یوں ہوگی ”وَلْيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا يَظْهَرُ مِنْ صَبْرِهِمْ عَلَى جِهَادٍ عَدُوَّهُمْ“ تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی ذاتوں کی پہچان کرادے جب ان کا صبر دشمن کے خلاف جہاد کرتے ہوئے ظاہر ہو جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَيَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ ”اور بنائے تم میں سے بعض کو شہید۔“

یہاں سے دنوں کے پھیرنے کی دوسری حکمت بیان کی جا رہی ہے کہ تمہیں شہداء بنائے، شہداء جمع شاہد کی ہے یا شہید کی ہے۔ دونوں احتمال پائے جاسکتے ہیں اگر شاہد کی جمع ہو تو مطلب یہ ہوگا۔

”وَيَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ بِمَا صَدَرَ مِنْهُمْ مِنَ الذُّنُوبِ وَالْمَعَاصِي، فَاِنْ كُنْهُمْ

لَهُمْ شُهَدَاءُ عَلَى النَّاسِ مِنْ صَبْرٍ عَالٍ وَدَرَجَةٍ عَالِيَةٍ“

کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لوگوں کے گناہ اور معاصی کرنے پر گواہ بنادے، اس لئے کہ ایمان والے تخلصین کو

لوگوں پر گواہ بنانے سے ان کا منصب بلند اور درجہ ثابت ہوگا۔

**دوسرا احتمال:** دوسرا احتمال کہ شہداء جمع شہید کی ہو، زیادہ مفسرین کرام نے یہی معنی لیا ہے، اعلیٰ حضرت

رحمہ اللہ کا ترجمہ بھی اسی کے مطابق ہے اور واقعہ نے بھی آپ کے ترجمہ کو ہی نقل کیا ہے۔

”وَالثَّانِي الْمُرَادُ مِنْهُ وَكَيْكُرم قَوْمًا بِالشَّهَادَةِ“ جب شہداء جمع شہید کی ہو تو مطلب یہ ہوگا تاکہ بنائے تم میں سے

بعض کو شہید اور شہادت کی وجہ سے ان کو مکرم بنائے۔ مسلمان بدر میں خود ہی شہادت کی تمنا کر رہے تھے، ان کی دعا کو



شرف قبولیت بخشا تو ان کو احد میں ستر کی تعداد میں شہادت نصیب ہوگئی۔

”القرآن مملوء من تعظیم جال الشهداء“ قرآن شہیدوں کی تعظیم کے بیان سے بھرا ہوا ہے، ارشاد

باری تعالیٰ ہے

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾  
اور ہرگز نہ گمان کرو ”ان لوگوں کو جو شہید کردئے اللہ کی راہ میں“ مردہ بلکہ وہ زندہ ہیں ان کے رب کے  
ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾  
پس وہ ان کیساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہے وہ انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور صالحین ہیں۔  
اس آیت کریمہ میں انبیاء کرام کے بعد صدیقین کا ذکر فرمایا، صدیقین کے بعد شہیدوں کا ذکر فرمایا۔  
”فكانت هذه المنزلة هي المنزلة الثالثة للنبوة“ تو اس سے اسی طرف ارشاد فرمایا کہ شہیدوں کا انبیاء کرام  
کے بعد تیسرا عظیم درجہ ہے۔ (کبیر)

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ انبیاء کرام کے بعد دوسرا مرتبہ صدیقین کو حاصل ہے، جن میں رئیس  
الصدیقین حضرت ابو بکر صدیق ؓ ہیں جو انبیاء کرام کے بعد سب شہیدوں سے افضل ہیں۔

شہید کو شہید کہنے کے وجہ:

نبی کریم ﷺ کی امت قیامت کے دن پہلی امتوں پر اور انبیاء کرام کے حق میں گواہی دے گی ان میں خصوصی  
درجہ اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والے کو ہوگا، اسی وجہ سے کہ وہ رب تعالیٰ کے حضور لوگوں پر گواہی دینے کیلئے حاضر  
ہوں گے تو ان کو شہید کہا جاتا۔ ”وقيل سمي شهيدا لانه مشهود له بالجنة“ اور وجہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل  
ہونے والے کو جنت میں حاضر کر دیا جاتا ہے لہذا اسے شہید کہا جاتا ہے۔

”وقيل سمي شهيدا لان ارواحهم احتضرت دار السلام لانهم احياء عند ربهم  
وارواح غيرهم لاتصل الى الجنة“

شہید کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی روحوں کو جنت میں حاضر کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے رب کے



ہاں زندہ ہوتے ہیں، اور ان کے بغیر دوسرے لوگوں کی روحوں کو جنت میں اسی وقت نہیں پہنچایا جاتا بلکہ حساب و کتاب کے بعد دوسرے لوگوں کی روحوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ شہیدوں کو عظیم مرتبہ حاصل ہوگا، ان کے عظیم مراتب کو قرآن پاک کی ان آیات میں دیکھئے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (سورة التوبة، آية نمبر ۱۱۱)

”بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لئے ہیں اس بدلے پر ان کیلئے جنت ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑیں تو ماریں اور مریں، اس کے ذمہ کرم سچا وعدہ توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے زیادہ قول کا پورا کون؟ تو خوشیاں مناؤ اپنے سودے کی جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ بَيْعَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۚ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ يَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلُكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٌ طَيِّبَةٌ فِي جَنَّاتٍ عِذْنُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (سورة الصف آیات نمبر ۱۲۷-۱۲۸)

”اے ایمان والو کیا میں بتا دوں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے۔ ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں رواں، اور پاکیزہ محلوں میں جو بننے کے باغوں میں ہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔“

وفی صحیح البستی عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ ما یجد الشہید من القتل الا کما یجد احدکم من القرحة

صحیح بستی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہید قتل سے نہیں پاتا مگر وہ جو تم میں سے کوئی ایک زخم کی خراش سے پاتا ہے۔ یعنی جس طرح خراش سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اسی طرح شہید کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

وروی النسائی عن راشد بن سعد عن رجل من اصحاب النبی ﷺ ان رجلا قال یا رسول اللہ ﷺ ما بال المؤمنین یفتنون فی قبورهم الا الشہید قال کفی ببارقة السیوف علی رأسه فتنة



نسائی نے راشد بن سعد سے روایت بیان کی جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے کہ سب مومنوں کو قبر کے سوال و جواب میں مبتلا ہونا ہے لیکن شہید کو نہیں؟ تو آپ نے فرمایا اس کے سر پر بجلی کی طرح چمکتی تلوار چلا کر ہی اسے آزمایا گیا۔

حدثنا انس بن مالك انه قتل منهم يوم احد سبعون ويوم بدر معونة وسبعون ويوم اليمامة سبعون قال بنرمعونة على عهد رسول الله ﷺ ويوم اليمامة على عهد ابي بكر يوم مسيلمة الكذاب (بخاری کتاب المغازی باب من قتل من المسلمين يوم احد) حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں احد کے دن ستر صحابہ کرام شہید کر دئے گئے اور برمعونہ کے دن ستر صحابہ کرام شہید کر دئے گئے اور یمامہ کے دن ستر صحابہ کرام شہید کر دئے گئے۔ برمعونہ کا واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ثابت ہوا، اور یمامہ کا واقعہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوا جبکہ آپ نے مسیلہ کذاب سے جنگ کی۔ (منقول از قرطبی)

برمعونہ کا ذکر تو پہلے تفصیلی طور پر کر دیا گیا ہے، جو صحابہ کرام کو تبلیغ کی غرض سے دھوکہ سے بلا کر شہید کر دیا گیا۔ یمامہ کا واقعہ مختصر یہ ہے کہ جھوٹے مدعی نبوت مسیلہ کذاب (جس نے نبی کریم ﷺ کے آخری ایام میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا) کے مقابلے کیلئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید کو جنگ کا امیر مقرر کیا، دونوں فریقوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا، یہ جنگ بہت مشکل اس لئے تھی کہ مرتدین کا لشکر بہت بڑی تعداد میں تھا، نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ایک لاکھ سے زائد جاہل لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو چکے تھے، جنگ یمامہ میں مسیلہ کذاب کے ساتھ چالیس ہزار آدمی تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ چوبیس ہزار آدمی تھے، ابتدائی طور پر مسلمانوں کے قدم ڈمگائے تھے، مگر آخر میں بحکم ”الاسلام یعلو ولا یعلیٰ“ (اسلام غالب ہے اور مغلوب نہیں) کے حکم کے تحت دشمنوں نے شکست کھائی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

”وولى الكفار الادبار ودخل اكثرهم الحديقة واحاط بهم الصحابة لم يدخلوها من حيطانها وابوابها فقتلوا من فيها من المرتد من اهل اليمامة“

اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے، جان بچانے کی خاطر ایک باغ میں گھس گئے اور صحابہ کرام نے ان کو گھیرے میں لے لیا اور دیواروں پھلانگ کر باغ کے اندر پہنچ گئے، کوئی دروازوں سے اندر چلے گئے، وہاں مرتدین یمامہ کو قتل کر دیا، یہاں تک کہ مسلمانوں نے مسیلہ کا پیچھا کیا، حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ آگے نیزہ اس کے سینے پر مارا جو اس کی پیٹھ سے نکل گیا، پھر جلدی ابو دجانہ ساک بن حرب آگے بڑھے جنہوں نے تلوار سے اسے قتل کر دیا۔



”وكان جملة من قتلوا في الحديقة وفي المعركة قريبا من عشر آلاف مقاتل وقيل  
احد وعشرون الفا“

مرتدین جو باغ میں قتل کر دئے گئے اور میدان جنگ میں جوان کی لڑائی کرنے والے قتل کر دئے گئے وہ  
دس ہزار تھے، بلکہ ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ اکیس ہزار کی تعداد میں مرتدین قتل کر دئے گئے۔  
”وقتل من المسلمين ستمائة وقيل خمس مائة والله اعلم وفيهم من الصحابة  
سبعون رجلا“

مسلمان اس جنگ میں پانچ سو اور چھ سو کے درمیان شہید ہوئے جن میں ستر صحابہ کرام تھے اور باقی  
تابعین تھے۔ (ماخوذ من ارج النبوة جلد دوم، وصحة القاري شرح بخاري ج ۱ صفحہ نمبر ۱۶۳)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ ”ان جميع الحوادث بارادة الله تعالى“ کہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ  
کے ارادہ سے پائے جاتے ہیں، اسلئے کہ منصب شہادت ایک عظیم درجہ ہے، اور شہادت کے اصول کے لئے کفار کا  
مؤمنوں پر مسلط ہونا ضروری ہے اس کے بغیر شہادت کا اصول نہیں جب شہادت کفار کے تسلط کے بغیر حاصل نہیں  
ہوتی ”فحينئذ يكون قتل الكفار للمؤمنين من لوازم تلك الشهادة“ تو پتہ چلا کہ کافروں کا مؤمنوں کو  
قتل کرنا شہادت کے لوازمات سے ہے۔

”فاذا كان تحصيل تلك الشهادة العبد مطلوب بالله تعالى وجب ان يكون ذلك القتل  
مطلوب بالله تعالى“

جب بندے کا شہادت کو حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب، اور شہادت کافر کے قتل کرنے کی وجہ سے حاصل  
ہوتی ہے تو کافر کا مسلمان کو قتل کرنا بھی مطلوب ہوا۔ ﴿وَيَسْخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءُ﴾ سے اور فائدہ یہ  
حاصل ہوا کہ جب شہادت رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

”وذلك يدل على ان فعل العبد خلق الله“ تو اسی سے پتہ چل گیا کہ بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی وجہ  
سے ہے، یعنی بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿وَاللَّهُ لَا يَحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظالموں سے۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں ”ظالموں“ سے مراد مشرکین ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ



مشرکوں سے محبت نہیں کرتا۔ یعنی جو لوگ جہاد پر صبر نہ کر کے ایمان پر ثابت نہیں رہتے رب تعالیٰ ان کو پسند نہیں کرتا، اور اسی سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کافروں کو اگر بظاہر کبھی برتری دے دے تو اس میں بھی مؤمنین کا ہی فائدہ ہوتا ہے کہ ان کو منصب شہادت حاصل ہو جاتا ہے ”لأنہ یحبہم“ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت رکھتا ہے وہ تو کافروں سے محبت رکھتا ہی نہیں۔ (ماخوذ از کبیر)



وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ۝ (آیت نمبر ۱۴۱)

(۱) اور اس لئے کہ اللہ مسلمانوں کا نکھار کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ (کنز الایمان)

(۲) اور اس لئے کہ نکھار دے اللہ تعالیٰ انہیں جنہوں نے ایمان لایا اور مٹا دے کافروں کو۔ (نجوم الفرقان)

**محص:** (ف) محصا۔ الظبی فی عدوہ ”تیز دوڑنا“ المذبوح برجلہ ”مذبوح کا تڑپنا“ بفلان العرض ”کسی کو زمین پر پھینکنا فلان من فلان، بھاگنا“ البرق ”بجلی کا چمکنا“ اللہ ماہک ”زائل کرنا، الشی ہر عیب سے پاک کرنا“ السنان ”بھالے کو صیقل کرنا“ الذهب بالنار ”سونے کو صاف کرنا یعنی سونے کو آگ کی مٹھی میں ڈال کر صاف کر کے نکھار دیا جائے۔

آیت کریمہ میں یہی معنی لیا گیا ہے:

المحص الورم، ورم کا کم ہونا، المحص والمحص والمحبص والممحوص من الخیل مضبوط ساخت کا گھوڑا، المحاص، جھکنے والی بجلی ”الامحص“ ہر جھوٹے، سچے کا عذر قبول کرنے والا۔ (المنجد)

**محق:** (ف) محقا الشی، باطل کرنا، مٹانا، اللہ الشی گھٹانا، برکت کھوٹا، الحر الشی جلانا ”المحق“ کھجور کے قریب قریب لگے ہوئے پودے ”ماحق الصیف“ موسم گرما کی شدت ”الامحق“ بے برکت۔ (المنجد)

اس آیت کریمہ میں تیری حکمت بیان کی جا رہی ہے، اور درمیان میں ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ جملہ معترضہ ہے۔



## دونوں آیات کا مختصر مطلب:

اگر تمہیں احد میں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو کافروں کو اسی کی مثل بدر میں تکلیف پہنچ چکی ہے، بلکہ احد میں بھی کافروں کے بیس سے زائد آدمی قتل کر دئے گئے تو اس لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کی قوم کو احد میں تم سے پہلے تکلیف پہنچ چکی ہے۔ یہ دن ہم لوگوں میں پھیرتے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کو فتح عطاء کردی اور کبھی کفار کو بظاہر وقتی طور پر برتری دے دی تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو کفار سے ممتاز کر کے ان کی پہچان کرادے، اور بعض مؤمنوں کو شہادت کا درجہ عطاء کر دے، اور مؤمن جب اس مشکل میں ایمان پر ثابت رہیں گے تو ان کو گناہوں سے پاک و صاف کر کے سونے کی طرح صاف و شفاف کر کے ان میں نکھار پیدا کر دے اور کافروں کو مٹا دے، وجہ اس کی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔

(ماخوذ از صاوی)

**اعتراض:** لوگوں میں دنوں کے پھیرنے پر کافروں کے مٹانے کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیسے صحیح ہے؟ جبکہ احد میں تو کافروں کو بظاہر برتری حاصل ہوئی تھی۔

**جواب:** قوله تعالى (وَيَمْحَقُ الْكَافِرِينَ) اى فانهم اذا ظفروا بغوا وبطروا، فيكون ذلك

سبب دمارهم و هلاكهم و محقهم و فناءهم

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَيَمْحَقُ الْكَافِرِينَ﴾ (اور کافروں کو مٹا دے) کا مطلب یہ ہے کہ جب

ان کو ظاہری طور پر کامیابی حاصل ہوتی ہے تو بغاوت و سرکشی کرتے ہیں، جو ان کی تباہی اور ہلاکت اور

(از ابن کثیر و صاوی)

ان کے مٹ جانے اور ان کے فناء ہو جانے کا سبب بنتی ہے۔

تین معانی میں سے جو چاہیں مراد لے لیں:

”محص یختبر“ اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو آزمائے کہ کون ایمان پر قائم رہتے ہیں اور ڈگمگاتے

ہیں ”محص اى يطهر“ اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو گناہوں سے پاک کرے، یعنی جب وہ ایمان پر

ثابت رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک و صاف و شفاف کر دے گا، اور ان کو نکھار دے۔ ”محص اى

یخلص“ اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے گناہوں کو مٹا دے اور انہیں معاف کر دے۔ یہ اسی طرح جس طرح

کہا جاتا ہے ”اللهم محص عنا ذنوبنا“ اے اللہ ہمارے گناہوں کو مٹا دے۔ اس آیت کریمہ میں ﴿وَلِيُخْلِصَ

اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کا معنی یہ ہو گیا ”فالمعنى عليه ليتلى المؤمنين ليشيهم ويخلصهم من ذنوبهم“ کہ اللہ



تعالیٰ مومنوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ ان کو ثواب عطاء کرے اور ان کے گناہوں کو مٹا دے۔ (ماخوذ از قرطبی)

❦ واخرج ابن ابي حاتم عن عكرمة قال لما ابطاء على النساء الخبر خرجن يستخبرن  
فاذا رجلان مقتولان على دابة او على بعير فقالت امرأة من الانصار من هذان  
قالوا فلان وفلان اخوها وزوجها وابنها فقالت ما فعل رسول الله ﷺ؟ قالوا حي قالت  
فلا ابالي يتخذ الله من عباده الشهداء ونزل القرآن على ما قالت

ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہ سے ایک روایت بیان کی، کہ جب عورتوں پر خبر کے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، تو وہ خبر طلب کرنے کیلئے نکلیں، تو شہیدوں کو ایک سواری پر لایا جا رہا تھا، تو اس عورت نے پوچھا کہ یہ دو شہید کون ہیں؟ تو اسے بتایا گیا کہ یہ فلاں اور فلاں دو شخص ہیں، ایک اس عورت کا خاوند اور ایک بھائی تھا یا ایک خاوند اور ایک بیٹا تھا، اس عورت نے پوچھا نبی کریم ﷺ کیسے ہیں؟ تو اسے بتایا گیا کہ آپ صحیح زندہ اور سلامت ہیں، تو اس عورت نے کہا کہ اب مجھے کوئی پروہ نہیں کہ آپ زندہ اور سلامت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ عطاء کر دیا، تو اسی وقت یہ الفاظ مبارکہ نازل ہوئے ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ﴾ کہ تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔ (منقول از درمنشور)

**سُبْحَانَ اللَّهِ! صحابہ اور صحابیات کا کتنا صبر تھا، کہ اپنے بھائی اور خاوند، یا کہ اپنے خاوند اور اپنے بیٹے کی پرواہ نہیں، بلکہ خوشی ہوئی کہ ان کو شہادت کا مرتبہ حاصل ہو گیا، فکر صرف نبی کریم ﷺ کی لاحق ہوئی، آپ کی حیات کی خبر سن کر اس کے دل کو اطمینان حاصل ہو گیا۔**

### محص اور محق میں فرق:

دونوں لفظوں میں مطابقت پائی گئی کہ ہر ایک کا معنی ”ازالہ“ ہے البتہ محص کا معنی یہ ہے ”فی الاول ازالة الآثار وازاحة الاوضار“ کہ آثار کو زائل کر دینا یعنی علامات اور نشانات مٹا دینا، اور میل کچیل کو دور کر دینا ”وفی الثانی ازالة العين واهلاک النفس“ دوسرے یعنی ”محقق“ کا معنی ہے عین چیز کو مٹا دینا اور نفس کو ہلاک کر دینا ”واصل المحقق تنقیص الشی قليلًا قليلًا“ اصل میں محقق کا معنی ہے کسی چیز کو آہستہ آہستہ مٹا دینا۔ (روح المعانی)





أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ  
الصَّابِرِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۴۲)

(۱) کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا  
اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی۔ (کنز الایمان)

(۲) کیا تم نے گمان کیا کہ ابتدا داخل ہو جاؤ گے جنت میں، حالانکہ نہیں آزمایا اللہ نے انہیں جنہوں  
نے جہاد کیا تم میں سے، اور نہیں آزمایا صبر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

یعنی جنت میں ابتدائی طور پر جانے کی یوں ہی امید نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحانوں میں  
کامیابی حاصل کرے، جہاد کرنے کی آزمائش میں پورا ترے، اور رب تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی تکالیف پر صابر  
رہے، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت عطاء فرمائے گا۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

جلائین میں ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ﴾ کی تفسیر ”بَلْ أَحْسِبْتُمْ“ سے کی گئی، اس پر صاوی نے لکھا ”ام“ منقطعہ ہے  
اسی وجہ سے مفسر رحمہ اللہ نے ”بل“ سے تفسیر کی جو اضراب انتقالی پر دلالت کر رہا ہے، اور مفسر رحمہ اللہ نے ہمزہ مقدر  
نکالا ہے، جو استفہام انکاری پر دلالت کر رہا ہے

”والمعنى لا تظنوا يا ايها المؤمنون انكم تدخلون الجنة مع السابقين بمجرد الايمان

من غير جهاد وصبر بل مع الجهاد والصبر“

معنی یہ ہے کہ اے مومنو تم گمان نہ کرو کہ تم جنت میں ابتدائی طور پر داخل ہونے والوں کے ساتھ بغیر  
جہاد اور صبر کے صرف ایمان کے ساتھ ہی چلے جاؤ گے، بلکہ جہاد اور صبر سے جنت میں السابقون  
الاولون کے ساتھ داخل ہو گے۔

طلباء کرام ایک اور مسئلہ کی طرف توجہ کریں:

”لما“ نافیہ ہے ”يعلم“ مجزوم ہے، التقاء ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ (صاوی)



تسکین البھان فی محاسن کنز الایمان سے اقتباس:

﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمِ الصَّابِرِينَ﴾

”ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور صبر نہ کرنے والوں کو جانا“ (عبدالمجید صاحب)  
 ”حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم نہیں کیا اور یہ مقصود ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے۔“ (فتح محمد صاحب)

اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جوڑنے والے ہیں تم میں سے اور معلوم نہیں کیا ثابت رہنے والوں کو“ (محمود الحسن صاحب)  
 اور ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے جوڑنے والے تم میں سے اور معلوم کرے ثابت رہنے والے۔ (شاہ عبدالقادر صاحب)  
 ”اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور صبر کرنے والوں کی آزمائش کی“

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفسرین کی بحث بآسانی سمجھ میں آتی ہے، کہ یہاں اللہ کے علم کی کیسے نفی ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ کہا جائے ابھی تک اللہ نے معلوم نہیں کیا۔

ای ولما تجاہدوا لان العلم متعلق بالمعلوم فتدل نفی العلم بمنزلة نفی متعلقه لانه منتف بانقضاءه نقول ما علم الله في فلان خيرا ای مافیہ خیر حتی یعلمہ“ (مدارک)

یعنی یہاں مقصد نفی جہاد ہے، نفی علم نہیں اس لئے کہ علم کا تعلق معلوم سے ہے، نفی معلوم کی جگہ نفی علم کو رکھا گیا ہے، کیونکہ معلوم کہ انتقاء سے علم کا انتقاء ہوتا ہے، جیسے تم کہو ”ما علم الله في فلان خيرا“ اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ نے فلاں میں خیر کو جانا نہیں، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ فلاں میں خیر ہے ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم سے متعلق ہو، مقصود بھی یہی ہے کیونکہ ما قبل آرہا ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، ابھی تو اللہ نے تمہیں جہاد میں آزمایا بھی نہیں اور نہ صبر کرنے والوں کی آزمائش کی۔

فان رجاء الاجر من غير عمل ممن يعلم انه منوط به مستبعد عند العقول ولهذا قيل :

ترجوا النجاة ولم تسلك مسالكها ان السفينة لا يجرى على الیسس

وورد عن شهر بن حوشب طلب الجنة من غير عمل ذنب من الذنوب وانتظار

الشفاعة بلا سبب نوع من الغرور وارتجاء الرحمة ممن لا يطاع حمق و جهالة“

(روح المعالی)



اجر کی امید بغیر عمل کئے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی دار و مدار بھی اسی پر ہے یہ عقل سے بعید ہے، اسی وجہ سے یہ کہا گیا ”نجات کی امید اس راہ پر چلنے کے بغیر کشتی کو خشکی پر چلانے کے مترادف ہے، شہر بن حوشب کہتے ہیں بغیر عمل کے طلب جنت گناہ ہے، انتظار شفاعت بلا سبب دھوکہ میں مبتلا ہونا ہے، اور رحمت کی امید بغیر اطاعت کے جہالت و بے وقوفی ہے، اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں نفی آزمائش جہاد و صبر ہے نہ کہ نفی علم۔

نفی اللازم نفی الملزوم و کثیرا ما یقال ما علم اللہ تعالیٰ فی فلان خیرا ویراد ما فیہ خیر حتی یعلمہ“ (روح المعانی)

اس عبارت کا مفہوم وہی ہے جو پہلے مدارک کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔

”ام حسبتم ان تدخلوا الجنة والحال انه لم يتحقق منكم الجهاد والصبر“ (روح المعانی) کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم سے جہاد اور صبر ثابت ہی نہیں ہوا، اس عبارت سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ ”نفی جہاد و صبر ہے، نہ کہ نفی علم۔“ (تسکین البیان صفحہ ۹۱، ۹۲)

”ظاہر الآية يدل على وقوع النفي على العلم، والمراد وقوعه على نفی المعلوم، والتقدير، ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما يصدر الجهاد عنكم، وتقريره ان العلم متعلق بالمعلوم كما هو عليه، فلما حصلت هذه المطابقة لا جرم حسن اقامة كل واحد منها مقام الآخر“

آیہ کریمہ سے ظاہری طور پر معنی یہ سمجھ آ رہا ہے کہ علم کی نفی ہو رہی ہے، لیکن مراد معلوم کی نفی ہے علم کی نہیں، آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ، کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم سے جہاد صادر ہی نہیں ہوا واضح ہوا کہ علم معلوم سے متعلق ہوتا ہے، جس طرح معلوم ہو، جب مطابقت ضروری ہے تو یقیناً علم کو معلوم کے درجہ میں، اور معلوم کو علم کے درجہ میں رکھنا جائز ہے۔ (کبیر)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

”قال الزجاج اذا قيل فعل فلان فجوابه انه لم يفعل، واذا قيل قد فعل فلان فجوابه لم يفعل، لانه لما اكد وفي جانب الثبوت بقدر لا جرم اكد في جانب النفي بكلمة لما“

زجاج نے کہا ہے کہ جب کہا جائے فلاں نے یہ کام کیا ہے، تو اس کی نفی مقصود ہو تو کہا جائے گا۔ ”انه لم يفعل“ اس نے یہ کام نہیں کیا، اور اگر ثبوت کی جانب تاکید لگائی جائے لفظ قد سے، تو نفی کی جانب لفظ



”ما“ سے تاکید آئے گی ”قد فعل“ تحقیق اس نے یہ کام کیا تو اس کے جواب میں کہا جائے گا  
”لم يفعل“ تحقیق اس نے نہیں کیا۔  
(کبیر)

کیا خوب نتیجہ پیش کیا گیا:

”واعلم ان حاصل الکلام ان حب الدنيا لا يجتمع مع سعادة الآخرة“ آیت کریمہ سے نتیجہ یہ  
حاصل ہوا کہ دنیا کی محبت، آخرت کی نیک بخشی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی، جتنی قدر ایک بڑھے گی اتنی مقدار میں دوسری  
میں کمی آئے گی، اگر دنیا کی محبت بڑی تو آخرت کی سعادت میں کمی آئے گی، اور اگر آخرت کی محبت بڑھی تو دنیا کی  
محبت میں کمی آجائے گی، اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ دنیاوی کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک دنیا کی  
طرف دل نہ لگایا جائے، اسی طرح اخروی سعادت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب دل اللہ تعالیٰ کے سوا تمام، چیزوں  
سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی محبت کی طرف لگا دے، اسی محبت الہیہ سے اس کا دل پر رہے۔

”وهذان الامران لا يجتمعان، فلهذا السروق الاستبعاد الشليد في هذه الآية من اجتماعهما“

یہ دونوں امر آپس میں جمع نہیں ہوتے، اسی راز کے پیش نظر ان دونوں چیزوں یعنی محبت دنیا اور سعادت  
اخرویہ کے اجتماع سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کی محبت صرف زبانی دعویٰ سے حاصل  
نہیں ہوتی، یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کے دین کا اقرار کرے وہ سچا بھی ہو، بلکہ محبوب اور مکروہ چیزوں کے  
مسلط کرنے سے اصلی محبت کا پتہ چلتا ہے، اگر محبوب سے منافع حاصل ہو تو محبت برقرار رہے اور محبوب کی طرف سے  
آزمائش کیلئے بے رخی پائی جائے تو محبت زائل ہو جائے تو یہ حقیقت میں محبت ہی نہیں۔

”فان الحب لا ينقص بالجفاء ولا يزداد بالوفاء، فان بقي الحب عند تسليط اسباب

البلاء ظهر ان ذلك الحب كان حقيقيا“

بیشک محبت جفاء سے کم نہیں ہوتی اور وفاء سے بڑھتی نہیں، اگر محبت اس وقت بھی باقی رہے جب آزمائش  
کے اسباب اس پر مسلط کئے جائیں تو یہی حقیقی اور کامل محبت ہے ”السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ“ کے ساتھ ہی فلہذا  
الحكمة قال ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ﴾ کیا تم گمان کرتے ہو کہ جنت میں ”السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ“ کے  
ساتھ ہی داخل ہو جاؤ گے، صرف رسول اللہ ﷺ کی تصدیق سے بغیر جہاد اور صبر میں مبتلا ہونے سے پہلے؟ نہیں ایسا  
نہیں، بلکہ پہلے تمہیں جہاد سے آزمایا جائے گا، اور شدید محنت میں مبتلا کر کے تمہارے صبر کی دوسرے لوگوں کو پہچان



کرائی جائے گی، جب تم اس معیار میں پورے اتر دو گے تو رب تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، پھر پہلے ہی مرحلہ میں تم جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے۔  
(ماخوذ از کبیر)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ﴾ میں ”میم“ کے کسرہ والی ایک قرأت ہے، وہ واضح ہے کہ اس میں پہلے ”لما“ بواسطہ عطف ساتھ مل جائے گا، اور ایک قرأت میں ”میم“ پر رفع بھی پڑھا گیا ہے، اس صورت میں واؤ استینافہ ہے یا حالیہ ہے ”کأنه قيل ولما تجاهدوا وانتم صابرون“ اس قرأت کے مطابق معنی یہ ہے، اور تم نے جہاد ہی نہیں کیا تمہارا صبر سامنے آتا تو رب تعالیٰ اس کی پہچان کر دیتا، لیکن مشہور قرأت رولۃ ابی حفص کے مطابق ہمارے سامنے ”نصب“ والی ہے، اس صورت میں ”ان“ مقدر ہو گا یا واؤ صرف ہو گی، اور کلام اس طرح ہو گی جیسے ”لا تأكل السمك وتشرب اللبن“ میں ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی کھانے اور دودھ کے پینے کو جمع نہ کرو، اب اس قانون کے مطابق آیۃ کریمہ کا مطلب یوں ہو گا ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ﴾ والحال انه لم يتحقق منكم الجهاد والصبر ای الجمع بینہما ”کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم (ابتداء) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم سے جہاد اور صبر ثابت ہی نہیں ہوئے۔“  
(روح المعانی)

﴿وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ﴾ ذکر فرمایا ﴿وَيَعْلَمَ الَّذِينَ صَبَرُوا﴾ نہیں ذکر فرمایا کہ دوام واستمرار بھی حاصل ہو جائے اور آیات کے آخری الفاظ ”عاملین، مکذبین، متقین اور صابرين ایک جیسے ہو جائیں۔“

ابتدائی کلاسوں کے دینی طلباء اسے نہ بھولیں:

آپ صرف کی کتب میں ثلاثی مجرد کے ابواب میں ”حسب یحسب“ ماضی اور مضارع مکسور العین پڑھ رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مادہ، یہ الفاظ کسی اور باب پر نہیں آتے، بلکہ قرآن پاک میں ماضی مکسور العین اور مضارع مفتوح العین ہی استعمال ہے، اس کی تفصیل یہ ہے ”حسبہ“ (ن) حسبا، حسابا، حسابانا، حسبة، حسابا، گنا شمار کرنا حسبه (س ح) حسابا، محسبه، گمان کرنا، خیال کرنا ”حسبة“ ”شریف الاصل ہوتا“ (المنجد)





(۱) وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمْنُونَ الْوَيْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ O (آیہ نمبر ۱۴۳)  
اور تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے اس کے ملنے سے پہلے تو اب وہ تمہیں نظر آئی آنکھوں کے سامنے۔  
(کنز الایمان)

(۲) اور تحقیق تم تمنا کرتے تھے موت کی پہلے اس کے پالینے کے، تو تحقیق (اب) تم نے اسے دیکھ لیا، اس حال میں کہ تم اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہو۔  
(نجوم الفرقان)

### شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کے ذریعے صحابہ کرام کے سامنے بدر والے شہداء کی شان بیان کی اور ان کا اپنے ہاں مقام تکریم و عزت بیان کیا تو جو لوگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ ہمیں بھی شہادت حاصل ہو اور ہم اپنے بھائیوں سے جا ملیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے موت کے اسباب ظاہر کر دیئے وہ کچھ دیر کیلئے پسپا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا کہ تم تو موت کو طلب کر رہے تھے جب موت کے اسباب تمہاری آنکھوں کے سامنے آ گئے تو تم پسپا (کیوں) ہو گئے۔ (خازن)

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمْنُونَ الْوَيْتَ﴾ ”اور تحقیق تم تمنا کر رہے تھے موت کی۔“

موت کی طلب کا مطلب یہ ہے کہ تم جنگ کر رہے تھے کہ ہمیں پھر جنگ کا موقع ملے، یا مراد یہ ہے کہ تم شہادت طلب کر رہے تھے، جب مراد اسباب موت لیا جائے کہ تم اسباب موت طلب کر رہے تھے تو بیان کردہ دونوں صورتوں کو یہ شامل ہے۔

﴿مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ﴾ ”پہلے اس کے پالینے کے۔“

”من قبل ان تشاهدوه وتعرفوا شدته“ یعنی موت کے اسباب کا مشاہدہ کرنے سے پہلے اور موت کی شدت کی پہچان سے پہلے تم موت کی تمنا کر رہے تھے۔

﴿فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ﴾ ”تحقیق (اب) تم نے اسے دیکھ لیا ہے۔“

”فقد رأيتموه معانين له حين قتل دونكم من قتل من اخوانكم“ تحقیق اب تم نے اس کا معاینہ کر لیا ہے



کہ تمہارے بھائی تمہارے سامنے شہید کر دیئے گئے

”رایتم“ اس مقام میں بمعنی ”ابصرتم“ کے ہے، اس کا ایک مفعول ہے، جس کا معنی ہے دیکھنا، کبھی ”رایت“ یقین کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں، لیکن یہاں وہ معنی مراد نہیں۔

﴿وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾ ”اس حال میں کہ تم اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہو“۔

یہ جملہ تاکید کیلئے ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ”رایت“ کا حقیقی معنی دیکھنا معتبر ہے، مجازی معنی نہیں لیا گیا، کیونکہ کبھی دل کی توجہ کو بھی رؤیہ سے تعبیر کر لیا جاتا ہے۔

### مختصر مطلب:

تقریباً شان نزول سے ہی پتہ چل گیا کہ صحابہ کرام شہادت کی طلب کی دعاء کر رہے تھے، احد میں ان کے سامنے اسباب شہادت آ گئے، لیکن وہ وقتی طور پر پسپا ہو گئے، تو رب تعالیٰ نے فرمایا تم تو موت (شہادت) کی تمنا کر رہے تھے جب تک تمہارے سامنے اسباب موت نہیں آئے، لیکن اسباب موت تمہارے سامنے جب آئے تو تم اس کا معائنہ کر رہے تھے، ضمناً اس میں تو بیخ بھی پائی گئی کہ تم خود ہی پہلے شہادت طلب کر رہے تھے اور جب تمہارے سامنے اسباب شہادت آ گئے تو تم وقتی طور پر کچھ دیر کیلئے پسپا ہو گئے گئے، اگرچہ بعد میں تم لوٹ آئے اور کفار کو تم نے شکست بھی دے دی، لیکن تمہارا کچھ دیر کیلئے پسپا ہونا بھی تمہاری شان کے لائق نہیں تھا۔ (ماخوذ از بیضاوی و شیخ زاہد)





وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنُيْضِرَّهُ اللَّهُ شَيْئًا وَسَيُجْزَى اللَّهُ

(آیہ نمبر ۱۴۴)

الشَّاكِرِينَ ۝

(۱) اور محمد تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول ہو چکے تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں تو تم اٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جوائے پاؤں پھرے گا اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، اور عنقریب اللہ شکر والوں کو صلہ دے گا۔ (کنز الایمان)

(۲) اور نہیں ہیں محمد مگر رسول، تحقیق گذر چکے ہیں اس سے پہلے رسول، تو کیا وہ انتقال فرمائیں، یا شہید کر دیئے جائیں تو تم پھر جاؤ گے اٹے پاؤں، اور جوائے پاؤں پھرے گا، تو ہرگز نہیں نقصان کرے گا اللہ کا کچھ (بھی) اور عنقریب جزاء دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ بہت ہی انبیاء کرام کے ادب و احترام کے عین مطابق ہے، واقعہ نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، کافی حد تک کوشش کی گئی کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہ ہو جو ادب کے خلاف ہو، واللہ اعلم بالنبات۔

راقم کی کتاب تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان کو دیکھئے، مترجمین نے کس طرح تراجم کئے۔

﴿ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ ﴾

پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔	(محمود الحسن صاحب)
پھر کیا وہ اگر مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں۔	(مودودی صاحب)
سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں۔	(عبد الماجد دریا آباد صاحب)
پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔	(شاہ عبدالقادر صاحب)
بھلا اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں۔	(فتح محمد صاحب)
تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔	(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)



نبی کریم ﷺ کے متعلق ذکر کیا جا رہا ہے، جنگ احد میں جب شیطان نے نبی کریم ﷺ کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیلا دی، صحابہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے، اس وقت رب تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ سے پہلے روگردانی کر جاؤ گے، اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ کون سا معنی نبی کریم ﷺ کی شان کے لائق ہے، ادب و احترام پر دلالت کر رہا ہے، جس میں شہید ہونے اور انتقال فرمانے کا ذکر ہے یا وہ تراجم اچھے ہیں جن میں ”مرگیا یا مارا گیا“ ذکر ہے، یا ذکر ہے ”مر جائیں یا قتل ہو جائیں“ یا ذکر ہے وفات پا جائیں یا مارے جائیں، یا جس میں یہ ذکر ہے (مر جائیں یا مارے جائیں) تراجم کو دیکھنے کے بعد یقیناً یہ کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ہی بہتر ہے، اہل دانش (سمجھدار لوگوں) پر یہ مخفی نہیں۔

(تسکین البہتان فی محاسن کنز الایمان صفحہ ۹۲)

## شان نزول:

در منشور میں کئی روایات نقل کی گئی ہیں، تقریباً مطلب سب کا ایک ہی ہے، الفاظ مختلف ہیں، تفسیر خازن سے شان نزول نقل کیا جا رہا ہے، تاکہ اختصار رہے، در منشور کی تمام روایات کو نقل کرنے میں بہت طوالت پائی جاتی ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ اشتد غضب الله على من قتله نبي في سبيل الله اشتد غضب الله على قوم ادموا وجه نبي الله قالوا وفشا في الناس ان محمداً ﷺ قد قتل فقال بعض المسلمين ليت لنا رسولا الى عبد الله بن ابي فياخذ لنا امانا من ابي سفيان و جلس بعض الصحابة والقوا بايدهم وقال الناس من المنافقين ان كان محمد قد قتل فالحقوا بدينكم الاول، وقال انس بن النضر عم انس بن مالك يا قوم ان كان محمد قد قتل فان رب محمد لم يقتل وما تصنعون بالحياة بعد رسول الله فقاتلوا على ما قاتل عليه، وموتوا على ما مات عليه، ثم قال اللهم اني اعتذر اليك مما يقول هؤلاء يعني المسلمين و ابرأ اليك مما جاء به هؤلاء يعني المشركين ثم شد بسيفه فقاتل حتى قتل ثم ان رسول الله ﷺ انطلق الى الصخرة وهو يدعو الناس، فاول من عرف رسول الله ﷺ كعب بن مالك قال قد عرفت عينه تزهر ان تحت المغفر فناديت باعلى صوتي يا معشر المسلمين ابشروا هذا رسول الله ﷺ فاشار الي ان اسكت فانجازت اليه طائفة من اصحابه فلا مهم النبي ﷺ على الفرار فقالوا يا رسول الله فديناك بآبائنا وامهاتنا اتانا الخير بانك قد قتلت فرعبت قلوبنا فولينا مدبرين، فانزل الله عز وجل وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوتا ہے جسے



اللہ کے نبی اللہ کی راہ میں قتل کر دیں، اور اس قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہے جس نے اللہ کے نبی چہرے کو خون آلود کر دیا، صحابہ کرام نے بیان کیا کہ لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے ہیں، بعض مسلمانوں نے کہا (جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا) کاش کہ ہمیں کوئی قاصد ملتا جس کو ہم عبد اللہ بن ابی (یہ منافقوں کا سردار تھا) کے پاس بھیجتے، وہ ہمیں ابوسفیان سے پناہ لے کر دیتا، اور بعض صحابہ کرام (ایمان میں پختہ، مخلصین) بھی ہتھیار ڈال کر بیٹھ گئے، منافقین کہنے لگے اگر محمد ﷺ شہید ہو گئے تو تم اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ آؤ (یعنی دین اسلام کو چھوڑ دو) حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا تھے، کہنے لگے اے میری قوم اگر محمد ﷺ شہید ہو گئے تو آپ کا رب تو زندہ ہے وہ تو شہید نہیں ہو اور رسول اللہ ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، اسی راہ پر (اللہ کی راہ میں) تم بھی جنگ کرو جس پر رسول اللہ ﷺ نے جنگ کی، اور تم بھی اسی طرح شہید ہو جاؤ جس میں آپ شہید ہوئے، پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے اللہ میں تیرے حضور عذر پیش کرتا ہوں (معافی طلب کرتا ہوں) اس سے جو یہ (نئے نئے اسلام قبول کرنے والے) مسلمان کہہ رہے ہیں، اور اے اللہ مشرکوں سے جو فعل سرزد ہوا (کہ نبی کریم ﷺ کو زخمی کیا) اس سے میں براءت طلب کرتا ہوں، پھر آپ نے نکواری سے کفار پر شدید حملہ کیا قتال کرتے ہوئے شہید ہو گئے، پھر بیشک رسول اللہ ﷺ ایک پتھر کی چٹان کی طرف چلے، اور لوگوں کو بلانے لگے، سب سے پہلے جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا وہ کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ تھے، وہ کہتے ہیں میں نے آپ کی نورانی آنکھوں کی چمک کو خود کے نیچے دیکھا، تو میں نے بلند آواز سے نداء دی، اے مسلمانوں کی جماعت خوش ہو جاؤ رسول اللہ ﷺ یہ ہیں، آپ نے مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا، لیکن صحابہ کرام کا ایک گروہ آپ کے پاس پہنچ گیا، نبی کریم ﷺ نے ان کو ملامت کی کہ تم لوگ کیونکہ پسپا ہو گئے تھے؟ انہوں نے عرض کیا ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ہم نے جب یہ خبر سنی کہ آپ شہید ہو گئے تو ہمارے دلوں پر رعب طاری ہو گیا، تو ہم پسپا ہو گئے، اس وقت یہ آیت کریمہ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ نازل ہوئی۔

(منقول از خازن)

نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر شیطان نے اڑائی:

رمی عبد اللہ بن قمیۃ الحارثی رسول اللہ ﷺ بحجر فکسر رباعینہ و شج وجہہ و اقبل یرید قتله فذب عنه مصعب بن عمیر و هو صاحب الراية يوم بدر و يوم احد حتی قتله ابن قمیۃ فظن انه قتل رسول اللہ ﷺ فقال قد قتلت محمدا و صرخ صارخا الا ان محمدا قد قتل و كان الصارخ الشیطان ففسا فی الناس خبر قتله (رواہ مجاہد و ضحاک)



مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن قمیہ حارثی نے رسول اللہ ﷺ کو پتھر مارا آپ کا رباعیہ دانت مبارک کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا، اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا، وہ آپ کو شہید کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے لشکر کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف سے دفاع کیا، یہ بدر میں بھی علمبردار تھے اور احد میں بھی، یہ دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے، ابن قمیہ کافر نے سمجھا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو شہید کر دیا، اس نے کہا میں نے محمد (ﷺ) کو شہید کر دیا، ادھر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا ہے خبردار بیشک محمد کو شہید کر دیا گیا، وہ چلا چلا کر اعلان کرنے والا شیطان تھا، اس طرح نبی کریم ﷺ کی شہادت کی خبر پھیل گئی۔

حد لنا اسحاق بن نصر حد لنا عبد الرزاق عن معمر بن همام سمع ابا هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اشتد غضب الله على قوم فعلوا بنيه يشير الى رباعيته اشتد غضب الله على رجل يقتله رسول الله ﷺ في سبيل الله.

(بخاری کتاب المغازی باب ما اصاب النبی ﷺ یوم احد)

معمر بن ہمام فرماتے ہیں میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا غضب شدید ہے اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی سے یہ کام کیا، آپ اپنے رباعیہ دانت مبارک کی طرف اشارہ فرما رہے تھے، اور شدید اللہ کا غضب اس شخص پر ہو گا جسے اللہ کے نبی نے اللہ کی راہ میں قتل کر دیا گیا۔

## وضاحت حدیث:

”ان النبی ﷺ لما جرح يوم احد وشج وجهه وكلمت شفته وكسرت رباعيته“  
احد کے دن نبی کریم ﷺ کو جب زخمی کیا گیا تو آپ کا چہرہ زخمی کر دیا گیا، اور آپ کے ہونٹ زخمی کر دیئے گئے، اور آپ کا رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا۔

”رباعيته“ بفتح الراء وبتخفيف الباء الموحدة وتخفيف الباء آخر الحروف وهي السن التي تلي الثانية من كل جانب وللانسان اربع رباعيات“  
انسان کے سامنے والے دو دانت نیچے ٹایا سفلی اور سامنے والے اوپر کے دو دانت ٹایا علیا کہلاتے ہیں، نیچے یا اوپر ٹایا کے ساتھ دائیں طرف اور بائیں طرف ایک ایک دانت رباعیہ کہلاتے ہیں، اس طرح ہر انسان کے چار چار دانت رباعیہ ہیں۔

ابن ہشام نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی کہ بیشک عتبہ بن ابی وقاص فرماتے ہیں ”وهو الذي كسر رباعيته النبي ﷺ السفلى وجرح شفته السفلى“ نبی کریم ﷺ کا نیچے والا رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا تھا، اور آپ کا نیچے والا ہونٹ زخمی ہو گیا تھا۔

(عمدة القاری للنعیمی ج ۱ صفحہ نمبر ۱۵۵)



نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں قتل ہونے والا بد بخت:

اقبل ابی ابن خلف الجمحی وقد حلف لیقتلن محمدا فقال بل انا قتله یا کذاب ابن  
تفر فحمل علیه فطعنه فی جیب الدرع یخور خوار الثور فاحتملوه فلم یلیث  
الابعض یوم حتی راحت روحه الی الهاویة

ابی بن خلف نجی نے قسم اٹھائی کہ وہ ضرور بر ضرور محمد کو قتل کر دے گا، تو آپ نے فرمایا بلکہ میں ہی اسے قتل  
کروں گا، پھر آپ نے فرمایا اے کذاب (بڑے جھوٹے) کہاں بھاگ رہا ہے یہی کہتے ہوئے آپ نے اس پر حملہ کر  
دیا تو اس کی زرہ کے گریبان میں نیزہ مار دیا، وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگ گیا، دوسرے کفار اسے اٹھا کر لے گئے کچھ  
دیر کے بعد ہی وہ مر گیا، اور اس کی روح جہنم کے مقام ہاویہ میں پہنچ گئی۔

اللہ کے شدید غضب کی وجہ:

”اشتد غضب اللہ“ معناه ان ذلک من اعظم السيآت عنده ويجازى عليه

اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر شدید غضب ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ کا نبی قتل کر دے اور اس قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا  
سخت غضب ہوتا ہے جو اللہ کے نبی کو زخمی کر دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بد بختوں کا گناہ بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے  
اس کی سزا بھی بہت بڑی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے شدید غضب سے بڑھ کر اور کیا سزا ہوگی؟

حد لنا قتیبہ بن سعید حد لنا یعقوب عن ابی حازم انه سمع سهل بن سعد وهو یسأل  
عن جرح رسول اللہ ﷺ فقال اما واللہ انی لا عرف من کان یغسل جرح رسول  
اللہ ﷺ ومن کان یسكب الماء وبما دوری قال کانت فاطمة علیها السلام بنت  
رسول اللہ ﷺ تغسله وعلی ﷺ یسكب الماء بالمجن فلما رأت فاطمة ان الماء لا  
یزید الدم الا کثرة اخذت قطعة من حصیر فاحرقتها والصقتها فاستمسک الدم  
وکسرت رباعيته یومئذ وجرح وجهه وکسرت البیضة علی رأسه

(بخاری کتاب المغازی باب ما اصاب النبی من الروح یوم احد)

ابو حازم کہتے ہیں میں نے سهل بن سعد سے سنا جب ان سے رسول اللہ ﷺ کے زخموں کے متعلق پوچھا جا  
رہا تھا، تو وہ فرما رہے تھے، خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک میں جانتا ہوں کون نبی کریم ﷺ کے زخم کو دھورہا  
تھا اور کون پانی بہا رہا تھا اس پر کیا دوا لگائی گئی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ زخموں کو دھورہی  
تھیں اور حضرت علی اس پر ڈھال سے پانی بہا رہے تھے جب حضرت فاطمہ نے دیکھا کہ دھونے سے



خون زیادہ ہی بہہ رہا ہے (بند نہیں ہو رہا) تو آپ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ زخم پر اسے چکا دیا تو خون رک گیا اور اس دن آپ کا ایک رباعیہ دانت ٹوٹ گیا تھا دانت ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آپ کا سر بھی زخمی ہو گیا تھا۔

عن معمر عن الزهري قال ضرب وجه النبي ﷺ يومئذ بالسيف سبعين ضربة وقاه الله شرها كلها“ (رواه عبد الرزاق)

زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں احد کے دن نبی کریم ﷺ کے چہرے پر تلوار کی ستر ضربیں لگائی گئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام کی شر سے محفوظ رکھا ”قیل یحتمل ارادة حقيقة السبعين والمبالغة في الكثرة“ حدیث شریف میں جو ستر ضربوں کا ذکر ہے، اس میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ ستر کی تعداد ہی معتبر ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کثرت معتبر ہو، کیونکہ اہل عرب ستر کو کثرت کے معنی میں بھی عام طور پر استعمال کرتے ہیں، اس صورت میں معنی ہوگا آپ کو کثیر ضربیں، تلوار کی لگائی گئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام کی شر سے محفوظ رکھا۔ (عمدة القاری شرح بخاری ج ۷ صفحہ نمبر ۱۶۱)

روی عبد الرزاق مرسلًا عن الزهري قال ضرب وجه رسول الله ﷺ سبعون ضربة بالسيف وقاه الله شرها كلها ورمى عتبة بن وقاص لعنه الله رسول الله ﷺ بأربعة أحجار فكسرها رباعيته اليمنى السفلى وجرح شفته السفلى“ نبی کریم ﷺ کو عتبہ بن وقاص لعنہ اللہ نے چار پتھر مارے جس سے آپ کا نیچے والا دایاں ایک رباعیہ دانت مبارک ٹوٹ گیا، اور آپ کا نیچے والا ہونٹ مبارک زخمی ہو گیا۔ (منقول از مظہری)

خیال رہے کہ روایات میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ آپ پر پتھراؤ کرنے والا عبد اللہ بن قمیہ بھی تھا اور عتبہ بن وقاص بھی تھا۔

نبی کریم ﷺ اور پندرہ صحابہ کرام کی ثابت قدمی:

روی البهيقي عن المقداد والذي بعثه بالحق ما زال رسول الله ﷺ من مكانه شيرا واحدا والله لقي وجه العدو وتفننى اليه طائفة من اصحابه وتفرق مرة فرما رأته قائما يرمى عن قوسه ويرمي بالحجر وثبت مع رسول الله ﷺ خمسة عشر رجلا ثمانية من المهاجرين ابو بكر وعمر وعلي وطلحة وزبير وعبد الرحمن بن عوف وسعد بن ابي وقاص وابو عبيدة بن الجراح وسبعة من الانصار الحباب بن المنذر وابودجانة وعاصم بن ثابت والحارث بن صمة وسهل بن حنيف وسعد بن معاذ وقيل سعد بن عباد ومحمد بن مسلمة اجمعين“



بیہتی نے حضرت مقداد ؓ سے روایت نقل کی وہ فرماتے ہیں قسم اس ذات کی جس نے نبی کریم ؐ کو حق سے مبعوث فرمایا کہ رسول اللہ ؐ اپنی جگہ سے ایک بالشت بھی نہیں ہٹے، بیشک آپ دشمن کے سامنے جم کر کھڑے رہے، صحابہ کرام کا ایک گروہ لوٹ کر آتا، پھر وہاں سے ہٹ جاتا، (یعنی عجیب حیرانگی چھائی ہوئی تھی، صحابہ کرام کو معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کیا کیا جائے) میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ؐ کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں اپنی قوس سے تیر چلا رہے ہیں، میں نے کئی مرتبہ آپ کو پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا، آپ کے ساتھ پندرہ صحابہ کرام جم کر کھڑے رہے، آٹھ مہاجرین میں سے تھے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہ بن جراح، اور سات انصار سے تھے حضرت حباب بن منذر، حضرت ابودجانہ، حضرت عاصم بن ثابت، حضرت حارث بن صمہ، حضرت بھل بن بن حنیف، حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت محمد بن مسلمہ ؓ اجمعین۔

(منقول از مظہری)

**تنبیہ:** یہ پندرہ صحابہ کرام جم کر کھڑے ہونے والے وہ ہیں جو ظاہری حیات میں قائم رہے، ورنہ شہید ہونے والوں کی اکثریت جم کر کھڑے ہونے والوں کو ہی تھی، حضرت مصعب بن عمیر ؓ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپ نبی کریم ؐ کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ﴾ (سورہ الاحزاب آیہ نمبر ۲۳)

”مسلمانوں میں کچھ وہ مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دیا جو عہد اللہ سے کیا تھا تو ان میں اپنی منت پوری کر چکا۔“ اس آیہ کریمہ میں ان صحابہ کرام کا ذکر ہے جو جم کر کھڑے رہے اور شہید ہو گئے، اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر جن کا ذکر پہلے شان نزول میں ہو چکا ہے، انہوں نے رب تعالیٰ سے کیا ہوا عہد اور مانی ہوئی منت کو کیسے پورا کیا، آئیے ذرا اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

❁ اخبرنا حسان بن حسان حد ثنا محمد بن طلحة حد ثنا حميد عن انس رضي الله عنه ان عمه غاب عن بدر فقال غبت عن اول قتال النبي ﷺ لئن اشهدني الله مع النبي ﷺ ليرين الله ما اجد فلقى يوم احد فهزم الناس فقال اللهم اني اعتذر اليك مما صنع هؤلاء يعني المسلمين و ابرأ اليك مما جاء به المشركون فتقدم بسيفه فلقى سعد بن معاذ فقال اين يا سعد اني اجد ريح الجنة دون احد فمضى فقتل فما عرف



حتى عرفته اخته بشامة او بسانه وبه بضع ولثمانون من طعنة وضربة ورمية بسهم“  
(بخاری ج ۲ کتاب المغازی باب غزوة احد)

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں میرے چچا (انس بن نضر) بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، آپ کہتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کے پہلے غزوہ میں شریک نہیں ہو سکا، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی غزوہ میں حاضر ہونے کی توفیق عطاء فرمادی تو ضرور بر ضرور اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ میں کیا کوشش کرتا ہوں، غزوہ احد میں یہ شریک ہوئے لیکن لوگوں (مسلمانوں) کو وقتی طور پر کچھ پسائی حاصل ہو گئی، انہوں نے عرض کیا اے اللہ بیشک میں تیرے حضور عذر پیش کرتا ہوں جو کام مسلمانوں سے سرزد ہوا، اور میں اس سے بری ہوں جو مشرکوں نے کیا، پھر آپ تلوار لے کر آگے بڑھے، حضرت سعد بن معاذ ؓ سے ملاقات ہو گئی، اے سعد تم کہاں جا رہے ہو؟ میں تو احد کے قریب جنت کی بو پارہا ہوں، پھر آپ نے دشمن سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے، آپ کو کوئی پہچان نہیں رہا تھا کہ یہ شہید ہونے والا کون ہے، یہاں تک کہ آپ کی بہن نے آپ کو نقوش اور انگلیوں کے پوروں سے پہچانا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو اسی سے زائد زخم تلوار اور نیزے اور پتھروں کے آئے تھے۔

رمی سعد بن وقاص حتى اندقت ستة قوسه ونشر رسول الله ﷺ كنانته فقال له ارم  
فداك ابی وامی“  
(رواہ البخاری)

حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے احد کے دن اس ثابت قدمی سے تیر اندازی کی کہ آپ کی چھ کمانیں ٹوٹ گئیں تھیں، نبی کریم ﷺ نے اپنی ترکش کے تمام تیران کے سامنے پھیلا دیئے، آپ نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر قربان تیر مارو (یعنی اسی طرح بہادری سے دشمن کو تاک تاک کر تیر مارو)

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ ”اور نہیں محمد ہیں مگر رسول۔“

”یعنی لیس ہو رہا یہ استحیل علیہ الفنا والموت وما هو يدعو الناس الى عبادته“  
یعنی وہ رب نہیں کہ ان کا انتقال نہ ہو سکے، وہ تو صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے جو ”حی قیوم“ ہمیشہ کیلئے زندہ اور قائم دائم ہے وہ ”حی لا یموت“ وہ ہمیشہ کیلئے زندہ ہے اس پر موت نہیں آتی، نبی کریم ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے ہیں، اس لئے آپ کا انتقال ہو سکتا ہے۔

قد خلت مضت وماتت من قبله الرسل فیسموت هو ایضا“  
آپ سے پہلے رسول گذر چکے ہیں، یعنی ان کا وصال ہو گیا تو آپ کا وصال بھی ہو سکتا ہے۔



﴿أَفَأَنْتُمْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾

”کیا اگر آپ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم پھر جاؤ گے اٹے پاؤں“

یہ سوال ”استفہام انکاری“ قانون کے مطابق ہے، یعنی اگر آپ انتقال فرما جائیں یا شہید ہو جائیں تو کیا تم پہلے کفر یہ دین کی طرف پھر جاؤ گے، جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ آپ سے پہلے انبیاء کرام دنیا سے تشریف لے گئے، تو تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ دین اسلام پر تمہیں قائم رہنا ضروری ہے۔

﴿وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنُيْضِرَّ اللَّهُ شَيْئًا﴾

”اور جو شخص اٹے پاؤں پھرے وہ ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکے گا اللہ کو کچھ بھی“

یعنی کسی کے دین سے پھر جانے، العیاذ باللہ مرتد ہونے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، بلکہ اس شخص کا اپنا ہی نقصان ہے۔

﴿وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ ”اور عنقریب جزاء دے گا اللہ شکر کرنے والوں کو۔“

جو اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی اسلام پر ثابت قدم رہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اجر و ثواب عطاء فرمائے گا۔  
(تفسیر ماخوذ از مظہری)

اسم گرامی سے متعلق بحث:

الحمد الشکر والرضاء والجزاء وقضاء الحق والتحميد حمد الله مرة بعد مرة ومنه  
محمد كأنه حمد مرة بعد مرة (القاموس)

شکر اور رضاء اور جزاء اور قضاء حق (حق کی ادائیگی) پر لفظ ”الحمد“ بولا جاتا ہے اور تحمید کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بار بار تعریف کی جائے، اسی سے لفظ حمد لیا ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بار بار تعریف کئے جانے کی کوئی انتہاء نہیں۔  
(مظہری)

محمد هو المستغرق لجميع المحامد لان الحمد لا يستوجه الا الكامل، والتحميد فوق الحمد، فلا يستحقه الا المستولى على الا مرفى الكمال واكرم الله نبيه وصفيه  
باسمين مشتقين من اسمه جل جلاله ”محمد و احمد“

حضرت محمد ﷺ تمام محامد (تعریفوں) کے جامع ہیں، کیونکہ حمد وہی معتبر ہے جو کامل ہو، اور تحمید حمد سے بھی اوپر درجہ رکھتی ہے، لفظ محمد تحمید سے لیا ہوا ہے، جب تحمید کیلئے ضروری ہے کہ وہ کامل امور پر مشتمل ہو تو لفظ محمد جو آپ کا



اسم گرامی ہے وہی آپ کے کمالات کو واضح کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دو نام وہ عطاء فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اسم گرامی محمود سے مشتق فرمائے ہیں، آپ کے وہ دو اسم گرامی محمد اور احمد (ﷺ) ہیں۔ حضرت حسان (ؓ) نے کیا خوب فرمایا:

الم تر ان الله ارسل عبده ببرهانه والله اعلى وامجد  
وشق له من اسمه ليجله فذوالعرش محمود وهذا محمد

کیا تم نے دیکھا نہیں بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو بھیجا۔ برہان (دلائل و معجزات) عطاء کر کے اللہ بلند اور بزرگ ہے اور اس نے اپنے نام سے آپ کا نام مشتق کیا ہے تاکہ آپ کو بزرگی عطاء کرے، صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔ (ماخوذ از معالم التنزیل للبغوی)

نبی کریم ﷺ کے باپ تو آپ کی ولادت سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے، آپ کی ولادت کے ساتویں روز آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کا نام محمد رکھا ”ولما سئل عن ذلك قال لرؤية رآها رجوت ان يحمد في السماء والارض“ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنے پوتے کا یہ نام کیوں رکھا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں یہی دیکھا کہ میں اپنے پوتے کا یہ نام رکھوں، مجھے امید ہے کہ اس کی تعریف زمین و آسمان میں زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے گی ”محمد“ کا معنی جب یہ ہے کہ جس کی بار بار تعریف کی جائے، زیادہ سے زیادہ تعریف کی جائے اور وہ تعریف کبھی ختم نہ ہو، لفظ محمد کی ضد لفظ مذم ہے، قریش کے کافر لوگ نبی کریم ﷺ کو ”معاذ اللہ“ گالیاں دیتے تھے لیکن مذم کہہ کر گالیاں دیتے تھے، وہ اپنی زبان کو تو سمجھتے تھے، انہیں یہ معلوم تھا کہ محمد کہہ کر گالیاں نہیں دی جاسکتیں، میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ نے رب تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ”الم تروا كيف صرف الله تعالى عني لعن قریش وشتهم يشتمون مني وانا محمد“ کیا تم دیکھتے نہیں ہو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کی گالیوں کو کس طرح پھیرا ہوا ہے، وہ گالیاں دیتے ہیں مذم کو میں تو محمد ہوں (یعنی میں مذم نہیں کہ ان گالیوں کی زد میں آؤں) (روح المعانی)

وعن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ الا تعجبون كيف يصرف الله عني شتم قریش ولعنهم يشتمون مذمما ويلعنون مذمما وانا محمد“ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ باب اسماء النبی ﷺ)

”وقد جمع هذا الاسم الكريم من الاسرار مالا يحصى“ یہ اسم گرامی اتنے راز اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو شمار میں نہیں آسکتے، یہ اسم گرامی نبی کریم ﷺ کے سید الانبیاء ہونے پر بھی دلالت کر رہا ہے، آپ کے متعلق یہ بھی کلام قدیم یعنی قرآن پاک میں بیان کیا گیا ﴿إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ بیشک آپ مرسلین سے ہیں، پھر آپ کا نام بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آپ کے دادا کو القاء کیا گیا یعنی آپ کے دل میں ڈالا گیا



کہ آپ کا نام محمد رکھا جائے تو اسی سے واضح کر دیا کہ جس کا نام ہی محمد (ﷺ) ہے وہ سب انبیاء کرام سے افضل ہے اور سب کا سردار ہے کیونکہ زمین و آسمان میں اس کی سب سے زیادہ تعریف ہو رہی ہے، اس کی تعریف خود انبیاء کرام بھی کر رہے ہیں، پھر آپ کا افضل الانبیاء ہونا اور سید الانبیاء ہونا واضح ہو گیا۔

”وَعبر عنه بهذا الاسم هنالک اول اسمائه واشهر وبه صرخ الصارخ“

یہاں زیر بحث آیت کریمہ میں بھی تمام رسولوں کا ذکر فرمایا ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور آپ کا اسم گرامی بھی ذکر فرمایا ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ میں یہ نام آپ کا سب سے پہلے رکھا گیا، آپ کے اسماء میں سے بھی پہلا ہے اور تمام ناموں میں سے بھی آپ کا نام پہلا ہے کیونکہ اس سے پہلے کسی شخص کا نام محمد نہیں تھا، آپ کا نام تو غیبی آواز دینے والے نے آپ کے دادا کو آواز دے کر بلکہ چلا چلا کر کہا کہ اس بچے کا نام محمد (ﷺ) رکھا جائے، اس سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ افضل الانبیاء ہیں۔

(ماخوذ از روح المعانی)

**تنبیہ:** روح المعانی نے ایک جگہ ذکر فرمایا ”ولما سئل عن ذلك قال لرؤية رآها“ آپ کے دادا سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ نام اپنے پوتے کا کیوں رکھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی حکم دیا گیا کہ میں یہی نام رکھوں، اور دوسری جگہ یہ فرمایا ”وبه صرخ الصارخ“ یہی نام غیبی طور آواز سے رکھنے کا حکم دیا گیا، ان دونوں میں تطبیق بظاہر نظر نہیں آتی، تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ حقیقت میں خواب میں ہی آپ کو یہ نام رکھنے حکم دیا گیا تھا ”وبه صرخ الصارخ“ کا مطلب یہ ہے کہ غزوہ احد میں آواز دینے والا، چلانے والا چلا کر یہ کہہ رہا تھا ”قد قتل محمد“ محمد شہید کر دیئے گئے، اب دونوں جملوں کا علیحدہ علیحدہ مطلب بیان کر دیا گیا، لیکن **دائم** کا موقف ”شروح احادیث میں مختلف الفاظ کو دیکھ کر“ یہ ہے کہ آپ کے دادا کو خواب میں بھی یہ نام رکھنے کا حکم دیا گیا، اور آپ کے دل میں القاء بھی کیا گیا، اور غیبی آواز دینے والے نے بھی یہ کہا کہ یہ نام رکھا جائے، اسی وجہ سے ”وبه صرخ الصارخ“ کا **دائم** نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

قال عباس بن مرداس:

اخاتم الانبياء انك مرسل بالخير كل هدى السبيل هداكا

ان الاله نبى عليك محبة فى خلقه ومحمد اسماكا

عباس بن مرداس نے کہا، اے خاتم الانبیاء بیشک آپ کو بھیجا گیا، خیر عطاء کر کے اور آپ کو تمام سیدھے راستوں کا ہادی بنایا گیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت ڈال دی تمام مخلوق میں اور آپ کا نام محمد رکھا۔ (ماخوذ از قرطبی)



عن جبیر بن مطعم قال سمعت النبی ﷺ ان لی اسماء انا محمد وانا احمد وانا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی وانا العاقب والعاقب الذی لیس بعده نبی“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ باب اسماء النبی ﷺ)

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا بیشک میرے کئی نام ہیں، میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں، اور ماحی ہوں کہ میرے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹاتا ہے، اور میں حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر (میرے پیچھے تابع ہو کر) جمع کئے جائیں گے، اور میں عاقب (آخری نبی) ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

”وسیحمدہ الاولون والآخرون فی المقام المحمود تحت اللواء الممدود“

نبی کریم ﷺ کی تعریف سب اولین و آخرین مقام محمود میں لواء الحمد کے نیچے کریں گے۔ (مرقاۃ ج ۱ صفحہ نمبر ۱۷)

دینی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ میں قصر قلب پایا گیا ہے، اس میں منافقین کا رد پایا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے ضعیف الاعتقاد نئے نئے اسلام قبول کرنے والوں کو کہا ”ان کان محمد قتل فارجعوا الی دینکم و دین آباءکم“ اگر محمد شہید ہو گئے ہیں تو اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہارے آباء اجداد کا دین ہے، تو رب تعالیٰ نے ان کا اس آیت کریمہ کے ذریعے رد فرمایا کہ تم محمد ﷺ کو معبود سمجھ رہے ہو کہ ان کا وصال نہیں ہونا یہ غلط ہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے عبد (بندہ ہیں) ان پر وفات آسکتی ہے، (اسی کو قصر قلب کہا جاتا ہے)

(صاوی)

فأفاد ان محمدا عبد مرسل یجور علیہ الموت لا رب معبود حتی تترك عبادة الله عنه اجل موته لان المقصود من وجوده تبليغ رسالة ربه ولذلك نزل قرب وفاته اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام ديناً ولكن يجب علينا تعظيمه واحترامه حيا وميتاً واعتقاد ان معجزاته باقية واتباعه وطاعته قال تعالى من يطع الرسول فقد اطاع الله ولم يقل وهو حي وقال تعالى (وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ) ولم يقل لاصحابك وقال عليه الصلوة والسلام حياتي خير لكم ومماتي خير لكم ممن اعتقد ان النبی ﷺ لا نفع به بعد الموت بل هو كاحاد الناس فهو الضال المضل“

(صاوی)

اسی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ بیشک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندہ اور رسول ہیں، آپ رب اور



معبود نہیں کہ آپ کے وصال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو ہی چھوڑ دیا جائے، آپ کو موجود کرنے یعنی آپ کو دنیا میں مبعوث کرنے (رسول بنا کر بھیجنے) میں مقصود یہ تھا کہ آپ اپنے رب تعالیٰ کے پیغامات بندوں تک پہنچائیں، اسی وجہ سے آپ کے وصال کے قریب رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”آج میں نے مکمل کر دیا تمہارے لئے تمہارا دین، اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو دین، لیکن ہم پر لازم ہے کہ آپ کی ہم تعظیم کریں، آپ کی ظاہری حیات میں جن خوش بخت مسلمانوں نے آپ کو پایا ان پر اپنی تمام زندگی میں لازم تھا آپ کی تعظیم و احترام کرنا، آپ کے وصال کے بعد بھی مؤمنین پر لازم ہے کہ وہ زندگی بھر آپ کی تعظیم و احترام کریں، اور کہ عقیدہ رکھیں کہ آپ کے معجزات باقی ہیں اور آپ کی اتباع اور اطاعت کرنا ہمیشہ کیلئے باقی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ جس شخص نے (اللہ کے) رسول کی اطاعت کی تحقیق وہ اللہ کا مطیع (فرمانبردار) ہوا“

اس ارشاد گرامی کو زندگی کی حالت سے مقید نہیں کیا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کی ظاہری حیات میں کی وہ اللہ کا مطیع ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد مطلق فرمایا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی وہ اللہ کا مطیع ہوا، یعنی خواہ آپ کی ظاہری حیات میں آپ کی اطاعت کی یا وصال کے بعد آپ کی طاعت کی اور رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کیلئے“ اس آیت کریمہ میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر تم اپنے اصحاب کیلئے رحمت ہو، جب یہ نہیں کہا، بلکہ یہ فرمایا کہ آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں، جب آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں تو تمام جہانوں پر لازم ہے کہ وہ آپ کی فرمانبرداری کریں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم“ میری حیات تمہارے لئے بہتر ہے اور میری وفات تمہارے لئے بہتر ہے، اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی کریم ﷺ اپنے وصال کے بعد نفع نہیں پہنچا سکتے، بلکہ آپ عام لوگوں کی طرح ہی ایک فرد ہیں تو وہ شخص خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔

(صادی)

قصر افراد کا قول صاحب مفتاح نے کیا ہے کہ یہ خلاف مقتضی ظاہر ہے کہ جب انہوں نے آپ کی عدم بقاء کو بعید سمجھا تو گویا کہ انہوں نے آپ کے وصال کو بعید سمجھتے ہوئے انکار کا درجہ حاصل کیا، جیسے کوئی انکار کر دے کہ یہ نہیں ہو سکتا ”کأنهم اعتقدوا فيه وصفين الرسالة والبعد عن الهلاك فقصر على الرسالة نفيا للبعد عن الهلاك“ گویا کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا تھا کہ آپ کو دو وصف حاصل ہیں، ایک رسالت اور دوسرا وصال کا نہ ہونا، تو ایک وصف پر اسے بند کر دیا کہ آپ تو صرف رسول ہیں، آپ کے وصال نہ ہونے کی بات درست نہیں، یہ قصر افراد ہے۔

(روح المعانی)



طلباء کرام خلاصہ کلام یوں یاد کریں:

جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ آپ کا وصال نہیں ہو سکتا تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ یعنی جب آپ رب نہیں بلکہ آپ رسول ہیں آپ پر وفات آ سکتی ہے تو یہ قصر قلب ہے، خیال رہے کہ اس قول میں نفی رسالت نہیں، بلکہ عقیدہ آپ کے وصال کے نہ ہونے کا تھا، جب آپ کے وصال کو ثابت کیا گیا تو قصر قلب ہوا، اس میں یہ اعتراض لغو ہوگا کہ قصر قلب میں تو نفی رسالت کا عقیدہ لازم آئے گا۔

اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ آپ رسول بھی ہیں لیکن پھر بھی آپ کے وصال کے نہ ہونے کا اعتقاد باطل ہے اس مشکل مسئلہ کو طلباء آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ جب کوئی کہے کہ میرا یہ کام حامد نے کیا ہے تو زاہد یہ کہے کہ یہ کام تو میں نے ہی کیا ہے (حامد نے نہیں کیا) یہ قصر قلب ہے، اور اگر کوئی یہ کہے کہ میرا یہ کام حامد اور زاہد نے مل کر کیا ہے تو اس کے جواب میں جب حامد یہ کہے کہ یہ کام تو صرف میں نے کیا ہے میرے ساتھ زاہد شریک نہیں تھا تو یہ قصر افراد ہے۔

نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت اسی آیت کریمہ سے حضرت ابو بکرؓ کا استدلال:

نبی کریم ﷺ کا جب وصال ہوا تو کچھ لوگ کہنے لگے آپ پر وفات طاری نہیں ہوئی، حضرت عمرؓ بھی یہی کہہ رہے تھے اور حضرت عثمانؓ گم سم ہو گئے، کچھ کہہ نہیں رہے تھے، اور حضرت علیؓ لوگوں سے مخفی ہو گئے، جب صحابہ کرام کی پریشانی کا یہ عالم تھا تو حضرت ابو بکرؓ مقام منہج سے یعنی مدینہ طیبہ کے باہر مقام میں تھے وہاں سے آئے تو آپ نے اسی آیت کریمہ سے دلیل پیش کی کہ آپ کا وصال ہو گیا، بخاری میں یہ حدیث اختصار سے پیش کی گئی، ابن ماجہ میں تفصیلاً ذکر ہے، دیکھئے۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہما قالت لما قبض رسول اللہ ﷺ و ابو بکر عند امرأته ابنة خارجة بالعوالي فجعلوا يقولون لم يممت النبی ﷺ انما هو بعض ما كان یاخذ عند الوحي، فجاء ابو بکر فكشف عن وجهه وقبل بين عينيه وقال انت اكرم على الله من ان يميتك مرتين، قد والله مات رسول الله ﷺ وعمر في ناحية المسجد يقول والله مات رسول الله ﷺ ولا يموت حتى يقطع ايدي اناس من المنافقين كثير وارجلهم، فقام ابو بکر فصعد المنبر فقال: من كان يعبد الله فان الله حي لم يممت ومن كان يعبد محمداً فان محمداً (وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبِهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ



شَيْنَاوَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ) قال عمر فلکانی لم اقرأها الا يومئذ (رواه ابن ماجه)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب نبی کریم ﷺ کی روح قبض ہوگئی، تو اس وقت حضرت ابو بکر صدیق ﷺ مدینہ طیبہ کے باہر اطراف میں اپنی زوجہ بنت خاریجہ کے پاس موجود تھے، لوگ کہہ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پر وفات طاری نہیں ہوئی، بلکہ آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہے (کیونکہ وحی کی صورت میں آپ پر کبھی غنودگی طاری ہوتی جو بیہوشی کی طرح ہوتی) حضرت ابو بکر ﷺ آئے تو آپ نے نبی کریم ﷺ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا، اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ کیا، اور عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہیں کہ وہ آپ کو دو مرتبہ وفات عطاء فرمائے (یعنی آپ پر فقط آن کی آن میں وفات طاری ہوئی پھر آپ ہمیشہ زندہ ہو گئے) آپ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو چکا ہے، ادھر حضرت عمر ﷺ مسجد کی ایک طرف کہہ رہے تھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ ﷺ پر وفات طاری نہیں ہوئی، اور نہ ہی آپ کو فوت کیا جائے گا، اگر منافقین نے یہ کہا کہ آپ فوت ہو گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے (حضرت ابو بکر ﷺ مسجد میں آ گئے) آپ کھڑے ہوئے، پھر منبر پر تشریف لے آئے، اور فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ زندہ ہے، وہ فوت ہونے سے پاک ہے، اور جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے تو وہ فوت ہو چکے ہیں، پھر آپ نے یہی آیت کریمہ بطور دلیل پیش کی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يُّنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنُيَضِرَ اللّٰهُ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ﴾ حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں (میری پریشانی کا یہ عالم تھا) کہ میں نے گویا کہ یہ آیت کریمہ پڑھی ہی نہیں، اب حضرت ابو بکر ﷺ سے سن رہا ہوں۔

والی ابو نصر عبید اللہ نے اپنی کتاب ”الابانۃ“ میں ذکر کیا ”ورجع عن مقالته التي قالها“ حضرت عمر ﷺ جو یہ فرما رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا نہ وصال ہوا اور نہ ہوگا، اس قول سے آپ نے رجوع فرمالیا، والی کی مکمل روایت دیکھئے۔

عن انس بن مالك انه سمع عمر بن الخطاب حين بويع ابو بكر في مسجد رسول الله ﷺ واستولى على منبر رسول الله ﷺ تشهد قبل ابي بكر فقال اما بعد فاني قلت لكم امس مقالة وانها لم تكن كما قلت، واني والله ما وجدت المقالة التي قلت لكم في كتاب النزله الله ولا في عهد عهده الى رسول الله ﷺ ولكني كنت ارجو ان يعيish رسول الله ﷺ حتى يدبرنا، يريد ان يقول حتى يكون آخرنا موتا، فاختر الله عز وجل رسوله الذي عنده على الذي عندكم، وهذا الكتاب الذي هدى الله به رسوله



فخذوا به تهتدوا لما هدى له رسول الله ﷺ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا، جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ کی مسجد میں بیعت کی گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پہلے شہادتیں پڑھیں، پھر آپ نے کہا ”اما بعد“ بیشک میں نے کل تمہیں کہا تھا، لیکن ایسے نہیں تھا جیسے میں نے کہا، بیشک میں نے اپنی بات کو کتاب اللہ میں نہیں پایا، اور نہ ہی میرے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کا کوئی وعدہ فرمایا تھا، لیکن میں امید رکھتا تھا کہ آپ ظاہری حیات میں ہم میں موجود رہیں گے، لیکن آپ ہمیں پیچھے چھوڑ کر تشریف لے گئے، ہمارے ارادہ میں یہ تھا کہ آپ ہم سب کے بعد تشریف لے جائیں گے، لیکن وہ ذات کریم جو ہم میں موجود تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ہاں پسند کر لیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب جو کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے بھی ہدایت تھی اسی کے مطابق تم عمل کرو تا کہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر تم قائم رہو۔

یعنی صحابہ کرام اتنی پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کو یہ آیہ کریمہ، اور دوسری آیات جن میں وفات کا ذکر ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اور ﴿إِنَّكَ مَبِئْتُ وَإِنَّهُمْ مَبِئُونُ﴾ گویا کہ ان کو بھول ہی گئی تھیں، یوں سمجھا رہا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سن رہے ہیں ”وخرج الناس يتلونها في سلك المدينة كأنها لم تنزل قط الا ذلك اليوم“ لوگ مدینہ طیبہ کی گلیوں میں ان آیات کو یوں پڑھ رہے تھے کہ پتہ چل رہا تھا کہ یہ آج ہی نازل ہوئی ہیں ایسے وقت میں جب کہ تمام صحابہ کرام کے حوصلہ پست ہو گئے تھے، اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بہادری اور علم سے کام لیتے ہوئے یہ آیہ کریمہ پڑھ کر تمام کو مطمئن کر دیا ”هذا الآية ادل دليل على شجاعة الصديق وجرائه“ تو یہ آیہ کریمہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور جرأت پر دلالت کر رہی ہے، کامل شجاعت و جرأت وہی ہوتی ہے جو مصائب کے وقت دل مطمئن رہے، نبی کریم ﷺ کے وصال سے بڑھ کر اور بڑی مصیبت کیا ہو سکتی تھی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنے دل کو مطمئن رکھنا آپ کی شجاعت و جرأت کی وجہ سے ہی تھا۔ (ماخوذ از قرطبی)

نبی کریم ﷺ کو موت و حیات میں اختیار دیا گیا، آنے والی احادیث مبارکہ مشکوٰۃ کے باب الکرامات کے بعد باب سے ذکر کی جا رہی ہیں مشکوٰۃ میں صرف ”باب“ لکھا گیا ہے عنوان قائم نہیں کیا گیا البتہ مرقاۃ میں بیان کیا گیا ہے ”فقیل المعنى هذا باب في بيان هجرة اصحابه من مكة وبيان وفاته ﷺ“ اور بعض نسخوں میں باب کا یہ عنوان قائم کیا گیا ”باب ما يتعلق بموته ﷺ من المقدمات“

عن ابی السعید الخدری رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ جلس علی المنبر فقال ان عبدا خیرہ اللہ بین ان یؤتیہ من زهرة الدنيا ماشاء و بین ما عنده فاختر ما عنده فبکی ابو بکر قال



فدیناک بآبائنا وامهاتنا فعجبنا له فقال الناس انظروا الى هذا الشيخ يخبر رسول الله ﷺ عن عبد خيره الله بين ان يؤتيه من زهرة الدنيا وبين ما عنده وهو يقول فديناک بآبائنا وامهاتنا فكان رسول الله ﷺ هو المخیر وكان ابو بکر اعلمنا "متفق علیه"

حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں، بیشک رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے، تو آپ نے فرمایا "ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کے منافع حاصل کر لے جب تک چاہے، یا اسے پسند کر لے بندے کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کے منافع حاصل کر لے جب تک چاہے، یا اسے پسند کر لے جو اس کیلئے (مدارج اور نعمتیں) اللہ تعالیٰ کے ہاں ہیں، تو اللہ کے بندے نے اللہ تعالیٰ کے ہاں نعمتوں کو پسند کر لیا ہے، تو حضرت ابو بکرؓ رونے لگے، عرض کرنے لگے "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان" ہمیں ان پر تعجب ہوا، لوگ کہنے لگے، اس شیخ کی طرف دیکھئے، نبی کریم ﷺ ایک بندے کی خبر دے رہے ہیں کہ رب تعالیٰ نے اسے اختیار دیا ہے کہ چاہے تو وہ دنیا کی نعمتوں کو پسند کر لے اور چاہے تو آخرت کی نعمتوں کو پسند کر لے، او یہ (شیخ رورہے ہیں اور) کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے متعلق ہی خبر دی تھی کہ آپ کو اختیار دیا گیا، حضرت ابو بکرؓ ہم سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

### حدیث پاک کی مختصر وضاحت:

حضرت ابو بکرؓ کے رونے کی وجہ آپ کی کامل سمجھ اور کامل علم تھا کہ آپ کو پتہ چل گیا تھا کہ اس مرض کی حالت میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی آپ کے اپنے متعلق ہی ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مقدمات مراتب اولیاء سے تھا، کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو خصوصی مراتب سے نوازتا ہے، صرف اپنے وصال کی خبر اشارہ سے دینی مقصود نہیں تھی، بلکہ نبی کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خبر واضح طور پر دے، راوی نے کہا کہ تعجب کر رہے تھے کہ یہ شیخ کہہ رہے ہیں "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان" اور یہ کیوں رورہے ہیں، یہ درحقیقت دوسرے لوگوں کا نبی کریم ﷺ کے اشارہ کو نہ سمجھنا تھا، حضرت ابو بکرؓ کو شیخ کہنے کی دو وجہ تھیں، ایک آپ کی عمر کی زیادتی کہ آپ اس وقت اکاسٹھ سال کے تھے، اور دوسری وجہ آپ کی عقل اور فہم (سمجھ) کی زیادتی تھی "ان کبرہ المقتضی لو قارہ و زیادة عقله وفهمه" آپ کی عمر کی زیادتی اور آپ علم و عقل کی زیادتی کا یہی تقاضا تھا کہ آپ کی عزت کرتے ہوئے آپ کیلئے لفظ شیخ (بزرگ) کا استعمال کیا جائے، آپ کے اس ارشاد گرامی کے بعد جلدی ہی آپ کا وصال ہو گیا تو لوگوں کو پتہ چل گیا کہ آپ کا ارشاد اپنے متعلق ہی تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے کامل علم کی وجہ سے اسے سمجھ رہے تھے جسے ہم نہیں سمجھ سکے۔

(مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۶، ۲۳۷)



تمام انبیاء کرام موت و حیات میں مختار تھے:

عن عائشة قالت سمعت رسول الله ﷺ يقول ما من نبي بمرض الا خير بين الدنيا والآخرة وكان في شكواه الذي قبض فيه اخلاؤه، بحة شديدة فسمعتة يقول مع الدين انعمت عليهم من النبيين والصديقين والشهداء الصالحين فعلمت انه خير (متفق عليه)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کوئی نبی نہیں کہ وہ مریض ہوں مگر یہ کہ انہیں دنیا اور آخرت (میں سے ایک) کا اختیار دیا جاتا ہے، جب آپ مریض ہو گئے جس مرض میں آپ کا وصال ہو گیا، اور آپ کو سانس کی شدید تکلیف ہوئی، تو میں نے آپ سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے (ان لوگوں کے ساتھ جن پر تیرا انعام ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین) تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو بھی اختیار دے دیا گیا ہے۔  
(فعلمت انه خير) ”الی بین القاء فی الدنيا وما عند الله فی الاخری من لقاء المولی“

تو مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا ہے یعنی چاہیں تو دنیا میں باقی رہیں، اور چاہیں تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں، اور آخرت میں اس کے ہاں نعمتوں کی طرف تشریف لے جائیں۔  
(مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۰)

حدیث پاک میں استعمال الفاظ کی وضاحت:

(شکواه ای فی مرضه) کان فی شکواه کا معنی یہ ہے آپ اپنی مرض میں تھے۔

(بُحَّة) کا معنی ”غلظ الصوت وخشونته“ آواز کو موٹا ہو جانا اور آواز کی سختی کا پیدا ہونا۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ”ہی شنی يغوص فی الحلق فيغير له الصوت فيغلظ“ کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی چیز گلے میں رک جائے جس کی وجہ سے اس کی آواز بدل جائے اور موٹی ہو جائے۔

”وقيل المراد هنا سعلة، ففي القاموس السعال والسعلة بضمهما وهي حركة تدفع

بها الطبيعة اذی عن الرنة والاعضاء التي تتصل بها“

بعض حضرات نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پھیپھڑوں کی تکلیف کی وجہ سے جو کھانسی کی کیفیت پیدا ہوتی

ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۴۰)

مطلب سب کا وہی ہے جو واقعہ نے اپنے ترجمہ میں سب اقوال کو جمع کر لیا ”آپ کو سانس کی تکلیف ہوئی“



## مرض وصال میں نبی کریم ﷺ کی بے قراری کی وجہ:

عن عائشة قالت ان من نعم الله على ان رسول الله ﷺ توفي في بيتي وفي يومي وبين سحري ونحري وان الله جمع بين ريقی وريقه عند موته دخل على عبدالرحمن ابن ابي بكر وبيده سواك وانا مسندة رسول الله ﷺ فرأيتہ ينظر اليه وعرفت من طبعه انه يحب السواك فقلت آخذه لك فاشار برأسه ان نعم فتناوله فاشتد عليه وقلت اليه لك فاشار برأسه ان نعم فلينته فامرہ وبين يديه ركوة فيهما ماء فجعل يدخل يديه في الماء فيمسح بهما وجهه وهو يقول لا اله الا الله ان للموت سكرات ثم نصب يده فجعل يقول في الرفيق الا على حتى قبض ومالت يده“ (رواه البخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بیشک اللہ کی نعمتوں میں سے مجھ پر یہ (عظیم) نعمت تھی کہ نبی کریم ﷺ کا وصال میرے حجرہ میں ہوا، اور میرے دن (میری باری کے دن) میں ہوا، اور میرے سینہ اور میرے سینہ کے اوپر گلے کے ساتھ ہڈیوں کے درمیان آپ کا سر تھا اس حال میں آپ کا وصال ہوا (یعنی آپ نے میرے سینہ کے ساتھ سہارا لگایا ہوا تھا) اور آپ کی وفات کے وقت اللہ تعالیٰ نے میرے اور آپ کے لعاب کو جمع فرمایا، میرے پاس (میرے بھائی) عبدالرحمن بن ابی بکر آئے ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، میں نے نبی کریم ﷺ کو سہارا دیا ہوا تھا، میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ میری طرف دیکھ رہے ہیں مجھے آپ کی طبیعت کے بارے میں علم تھا کہ آپ مسواک کو پسند کرتے ہیں، میں نے عرض کیا، میں آپ کیلئے کیا یہ مسواک لے لوں؟ آپ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا ہاں لے لو، آپ نے اسے اپنے منہ میں لیا لیکن وہ سخت تھی (اسے چبانا مشکل تھا) تو میں نے کہا کیا میں آپ کو نرم کر دوں؟ آپ نے سر کے اشارہ سے فرمایا کہ ہاں لے لو، میں نے اس مسواک کو اپنے دانتوں سے نرم کیا اور آپ کے دانتوں پر اسے میں پھیرنے لگی (اس طرح میرا اور آپ کا لعاب جمع ہو گیا) آپ کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا، آپ اپنے ہاتھوں کو پانی میں داخل کرتے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرتے، اور آپ یہ فرما رہے تھے ”لا اله الا الله ان للموت سكرات“ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں، بیشک موت کے سكرات ہیں پھر آپ نے اپنا ہاتھ اٹھایا، اور آپ کے ہاتھ ڈھلک گئے (آپ کی بے قراری کی وجہ یہی تھی کہ آپ رفیق اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ سے ملنے کو بے قرار و بے تاب تھے۔

## مختصر وضاحت حدیث:

جامع الاصول میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ابتدائی تکلیف سر کے درد سے شروع ہوئی، جبکہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا



کے حجرہ میں تھے، پھر آپ کی تکلیف بڑھ گئی جب آپ کا وصال ربیع الاول میں پیر کے دن تھا، وقت چاشت کا تھا، آپ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا، یا بارہ ربیع الاول کو ہوا اگرچہ بارہ ربیع الاول والا قول زیادہ مشہور ہے، اور زیادہ حضرات کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن تحقیق کی نظر سے پہلا قول زیادہ معتبر ہے کہ آپ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا، کیونکہ دو مسائل میں اتفاق ہے کہ آپ نے حج الوداع جب فرمایا تو ذی الحج جمعہ کا دن تھا، اور آپ کا جب وصال ہوا تو پیر کا دن تھا، ذی الحج کے بیس یا اکیس دن محرم اور صفر کے تیس تیس دن اور ربیع الاول کے اگر بارہ دن لئے جائیں تو کل دن ترانوے بنتے ہیں جب تمام چاند تیس تیس دن کے شمار ہوں لیکن ان میں ایک یا دو چاند انتیس کے ہیں اس طرح کل دن اکانوے ہوئے، جب نو ذی الحج جمعہ ہو تو اکانوے دنوں کے بعد بارہ ربیع الاول جمعرات کو بنتی ہے لہذا بارہ ربیع الاول کو پیر کے دن وصال والا قول تحقیق کے طور پر صادق نہیں آتا، اور دو ربیع الاول تک اکا سی دن بنتے ہیں، جب نو ذی الحج جمعہ ہو اور اس کے اکا سی دن بعد دو ربیع الاول پیر بنتا ہے لہذا تحقیقی قول آپ کے وصال کا دو ربیع الاول والا ہی ہے یہی وجہ ہے کہ چشتی اولیاء کرام کے درباروں میں آپ کا یوم وصال دو ربیع الاول کو منایا جاتا ہے، دربار عالیہ گولڑہ شریف ”جو واقف کا پیر خانہ ہے“ میں سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کے دور سے لے کر آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ (راقم)

”سکرات الموت“ ای شدا ئد و مشقات عظیمہ“ سکرات موت کا معنی موت کے شدا ئد اور عظیم مشقت مراد ہے، ترمذی شریف ”منکرات الموت او سکرات الموت“ مذکور ہے، جو راوی کو شک ہے تاہم دونوں کا معنی ایک ہے ”ثم نصب یدہ“ پھر آپ نے اپنا ہاتھ دعاء کیلئے اٹھایا، یا آسمانوں کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اٹھایا، پھر آپ نے دعاء فرمائی ”بالرفیق الا علی“ اے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ سے ملا دے، رفیق اعلیٰ سے مراد کیا ہے؟ اس کے کئی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔

- (۱) اے اللہ مجھے انبیاء کرام سے ملا دے۔ (۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے مقام محمود میں پہنچا دے۔
  - (۳) تیسرا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے جنت میں پہنچا دے۔ (۴) چوتھا مطلب یہ ہے کہ ”رفیق اعلیٰ“ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے کہ اے اللہ مجھے اپنے آپ سے ملا لے اس پر کچھ بحث ہے ”وقبل الرفیق الا علی من اسمائہ تعالیٰ من الرفق“ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”الرفیق الا علی“ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی سے ہے، اور رفیق سے ماخوذ ہے
- ”ثم رأیت النور بشتی قال قد ذهب بعضهم فی الرفیق الا علی انه اسم من اسماء اللہ تعالیٰ“  
تو بشتی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ رفیق اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی سے ہے۔



”قال الازهری غلط قائل وقوله ان الله رفيق لم يوجب اطلاق هذا الاسم عليه“ ازهری نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام رفیق نہیں، اس لئے اس پر رفیق کا اطلاق صحیح نہیں

”قال الفاضل الطیبی لم لا يجوز ان يستدل بهذا الحديث على اطلاق هذا الاسم عليه وما المانع“ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس حدیث پاک سے اس پر دلیل پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق صحیح ہے کوئی مانع موجود نہیں۔ (ازمرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۹)

راقم نے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسماء کے توقیفی ہونے یا غیر توقیفی ہونے کی بحث بہت تفصیل سے نجوم الفرقان کی جلد اول میں بیان کی ہے، ارباب ذوق وہیں دیکھیں، مسئلہ کو سمجھانے کیلئے صرف ایک فیصلہ کن بحث کو دوبارہ ذکر کر رہا ہوں۔

**نکتہ:** علامہ غزالی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اسم اور چیز ہے، صفت اور، آپ نے فرمایا۔

”اسمی ومحمد واسمک ابو بکر فهذا من باب الاسماء واما الصفات فمثل هذا الانسان بكونه طويلا فقيها كذا وكذا“

میرا نام محمد ہے اور تمہارا نام ابو بکر ہے، اسے اسم کہا جاتا ہے، لیکن جب کہا جائے کہ یہ انسان لمبا ہے، یہ فقیہ ہے، زائد ہے، متقی ہے، بخشنے والا وغیرہ یہ صفات ہیں۔

اذا عرفت هذا الفرق فيقال اما اطلاق الاسم على الله قال يجوز الا عند روده في القرآن والخبر واما الصفات فانه لا يتوقف على التوقيف“ (از تفسیر کبیر)

جب تمہیں اسم اور صفت میں فرق کا پتہ چل گیا تو اب یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء تو دعویٰ ہوں گے، جن کا ذکر قرآن پاک اور احادیث میں ہوگا، البتہ صفات اللہ تعالیٰ کی بے حد ہیں، وہ توفیقیہ نہیں۔

اس بحث کے بعد واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ پر بطور صفت ”رفیق اعلیٰ“ کا اطلاق صحیح ہے، اب مسئلہ مہر کر واضح ہو گیا کہ حقیقت میں بے قراری کی وجہ رب تعالیٰ سے ملاقات تھی، کہ ملاقات میں تاخیر نہ ہو، بلکہ ملاقات جلدی ہو، اگرچہ بظاہر تکلیف، سر درد، اور کبھی کبھی بیوشی کا طاری ہو جانا بھی تھا، جہاں تک آپ کی دعاء میں ”اللهم اعنني على منكرات الموت“ یا ”اللهم اعنني على سكرات الموت“ کے الفاظ ہیں، کہ اے اللہ میری امداد فرما منکرات موت پر اور سكرات موت پر، یہ تعلیم امت کیلئے دعاء تھی، اور رب تعالیٰ کی قدرت اور اپنے عجز کا اظہار تھا۔ (راقم)

نبی کریم ﷺ کو اپنی وفات کا وقت معلوم تھا:

وعن انس قال لما نقل النبي ﷺ جعل ينفشاه الكرب فقالت فاطمة واكرب اياه فقال



لیس علی ابیک کرب بعد الیوم فلما مات قالت یا ابتاه اجاب ربا دعاه یا ابتاه من  
جنة الفردوس ماواه یا ابتاه الی جبریل نعاہ فلما دفن قالت فاطمة یا انس اطابت  
انفسکم ان تحنوا علی رسول اللہ ﷺ التراب“  
(رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، جب نبی کریم ﷺ پر بیماری شدید ہو گئی، تو آپ کو تکالیف نے ڈھانپ لیا، تو  
حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے کہا، ابا جان پر کتنی ہی بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے، تو آپ نے فرمایا کل تمہارے  
باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، جب آپ کا (دوسرے دن ہی) وصال ہو گیا تو حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے  
کہا ”اے ابا جان آپ نے اپنے رب کے بلائے کو قبول کر لیا ہے“ اے ابا جان جنة الفردوس آپ نے اپنا ٹھکانا  
بتا لیا، اے ابا جان ہم جبریل سے آپ کی وفات کا تذکرہ کرتے ہیں، جب آپ کو دفن کر دیا گیا، تو آپ نے کہا ”اے  
انس کیا تم لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر مٹی ڈالنی پسند کر لی تھی۔

حدیث پاک کی مختصر وضاحت:

فقال لها ليس علي ابك كرب بعد اليوم یعنی ان الكرب كان به شدة الالم  
، وصعوبة الوجع وبعد هذا اليوم لا يكون ذلك لان الكرب كان بسبب العلائق  
الجسمانية وبعد اليوم ينقطع العلائق الصورية“

آپ کے ارشاد گرامی کہ ”آپ کے باپ پر آج کے بعد کوئی مصیبت نہیں رہے گی“ کا مطلب یہ ہے کہ آپ  
نے اپنے وصال کی خبر دے دی کہ آج ہی میرا وصال ہو رہا ہے، اس تکلیف کا تعلق درد کی شدت، اور مرض کی وجہ سے  
مشکل تکلیف ہے، جب وصال ہو جائے گا تو تکالیف خود بخود اٹھ جائیں گی، یعنی صوری تکالیف ختم ہو جائیں  
گی، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ وصال پر الفاظ گرامی ”یا ابتاه اجاب ربا دعاه، الخ“ سے  
پتہ چلا کہ کسی کی وفات پر نوحہ کرنا تو منع ہے لیکن اظہار غم کی وجہ سے اس قسم کے الفاظ ذکر کرنا جائز ہے، جو آپ کے  
اظہار غم سے واضح ہو رہا ہے۔

(یا ابتاه الی جبریل نعاہ) ای نظہر خبر موته الیہ من النعی، وفی الا زہار ای لبکی  
الیہ وقیل نعزیہ وقیل نخبرہ“

”نعاہ“ النعی سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہوتا ”موت کی خبر دینا“ یعنی بے قراری میں آپ یوں کہہ رہی  
تھیں کہ ہم آپ کی وفات کی خبر کا اظہار جبریل سے کریں گے، کہ اے جبریل اب تمہارا وحی لانا ختم ہو چکا ہے، اور معنی



یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم اپنا رونا جبریل کو دکھائیں گے، اور معنی یہ بیان کیا گیا کہ ہم جبریل سے تعزیت کریں گے، اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم جبریل کو آپ کی وفات کی خبر دیں گے، یہ وہی معنی جو سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے اس لحاظ پر کل تین معانی بیان ہوئے، ان تین میں سے بہتر کون سا معنی ہے، اس کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ”اقول و اوسطھا اعلاھا“ میں کہتا ہوں ان تین معانی میں سے جو درمیان میں مذکور ہے وہی مراد لینا زیادہ بہتر ہے، وہ تعزیت ہے، خیال رہے کہ تعزیت کا معنی ”کسی کو صبر دلانا“ یعنی ہم خود بھی صبر سے کام لیں گے اور جبریل کو بھی صبر دلانے گے، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے آپ کے وصال پر مرثیہ کہا۔

ماذا على من شم تربة احمد ان لا يشم مدى الزمان غوا ليا

کیا ہے اس پر جس نے نبی کریم ﷺ کی تربت کو سونگھا وہ نہیں سونگھے گا طویل زمانہ مصائب و آلام

صبت على مصائب لو انها صبت على الايام صرن ليا ليا

مجھ پر اتنی مصیبتیں ڈال دی گئیں اگر وہ دنوں پر ڈال دی جاتیں تو یقیناً وہ راتیں بن جاتیں

عن عائشه قالت لما قبض رسول الله ﷺ اختلفوا في دفنه فقال ابو بكر سمعت من

رسول الله ﷺ شيئا قال ما قبض الله نبيا الا في الموضع الذي يحب ان يدفن فيه

ادفنه في موضع فراشه (رواه الترمذی)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا، تو صحابہ کرام کا آپ کے دفن کے

بارے میں اختلاف ہوا، تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے

متعلق کچھ سنا ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح کو قبض نہیں فرماتا مگر اسی جگہ پر جہاں وہ

اپنے نبی کے دفن ہونے کو پسند کرتا ہے، اس لئے آپ کو وہیں دفن کرو جہاں آپ روح کے قبض ہونے

کے وقت تشریف فرما تھے۔

### مختصر وضاحت حدیث:

”اختلفوا في دفنه اي في موضع دفنه“ صحابہ کرام کا آپ کے دفن میں اختلاف ہوا کہ کس جگہ آپ کو

دفن کیا جائے، بعض نے کہا آپ کو مکہ مکرمہ میں دفن کیا جائے، اور بعض نے کہا آپ کو اپنے جدا مجد ابراہیم علیہ السلام کے

پاس دفن کیا جائے ”او في نفس الدفن“ اسی طرح صحابہ کرام پریشانی کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی نہیں کر پارہے تھے کہ

آپ کو دفن بھی کرنا ہے یا نہیں۔

كما روى الترمذی في الشمايل عن سالم بن عبيد و كانت له صحبة قالوا لابي بكر يا



صاحب رسول اللہ ﷺ اید فن رسول اللہ ﷺ؟ قال نعم "قالوا این؟ قال فی المكان الذی قبض اللہ فیہ روحہ فان اللہ لم یقبض روحہ الا فی مکان طیب فعلموا انه قد صدق"

ترمذی نے شامل (باب) میں سالم بن عبید کی روایت نقل کی کہ وہ صحابی تھے، صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کیا نبی کریم ﷺ کو دفن کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں دفن کیا جائے گا، پھر صحابہ کرام نے پوچھا آپ کو کہاں دفن کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا اسی جگہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو قبض کیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو نہیں قبض کیا مگر اسی جگہ میں جو پاکیزہ ہے، صحابہ کرام نے معلوم کر لیا، بیشک آپ نے سچ کہا ہے (فقال ابو بکر سمعت من رسول اللہ ﷺ شیئا) ای ما نسیته حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنا ہے، یعنی میں اسے بھولا نہیں "ما نسیته" کے الفاظ شامل ترمذی میں موجود ہیں۔

(فقال ای رسول اللہ) ما قبض اللہ نبیا الا فی الموضع الذی یجب) ای النبی او یرید اللہ (ان یدفن) ای ذلک النبی فیہ الی فی ذلک المكان

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نہیں قبض کرتا کسی نبی کی روح کو مگر اسی جگہ میں جسے وہ پسند کرتا ہو دفن کئے جانے کو، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ وہ نبی جس جگہ دفن ہونے کو پسند کریں وہاں ان کی روح کو قبض کیا جاتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس نبی کو یہاں دفن کیا جانا چاہیے وہاں روح کو قبض کیا جاتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد صحابہ کرام کو کہا "ادفنوه فی موضع فراشه" نبی کریم ﷺ کو وہاں ہی دفن کرو جہاں آپ کی چار پائی اور بستر تھے۔

اللہ تعالیٰ کا نبی جہاں فوت ہوتا ہے، وہاں ہی دفن کرنے کی حکمت یہ ہے کہ "لیکون شرف المكان بالمکین ویتشرف به اهل التمكن" اس جگہ کو اللہ کے نبی "جنہوں نے وہاں مکین ہونا ہے" سے شرف حاصل ہو جائے پھر مکان کی شرافت و برکت سے اس بستی کے تمام باشندوں کو برکت حاصل ہوتی ہے۔

اللہ کے نبی وصال سے پہلے اپنا مکان جنت میں دیکھ لیتے ہیں:

عن عائشہ قالت کان رسول اللہ ﷺ یقول وهو صحیح انه لن یقبض لہ حتی یری مقعده من الجنة ثم یخیر "الحديث"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ حالت صحت میں فرماتے تھے کہ ہرگز کسی نبی کی روح قبض نہیں کی جاتی یہاں تک کہ وہ اپنا مکان جنت میں دیکھ لیتے ہیں، پھر انہیں اختیار دے دیا جاتا ہے



(کہ جنت میں آنا چاہتے ہو یا دنیا میں رہنا چاہتے ہو، جسے چاہتے ہو پسند کرلو)

وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يقول في مرضه الذي مات فيه يا عائشة ما ازال اجد الم الطعام الذي اكلت بخير وهذا اوان وجدت انقطاع ابهرى من ذلك السم

(رواه البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ اپنی اس مرض میں ارشاد فرماتے تھے جس میں آپ کا وصال ہو گیا کہ اے عائشہ میں ہمیشہ اس طعام کا درد پاتا رہا جو میں نے خیبر میں کھایا تھا میں اس وقت یہ سمجھتا ہوں کہ میرے دل کی رگیں س زہر کی وجہ سے کٹ رہی ہیں۔

### مختصر وضاحت:

خیبر میں ایک یہودیہ عورت نے آپ کو بکری کا زہر آلود گوشت دیا تھا، جو آپ نے معمولی یعنی ایک لقمہ تناول کرنے پر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا تھا کہ اس گوشت نے میرے ساتھ کلام کیا ہے کہ میں زہر آلود ہوں، وہ جو ایک لقمہ گوشت کھایا تھا اس کا اثر لگا تا رہا جاری رہا کہ آپ کو درد محسوس ہوتا رہا، یہاں تک کہ وصال کے وقت اس کا اثر زیادہ مقدار میں لوٹ کر آ گیا، جس کی وجہ سے آپ کا وصال ہو گیا، اس طرح آپ کو درجہ شہادت حاصل ہو گیا۔ (ازمرقاۃ باب صلوة النبی ﷺ) (ابہری) بفتح الهمزة والهاء بينهما موحدة وهو عرق يتعلق به القلب "دل کے ساتھ رگ کو" ابہری "کہا جاتا ہے یہ رگ کٹ جائے تو انسان پر وفات طاری ہو جاتی ہے (السم) سین پر تینوں حرکتیں پڑھی جاسکتی ہیں، ضمہ، فتح، کسرہ "والضم اشهر" پیش زیادہ مشہور ہے "والفتح اکثر" لیکن اب تلفظ زیادہ زبر سے ہی ہو رہا ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۳)

نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ میں کوئی امام نہیں تھا:

یعنی آپ کی نماز جنازہ ہماری نماز جنازہ کی طرح نہیں تھی، بلکہ صحابہ کرام تھوڑی تعداد میں آتے اور آپ پر درود پاک اور دعاء پڑھ کر چلے جاتے۔

قد خرج ابن ماجة باسناد حسن بل صحيح من حديث ابن عباس وفيه فلما فرغوا من جهازه يوم الثلاثاء وضع على سريرته في بيته، ثم دخل الناس على رسول الله ﷺ ارسالا يصلون عليه حتى اذا فرغوا ادخلوا النساء حتى اذا فرغن ادخلوا الصبيان ولم يؤم الناس على رسول الله ﷺ



حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو ابن ماجہ نے سند حسن بلکہ سند صحیح سے تخریج کی اس میں یہ ذکر ہے کہ جب لوگ نبی کریم ﷺ کے کفن و دفن سے منگل کے دن فارغ ہوئے، تو آپ کو اپنے گھر چار پائی پر رکھ دیا گیا، لوگ تھوڑی تھوڑی تعداد میں آگے پیچھے آتے رہے اور درود پاک پڑھ کر واپس ہو جاتے، یہاں تک کہ جب سب مرد فارغ ہو گئے تو عورتوں کو اجازت دی گئی، جب وہ سب فارغ ہو گئیں تو بچوں کو اجازت دی گئی، رسول اللہ ﷺ پر (نماز جنازہ میں) کوئی امام نہیں تھا۔ (منقول از قرطبی)

امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جنازہ شریف پر کسی نے امامت نہیں کی کیونکہ آپ ایام حیات اور ممات میں سب کے امام ہیں، نبی کریم ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ پر متعدد نمازیں پڑھی گئیں، اور تنہا تنہا لوگوں نے پڑھیں، ورنہ عام لوگوں کی ایک ہی نماز جنازہ ہے، اور وہ بھی جماعت سے یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ پر کون سی دعاء پڑھی جائے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھو، جب لوگوں نے آپ سے پوچھا، تو آپ نے فرمایا تم یہ دعاء پڑھو۔

”ان الله وملائكته يصلون على النبي يا ايها الذين امنوا صلوا عليه وسلموا تسليما، اللهم ربنا ليك وسعديك صلوات الله البرا لرحيم والملائكة المقربين والنبيين والصدّيقين والشهداء والصالحين واسبح لك من شئى يا رب العالمين على محمد بن عبد الله خاتم النبيين وسيد المرسلين وامام المتقين ورسول رب العالمين الشاهد البشير الداعى باذنك السراج المنير وعليه السلام“

اس دعاء کو شیخ زین الدین مراعی نے اپنی کتاب تحقیق النظرۃ میں بیان کیا ہے۔ (مدارج النبوة ج ۲ حالات وصال)

نبی کریم ﷺ کی تدفین میں تاخیر:

۱۔ کربلا کے واقعے کی تاریخ : ۱۰ محرم ۶۱ ہجری / ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء



ہے، یہ ان کا قول باطل ہے اور کذب بیانی ہے، بلکہ آج کے شیعہ حضرات اپنی کتابوں سے ناواقف ہیں، آئیے شیعہ حضرات کی حدیث کی کتاب اصول کافی کو دیکھئے۔

عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت له کیف كانت الصلوة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لما غسله امیر المؤمنین علیہ السلام وكفنه سجاہ ثم اذ كل علیه عشرة تداروا حوله ثم وقف امیر المؤمنین علیہ السلام فی وسطهم وقال (اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰی النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم يَا أَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا) فیقول القول كما یقول حتی صلی علیہ وسلم اهل المدينة واهل العوالی“ (اصول کافی)

حضرت جعفر علیہ السلام سے مروی ہے کہ میں نے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ کیسے ادا کی گئی تھی؟ تو انہیں بتایا گیا کہ جب امیر المؤمنین علیہ السلام نے آپ کو غسل دیا اور کفن پہنا دیا اور ڈھانپ دیا تو دس آدمی آپ کے جسد مبارک کے پاس آئے اور ارد گرد پھرے، پھر امیر المؤمنین علیہ السلام ان کے درمیان کھڑے ہوئے اور پڑھا۔ (اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰی النَّبِيِّ صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا) قوم نے بھی یہی پڑھا جو امیر المؤمنین پڑھ رہے تھے یہاں تک کہ تمام اہل مدینہ نے پڑھا اور ارد گرد تمام دیہات والوں نے پڑھا۔

اہل تشیع کی اپنی ہی حدیث نے واضح کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ تمام صحابہ کرام نے ادا کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر تغیر احوال:

عن انس قال لما قدم رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم المدينة لعبت الحشبة بحرابهم فرحوا لقدومه رواه ابو داود، وفي رداية الدرмі قال ما رأيت يوما قط كان احسن ولا رضوا من يوم دخل علينا فيه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وما رأيت يوما كان اقبح ولا اظلم من يوم مات فيه المدينة اضاء منها كل شئ فلما كان اليوم الذي مات فيه اظلم منها كل شئ وما نفضنا ايدينا عن التراب وانا لفی دفنه حتی انكرنا قلوبنا“

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں آئے تو حبشہ کے لوگوں نے آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں نیزہ بازی کا کھیل پیش کیا۔ (رواہ ابو داود)

دارمی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے آج تک کوئی دن اتنا زیادہ حسین نہیں دیکھا، اتنا زیادہ روشن دن کوئی نہیں دیکھا اس دن سے جس دن سے ہمارے پاس (مدینہ طیبہ میں) تشریف لائے اور میں نے



کوئی دن اتنا بر نہیں دیکھا اور نہ ہی اتنا تاریک دن کوئی دیکھا اس دن سے جس دن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا، اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس دن نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہر چیز روشن ہو گئی، اور جس دن آپ کا وصال ہوا ہر چیز تاریک ہو گئی، اور ابھی ہم نے (آپ کے دفن کی) مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے بلکہ ابھی آپ کے دفن میں مشغول تھے یہاں تک کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔

نبی کریم ﷺ جس دن مدینہ طیبہ میں تشریف لائے وہ دن بہت حسین تھا ”ای ازہر فی الخاطر“ جو دل کو بہت زیادہ خوش کرنے والا تھا، اور بہت ہی زیادہ روشن تھا ”ای فی نور الظاہر“ اس سے مراد ظاہری نور ہے جس نور نے مدینہ طیبہ کی ہر چیز کو روشن کر دیا تھا ”وہذا یدل علی ان الاضاء ة کانت محسوسۃ“ اس سے واضح طور پر پتہ چل رہا ہے کہ وہ روشنی محسوس ہو رہی تھی، اور جس دن آپ کا وصال ہوا وہ دن بڑا قبیح تھا ”الی اسوا واحزن فی القلب“ یعنی وہ دن دلوں کو غم میں ڈالنے والا اور بد حال کرنے والا تھا، اور اس دن مدینہ طیبہ کی ہر چیز تاریک ہو گئی، اس کی وجہ یہ تھی ”فان نورہ شمس العالم الصوری والمعنوی“ کہ نبی کریم ﷺ کا نور عالم صوری اور عالم معنوی کیلئے سورج کی حیثیت رکھتا تھا، جب وہ سورج ہی غروب ہو گیا تو ہر چیز نے تاریک ہونا ہی تھا۔

**اعتراض:** جب نبی کریم ﷺ کا نور عالم صوری اور عالم معنوی کیلئے سورج تھا، تو آپ کے وصال سے کل جہان کو تاریک ہو جانا چاہیے تھا، صرف مدینہ طیبہ کے تاریک ہونے کی تخصیص کیوں؟

**جواب:** ”وتخصیص المدینۃ لكونها اقرب لنسبة رؤية الراوی انسب“ مدینہ طیبہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ وہ قریب تھا، راوی نے اپنے دیکھنے کے لحاظ پر بیان کیا ہے، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آپ کے وصال سے کل جہاں غم اور پریشانی کی وجہ سے ظاہر طور پر تاریک ہو گیا تھا ”حتی انکرونا قلوبنا“ ابھی ہم نے نبی کریم ﷺ کے دفن کی مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔

ای تغیرت حالنا بوفاة رسول اللہ ﷺ وظہور انواع الظلمۃ علینا ولم نجد قلوبنا علی کانت علیہ من انوار الصفاء الرقة والالفة فیما بیننا لا نقطاع مادة الوحی وفقد ان برکۃ صحبته والراکسیر حضور حضرتہ“

آپ کے وصال سے ہمارے حالات بدل گئے، اور ہم پر تاریکی کی انواع کا ظہور ہوا، ہمارے دلوں میں صفائی اور نرمی اور الفت کے انوار باقی نہ رہے، یعنی جو ہمارے درمیان الفت تھی وہ وحی کے آنے کے اختتام کی وجہ سے جاتی رہی، اور اس کی وجہ آپ کی صحبت کی برکت کا ختم ہو جانا تھا، آپ کے حضور



ہماری موجودگی کیلئے آپ کی برکت اکسیر اعظم کی حیثیت رکھتی تھی جو ختم ہو گئی۔

دینی طلباء کرام:

”حتی انکرنا قلوبنا“ حدیث پاک میں ایسا جملہ وارد ہے کہ اگر اسے نہ سمجھا جائے تو ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

”قال التور بشتی یرید انہم لم یجدوا قلوبہم علی ما کانت علیہ من الصفاء والالفة لا نقطاع مادة الوحي وفقدان ما کان یمدہم من الرسول اللہ ﷺ من التائید والتعلیم ولم یرد انہم لم یجدوها علی ما کانت من التصدیق“

تور پستی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ ”حتی انکرنا قلوبنا“ (یہاں تک کہ ہمارے دلوں نے انکار کر دیا) کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں جو صفائی اور الفت تھی وہ وحی کے ختم ہو جانے کی وجہ اس طرح نہ رہی جو پہلے تھی، کیونکہ پہلے نبی کریم ﷺ کی تائید سے اور آپ کی تعلیم سے صفائی قلب اور الفت بڑھتی رہتی تھی، آپ کے تشریف لے جانے سے اس کی کیفیت پہلے والی نہ رہی۔

ہاں ضرور توجہ کیجئے، اس کا مفہوم یہ نہیں کہ ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی تصدیق ہی ختم ہو گئی، میرے عزیز طلباء کرام! اگر یہ معنی کرو گے تو صحابہ کرام کی طرف کفر منسوب کرو گے (سواء اللہ) اس سے تو اپنے ایمان سے ہاتھ دھونے لازم آئیں گے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۳۱ بمع نصیحت طلباء از راقم)

وعن عائشہ قالت ما ترک رسول اللہ ﷺ دینار او لا درہم او لا شاة ولا بعیر او لا وصی بشتی“ (رواہ مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم اور نہ بکری اور نہ اونٹ اور نہ ہی کسی چیز کی آپ نے وصیت کی، دوسری روایت یہ ہے۔

”ذکروا عند عائشہ رضی اللہ عنہا ان علیا ؑ کان وصیا فقلت متی اوصی الیہ وقد کنت مسندہ حتی مات“

صحابہ کرام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی ؑ کو خلیفہ مقرر کرنے کی کوئی وصیت فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا کہ آپ نے کب وصیت فرمائی، میں نے آپ کو سہارا دیا ہوا تھا (یعنی آپ میرے سینہ سے سہارا لگائے ہوئے تھے) تو آپ کا وصال ہو گیا۔



علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”متی اوصی“ اور ”لا اوصی بشئ“ کا یہ ہے۔

”لا اوصی بثلث ما له ولا وغیره اذ لم یکن له مال ولا اوصی الی علی ولا الی غیرہ خلاف ما یزعمہ الشیعة“

کہ آپ نے تہائی حصہ مال وغیرہ کی کوئی وصیت نہیں کی کیونکہ آپ کا مال ہی نہیں تھا، اور نہ ہی آپ نے حضرت علیؓ کیلئے کوئی وصیت کی اور نہ ہی کسی اور کیلئے آپ نے کوئی وصیت کی ”ولا اوصی بشئ“ کا جب مطلب واضح ہو گیا، اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا۔

”واما الا حادیث الصیحة فی وصیته ﷺ بکتاب اللہ ووصیته لاهل البیت وخراج الیہود من جزیرۃ العرب واجازۃ الوفد فلیست مرادۃ بقولہا ولا اوصی“

لیکن احادیث صحیحہ میں جو نبی کریم ﷺ کی وصیت کا ذکر ہے کہ آپ نے کتاب اللہ کو لازم پکڑنے یعنی قرآن پاک کے مطابق عمل کرنے کی وصیت کی، اور اہل بیت کے ساتھ محبت کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے اور یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینے اور باہر سے آنے والے وفود سے اچھا سلوک کرنے کی آپ نے جو وصیت کی وہ ”لا اوصی بشئ“ میں نہیں آتی کہ اس میں تو نفی مال کی وصیت کرنے اور خلیفہ نامزد کرنے کی ہے۔

”واما الارض التی کانت لہ ﷺ بخیر وفدک فقد سلّٰہا ﷺ فی حیاتہ وجعلہا صدقۃ للمسمین“ لیکن وہ زمین جو نبی کریم ﷺ کی خیر میں یا فدک کی زمین وہ آپ نے اپنی ظاہری حیات میں ہی مسلمانوں کیلئے وقف کی دی تھی۔

**اعتراض:** اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کثیر تعداد میں اونٹ اور بیس اونٹیاں تھیں جن کی صحابہ کرام مدینہ طیبہ کے باہر اطراف میں حفاظت کرتے تھے، اور ان کا دودھ رات کو آتا تھا، اور سات بکریوں اور سات بھیتروں کا دودھ آتا تو ”یشربون من البانہا“ وہ دودھ پیتے تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ آپ کے وصال کے وقت آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا؟

**جواب:** ”فلا یصلح لمعارضۃ هذا الحدیث الصحیح ولو صح لحمل علی انہا کانت من اہل الصدقۃ وکان اصحابہ الفقراء من اہل الصفة وغیرہم یشربون من البانہا“

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث میں مال کی نفی کا ذکر ہے وہ سند صحیح سے ثابت ہیں، جو اہل سیر نے بیان کیا ہے یہ احادیث صحیحہ نہیں، اگر ان کا صحیح ہونا ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی نبی کریم ﷺ کی ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ مال فقراء صحابہ کرام کے نفع حاصل کرنے کیلئے رکھا ہوا تھا، وہ دودھ پینے والے اہل صفہ تھے جو فقراء صحابہ کرام



تھے، جن کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا بلکہ وہ فقط دین کے حاصل کرنے والے طلباء کرام تھے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ صفحہ نمبر ۲۵۲، ۲۵۵)  
اب اس کے بعد بخاری کی ایک حدیث دیکھئے جو ما قبل بحث کی وجہ سے آسانی سے سمجھ آئیگی۔

عن عمرو بن الحارث (خی جویریۃ قال ما ترک رسول اللہ ﷺ عند موتہ دینارا ولا درهما ولا عبدا ولا امة ولا شیئا الا بغلته البیضاء وسلاحه وارضا جعلها صدقة“

(رواہ بخاری)

عمرو بن حارث الخزاعی جو ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہما کے بھائی ہیں فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اپنے وصال کے وقت نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم اور نہ غلام اور نہ کنیز اور نہ کوئی اور چیز مگر سفید خچر اور ہتھیار اور زمین جن کو آپ نے صدقہ کر دیا، یعنی فقیر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔

### مختصر وضاحت حدیث:

باقی روایات میں غلاموں اور کنیزوں کا ذکر نہیں تھا، اس میں وہ وضاحت بھی موجود ہے ”فہی دلالة علی ان ما ذکر من رقیق النبی ﷺ فی جمیع الاخبار کان اما مات واما اعتقه“ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں آپ کے جن غلاموں اور کنیزوں کا ذکر ہے، ان میں سے کوئی پہلے ہی فوت ہو چکے تھے اور کچھ کو آپ نے وصال سے پہلے ہی آزاد کر دیا تھا۔

(جعلها صدقة) وضمیر جعلها راجع الی کل الثلاثة لا الی الارض فقط فانه ﷺ قال  
نحن معشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقة“

”جعلها“ کی ضمیر تینوں کی طرف لوٹ رہی ہے، صرف ”ارض“ کی طرف نہیں لوٹ رہی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ہم انبیاء کرام کا گروہ جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا، ہماری کوئی وراثت تقسیم نہیں کی جاتی، مطلب یہ ہوا کہ آپ کی سفید خچر اور آپ کا اسلحہ اور زمین بھی صدقہ کر دیا گیا۔

”قال العسقلانی ای تصدق بمنفعة الارض فصار حکمها حکم الوقف“ علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صدقہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی منفعت صدقہ کی گئی، زمین کا وقف کا حکم رہا کہ اس کا کوئی مالک نہیں تھا، البتہ خاندان نبوت کو اس کا متولی بنادیا گیا تھا۔

قبر کے سامنے سجدہ کرنے کی ممانعت:

نبی کریم ﷺ نے وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا ”جان لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ تم سے پہلے ایسے لوگ گذرے ہیں



جنہوں نے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو مساجد یعنی سجدہ گاہ بنالیا تھا، تمہیں لازم ہے کہ ایسا نہ کرنا، ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا ”لعن اللہ الیہود والنصارى اتخذوا قبور البیائهم مساجد“ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا، اے اللہ میری قبر کو میرے بعد بت نہ بنانا، خدا کا غضب اور اس کا قہر ان لوگوں پر زیادہ ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، بلاشبہ اے مسلمانو میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں اور فرمایا ”الاہل بلغت اللہم اشہد اللہم اشہد“ خبردار میں نے تمہیں خبردار کر دیا، اے اللہ گواہ رہ اے اللہ گواہ رہ۔ خیال رہے کہ صاحب قبر کو معبود سمجھ کر سجدہ کیا جائے تو یہ شرک ہے، اور اگر معبود تو اللہ تعالیٰ کو مانا جائے لیکن پھر بھی قبر کو سجدہ کر لیا جائے تو یہ حرام ہے، اگرچہ شرک نہیں۔

نبی کریم ﷺ کے پاس سات دینار کہیں سے آئے تھے جن کو آپ خرچ نہیں کر سکے تھے، بیمار ہو گئے، شدید بیماری کی حالت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا ان سونے کے ٹکڑوں کو کہیں بھیج دو کہ وہ فقراء پر خرچ ہو جائیں، آپ کے یہ ارشاد فرمانے کے ساتھ ہی آپ کی بیماری میں شدت آگئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت میں لگ گئیں، آپ کو جب ہوش آیا تو پوچھا کہ وہ دینار خرچ ہو گئے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، ابھی نہیں خرچ ہوئے، نبی کریم ﷺ پر معمولی افاقہ سے بیماری میں اور زیادہ شدت آجاتی، پھر آپ پوچھتے کہ سونے کے ٹکڑے خرچ ہو گئے؟ تین مرتبہ کچھ افاقہ ہوا، اور پھر بیماری کی شدت ہو جاتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت کی وجہ سے اور شدید اضطراب و پریشانی کی وجہ سے وہ دینار فقراء پر تقسیم نہ کرا سکیں اس کے بعد کچھ افاقہ ہوا تو وہ حضرت علیؑ کے پاس بھیج دیئے گئے تاکہ یہ مستحقین میں خرچ کر دیئے جائیں۔

سبحان اللہ! مال سارا اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اور خود دنیا سے تشریف لے جا رہے تو گھر کے چراغ میں تیل نہیں تھا جب دو شنبہ (پیر) کی شام ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی انصاری عورت کے گھر چراغ بھیجا کہ اگر تمہارے گھر تیل ہو تو اس میں چند قطرے ڈال دیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نزع کے عالم میں ہیں یعنی نزع کی حالت میں گھر میں چراغ میں تیل نہیں، رات اسی حال میں گذر گئی، صبح چاشت کے وقت آپ کا وصال ہو گیا ”اللہم ارفع درجاتہ و اغفر لنا بحرمۃ“ (ماخوذ از مدارج النبوۃ جلد دوم ذکر وصال النبی ﷺ)

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مولانا الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا۔

مالک کو نین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں  
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں



## نبی کریم ﷺ کی قبر انور کا مقام عرش اعلیٰ سے بلند:

اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ مکہ مکرمہ افضل ہے یا مدینہ طیبہ، حضرت عمرؓ اور بعض صحابہ کرام اور اکثر اہل مدینہ اور امام مالک رحمہ اللہ مدینہ طیبہ کی افضلیت کے قائل ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی قبر انور کے مقام کی افضلیت میں کوئی اختلاف نہیں۔

”ونقل القاضي عياض وغيره الاجماع على تفضيل ما ضم الاعضاء الشريفة حتى على الكعبة المنيفة وان الخلاف فيما عداه ونقل عن ابي عقيل الحنبلي ان تلك البقعة افضل من العرش وصرح الفا كهاني بتفضيلها على السماوات قال بل الظاهر المتعين تفضيل جميع الارض على السماء لحلوله عليه الصلوة والسلام بها وحكاها بعضهم عن الاكثرين لخلق الانبياء منها ودفنهم فيها“

قاضی عیاض رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم سے یہ منقول ہے کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ زمین کا وہ حصہ جس سے نبی کریم ﷺ کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے وہ کعبہ مکرمہ سے افضل ہے، اختلاف اس مقام کے غیر میں ہے کہ مکہ مکرمہ افضل ہے یا مدینہ طیبہ، فا کہانی رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس مقام کو تمام آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے، اور انہوں نے کہا کہ ظاہر بات یہ ہے کہ تمام زمین کو تمام آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ زمین میں تشریف فرما ہیں، اکثر اہل علم نے توزمین کی افضلیت پر یہی دلیل قائم کی ہے، کچھ اور حضرات نے یہ کہا ہے کہ تمام انبیاء کرام زمین سے پیدا ہوئے اور زمین میں مدفون ہیں، اس لحاظ پر بھی زمین کو آسمانوں پر افضلیت حاصل ہے۔

”وقال النووي والجمهور على تفضيل السماء على الارض اي ما عدا ما ضم الاعضاء الشريفة ومحل الخلاف فيما عدا الكعبة فهي افضل من بقية المدينة اتفاقا ما عدا موضع قبره المقدس“

علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جمہور علماء کرام اس طرف ہیں کہ آسمانوں کو زمین پر افضلیت حاصل ہے، سوائے اس مقام کے جس سے حضور ﷺ کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے، لیکن یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر انور کے بغیر باقی مدینہ طیبہ پر کعبہ شریف کو افضلیت حاصل ہے۔ (مرقاۃ جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۹۰)

یہ مسائل ایمان کی سلامتی اور نبی کریم ﷺ کی محبت سے حاصل ہوتے ہیں، جن لوگوں کے دل نبی کریم ﷺ کی محبت سے خالی ہوتے ہیں، وہ ان مسائل کو سن کر جل جاتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی قبر شریف کعبہ شریف اور مکہ مکرمہ سے افضل ہے، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، ان لوگوں کیلئے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں محبت رسول اللہ ﷺ اور عظمت رسول اللہ ﷺ پیدا کر دے تو ان شاء اللہ یہ مسائل خود بخود سمجھ آ جائیں گے۔ (راقم)



وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّوَجَّلًا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۝ (آیہ ۱۴۵)

(۱) اور کوئی جان بے حکم خدا مر نہیں سکتی سب کا وقت لکھا رکھا ہے، اور جو دنیا کا انعام چاہے ہم اس میں سے اسے دیں اور جو آخرت کا انعام چاہے ہم اس میں سے اس دیں اور قریب ہے کہ ہم شکر والوں کو صلہ عطاء کریں۔ (کنز الایمان)

(۲) اور نہیں ہے کسی نفس کو مرنا سوائے اللہ کے حکم کے، (موت کا وقت) لکھا ہوا، مقرر ہے اور جو ارادہ رکھتا ہے دنیا کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جو شخص ارادہ رکھتا ہے آخرت کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جلدی ہم جزاء (بدلہ) دیں گے شکر کرنے والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق کی چند وجوہ:

(۱) ”منافقین“ نے جب غزوہ احد میں یہ خبر اڑائی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرما کر ان کا رد کیا کہ ہر ذی روح چیز کی موت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، اس کے حکم اور اس کی قضاء و تقدیر کے بغیر کسی پر موت نہیں آ سکتی قتل یا موت وقت معین میں آتے ہیں، وقت سے پہلے نہیں آتے، منافقین کا اصل مقصد نئے نئے اسلام لانے والے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو دین سے پھیرنا تھا کہ جب محمد ﷺ قتل ہو گئے تو تم اس دین سے پھر جاؤ، تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ سے ان کا رد کیا۔

”فَكَمَا أَنَّهُ لَوَمَاتٍ فِي دَارِهِ لَمْ يَدُلْ ذَلِكَ عَلَى فُسَادِ دِينِهِ فَكَلَّا إِذَا قُتِلَ وَجِبَ أَنْ لَا يُؤْتَىٰ ذَلِكَ فِي فُسَادِ دِينِهِ“

کہ موت کا وقت مقرر ہے، اگر آپ کی وفات اپنے گھر میں آگئی تو دین میں کوئی فساد اور خرابی لازم نہیں آئے گی، اگر آپ کو شہید کر دیا گیا تو پھر بھی دین میں کوئی خلل لازم نہیں آئے گا۔

(۲) ”آیت کریمہ“ کے نزول سے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے، اور انہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ”ان الحلو لا يلدع القدر“ بیشک ڈرنے سے تقدیر ٹل نہیں سکتی، اس لئے کہ موت وقت سے پہلے نہیں آتی، اور وقت آجائے تو موت کو کوئی



چیز ٹال بھی نہیں سکتی ”فلا فائدة في الجبن والخوف“ بزدلی اور خوف میں کوئی فائدہ نہیں۔

(۳) ”اس آیت کریمہ“ کو نازل فرمایا کر یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرمائی اور آپ کو اس خوفناک معرکہ سے بچایا، ”فان تلك الواقعة مابقي سبب من اسباب الهلاك الا وقد حصل فيها“ غزوہ احد میں کفار کی یلغار اور گھیراؤ اٹالنے کی وجہ سے بظاہر ہلاکت کے اسباب میں سے کوئی سبب باقی نہیں رہا تھا۔

”ولكن لما كان الله حافظا وناصر ما ضره شيء من ذلك، وفيه تنبيه على ان اصحابه قصر وافي الدب عنه“

لیکن اللہ تعالیٰ نے جب آپ کی حفاظت اور امداد فرمائی تو کوئی چیز بھی آپ کو نقصان نہ پہنچا سکی، اس میں اس پر تنبیہ کی گئی غزوہ احد میں صحابہ کرام سے آپ سے کفار کے دفاع میں کوتاہی واقع ہو گئی تھی، اگرچہ اجتہادی خطا تھی۔

(۴) ”منافقین“ نے جب مؤمنین کے متعلق یہ کہا ﴿لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا﴾ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ ان پر موت واقع ہوتی اور نہ وہ شہید کئے جاتے۔

فاخبر الله تعالى ان الموت والقتل كلاهما لا يكونان الا باذن الله وحضور الدجل  
(دجالہ (عمر بالصبر))

تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بیشک موت اور قتل دونوں ہی اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پائے جاسکتے، اور موت کے وقت سے پہلے موت نہیں آتی۔  
(ماخوذ از کبیر)

”إِذْنِ“ کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں:

(۱) ”الاذن هو الامر“ اذن کا ایک معنی ”امر“ بیان کیا گیا ہے ”والمعنى ان الله تعالى يأمر ملك الموت بقبض الارواح فلا يموت احد الا بهذا الامر“ اب مطلب یہ ہوا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ملک الموت (عزرائیل) کو روحوں کے قبض کرنے کا حکم دیتا ہے، کسی ایک کی موت سوائے اس کے امر کے نہیں آتی۔

(۲) ”الاذن هو التكوين والتخليق والايجاد“ اذن کا معنی ہے ”تکوین، تخلیق، ایجاد“ سب کا مطلب ایک ہی مراد لیا گیا ہے یعنی موت و حیات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، کہ موت و حیات پر اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قادر نہیں ”فاذن المراد ان نفسا لن تموت الا بما اماتها الله تعالى“ اب مطلب یہ ہو گیا کہ کسی نفس پر موت نہیں واقع ہوتی سوائے اس کے کہ جسے اللہ تعالیٰ موت عطا کرے۔



(۳) ”الاذن“ بمعنی العلم ”اذن کا معنی علم“ ہے۔ یعنی موت اس وقت سے پہلے نہیں آتی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، ”واذا جاء ذلك الوقت لزم الموت“ جب وہ وقت آتا ہے تو موت کا آنا لازم ہو جاتا ہے۔ یہی مضمون رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے زیادہ واضح ہو رہا ہے۔ ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ ”جب موت کا وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی اس میں نہ دیر ہوتی ہے، اونہ ہی جلدی۔“

(۵) ”الخامس“ قال ابن عباس الاذن هو قضاء الله وقدره ”پانچواں معنی جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ اذن کا معنی قضاء و تقدیر ہے، ”فانه لا يحدث شيء الا بمشيئته و ارادته“ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کے بغیر کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی۔ اسلئے موت صرف اس کے ارادہ اور مشیت سے واقع ہو سکتی ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۲۳)

﴿كِتَابًا مُّؤَجَّلًا﴾ (موت کا وقت) لکھا ہوا، مقرر ہے۔“

ایک احتمال (کتابا)

”مصدر مؤكد لما قبله اذ المعنى كتب الموت كتابا (مُؤَجَّلًا) موقتا بوقت معلوم لا يتقدم ولا يتاخر ولو ساعة“

”کتابا“ مصدر ہے، جو فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور تاکید کا معنی دے رہا ہے اب معنی واضح ہو گیا کہ ”موت کا وقت لکھا ہوا ہے، اس کا وقت مقرر ہے، اس میں ایک گھڑی بھی جلدی نہیں، اور نہ ہی دیر ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۵)

**دوسرا احتمال:** یہ ہے کہ کتابا ”مصدر نہ ہو بلکہ اسم ہو،“ المراد بالكتاب المؤجل الكتاب المشتمل على الآجال“ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا، کہ ہر ایک کی موت کا وقت ”کتاب مؤجل“ میں مذکور ہے، یعنی وہ کتاب جس میں لوگوں کی اموات کا ذکر موجود ہے۔ ”کتاب مؤجل“ سے مراد لوح محفوظ ہے، جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے اللہ تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا ”اكتب“ لکھ۔ ”فكتب ما هو كائن الى يوم القيامة“ تو اس نے قیامت تک ہونے والے واقعات کو لکھ دیا۔

واعلم ان جميع الحوادث لابد ان تكون معلومة لله تعالى وجميع حوادث هذا العالم من الخلق والرزق والاجل والسعادة والشقاوة لابد وان تكون مكتوبة في اللوح المحفوظ فلوقعت بخلاف علم الله لان قلب علمه جهلا ولا قلب ذلك الكتاب كذبا وكل ذلك محال، واذا كان الامر كذلك ثبت ان الكل بقضاء الله وقدره“

(کبیر ج ۹ ص ۴۲)



یقینی بات ہے کہ تمام حوادث اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں۔ اور اس جہان کے تمام حوادث خلق، رزق، اجل، نیک بختی اور بد بختی سب ہی لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اس کے خلاف نہیں ہو سکتیں، اگر اس کے خلاف ہوں تو اللہ تعالیٰ کے علم کا جہل ہونا لازم آئے گا، اور اس کی کتاب یعنی لوح محفوظ کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا، یہ محال ہے، تو اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر میں ہیں تقدیر کی مناسب حد تک بحث نجوم الفرقان جلد دوم پہلے پارہ میں گذر چکی ہے۔

### مقتول کی موت وقت مقرر پر ہے:

و ظاهر الآیة یؤید مذهب اهل السنة القائلین ان المقتول میت بأجله ای بوقته المقدر له

جب آیہ کریمہ میں یہ واضح کر دیا گیا کہ ہر نفس کی موت وقت مقرر پر آتی ہے، وہ وقت لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، تو اسی آیہ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ ”مقتول“ (جسے قتل کر دیا گیا ہو) کی موت اپنے وقت مقرر پر آتی ہے، اس کی موت کا وقت یہی مقرر تھا، اگر قاتل اسے نہ قتل کرتا تب بھی اس نے اسی وقت میں مرنا تھا جس وقت میں قتل ہوا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے موت کے وقت کے مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اس کی موت کا سبب قتل ہوگا۔

### معتزلہ کا مذہب:

اس مسئلہ میں یہ ہے کہ مقتول کی موت قاتل کی وجہ سے آتی ہے، اگر قاتل اسے قتل نہ کرتا تو اس نے اس وقت نہیں مرنا تھا، اس لئے ان کا قول یہ ہے۔

”ان للمقتول اجلین احدهما القتل والاخر الموت وانه لو لم یقتل لعاش الی اجله الذی هو الموت“  
کہ مقتول کی موت کے دو وقت مقرر کئے گئے، ایک قتل اور دوسرا موت کا وقت، اگر قتل نہ کیا جاتا تو اس وقت اس پر موت نہ آتی بلکہ اس پر موت دوسرے وقت میں آتی، معتزلہ نے اپنے موقف پر ان احادیث کو پیش کیا جن میں طاعات کی وجہ سے عمر کے زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔

### اہلسنت نے ان کا جواب یہ دیا ہے:

کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس میں تقدیم و تاخیر (جلدی، دیر) نہیں۔ جہاں تک احادیث میں طاعات کی وجہ سے عمر کی



زیادتی کا ذکر ہے ان سے مراد یہ ہے۔

”ان الطاعة تزيد في العمرانها تزيد فيما هو المقصود الا هم منه وهو اكتساب  
الكمالات والخيرات والبركات“

کہ بیشک طاعت سے عمر کی مقصود چیزوں میں زیادتی ہوتی ہے، یعنی اسے کمالات کے حاصل کرنے اور خیرات و برکات کے حاصل کرنے کی زیادۃ توفیق حاصل ہوتی ہے۔ اگر عمر کی زیادتی مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تقدیر میں ذکر ہوگا کہ اگر اس نے یہ طاعت نہ کی اس کی عمر چالیس سال ہوگی۔ اور اگر اس نے طاعت کی تو اس کی عمر ستر سال ہوگی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ اس نے یہ طاعت ضرور کرنی ہے لہذا اس کی عمر ستر سال ہی ہونی ہے۔  
(ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۷۶، ۷۷)

﴿وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾  
”اور جو ارادہ رکھتا ہے دنیا کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے، اور جو شخص ارادہ رکھتا ہے آخرت کے فائدہ کا ہم دیتے ہیں اس کو اس سے۔“

غزوہ احد میں منافقین بھی شریک ہوئے تھے جن کا مقصد مال غنیمت حاصل کرنا اور شہرت حاصل کرنا تھا، اور مخلصین مؤمنین بھی شریک ہوئے تھے جن کا مقصد رب تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ ان دونوں فریقوں کا تذکرہ فرما دیا کہ جو دنیا کا نفع حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوتے ہیں، ان کو صرف دنیا کا مال ہی دیا جاتا ہے وہ آخرت کے ثواب سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور جو آخرت کے ثواب کیلئے حاضر ہوتے ہیں ان کو آخرت کا ثواب دیا جاتا ہے، درحقیقت وہی لوگ کامیاب ہیں۔

وعن انس بن مالك ان النبي ﷺ قال من كانت نيته طلب الآخرة جعل الله غناه في قلبه وجمع له شمله وآتاه الدنيا وهي راغمة ومن كانت نيته طلب الدنيا جعل الله الفقر بين عينيه وشتت عليه أمره ولا يأتياها منها الا ما كتب الله له،،  
(رداء ابو داود فی کتاب الزکوۃ، معالم الشریع للبخاری ج ۱ ص ۳۵۹)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کی نیت آخرت کو طلب کرنے کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غناء پیدا کر دیتا ہے، اور اسے ہمت عطاء کر دیتا ہے، اور دنیا اس کے پاس خود بخود آ جاتی ہے اگرچہ وہ اس کے نزدیک حقیر ہوتی ہے، اور جس شخص کی نیت آخرت کو طلب کی ہو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں میں احتیاجی



رکھ دیتا ہے، اس کا معاملہ بکھر جاتا ہے، اسے کچھ میسر نہیں ہوتا سوائے اس کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے جو لکھ دیا ہے۔

(ماخوذ از بغوی مع حاشیہ)

عن عمر بن الخطاب ؓ قال قال رسول الله ﷺ انما الاعمال بالنيات وانما لكل امرئ ما نوى فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او امرأة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه

(بخاری و مسلم)

حضرت عمر بن خطاب ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اعمال کا دار و مدار نيات پر ہے، بیشک ہر شخص کیلئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی، جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی (رضامندی) کے لئے ہجرت کی، تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہی ہجرت ہے، اور جس شخص نے دنیا کی طرف ہجرت کی وہ اسے پائے گا یا کہ عورت کیلئے جس نے ہجرت کیلئے وہ اس سے نکاح کر لے گا، جس غرض سے وہ ہجرت کرے گا وہ اس غرض کو پائے گا۔

”فعلى السالك ان يهاجر الى الله ورسوله ويجاهد من غير ان يخاف لومة لائم حتى يصل الى الله ويتخلص من الاضطرار“

راہ سلوک پر چلنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہی ہجرت کریں، اور اللہ کی راہ میں جہاد کریں، کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، تاکہ وہ اس خالص عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیں اور اضطرار سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۶)

﴿وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ﴾ اور جلدی ہی ہم جزا (بدلہ) دیں گے شکر کرنے والوں کو۔

”منعطيهم من فضلنا ورحمتنا في الدنيا والآخرة بحسب شكرهم وعملهم“  
یعنی جلدی ہی ہم اپنے فضل اور رحمت سے ان کو ان کے شکر اور عمل کے مطابق نوازیں گے دنیا اور آخرت میں۔

### خاصہ تفسیر:

ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے۔ موت وقت سے پہلے نہیں آتی، اور نہ ہی وقت مقرر سے آگے جاتی ہے، انسان اپنے اعمال میں جو نیت کرتا ہے اسی کے مطابق اسے جزاء حاصل ہوتی ہے، دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اگر کوئی عمل کرتا ہے تو وہ دنیا کو ہی حاصل کرتا ہے، آخرت کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، اور جو شخص اللہ کی رضا کیلئے عمل کرتا ہے اور اخروی ثواب حاصل کرنے کیلئے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں ثواب عطا فرمائے گا، کیونکہ حقیقت میں وہی اللہ



تعالیٰ کے شکر گزار ہیں۔ اعمال کی دار و مدار نیت پر ہے، ایک ہی عمل دو مختلف نیتوں سے مختلف حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔  
 ”من وضع الجبهة على الارض في صلوة الظهر والشمس قدامة فان قصد بذلك  
 السجود عبادة الله كان ذلك من الشرف دعائم الاسلام وان قصد به عبادة  
 الشمس كان ذلك من اعظم دعائم الكفر“  
 ایک شخص نے ظہر کی نماز ادا کرتے ہوئے سجدہ کیا، پیشانی کو زمین پر رکھا، سورج سامنے تھا، اگر سجدہ میں  
 اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت تو اس نے اسلام کے اعلیٰ ستون کا سہارا لیا۔ اور اگر اس نے سورج کی عبادت  
 کی نیت کی تو اس نے کفر کیا۔

اسی سے واضح ہوا ”ان المؤثر في طلب الثواب والعقاب المقصود والدواعي لظواهر  
 الاعمال“ بیشک ثواب و عذاب کے حصول میں اصل مؤثر مقصود اور حقیقی اسباب ہیں۔ ظاہری اسباب حقیقی مؤثر نہیں۔  
 (ماخوذ از روح البیان ج ۲ ص ۱۰۵، ۱۰۶)

خصوص مورد کا لحاظ نہیں، عموم الفاظ کا لحاظ ہے:

واعلم ان هذه الآية وان وردت في الجهاد خاصة، لكنها عامة في جميع الاعمال  
 جان کہ بیشک یہ آیت اگرچہ جہاد کے متعلق نازل ہوئی ہے، لیکن تمام اعمال کو شامل ہے۔ یعنی ہر عمل میں خصوص  
 نیت کا اعتبار ہے ظاہری اسباب کا لحاظ نہیں۔ لہذا انسان کو چاہئے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مد نظر ہو۔  
 (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۲۵)





وَكَائِنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝

(آیہ ۱۳۶)

- (۱) اور کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت خدا والے تھے تو نہ سست پڑے ان مصیبتوں سے جو اللہ کی راہ میں ان پہنچیں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دبے اور صبر والے اللہ کو محبوب ہیں۔ (کنز الایمان)
- (۲) اور کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا، جبکہ ان کے ساتھ اللہ والے بہت تھے، تو نہ سست پڑے وہ جو ان کو مصیبتیں پہنچیں اللہ کی راہ میں، اور نہ کمزور ہوئے، اور نہ وہ دبے، اور اللہ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے۔
- (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”کَإِنْ“ مرکب ہے کاف مثلیہ اور ای سے، اس میں کثرت والا معنی آگیا، یہ کم خبریہ کے معنی کو متضمن ہو گیا، کم خبریہ کی تمیز غالباً مکسور ہوتی ہے اور اس سے پہلے من آتا، لیکن کبھی من کا حذف کرنا جائز بھی ہوتا ہے، اس وقت وہ منصوب ہوتا ہے لیکن ”کَإِنْ“ کے آخر میں نون تنوین ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے ”مِنْ“ کو حذف کرنا اور اضافت کی وجہ سے جردینا جائز نہیں ”ولم یجئ فی التزیل الا کذا“ قرآن پاک میں صرف اس ایک صورت میں استعمال ہے۔

”قاتل معہ ربیون کثیر“ خبر لقولہ کاین لانہا مبتدا والفعل مسند الی ظاہرہ

(کَإِنْ مِنْ نَبِيٍّ) مبتدا ہے، اور ”قاتل معہ ربیون کثیر“ خبر ہے۔ ”قاتل“ فعل کا فاعل اسم ظاہر یعنی ”ربیون“ ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا ”کتنے ہی نبی (گذر گئے) کہ ان کے ساتھ ملکر جہاد کیا بہت اللہ والوں نے۔ (ضیاء القرآن میں تقریباً یہی ترجمہ بیان کیا گیا)

(روح البیان بالوضاحت ج ۲ ص ۱۰۷)

لیکن اس ترجمہ میں اللہ والوں کا جہاد کرنا صراحتہً سمجھ آئے گا، اور انبیاء کرام کا ضمناً، دوسری ترکیب یہ ہے کہ قاتل کا فاعل ہو ضمیر ہو، اور حرف عطف محذوف ہو ”رِبِّيُونَ“ معطوف ہو، ”مَعَهُ“ ظرف ہو اور خبر مقدم ہو اور ”کَثِيرٌ“ مبتداء مؤخر ہو، یہ جملہ مفعول فیہ ہو۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا، کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا اور بہت تعداد میں ان کے ساتھ ملکر اللہ والوں نے (بھی) جہاد کیا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق ہے، راقم نے بھی یہی نقل کیا، یہی زیادہ بہتر نظر آیا کہ اس



میں انبیاء کرام اور ان کے ساتھ ملکر اللہ والوں کا جہاد کرنا ”بالاصالة“ سمجھ آئے گا، انبیاء کرام کا جہاد ضمنی نہیں بلکہ صریح سمجھ آئے گا۔ ایک اور ترکیب یہ بیان کی گئی کہ ”قَاتِلْ“ کا فاعل ضمیر ہے، جو ”مبني“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ”مَقْعِدُ رِیْثُونِ“ حال ہے فاعل سے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کتنے ہی نبیوں نے جہاد کیا اس حال میں کہ ان کے ساتھ اللہ والے بہت تھے۔

”رِیْثُونِ“ کا مطلب ہے ”ربانی“ رب والے ”ربی“ راء پر تینوں حرکتیں پڑھی گئی ہیں، فتح، ضمہ، کسرہ۔ فتح اصل ہے اور کسرہ یا ضمہ تغیرات نسبہ سے ہے، کیونکہ عرب جب کسی کلمہ کی نسبت کرتے اور آخر میں یاء نسبت لگاتے ہیں تو اس کلمہ کی حرکات کو بدل دیتے ہیں، جیسے بھری کو باء کے کسرہ سے پڑھتے ہیں۔ اور ”دھری“ کی دال میں تینوں حرکتیں پڑھ لیتے ہیں۔

ایک نئے فتنہ نے جنم لیا:

آجکل فتنہ باز جہلاء نے ہزاروں بزرگان دین کو جاہل بنانے کیلئے یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ ”خدا حافظ“ نہ کہو بلکہ اللہ حافظ کہو، کیونکہ ”خدا“ اللہ تعالیٰ کا نام نہیں۔ جب یہ لوگ یوں کہیں گے کہ ”خدا“ اللہ کا نام نہیں تو ان کی بات کو سننے والے یہ کہیں گے کہ سعدی، رومی، شیرازی اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ (معاف اللہ) جاہل تھے، نہیں نہیں ایسی بات نہیں بلکہ یہ لوگ خود جاہل ہیں، کتب کو پڑھنا اور سمجھنا ان کی قسمت میں نہیں، صرف فتنہ کھڑا کرنا ان کا وتیرہ ہے، اسماء باری تعالیٰ کی بحث نجوم الفرقان کے پہلے حصہ میں گنبد چکی ہے۔ یہاں تو مختصر طور پر صرف اتنا ذکر کیا جا رہا ہے۔ کہ لفظ ”خدا“ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر صحیح ہے۔

”فان قيل كيف صح اطلاق الموجود والواجب والقديم ونحو ذلك كلفظ خدا

بالفارسية مما لم يرد به الشرع“

اعتراض یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ پر موجود، واجب اور قدیم، اور فارسی میں لفظ خدا کا اطلاق کس طرح صحیح ہے؟

قلنا بالاجماع، وقد يقال كلمة التوحيد يصح اطلاق الموجود وهو من الادلة

الشرعية لانه قد ثبت بالقرآن والحديث ان الاجماع حجة اما القرآن فقوله تعالى

”كنتم خيرامة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر، ولو اجتمعوا

على الخطاء لا امروا بالمنكر ونهوا عن المعروف، واما الحديث فقوله عليه السلام

لا تجتمع امتي على الضلالة“



اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ”واجب اور قدیم اور خدا“ کا اطلاق شریعت میں نہیں۔ جب ان الفاظ کا اطلاق اجماع امت سے ثابت ہے تو شریعت سے ہی ثابت ہے، کیونکہ اجماع امت شرعی دلائل اربعہ (چار) میں سے ایک دلیل ہے۔ اجماع کا دلیل شرعی ہونا قرآن پاک اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

تم بہتر ہوان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں بھلائی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے منع کرتے ہو۔

(کنز الایمان)

اگر آپ کے علماء مجتہدین کسی خطاء پر مجتمع ہو جائیں تو وہ (معاف اللہ) برے کاموں کا حکم دینے والے ہوں گے، اور اچھے کاموں سے منع کرنے والے ہوں گے، ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ رب تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہوگا۔ حدیث پاک میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی واضح ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ واضح ہوا کہ لفظ ”خدا“ جس کا معنی ہے واجب الوجود“ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر شرعی دلیل اجماع امت سے ثابت ہے۔ خیال رہے کہ لفظ خدا اصل میں خود آئی ہے ”جس کا معنی یہ ہے کہ وہ خود بخود قائم ہے، اسے کوئی قائم کرنے والا نہیں۔ (شرح عقائد مع نبراس ص ۱۷۲، ۱۷۳)

”رہیون“ کا ایک اور معنی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ماخوذ ہے ”رہۃ“ راء کے کسرہ اور باء کی تشدید سے، اس کا معنی ہے ”جماعت“ اب معنی یہ ہوگا کتنے نبیوں نے جہاد کیا ان کے ساتھ کثیر جماعتیں تھیں۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

﴿فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا﴾

”تو نہ ست ہوئے وہ جو پہنچی ہیں مصیبتیں ان کو اللہ کی راہ میں، اور نہ وہ کمزور ہوئے اور نہ وہ دبے۔“

”فَمَا وَهَنُوا“ میں فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف ہے، قاتل پر۔ اور اس کا معنی ہے ”فما افتروا وما انكسرت همتهم“ تو وہ نہ ست ہوئے اور نہ ان کی ہمت ٹوٹی ﴿لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ جو پہنچی ہیں مصیبتیں ان کو اللہ کی راہ میں ”یعنی جہاد میں جو ان کو زخم پہنچے یا اور تکالیف پہنچیں تو وہ ان کی وجہ سے ست نہیں ہوئے۔“

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

یہ مطلب جو ابھی بیان کیا ہے یہ اس وقت ہوگا جب ”فَمَا وَهَنُوا“ اور ”لِمَا أَصَابَهُمْ“ کی ضمیریں تمام ”رہیون“ کی طرف لوٹیں، اور اگر جہاد میں شریک ہونے والے جو شہید ہو گئے ان کے بغیر جو باقی رہنے والے ہیں



ان کی طرف ضمیریں لوٹائیں تو معنی یہ ہوگا ”ما اعتراهم من قتل اخوانهم والخوف والحزن وغير ذلك“ تو وہ اپنے بھائیوں کی شہادت کی وجہ سے نہ ست ہوئے اور نہ ہی ان کو کوئی خوف و حزن لاحق ہوا۔ ”وَمَا ضَعُفُوا“ اور نہ وہ کمزور ہوئے، یعنی دشمن کے سامنے انہوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی، اور نہ ہی وہ جہاد سے کمزوری دکھا کر پیچھے ہوئے، اور نہ ہی وہ دشمن سے دبے۔

”واصله استكن يستكن (باب افتعال) من السكون لان الخاضع يسكن لصاحبه

ليفعل به ما يريد“ والالف لاشباع الفتحة“

”استكن“ ”يستكن“ باب افتعال ہے، سکون سے لیا ہوا ہے الف فتحہ کو لمبا کر کے اشباع کیلئے بنایا گیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے صاحب یعنی مد مقابل سے یوں دب کر سر جھکا کر رہے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔

اللہ والوں کی شان بیان فرمائی کہ وہ انبیاء اکرام سے مل کر دشمن سے جہاد کرتے ہوئے دشمن سے کبھی دبے نہیں، دشمن کے سامنے کبھی سر جھکا کر نہیں رہے، بلکہ حقیقت یہی ہے کہ وہ سراٹھا کر رہے، دشمن ان سے دبا رہا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”استکان“ کون سے لیا ہوا ہو، اصل میں ”استکون“ تھا، اور واؤ کو الف سے تبدیل کیا گیا، معنی اس صورت میں بھی وہی ہوگا۔ جو پہلی صورت میں بیان کیا گیا۔

آیہ کریمہ کا اشارۃ مفہوم یہ ہوا:

وهذا تعريض بما اصابهم من الوهن والالكسار عند استيلاء الكفرة عليهم

والارجاف بقتل النبي ﷺ وبضعفهم عند ذلك عن مجاهدة المشركين واستكانتهم

لهم حين ارادوا ان يعتضدوا بابن ابي المنافق في طلب الامان من ابي سفيان“

”اس آیہ کریمہ“ میں جب یہ بیان کیا گیا کہ کتنے ہی اللہ والوں نے کثیر انبیاء سے ملکر جہاد کیا لیکن وہ نہ ست ہوئے، اور نہ ہی وہ کمزور ہوئے اور نہ ہی وہ دبے، تو اشارۃ صحابہ کرام کو سمجھایا گیا (کہ غزوہ احد میں کفار کے اچانک حملہ سے اور اس خبر سے کہ نبی کریم ﷺ شہید ہو گئے، تمہارے حوصلے پست ہو گئے، دشمن سے جہاد میں تم نے وقتی طور پر کمزوری دکھائی، اور تم میں منافقین اور کچھ ضعیف الاعتقاد کفار سے دب گئے جب انہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ ابن ابی منافق سے امداد طلب کریں کہ وہ ابی سفيان سے ان کو پناہ لے کر دے) کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔



”اور اللہ پسند کرتا ہے صبر کرنے والوں کو۔“

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾

یعنی جو لوگ جہاد میں دشمن کی سختیوں اور ان کی طرف سے لاحق ہونے والی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے، انہیں پسند کرتا ہے، یعنی ان کی امداد فرماتا ہے اور ان کی قدر و منزلت کو بلند فرماتا ہے۔

(ماخوذ از روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

اولیاء محبوب اللہ است دان کس نیاز دارد ہمیش در جہان  
جان لواللہ کے ولی اللہ کے محبوب ہیں کوئی بھی ستاتا نہیں اپنے محبوب کو جہان میں۔

دینی طلباء کرام کیلئے:

”کَآئِن“ میں چار لغات ہیں:-

(۱) ایک تو یہی جو مشہور ہے اور اصل ہے کہ ای پر کاف داخل ہے، البتہ نون سے یہ کلمہ لکھا جاتا ہے جس سے اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ کلمہ دو لفظوں سے مرکب ہے، اسلئے ای کے معنی میں بھی تبدیلی ہے، یعنی کم خبریہ کے معنی کو متضمن ہے، جو کثرت کا معنی دے رہا ہے، یعنی کتنے ہی کثیر انبیاء کرام نے جہاد کیا“ خیال رہے کہ معنی سب صورتوں میں یہی رہے گا، صرف تلفظ میں تین صورتیں اور ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ”کَآئِن“ بروزن فاعل ہے۔ اصل کینی ہے، یاء کو الف سے تبدیل کیا گیا جیسا کو بیاس میں دوسری یاء کو الف سے تبدیل کر کے یاء س بھی پڑھا جاتا ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ”کئن“ بروزن کعن پڑھا جاتا ہے، کائن میں سے ہی تخفیف کیلئے الف حذف کر دیا جاتا ہے، باقی کئن رہ گیا۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ یہ لفظ ”کَآئِن“ پڑھا جاتا ہے اس کا وزن کعین ہے، جو اصل میں کینی ہے اس میں قاعدہ تقلیب جاری کیا گیا، ہمزہ کو یاء کی جگہ اور یاء کو ہمزہ کی جگہ رکھا۔ ”وَهَنُوا“ میں بھی تین طرح کا تلفظ ہے۔ ہا کے فتح سے، کسرہ سے اور ضمہ سے ”الوہن انکسار الجذ بال خوف“ خوف کی وجہ سے کوشش میں سستی پڑ جائے تو اسے ”الوہن“ کہا جاتا ہے ”وہن الشی“ سست ہونا، کمزور ہونا، اوہن باب افعال، وہن باب تفصیل کا معنی ہے ضعف (عین مشدود) میں نے اسے ڈرا کر ست کر دیا، کمزور کر دیا ”الواہنة“ القصیری وہی اسفل الاضلاع“ پسلیوں کے نیچے حصہ کو ”واہنة الاضلاع“ یا ”قصار الاضلاع“ کہا جاتا ہے۔ جب کوئی اونٹ ست



تار ہو جائے تو کہا جاتا ”الوہن“ یعنی ”هذا الابل وھن“ یعنی یہ اونٹ ست رفتار ہو گیا۔ ”الوہن ساعة تمضي من الليل“ رات کی ایک گھڑی گزر جائے تو اسے بھی ”وھن“ کہا جاتا ہے۔ اوھنا صرنا فی تلک الساعة (اوھنا میں نون مشدد ہے) یعنی ہم رات کی فلاں گھڑی میں گزرے۔ (القرطبی)

**فائدہ جلیلہ:** قال الحسن البصری وجماعة من العظماء لم یقتل نبی فی حرب قط

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور دوسرے عظیم اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نبی بھی جنگ میں شہید نہیں ہوئے (تفسیر ابی السعود) وجہ اس کی یہ تھی کہ کفار انبیاء کرام کی مسلمانوں کے سامنے تذلیل نہ کریں کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ بنی اسرائیل کے متعلق جو ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ وہ انبیاء کو ناحق شہید کرتے ہیں، اس سے مراد ان کا جنگ میں شہید کرنا نہیں بلکہ آگے پیچھے داؤ لگا کر شہید کرنا مراد ہے۔

**فائدہ جلیلہ:** رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ﴿فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ کہ کثیر انبیاء کرام اور ان کے ساتھ کثیر تعداد میں اللہ والے جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں ”فان کون فی سبیلہ عز وجل بما یقوی قلوبہم ویزیل وھنہم“ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے خود بخود دل قوی ہو جاتے ہیں اور ان کی کمزوری زائل ہو جاتی ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

**اللہ تعالیٰ کا صابرین سے محبت کرنے کا کیا مطلب؟**

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ ای علی مقاساة الشدائد ومعاناة المكاره فی سبیل اللہ  
فینصرھم وبعظم قدرھم

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، یعنی جو جہاد میں سختیاں برداشت کرتے ہیں، اور کفار کی طرف سے مصائب پہنچائے جانے پر اللہ کی راہ میں صبر کرتے ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ یعنی ان کی امداد کرتا ہے ان قدر و منزلت کو بڑھاتا ہے۔ محبت کا یہاں یہی معنی ہے۔

**نکتہ:** ”والاظهار فی موضع الاضمار للثناء علیہم بحسن الصبر والاشعار بعلیہ الحکم“

پہلے ذکر آ رہا ہے ﴿مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ﴾ اب بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَاللَّهُ يُحِبُّهُمْ﴾ ذکر کیا جاتا تو کافی تھا، لیکن ”الصَّابِرِينَ“ اسم ظاہر ذکر کیا گیا، اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ ان کے حسن صبر کی تعریف کرنی مقصود تھی، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے کی بظاہر علت سمجھ آ جائے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے افعال کسی علت سے نہ محتاج ہیں اور نہ ہی کسی علت کے تابع ہیں۔ (تفسیر ابی السعود مع الوضاح)

”رِبِّيُّونَ“ بمعنی بیان کیا گیا ہے ”اللہ والے“ اللہ والے کون سے لوگ مراد ہیں، اس میں تین احتمال بیان کئے گئے ہیں۔



(۱) ”واخرج ابن جریر من طریق سعید بن جبیر عن ابن عباس فی قوله ربیون کثیر قال علماء کثیرون“

ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ اللہ والوں سے مراد ”علماء“ ہیں، کہ کثیر علماء انبیاء کرام کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے، یہی مطلب عبد بن حمید، اور ابن المذہب اور ابن ابی حاتم کی روایات ”جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ہیں“ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۲) ”واخرج ابن جریر عن ابن زید قال الربیون الاتباع والربانیون الولاة“ ابن جریر نے ابن زید سے روایت بیان کی کہ ”رَبِیُّونَ“ سے مراد حکام کے قبیعین ہیں، اور ربانیون سے مراد حکام ہیں۔

(۳) تیسرا احتمال جو پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ”رَبِیُّونَ“ کا ایک معنی کثیر جماعتیں ہیں۔ واخرج (ابن جریر) عن طریق العوفی عن ابن عباس فی قوله ”رَبِیُّونَ کَثِیْرٌ“ قال الربیوهم الجمیع الکثیرة“ جریر نے ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کی کہ ”رَبِیُّونَ کَثِیْرٌ“ کا مطلب بہت جماعتیں ہیں۔ (درمنثور)

واقم کے نزدیک روایات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کتنے ہی کثیر تعداد میں انبیاء کرام نے جہاد کیا، ان کے ساتھ بہت اللہ والوں کی جماعتوں نے بھی جہاد کیا وہ اللہ والے علماء صلحاء اور انبیاء کی طرف مقرر کئے ہوئے عاملین (حکام) اور ان کے قبیعین تھے۔

**خلاصہ کلام:** اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو جہاد پر براہیختہ کیا گیا۔ کہ اے مسلمانوں! تم بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرو کیونکہ کثیر تعداد میں پہلے انبیاء کرام نے جہاد کیا اور ان کی معیت میں کثیر اللہ والوں نے جہاد کیا، ان کو اللہ کی راہ میں کفار کے ہاتھوں جو تکالیف پہنچیں وہ ان کی وجہ سے نہ ہی ست ہوئے اور نہ ہی کمزور اور نہ ہی کفار سے وہ دبے۔ بلکہ صبر سے کام لیا، اللہ تعالیٰ کی محبت ان کو حاصل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد فرمائی اور ان کے مدارج کو بلند کیا۔ لہذا تمہیں بھی چاہئے کہ تم ست نہ پڑو، کوئی کمزوری نہ دکھاؤ، کفار سے نہ دبو، بلکہ صبر سے کام لو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا، تمہیں اپنی نصرت عطا کرے گا۔

**مقام افسوس:** آج کل مسلمان کفار کے سامنے سر جھکا کر وقت گزار رہے ہیں، کفار سے دبے ہوئے، کفار کے سامنے سر اٹھانے کی طاقت نہیں۔ نصرانیوں کے یار بنے ہوئے ہیں، یہودیوں کے فلسطین پر ناجائز قبضہ کو ماننے کیلئے بے تاب ہیں، صحیح چمچہ یہود و نصاریٰ کو مل گیا جو ہنود کا غمخوار بھی ہے اور قادیانیوں کا طرفدار بھی۔

اللهم انا نعوذک من اليهود والنصارى وملاعقهم، اللهم اهد المؤمنین الذین یقتلون المسلمین“



وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا  
وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

(آیہ ص ۱۳۷)

- (۱) اور کچھ بھی نہ کہتے تھے سوا اس دعاء کے کہ اے رب ہمارے بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں اور ہمارے قدم جمادے اور ہمیں ان کا فر پر مدد دے۔ (کنز الایمان)
- (۲) اور نہیں تھا ان کا کوئی قول سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو اور ہماری زیادتیوں کو جو ہمارے کاموں میں ہوئیں، اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر۔

(نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

پچھلی آیہ کریمہ میں اللہ والوں کی بہادری اور صبر اور سستی میں نہ پڑنے، اور کفار سے نہ دبنے کا ذکر کیا، یہ تمام چیزیں ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب اس آیہ کریمہ میں ان کا دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے، دعاء کرنے، رب تعالیٰ سے بخشش طلب کرنے اور رب تعالیٰ کی طرف جھکنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ (البحر المحیط)

﴿إِلَّا أَنْ قَالُوا﴾ عام اشیاء سے مستثنیٰ مفرغ ہے، یعنی دشمن سے ملاقات کے وقت اور جنگ کی تنگیوں میں اور مختلف قسم کی مصیبتوں کے پہنچنے میں، اور ہر قسم کے شدائد اور ہولناکیوں میں اللہ والے لوگوں کی صرف یہی دعاء تھی اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما۔

(روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا﴾ ”اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہوں کو“

”ذُنُوبَنَا“ الصغائر منها والكبائر ”ذُنُوبَنَا“ تمام صغائر اور کبائر گناہوں کو شامل ہے۔ یعنی اے ہمارے رب ہمارے تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو بخش دے۔

﴿وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا﴾ ”اور (بخش دے) جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں“

”یعنی ما اسرفنا فيه فتخطينا الى العظام من الذنوب لان الاسراف الافراط في الشيء ومجاوزه الحد فيه“



یعنی اے ہمارے رب جو ہم نے زیادتیاں کی ہیں اپنے کاموں میں ان کو بخش دے، اس سے مراد گناہ کبیرہ ہیں کیوں کہ کسی چیز میں افراط (زیادتی) کی جائے، اور حد سے تجاوز کیا جائے تو اسے اسراف کہا جاتا ہے۔ یہ تخصیص بعد از تعیم ہے۔ یعنی ”ذُنُوبَنَا“ میں اگرچہ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن پھر ”إِسْرَافَنَا“ کہہ کر خصوصی طور پر کبیرہ گناہوں کی بخشش طلب کی۔  
(ماخوذ از خازن ج ۱ ص ۲۹۱)

دعاء میں عجز پایا گیا ہے:

اضافوا الذنوب والاسراف الى انفسهم مع كونهم ربانيين براء من التفريط في جنب الله هضمًا لها واستقصارا لهم واسنادا لما اصابهم الى اعمالهم  
اللہ والے اگرچہ گناہوں سے پاک تھے، لیکن انہوں نے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو اپنی طرف منسوب کیا اور رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی، جس سے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور کفار کے ہاتھوں پہنچنے والی مشکلات کو اپنے اعمال کی طرف منسوب کیا۔  
(روح البیان ج ۱ ص ۱۰۷)

پہلے مغفرت کی دعاء کی تاکہ گناہوں کے معاف ہونے کے بعد زبان پاک و صاف ہو جائے، اور اس میں مقام قبولیت آجائے، اس کے بعد دعاء کی ﴿وَقَبِثْ أَقْدَامَنَا﴾ اور ثابت رکھ ہمارے قدموں کو۔

﴿وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ ”اور امداد فرما ہماری کافروں کی قوم پر“

یہ تمام دعاء مقام قبولیت میں واقع ہوئی، کیونکہ دعاء میں عجز پایا گیا ہے، پاکیزہ لوگوں کی پاکیزہ زبانوں سے دعاء نکلی جو قبولیت کے قریب تھی۔ وہ اللہ والے یہ دعاء ہمیشہ کرتے ہی رہے حالانکہ ان کی زبانوں سے کوئی ایسا جملہ نہیں صادر ہوا جس میں ان کے متزلزل ہونے اور جزع و فزع کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا گیا۔ ان کی یہ دعاء ہی ان کے عجز پر اور اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے پر دلالت کر رہی ہے۔  
(روح البیان ج ۲ ص ۶۰۷)

دعائی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ﴾ قول پر نصب ہے یہ ”كَانَ“ کی خبر مقدم اور ﴿أَن قَالُوا﴾ میں ”أَن“ کی وجہ سے فعل مصدر کی تاویل میں ہے اسلئے وہ اسم کان ہے جو مؤخر ہے۔ اور اعم الاشیاء سے مستثنی مفرغ ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۱۷۴)  
تمام مترجمین نے ترجمہ میں اختصار کیا ہے، راقم نے بھی اختصار سے ہی کام لیا ہے، ورنہ روح المعانی کی ترکیب کے مطابق



مکمل ترجمہ ﴿وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا﴾ کا یہ ہے۔ ”اور نہیں تھی کوئی چیز سوائے ان کے یہ بات کہنے کے“

**دوسری قراءت:** ابن کثیر اور عاصم کی روایت میں ”قَوْلُهُمْ“ کو مرفوع پڑھا گیا ہے کہ وہ اسم کان ہے، اور

﴿إِلَّا أَنْ قَالُوا﴾ خبر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوا ”وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ شَيْئًا مِنَ الْأَشْيَاءِ إِلَّا هَذَا الْقَوْلُ الْمَبْنِي عَنْ أَحْسَنِ الْمُحَاسِنِ“ اور نہیں تھا ان کا قول چیزوں میں سے کوئی چیز سوائے اس قول کے جو ان کے محاسن کے کمالات کی خبر دے رہا ہے، یعنی ان کی دعاء اور ان کا عجز کتنا ہی مستحسن امر تھا۔ (ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۷۴، ۷۵)

**ثابت قدمی کا ایک اور مطلب:**

ایک مطلب تو پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ ان کی دعاء کا مطلب یہ تھا کہ اے اللہ ہمیں جنگ میں ثابت قدم رکھنا، ہم پسپا نہ ہوں، پیچھے نہ بھاگیں، اور دوسرا مطلب یہ ہے ”ثَبَّتْنَا عَلَى دِينِكَ الْحَقِّ“ ہمیں اپنے دین حق پر ثابت رکھنا۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۷۵)

**دعاء کیسی ہو؟** نبی کریم ﷺ کی تعلیم امت کیلئے دعاء دیکھئے، کوئی کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، رب تعالیٰ سے عجز و انکساری سے دعاء کرے۔

❁ **وفی صحیح المسلم** ”عن ابی موسیٰ الأشعری عن النبی ﷺ انه کان يدعو بهذا

الدعاء. ﴿اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَاسْرَافِيْ فِيْ أَمْرِيْ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي﴾

مسلم شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی دعاء کا ذکر فرمایا، جو نقل کر دی گئی۔

”فعل الانسان ان يستعمل ما فى كتاب الله وصحيح السنة من الدعاء ويدع ما سواه

ولا يقول اختار كذا فان الله تعالى قد اختار لنبه واولياته وعلمهم كيف يدعون“

انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن پاک اور حدیث پاک میں مذکور دعاؤں میں سے کوئی دعاء کرے یہ نہ

کہے کہ میرے نزدیک یہ دعاء زیادہ مختار ہے، اسلئے کہ وہی دعائیں زیادہ مختار ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اور اپنے اولیاء کو سکھائی ہیں کہ یہ دعائیں تم کرہ۔ (قرطبی ج ۳ ص ۲۳۰)

**میدان جنگ میں وہی دعاء کرے جو اللہ والوں نے کی:**

وفی هذا دليل على مشروعية الدعاء عند لقاء العدو وان يدعو بهذا الدعاء المعين

وقد جاء فى القرآن ادعية اعقب الله بالاجابة فيها“



قرآن پاک کی زیر بحث آیت کریمہ سے یہ واضح ہو گیا کہ دشمن کی ملاقات پر دعاء کرنا مشروع ہے، اور دعاء بھی یہ خاص معین دعاء کرے جو اللہ والے کرتے رہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَسِرَافِنَا فِي أَمْرِنَا وَبَثِّثْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝﴾

اگرچہ قرآن پاک میں اور دعاؤں کا بھی ذکر ملتا ہے، لیکن جہاد کے دوران یہ خصوصی دعاء کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والی آیت کریمہ میں اس دعاء کی قبولیت کا ذکر فرمایا گیا۔  
(البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۱)



فَاتَهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (آیت نمبر ۱۳۸)

(۱) تو اللہ نے ان کو دنیا کا انعام دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی اور نیکی والے اللہ کو پیارے ہیں۔  
(کنز الایمان)

(۲) تو دیا ان کو اللہ نے دنیا کا ثواب، اور آخرت کے ثواب کی خوبی، اور اللہ پسند فرماتا ہے احسان کرنے والوں کو۔  
(نجوم الفرقان)

﴿فَاتَهُمُ اللَّهُ﴾ ”تو دیا ان کو اللہ نے“

(فَاتَهُمُ اللَّهُ) ”ای بسبب“ قولہم ذلک کما تؤذن بہ الفاء“ فاء سے آیت کریمہ کو شروع کیا گیا، فاء دلالت کرتی ہے ”تعقیب مع الوصل“ پر یعنی ایک کام کے اوپر دوسرا کام ساتھ ہی مرتب ہو جائے، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ ان کی دعاء کے بعد جلدی ہی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کر لیا۔

﴿ثَوَابَ الدُّنْيَا﴾ ”دنیا کا ثواب“

ان کی دعاء کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا ثواب عطا فرما دیا، دنیا کے ثواب سے کیا مراد ہے؟ ”وقال قتادة الفتح والظهور والتمكن والنصر“ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ دنیا کے ثواب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا کی، اور ان کو کفار پر غلبہ عطا کیا، ان کو کفار پر طاقت دی اور ان کی امداد کی۔ (ثَوَابَ الدُّنْيَا) ای النصر والغنیمۃ قالہ ابن جریر ”دنیا کے ثواب کا مطلب امداد کرنا اور مال غنیمت دینا۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۸۶)



**اعتراض:** ابن جریج کی تفسیر کس طرح صحیح ہے؟ جبکہ بخاری شریف میں حدیث پاک ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”واحلت لی الغنائم ولم تحل لأحد قبلی“ مال غنیمت صرف میرے لئے ہی حلال کیا گیا ہے، مجھ سے پہلے کسی ایک کیلئے حلال نہیں کیا گیا۔ پہلی امتوں میں مال غنیمت کو ایک جگہ رکھ دیا جاتا تھا، قدرتی طور پر آگ آتی اسے کھا جاتی تھی، وہ مال غنیمت جہاد میں شرکاء حضرات خود استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ابن جریج کی تفسیر میں (ثَوَابِ الدُّنْيَا) سے مراد مال غنیمت بھی بیان کیا گیا، جبکہ ذکر پہلے انبیاء کرام کی امتوں میں سے ”رَبِیُّونَ“ (اللہ والوں) کا ہو رہا ہے، ان کو مال غنیمت دینے کا کیا مقصد؟

**جواب:** واجب بأن المال الذی فآخذہ النار غیر الحیوان واما الحیوان فکان یبقی للغانمین دون الانبیاء علیہم السلام“

مال غنیمت کو آگ کھا جاتی تھی لیکن اس مال سے مراد حیوانوں کے بغیر اور مال ہے۔ حیوانوں کو آگ نہیں کھاتی تھی حیوان جہاد میں شرکاء حضرات کو بطور مال غنیمت مل جاتے تھے، اگرچہ انبیاء کرام وہ حیوان بھی حاصل نہیں کرتے تھے۔ (ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۸۶ و از البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۲)

﴿وَحُسْنُ ثَوَابِ الْآخِرَةِ﴾ ”اور آخرت کے ثواب کی خوبی“

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کے بعد ان کو آخرت کے ثواب کی خوبی (بھی) عطاء کی۔

”ثواب الآخرة الحسن وهو عند ابی جریج“ رضوان اللہ تعالیٰ ورحمته“ وعند قتادہ ہی الجنة، وتخصیص الحسن بهذا الثواب للایذان بفضلہ ومزیته وانه المعتد بہ عنده تعالیٰ“

آخرت کے ثواب کے ”حسن (خوبی)“ سے مراد ابن جریج کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور اس کی رحمت ہے۔ اور ابن قتادہ کے نزدیک اس سے مراد جنت ہے۔ البتہ آخرت کے ثواب کے ساتھ ”حسن“ (خوبی) کے ذکر کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ثواب ہی اللہ کے ہاں زیادہ معتبر ہے، اور اسی میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل پایا گیا ہے، اور اسی کے ذریعے رب تعالیٰ نے بندے کو خصوصی فوقیت عطاء کی ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۸۶)

”وَحُسْنُ ثَوَابِ الْآخِرَةِ“ ای الجنة وحسنه التفضل فوق الاستحقاق“ (جلالین)

ثواب آخرت سے مراد جنت ہے، اور حسن سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل سے انہیں ان کے استحقاق سے زیادہ انعام عطاء کرے گا۔

”یعنی ان ثواب الآخرة هو الجنة وهو حسن واحسن الزیادة لهم فوق ما يستحقون“



آخرت کے ثواب سے مراد جنت ہے، وہ خود ہی حسین ہے کیونکہ اس میں ”حسن“ (خوبی) موجود ہے، البتہ اللہ والوں کو ان کی دعاء کے ذریعے ان کے استحقاق سے زیادہ عطاء فرماتا جو ”احسن“ (بہت خوبی) ہے۔  
(صادی ج ۱ ص ۱۶۲)

**فائدہ:** ثواب آخرت تمام ہی حسین ہے ”فما خصه الله بأنه حسن من هذا الجنس فانظر كيف يكون حسنه“ جس کو اللہ تعالیٰ نے حسن سے خاص کیا ہے وہ کتنا ہی زیادہ حسین ہوگا۔ ثواب دنیا کے ساتھ حسن کی قید نہیں لگائی گئی کیونکہ یہ قلیل ہے، اور دنیا میں ضرر و نقصان بھی پایا جاتا ہے، اور دنیا کا ثواب ختم بھی ہو جاتا ہے۔  
دینی طلباء کے فائدہ کیلئے:

حسن جب حاء پر ضمہ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے ”خوبصورتی“ اور اگر فتح ہو تو اس کا معنی ہوتا ”خوبصورت“ یعنی جس میں خوبصورتی پائی جائے۔

قال القفال رحمه الله يحتمل ان يكون الحسن (بالضمة) هو الحسن (بالفتحة) كقوله تعالى (وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا) ای حسنا

فقال رحمه الله نے بیان کیا ہے کہ آیہ کریمہ میں ”حسن“ (حاء کی پیش سے) جو ذکر ہے، معنوی لحاظ پر ”حسن“ (حاء کی زیر سے ہو) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ میں ”حسن“ (پیش سے) ”حسن“ (زیر والی صورت میں) کے معنی میں ہے۔ اس میں مبالغہ پایا گیا ہے کہ آخرت کا ثواب اتنا زیادہ حسین ہے گویا کہ عین حسن بن گیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ”فلان جود و کرم اذا كان في غاية الجود والكرم“ فلاں جود و کرم ہے۔ یعنی بہت زیادہ جود و کرم اسے حاصل ہے۔

**فائدہ جلیلہ:** اس سے پہلے رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بیان ہو چکا ہے۔

﴿وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾  
”جو شخص ارادہ رکھتا ہے دنیا کے ثواب کا ہم اسے دیتے ہیں اس میں سے، اور جو شخص آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتا ہے ہم اسے دیتے ہیں اس میں سے۔“

اس آیہ میں دونوں جگہ ”منها“ ذکر ہے۔ ”من“ بمعنی کیلئے ہے۔ یعنی دنیا کا بعض ثواب دیتے ہیں اور آخرت کا بعض ثواب دیتے ہیں۔ لیکن زیر بحث آیہ کریمہ میں ”من“ مذکور نہیں۔ وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ جو لوگ



آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتے ہیں۔

”انما اشتغلوا بالعبودية لطلب الثواب فكانت مرتبتهم نازلة“ وہ عبودیت میں ثواب کی طلب کیلئے مشغول ہوتے ہیں، ان کا مرتبہ گھٹیا ہے۔ لیکن اس زیر بحث میں جن اللہ والوں کا ذکر ہے۔  
 ”فانهم لم يذكروا في انفسهم الا الذنب والقصور“ انہوں نے اپنے نفسوں کا سوائے گناہوں اور قصور کے ذکر نہیں کیا، یہی مراد ان کی اس دعاء میں ہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا﴾

”اے ہمارے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے تجاوز کی بخشش فرما۔“

”ولم يروا التدبير والنصرة والاعانة الا من ربهم“ اور انہوں نے تدبیر اور نصرت و اعانت کو صرف اپنے رب سے طلب کیا، ان کی دعاء، ﴿وَوَيْتٌ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ کا یہی مطلب ہے۔  
 ”فكان مقام هؤلاء في العبودية في غاية الكمال“ لہذا ان لوگوں کو مقام عبودیت میں بہت کمال حاصل ہے۔

”فلا جرم اولئك فازوا ببعض الثواب وهؤلاء فازوا بالكل“ اسی وجہ سے یقیناً وہ لوگ جن کا ذکر پچھلی آیت کریمہ میں ہے وہ بعض ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، وہ جن لوگوں کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے وہ کل ثواب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی مکمل رضاء مندی اور رحمت حاصل ہو گئی۔

”وايضا اولئك ارادوا الثواب وهؤلاء ما ارادوا الثواب وانما ارادوا خدمة مولا هم  
 فلا جرم اولئك حرموا وهؤلاء اعطوا ليعلم ان كل من اقبل على خدمة الله اقبل  
 على خدمته كل ماسوى الله“

اور وجہ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں کا پچھلی آیت کریمہ میں ذکر ہے انہوں نے ثواب کا ارادہ کیا اس لئے وہ مکمل ثواب حاصل کرنے سے محروم رہے، اور جن لوگوں کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے انہوں نے ثواب کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ اپنے مولیٰ کی خدمت کا ارادہ کیا اس لئے ان کو مکمل ثواب عطاء کیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی خدمت (عبادت) میں مشغول ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوق اس کی خدمت میں مشغول ہوتی ہے۔ (کیرج ۹ ص ۲۹)

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ ”اور اللہ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں پر“

نبی کریم ﷺ نے احسان کی وضاحت فرمائی جبکہ جبریل نے آپ سے پوچھا ”ما الاحسان يا رسول“



اللہ“ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ تو آپ نے اسے جواب دیا ”ان تعبد اللہ کانک تراہ“ تم اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس مقام میں مفسر بن کرام نے دو معنی بیان کئے ہیں ایک بندے اور رب تعالیٰ کے درمیان جو طاعت پائی جاتی ہے یہ اسے لازم پکڑتا ہے، یعنی کامل مطیع اور کامل عبادت گزار ہوتا ہے، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ ثابت قدم رہے کہ یا تو ہم شہید ہو جائیں گے یا غالب ہو جائیں گے، اس سے پہلے ہم نبی کا ساتھ چھوڑ کر کہیں بھاگ کر نہیں جائیں گے، میدان جنگ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۲)

**دقیقہ لطیفہ:** جب بندے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں۔  
﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا﴾ تو اللہ تعالیٰ ان کا نام محسن رکھ دیتا ہے کہ یہ محسن ہیں۔ گویا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اس بندے کو یوں نداء دی جاتی ہے

”اذا اعترفت باساءتك وعجزك فانا اصفك بالاحسان واجعلك حبيبا لنفسي  
حتى تعلم انه لا سبيل للعبد الى الوصول الى حضرة الله الا باظهار الذلة  
والمسكنة والعجز“

کہ اے میرے بندے جب تو نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے اور اپنے عجز کا تو نے اظہار کر دیا ہے تو میں تجھے احسان کا وصف عطاء کر رہا ہوں، اور تجھے اپنا حبیب بنا رہا ہوں، تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور مقبولیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو کمتر سمجھے اور مسکینی اختیار کرے اور عجز اختیار کرے، اور وجہ ان کو محسنین کہنے کی یہ ہے کہ جب انہوں نے جہاد میں ثابت قدم رہنے کی اور دشمن کے خلاف امداد حاصل کرنے کی دعاء رب تعالیٰ سے کی تو ان کو اللہ تعالیٰ نے صفت احسان عطاء کی۔

”وهذا يدل على ان العبد لا يمكنه الاتيان بالفعل الحسن الا اذا اعطاه الله ذلك  
الفعل واعاله عليه“

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ بندہ کو اچھا فعل عمل میں نہیں لاسکتا جب تک اللہ تعالیٰ اسے وہ فعل عطاء نہ کرے اور اس کی امداد نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو محسن ہونا قرار دیا تو اس پر جزاء یہ مرتب فرمائی کہ اے میرے بندو جب تم احسان کرنے والے ہو یعنی میری طاعت و عبادت کو لازم پکڑنے والے ہو تو میں تمہیں اپنی محبت سے نواز رہا ہوں کہ تم میرے محبوب ہو، یعنی بندوں کو جب احسان حاصل ہوتا ہے تو رب تعالیٰ بھی ان پر احسان فرماتا ہے۔ رب تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ و کرم پر یہ لازم کیا۔



﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ ”کہ احسان کی جزاء نہیں سوائے احسان کے۔“  
 ”وكل ذلك يدل على انه سبحانه هو الذي يعطي الفعل الحسن للعبد ثم انه يشبه  
 عليه ليعلم العبد ان الكل من الله وباعانة الله“  
 اس تمام بحث سے یہ پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ بندے کو فعل حسن عطاء کرتا ہے، پھر اس اچھے فعل پر اسے اللہ  
 تعالیٰ جزاء عطاء فرماتا ہے، تاکہ بندے کو معلوم ہو جائے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی امداد سے  
 حاصل ہے۔  
 (کبیر ج ۹ ص ۲۹، ۳۰)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ ”وضع المظهر موضع المضمّر للاشعار بانهم هم المحسنون“  
 یہاں اسم ظاہر ”مُحْسِنِينَ“ ذکر کیا، ضمیر نہیں ذکر کی یوں نہیں کیا ”وَاللَّهُ يُحِبُّهُمْ“ کہ اللہ ان سے محبت  
 کرتا ہے، اس لئے کہ ضمیر لانے کی صورت میں اتنا تو پتہ چل جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے ”رَبِّسُونَ“ (اللہ والوں) کو دنیا  
 کا ثواب اور آخرت کے ثواب کی خوبی عطاء کی اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے، لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ  
 احسان کرنے والے بھی ہیں۔ لیکن جب اسم ظاہر ذکر کیا تو یہ بہت واضح ہو گیا کہ وہ اللہ والے محسن ہیں اور اللہ تعالیٰ  
 محسنین سے محبت کرتا ہے۔  
 (تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۵۳)

محبت کے حاصل ہونے سے تمام نیک بختیاں حاصل ہو جاتی ہیں:

”ومحبة الله للعبد عبارة عن رضا عنه و اراد الخيرية فهي مبدأ لكل سعادة“  
 اللہ تعالیٰ کی محبت بندے کو حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو رب تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے، اور  
 اللہ تعالیٰ اسے خیر و بھلائی عطاء فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت اور اس کی طرف سے ارادہ خیر سے ہر طرح کی  
 سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

والصبر والاحسان من صفات الله تعالى والله تعالى يحب صفاته ويحب من تخلق  
 بصفاته ولهذا قال ﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ، وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

صبر و احسان حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو پسند فرماتا ہے، اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی  
 صفات سے متصف ہوا ہے بھی اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ  
 الْمُحْسِنِينَ﴾ اور اللہ محبت رکھتا ہے احسان کرنے والے سے۔



لما زاد لخواص عباده كرامة التخلق باخلاقه ابتلاهم بقتال العدو ولبتھم عند الملاقاة  
فاستخرج من معادن ذواتهم جواهر صفاته المكنونة فيها المكرمة بهابنو آدم  
جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خاص نعموں سے نوازنے کا ارادہ فرماتا ہے یعنی ان کو اپنی صفات سے متصف  
کرنا چاہتا ہے تو ان کو میدان جنگ میں آزماتا ہے جب وہ وہاں ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو  
اس طرح نکھار کر مکرم بنادیتا ہے جیسے معدنیات سے خواہر کو نکھار کر نکالا جائے۔ (ماخوذ از روح البیان ج ۲ ص ۱۰۷)



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ  
فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝

(آیہ نمبر ۱۲۹)

(۱) اے ایمان والو اگر تم کافروں کے کہے پر چلے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں لوٹا دیں گے پھر ٹوٹا کھا کے  
پلٹ جاؤ گے۔ (کنز الایمان)

(۲) اے ایمان والو اگر تم نے اطاعت کی کافروں کی وہ لوٹا دیں گے تمہیں الٹے پاؤں تو تم پھرو گے  
نقصان اٹھاتے ہوئے۔ (نجوم الفرقان)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا﴾  
”اے ایمان والو اگر تم نے اطاعت کی کافروں کی۔“

شان نزول میں چند احتمال ہیں:

(۱) ابن جریر اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج سے روایت کی کہ یہ آیہ نازل ہوئی کہ ”لا تنتصحو  
اليهود والنصارى عن دينكم ولا تصدقوهم بشئ في دينكم“ اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ سے اپنے  
دین کے متعلق کوئی نصیحت قبول نہ کرو، اور نہ ہی اپنے دین کے متعلق ان کی کسی چیز میں تصدیق کرو ورنہ وہ تمہیں دین  
سے پھیر دیں گے۔ (در منثور ج ۷ ص ۸۳)

(۲) وقال على رضى الله عنه يعنى المنافقين قولهم للمؤمنين عند الهزيمة ارجعوا الى  
اخوانكم وادخلوا في دينهم“ (معالم التنزيل للبغوي ج ۱ ص ۳۶۰، مظهری ج ۲ ص ۱۵۳)



## شان نزول:

کے متعلق دوسرا قول حضرت علیؓ کا ہے کہ منافقین نے جب ایمان والوں کو کہا کہ تم پسپا ہو گئے، کفار نے اچانک تم پر حملہ کر کے تمہیں بہت بڑا نقصان پہنچا دیا ہے، لہذا تم اپنے بھائیوں (کفار قریش) کی طرف لوٹ جاؤ، اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ، اگر محمد نبی ہوتے تو شہید نہ ہوتے، یہ اس وقت کی بات ہے جب شیطان نے یہ خبر اڑائی تھی کہ محمد شہید کر دیئے گئے۔ منافقین مشورہ دے رہے تھے کہ عبداللہ بن ابی کے پاس چلو تا کہ وہ سفارش کر کے ابوسفیان سے تمہیں امان لے کر دے، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

﴿يُرْذُوكُمْ عَلَىٰ أَغْقَابِكُمْ﴾ ”وہ لوٹا دیں گے تمہیں الٹے پاؤں۔“

حقیقت میں لغوی معنی یہ ہے کہ وہ لوٹا دیں گے تمہیں ایڑیوں کے بل، مرادی ترجمہ وہی ہے جو ذکر کر دیا گیا۔ مطلب اس کا یہ ہے ”برجموکم الی ما کنتم علیہ قبل الاسلام عن الشرک“ کہ وہ تمہیں شرک کی طرف لوٹا دیں گے، جہاں تم اسلام سے پہلے تھے۔

﴿فَتَنَقَّلُوا خَاسِرِينَ﴾ ”تو تم پھر وگے نقصان اٹھاتے ہوئے۔“

یعنی اگر (بالفرض) تم نے کافروں کی اطاعت کر لی، ابوسفیان سے پناہ حاصل کر لی تو تم دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہو گے، اس طرح تم نقصان اٹھاتے ہوئے دین اسلام سے کفر و شرک کی طرف پھر جاؤ گے۔  
(تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۵۲، ۱۵۳)

**تنبیہ:** واعلم ان اللفظ لما کان عاما وجب ان یدخل فیہ خسران الدنیا والآخرة (کبیج ۹ ص ۳۱)

﴿فَتَنَقَّلُوا خَاسِرِينَ﴾ میں لفظ خاسرین عام ہے، لہذا اس کی عمومیت (عام ہونے) کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اس سے مراد دنیا اور آخرت کا خسارہ مراد لیا جائے کہ تم لوٹو گے دنیا اور آخرت کا خسارہ اٹھاتے ہوئے۔

دنیا و آخرت کا خسارہ کتنا عظیم ہے:

اما خسران الدنیا فلان اشق الاشیاء علی العقلاء فی الدنیا الانقیاد للعدد والتدلیل له و اظهار الحاجة الیه، واما خسران الآخرة فالحرمان عن الثواب



اگر تم نے کفار کی تابعداری کی تو تم دین اسلام سے کفر کی طرف پھر جاؤ گے اور بہت نقصان اٹھاتے ہوئے پھر وگے اس لئے کہ تم اپنے دشمن کے سامنے سر جھکاؤ گے، اس کے سامنے عجز کا اظہار کر کے اپنے آپ کو ذلیل کرو گے۔ اور اپنی حاجات کا ذکر اپنے دشمن سے کرو گے، اس سے اپنی حاجات طلب کرو گے تو اس سے بڑھ کر دنیا میں تمہیں خسار کیا حاصل ہوگا؟ ہر عقلمند شخص اسے اپنے لئے بہت بڑا نقصان سمجھتا ہے۔ اور آخرت کا خسار تمہیں یہ حاصل ہوگا کہ تم دائمی ثواب سے محروم ہو جاؤ گے اور ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔

**فائدہ:** آیہ کریمہ سے یہ فائدہ: اصل ہوا کہ کفار، یہود و نصاریٰ سے اپنی حاجات طلب کرنا، ان کے سامنے سر جھکانا، ان کے سامنے عاجز ہو کر رہنا، ان سے ڈرنا سوائے دنیا اور آخرت کے خسار کے کچھ نہیں۔ کبھی ان کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کاش کہ اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے قرآن پاک کی یہ آیہ کریمہ سمجھ آ جائے، اور کفار سے دوستی قائم کر کے جو خسار حاصل کر رہے ہیں، اس سے بچ سکیں، لیکن افسوس یہ سر جھکاتے ہی چلے جا رہے ہیں، یہود و نصاریٰ سے بڑھ کر ان کے چچے اسلام کو نقصان پہنچانے کیلئے پیش پیش ہیں، لیکن جس چیز کی رب تعالیٰ حفاظت کر رہا ہو اسے کون مٹا سکتا ہے۔



بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ الْوَالِدِ صَرِيْنٌ ۝ (آیہ نمبر ۱۵۰)

(۱) بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے وہ سب سے بہتر مددگار ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) بلکہ اللہ مددگار ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔ (نجوم الفرقان)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ نے ”مَوْلَاكُمْ“ کا ترجمہ تمہارا مولیٰ کیا تا کہ مفسرین کرام کے بیان کئے ہوئے تمام معانی کو شامل ہو جائے۔

(بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ) محبکم و ناصرکم و حافظکم علی دینہ فلا تتولوا غیرہ تعالیٰ

(مظہری ج ۲ ص ۱۵۵)

بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے، یعنی وہ تمہارے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ وہ تمہارا مددگار ہے، وہ تمہاری حفاظت کرنے والا ہے تمہیں اپنے دین پر قائم رکھ کر، لہذا تم اللہ تعالیٰ سے اس کے غیروں کی طرف نہ پھرو یعنی دین اسلام پر قائم



رہو۔ ”والمعنی لیس الکفار اولیاء فیطاعوا فی شیء بل اللہ مولاکم“ مطلب یہ ہے کہ کافر تمہارے ولی، مددگار، حامی و ناصر نہیں کہ تم ان کی اطاعت کرہ، ان کی اطاعت نہ کرو، بلکہ تمہارا مولی اللہ ہے تم اس کی اطاعت کرو۔

”وقرأ الحسن بنصب الجلالة علی معنی بل اطیعوا اللہ لأن الشرط السابق يتضمن معنی النهی ای لا تطیعوا الکفار فتکفروا بل اطیعوا اللہ مولاکم“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے لفظ ”اللہ“ پر نصب (ز) پڑھی ہے، اور فعل ”أَطِيعُوا“ کو محذوف مانا ہے کہ پہلے مذکور شرط ﴿إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَزِدُّكُمْ عَلَىٰ عَذَابِكُمْ﴾ سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ یہاں بھی نہی پائی گئی ہے معنی یہ ہے کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو، ان کی اطاعت کرنے سے کافر ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو وہی تمہارا مولیٰ ہے۔

(البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۳)

﴿وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ﴾ ”وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ سب سے بہتر مددگار کیوں ہے؟ اسلئے کہ ”انہ تعالیٰ هو القادر علی نصر تک فی کل ماترید“ اللہ تعالیٰ قادر ہے، تم اس سے جو مدد طلب کرو وہ تمہاری امداد فرماتا ہے، کیونکہ وہ تمہاری امداد فرمانے پر قادر ہے، اس کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔ سب سے بہتر مددگار ہونے کی وجہ یہ ہے ”وهو العالم الذی لا ینخفی علیہ دعاؤک ونضر عک“ کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے، اس لئے تمہاری دعاء اور تمہاری عاجزی اس سے چھپی ہوئی نہیں، تم جو دعاء کرتے ہو اور اپنی عاجزی پیش کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور وہ تمہاری امداد فرماتا ہے۔

سب سے بہتر مددگار ہونے کی وجہ یہ ہے ”هو البکریم الذی لا ینخل فی جودہ“ کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، وہ جواد ہے اسے بخل حاصل نہیں، وہ جتنا چاہے عطاء کرنے اس کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔ بعض انسان اگرچہ دوسروں کی امداد کرتے ہیں لیکن ان کی امداد کو اللہ تعالیٰ کی امداد سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ان کی قدرت و علم و سخاوت کو جب رب تعالیٰ کی قدرت و علم و جود کے مقابل کچھ نسبت حاصل نہیں تو یقیناً بندوں کی مدد دوسرے بندوں کی نسبت رب تعالیٰ کی امداد کے کمترین رہتی ہے۔

اور وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں امداد فرماتا ہے، بندوں کو ذاتی طور پر خود بخود یہ طاقت حاصل نہیں۔ (اگرچہ انبیاء کرام اور صلحاء کو شفاعت کرنے کا حق یوم آخرت کو دیا جائے گا لیکن وہاں بھی حقیقی امداد رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونی ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ بندوں کی حاجات کو جانتا ہے وہ ان کو سوال سے پہلے ہی عطاء کر دیتا ہے، بندوں کو یہ طاقت حاصل نہیں۔)

(ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۳۱)



لہذا اے انسان تو اپنے گناہوں کی معافی صرف اللہ تعالیٰ سے ہی طلب کر، معاف کرنے کی صرف اسے ہی طاقت حاصل ہے۔

کنوں بایدت عذر تقصیر گفت نہ چوں نفس ناطق ز کفتن بخت  
اب تجھے چاہئے کہ تو اپنے گناہوں کا عذر پیش کر اس وقت (کوئی فائدہ) نہیں کہ تیری زبان بولنے سے بند ہو جائے  
تو پیش از عقوبت در عفو کوب کہ سودے ندارد فغان زیر چوب  
تو سزا سے پہلے معافی کا دروازہ کھٹکا اس وقت شور کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب ڈنڈہ تیرے سر پر پڑ رہا ہوگا



سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا  
وَمَا وَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوًى الظَّالِمِينَ ۝  
(آیہ نمبر ۱۵۱)

- (۱) کوئی دم جاتا ہے کہ ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈالیں گے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا جس پر اس نے کوئی سمجھ نہ اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا برا ٹھکانا انصافوں کا۔ (کنز الایمان)
- (۲) عنقریب ہم ڈالیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس وجہ سے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ سے (اسے) کہ نہیں نازل ہوئی اس (کے شریک ہونے) پر کوئی حجت، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے، اور کتنا ہی برا ٹھکانا ہے نا انصافوں کا

(نجوم الفرقان)

## شان نزول:

واخرج ابن ابی حاتم عن ابن عباس فی هذه الآية قال قذف الله فی قلب ابی سفیان الرعب فرجع الی مکه فقال النبی ﷺ ان اباسفیان قد اصاب منکم طرفا وقد رجع وقذف الله فی قلبه الرعب“

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا ہے، نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کو بتایا کہ ابوسفیان کو تمہارا خوف لاحق ہو گیا



اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا، اسی لئے وہ مکہ کی طرف لوٹ گیا۔ (درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

ابن جریر نے سدی سے تفصیلی روایت ذکر کی ہے:

”اخرج ابن جریر عن السدی قال لما ارتحل ابو سفیان والمشرکون يوم احد متوجهين نحو مكة انطلق ابو سفیان - حتى بلغ بعض الطريق ثم انهم ندموا فقالوا ابنسما صنعتهم انکم قتلتموهم حتی لم یبق الا الاشرید ترکتموهم ارجعوا فاستأصلوا فقتل الله فی قلوبهم الرعب فانهمزوا فلقوا اعرابا فجعلوا له جعلاً فقالوا له ان لقیتم محمد افأخبرهم بما قد جمعنا لهم، فأخبر الله رسوله ﷺ فطلبهم حتی بلغ حمراء الاسد فانزل الله فی قلوب الذین کفروا الرعب الالة“ (درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

”ابن جریر“ نے سدی روایت ذکر ہے کہ جب ابوسفیان اور دوسرے مشرکین غزوہ احد سے مکہ کی طرف لوٹے، ابوسفیان نے راستہ میں چلتے ہوئے کہا اور: ”تھ ہی دوسرے مشرکین بھی کہنے لگے، وہ سب بظاہر پشیمان ہو رہے تھے، اور ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے، تم نے بہت ہی برا کیا ہے کہ مسلمانوں کو تم نے قتل تو کیا ہے لیکن بہت ان میں سے بکھرے ہوئے تھے جن کو تم نے قتل نہیں کیا وہ باقی رہ گئے ہیں، اس لئے واپس چلو ان کا مکمل صفایا کرو، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا وہ بھاگ گئے، اس طرح حقیقت میں شکست انہیں ہی ہوئی، حالانکہ وہ پہلے ایک اعرابی کو کہہ رہے تھے کہ محمد کو قتل کر بتاؤ کہ ہم ایک مرتبہ پھر تم پر جمع ہو کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ ادھر رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خبر دے دی آپ نے بھی اپنے ان صحابہ کو جو غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے اور زخمی بھی تھے، ساتھ لیا کفار کا پیچھا کیا، جب نبی کریم ﷺ مقام حمراء میں پہنچے تو یہ آیت کریمہ ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ نازل ہوئی۔ تو وہ رعب میں آگرڈر کے مارے بھاگ گئے۔ خیال رہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو اس خاص موقع پر نازل کیا، لیکن یہ اپنے مضمون کے لحاظ پر عام ہے، یعنی کافر ہمیشہ ہی مسلمانوں سے ڈرتے ہی رہیں گے۔ (غازن)

البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمان ان کے مقابلہ کیلئے نکلیں، تو ان شاء اللہ کافر ہر میدان سے دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔

واخرج مسلم عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال نصرت بالرعب على العدد“

(درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دشمن پر رعب ڈال کر میری امداد فرمائی گئی۔

واخرج احمد والترمذی وصححه وابن المنذر وابن مردويه والبيهقي في سننه عن



ابی امامۃ ان رسول اللہ ﷺ قال فضلت علی الانبیاء باربع ارسلت الی الناس کافۃ وجعلت لی الارض کلها ولأمتی مسجدا وطهورا فاینما رجل أدركه من أمتی الصلوة فعنده مسجده وعنده طهوره ونصرت بالرعب مسيرة شهر یقذفه فی قلوب اعدائی واحل لنا الغنائم“ (درمنثور ج ۲ ص ۸۳)

”ابو امامہ“ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے انبیاء پر چار چیزوں سے فضیلت دی گئی مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا، اور میرے لئے اور میری امت کیلئے تمام زمین کو مسجد اور مطہر (پاکیزہ کرنے والی) بنا دیا گیا، ہری امت میں سے جہاں بھی کسی شخص نے نماز کے وقت کو پایا وہاں ہی (وہ زمین) اس کیلئے مسجد ہے۔ اور وہاں ہی اس کیلئے پاکیزہ کرنے والی چیز (یعنی مٹی موجود ہے) اور ایک مہینہ کی راہ سے میرے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر میری امداد کی گئی، اور مال غنیمت میرے لئے حلال کر دیا گیا۔

ان دونوں روایات سے بھی عموم سمجھ آتا ہے، کیا یہ عموم صرف نبی کریم ﷺ کیلئے تھا یا آپ کی امت کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا گیا؟ راقم کے نزدیک یہ حکم عام ہے جو امت مصطفیٰ کریم ﷺ کو بھی حاصل ہے۔ ”الرعب“ عین کے سکون سے ہے، البتہ عامر اور کسائی کی قراءت میں عین کے پیش سے پڑھا گیا ہے۔

”وہما لغتان“ یہ دونوں لفظیں ہیں جو جائز ہیں۔ ”رعب“ میں مصدری معنی بھی پایا جاتا ہے ”رعبہ رعبا“ میں نے اس پر رعب ڈالا۔ اس طرح جو رعب میں آجائے اسے مرعوب کہا جاتا، اور ”رعب“ میں اسی معنی بھی پایا جاتا ہے، یعنی ”خوف“ کو رعب کہا جاتا ہے۔ ”والرعب الاسم واصله من الملاء“ رعب کا اصل میں معنی ہے بھر دینا۔ کہا جاتا ہے ”سیل رعب یملأ الوادی“ ندی وادی کو بھر رہی ہے۔ ”رعبت الحوض، ملأته“ میں نے حوض کو بھر دیا ہے۔ خوف اور فزع کو اس لئے رعب کہا جاتا ہے کہ یہ مشرکین کے دلوں کو خوف سے بھر دیتا ہے۔

اب ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ کا معنی ہو گیا ”سنملا قلوب المشركين خوفا وفزعاً“ ہم عنقریب مشرکوں کے دلوں کو خوف اور فزع سے بھر دیں گے۔ (قرطبی ج ۳ ص ۲۴۲)

**تنبیہ:** القاء حقیقی معنی کے لحاظ پر اجسام سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات گرامی میں ہے ”والقئی اللواح“ (اور ڈال دیا تختیوں کو) اور ارشادات باری تعالیٰ ہے ﴿فَالْقَوُّوا جِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ﴾ (تو انہوں نے اپنی رسیاں اور عصا ڈالے) اور ذکر ہے ﴿فَالْقَى مُوسَى عَصَاهُ﴾ (تو ڈالا موسیٰ نے اپنا عصا) القاء کا مجازی معنی دلوں



میں کسی چیز کو ڈال دینا جیسا کہ اسی زیر بحث میں ہے ﴿مَسْلُفِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ عتقرب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب“ اسی طرح اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَالْقَيْثُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِنِّي﴾ میں نے تجھ پر اپنی طرف کی محبت ڈالی، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالی، یہی وجہ تھی کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچوں کو قتل کر دیا، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر پالا، کیونکہ فرعون کے دل میں بھی آپ کی محبت کو ڈال دیا گیا تھا۔

﴿بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ﴾ ”اس وجہ سے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ سے۔“

﴿مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ﴾ ”ای باشر کہہ وقیل بعد دتہ“ یعنی کفار جسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اس کے شریک ہونے اور اس کے معبود ہونے پر کوئی دلیل) اللہ تعالیٰ نے نہیں اتاری (روح المعانی) یعنی مشرکین نے کئی معبود بنا رکھے ہوتے ہیں، وہ اس میں حیران ہوتے ہیں کہ کسی کی عبادت کریں اور کسی کی عبادت نہ کریں، ان کے معبودوں پر ان کے پاس کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں تھی، ان کا حال تو یہ تھا کہ ایک پتھر خوبصورت دیکھا تو اس کی پوجا شروع کر دی اور جب اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی پتھر نظر آیا تو پہلے بت کو پھینک کر نئے بت کی پوجا کرنے لگ گئے۔

(سلطاناً) ”حجة وبياناً وعذراً وبرهاناً“ یعنی نہیں نازل ہوئی اس کے شریک ہونے اور معبود ہونے پر کوئی حجت و دلیل، اور نہ ہی نازل ہوا اس پر کوئی بیان، اور نہ ہی نازل ہوا ان پر کوئی عذر اور نہ ہی برهان۔ ”انه حجة الله عز وجل“ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حجت و دلیل ہے زمین میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے ”انه ذو الحجة“ کہ بادشاہ صاحب حجت و دلیل ہے کہ وہ اپنے فیصلے و دلائل سے کرتا ہے، اسی لئے اسے سلطان کہا جاتا ہے۔ ”قال الزجاج انه من السليط الذي يضاء به السراج وهو دهن السمسم“ زجاج نے کہا ہے کہ ”سلطان“ ماخوذ ہے سلیط سے، سلیط اس چیز کو کہتے ہیں جس سے چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ اگرچہ چراغ میں استعمال ہونے والا کوئی تیل بھی ہوا سے سلیط کہا جاتا ہے۔ تاہم زیادہ طور پر اس کا اطلاق تلوں کے تیل پر ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے ”اما السليط بالبدال المفضل“ اس نے بٹی ہوئی جتنی پر تیل انڈیا ”فالسلطان يستضاء به في اظهار الحق وقمع الباطل“ اس معنی کے لحاظ پر بادشاہ کو سلطان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کے ذریعے حق کے اظہار اور باطل کے مٹانے کی روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ ”وقيل للامراء سلاطين لانهم الذين بهم يتوصل الناس الى تحصيل الحقوق“ اس معنی کے لحاظ پر بادشاہوں کو سلاطین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح چراغ سے راہ کو تلاش کیا جاتا ہے اسی طرح بادشاہوں کے ذریعے لوگ اپنے حقوق حاصل کرتے ہیں۔

قال الليث ”السلطان القدرة لأن اصل بنائه من التسليط، وعلى هذا سلطان الملك قوته وقدرته“



لیٹ نے بیان کیا ہے کہ سلطان کا معنی قدرت ہے، یہ لیا ہوا ہے تسلیط سے جس کا معنی ہے قدرت، اس معنی کے لحاظ پر بادشاہ کی قوت و قدرت کو بھی سلطان کہا جاتا ہے۔ ”قال ابن درید السلیط الحديد، والسلطة“ لو ہے کو سلیط کہا جاتا ہے۔ اور آلات کی تیزی کو حدة کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی مناسبت سے یوں کہا جا سکتا ہے ”السلطان يقهر بالسلطان على السلطان“ بادشاہ طاقت سے دوسرے بادشاہ پر قہر کرتا ہے اور بد بہ ڈالتا ہے۔ ”والسليطة المرأة الصخابة والسليط الرجل الفصيح اللسان“ چلا نیوالی عورت کو سلیطہ کہا جاتا ہے۔ اور فصیح اللسان شخص کو سلیط کہا جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۳۳، قرطبی ج ۴ ص ۲۳۲)

**اعتراض:** رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَالَهُ يُنَزِّلُ بِهِ سُلْطَانًا﴾ نہیں نازل کی اس پر کوئی حجت، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حجت نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ حجت تو ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اتارنا نہ ہو اور ظاہر نہ کیا ہو۔

**جواب:** ”لو كان لانزل الله به سلطانا فلما لم ينزل به سلطانا وجب عدمه“

اگر دلیل ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور نازل فرماتا، جب اس نے کوئی دلیل نازل نہیں کی تو اس کا مطلب واضح ہے کہ کافروں کے معبودوں اور ان کے شریک ٹھہرانے پر حقیقت میں کوئی دلیل ہی نہیں۔

وحاصل الکلام فيه ما يقوله المتكلمون ان هذا مما لا دليل عليه فلم يجز اثباته ومنهم من يبالغ فيقول لا دليل عليه فيجب نفيه“

حاصل کلام اس میں جو متکلمین نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں لھذا سے ثابت کرنا جائز نہیں۔ بعض حضرات نے اس پر زیادہ مبالغہ کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ جس پر دلیل نہیں اس کی نفی

(کبیر ج ۹ ص ۳۳)

واجب ہے۔

**دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:**

قضیہ سالبہ وجود موضوع کو نہیں چاہتا، یعنی ضروری نہیں کہ موضوع موجود ہو پھر اس سے نفی کی جائے، موضوع موجود نہ ہو اور اس سے نفی کرنا صحیح ہے، جیسا کہا جائے ”شریک الباری لیس بمستحق العبادۃ“ شریک باری تعالیٰ مستحق عبادت نہیں، اس جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شریک باری تعالیٰ ہے کہ ہم اس کی عبادت نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی رب تعالیٰ کا نہ شریک ہے اور نہ ہی عبادت کے مستحق ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے ”ولا تری الضب بها ينحجر“ تو گوہ کو بل میں گھتے ہوئے نہیں دیکھ رہا ”فالمراد نفیہما جمیعاً“ یہاں مراد دونوں چیزوں کی نفی ہے، یعنی نہ گوہ ہے اور نہ ہی وہاں بل (سورخ) ہے۔



”وذكر عدم انزال الحجة مع استحالة تحققها من باب انتفاء المقيد لانتفاء قيدہ  
اللازم ای لاحجة حتى ينزلها“

یہاں آیت کریمہ میں جو حجت کے نازل نہ کرنے کا ذکر ہے اس سے حجت کے پائے جانے کی بھی نفی کی  
جارہی ہے، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قید بھی ”منفی“ ہو اور قید بھی ”منفی“ ہو۔ لہذا یہاں مطلب یہ  
ہے کہ حجت ہے ہی نہیں کہ اسے اتنا اجائے۔  
(ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۸۸)

**رب تعالیٰ کی شرکت پر حجت کا پایا جانا محال ہے:**

یہ دین کا مسئلہ بدیہی ہے کہ رب تعالیٰ کا نہ ہی کوئی شریک ہی اور ہی اس کی شرکت پر کوئی دلیل قائم  
ہے۔ شرکت پر دلیل کا پایا جانا محال ہے۔

”امافی الاشراک بالربوبیة وظاهر اذ کیف یامر الله سبحانه باعتقاد ان خالق العالم  
النان مشترکان فی وجوب الوجود والاتصاف بکل کمال“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ربوبیت میں شرکت کی اہانت دی جائے یہ محال ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے  
کہ اللہ تعالیٰ خود ہی حکم دے کہ تم عقیدہ پر رکھو کہ جہاں کے خالق دو ہیں اور واجب الوجود ہونے میں اور  
تمام کامل صفات کے حاصل کرنے میں وہ برابر شریک ہیں۔ واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی شرکت پر کوئی  
حجت نہیں تھی کہ اسے نازل کیا جاتا۔

واما الاشراک فی الالوهیة الذی علیہ اکثر المشرکین فی عهد رسول الله ﷺ فلا ینفی  
الی الامر باعتقاد اشیاء خلاف الواقع مما کان المشرکون یعقلونہم فی اصنامہم“

رب تعالیٰ کی الوہیت (اس کے معبود ہونے) میں شرکت محال ہے، کیونکہ مشرکین کا بتوں کی پوجا کرنا  
خلاف واقع چیز کا اعتقاد تھا جو باطل ہے۔ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہونے کے تمام احتمالات  
باطل ہیں۔ لہذا شرکت پر نہ کوئی حجت تھی نہ ہی اسے نازل کیا گیا۔ (ماخوذ از روح المعانی ج ۳ ص ۸۸)

**صانع صرف ایک ہے:**

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یہ دلیل قائم کی گئی ”لا سبیل الی اثبات الصانع الا باحتیاج المحدثات  
الیہ“ صانع وہی ہو سکتا ہے کہ تمام محدثات (تمام مخلوق) اس کے محتاج ہو، جب ساری کائنات محتاج صرف رب تعالیٰ  
کی ہے تو اسی سے پتہ چل گیا کہ صانع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے،  
(ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۳۳)



کاش کہ جہلاء علامہ رازی رحمہ اللہ کے قول کو سمجھتے:

هذه الآية دالة على فساد التقليد وذلك لان الآية دالة على ان الشرك لا دليل عليه فوجب ان يكون القول به باطلا“

اس آیت کریمہ سے پتہ چلا کہ تقلید کا قول فاسد ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ کے شریک کے پائے جانے پر کوئی دلیل نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ شریک ٹھہرانے پر دلیل کے قائم ہونے کا اگر کوئی دعویٰ کرے تو اس کا قول باطل ہوگا اور اس کی تقلید بھی باطل ہوگی۔ (کبیر ج ۹ ص ۳۳)

علامہ رازی رحمہ اللہ کے اس قول سے بعض لوگ مطلقاً تقلید کی نفی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ علامہ رازی رحمہ اللہ بھی تقلید کی نفی کرتے ہیں۔ یہ قول ان لوگوں کا باطل ہے، کیونکہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے تقلید کی نفی کے دو قول مختلف جگہ پر بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ اعتقادات میں تقلید نہیں۔ اور دوسرا قول جو یہاں بیان کیا ہے کہ جس چیز کا باطل ہونا صریح ہو اس کی تقلید نہیں، جیسا کہ رب تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا باطل ہے اور اس پر کوئی دلیل قائم کرنا بھی باطل ہے، لہذا اس کی تقلید بھی نہیں کی جاسکتی، پتہ چلتا ہے کہ اس پر کوئی دلیل قائم کرنا بھی باطل ہے۔ یہی تین قول بفضلہ تعالیٰ ہمارا مسلک ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اہل علم کے اقوال کو سمجھا جائے۔ (راقم)

﴿وَمَا وَاهُمُ النَّارُ﴾ ”اور ان کا ٹھکانا آگ ہے۔“

یعنی مشرک جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی ان کا ٹھکانا ہوگا، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے دنیا کے حال کو بیان کیا، ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (کہ ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے) اب ان کے اخروی حال کو بیان کیا جا رہا ہے، ”وہی ان ماواہم ومسکنہم النار“ کہ ان کا ٹھکانا، ان کا مسکن جہنم کی آگ ہوگا۔

﴿وَبِئْسَ مَثْوًى الظَّالِمِينَ﴾ ”کتنا ہی برا ٹھکانا ہے ظالموں کا۔“

یہاں مخصوص بالذم محذوف ہے، اور وہ نار (آگ) ہے، یعنی ”آگ ظالموں کا کتنا ہی برا ٹھکانا ہے۔“ یہاں اسم ظاہر کو لایا اسم ضمیر کو نہیں۔ تاکہ ان کا ظالم ہونا واضح طور پر ذکر ہو جائے اور ان کا مستحق آگ ہونے کا سبب بھی معلوم ہو جائے، کہ آگ ان کا ٹھکانا ہوگی، جو بہت برا ٹھکانا ہوگا ان کا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظالم ہیں، ظالم کا حق یہی ہے کہ ان کو سخت عذاب دیا جائے۔ (ماخوذ از مظہری ج ۳ ص ۱۵۴)



## ﴿مَأْوٰی﴾ اور ﴿مَثْوٰی﴾ میں فرق:

(مَأْوٰی) لیا ہے اوی یا وی اویا واداء (ض) گھر میں اترنا، اور گھر میں ٹھکانا لیا، کبھی اس کا معنی "کسی پر رحم کرنا، نزم دل ہونا، ترس کھانا" بھی آتا رہتا ہے، لیکن اس وقت مصدر "اویۃ" آتا ہے۔ (مَثْوٰی) لیا ہوا ہے، ٹوی ٹوی ٹوا (ض) ہے، اس کا معنی کسی جگہ ٹھہرنا، آباد ہونا اور کسی آدمی کا مرنا "اٹوی" ٹھہرنا، کسی کی مہمانی کرنا "اٹواہ" کسی کو ٹھہرانا۔ (مَوی ظرف مکان ہے) اب فرق واضح ہو گیا کہ مَأْوٰی میں آباد ہونا، اور مستقل ٹھہرنا لازم نہیں، بلکہ صرف گھر میں اترنا اور گھر میں ٹھکانا لینا مراد ہے، لیکن مَوی میں ٹھکانا لینا لازم ہے، یہی وجہ ہے کہ (مَأْوٰی) کو پہلے ذکر کیا، وہ عام ہے اور (مَثْوٰی) کو بعد میں ذکر کیا وہ خاص ہے۔



وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَزَّعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَغَصِبْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرْكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ

(آیہ نمبر ۱۵۲)

(۱) اور بیشک اللہ نے تمہیں سچ کر دکھایا اپنا وعدہ جبکہ تم اس کے حکم سے کافروں کو قتل کرتے تھے یہاں تک کہ جب تم نے بزدلی کی اور حکم میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ تمہیں دکھا چکا تمہاری خوشی کی بات تم میں کوئی دنیا چاہتا تھا اور تم میں کوئی آخرت چاہتا تھا پھر تمہارا منہ ان سے پھیر دیا کہ تمہیں آزمائے اور بے شک اس نے تمہیں معاف کر دیا اور اللہ مسلمانوں پر فضل کرتا ہے۔

(۲) اور تحقیق سچ کر دکھایا تمہیں اللہ نے اپنا وعدہ جب تم قتل کر رہے تھے ان کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ تمہاری رائے ضعیف ہو گئی اور تم نے جھگڑا کیا امر میں، اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اس نے دکھایا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے، تم میں بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے اور تم میں سے



بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے، پھر اس نے پھیر دیا تمہیں ان سے تاکہ تمہیں آزمائے اور تحقیق معاف کر دیا اس نے تمہیں اور اللہ فضل فرمانے والا ہے مومنوں پر۔ (نجوم الفرقان)

### مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہ وعدہ ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۳۹)  
”اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تمہیں غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔“ (کنز الایمان)

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ غزوہ احد میں بھی سچا کر دیا کہ مومنین کافروں کو رب تعالیٰ کے حکم اور اس کے فضل سے قتل کر رہے تھے، جسے وہ پسند کرتے تھے یعنی فتح کو وہ ابتدائی طور پر مکمل کامیابی حاصل کر لی یہاں تک کہ مال غنیمت جمع کرنے لگے، لیکن صحابہ کرام سے اجتہادی خطا ہو گئی کہ نبی کریم ﷺ سے کئے ہوئے وعدہ میں اور آپ کے اس حکم میں کہ تم نے اس درہ کو نہیں چھوڑنا خواہ ہمیں فتح حاصل ہو یا نہ ہو، اس میں صحابہ کرام اختلاف کرنے لگے کچھ نے کہا اب فتح ہو چکی ہے مال غنیمت جمع کیا جا رہا ہے اس لئے ہمیں بھی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جانا چاہئے۔ وہ مال غنیمت جمع کرنے کیلئے درہ چھوڑ آئے، لیکن کچھ حضرات نے کہا ہم درہ نہیں چھوڑیں گے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں درہ نہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس اختلاف پر اور درہ کے خالی ہونے پر کفار کو اچانک حملہ کرنے کا موقع مل گیا، جس سے صحابہ کرام ادھر ادھر بکھر گئے گویا کہ ان سے ضعف رائے واقع ہوئی۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ درہ میں کھڑے ہوئے تیر اندازوں نے دنیا کا مال حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا، کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے کی غرض سے درہ کو چھوڑ آئے، اگرچہ حضرت عبداللہ بن جبیر اور ان کے دس ساتھی (رضی اللہ عنہم) آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتے ہوئے اپنی جگہ جمے رہے اور شہید ہو گئے، لیکن انتالیس حضرات کے درہ چھوڑنے کی وجہ معاملہ الٹ ہو گیا۔ رب تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں کفار سے پھیر دیا کہ پہلے تم ان پر غالب آ رہے تھے لیکن اب وہ تم پر چھا رہے تھے جس کی وجہ سے رب تعالیٰ نے تمہیں ان سے پھیر دیا یعنی تم ادھر ادھر بکھر گئے، یہ درحقیقت تمہاری آزمائش تھی کہ اس حال میں ایمان پر کون قائم رہتا ہے اور کون نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد تمہیں معاف کر دیا کہ تم ایمان پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ ایمان والوں پر فضل فرمانے والا ہے۔



اس آیت کا ماقبل سے تعلق اور شان نزول:

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں۔

(۱) جب نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام غزوہ احد سے مدینہ طیبہ کی طرف لوٹے حال یہ تھا کہ ستر صحابہ کرام شہید ہو چکے تھے اور کثیر تعداد میں شدید زخمی تھے، اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے راستہ میں ”قال ناس من اصحابه من این اصابنا هذا وقد وعدنا الله النصر فانزل الله هذه الآية“ بعض صحابہ کرام نے یہ کہا کہ ہمیں یہ مصیبت کہاں سے پہنچ گئی حالانکہ رب تعالیٰ نے ہمارے ساتھ امداد کا وعدہ فرمایا تھا، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی امداد کا وعدہ سچا کر دیا تھا، تمہیں کامیابی عطا کر دی تھی لیکن تم اپنی غلطی کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔

(۲) بعض حضرات نے اور وجہ یہ بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ ایک دنبہ ذبح کیا جا رہا ہے، ”فصدق الله رؤياه بقتل طلحة بن عثمان صاحب لواء المشركين يوم احد وقتل بعده تسعة نفر على اللواء“ تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے اس خواب کو سچا کر دیا کہ مشرکوں کا علمبردار طلحہ بن عثمان احد کے دن قتل ہو گیا، اور اس کے بعد مشرکوں کے نو شخص قتل ہو گئے جو ان کے علمبردار تھے، نبی کریم ﷺ کے اس خواب کے سچا ہونے کے متعلق نازل فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ تحقیق سچ کر دیا اللہ نے جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا۔

(۳) جائز ہے کہ اس وعدہ سے مراد، اللہ تعالیٰ کا قول ہو ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ﴾ البتہ ضرور بر ضرور اللہ تعالیٰ اس کی امداد کرے گا جو اس کے دین کی امداد کرے گا۔ رب قدوس نے اپنے وعدہ کو مشروط کر دیا کہ جو اس کے دین یا اس کے رسول ﷺ کی امداد کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی امداد کرے گا، رب تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو سچا کر دیا کہ جب تک تم رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق درہ میں کھڑے رہے تم ہی کافروں کو قتل کرتے رہے، لیکن جب آپ کے حکم خلاف تم درہ سے ہٹ گئے تو تم پسپا ہو گئے۔

(۴) اور اس سے مراد وہ وعدہ ہے جو ساتھ ہی پہلی آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ عنقریب ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب ”اب اس آیت کریمہ کو نازل کر کے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا کہ کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ بھاگ کر چلے گئے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۲ ص ۳۲)



”صدق“ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”صدقته الوعد والوعید“ میں نے فلاں سے کئے ہوئے وعدہ یا وعید کو سچا کر دیا۔ آیت کریمہ میں ایک مفعول ”کم“ ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول ”وعدہ“ ہے۔ اصل میں ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ کا یہ ہے کہ تحقیق سچا کر دیا تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ اور پیر محمد کرم شاہ بھیروی الازہری رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ”سچ کر دکھایا“ واقم نے بھی یہی نقل کیا، یہ صرف اردو محاورہ ہے ورنہ دکھایا کسی لفظ کا معنی نہیں۔ ﴿إِذْ تَحْسُونَهُمْ بِإِذْنِهِ﴾ جب تم قتل کر رہے تھے ان کو اس (رب تعالیٰ) کے حکم سے ”حسہ“ (ن) حسا (بالفتح) قتل کرنا، جڑ سے اکھیڑ دینا۔ آیت کریمہ میں یعنی معنی لیا گیا ہے، اس کے اور بھی کئی معانی ہیں ”حس البرد الزرع“ سردی کا کھیتی کو مار دینا، جلا دینا ”حس“ (ض) حسا (بالفتح) الشی، معلوم کرنا۔ حس (س ض) حسا (بالفتح و بالکسر) بالخمر یقین کرنا، معلوم کرنا۔ (المنجد بالاختصار) ﴿بِإِذْنِهِ﴾ ای بعلمہ اللہ کے علم سے۔ (ای بتیسیرہ وتوفیقہ اللہ کے آسان کرنے سے اور اس کی توفیق سے۔

(روح المعالی)

﴿إِذْ تَحْسُونَهُمْ بِإِذْنِهِ﴾ ای تقتلونہم ذریعاً بقضاء اللہ جب تم ان کو قتل کر رہے تھے اللہ کے حکم سے۔

(معالم التنزیل للبغوی)

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بغوی رحمہ اللہ کے مطابق ہے، واقم نے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔ مختصر مطلب جو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مسئلہ کافی حد تک سمجھ آچکا ہے، تاہم کچھ وضاحت کی جا رہی ہے۔

و صدق الوعد هو انهم هزموا المشركين اولا وكان المشركون في ثلاثة آلاف ومعهم مائتا فرس والمسلمون في سبع مائة رجل

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے امداد کا کیا ہوا وعدہ سچا کر دیا کہ شروع میں مشرکوں کو مسلمانوں نے شکست دی حالانکہ مشرکین کی تعداد تین ہزار تھی، ان کے پاس دو سو گھوڑے تھے، لیکن مؤمنین کی تعداد سات سو تھی، کیونکہ تین سو کی تعداد میں منافقین بھاگ آئے تھے۔

”ومعنى لحسونهم“ تقتلونهم وكانوا قتلوا من المشركين اثنين وعشرين رجلا“ ﴿إِذْ تَحْسُونَهُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب تم قتل کر رہے تھے، ابتدائی طور پر صحابہ کرام نے بائیس مشرکین کو قتل کر دیا تھا۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۵)

﴿حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ﴾ ”یہاں تک کہ تمہاری رائے جب ضعیف ہو گئی۔“

﴿حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ﴾ ای جبنتم وضعفتم وقيل معناه ضعف رأيكم وملتم الى الغنيمة



فان الحرص من ضعف العقل

ایک معنی ﴿وَخَتَّىٰ إِذَا فُتِنْتُمْ﴾ کا وہی علامہ قاضی مظہری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے جو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے کنز الایمان سے نقل کیا جا چکا ہے یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے، ضعیف ہو گئے۔ لیکن دوسرا معنی جو بیان کیا گیا راقم کو اس سے زیادہ اتفاق ہو رہا ہے، شان صحابہ کے مطابق بہت خوب ہے، وہ یہ ہے ”یہاں تک کہ تمہاری رائے ضعیف ہو گئی اور تم غنیمت کی طرف مائل ہو گئے، بیشک عقل کے ضعف کی وجہ سے ہی حرص و لالچ آتی ہے۔“ (مظہری ج ۲ ص ۱۵۲)

”اور جھگڑا کیا تم نے حکم میں۔“

﴿وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ﴾

(فی الأمر) ای امر النبی ﷺ بالمقام فی سفح الجبل للرمی فقال بعضهم نذهب فقد نصر اصحابنا، وبعضكم لانخالف امر النبی

اور تم نے جھگڑا کیا امر میں“ اس امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا پچاس تیر اندازوں کو پہاڑ کے درہ میں کھڑا کر کے یہ ارشاد فرمانا تم نے یہاں سے ہٹنا نہیں، نبی کریم ﷺ کے اس امر میں انہوں نے اختلاف کیا جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو بعض حضرات نے کہا کہ ہمارے اصحاب کو فتح حاصل ہو چکی ہے، اب ہمیں ان کے ساتھ مل کر مال غنیمت جمع کرنا چاہئے، اور بعض حضرات نے کہا کہ ہم تو نبی کریم ﷺ کے امر کی مخالفت نہیں کر سکتے، ہم تو یہاں ہی کھڑے رہیں گے۔

”اور تم نے نافرمانی کی۔“

﴿وَعَصَيْتُمْ﴾

”وَعَصَيْتُمْ“ امرہ ﷺ فترکتہم المکرز لطلب الغنیمۃ“ اور تم نے نبی کریم ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی کہ مرکز کو چھوڑ دیا، مال غنیمت حاصل کرنے لگے۔ یہاں مرکز سے مراد پہاڑ کا درہ جس پر نبی کریم ﷺ نے تیر انداز لوگوں کو کھڑا کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے اپنے لشکر کو پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا، ایک کو آگے کھڑا کیا، اور ایک کو پیچھے، اور ایک کو بائیں، اور ایک کو درمیان میں، یہی جو درمیان میں تھے ان کو ہی پہاڑ کے درہ میں کھڑا کیا تھا اور ان کو وہاں سے نہ ہٹنے کا حکم دیا تھا۔

﴿مِنْ بَعْدِ مَا رَأَيْتُمْ مَا يُحِبُّونَ﴾ ”اس کے بعد کہ اس نے دکھایا تمہیں وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔“

یعنی تمہیں پسند تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری امداد کرے اور تمہیں کامیابی عطاء کرے، ابتدائی طور پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کامیابی عطاء کر دی اور تمہاری امداد فرمادی، لیکن تم نے نبی کریم ﷺ کے امر میں اختلاف کر کے اور اس کی نافرمانی کر کے اپنے آپ میں ضعف رائے قائم کر دیا جس کی وجہ سے معاملہ الٹ ہو گیا۔ (ماخوذ از جلالین و صاوی ج ۱ ص ۱۶۳)



واقعہ احد کی ابتداء میں احادیث سیانہ کی جلا چکی ہیں، تاہم اس مقام میں دوبارہ درمنثور اور ابن کثیر میں بخاری اور مسند امام احمد سے کچھ روایات بیان کی گئی ہیں، انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہاں بخاری کی ایک روایات کو دوبارہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

عن البراء قال لقينا المشركين يومئذ واجلس النبي ﷺ جيشا من الرماة وامر عليهم (عبد الله بن جبیر) وقال لا تبرحوا ان رأيتمونا ظهرنا عليهم فلا تبرحوا، وان رأيتموهم ظهروا علينا فلا تعينونا، فلما لقيناهم هربوا حتى رأيت النساء يشتدن في الجبل رفعن عن سوقهن قد بدت خلاخلهن فاخذوا يقولون الغنيمة الغنيمة فقال عبد الله بن جبیر عهد الى النبي ﷺ ان لا تبرحوا فأبوا فلما أبوا صرف وجوههم فاصيب سبعون قتيلافأشرف ابوسفیان فقال أفي القوم محمد فقال لا تجيبوه، فقال أفي القوم ابن ابي قحافة قال لا تجيبوه فقال أفي القوم ابن الخطاب، فقال ان هؤلاء قتلوا فلو كانوا احياء لأجابوا، فلم يملك عمر نفسه فقال له كذبت يا عدو الله ابقى الله لك ما يحزنك، قال ابوسفیان اعلى هبل، فقال النبي ﷺ أجيبوه، قالوا ما نقول؟ قال قولوا "الله اعلى وأجل" قال ابوسفیان لنا العزى ولا عزى لكم، فقال النبي ﷺ أجيبوه، قالوا ما نقول؟ قال قولوا الله مولنا ولا مولى لكم، قال ابوسفیان يوم بيوم بدر والحرب مسجال، وستجدون مثله لم آمر بها ولم تستثنوني" (بخاری غزوه احد)

حضرت براءؓ فرماتے ہیں ہمارا مشرکوں سے آمنا سامنا ہوا اس دن (یعنی غزوہ احد کے دن) اور نبی کریم ﷺ نے تیر اندازوں کو ایک جگہ پر بٹھادیا (یعنی پہاڑ کے درہ میں ان کو قائم کر دیا) اور ان پر ایک شخص (عبد اللہ بن جبیر) کو امیر مقرر دیا، اور ان کو ارشاد فرمایا یہاں سے ہٹنا نہیں۔ اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آرہے ہیں تو یہاں سے نہ ہٹنا۔ اگر تم انہیں ہم پر غالب ہوتے ہوئے دیکھو تو ہماری امداد نہ کرنا۔ (راوی کہتے ہیں) جب ہم ان سے ملے تو وہ (کفار) بھاگ گئے، یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے چڑھا کر ان کو پہاڑ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا، ان کی پازیبین نظر آرہی تھیں، (اب انہوں نے درے پر کھڑے صحابہ کرام نے) کہنا شروع کیا غنیمت، غنیمت (یعنی مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جاؤ) تو حضرت عبد اللہ بن جبیر نے کہا مجھ سے نبی کریم ﷺ نے وعدہ لیا ہوا ہے تم یہاں سے نہ ہٹنا، تو ان حضرات نے انکار کر دیا، جب انہوں نے (وہاں قائم رہنے سے) انکار کر دیا، تو ان کو اللہ نے ان کافروں سے پھیر دیا، یعنی وہ ادھر ادھر بکھر گئے، اور ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، ابوسفیان نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا اور کہنے لگا کیا اس قوم میں محمد ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا اس قوم میں



ابن ابی قحافہ (ابو بکر) ہیں، تو آپ نے فرمایا اسے کوئی جواب نہ دو، پھر کہنے لگا کیا اس قوم میں عمر ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگا بیشک یہ سب لوگ قتل ہو گئے، اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے، تو حضرت عمرؓ اس کی بات سن کر صبر نہ رکھ سکے، آپ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن ان سب کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا ہوا ہے جو تجھے غم میں ڈالتے رہیں گے، ابوسفیان نے کہا اے ہبل بلند ہے (ہبل ان کے بت کا نام تھا، یعنی ہبل کو بلندی حاصل رہے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اب اسے جواب دو، صحابہ کرام نے پوچھا اسے کیا جواب دیں، تو آپ نے فرمایا تم اسے یہ کہو ”اللہ اعلیٰ واجل“ اللہ ہی بلند اور بزرگ ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا ہمارا (معبود) عزیزی ہے، تمہارا کوئی عزیزی نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم اسے جواب دو، صحابہ کرام نے پوچھا ہم اسے کیا جواب دیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ کہو ”اللہ مولنا ولا مولیٰ لکم“ اللہ ہمارا مولیٰ ہے، تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، لڑائی باری باری ہے، تم (اپنے مقتولوں میں) مثلہ پاؤ گے (حضرت حمزہؓ اس نے مراد لیا) میں نے یہ حکم نہیں دیا اور تم مجھے برا نہ کہنا، اس حدیث پاک میں غزوہ احد کا مکمل نقشہ پیش کر دیا گیا، اور زیر بحث آیت کریمہ کا مکمل مفہوم بھی سمجھ آ گیا۔

﴿مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾

”تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے، اور بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے۔“

﴿مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا﴾ یعنی الغنیمۃ قال ابن مسعود ما شعرنا ان احدا من اصحاب

النبی ﷺ يريد الدنيا وعرضها حتى كان يوم احد“

”تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ رکھتے تھے“ یعنی مال غنیمت کا ارادہ رکھتے تھے، حضرت عبداللہ

بن مسعودؓ فرماتے ہیں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے بھی دنیا کے مال کا ارادہ کیا

ہو، یہاں تک کہ غزوہ احد کے بعد اس آیت کریمہ کے نزول سے پتہ چلا۔

﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾ وہم الذین ثبتوا فی مرکزہم ولم یخالفوا امر نبیہم“ اور تم

میں سے بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے، یہ وہ لوگ ہیں جو مرکز میں ثابت قدم رہے، یعنی جہاں پہاڑ کے درہ

میں نبی کریم ﷺ نے کو ان کھڑا کیا تھا وہیں قائم رہے، اور نبی کریم ﷺ کے حکم کی انہوں نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ یہ

عبداللہ بن جبیر اور ان کے ساتھی تھے، خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل جو اس وقت کافر تھے انہوں نے درہ میں

(قرطبی ج ۴ ص ۲۳۷)

ثابت قدم رہنے والوں پر حملہ کر کے ان کو شہید کر دیا۔

فائدہ جلیلہ: والعتاب مع من انہزم لامع من ثبت، فان من ثبت فاز بالشواب، وهذا کما انہ



اذا حل بقوم عقوبة عامة فاهل الصلاح والصبيان يهلكون ولكن لا يكون ما حل بهم عقوبة بل هو سبب المثوبة “ (ر(له اعلم“  
(قرطبی ۲ ص ۲۷۷)

اس آیت کریمہ میں ان حضرات کو عتاب کیا گیا (یعنی ان کی سرزنش کی گئی) جو مرکز سے ہٹ گئے تھے اور پسپا ہو گئے تھے۔ ان کو عتاب نہیں کیا گیا جو ثابت قدم رہے تھے، ثابت قدم رہنے والے اگرچہ شہید ہو گئے تھے لیکن انہوں نے منصب شہادت جیسا عظیم مرتبہ اور ثواب عظیم حاصل کیا، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کسی قوم پر عذاب آئے تو بدکاروں کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے باغیوں کیلئے، حدود سے تجاوز کرنے والوں کیلئے تو وہ عذاب ہے، لیکن جو نیک لوگ اور بچے اس کی گرفت میں آتے ہیں تو ان کیلئے وہ ذریعہ ثواب ہوتا ہے۔

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ ”پھر اس نے پھیر دیا تمہیں ان سے۔“

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ ایہا المسلمون صرفکم اللہ بشنوم عصیانکم عن الکفار بالهزيمة حتى حالت الحالة فغلبوكم (لیبتلیکم) ای لیمتحنکم حتی یشہر المؤمنین من المنافقین او المعنی لنزل البلاء علیکم بما صنعتم“

”پھر اس نے تمہیں ان سے پھیرا“ یعنی اے مسلمانو اللہ تعالیٰ نے تمہیں کفار سے پھیرا یعنی پسپا کر دیا، وجہ اس کی یہ تھی کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے حکم کو بجا نہیں لایا، یہاں تک جنگ کی حالت بدل گئی، پہلے تم فتح حاصل کر رہے تھے اب کفار کو بظاہر غلبہ حاصل ہو گیا۔ رب تعالیٰ نے تمہیں کفار سے جو پسپا کیا اس میں تمہاری آزمائش تھی کہ مؤمنین منافقین سے ممتاز ہو جائیں۔ یا دوسری وجہ ”لِیَبْتَلِیْکُمْ“ (میں یہ ہے کہ وہ تمہیں مصیبت میں مبتلا کرے بوجہ اس کے جو تم نے کیا) یعنی تمہیں کفار سے پھیر کر اور ان کو ظاہری طور پر غلبہ دے کر رب تعالیٰ نے تمہیں مصیبت میں مبتلا کر دیا۔  
(مظہری ج ۳ ص ۱۵۵)

(لِیَبْتَلِیْکُمْ) ”ای لیمتحن صبرکم علی المصائب وثباتکم علی الایمان عندهما“  
”تا کہ تمہیں آزمائے“ یعنی تمہارا امتحان لے کہ تم مصیبتوں کے پہنچنے پر کتنا صبر کرتے ہو، اور کتنا ایمان پر ثابت رہتے ہو۔  
(البحر المحیط ج ۳ ص ۱۱۷)

**اعتراض:** امتحان تو وہ لیتا ہے جسے پتہ نہ ہو کہ یہ کسی درجہ کا ہے، رب تعالیٰ علیم وخبیر ہے اس کے امتحان لینے کا کیا مطلب۔

**جواب:** (لِیَبْتَلِیْکُمْ) ای یعاملکم معاملة من یمتحنکم لیظهر لباتکم علی الایمان عندهما“

(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۰)



امتحان لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو اس شخص سے معاملہ کیا جاتا ہے جس کا امتحان لیا جاتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ تمہیں لوگوں کے سامنے نکھارنا مقصود ہے، کہ بعض تو ثابت قدم رہے لیکن پسپا ہونے والے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے رب تعالیٰ کے غفور کرم کے مستحق ہو گئے،

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

یہاں چند بخششیں وہ ہیں جن کا تعلق اصطلاحات سے جن کو طلباء کرام تو جانتے ہیں لیکن عوام نہیں جانتے، ان میں سے ایک بحث یہ ہے ﴿حَتَّىٰ إِذَا فُشِلْتُمْ﴾ شرط ہے، جہاں شرط ہو وہاں جزاء کا پایا جانا ضروری ہے، اس شرط کی جزاء کیا ہے؟ تو اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ شرط نہیں بلکہ ”حتی“ ”الی“ کی طرح غایت کیلئے استعمال ہو رہا ہے، اب مطلب یہ ہو گیا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ حَتَّىٰ إِذَا فُشِلْتُمْ﴾ تحقیق تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تمہاری رائے میں ضعف آ گیا، یہ نصرت کی انتہاء بیان کی گئی۔

اگر اسے شرط تسلیم کیا جائے تو اس صورت میں بھریوں نے یہ جواب دیا ہے کہ اس کی جزاء محذوف ہے، وہ یہ ہے ”منعکم اللہ نصرہ“ کہ جب تم بزدل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنی امداد کو روک لیا۔ کوئی حضرات نے جواب دیا ”وَعَصَيْتُمْ“ میں واؤ زائد ہے جیسا کہ ”وَتَلَّهَ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ“ میں ”وَنَادَيْنَاهُ“ میں واؤ زائد ہے۔ اب تقدیر عبارت کی یہ ہو گئی ﴿حَتَّىٰ إِذَا فُشِلْتُمْ وَتَنَارَ غُتْمُ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ﴾ یہاں تک کہ جب تمہاری رائے ضعیف ہو گئی اور تم نے جھگڑا کیا امر میں تو تم نافرمان ہو گئے، یعنی ”وَعَصَيْتُمْ“ جزاء ہے۔

**اعتراض:** یہ توجیہ کیسے درست ہے جبکہ ضعف اور جھگڑا معصیت ہے، اور جزاء بھی معصیت ہو جائے تو ایک ہی چیز شرط اور وہی جزاء ہوگی ”لِزْمِ كَوْنِ الشَّيْءِ عِلَّةً وَذَلِكَ فَاسِدٌ“ اس صورت میں ایک چیز اپنے آپ کی علت بن جائے گی، یہ فاسد ہے، درست نہیں۔

**جواب:** ضعف اور جھگڑا سبب بنے ہیں اس جگہ سے ہٹنے کا جہاں نبی کریم ﷺ نے کھڑا کیا تھا۔ جب اس جگہ سے وہ ہٹ گئے تو اس پر عصیان مرتب ہوا، لہذا شرط اور ہے، جزاء اور ہے۔ ”فَلِمَ يَلْزَمُ تَعْلِيلُ الشَّيْءِ بِنَفْسِهِ“ کوئی چیز اپنی ذات کیلئے علت نہیں بنی۔ یہ بھی خیال رہے کہ بھریوں کے نزدیک واؤ زائد نہیں۔ لہذا ان پر نہ کوئی اعتراض اور نہ اس کا جواب۔

(ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۳۶)

**تنبیہ:** قِيلَ الْفُشْلُ هُوَ الضَّعْفُ وَقِيلَ الْفُشْلُ هُوَ الْجَبْنُ وَهَذَا بَاطِلٌ بِدَلِيلِ قَوْلِهِ



تعالیٰ ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا﴾ ای فتضعفوا لانہ لایلیق بہ ان یکون المعنی فتجنبوا“ بعض حضرات نے ”فشل“ کا معنی ضعف رائے بیان کیا، اور بعض نے اس کا معنی بزدلی مراد لیا، لیکن یہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا﴾ کا مطلب یہی ہے کہ جھگڑانہ کرو، ورنہ ضعیف رائے والے ہو جاؤ گے، ”بزدل ہو جاؤ گے“ معنی لینا مناسب نہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۳۶)

**مقام توجہ:** ﴿مِنْ بَعْدِ مَا أَرْكُم مَّا تَحِبُّونَ﴾ زیادہ متنبہ کیا گیا، یا زیادہ عتاب پایا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ”انہم لما شاهدوا ان الله تعالى اكرمهم بانجاز الوعد كان من حقهم ان يمتنعوا عن المعصية فلما اقدموا عليها لاجرم سلبهم الله ذلك الاكرام واذاقهم وبال امرهم“ جب انہوں نے یہ مشاہدہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد کر کے ان کو مکرم بنادیا تو ان کا حق یہ تھا کہ وہ امر کی مخالفت نہ کرتے، لیکن جب ان سے مخالفت سرزد ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے والا اکرام واپس لے لیا۔

### امر میں اختلاف کا کیا مطلب:

ایک وجہ تو پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا امر ہے یہ امر ضد ہے نہی کی۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے جہاں کھڑے رہنے کا حکم دیا وہاں کھڑے رہنے میں صحابہ کرام کا اختلاف ہو گیا، اس طرح نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی۔ اور مطلب اس کا یہ بیان کیا گیا ہے ”ان الامرھنا بمعنی الشان والقصة ای تنازعتم فیما کنتم فیہ من الشان“ کہ بیشک امر یہاں شان اور قصہ کے معنی میں ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ تم جس حال میں تھے اس میں تم نے اختلاف کیا کہ یہاں کھڑے رہیں یا نہ رہیں۔ یہ معنی بھی عجیب بھلا معلوم ہوتا ہے کہ براہ راست نبی کریم ﷺ کے امر کی طرف مخالفت کی نسبت نہیں کی گئی بلکہ ان کے اپنے حال کی طرف مخالفت کی نسبت کی گئی جو ضمنی طور پر نبی کریم ﷺ کے امر کی طرف منسوب ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾

”اور تحقیق معاف کر دیا اس نے تمہیں اور اللہ فضل فرمانے والا مومنوں پر۔“

**سبحان اللہ!** صحابہ کرام کے درہ کو چھوڑنے کی وجہ سے اور پسپا ہونے کی وجہ سے جو کیفیت انہیں لاحق ہوئی جسے عصیان سے تعبیر کیا گیا رب تعالیٰ نے اس معاف فرمادیا، اس معاف فرمانے کا تذکرہ بہت تاکید سے



فرمایا۔ ایک لام سے تاکید کی گئی کہ وہ مؤطاً للقسم ہے۔ کیونکہ ماضی پر قد داخل ہو اور اس پر لام تاکید آئے تو وہاں پتہ چلتا ہے کہ یہاں قسم پائی گئی، پھر ”قد“ بھی تحقیق کا معنی دے رہا ہے۔ گرائمر کے اس ضابطہ کے مطابق مکمل معنی یوں ہو گیا۔ اور قسم ہے اللہ کی تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام ایمان والوں پر اپنا فضل فرماتا ہے، جب اس کی مہربانیاں اور رحمتیں تمام ایمان والوں پر ہیں تو صحابہ کرام پر تو یقیناً اور زیادہ رحمت پائی گئی ہے۔ اگر غزوہ احد میں صحابہ کرام کے درہ کو چھوڑنے اور پسپا ہونے کو کوئی شخص آڑ بنا کر صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کرے تو وہ بد قسمت ہے کہ رب تعالیٰ جب معافی کرنے کا اعلان کر رہا ہے تو وہ صحابہ کرام پر تبرا بازی کر رہا ہے، آئیے ایسے شخص کا منہ بند کرنے کیلئے، ایک حدیث پاک کو دیکھئے۔

حدثنا عبدان اخبرنا ابو حمزة عن عثمان بن موهب قال جاء رجل حج البيت فرأى قوما جلوسا فقال من هؤلاء القعود قالوا هؤلاء قریش قال من الشيخ قالوا ابن عمر فأتاه فقال انی سائلک عن شیء الحدیثی قال انشدک بحرمة هذا البيت العلم ان عثمان بن عفان فریوم احد قال نعم قال فتعلمه تغیب عن بدر فلم يشهدھا قال نعم قال فتعلم انه تخلف عن بیعة الرضوان فلم يشهدھا قال نعم قال فکبر، قال ابن عمر تعال لاخبرک ولأبین لک عما سألتنی عنه اما فراره یوم احد فاشهد ان الله عفا عنه واما تغيبه عن بدر فانه کان تحته بنت رسول الله ﷺ و كانت مریضة فقال له النبی ﷺ ان لک اجر رجل ممن شهد بدرا وسهمه واما تغيبه عن بیعة الرضوان فانه لو کان احد اعز بطن مکه من عثمان بن عفان لبعثه مکانه فبعث عثمان و كانت بیعة الرضوان بعد ما ذهب عثمان الی مکه فقال النبی ﷺ بیده الیمنی هذه ید عثمان فضرب بها علی یده فقال هذه لعثمان اذهب بهذا الآن معک“

(بخاری ج ۲ کتاب المغازی باب قول الله تعالیٰ ان الذین تولوا منکم النخ)

عثمان بن موهب فرماتے ہیں ایک شخص بیت اللہ شریف کا حج کرنے کیلئے آیا، اس نے ایک قوم کو بیٹھے ہوئے دیکھا، تو اس نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں جو بیٹھے ہوئے ہیں؟ تو اسے بتایا گیا یہ قریش ہیں، اس نے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں؟ تو اسے بتایا گیا یہ ابن عمرؓ ہیں، تو وہ ان کے پاس آیا، تو کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ مجھے ان کا جواب دو گے، اس بیت اللہ شریف کی حرمت کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ بیشک عثمان بن عفان احد کے دن پسپا ہو گئے تھے؟ تو آپ نے فرمایا، ہاں۔ پھر اس نے پوچھا کیا تم جانتے ہو وہ بدر سے غائب تھے، وہاں حاضر نہیں ہوئے تھے، آپ نے فرمایا، ہاں۔ پھر اس نے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہے



اس امر میں حاضر نہیں تھے آپ نے فرمایا ہاں تو اس نے (خوشی سے) اللہ اکبر کہا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا آؤ میں تمہیں خبر دوں اور تمہیں ان سوالوں کو وضاحت سے بیان کروں جو تم نے مجھ سے سوال کئے، غزوہ احد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پسپا ہونا، میدان چھوڑ کر ہٹ جانا، اس کے متعلق میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، (اس لئے کہ) رب تعالیٰ نے اعلان فرمایا ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا ہے) لیکن بدر میں حاضر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی زوجیت میں نبی کریم رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھی جو شدید مریض تھیں (تو نبی کریم رضی اللہ عنہ نے خود ہی ان کو مدینہ طیبہ میں چھوڑا) نبی کریم رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہیں اجر و ثواب بدر میں شریک ہونے والے کا حاصل ہے اور تمہارا حصہ بھی بدر والے کا ہے۔ بیعت رضوان میں غائب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اگر کوئی اور شخص ان سے مکہ والوں کو زیادہ عزیز ہوتا تو نبی کریم رضی اللہ عنہ اس کو بھیجتے، آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ میں لوگوں سے بات چیت کیلئے بھیج دیا۔ بیعت رضوان آپ کے مکہ میں جانے کے بعد ہوئی، نبی کریم رضی اللہ عنہ نے اپنے دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور فرمایا یہ عثمان کی بیعت ہے۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو فرمایا یہ میری باتیں ساتھ لے جا۔

یہ حدیث بخاری نے مناقب عثمان میں بھی ذکر کی ہے، وہاں شیخ علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”والذی ینظر انہ کان متعصبا علی عثمان ص فلذلک قال اللہ اکبر مستحسنا“  
وہ سوال کرنے والا شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تعصب رکھتا تھا، اسی وجہ سے جب تک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس کے سوالوں کے جوابوں میں ہاں کہتے رہے۔ ہاں اسی طرح ہوا، تو وہ خوش ہو رہا تھا، اسی خوشی پر اس نے اللہ اکبر کہا۔

اسی سے راقم کو یہ بھی سمجھ آیا کہ کسی سے تعصب کے وقت، کسی ناجائز کام پر خوش ہو کر اللہ اکبر کہنا منافقین اور رافضیوں کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس متعصب کے نظریات فاسدہ کو دیکھ کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ہر سوال کا جواب مستحسن طریقہ سے واضح کر دیا کہ اس کی حقیقت اور وجہ کیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جو زوجہ بیمار تھی جن کی وجہ سے نبی کریم رضی اللہ عنہ ان کو بدر میں ساتھ نہ لیا بلکہ مدینہ طیبہ میں ہی ان کو چھوڑا وہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں جو رسول اللہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔

”اذہب بہا الآن معک“ کے دو مطلب ہیں ایک یہ ”افرن هذا العذر بالجواب حتی لا یبقی لک فیما اجبتک بہ حجة علی ما کنت تعتقدہ من غیبة عثمان رضی اللہ عنہ“ میں نے تمہیں مختصر جواب صرف ”نعم“ (ہاں) سے دیتے تھے ان کے ساتھ یہ وضاحتیں اور وجوہ بھی ساتھ ملاؤ، اب تم جو اپنا باطل عقیدہ رکھتے تھے وہ ان



جوابات کی وجہ کے بعد رد ہو جائے گا، تمہارے پاس کوئی حجت نہیں رہے گی۔

جواب کی دوسری وجہ "قال الطیبی قالہ ابن عمر لہکما بہ ای توجہ بما تمسکت بہ فانہ لا ینفعک بعد ما بینت لک" علامہ طیبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس شخص سے بات بطور جہلم کی، مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گویا کہ یہ کہا کہ بیشک تو نے جو سوال اپنے تعصب پر دلیل بتانے کیلئے کئے میری وضاحت کے بعد تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ (یعنی ج ۱۶ ص ۲۰۷)

غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت رہنے والے حضرات:

بلادری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مہاجرین میں سے ثابت رہنے والے حضرات یہ تھے، ابوبکر، عمر، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام اور ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم اور انصار میں سے یہ تھے جناب بن منذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت بن ابی اللاح، حارث بن الصمۃ، اسید بن حضیر، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور بعض حضرات نے کہا کہ سہل بن حنیف بھی ثابت رہنے والے انصار میں تھے۔ (یعنی ج ۱۶ ص ۲۰۷)

**فائدہ جلیلہ:** اللہ تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ "اور اللہ فضل فرمانے والا ہے ایمان والوں پر۔"

"ان ذلک العفو بطریق التفضل والاحسان لا بطریق الوجوب علیہ ای شانہ ان یتفضل علیہم بالعفو"

اللہ تعالیٰ نے جو پسپا ہونے والے صحابہ کرام کو معاف کیا یہ اس کا فضل و کرم اور اس کا احسان تھا، رب تعالیٰ پر کوئی واجب نہیں تھا، لیکن اس کی شان ہی یہ ہے کہ وہ مومنوں کو توبہ پر معاف فرماتا ہے اور ان پر فضل و کرم فرماتا ہے۔ (تفسیر ابی السعود)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا شاندار استدلال:

❦ واخرج الامام احمد وجماعة عن ابن عباس رضي الله عنهما انه قال ما نصر الله تعالى نبيه في موطن كمانصره يوم احد فانكروا ذلك فقال ابن عباس رضي الله عنهما وبين من أنكر ذلك كتاب الله ان الله تعالى يقول يوم احد "وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعَدَهُ اِذْ تُحْسِنُوْنَهُمْ" اي تقتلونهم "وهو التفسير المألوف واستشهد عليه الخبر بقوله عتبة الليثي "نحسهم (اي نقتلهم) بالبيض حتى كانوا نفلق منهم بالجمام حنظلا"

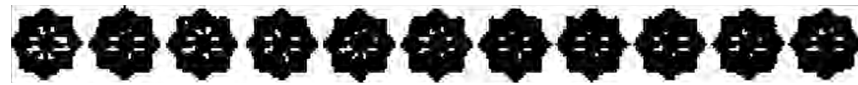


وبقوله ومنا الذی لاقی بسیف محمد فحس (ای قتل) به الاعداء عرض العساكر

امام احمد رحمہ اللہ اور حضرات نے بھی ابن عباس ؓ سے روایت ذکر کر کے آپ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی اتنی امداد کہیں نہیں فرمائی جتنی احد میں فرمائی، آپ کے اس قول پر بعض لوگوں نے انکار کیا، تو حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ میرے اور انکار کرنے والوں کے درمیان کتاب اللہ فیصلہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے احد والوں کے متعلق فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ﴾ تحقیق اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا جب تم ان کو قتل کر رہے تھے ایمان والوں کا مشرکین کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کی امداد کی وجہ سے ہی تھا۔ جب آپ سے نافع بن ازرق نے پوچھا کیا عرب حضرات نے ”حس“ کا معنی قتل لیا ہے۔ آپ نے دو شعر بطور دلیل پیش کئے جن میں ایک جگہ ”نحسہم“ استعمال ہوا ہے، جس کا معنی ہے ”ہم ان کو سفید تلواروں کے ذریعے قتل کر رہے تھے، ان کی کھوپڑیوں کو ہم تھے کی طرح اڑا رہے تھے۔

دوسرے شعر کا معنی:

ہم میں سے وہ جس نے محمد ﷺ کی تلوار سے ملاقات کی، اس نے دشمن کو قتل کیا شکروں میں گھس گیا۔ (ماخوذ از درمنثور ج ۲ ص ۸۹)





اذْصَعِدُوْنَ وَلَا تَلُوْنَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوْكُمْ فِيْ اٰخِرَاتِكُمْ فَاٰتَابَكُمْ  
عَمَّاۤ بِغَمٍ لِّكَيْلًا تَحْزَنُوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا  
تَعْمَلُوْنَ ۝ (آیہ نمبر ۱۵۳)

(۱) جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے اور پیٹھ پھیر کر کسی کو نہ دیکھتے اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمہیں پکار رہے تھے تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا اور معافی اس نے سنائی کہ جو ہاتھ سے کیا اور جو افتاد پڑی اس کا رنج نہ کرو اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) یاد کرو جب تم دور ہو رہے تھے، اور پیچھے توجہ نہیں کر رہے تھے کسی ایک پر، اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں، تو پہنچایا تمہیں غم پر غم تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہوگئی، اور نہ اس پر جو پہنچی ہے تمہیں، اور اللہ خبر رکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو۔ (نجوم الفرقان)

﴿اذْصَعِدُوْنَ وَلَا تَلُوْنَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوْكُمْ فِيْ اٰخِرَاتِكُمْ﴾  
”جب تم دور ہو رہے تھے اور پیچھے توجہ نہیں کر رہے تھے کسی ایک پر اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں“

آیہ کریمہ کا ماقبل سے تعلق ہے یا استیناف پایا گیا:

اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ”انہ ابتداء کلام لا تعلق له بما قبله والتقدير اذکر اذ تصعدون“ اس کا تعلق ماقبل سے نہیں بلکہ جملہ استیناف یہ ہے، اور اذکر مقدر ہے۔ یعنی یاد کرو جب تم دور ہو رہے تھے، (راقم نے یہی ترجمہ کیا ہے) ایک اور اس میں احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ماقبل سے ہے، ماقبل سے تعلق میں پھر تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تحقیق اس (اللہ) نے معاف کر دیا تمہیں جب تم دوری کی طرف جا رہے تھے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”پھر تمہیں پھیرا ان سے تاکہ تمہیں آزمائے جب تم دور ہوئے جا رہے تھے۔“ (کبیر ج ۹ ص ۳۹)



تیسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ”لِيَبْتَلِيَكُمْ“ سے ہو، اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”پھر تمہیں پھیرا ان سے جب تم دور ہوئے جا رہے تھے۔“ (کبیر ج ۹ ص ۳۹)

## مختصر مطلب:

جب کفار نے اچانک حملہ کیا تو صحابہ کرام پریشان ہو گئے، دائیں، بائیں بکھر گئے، کوئی پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور کوئی وادیوں میں جا رہا تھا، اور کوئی کھلی زمین میں دوڑ دوڑ کر جا رہا تھا، ہر شخص اپنی پریشان میں مبتلا تھا کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں کر رہا تھا، پیچھے مڑ کر کوئی نہیں دیکھ رہا تھا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ پیچھے ثابت رہنے والی جماعت میں بکھر جانے والوں کو بلارہے تھے، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو غم کے بدلے غم پہنچایا تا کہ وہ غمگین نہ ہوں جو ان سے نعمتیں فوت ہوئیں ان پر، اور نہ ہی مصیبتوں کے پہنچنے پر غمگین ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمام اعمال پر خبر رکھنے والا ہے، یہی مضمون صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ”اذْثُصْعِدُوْنَ“

عبدالرحمن سلمیٰ اور حسن اور قنادہ رحمہم اللہ کی قراءت میں تاء اور عین کے فتح سے پڑھا گیا، صعود سے ماخوذ ہے۔ ”والصعود ای الارتفاع علی الجبال والسطوح“ اس قراءت کے مطابق پہاڑ پر چڑھنا مراد ہوگا، کیونکہ ”صعود“ کا معنی پہاڑ پر اور چھت پر چڑھنا ہے۔ اور مشہور قرأت میں تاء پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ ”اصعاد“ (باب افعال) سے لیا ہوا ہے، اس کا معنی ہے ”السير فی مستوى الارض“ ہموار زمین میں چلنا ”وقال المبرد اصعد اذا ابعد فی الذهاب“ مبرد نے کہا ہے کہ اصعد کا معنی دور چلے جانا۔

راقم نے یہی معنی ذکر کیا ہے۔ ”وقال المفضل صعد واصعد بمعنى واحد“ مفضل رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے ”صعد اور اصعد“ کا ایک ہی معنی ہے ”قال ابو حاتم يقال اصعدت اذا مضيت حياں وجهک“ ابو حاتم کہتے ہیں، جب کہا جائے ”اصعدت“ تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے، تو منہ اٹھائے چل رہا تھا، یعنی بغیر سوچے سمجھے جدھر منہ آ رہا تھا ادھر ہی چل رہا تھا، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ بعینہ اسی کے مطابق ہے ”جب تم منہ اٹھائے چلے جاتے تھے“ (ماخوذ از معالم التنزیل ج ۱ ص ۳۶۲)

راقم نے مختصر مطلب میں یہ لکھا ہے بعض حضرات پہاڑ پر چڑھ رہے تھے، بعض وادی میں جا رہے تھے، بعض کھلی زمین میں دوڑ کر جا رہے تھے، یہ مطلب درحقیقت تمام قراءتوں کا جامع ہے، اگرچہ ہمارے پاس روایت حفص کے مطابق اصعاد سے ماخوذ ہے، اسلئے راقم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ ﴿وَلَا تَلْوُؤْنَ عَلَىٰ أَحَدٍ﴾ ای



لَا تَلْتَفِتُونَ إِلَى أَحَدٍ مِنْ شِدَّةِ الْهَرَبِ“ تم کسی ایک کی طرف شدید دوڑنے کی وجہ سے توجہ نہیں کر رہے تھے۔  
(کیرج ۹ ص ۴۰)

”لایلوٰی“ وہ گردن پھیر کر کسی کی طرف توجہ نہیں کرتا ”لوٰی“ الیٰ قتل الحبل۔ لویتہ لیا، لوٰی بلوٰی لیا۔ کا معنی ری کا بٹنا، ”لوٰی یدہ و لوٰی راسہ و براسہ امالہ“ جب اس کے ساتھ ید یا راس کا تعلق ہو تو ہاتھ کو مائل، سر کو مائل کرتا، ”لو واد و وسهم“ انہوں نے اپنے سروں کو پھیرا، ”لوٰی لسانہ“ اس نے اپنی زبان کو پھیرا، اس کا معنی یہ بھی آتا ہے، اس نے جھوٹ بولا“ تخمینہ سے بات کی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿يَلُوُّونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ﴾ وہ اپنی زبانوں کو کتاب میں پھیرتے ہیں۔ فلان لایلون علی احد اذا معن فی الہزیمۃ“ فلاں شخص اپنی شکست میں غور و فکر کی وجہ سے کسی اور کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا، ”اللواء الرایۃ“ جھنڈے کو ”لواء“ کہتے ہیں کیونکہ ہوا اسے ادھر ادھر مائل کرتی ہے، ”اللوٰیۃ“ (واؤ کے نیچے کسرہ اور یاء مشدود) طعام کو دوسرے طعام سے ہٹا کر، پھیر کر ذخیرہ بنانا، (مفردات راغب) ﴿وَلَا تَلُوُّونَ عَلَىٰ أَحَدٍ﴾ تم کسی ایک کے طرف گردن پھیر کر مڑ کر نہیں توجہ کر رہے تھے۔

﴿وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ﴾ ”اور رسول بلا رہے تھے تمہیں دوسری جماعت میں۔“

(فی اخراکم) فی مسافتکم و جماعتکم الاخری، والمعنی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

کان یدعوہم و هو واقف فی اخراہم لان القوم بسبب الہزیمۃ قد تقدموہ“

قوم پسپا ہو کر دوڑ کر آگے چل گئی، نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ قائم رہنے والے اپنی جگہ پر قائم رہے،

یہ لوگ ان آگے جانے والوں سے پیچھے رہ گئے، اب مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں پیچھے دوسرے

(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

جماعت میں آواز دے رہے تھے، بلا رہے تھے،

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا یہی ترجمہ ہے، ”اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمہیں پکار رہے تھے“ (کنز الایمان)

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا:

”والرسول یدعوکم فی اخراکم“ ای فی اخراکم ومن ورائکم الی عباد اللہ انا رسول

اللہ من یکرہ للہ الجنۃ“ (معالم التنزیل للبغوی ج ۱ ص ۳۶۲)

﴿فِي أُخْرَاكُمْ﴾ کا معنی ہے ﴿مِنْ وَرَائِكُمْ﴾ تمہارے پیچھے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ”اور رسول کریم بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے (ضیاء القرآن) یعنی آپ



فرما رہے تھے ”میں اللہ کا رسول ہوں جو شخص لوٹے گا اس کیلئے جنت ہے۔ خیال رہے کہ حضرت مفتی احمد بارخان رحمہ اللہ نے بہت خوبصورت انداز میں دونوں تراجم کو یکجا جمع کیا، آپ کا ترجمہ یہ ہے، حالانکہ رسول بلا رہے تھے تم کو تمہاری پچھلی جماعت میں۔“ (نہج ج ۳ ص ۲۵۸)

﴿فَأَتَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ تو پہنچایا تمہیں غم پر غم۔

﴿فَأَتَابَكُمْ﴾ (تو پہنچایا تمہیں) ”اثاب“ ماخوذ ہے لفظ ثواب سے، اس کا غالب استعمال سوائے خیر سے نہیں۔ اور شر میں بھی اس کا استعمال جائز ہے۔ لغوی معنی کے لحاظ پر اس کا مطلب ہے لوٹنا، ”ثاب الیہ عقلہ“ ای رجوع الیہ“ اس کی عقل اس کی طرف لوٹ آئی، یہی معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں پایا گیا ہے۔ ﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ اور جب بنایا ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ ”والمراة تسمى ثيبا“ لان الواطی عائد الیہا“ عورت کو ثیبہ کہا جاتا ہے کہ وٹی کرنے والا اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے،

”واصل الثواب كل ما يعود الى الفاعل من جزاء فعله سواء كان خيرا او شرا الا انه بحسب العرف اختص لفظ الثواب بالخير“

ثواب کا معنی جب لوٹنا ہے تو اس معنی کے لحاظ پر فعل کی جزاء جو اس پر عمل کرنے والے کی طرف لوٹنی ہے اسے ثواب ہی کہا جاتا ہے خواہ فعل خیر پر جزاء خیر ہو، یا فعل شر کا بدلہ ہو، لیکن اب عرف میں جزاء خیر کو ہی ثواب کہا جاتا ہے، جزاء شر کو ثواب نہیں کہا جاتا۔

اگر لغوی معنی لیں تو یہاں ﴿فَأَتَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ میں استعمال درست ہے کہ ان کو غم پر غم پہنچایا۔ اور اگر عرضی معنی لیں تو تب تکم ہے، یعنی ان کو مصیبت کے پہنچنے کو ثواب سے تعبیر کر دیا گیا، (کبیر ج ۹ ص ۴۰)

﴿غَمًّا بِغَمٍّ﴾ ”يحتمل ان تكون بمعنى المعاوضة كما يقال هذا بهذا اي هذا عوض عن ذاك“ ایک احتمال یہاں یہ پایا گیا ہے کہ ”باء“ بدلیت کیلئے ہو، جیسے کہا جاتا ہے ”هذا بهذا“ یہ بدل ہے اس کا“ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے ”تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا“ (کنز الایمان)

ويحتمل ان تكون ”مع“ ”والتقدير اصابهم غمامع غم“

اور احتمال یہ ہے کہ ”باء“ مع کے معنی میں ہو، اب اس صورت میں مطلب ہو غموں کے ساتھ غم، حضرت مفتی احمد یارخان رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے ”تو پہنچائے تمہیں غم پر غم“ (نہج) راقم نے بھی طلباء کرام کے فائدہ کیلئے یہی ترجمہ نقل کیا تا کہ انہیں دونوں احتمال ذہن نشین ہو جائیں، (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۱۴۰)



پہلے معنی میں چند صورتیں:

جب معنی یہ کیا جائے ”تو تمہیں پہنچایا غم کے بدلہ غم“ تو اس کی چند وجوہ بیان کی گئی ہیں،

(۱) زجاج نے اس کی وضاحت یوں کی کہ تم نے جب رسول اللہ ﷺ کے امر پر عمل نہیں کیا تو تم نے اپنے آپ کو غم پہنچایا، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تمہیں غم پہنچایا کہ پسپا ہو گئے اور تمہارے احباب شہید ہو گئے ”والمعنی جازاکم من ذلک الغم بهذا الغم“ یعنی رسول اللہ ﷺ کو غم پہنچانے کے بدلے تمہیں غم پہنچایا گیا۔

(۲) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت یوں کی ”یرید غم یوم احد للمسلمین بغم یوم بدر للمشرکین“ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آج احد کو تمہیں غم پہنچایا جا رہا ہے تو کل بدر میں مشرکین کو غم پہنچایا جا چکا ہے۔ مقصد اس میں یہ تھا کہ تمہارے دل میں دنیا کی طرف توجہ نہ رہے، نہ تم دنیا کے حاصل ہونے کی وجہ سے خوش ہو، اور نہ ہی تم دنیا کے جانے پر غمناک ہو، یہی مطلب ہے ﴿لَکَیْلًا سَوَّاءٌ عَلَی مَآئَاتِکُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاکُمْ﴾ ”تا کہ تم عملیں نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی اور نہ خوش ہو اس پر جو تمہیں عطاء کیا“

(۳) بجوز ان یكون الضمیر فی قوله ﴿فَالْآبَاکُمْ﴾ يعود للرسول وذا معنی ان الصحابة لما راوا ان النبی ﷺ شج وجهه وکسرت رباعيته وقتل عمه اغتموا الاجله والرسول ﷺ لما رأى انهم عصوا ربهم لطلب الغنیمة ثم بقوا محرومین من الغنیمة وقتل اقاربهم اغتم لاجلهم“

اس میں ایک اور صورت یہ پائی گئی ہے کہ ضمیر ﴿فَالْآبَاکُمْ﴾ کی ہو سکتا ہے کہا ﴿الرَّسُولُ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہو، مطلب یہ ہے کہ جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ بیشک نبی کریم ﷺ کا چہرہ زخمی ہو گیا، دانت مبارک ٹوٹ گیا، اور آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو صحابہ کرام کو اس وجہ سے غم لاحق ہوا ہو، اور رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ ان لوگوں نے مال غنیمت کی وجہ سے رب تعالیٰ کا حکم ٹال دیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے امر میں اختلاف درحقیقت رب تعالیٰ کے امر میں اختلاف تھا، تو وہ مال غنیمت سے بھی محروم ہو گئے، ان کے اقرباء بھی شہید ہو گئے تو نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام کا غم لاحق ہوا، اس صورت میں گویا کہ مفہوم یہ ہو گیا ﴿فَالْآبَاکُمْ غَمًا بِغَمٍ﴾ تو پہنچایا تمہیں اے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے غم صحابہ کرام کے غم کے بدلے۔

دوسرے معنی میں چند صورتیں:

جب ”غما بغم“ میں باء کو جمع کے معنی میں کریں، مطلب یوں ہو ﴿فَالْآبَاکُمْ غَمًا بِغَمٍ﴾ تو پہنچائے



تمہیں غموں کے ساتھ غم، یا باء علی کا معنی دے تو اس صورت میں مطلب یوں ہوگا ﴿فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ﴾ تو پہنچائے تمہیں غموں پر غم،

اس معنی کے لحاظ پر چند صورتیں پائی گئی ہیں، لیکن اس سے پہلے دو مثالیں دیکھیں جن میں ایک جگہ ”باء مع“ کا معنی دے رہی ہے، اور دوسری جگہ ”باء علی“ کا معنی دے رہی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”مازلت بہ حتی فعل“ ای مازلت معه حتی فعل میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہا یہاں تک کہ اس نے یہ کیا، یہاں ”باء مع“ کے معنی میں استعمال ہے۔ اور کہا جاتا ہے ”نزلت بنی فلان“ ای علی بنی فلان میں بنی فلاں پر اترا، اس میں باء علی کے معنی میں استعمال ہے۔

(۱) غموں پر غم پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ کثیر غم پہنچائے گئے، دشمن کی طرف سے ان کے مالوں اور جانوں میں نقصان پہنچانے کا غم انہیں لاحق ہوا، پھر احد میں صحابہ کرام کی تکالیف پر تمام مسلمانوں کو غم لاحق ہوا، پھر نبی کریم ﷺ کے زخمی ہونے، اور آپ کے دانت مبارک کے ٹوٹنے کا غم انہیں لاحق ہوا، پھر رسول اللہ ﷺ کے شہید ہو جانے کی خبر اڑانے کی وجہ سے غم انہیں لاحق ہوا، پھر ان سے جو نبی کریم ﷺ کے حکم کی بجا آوری (پورا کرنے) میں کوتاہی ہوئی اس کے عذاب کا خوف کا غم انہیں لاحق ہوا،

(۲) ان الغم الاول ما اصابهم عند الفشل والتنازع والغم الثاني ما حصل عند الهزيمة  
پیشک پہلا غم جو ان کو ضعف رائے حاصل ہونے پر اور نبی کریم ﷺ کے امر میں تنازع کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اور دوسرا غم انہیں پسپا ہونے، میدان میں جم کر کفار کو قتل نہ کرنے کی وجہ سے لاحق ہوا،

(۳) ان الغم الاول ما حصل بسبب فوت الغنائم والغم الثاني ما حصل بسبب ان اباسفیان  
وخالدين الوليد اطلعوا على المسلمين فحملوا عليهم وقتلوا منهم جمعا عظيما  
پہلا غم انہیں غنیمت کے فوت ہونے کی وجہ سے لاحق ہوا، اور دوسرا غم انہیں حاصل ہوا جب کہ ابوسفیان اور خالد بن ولید نے مسلمانوں کے درہ سے ہٹ جانے پر مطلع ہو کر ان پر چڑھائی کر دی اور ان پر حملہ کر دیا اور ان میں سے ایک بڑی جماعت یعنی ستر صحابہ کرام کو شہید کر دیا۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۴۱)

﴿لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ﴾

تاکہ تم عملیں نہ ہو اس پر جو تم سے ضائع ہو گئی اور اس پر جو پہنچی ہے تمہیں۔

یہاں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق ہو ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ سے، اب مطلب یہ ہوگا کہ تحقیق اس نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم کسی چیز کے کھو جانے پر غم نہ کرو اور کسی مصیبت کے آنے پر غم نہ کرو، اس کی وجہ یہ ہے



کہ ”ان فی عفوہ تعالیٰ مایزیل کل غم و حزن“ بیشک اللہ تعالیٰ جب کسی کو معاف فرمادے تو اس کے تمام غم اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا تعلق ﴿فَاَلَا بَکُمْ﴾ سے ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں غم کے بدلے غم پہنچایا تا کہ تمہیں کسی چیز کے ضائع ہونے پر اور کسی مصیبت کے پہنچنے پر کوئی غم نہ ہو۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے امر کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اور آپ کو غم پہنچانے کی وجہ سے جو تمہیں پسپا ہونے کا غم رب تعالیٰ نے پہنچایا اس کی وجہ سے باقی تمام غم تمہارے جاتے رہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ

”وَذَلِكْ لَانِ الْغَمَّ الْحَاصِلَ بِسَبَبِ الْاِقْدَامِ عَلٰی الْمَعْصِيَةِ يَنْسِي الْغَمَّ الْحَاصِلَ بِسَبَبِ مَصَائِبِ الدُّنْيَا“

جب ان کو ظاہری عصیان و نافرمانی پر غم حاصل ہوا تو اس نے باقی دنیا کی مصیبتوں کے غم بھلا دئے، یہ حقیقت ہے کہ بہت بڑے غموں کی وجہ سے چھوٹے غموں کی طرف توجہ ہی نہیں رہتی، ”جب دوسرا معنی مراد ہو کہ تمہیں پہنچائے غموں پر غم“ تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ رب تعالیٰ نے جب تمہیں پہلے کثیر غم پہنچا دئے ہیں جن کی وجہ سے تم بہت زیادہ عملیں ہو چکے ہو تو اس کے بعد کسی غم کو تم دل میں نہیں لاؤ گے،

(ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۴۲)

اور غموں پر غم پہنچا دینے کی وجہ یہ تھی کہ ”لَتَمَرَّنَا عَلٰی الصَّبْرِ فِي الشَّدَائِدِ وَتَعْنَا دَوَاتِجِرِ الْغَمِّ فَلَا حَزْنَ عَلٰی نَفْعِ فَاَتِ اَوْضْرَاتِ“ تمہیں مشکلات پر صبر کرنے کی مشق حاصل ہو جائے اور غموں کا گھونٹ پی لینے کی عادت ہو جائے، پھر تمہیں کسی نفع کے فوت ہونے اور ضرر کے پہنچنے پر کوئی غم لاحق نہ ہو،

(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

﴿وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ اور اللہ خبر رکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو،

”ای عالم باعمالکم و بما قصدتم بها“ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال اور تمہارے دلی ارادوں کو جانتا ہے۔

**فائدہ:** صبر، یقین، اور اللہ تعالیٰ پر توکل، اور دنیا، اور دنیا کے حسن مناظر سے بچ کر رہنا، اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے بچ کر رہنا، رب تعالیٰ کی طرف سے امداد، کامیابی کے حاصل ہونے کے ذرائع ہیں۔ اور ضعف رائے اور تنازع اور دنیا کی طرف توجہ کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے امر کو نہ بجالانا یہ مصائب میں مبتلا ہونے کی اسباب ہیں، اور دشمن سے پسپا ہونے کا سبب ہے۔

”فَمَنْ ارَادَ النَّصْرَةَ عَلٰی الْاَعْدَاءِ الظَّاهِرَةِ وَالْبَاطِنَةِ لَا يَسْلُكْ طَرِيقًا غَيْرَ مَا عَيْنُهُ الشَّارِعُ“



جو شخص ظاہری اور باطنی دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہئے کہ جو راستہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ نے معین کیا ہے اس سے نہ ہٹے، اور کوئی راہ اختیار نہ کرے، آزمائشوں پر راضی رہے، آخرت کا بھی کوئی غم نہ کرے بلکہ صرف رب تعالیٰ کی طلب کا غم کرے۔

”فطلب الحق الذی من نعيم الدنيا والآخرة“ اللہ تعالیٰ کی طلب کا غم دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ دین کے معاملات میں جتنی بھی مصیبتیں آئیں ان پر صبر کرے،

صبر آرد آرزو رانی شتاب صبر کن واللہ اعلم بالصواب

صبر جلدی ہی آرزوؤں پورا کرتا ہے صبر کر، اللہ تعالیٰ زیادہ درست جانتا ہے۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ کا ارشاد:

قال ذوالنون قدس سرہ العزیز ان ادنی منازل المرید ان اللہ تعالیٰ لو ادخلہ النار واحاط بہ عذابه مع هذه الارادة لم یزد دقلبه الاحباله وانسابه وشوقا الیہ وکانت الجنة عنده اصغر فی جنب ارادته من خرد لہ بین السماء والارض فعلى السالک ان یدیق نفسه مرارة الطاعة ویدخلها فی باب التسليم لیكون عند الله مماله قدر وسبق

حضرت ذوالنون بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ارادہ رکھنے والے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے آگ میں داخل کر دے اور عذاب کے ذریعے اس کا احاطہ کر لے تو اس کے ارادہ میں کوئی فرق نہ آئے بلکہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے بڑھتی چلی جائے، اللہ تعالیٰ سے اس کا انس اور شوق اور زیادہ ہو۔ جنت اسے رائی کے دانے سے بھی چھوٹی نظر آئے، سالک وہی ہے جو طاعت کی مشکلات کو برداشت کرے اور تسلیم کے دروازہ میں داخل ہو جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے قدر و منزلت حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اسے سبقت حاصل ہو۔ (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

**حکمت آموز قول:** روح البیان میں ذکر کیا گیا ہے (سند مذکور نہیں اسلئے سند کی صحت وغیر صحت علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ پر ہے) حضرت علیؑ نے فرمایا میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے پوچھا کہ اے خلیفہ رسول اللہ ﷺ کس وجہ سے اس مرتبہ تک پہنچے ہو کہ ہم سے تم سبقت لے گئے؟ آپ نے فرمایا پانچ چیزوں کی وجہ سے:

(۱) اولہا وجدت الناس صنفین مرید الدنیا ومرید العقبیٰ فکنت انا مرید المولیٰ ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ میں نے لوگ دو قسم کے پائے، ان میں سے بعض دنیا کا ارادہ کر رہے تھے، اور بعض آخرت کا ارادہ کر رہے، لیکن



میں نے (دنیا و آخرت کا ارادہ نہیں بلکہ) صرف رب تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا،

(۲) والثانی ملد دخلت فی الاسلام ماشبعت من طعام الدنيا لان لذة معرفة الله شغلتنی عن لذائذ طعام الدنيا“ ان میں دوسری وجہ یہ ہے کہ میں جب سے اسلام میں داخل ہوا، میں نے سیر ہو کر دنیا کا طعام نہیں کھایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی لذت نے دنیا کے طعام کی لذت سے پھیر دیا۔

(۳) والثالث ملد دخلت فی الاسلام مارویت من شراب الدنيا لان محبة الله شغلتنی عن شراب الدنيا“ ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ میں جب سے اسلام میں داخل ہوا میں نے دنیا کا مشروب نہیں پیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے مجھے دنیا کے شراب سے پھیر دیا، خیال رہے کہ اس مقام میں شراب سے مراد زیادہ بہتر یہ ہے کہ تشبیہ ثابت کی جائے کہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جب سے اسلام قبول کیا مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت نے یوں مست کر دیا کہ دنیا کی محبت کا کوئی مشروب میں نے نہیں پیا۔

(۴) والرابع كلما استقبلنی عملان عمل الدنيا وعمل الآخرة اخترت عمل الآخرة علی عمل الدنيا“ ان میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب بھی میرے سامنے دو عمل آئے ایک دنیا کا عمل اور ایک آخرت کا عمل تو میں نے آخرت کے عمل کو دنیا کے عمل پر ترجیح دی،

(۵) والخامس صحبت النبی ﷺ فاحسنت صحبتہ“ پانچویں وجہ یہ ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کو جب سے اختیار کیا تو میں نے احسن طریقہ سے صحبت کو قائم رکھا، علامہ اسماعیل حقّی رحمہ اللہ فرماتے ہیں آپ نبی کریم ﷺ کی صحبت سے بھی ایک گھڑی سے زیادہ جدا نہیں رہے، یہاں تک کہ آپ نبی کریم ﷺ سے ساتھ غار میں داخل ہوئے طرح طرح کی مشکلات کو آپ نے برداشت کیا لیکن نہ ہی بھی حضور ﷺ سے آپ نے جدا ہونے کا خیال کیا اور نہ ہی آپ نے بھی حضور ﷺ کے حکم کو ٹالا۔

(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۱)

**تنبیہ:** نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی غزوہ احد میں صرف چالیس صحابہ کرام سے ہوئی، اور آپ کے ساتھ ثابت رہنے والے اور آپ کی حفاظت کرنے والے چودہ صحابہ کرام تھے جن کے نام ذکر کر دئے گئے، شہید ہونے والے ستر صحابہ کرام سب ہی ثابت قدم رہنے والے تھے، اور جو شہید نہیں ہوئے ان میں بعض میدان کارزار میں قائم رہے کچھ بکھر گئے۔ لیکن رب تعالیٰ نے بکھر جانے والوں کے نام ہونے پر ان کو معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، صحابہ کرام اور اہل بیت کے گستاخ اپنی عاقبت برباد کر رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفین اور حضرت امام حسین ﷺ کے مخالفین دونوں ایک درجہ کے ہیں۔ رب تعالیٰ ان دونوں فرقوں سے بچائے، کاش کہ حق راہ سادات اور پیروں کو بھی سمجھ آئے۔



ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَى طَائِفَةً مِّنْكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّهِ يُخَفُونَ فِي أَنفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

(آیہ نمبر ۱۵۴)

(۱) پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری کہ تمہاری ایک جماعت کو گھیرے تھی اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی تھی اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان کہتے کیا اس کام میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے، تم فرما دو کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں ہمارا کچھ بس ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے تم فرما دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے جب بھی جن کو مارا جانا لکھا جا چکا تھا اپنی قتل گاہوں تک نکل کر آتے اور اس لئے کہ اللہ تمہارے سینوں کی بات آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے کھول دے اور اللہ دلوں کی بات جانتا ہے۔

(کنز الایمان)

(۲) پھر اتاری تم پر غم کے بعد چین کی نیند جو چھارہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے، اور ایک گروہ کو تحقیق غم میں ڈالان کی جانوں نے، وہ گمان کرنے لگے اللہ پر بے جا جاہلیت کا گمان "وہ کہنے لگے کیا ہمیں (اختیار) ہے اس کام میں کچھ، تم فرما دو کہ بیشک کام (میں اختیار) تو سارا اللہ کا ہے، وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر وہ کہتے ہیں اگر ہمیں اس کام میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم نہ قتل کئے جاتے یہاں۔ فرما دیجئے اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں البتہ نکل آتے "وہ کہ لکھا گیا ان کیلئے قتل ہونا" اپنے قتل کی جگہ تک، تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے، تاکہ کھول کر نکھار دے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے، اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو۔

(نجوم الفرقان)



## مختصر مطلب:

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے نصرت کا وعدہ فرمایا کہ تمہیں کافروں پر مدد دی جائے گی، انسان نصرت کو اسی وقت نصرت اعتبار کرتا ہے جب اس کا خوف زائل ہو جائے، اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان سے خوف زائل کرنے کا ذکر کیا، تاکہ ان کے دل مطمئن ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کا وعدہ مزید پورا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی امداد کا ذکر فرمایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ﴾ اور تحقیق سچا کر دیا تمہارے ساتھ اللہ نے اپنا وعدہ جب تم ان کو (کافروں کو) قتل کر رہے تھے، لیکن صحابہ کرام سے نبی کریم ﷺ کے حکم کو ماننے میں غلطی ہوئی تو ان پر خوف مسلط کر دیا گیا، پھر ان سے خوف کو ہٹا لیا گیا۔ غزوہ احد میں شریک ہونے والے دو قسم کے لوگ تھے، ایک مخلصین مومنین صحابہ کرام اور دوسرے منافقین، ان دونوں فریقوں کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں فرمایا، مومنوں کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو غم پہنچایا اور خوف مسلط کیا اس کے بعد تمہیں چین کی نیند عطا فرمادی جس سے تمہارا خوف جاتا رہا، یہ ایک فریق یعنی مخلصین مومنین پر نیند چھا گئی، اور دوسرا فریق منافقین کا تھا جن کو جان کی فکر کھائے جارہی تھی، وہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالیٰ پر بلا وجہ بدگمانی کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کاش ہمیں بھی کوئی اختیار ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ فرمادیں کہ بیشک تمام اختیار تو اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے، انہوں نے اپنی بدگمانیوں کو دلوں میں چھپا رکھا تھا، اسے ظاہر نہیں کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کاش کہ ہمیں کوئی اختیار ہوتا اور ہمارے سردار عبداللہ بن ابی کی بات کو مان کر مدینہ میں رہ کر مدافعت (دفاعی) جنگ لڑی جاتی تو یہاں ہمارے بھائی قتل نہ ہوتے، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا کہ آپ ان کو فرما دیں کہ جس کی موت لکھی ہوئی تھی اسے اپنی قتل کی جگہ پہنچنا ہی تھا جہاں وہ پہنچ گیا، احد کے واقعہ کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کا امتحان لے لے، مومنوں کے دلوں سے خوف کو ہٹا دے، مومنوں کے دلوں کو نکھار دے، اور مومنوں اور منافقوں میں تمیز کر دے تاکہ آنے والی نسلوں کو مخلصین اور منافقین کا کردار اور ان کے نظریات سمجھ آتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ تو لوگوں کے سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔

﴿ثُمَّ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنٌ نُعَاسًا﴾ ”پھر اتاری تم پر چین کی نیند۔“

﴿ثُمَّ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ﴾ یہ خطاب ایمان والوں کو ہے کہ اے ایمان والو پھر اتاری تم پر، ﴿مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ﴾ غم کے بعد، یعنی جو تمہیں غزوہ احد میں مصیبت پہنچی اور وقتی طور پر شدید خوف لاحق ہوا، اس کے بعد ”امنة نعاسا“ چین کی



نیز ”الامن والامنة واحد“ امن اور امنہ کا ایک ہی معنی ہے، ہاں بعض حضرات نے فرق بھی کیا ہے، وہ یہ کہ ”الامن یکون مع زوال الخوف“ امن اس وقت حاصل ہوتا ہے جب خوف بھی زائل ہو جائے ”والامنة مع بقاء سبب الخوف“ امنہ اس آرام کو کہتے ہیں جو بظاہر آرام بھی حاصل ہو، لیکن خوف باقی رہے، ”والنعاس اخف من النوم“ بلکی نیند کو نعاس کہا جاتا ہے،

”والمعنى اعقبكم بما نالكم من الخوف والرعب ان امنكم امناتنا من معد لان الخائف لا يكاد ينال فآمنهم بعد خوفهم“

مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ایمان والوں کا امتحان لے لیا، ان کو مصیبت پہنچا کر ان پر خوف اور رعب مسلط کر دیا، اس کے بعد ان کو امن، چین دے دیا جس کی وجہ سے ان کو نیند آنے لگی، اسی سے واضح ہو گیا کہ ان کے دلوں میں کوئی خوف نہیں رہا تھا کیونکہ جو ڈر رہا ہو نیند تو اس کے قریب بھی نہیں آتی، یہاں سے ایک اور بات نکھر کر سامنے آگئی کہ اس مقام ”امنة“ بغیر خوف کے امن حاصل ہونے کے معنی میں استعمال ہے وہ امن مراد نہیں جس میں خوف باقی رہے۔  
دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

قوله ”نعاس“ بدل احتمال من امانة و جاز ان يكون مفعولا لانزل ”وامنة“ حال منه مقدم عليه“

(مظہری ج ۲ ص ۱۵۷)

یہاں دو ترکیبیں پائی گئی ہیں ایک یہ کہ ”نعاس“ بدل احتمال ہو ”امنة“ سے، اسی ترکیب کے مطابق حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ”پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم و اندوہ کے بعد ”راحت“ (یعنی) غنودگی۔

(ضیاء القرآن ج ۱ ص ۲۷۶)

اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ ”نعاس“ مفعول ہے ”انزل“ کا، اور ”امنة“ اس سے حال مقدم ہے، اس کا تفصیلی معنی تو یوں ہوگا ”پھر اتاری تم پر نیند حال یہ ہے کہ وہ امن و چین تھی“ لیکن اتنے لمبے معنی کو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے مختصر اور خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا ”پھر تم پر غم کے بعد چین کی نیند اتاری“۔ (کنز الایمان)

راقم نے بھی یہی ترجمہ نقل کیا لیکن لفظی ترتیب کے مطابق ”پھر اتاری تم پر چین کی نیند“ (نجوم الفرقان)

﴿يَنْشَى طَائِفَةٌ مِّنْكُمْ﴾ جو چھار ہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے ”اس گروہ سے مراد کون سا گروہ ہے؟

﴿وَهُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ اس سے مراد یقیناً ایمان والے لوگ ہیں۔ (مظہری ج ۲ ص ۱۵۸)

عن انس عن ابی طلحة قال كنت فيمن نغشاهم النعاس يوم احد حتى سقط سيفي



حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں میں بھی ان لوگوں میں تھا جن پر احد کے دن نیند چھا رہی تھی، یہاں تک کہ میرے ہاتھ سے کئی مرتبہ تلوار گر گئی، تلوار گر جاتی میں اسے پکڑ لیتا، پھر گر جاتی پھر پکڑتا،

❖ واخرجه الترمذی عنه قال غشينا النعاس ونحن فی مصافنا یوم احد

❖ حضرت ابو طلحہ کہتے ہیں ہم پر احد کے دن نیند چھا رہی تھی حالانکہ ہم صفوں میں تھے،

(منقول از خازن ج ۱ ص ۲۶۳)

❖ وقال ثابت عن انس عن ابی طلحة قال رفعت رأسی یوم احد فجعلت مأری احدا من القوم الا وهو یمیل تحت جحفة من النعاس

❖ ابو طلحہ فرماتے ہیں میں نے احد کے دن اپنا سر اٹھا کر دیکھا، میں اپنی قوم کو دیکھ رہا تھا کہ غنودگی کی وجہ سے ڈھالوں کے نیچے ان کے سر مائل ہو رہے تھے

(منقول مظہری ج ۲ ص ۱۵۹)

❖ عن ابن مسعود النعاس فی القتال امانة والنعاس فی الصلوة من الشیطان

❖ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جنگ میں غنودگی امن ہے اور نماز میں غنودگی شیطان کی طرف سے ہے

❖ "وذلك لانه فی القتال لا یكون الامن غایة الوثوق بالله والفراغ عن الدنیا ولا یكون الصلوة الامن غایة البعد عن الله"

❖ وجہ اس کی یہ ہے کہ جنگ میں غنودگی تب ہی آتی ہے جب اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ ہو، اور دنیا کی طرف اس کی توجہ نہ ہو، اور نماز میں غنودگی کا آنا علامت ہے اس کی کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہے، اگر اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا، اور رب تعالیٰ کا خوف لاحق ہوتا تو اسے غنودگی نہ آتی۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۵)

### غنودگی میں فوائد:

(۱) مؤمنوں کی جماعت کو دوران جہاد عام عادت کے خلاف زیادہ ہی ہلکی نیند آگئی، جس کی وجہ سے ان کے ہاتھوں سے تلوار گرتی وہ اٹھاتے پھر گر جاتی "فکان ذلک معجزة ظاهرة للنبی ﷺ" یہ نبی کریم ﷺ کا واضح معجزہ ہے۔ صحابہ کرام نے جب نبی کریم ﷺ کا یہ نیا معجزہ دیکھا تو ان کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آگئی،

"ومنی صاروا کذلک ازداد جدهم فی محاربة العدو ووثوقهم بان الله تعالى منجز وعده"

جب ان کے دل میں اور زیادہ ایمان میں پختگی آگئی تو دشمن کے ساتھ ان کی جنگ میں کوشش اور بڑھ گئی۔ اور بہت زیادہ وثوق ان کو حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کو ضرور ہی پورا کرنا ہے،

(۲) نیند کے نہ آنے، بیدار رہنے کی وجہ سے ضعف اور سستی آ جاتی ہے۔ جب سو جائے، آرام کر لے تو اس کے



بعد چستی اور قدرت و طاقت بڑھ جاتی ہے۔

(۳) صحابہ کرام کو دوران جہاد اس وجہ سے بھی غینہ عطاء کی تاکہ وہ اپنے شہید اقرباء کو نہ دیکھیں تاکہ دیکھنے میں انہیں خوف نہ حاصل ہو۔

(۴) دشمن جبکہ بہت تمنا رکھتے تھے کہ باقی بچ جانے والے حضرات کو بھی شہید کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو نیند عطاء کر دی اور ان کو سلامت رکھا، ”هذا اذل الدلائل على ان حفظ الله وعصمته معهم“ یہ اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کرنے والا ہے، اور وہی بچانے والا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آجائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ بڑھ جاتا ہے اور دل سے خوف جاتا رہتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۲۵)

﴿وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ﴾ ”اور ایک گروہ کو غم میں ڈالا ان کی جانوں نے۔“

”ہم یہم ہما“ الحزن الذي يذيب الانسان“ يقال هممت الشحم

وہ غم جو انسان کو پگھلا دے اسے ”ہم“ کہا جاتا ہے اسی طرح کہا جاتا ہے ”ہممت الشحم“ میں نے چربی کو پگھلایا۔ ”والهم ما هممت به في نفسك“ اسی طرح ”ہم“ کا معنی ارادہ کرنا بھی آتا ہے۔ یہ معنی قرآن پاک کی بہت آیات میں استعمال ہے۔

”إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ“ ”وَهُمُّوا بِمَالِهِمْ يَنْتَالُوا“ ”وَهُمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ“

اس مقام میں کوئی سامعنی معتبر ہے؟ دونوں معنی لئے جاسکتے ہیں لیکن مراد دونوں سے غم میں ڈالنا ہی ہے۔ ”وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ“ یعنی

حملتہم انفسہم علی الہم لان اسباب الخوف وہی قصد الاعداء کانت حاصلۃ عندهم

یعنی ان کی جانوں نے ان کو غم پر برا بھلا کیا یعنی غم پر ابھارا، کیونکہ ان کو اسباب خوف حاصل تھے کہ ہائے دشمن ہم پر حملہ کر کے ہمیں قتل کر دے گا۔ (خازن ج ۱ ص ۲۹۲)

راقم نے یہی معنی کیا ہے ظاہر الفاظ کے مطابق چونکہ ”انفسہم“ مرفوع ہے اور قاعل ہے۔ (اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے مرادی معنی پیش کیا ہے، مختصر اور خوب، ”اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی“ (کنز الایمان)

اور یہی ڈرنے والا معنی ابو مسلم نے بھی بیان کیا:

”قال ابو مسلم من عادة العرب ان يقولوا لمن خاف“ قداہمتہ نفسہ“



ابو مسلم کہتے ہیں عرب کی یہ عادت ہے کہ جب کوئی ڈر رکھتا ہو تو کہا جاتا ہے ”قداہمتہ نفسہ“ تحقیق اس کے نفس نے اسے غم میں ڈال دیا ہے، یعنی اسے اپنی جان کی پڑی ہوئی ہے۔ ”ارادہ والامعنی“ بھی آتا رہتا ہے ”ہمندی الشئ“ فلاں چیز نے مجھے یہ ارادہ کرایا۔ ”یعنی عن ہمی وقصدی“ یعنی میرا ارادہ یہ تھا۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۶)

اسی معنی کے لحاظ پر ترجمہ یوں ہوگا ”ایک گروہ کو ان کے نفسوں نے ارادہ کرایا (ڈرنے کا) لیکن اس معنی میں تکلف پایا جائے جو مستحسن نہیں۔

”وہو لاء المنافقون لشدة خوفهم من القتل طار النوم عنہم“  
منافقوں کی شدت خوف کی وجہ نینداڑ گئی تھی،

مومنوں اور منافقوں کے غم میں فرق:

قيل المؤمنون كان همهم النبي ﷺ واخوانهم من المؤمنين، والمنافقون كان همهم انفسهم“  
مومنوں کو بھی اگرچہ خوف تھا لیکن وہ نبی کریم ﷺ اور اپنے مومن بھائیوں کا ان کو اپنی جانوں کا کوئی خوف نہ تھا اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے ان پر نیند کو مسلط کر کے اس خوف کو ان سے دور کر دیا جو انہیں لاحق تھا۔ لیکن منافقوں کو اپنی جان کا خوف تھا، اسلئے وہ خوف سے پگھلے جا رہے تھے، تحقیق قول کی یہ ہے کہ انسان جس چیز میں مشغول ہو اور متفرق ہو دوسری چیز اسے بھول جاتی ہے، اسلئے مومنوں کی توجہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تھی لہذا ان کو جانوں کا خوف نہیں دیا۔ منافقین اپنی جانوں میں مشغول تھے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے تھے اس وجہ سے انہیں خوف اپنی جانوں کا تھا، (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۴۶)

﴿يُظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا جاہلیت کا گمان۔

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿غَيْرَ الْحَقِّ﴾ ”مصدر کے حکم میں ہے، معنی اس کا یہ ہے ”يُظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ الَّذِي يَجِبُ اَنْ يُظَنَّ بِهِ“ وہ اللہ پر گمان کرتے ہیں ”ظن، حق کا غیر ہے“ حالانکہ ان پر واجب تھا کہ وہ حق گمان کرتے، ”ظن الجاهلية“ بدل عنہ ”ظن الجاهلية“ بدل ہے ”غیر الحق“ سے، اس ترکیب کا فائدہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ کثیر تعداد میں دین ناسحق ہیں، ان سب میں سے اہل جاہلیت کے اقوال زیادہ برے ہیں، پہلے



ذکر کیا ”انہم یظنون باللہ غیر الظن الحق“ کہ وہ بیشک اللہ تعالیٰ پر بے جا، ناحق گمان کرتے ہیں۔ اس کے بعد بیان کیا کہ انہوں نے ناحق دینوں میں سے وہ پسند کیا ”ہوا کثرہا بطلانا و هو ظن اهل الجاہلیۃ“ جو اکثر باطل ہے، وہ اہل جاہلیت کا گمان ہے۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۷)

﴿يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ﴾ میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ ”ظن“ خاص درجہ علم میں ہو اور اس کا استعمال اس طرح ہو جیسا کہ ”حاتم الجود“ اور ”عمر العدل“ کا استعمال ہے، مراد وہ ظن ہو جو دین جاہلیت کے ساتھ خاص ہو۔ ”اب ترجمہ یہ ہوگا“ وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا دین جاہلیت کا گمان“ راقم نے ظاہری الفاظ کے مطابق یہی ترجمہ کیا ہے،

دوسرا قول ہے ”المراد ظن اهل الجاہلیۃ“ اس صورت میں معنی یہ ہوگا وہ گمان کرتے ہیں اللہ پر بے جا جاہلیت والوں کے گمان کی طرح، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ذرا مختصر ترجمہ کیا ”اللہ پر بے جا گمان کرتے تھے جاہلیت کے سے گمان۔“

جاہلیت کا گمان کیا تھا:

اس کے دو احتمال ہیں۔ ایک ان میں سے زیادہ ظاہر ہے وہ یہ کہ

”انہم کانوا یقولون فی انفسہم لو کان محمد محقافی دعواہ لما سلط الکفار علیہ و هو ظن فاسد“

وہ کہ وہ اپنے دل میں یہ کہتے تھے کہ اگر محمد اپنے دعویٰ میں حق پر ہوتے تو کافران پر مسلط نہ ہوتے، یہ دعویٰ ان کا باطل تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو نبوت کا تاج پہنایا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ رب تعالیٰ آپ کو آزمائش میں نہیں ڈال سکتا، ”ان اللہ تعالیٰ یفعل ما یرید و یحکم ما یرید“ بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے اور جو چاہے وہ حکم فرماتا ہے، رب تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بندے کی آزمائش بھی اس کے مدارج کو بلند کرنے کیلئے کی جاتی ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورا اتر کر قرب الہی حاصل کر لے۔

ظن جاہلیت میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”انہم کانوا ینکروں الہ العالم بکل المعلومات القادر علی کل المقدورات“ کہ وہ رب تعالیٰ جو معبود حقیقی ہے اس کے متعلق یہ گمان کرتے تھے کہ وہ تمام معلومات کا عالم نہیں



اور تمام مقدورات پر قادر نہیں، ان کا یہ گمان باطل تھا،

”وینکرون النبوة والبعث فلا جرم ما وثقوا بقول النبی فی ان الله یقویہم ینصرہم“

وہ نبوت اور قیامت کا انکار کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے اس قول پر وثوق نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو

قوت دے گا، ان کی امداد کرے گا، ان کا یہ انکار بھی جاہلیت کا گمان تھا، (ماخوذ از کبیر بالاختصار ج ۹ ص ۴۶)

﴿وَيَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ”وہ کہنے لگے کیا ہمیں اس کام میں اختیار ہے کچھ“

منافقین کی یہ ایک اور صفت بیان کی جا رہی ہے۔ ان کا کلام استفہام انکاری کے طور پر ہے، مطلب یہ ہوا کہ وہ منافقین کہہ رہے تھے کیا ہمیں اس کام میں کوئی اختیار ہے کچھ، یعنی ہمیں تو اس میں کوئی اختیار ہی نہیں تھا، اگر ہمارا کوئی اختیار ہوتا اور ہماری بات کو مانا جاتا تو اس طرح مسلمان قتل نہ ہوتے۔

### شان نزول:

غزوہ احد کیلئے نبی کریم ﷺ نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ آپ مدینہ طیبہ میں ہی رہیں، یہاں سے ہی کفار کا دفاع کریں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کی بات کو نہ مانا آپ احد میں تشریف لے گئے، ”وقتل من قتل“ تو اس میں کئی حضرات شہید ہو گئے۔

”قیل لعبد اللہ بن ابی قد قتل بنو الخزرج“ قال ”هل لنا من الامر شيء“ وهو استفہام

علی سبیل الانکار ای مالنا امر یطاع“

تو عبداللہ بن ابی کو کہا گیا بنو خزرج کے لوگ شہید ہو گئے، وہ کہنے لگا کیا ہمیں اس کام میں کوئی اختیار تھا؟ یعنی ہمیں تو کوئی اختیار نہیں تھا ہماری بات کو تو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔

یعنی ان محمد الم یقبل قولی حین امرتہ بأن یسکن فی المدینة ولا ینخرج

منہا، ونظیرہ ما حکاہ اللہ عنہم الہم قالوا ”لو اطاعونا ما قتلوا“

یعنی عبداللہ بن ابی کہنے لگا میری بات کو تسلیم نہیں کیا گیا میں نے تو کہا تھا مدینہ میں ہی رہیں باہر نہ نکلیں، رب تعالیٰ نے ان لوگوں کو قول کو یوں بیان فرمایا کہ وہ کہہ رہے تھے ﴿لَوْ اطَاعُونَا مَا قُتِلُوا﴾ اگر یہ (مسلمان) ہماری اطاعت کرتے تو قتل نہ کئے جاتے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ منافقین کا یہ کہنا:



”هل لنا من الامر شيء“ ای هل لنا من الشيء الذي كان يعدنا به محمد وهو النصره والقوة شيء وهذا استفهام على سبيل الانكار“

”کیا ہمیں اس کام میں اختیار ہے کچھ“ اس میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں تو اس میں کچھ اختیار ہی نہیں تھا جو محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ نصرت اور غلبہ کا وعدہ کرتے تھے۔ بلکہ (معاذ اللہ) وہ استدلال یہ پیش کر رہے تھے ”ان محمدا كان كاذبا في ادعاء النصره والعصمة من الله تعالى لامته“

بیشک محمد (ﷺ) اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے تھے جو وہ اپنی امت کو کہتے تھے کہ تمہیں امداد حاصل ہوگئی۔ (معاذ اللہ) ان منافقین کا استدلال باطل تھا۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۷)

عبداللہ بن ابی کی طرح معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی بھی یہی کہہ رہے تھے ”وكانوا خرجوا طمعا في الغنيمه“ وہ نکلے ہی تھے مال غنیمت حاصل کرنے کیلئے، جب ان کو غنودگی بھی نہ آئی ”وجعلوا يتأسفون على الحضور ويقولون الاقاديل“ خوف ان کو حاصل ہوا تو وہ احد میں اپنے حاضر ہونے پر افسوس کر رہے تھے، اور اس قسم کے باطل اقوال پیش کر رہے تھے۔

”قال ازبیر ارسل علينا النوم ذلك اليوم وانی لأسمع قول معتب بن قشیر والنحاس يغشانی يقول لو كان لنا من الأمر شيء ماقتلنا ههنا“

حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں، ہمیں اس دن غزوہ احد میں نیند عطاء کر دی گئی، باوجود اس کے کہ نیند مجھ پر چھا رہی تھی لیکن میں معتب بن قشیر کی آواز سن رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا ”اگر ہمیں اس امر میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، (قرطبی ج ۳ ص ۶۳۲)

﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾

”تم فرما دو بیشک کام (میں اختیار) سارا اللہ کا ہے۔“

(قل) یا محمد لهؤلاء المنافقين (ان الامر كله لله) یعنی النصر والظفر والقضاء والقدر كله لله وبیده بصره كيف يشاء ويدبره كيف احب“

مطلب ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہوا کہ اے محمد (ﷺ) آپ ان منافقوں کو فرما دو کہ بیشک سارا امر اللہ کیلئے ہے یعنی نصرت اور کامیابی عطاء کرنا، قضاء و قدر (تمام فیصلے اور تقدیر) سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ پھیرتا ہے جس طرح چاہے، اور تدبیر فرماتا ہے جس طرح پسند کرتا ہے۔ (خازن ج ۱ ص ۲۶۳)



تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر میں ہیں:

اس آیت کریمہ سے اہل سنت نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ جب منافقین نے یہ کہا ”ان محمد الو قبل منا ربنا ونصحنالما وقع فی هذه المحنة“ بیشک محمد اگر ہماری رائے کو مانتے اور ہماری نصیحت پر عمل کرتے تو اس مشقت میں نہ پڑتے ”فاجاب الله عنه بان الامر كله لله“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا کہ امر (کام) سارا اللہ کا ہے، اس جواب سے ہی یہ پتہ چل گیا کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر میں ہیں، اگر اس کی مشیت سے خارج ہوتے تو منافقین کے شبہ کا ازالہ نہ ہوتا۔

آیت کریمہ اور برہان عقلی کا تطابق:

آیت کریمہ سے جس طرح ثابت ہوا کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر میں ہیں اسی طرح عقلی دلیل سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ موجود یا واجب لذاتہ ہوگا یا ممکن لذاتہ کے وجود کو عدم پر اس وقت تک رائج نہیں کر سکتے جب تک اس کی انتہاء واجب الوجود کی طرف نہ ہو، یعنی ممکن اسی وقت موجود ہوتا ہے جب واجب الوجود اسے موجود کرے ”فثبت ان كل ما سوى الله تعالى مستند الى ايجاده وتكوينه“ تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب مخلوق اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے سے ہی موجود ہوتی ہے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ بعض محدثات اور بعض ممکنات تو اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے اور پیدا کرنے سے ہی موجود ہوتے ہیں۔ اور بعض خود بخود ہو جاتے ہیں۔

”فتدخل فيه افعال العباد وحركاتهم وسكناتهم وذلك هو المراد بقوله ”قل ان الامر كله لله“ بلکہ یہ ثابت ہے کہ تمام بندوں کی حرکات و سکنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿قُلْ اِنَّ اَمْرًا كُلَّهُ لِلّٰهِ﴾ کا یہی مطلب ہے کہ سارا کام اللہ تعالیٰ کا ہے، یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ ”هذا كلام في غاية الظهور لمن وفقه الله للانصاف“ یہ مسئلہ بہت زیادہ واضح ہے لیکن سمجھا سے ہی آسکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انصاف کی توفیق عطاء کرے۔ (کبیر ج ۹ ص ۳۸)

﴿يُخْفُونَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ﴾ وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنے نفسوں میں جو نہیں ظاہر کرتے آپ پر یعنی وہ کفر کو اپنے نفسوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں شک کرتے ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ ٹکٹنے میں اپنی ندامت کو پوشیدہ رکھتے ہیں (خازن)

والفائدة في هذا التبيه ان يكون النبي ﷺ متحرزا عن مكرهم وكيدهم (کبیر ج ۹ ص ۳۸)  
اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ دل میں مخفی رکھتے ہیں جو ظاہر نہیں کرتے، اس سے نبی کریم ﷺ کو خبردار کرنا



مقصود ہے کہ آپ ان کے مکرو فریب سے بچ کر رہیں۔

﴿يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هَهُنَا﴾

”وہ کہتے ہیں اگر ہمیں اس کام میں کچھ (اختیار) حاصل ہوتا تو ہم نہ مارے جاتے یہاں۔“

**سوال:** پہلے جو گزر گیا ﴿يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ اور اب جو بیان کیا جا رہا ہے ﴿يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ ان میں کیا فرق ہے بظاہر تو تکرار نظر آتا ہے۔

**پہلا جواب:** اللہ تعالیٰ نے جب ان کے قول کو بیان فرمایا ﴿يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ (وہ کہتے ہیں کیا ہمیں اس امر میں (اختیار) تھا کچھ) تو رب تعالیٰ نے اس کا جواب دے دیا ﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾ آپ فرمادیں بیشک امر سارا اللہ کا ہے۔ تو اس جواب پر گواہ کہ انہوں نے زاعۃ اضر کر طور پر کہہ لیا کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ



حاصل ہوگی جس کا وعدہ ہمارے ساتھ محمد (ﷺ) نے کیا۔ اور دوسرا قول عبد اللہ بن ابی کا ہے جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس کے قبیحین بھی اس کے ہمنوات تھے، اسی کا راگ الاپ رہے تھے، وہ یہ کہہ رہا تھا ”ان محمدًا لو اطاعنی وما خرج من المدینة ما قتلنا ههنا“ بیشک محمد (ﷺ) اگر میری اطاعت کرتے اور مدینہ سے نہ نکلتے تو یہاں ہمارے اتنے حضرات قتل نہ کئے جاتے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۴۹)

﴿قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ﴾  
فرما دیجئے اگر ہوتے تم اپنے گھروں میں البتہ نکل آتے ”وہ کہ لکھا گیا ان کیلئے قتل ہونا“ اپنے قتل کی جگہ تک۔“

یہ الفاظ مبارکہ جن کا ترجمہ ابھی نقل کیا گیا، اور آنے والے دو جملے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کے جواب میں ارشاد فرمائے جو انہوں نے کہا ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا ههنا﴾ (اگر ہمیں اس امر میں کچھ اختیار) حاصل ہوتا تو ہم قتل نہ کئے جاتے یہاں)

”البراز“ فضاء، بروز حاصل فی برازای فضاء، جب کوئی کملی فضاء میں جائے تو کہا جاتا ہے ”برز“ پھر کبھی یہ خود بخود ظاہر ہونے پر بولا جاتا، اور کبھی ظاہر کرنے کھولنے پر بولا جاتا۔ اور کبھی اللہ کے فضل سے ظاہر ہونے پر، خود بخود ظاہر ہو جیسے ”تسری الارض بارزة“ اور تم دیکھو گے زمین کو کھلا، یعنی اس میں مکانات اور رہنے والے نہیں ہوں گے، اسی معنی کے مناسب ”المبارزة“ ہے، جس کا معنی ہے جنگ کیلئے صف سے باہر نکلنا اور دشمن کے سامنے ظاہر ہونا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ﴾ جب وہ (ایمان والے قوم طالوت) نکلے جالوت اور اس کے لشکر کیلئے۔ ”ظاہر کرنا، کھولنا“ معنی لیتا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ وہ ظاہر ہوں گے اللہ واحد وقہار کیلئے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو مستور و محبوب ہے وہ قیامت کے دن منکشف (ظاہر) ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے لوگوں کو اپنا جلوہ دکھائے گا۔ اب اسی میں دو صورتیں ہیں کہ مومنوں کا رب تعالیٰ کو دیکھنا محمود ہوگا کہ وہ اس پر خوش ہوں گے کہ ہمیں سب نعمت عظمیٰ رب تعالیٰ کی جلوہ گری حاصل ہوگی۔ اور رب تعالیٰ کا اپنے آپ کو کافروں پر منکشف کرنا ان کیلئے غیر محمود ہوگا کیونکہ رب تعالیٰ کا ان پر قہر و غضب ہوگا۔ اور ان پر ناراض ہوگا۔ تیسرا اس نے پاخانہ کیا، یہ مجازی معنی ہے اصل معنی ہے وہ فضاء میں گیا۔ ”امراة برزة“ (بسکون الراء) پاکدامن عورت، یعنی پاکدامنی نے اسے رفعت عطاء کی جو رفعت کی وجہ سے ظاہر



جلوہ گر ہو گئی۔ (ماخوذ از مفردات راغب)

﴿مَضَاجِعُهُمْ﴾ ضجع (ف۔) ضجعا، ضجوعا، پہلو کے بل لیٹنا۔ اضجعه پہلو کے بل لیٹنا، پست کرنا، "ضجعت الشمس سورج کا ڈوبنے کیلئے مائل ہونا" ضجع فی الامر کام میں کوتاہی کرنا۔ "ضاجعه ساتھ لیٹنا مضاجع لیٹنے کی جگہ (النجہ) آیہ کریمہ میں مراد قتل ہونے کی جگہ۔

**مطلب:** ان کو جواب واضح ہے کہ تم جہاں بھی اپنے گھروں میں ہو جن کی تقدیر میں قتل ہونا لکھا گیا ہے انہوں نے اپنے قتل کی جگہ ضرور برسرِ رو پہنچ جاتا ہے۔

"ان الحذر لا يدفع القدر والتدبير لا يقاوم التقدير فالدين قدر الله عليهم القتل لا بد وان يقتلوا على جميع التقديرات"

واضح ہوا کہ بچاؤ کرنا تقدیرِ ثانی نہیں سکتا۔ کوئی تدبیر تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں جن کا قتل ہونا لکھ دیا گیا ہے انہوں نے ضرور ہی قتل ہونا ہے، لہذا وہی خوش قسمت شہید ہوئے جن کی تقدیر میں شہادت لکھ دی گئی تھی۔

"ان الله تعالى لما اخبر انه يقتل فلولم يقتل لانقلب علمه جهلا"

بیشک اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے قتل ہو جانے کی خبر دے دی، اگر وہ قتل نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کا علم جہل سے بدل جائے گا، ایسا کبھی ہو نہیں سکتا کہ معاذ اللہ رب تعالیٰ کو جاہل کہا جائے۔ یہ بھی خیال رہے کہ کسی کا قتل ہو جانا یہ ممکنات میں داخل ہے، ابھی پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ تمام ممکنات کی انتہاء اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے پر ہے "فلولم يوجد لانقلب قدره عجزا و كل ذلك محال" اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کسی کے قتل ہونے کا ہو جائے اور وہ قتل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجز بننا لازم آئے گا، یہ محال ہے۔

**تنبیہ:** کلمہ "كُتِبَ" وجوب کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ میں "تفید وجوب الفعل" وجوب کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ میں "تفید وجوب الفعل" وجوب فعل کا فائدہ دے رہا ہے۔

"وهنا لا يمكن حملها على وجوب الفعل فوجب حملها على وجوب الوجود،"

یہاں اس آیہ کریمہ میں "كُتِبَ" کا معنی وجوب فعل تو نہیں لیا جاسکتا، البتہ وجوب وجود معنی لیا جائے گا۔

(تبیح ج ۹ ص ۳۹)

یہ بھی خیال رہے کہ یہاں "كُتِبَ" کا معنی فرض کرنا نہیں بلکہ "لکھنا" مراد ہے، لیکن لکھنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے



ہوگا اس کا پایا جانا لازم ہوگا۔

﴿قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ﴾ کے مفسرین کرام نے دو مطلب بیان کئے ہیں:

”الاول“ لو جلستم فی بیوتکم لخرج منکم من کتب اللہ علیہم القتال الی مضاجعہم ومصارعہم حتی یوجد ما علم اللہ الہ یوجد“

ان میں سے ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ منافقین کو یہ کہا گیا ہے ”اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھ رہو تو پھر بھی جن لوگوں کا قتل ہو جانا لکھا جا چکا ہے وہ تم میں سے ضرور اپنے قتل کی جگہ پہنچ جائیں گے، اللہ تعالیٰ کے علم میں جس چیز کا پایا جانا لکھا جا چکا ہے اس نے ضرور واقع ہوتا ہے۔

”والثانی“ کانہ قبل للمنافقین لو جلستم فی بیوتکم وتخلفتم عن الجہاد لخرج المؤمنون الدین کتب علیہم قتال الکفار الی مضاجعہم ولم يتخلفوا عن هذه الطاعة بسبب تخلفکم“

ان میں سے دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کو کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو اور جہاد سے پیچھے رہ جاؤ تو مومن جن کی قسمت میں کافروں سے جہاد کرنا اور شہید لکھا جا چکا ہے وہ ضرور اپنے مقام شہادت میں پہنچ جائیں گے، تمہارے پیچھے رہنے کی وجہ سے وہ کبھی اس طاعت سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ (کیرج ۹ ص ۴۹)

﴿وَلَيَبْتَليَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ﴾ ”تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے“

اللہ تعالیٰ نے ان کے قول ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هُنَا﴾ کا دوسرا جواب ہے۔ قوم نے جب یہ گمان کیا کہ جہاد کی طرف لکنا باعث فساد ہے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس میں تو امتحان لینا مقصود تھا، ”فهذه المقاتلة مشتملة على نوعين من المصلحة ان يتميز الموافق من المنافق، وفي

المثل المشهور لا تکرهوا الفتن فانها حصاد المنافقین“

اس جہاد یعنی غزوہ احد میں دو قسم کی مصلحتیں رکھ دی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ خالص مومن رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے والے اور منافقین میں امتیاز ہو جائے، یعنی مؤمنین میں اور زیادہ نکھار آجائے، دوسری مصلحت اس مثال مشہور کے مطابق تھی



”لا تکرهوا الفتن فانها حصاد المنافقین“ فتنوں کو نا پسند نہ سمجھو یہ تو منافقوں کو کاٹ دینے والی تلواریں ہیں۔ (کبیر ج ۹ ص ۴۹)

**اعتراض:** جب پہلے ذکر ہو چکا ہے ﴿ثُمَّ صَرَفْكُمْ عَنْهُمْ لِيَنْتَلِيَكُمْ﴾ (پھر پھیرا تمہیں ان سے تاکہ تمہیں آزمائے) اس کے بعد ﴿وَلِيَنْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ﴾ (تاکہ آزمائے اللہ جو تمہارے سینوں میں ہے) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے اس میں تو تکرار نظر آتا ہے۔ تکرار غیر مستحسن ہے۔ اس کے دو جواب دئے گئے ہیں۔  
**پہلا جواب:** ”الاول لما طال الكلام اعاد ذكره“ جب کلام لمبا ہو جائے تو دوبارہ ذکر کرنا مستحسن ہے۔

**دوسرا جواب:** ”والثاني الابتلاء الاول هزيمة المؤمنين والثاني سائر الاحوال“ پہلی آزمائش جس کا ذکر ہے وہ مؤمنین کا کافروں سے پھر جانا اور پسپا ہو جانے کا ذکر ہے، اور دوسری آزمائش عام احوال میں امتحان لینے کا ذکر ہے۔

﴿وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ﴾ تاکہ کھول کر نکھار دے جو تمہارے دلوں میں ہے۔

”محص“ (ف) محصا. الظبی فی عدوہ ”تیز دوڑنا“ ”المذبوح برجله“ مذبوح کا تڑپنا، بفلان الارض، کسی کا زمین پر پکنا۔ ”فلان من فلان“ بھاگنا۔

”البرق“ بجلی کا چمکنا ”الله مابك“ زائل کرنا، ”محص الشئ“ ہر عیب سے پاک کرنا۔ محص (تفعیل) الشئ، کم کرنا۔

”اللحم“ گوشت کو پھٹے سے صاف کرنا۔ محص الرجل (بصب اللام) کسی کو آزمانا (المنجد) آیت کریمہ میں ایک معنی تو یہی ہے جو راقم نے ذکر کیا، البتہ مرادی مطلب یوں بھی بیان کیا گیا ہے، ﴿وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ﴾ ”فالتمجیص ههنا كالتزكية والتطهير، تمجیص“ کا یہاں معنی پاک کرنا، صاف کرنا۔ اب ترجمہ یوں ہوگا تاکہ پاک کرے، صاف کرے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ (مفردات راغب)

یہاں دو وجہ ذکر کی گئیں ہیں۔

”احدهما ان هذه الواقعة تمحص قلوبكم عن الوسوس والشبهات“

ایک یہ کہ واقعہ غزوہ احد کا اس لئے پیش آیا تاکہ تمہارے دلوں کو وسوسوں اور شبہات سے پاک و صاف کر دے، تاکہ تم میں نکھار آجائے۔



”والثانی انها تصیر كفارة لذنوبکم فتمحصکم عن تبعات المعاصی والسیات“

اور دوسری وجہ یہ ہے غزوہ احد میں تمہیں مصائب سے آزمایا گیا تاکہ وہ تمہاری لغزشوں کا کفارہ بن جائے اور تمہیں معاصی اور خطاؤں کے پیچھے پڑنے سے ہٹا کر صاف و ستھرا کر دے۔ (کبیر ج ۹ ص ۵۰)

﴿وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ ”اور اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو۔“

ایک چیز جب دوسری مصاحب ہو اور مذکر ہو تو اس کیلئے بولتے ہیں ذوالشیء اور جب مؤنث ہو تو اس کیلئے بولتے ہیں ﴿بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو سینوں میں موجود ہیں۔ ”وہی الاسرار والضمائر“ یہ اسرار اور دل میں چھپی چیزیں ہیں۔ رب تعالیٰ نے یہ ذکر فرما کر ﴿وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (اور اللہ جانتا ہے سینوں کی باتوں کو یعنی سینوں میں بند راز اور چھپی ہوئی باتوں کو وہ جانتا ہے) یہ واضح کر دیا کہ

”ان ابتلاہ لم یکن لانه ینخفی علیہ مافی الصدور او غیر ذلک لانه عالم بجمیع

المعلومات وانما ابتلاءہم اما لمحض الالہیة اوللا ستصلاح“

رب تعالیٰ نے بندوں کا امتحان اس لئے نہیں لیا کہ وہ ان کے سینوں کی چھپی باتوں کو نہیں جانتا، یا اس پر کوئی راز وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ وہ تو تمام معلومات کو جانتا ہے، اس کے امتحان لینے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اسی کو خالص معبود سمجھیں، اور لوگ اپنی اصلاح کر لیں، اور ان کا آزمائش میں پورا اترنا دوسروں پر بھی واضح ہو جائے، ان کا کمال اور ان کے مدارج کی بلندی نکھر کر سامنے آجائے۔ (کبیر بمع وضاحت ج ۹ ص ۵۰)

”سُبْحَانَ اللّٰهِ“ کیا شان ہے صحابہ کرام کی جن کو رب تعالیٰ نے آزمائش میں کامیاب کر کے ان کے درجات کی بلندی کو واضح کر دیا۔

فائدہ: ”وَلِيَبْتَلِيَ“ اور ”وَلِيَمْحَصَ“ ذکر فرما کر یہ واضح کر دیا ”ان اللہ فرض علیکم القتال ولم ینصرکم یوم أحد لیختبر صبرکم ولیمحص عنکم سیاتکم ان تبتم واخلصتم“ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۳۲)

کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جہاد فرض کیا، ایک مرتبہ امداد فرمانے کے بعد دوبارہ امداد نہیں فرمائی تاکہ تمہارے صبر کی آزمائش ہو جائے، اور اگر تم رب تعالیٰ کی طرف رجوع کر لو اور خلوص پیدا کر لو تو اللہ تعالیٰ تمہاری لغزشوں کو دور فرما دے۔

موت کی جگہ کو مرنے والا ضرور پہنچ جاتا ہے:



روایت بیان کی گئی کہ بیشک ملک الموت (موت کا فرشتہ عزرائیل) حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہوا، مجلس میں ایک شخص کو ڈراؤنی نظر سے دیکھا، جب ملک الموت اٹھ کر چلا گیا، تو اس شخص نے پوچھا یہ کون تھا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بتایا کہ یہ ملک الموت تھا۔

”قال ارسلنی مع الريح الى عالم آخر فانی رأیت منه مرأی هائلا“ تو اس شخص نے کہا کہ آپ ہوا کو حکم دیں جو مجھے کہیں دور علاقہ میں پہنچا دے کیونکہ میں نے اس کی بڑی ڈراؤنی نظر کو دیکھا، یعنی وہ مجھے بہت گھور گھور کر دیکھ رہا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا کہ اس شخص کو کہیں دور جگہ میں پہنچا دو ہوانے آپ کے حکم کے مطابق اسے دور پہنچا دیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا کہ ملک الموت فرشتہ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، اور کہنے لگا کہ مجھے رب تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ فلاں جگہ فلاں وقت اس شخص کا روح قبض کر لو، میں نے اسے آپ کے پاس بیٹھے خیال کیا کہ یہ شخص وہاں اتنا جلدی کیسے پہنچے گا۔

”وقدارسلته بالريح الى ذلك المكان فوجدته هناك قضی امر الله عز وجل فی زمانه ومكانه من غیرا خلل بشی من ذلك“

تحقیق ہوانے اسے اس مقرر جگہ پر پہنچا دیا، میں نے اسے وہاں پایا تو اس کے روح کو قبض کر لیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وقت مقرر اور مکان مقرر میں اسے پورا کر لیا گیا، اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

(تفسیر ابی السعود ج ۱ ص ۱۰۲)





إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (آیہ نمبر ۱۵۵)

(۱) بیشک وہ جو تم میں سے پھر گئے جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں انہیں شیطان نے ہی لغزش دی ان کے بعض اعمال کے باعث اور بیشک اللہ نے انہیں معاف فرما دیا، بے شک اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) بیشک وہ جو پھر گئے تم میں سے بعض جس دن ملے دو لشکر، بیشک پھسلا یا ان کو شیطان نے ہی، بوجہ بعض ان کے کسب کے، اور البتہ تحقیق معاف کر دیا اللہ نے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا، بردبار ہے۔ (نجوم الفرقان)

”تَسْكِينُ الْجَنَانِ فِي مَحَاسِنِ كُنْزِ الْإِيمَانِ“ کا ایک ورق:

راقم نے تراجم کا جو مقابل جائزہ پیش کیا اسے دیکھئے

﴿بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا﴾

(محمود الحسن صاحب)	ان کے گناہ کی شامت سے
(عبد الماجد صاحب)	ان کے بعض کرتوتوں کے سبب
(شاہ عبدالقادر صاحب)	کچھ ان کے گناہ کی شامت سے
(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)	ان کے بعض اعمال کے باعث

جنگ احد میں نبی کریم ﷺ نے ایک درہ میں صحابہ کرام کی ایک جماعت کو کھڑا کیا کہ تم نے یہاں ہی کھڑے رہنا ہے، جب صحابہ کرام کو فتح حاصل ہوئی تو وہ جماعت بھی اس جگہ کو چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے کیلئے دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شریک ہو گئے، یہ صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی، ان کا خیال یہ تھا کہ شاید فتح تک ٹھہرنے کا ہمیں حکم دیا گیا، نبی کریم ﷺ کی اجازت کا انتظار نہ کرنے کی وجہ سے آزمائش میں آ گئے، اسی درہ سے کفار نے حملہ کر دیا، صحابہ کرام کو تکلیف پہنچی، اسی درہ کو چھوڑنے کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا﴾ ان کے بعض اعمال کی وجہ سے



شیطان نے انہیں پھسلا دیا، پھر بیشک اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا، اسی مقصد کو اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے صحابہ کرام کے ادب کا لحاظ کرتے ہوئے ”ان کے بعض اعمال کے باعث“ ترجمہ کیا۔

راقم نے لفظی ترجمہ کیا ”بوجہ بعض ان کے کسب کے“ ”ان کے بعض اعمال کی سامت سے“ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ نہیں کیا جس میں گناہ کی نسبت صراحت صحابہ کرام کی طرف ہو، لطف کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ ”اے محبوب“ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے، تو یہاں ”گناہ“ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

(سکین البجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۹۳)

یہ بھی خیال رہے کہ عبدالماجد صاحب کا ترجمہ ”ان کے بعض کرتوتوں کے سبب“ اور ہی زیادہ سنگین ہے۔ مختصر مطلب تسکین البجنان کی عبارت سے واضح ہو رہا ہے، دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ﴾

”بیشک وہ جو پھر گئے تم میں سے بعض جس دن ملے دو لشکر“

”ہذا خطاب للمؤمنين خاصة يعني الذين انهزموا يوم احد“ یہ خطاب ہے مؤمنین کو خاص کر کے یعنی وہ حضرات جو احد کے دن پسپا ہو گئے تھے۔ ”مِنْكُمْ“ میں ”مِنْ“ جمعیت ہے۔ جس کا معنی ہے بعض ”یعنی وہ جو تم میں سے پھر گئے بعض جس دن دو لشکر ملے ایک لشکر نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا اور ایک لشکر ابوسفیان کے ساتھ تھا، نبی کریم ﷺ کا لشکر سات سو افراد پر مشتمل تھا۔ اور ابوسفیان کا لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

”فذكر محمد بن اسحاق ان ثلث الناس كانوا مجروحين وثلثهم انهزموا وثلثهم ثبتوا“

محمد بن اسحاق نے بیان فرمایا ہے کہ مؤمنین کا تیسرا حصہ زخمی ہو گیا، یقیناً یہ لوگ وہی تھے جا ثابت قدم رہے اور تیسرا حصہ پسپا ہو گئے یعنی ادھر ادھر بکھر گئے، اور تیسرا حصہ ثابت قدم رہے، یہ وہ تھے جو زخمی نہیں تھے۔

قال القفال والذي تدل عليه الاخبار في الجملة ان نفرا منهم تولوا وابتعدوا فمهم من دخل المدينة ومنهم من ذهب الى سائر الجوارح اما الاكثرون فانهم نزلوا عند الجبل واجتمعوا هناك

قفال کہتے ہیں کہ مختلف اخبار سے مسئلہ یوں واضح ہوا کہ جو لوگ پسپا ہونے والے یعنی ادھر ادھر بکھر جانے والے تھے ان میں سے بعض وہ تھے جو دور چلے گئے تھے، اور بعض وہ تھے جو مدینہ میں داخل ہو گئے تھے، یہ بھی خیال رہے کہ احد اس وقت مدینہ طیبہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر تھا، اب مکانات اور سڑکوں کی وجہ سے مسافت زیادہ



نظر آتی ہے۔ مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے جانے والے سعد بن عثمان تھے۔ بعد میں کچھ اور حضرات بھی مدینہ طیبہ میں داخل ہو گئے۔ اور بعض ان میں سے وہ تھے جو میدان کی اطراف میں ادھر ادھر بکھر گئے لیکن وہ زیادہ دور نہیں گئے۔ اور ان میں اکثر حضرات وہ تھے جو میدان سے تو اگر چہ ہٹ گئے تھے لیکن وہاں ہی پہاڑ کے دامن میں جمع ہو گئے تھے۔ جو لوگ میدان جنگ میں ثابت رہنے والے تھے، ان میں سے وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرنے والے اور آپ کے ارد گرد جمع ہونے اور ثابت قدم رہنے والے چودہ تھے جن کے اسماء گرامی پہلے ذکر کئے جا چکے ہیں۔

”ومن المنهزمین عمر، الا انه لم یکن فی اوائل المنهزمین ولم یعد بل ثبت علی الجبل

الی ان صعد النبی ﷺ

”جو لوگ میدان سے ہٹ جانے والے تھے، ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے، لیکن آپ جلدی میدان سے نہیں ہٹے تھے بلکہ کچھ دیر کے بعد میدان سے ہٹ کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ بھی

پہاڑ پر چڑھ گئے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۵۹)

**مقام توجہ:** کل تعداد احد میں صحابہ کرام کی سات سو تھی۔ کل شہید ستر تھے۔ جن میں دس درہ میں قائم رہنے

والے، ساتھ اور ثابت قدم رہنے والے بھی تھے۔ باقی چھ سو میں سے دوسو تقریباً ثابت قدم رہنے والے، اور دوسو ثابت قدم رہنے کی وجہ سے زخمی ہو گئے، کل ثابت رہنے والے چار سو نوے تھے اور ثابت قدم نہ رہنے والے، دائیں بائیں بکھر جانے والے دوسو تھے، ان میں سے بھی زیادہ پہاڑ کے پاس اپنا بچاؤ کر رہے تھے اور وہیں جمع تھے، اور ان میں ہی چالیس حضرات وہ تھے جو درہ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو گئے تھے۔ (راقم)

”ومن المهزمین کان عثمان انهم مع رجلین من الانصار یقال لهما سعد وعقبه“ جو

لوگ ادھر ادھر بکھر جانے والے تھے ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے جو انصار میں سے

دو حضرات، سعد اور عقبہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ کچھ دور ہی چلے گئے تھے۔ (کبیر ج ۹ ص ۵۰)

**تنبیہ:** حضرت عثمانؓ سے تعصب رکھنے والے شخص کو خاموش کر دینے والا جواب حضرت ابن عمرؓ کا

پہلے بخاری کے حوالہ سے تعبیر کیا جا چکا ہے، شاید ان کا جواب حضرت عثمانؓ کے اپنے جواب سے ہی ماخوذ

تھا، آئیے حضرت عثمانؓ کا حضرت عبدالرحمن بن عوف کو جواب دیکھئے۔

ذکر ابواللیث سمرقندی بالاسناد عن جریر ان عثمان کان بینہ و بین عبد الرحمن

کلام فقال له عبد الرحمن بن عوف اتسبني وقد شهدت بدرا ولم تشهد وقد بايعت

تحت الشجرة ولم تبایع وقد كنت تولي مع تولي يوم الجمع يعني يوم احد، فرد عليه



عثمان فقال اما قولك انا شهدت بدرا ولم تشهد فاني لم اغب عن شئ شهدته رسول الله ﷺ الا ان بنت رسول الله ﷺ كانت مريضة و كنت معها امرضا فضرب لي رسول الله ﷺ سهمافي سهام المسلمين واما بيعة الشجرة فان رسول الله ﷺ بعثني ربيثة على المشركين بمكة (الربيثة هو الناظر) فضرب رسول الله ﷺ يمينه على شماله فقال هذه لعثمان فيمين رسول الله ﷺ و شماله خير لي من يميني و شمالي و اما يوم الجمع فقال الله تعالى "ولقد عفا الله عنهم" فكانت فيمن عفا الله عنهم فحج عثمان عبدالرحمن

(قرطبي ج ۳ ص ۲۴۴)

جریر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف کے درمیان سخت کلامی ہو گئی تو ان کو عبدالرحمن بن عوف کہنے لگے تم میرے ساتھ سخت کلام کرتے ہو حالانکہ میں بدر میں موجود تھا تم نہیں تھے، پھر میں نے (کیکر کے) درخت کے نیچے بیعت کی تم نے نہیں کی، اور تم اس دن پھر گئے تھے جس دن دو لشکر جمع ہوئے، حضرت عثمان نے ان کو جواب دیا، کہ جو تم نے میرے بدر میں حاضر نہ ہونے کی بات کی اس کے متعلق بات یہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ سے کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا، مگر بدر میں مجھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کی بیماری پر ان کی دیکھ بھال کیلئے مدینہ طیبہ میں چھوڑ دیا تھا، میں ان کی دیکھ بھال کرتا رہا، نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے مال غنیمت کے حصہ میں میرا حصہ بھی رکھا، جہاں تک درخت کے نیچے بیعت کے متعلق تم نے جو بیان کیا ہے کہ میں اس میں حاضر نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے مکہ میں کفار کے ساتھ گفت شنید کیلئے بھیجا "ربيثة کا اصل معنی ہے "جاسوس دشمن کے حالات کو دیکھنے والا" (لیکن یہاں معنی گفت شنید ہے) تو نبی کریم ﷺ نے اپنے ہی دائیں ہاتھ کو بائیں پر مارا پھر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے، (یعنی اپنے ہی ہاتھ کو میرا ہاتھ قرار دیا) میرے اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ سے میرے لئے نبی کریم ﷺ کا دائیاں اور بائیاں ہاتھ بہتر ہیں۔ جہاں تک دو لشکروں کے جمع ہونے کے دن تم نے ہمارے پسپا ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں معاف کر دینے کا اعلان فرمادیا۔ ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ﴾ "اور تحقیق اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے۔" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر غالب آ گئے اور ان کو خاموش کر دیا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ "بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔"

﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ﴾ للذنوب صفائرها و کبائرہا (حلیم) لا يعاجل بعقوبة المذنب "بیشک اللہ تعالیٰ صفائز اور کبائر گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ اسلئے وہ غفور ہے۔ اور کسی گنہگار کو جلدی عذاب نہیں دیتا بلکہ توبہ کا موقع



دیتا ہے، اسلئے وہ حلیم ہے۔ ”وقد جاءت هذه الجملة كالتعليل للعفو عن هؤلاء المتولين“ اور تحقیق یہ جملہ علت و سبب کے درجہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھر جانے والوں کو معاف فرمادیا ہے کیونکہ وہ ”غفور“ ہے، اور ”حلیم“ ہے، (روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)

**فائدہ جلیلہ:** ”لا تعير بعد عفو الله تعالى عن الجميع، ونحن لا ندعى العصمة في الصحابة ولا نشترطها في الخلافة“

اللہ تعالیٰ نے جب پھر جانے والے تمام صحابہ کرام کو معاف کر دیا تو اب کسی صاحب کے فعل کو عار بنانا جائز نہیں۔ اور ہمارا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ تمام صحابہ کرام معصوم تھے، اور نہ ہی ہمارے نزدیک کسی صحابی کے خلیفہ بننے کیلئے معصوم ہونا شرط ہے۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)

حضرت عمرؓ کے پہاڑ میں چڑھ جانے میں تو کئی احتمال ہیں، ایک احتمال یہ ہے کہ نبی کریمؐ کو پہاڑ پر چڑھ جانے کی ترغیب دلائی مقصود ہو کہ آپؐ بھی پہاڑ پر آجائیں، یہاں سے کفار پر حملہ بھی آسان ہے اور دفاع بھی آسان، اگر یہ احتمال ہو تو یہ ثابت قدمی کی اعلیٰ مثال ہے، راقم کے نزدیک یہی احتمال قوی ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپؐ بھی پسپا ہونے والوں میں تھے اس لئے پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، یا بالفرض شیعہ کی بات کو تسلیم کیا جائے کہ آپؐ دور چلے گئے تھے، کسی صورت میں بھی آپؐ پر اعتراض کرنا اور عار دلانا جائز نہیں، اسلئے کہ رب تعالیٰ نے جب معاف کر دیا تو دوسرے کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس میں اعتراض کرتا ہے، اور یہ وجہ آپؐ کے خلافت کے حقدار نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ (راقم)

**صحابہ کرام کا پھر جانا کون سا گناہ تھا؟**

بعض حضرات نے تو یہ بیان کیا ہے کہ کبیرہ گناہ تھا، صحابہ کرام نے توبہ کر لی تھی اسلئے رب تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ لیکن راقم کو قرطبی رحمہ اللہ کی بحث پسند آئی کہ صحابہ کرام کا پھرنا گناہ نہیں تھا، لیکن نبی کریمؐ کے ثابت قدم رہنے کے باوجود آپؐ کو چھوڑنا بہت بڑی غلطی تھی، آئیے عجیب بحث آپؐ بھی دیکھیں، ”وقيل لم يكن الانهزام معصية لانهم ارادوا التحصن بالمدينة“ ایک قول یہ ہے کہ صحابہ کرام کا میدان کو چھوڑنا کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں قلعہ بند ہو کر دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملا دیں گے، دشمن کو تہس نہس کر دیں گے، اصل وجہ ان کی احد کے مقام کو چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریمؐ کی شہادت کی خبر نے ان کے ہوش اڑائے تھے، وہ یہ سمجھنے لگے کہ اب یہاں ٹھہرنے کا کیا مقصد، دشمن کے ارادوں کو ختم کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ جب نبی کریمؐ شہید ہو گئے تو یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں گے۔ ”ويجوز ان يقال لم يسمعوا



دعاء النبی ﷺ للہول الذی کانوا فیہ "بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو صحابہ کرام کو بلا رہے تھے تو انہوں نے آپ کی شہادت کی خبر پر کیسے اعتبار کر لیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ شدید ہولنا کی چھا گئی تھی، کیونکہ جب درہ والے حضرات نے درہ کو چھوڑا اور کافروں نے اچانک حملہ کیا تو اس وقت صحابہ کرام اس شدت میں نبی کریم ﷺ کی آواز نہ سن سکے، "ویجوز ان یقال زاد عدد العدو علی الضعف لانہم کانوا سبع مائۃ والعدد ثلاثۃ آلاف" اس عبارت کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ابتدائی دور میں صحابہ کرام پر ایک کدوس سے جنگ کرنا لازم تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس میں آسانی پیدا کرنے کیلئے ارشاد فرمایا۔

﴿الَّذِينَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ﴾

(الأنفال آیت نمبر ۶۲)

"اب اللہ نے تم پر سے تخفیف فرمائی اور اسے معلوم ہے کہ تم کمزور ہو تو اگر تم میں سو صبر والے ہوں دو سو پر غالب آئیں گے" اس تخفیف کے بعد ایک صحابی کا دو کافروں کے مقابل ثابت قدم رہنا ضروری ہو گیا، اس سے زیادہ مقدار کے سامنے کھڑا ہونا لازم نہیں تھا، غزوہ احد اسی وقت درپیش آیا جب یہ آیت کریمہ نازل ہو چکی تھی، اس میں دشمن کی تعداد چار گنا سے بھی زائد تھی کیونکہ صحابہ کرام سات سو تھے اور کافر تین ہزار تھے، یہ تعداد دو گنا ہوتی تو پھر صحابہ کرام پر طعن ممکن تھا، جب رب تعالیٰ نے خود تخفیف فرمائی تو صحابہ کرام کا چار گنا سے زائد کے مقابل ثابت قدم نہ رہنا جائز تھا،

**تنبیہ شدید:**

لكن الانهزام عن النبی ﷺ خطأ لا یجوز ولعلہم توہموا ان النبی ﷺ انحاز الی الجبل ایضا

(قرطبی ج ۲ ص ۲۴۲)

نبی کریم ﷺ کے متعلق یہ کہنا کہ آپ بھی اپنی جگہ کو چھوڑ کر ہٹا ہو گئے تھے یہ جائز نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا پہاڑ پر چڑھنا بھی وہم ہی ہو سکتا ہے حقیقت نہیں، اگرچہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہاڑ پر چڑھنا ثابت کیا ہے اگر وہ ثابت ہو جائے تو اس کا وہی مطلب ہو سکتا ہے جو راقم نے بیان کیا ہے کہ زیادہ دفاع مقصود تھا، لیکن علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا قول زیادہ رائج نظر آتا ہے کیونکہ احادیث کی شروح سے یہی ثابت کہ آپ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، (واللہ اعلم بالصواب)





يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ  
أَوْ كَانُوا غُزًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَاقُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي  
قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (آیہ نمبر ۱۵۶)

- (۱) اے ایمان والو! ان کافروں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے کہا ہے اپنے بھائیوں کی نسبت جب وہ سفر یا جہاد کو گئے کہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اس لئے کہ اللہ ان کے دلوں میں اس کا افسوس رکھے اور اللہ جلاتا اور مارتا ہے اور تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔ (کنز الایمان)
- (۲) اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا، اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق جب سفر کیا انہوں نے زمین میں، یا وہ ہوئے جہاد کرنے والے، اگر وہ ہوتے ہمارے پاس نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، تاکہ بنائے اللہ اسے حسرت ان کے دلوں میں، اور اللہ ہی زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے، اور اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔ (نجوم الفرقان)

### شان نزول و مختصر مطلب:

منافقین ایمان والوں کو کافروں کے ساتھ جہاد کرنے پر عار دلاتے اور شہید ہونے والوں کے متعلق کہتے ﴿لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَاقُتِلُوا﴾ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، ان کے اس کہنے پر بعض نئے ایمان قبول کرنے والوں کے دلوں میں سستی آ جاتی اور ان کے دلوں میں ضعف آ جاتا احد میں جب ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے تو مومنوں کو منع کیا کہ کہیں تم بھی یہ نہ کہتے رہنا کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، کافروں کے اس قول اور باطل گمان کو رب تعالیٰ نے ان کے دلوں میں حسرت بنا دیا ہے، حالانکہ موت کا وقت مقرر ہے رب تعالیٰ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، موت کے وقت آنے پر موت نے ضرور آنا ہے خواہ جنگ میں ہو یا گھر میں اور جب تک اس کی زندگی ہے اس نے ضرور زندہ رہنا ہے خواہ گھر میں ہو یا میدان جنگ میں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)



﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ اے ایمان والو! نہ ہو ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا۔

یہاں کافروں سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں، زیادہ مفسرین کرام نے ﴿الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ سے مراد منافقین لیا ہے کہ یہ قول عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔ دوسرا قول علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا ہے:

”وقيل المراد بالذين كفروا سائر الكفار على العموم اى لا تكونوا كالكفرة فى نفس الامر“ (روح المعانى ج ۳ ص ۹۹)

کہ اس سے مراد تمام کافر ہیں علی العموم یعنی جو لوگ حقیقت میں کافر ہیں، ان کی طرح نہ ہو، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ”الَّذِينَ“ موصول کو عہد خارجی کے درجہ میں رکھ کر خاص منافقین مراد لئے ہیں، اسی لئے آپ نے ترجمہ کیا ”اے ایمان والو! ان کافروں کی طرح نہ ہونا۔“ (کنز الایمان)

لیکن راقم نے طلباء کرام کے فائدہ کیلئے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے تا کہ طلباء کرام کو دوسری شق کا بھی پتہ چل جائے، راقم نے ترجمہ کیا اے ایمان والو! نہ ہو ان کی طرح جنہوں نے کفر کیا۔ (نجوم الفرقان) یہ ترجمہ تو لفظوں کے مطابق ہے، اگر مختصر کر کے با محاورہ ترجمہ کریں تو راقم کا ترجمہ یوں ہوگا، ”اے ایمان والو! نہ ہو کافروں کی طرح“

﴿وَقَالُوا لَا خَوَانِيهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا﴾

”اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، جب سفر کیا انہوں نے یا ہوئے جہاد کرنے والے، اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو وہ نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے۔“

﴿وَقَالُوا لَا خَوَانِيهِمْ﴾ ”فی النفاق والكفر وقيل فى النسب“ ان کے بھائیوں سے مراد ان کے ہم عقیدہ لوگ ہیں جو منافقت اور کفر میں ان کے مشایہ تھے، یا ان کے نسبی بھائی تھے۔

تنبیہ: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے، جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کی نسبت (کنز الایمان)



راقم نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور انہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے متعلق، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ روح المعانی کی اس عبارت کے مطابق ہے ”واللام تعلیلۃ ای قالوا لأجلهم وجعلها ابن حاجب بمعنی ”عن“ لاخوانہم“ میں لام تعلیلیہ ہے، یعنی انہوں نے اپنے بھائیوں کے قتل (شہید) ہونے کی وجہ سے یہ کہا۔ اور علامہ ابن حاجب نے کہا ہے کہ لام بمعنی عن ہے۔ اس کے مطابق بھی یہی ترجمہ ہوگا ”اور انہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا“ طلباء کرام خصوصی توجہ اس بات کی طرف رکھیں کہ یہ بحث لام کے متعلق جواب بھی تک بیان کی ہے اس کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ان کے بھائی نسبی مراد ہیں، ہم عقیدہ نہیں۔ ان کے نسبی بھائی یعنی ان کے خاندان کے لوگ جو خلوص سے ایمان لے آئے تھے اور شہید ہو گئے تھے، ان کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ کیونکہ ان کے ہم عقیدہ منافقین شہید نہیں ہوئے۔

اور جب لا کو زائد مانا جائے جیسے ”ردف لکم“ میں لام زائد ہے اس کا مطلب ہے ”ردفکم“ اسی طرح جب یہاں معنی یوں کیا جائے ﴿وَقَالُوا لِأَخْوَانِهِمْ﴾ ”اور کہا انہوں نے اپنے بھائیوں کو“ اس صورت میں ان کے نسبی بھائی اور ہم عقیدہ بھائی دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نسبی اور اپنے ہم عقیدہ بھائیوں کو یہ کہا وہ زمین میں سفر کرنے والے اور غزوہ میں جانے والے اگر ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔

دینی طلباء کرام کی خصوصی توجہ کیلئے:

❁ ”فان واذا للشرط فی الاستقبال لكن اصل ان علم الجزم بوقوع الشرط واصل اذا الجزم“  
ان اور اذا دونوں ہی مستقبل میں شرط کیلئے آتے ہیں۔ لیکن ”ان“ اصل میں یہ ہے کہ اس میں جزم نہیں پایا جاتا بلکہ شک پایا جاتا ہے۔ یہ اس کا حقیقی معنی ہے، لیکن مجازی معنی کے لحاظ پر بھی جزم کیلئے بھی آتا ہے۔ اس میں کافی تفصیل ہے۔

❁ ”ولان اصل اذا الجزم بالوقوع غلب لفظ الماضي لدلالته على الوقوع قطعاً نظراً الى نفس اللفظ وان نقل ههنا الى معنى الاستقبال مع اذا“  
اور ”اذا“ میں اصل میں جزم پایا جاتا ہے کہ اس نے واقع ہونا ہی ہے۔ پھر اذا کے ساتھ غالباً لفظ ماضی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ یقینی وقوع پر دلالت کرے۔

❁ ”واذا جی بھا ای بان فی مقام التاکید بعد واو الحال لمجرد الوصل والربط دون الشرط نحو زید وان کثر ماله بخیل ولی غیر ذلک ای غیر المستقبل قليلاً مع کونها للشرط“



اور اذا مقام تاکید میں واؤ حالیہ کے بعد صرف وصل اور ربط کیلئے آتا ہے اس میں شرط کا معنی نہیں پایا جاتا، جیسے کہا جاتا ہے "زید وان کثر ماله بخیل زید اگرچہ کثیر مال رکھتا ہے لیکن بخیل ہے۔ اور اذا کا استعمال مستقبل کے بغیر بھی قلیل طور پر آتا رہتا ہے۔ (ماخوذ از تلخیص المفتاح و روح المعانی و تجرید)

اب اس تمہید کے بعد زیر بحث آیہ کریمہ میں دیکھیں کہ "اِذَا ضَرَبُوا" میں اذا استعمال ہے، یہاں کون سا معنی لیا جائے، اس مقام پر تفسیر مظہری میں زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ یہ حال کے معنی میں استعمال ہے، مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو نہ ہو کافروں کی طرح جب وہ اپنے بھائیوں کو کہتے ہیں کہ وہ سفر کرتے یا غزوہ کیلئے جاتے کہ وہ جو پہلے سفر میں اور غزوہ میں گئے وہ مر گئے یا مارے گئے اگر وہ نہ جاتے اور ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، اس مقام پر روح المعانی میں اذا کے متعلق بہت طویل بحث کی گئی ہے، لیکن تفسیر ابی السعود نے مختصر اور خوبصورت انداز پر مسئلہ کا حل پیش کیا،

❦ "وایشار اذا المفیدۃ لمعنی الاستقبال علی اذا المفیدۃ لمعنی الماضی لحکایۃ الحال الماضیۃ قال الزجاج اذا ههنا تنوب عما مضی من الزمان وما یستقبل یعنی انها لمجرد الوقت او یقصد بها الاستمرار"

یہاں اذا کا استعمال کیا گیا ہے حالانکہ اذا ماضی کیلئے آتا ہے، اذا پر اذا کو ترجیح اسلئے دی گئی ہے کہ یہ حال ماضیہ کی حکایت کیلئے آیا ہوا ہے زجاج نے بیان کیا ہے کہ یہ ماضی کے معنی کیلئے ہو یا استقبال کیلئے ہو یہاں مطلقاً وقت کیلئے استعمال ہے۔ یا استمرار کا ارادہ کیا گیا ہے، اس تفصیل کے بعد مندرجہ ذیل معانی کئے جاسکتے ہیں۔ "جب ماضی میں وہ کہتے رہے" جب ماضی میں انہوں نے کہا۔ ہمیشہ ان کا بھائیوں کو یہی کہنا رہا۔

﴿اِذَا ضَرَبُوا فِی الْاَرْضِ﴾ "جب انہوں نے سفر کیا زمین میں۔"

(ای سافروا فیہا للتجارة او طلب معاش فماتوا) یعنی تجارت کیلئے یا اور مقاصد کیلئے وہ گھر سے دوسرے علاقہ میں سفر کر کے گئے، اور فوت ہو گئے، "اصل الضرب ایقاع شیء علی شیء" ضرب کا حقیقی معنی ایک چیز کا دوسری چیز پر واقع ہونا۔ زمین پر چلنے پر بھی "ضرب" کا اطلاق اسی لئے ہے کہ انسان اپنا پاؤں زمین پر مارتا ہے، "ثم صار حقيقة فیہ" پھر اس معنی کو بھی بطور حقیقت سمجھ لیا گیا۔ زمین کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اکثر سفران کے خشکی کے ہوتے تھے، "وقیل المراد من الارض ما یشمل البر والبحر" بعض حضرات نے بیان کیا کہ زمین سے مراد عام ہے جو خشکی اور تری دونوں کو شامل ہے۔ (راقم کو یہی معنی بہتر نظر آتا ہے)

(روح المعانی ج ۳ ص ۹۹)



﴿أَوْ كَانُوا غُزًى﴾ ”یا ہوئے جہاد کرنے والے۔“

”غزی جمع غاز كالقول والركع والسجد جمع قائل وراكع وساجد“ غزی جمع ہے غاز کی جس طرح قول جمع ہے قائل کی، اور رکع جمع ہے راکع کی اور سجد جمع ہے ساجد کی۔ غازی کی جمع غزاة بھی آتی ہے، جس طرح قاض کی قضاة اور رامی کی رماة جمع آتی ہے۔ الغزو کا کلام عرب میں اطلاق ”دشمن کے قصد کرنے پر ہوتا ہے۔ مغزی کا معنی مقصد۔“ (کبیر ج ۹ ص ۵۵)

”غزی“ بتشديد الزاء وقرأ الحسن والزهری بتخفيف الزای“ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۳۶)

”غزی“ میں زاء پر شد ہے، البتہ حسن بصری رحمہ اللہ علیہ اور زہری رحمہ اللہ نے زاء کو مخفف کر کے پڑھا ہے۔

﴿لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا﴾

”اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے۔“

کافروں کا یہ کلام کن لوگوں کے متعلق تھا؟ جمہور حضرات نے تو یہ کہا کہ انہوں نے یہ کلام احد کے شہداء کے متعلق کیا، لیکن بکر بن ہبل دمیاطی نے بیان کیا ہے کہ ان کا یہ قول ”سریہ بیوم معونة“ میں ستر قراء شہید ہونے والوں کے متعلق تھا۔ ”وما قتلوا“ میں تاء مخفف ہے۔ البتہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے تشدید سے پڑھا ہے البتہ کثرت والا معنی کثیر مقامات کے لحاظ پر ہوگا، کثیر مقامات میں کثیر لوگ مرنے والے اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، ایک محل میں مرنے والوں کے متعلق ان کا کلام نہیں تھا ”لانه لا يمكن التكثير فيه“ کیونکہ ایک محل میں کثرت کا اس وقت پایا جانا ممکن نہیں۔ (البحر المحیط ج ۳ ص ۱۳۶)

تفسیر کبیر کی عظمت دینی طلباء کیلئے:

اذا کے متعلق مختصر بحث جو پہلے ذکر کی ہے اس کے متعلق ایک اور رخ سے انہوں نے ایک اعتراض اور اس کے تین جواب دئے ہیں، جس سے تفسیر کبیر کی عظمت سمجھ آئیگی، باقی آپ کے خوشہ چین ہیں۔

اعتراض: ”وَقَالُوا لِأَخْوَانِهِمْ“ ماضی پر دلالت کر رہا ہے ”إِذَا ضَرَبُوا“ مستقبل پر دلالت کر رہا ہے (کیونکہ) ”إِذَا“ استقبال کیلئے آتا ہے ”فكيف الجمع بينهما“ ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرنا کیسے صحیح ہے؟ اگر ”إِذَا“ کی جگہ ”إِذْ“ آتا تو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ”إِذْ“ ماضی کیلئے آتا رہتا ہے۔

پہلا جواب: ”قَالُوا“ مجازی طور پر مستقبل کیلئے استعمال ہے، گویا کہ عبارت کا مطلب یوں ہو گیا



”لا تكونوا كالذين كفروا ويقولون لآخوانهم كذا و كذا“ نہ ہو جاؤ ان کافروں کی طرح جو اپنے بھائیوں کو اس طرح کہیں گے۔ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنے کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ جب کسی چیز کا مستقبل میں پایا جاتا لازمی ہو اس وقت اسے ماضی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ ”اتى امر الله“ فصعق من فى السماوات“ ان دونوں جگہ ماضی کے صیغے استقبال کیلئے استعمال ہیں۔ اگر مستقبل کا صیغہ استعمال کیا جاتا تو مبالغہ نہیں پایا جاسکتا تھا۔ مبالغہ ماضی کے صیغہ سے ہی حاصل ہو رہا ہے۔

❁ ”دل ذلك على ان جدهم واجتهدهم فى تقرير الشبهة قد بلغ الغاية و صار بسبب ذلك الجد هذا المستقبل كالكاثر الواقع“

اس کلام سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ ان کی کوشش اور اجتہاد شبہ کو ثابت کرنے میں اس انتہاء درجہ کو پہنچا ہوا تھا کہ ان کی اس کوشش سے یوں سمجھ آتا کہ مستقبل میں ان کا کہنا گویا کہ ابھی واقع ہو چکا ہے۔ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ

❁ ”انه ليس المقصود الاخبار عن صدور هذا الكلام بل المقصود الاخبار عن جدهم واجتهدهم فى تقرير هذه الشبهة“

مقصد بیان کرنے کا صرف یہ نہیں کہ یہ بتایا جائے وہ اس طرح کلام کرتے تھے، بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈالنے کی کتنی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ اس جواب کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں ”فہذا هو الجواب المعتمد عندی (واللہ اعلم) یہ جواب میرے نزدیک معتمد ہے، (واللہ اعلم بالصواب)، لیکن راقم کے عنوان کا تعلق تیسرے جواب سے ہے جو قریب ہی ان شاء اللہ آ رہا ہے۔

**دوسرا جواب:** ”ان الکلام خرج على سبيل حكاية الحال الماضية“ کہ یہ کلام حال ماضیہ کی حکایت ہے۔ ”فالکافرون يقولون لو كانوا عندما ماتوا وماقتلوا فمن اخبر عنهم بعد ذلك لابد وان يقول قالوا“ یعنی کافر لوگ ماضی میں یہ کہتے رہے اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کئے جاتے، اس کے بعد جب ان کی خبر دی گئی تو ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا۔

**تیسرا جواب:** قال قطرب كلمة ”إِذَا“ و ”إِذَا“ يجوز اقامة كل واحدة منهما مقام الأخرى قطرب“ بیان کرتے ہیں، ”إِذَا“ اور ”إِذَا“ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ لہذا آیہ کریمہ میں ”إِذَا“ کا استعمال مجازی طور پر ”إِذَا“ کی جگہ ہوا ہے، لہذا دونوں جملے ”وَقَالُوا لِآخْوَانِهِمْ“ اور ”إِذَا ضَرَبُوا“ ماضی پر ہی دلالت کر رہے ہیں۔ اس



جواب کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے ”واقول هذا الذي قاله قطرب كلام حسن“ اور میں کہتا ہوں کہ جو قطرب نے بیان کیا ہے یہ جواب بہت حسین ہے۔

اس پر مزید آپ نے تبصرہ یہ فرمایا ہے کہ جب عربی لغت کو ایک مجہول شعر اور مجہول شاعر سے منقول ہونے کے باوجود ثابت کرتے ہیں ”فلان يجوز اثباتها بالقرآن العظيم كان ذلك أولى“ تو زیادہ ضروری یہ ہے کہ عربی لغت کو ہم قرآن پاک کے ذریعے ثابت کریں، زیادہ سے زیادہ یہاں کہا جاسکتا ہے کہ ”اذا حقيقى معنى کے لحاظ سے ثابت کیا گیا ہے اس سے ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ محازی معنی کے لحاظ سے ماضی کیلئے نہیں آتا



﴿لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾

”تا کہ بنائے اللہ اسے حسرت ان کے دلوں میں“

اس کی تفسیر میں دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہے ”انہم قالوا ذلک الکلام لیجعل اللہ ذلک الکلام حسرة فی قلوبہم“ بیشک انہوں نے یہ کلام کیا تا کہ اللہ تعالیٰ یہ کلام ان کے دلوں میں حسرت بنا دے، یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے ”ربیتہ لیسو ذینہ“ و نصرتہ لیقہرنی“ میں نے اس کی تربیت کی تا کہ وہ مجھے ایذا پہنچائے، اور میں نے اس کی امداد کی تا کہ وہ مجھ پر قہر کرے۔ اسی طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَخَزَنًا﴾ تو اسے اٹھالیا فرعون کے گھر والوں نے کہ وہ ان کا دشمن اور ان پر غم ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا چیز حسرت بنی اور کن لوگوں کیلئے حسرت بنی؟ اس میں چند وجوہ بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ مرنے والے اور قتل ہونے والے حضرات کے اقارب نے جب سنا تو ان کے دلوں میں حسرت بڑھ گئی

”لان احدہم یعتقد انہ لو بالغ فی منعہ عن ذلک السفر وعن ذلک الغزو لبقی“

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو اس کا اعتقاد ہو گیا کہ اگر وہ ان لوگوں کو اس سفر یا اس غزوہ سے زبردستی روکتے تو وہ رک جاتے اور بچ جاتے، وہ شخص مر گیا یا قتل ہو گیا تو ہماری کمزوری کی وجہ سے کہ ہم اسے روک نہیں سکے۔ ان کے اس کلام کو سننے والے کا بھی عقیدہ یہ ہو جاتا کہ اس شخص کی موت یا قتل ہونے کا سبب ان لوگوں کا اسے نہ روکنا ہے، ”ومتی یعتقد فی نفسہ ذلک فلا شک انہ تزداد حسرتہ وتلففہ“ جب عقیدہ ہی ان لوگوں کا یہ ہو گیا تو یقیناً ان کی حسرت اور اس پر افسوس بڑھ گیا۔

”اما المسلم المعتقد فی ان الحیاة والموت لایکون الا بتقدیر اللہ وقضائہ، لم

یحصل البتہ فی قلبہ شی من ہذا النوع من الحسرة“

لیکن مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ بیشک حیات زندگی اور موت صرف اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے فیصلہ پر موقوف ہے، اسی وجہ سے مومن کے دل میں اس قسم کی کوئی حسرت نہیں پائی جاتی۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ

”انہم متی القوا ہذہ الشبهة علی اقویاء المسلمین لم یلتفتوا الیہم فیضیع سعیہم

ویبطل کیدہم فتحصل الحسرة فی قلوبہم“



کہ جب منافقین نے قوی مسلمانوں پر اس قسم کے شبہات ڈالے تو انہوں نے ان کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو منافقین کی ساری کوشش ضائع ہو گئی، ان کا مکر و فریب برباد ہو گیا، ان کے دلوں میں حسرت پیدا ہو گئی۔

(۳) "ان جدهم واجتہادہم فی تکثیر الشبہات والقاء الضلالت یعمی قلوبہم فیقعون عند ذلک فی الحیرۃ والخیبة وضیق الصدر وهو المراد بالحسرة کفولہ" ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً"

منافقین کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ زیادہ سے شبہات مسلمانوں کے دلوں میں ڈالے جائیں اور ان کو گمراہ کرنے والی باتوں سے پھیرا جائے یعنی ان کے دل اندھے ہو جائیں، اسی سوچ میں وہ ہر وقت حیران رہتے اور ان کا دل تنگ رہتا اور خاص کر کے مسلمانوں کے ان کی باتوں کو نہ ماننے سے ان کو رسوائی حاصل ہوتی، اسی چیز کو رب تعالیٰ نے "حسرت" سے تعبیر فرمایا، دوسرے مقام پر رب تعالیٰ کا ارشاد اس کی تائید کر رہا ہے۔ ﴿وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ جس شخص کو وہ گمراہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے۔

(۴) چوتھی وجہ اس میں یہ ہے کہ منافقین نے جب نئے نئے اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں میں شبہات ڈالے تو وہ ان کی باتوں میں آگئے اور سمجھنے لگے کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں تو یہ بڑے خوش ہوئے کہ ہمارا داؤد چل گیا، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ اس کا مطلب یہ ہو گیا "سیصیر ذلک حسرة فی قلوبہم اذا علموا انہم کانوا علی الباطل فی تقریر هذه الشبهة" کہ جب ضعیف اعتقاد والے مؤمنین کے دلوں میں بھی ایمان راسخ (پختہ) ہو جائے گا تو وہ بھی سمجھ جائیں گے کہ یہ جھوٹے ہیں، ان کے شبہات باطل ہیں، تو ان کو بڑی حسرت ہوگی کہ ہائے جو کوشش اثر انداز ہوتی نظر آ رہی تھی وہ بھی ضائع ہو گئی۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے منافقین نے جب شبہات ڈالے کہ یہ لوگ جہاد چھوڑ دیں، لیکن مسلمانوں نے ان کے روکنے کے باوجود جہاد جاری رکھا، غزوات میں بلا خوف شریک ہوتے رہے،

"ووصلوا بسببه الى الغنائم العظيمة والاستيلاء على الاعداء والفوز بالأمانی بقی ذلک المتخلف عند ذلک فی الخیبة والحسرة"

جب مسلمان کامیاب ہو جاتے، دشمن پر غلبہ حاصل کر لیتے اور مال غنیمت حاصل کر لیتے تو منافقین پیچھے رہ جانے کی وجہ سے محروم ہو جاتے تو ان کو اس پر حسرت ہوتی۔

(۶) "ان هذه الحسرة انما تحصل یوم القيامة فی قلوب المنافقین اذ رأوا تخصیص اللہ المجاہدین بمزید الکرامات واعلاء الدرجات وتخصیص هؤلاء المنافقین بمزید



الخنزى والعقاب“

منافقین کو قیامت کے دن حسرت حاصل ہوگی جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بہت بڑی کرامات اور بلندی درجات سے محض کر دیا ہے، اور ہمیں رسوائی اور عذاب حاصل ہو رہا ہے تو ان کو حسرت ہوگی۔ وہ حسرت ان کی روز بروز بڑھتی چلی جائے گی۔

آیہ کریمہ کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے:

کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿لِيَجْعَلَ اللَّهُ﴾ میں لام کا متعلق اس نہی سے ہے جو سابقہ جملہ میں ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا

”لَا تَكُونُوا مِثْلَهُمْ حَتَّىٰ يَجْعَلَ اللَّهُ انْتِفَاءً كَوْنَكُمْ مِثْلَهُمْ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ لِأَن مَّخَالَفَتَهُمْ فِيمَا يَقُولُونَ وَيَعْتَقِدُونَ وَمُضَادَّتَهُمْ مِمَّا يَغِظُهُمْ“  
اے ایمان والو تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ تا کہ تمہارے ان کی طرح نہ ہونے سے ان کے دلوں میں رب تعالیٰ حسرت بتا دے، اس لئے کہ جب ان کے قول اور اعتقاد کی مخالفت کرو گے تو تمہاری مخالفت کی وجہ سے ان کو غصہ آئے گا وہی ان کو حسرت دلائے گا۔ (ماخوذ از تفسیر کبیر بتقدیم دتا خیرج ص ۵۵، ۵۶)

﴿وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ ”اور اللہ زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے۔“

اس کی تفسیر میں دو وجہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان الفاظ مبارکہ سے منافقین کے شبہ کا جواب دیا گیا ہے ”اس جواب کی تقریر یہ ہے“ کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی اور چیز کو حیات اور موت میں کوئی تاثیر نہیں ”وَأَنَّ عِلْمَ اللَّهِ لَا يَتَغَيَّرُ وَأَنَّ حُكْمَهُ لَا يَنْقَلِبُ، وَأَنَّ قَضَاءَهُ لَا يَتَبَدَّلُ، فَكَيْفَ يَنْفَعُ الْجُلُوسُ فِي الْبَيْتِ مِنَ الْمَوْتِ“  
بیشک اللہ تعالیٰ کا علم بدلتا نہیں، اور بیشک اس کا حکم نہیں بدلتا، اور بیشک اس کی تقدیر نہیں بدلتی، لہذا اگر میں بیٹھنا کسی کو موت سے بچانے کا نفع نہیں دے سکتا۔

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر نہیں بدلتی لہذا اپنے آپ کو موت اور قتل سے بچانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ کوئی اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی اچھے عمل کرے اور نہ ہی برے اعمال سے رکے، اس طرح تو انسان کا مکلف ہونا ہی ختم ہو جائے گا۔

جواب: ”أَنَّ حَسْنَ التَّكْلِيفِ عِنْدَنَا غَيْرُ مَعْلَلٍ بِعِلَّةٍ وَرِعَايَةِ مَصْلَحَةٍ بَلْ عِنْدَنَا أَنَّهُ يَفْعَلُ

مَا يَشَاءُ وَيُحْكَمُ مَا يَرِيدُ“



اللہ تعالیٰ بندوں پر جو احکام نافذ فرماتا ہے، یا جن کاموں سے روکتا ہے، ان کا نام ہی تکلیف ہے، ان سے ہی انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے، لیکن تکلیف کی دار و مدار کسی علت اور کسی مصلحت کی رعایت پر موقوف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ يُفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کرتا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ يَخُكُّ مَا يُرِيدُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے، ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾ اس سے نہیں پوچھا جائے گا وہ کیا کرتا رہا، ہاں البتہ بندوں سے پوچھا جائے گا وہ کیا کرتے رہے۔ ہاں البتہ اتنی بات یاد رکھی جائے، اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ ”فان الحكيم لا يامر بالقبايح ولا ينهى عن المحاسن“ بیشک حکیم برے کاموں کا حکم نہیں دیتا اور اچھے کاموں سے روکتا نہیں۔

### دوسری وجہ تفسیر:

یہ ہے کہ ﴿وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ ان کے شبہ کے ازالہ کیلئے نہ ہو کیونکہ شبہ کا ازالہ تو پہلے ہی ﴿لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ سے کیا جا چکا ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب منافقوں کی طرح کلام کرنے سے منع کیا تو ساتھ ہی ارشاد فرمایا ﴿وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ ”برید یحییٰ قلوب اولیائہ و اهل طاعته بالنور والفرقان ويمیت قلوب اعدائه من المنافقين“ یعنی ان الفاظ مبارکہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور اس کی طاعت کرنے والوں کے دلوں کو نور اور فرقان سے زندہ رکھتا ہے، اور اپنے دشمنوں یعنی منافقین کے دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر بالوضاح ج ۹ ص ۵۶، ۵۷)

﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ ”اللہ جو تم عمل کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔“

”المقصود منه الترغيب والترهيب“ م قصد اس سے مؤمنین کو نیک اعمال کی، جہاد کی رغبت دلانا ہے کہ موت سے نہ ڈرو موت و حیات تو رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، اور ساتھ ہی منافقوں کو ڈرایا گیا کہ تم اپنی جتنی حفاظتی تدابیر کر سکتے ہو کر لو، اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

ابن کثیر اور حمزہ کی قراءت میں ﴿يَعْمَلُونَ﴾ پڑھا گیا ﴿فِي قُلُوبِهِمْ﴾ کی مناسب سے، اور باقی حضرات نے تاء سے پڑھا ہے ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ کی مناسبت سے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۵۷)



وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝  
(آیہ نمبر ۱۵۷)

(۱) اور بیشک اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت ان کے سارے دھن و دولت سے بہتر ہے (کنز الایمان)

(۲) اور بیشک اگر تمہیں قتل کر دیا جائے اللہ کی راہ میں یا تم مرجاؤ، تو البتہ تھوڑی بخشش اللہ کی طرف سے اور تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

اس آیہ کریمہ میں منافقین کے شبہ کا دوسرا جواب دیا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موت نے ضرور واقع ہونا ہے، اگر انسان نے قتل ہونا ہے یا مرنا ہے تو ضرور اس نے قتل ہونا ہے یا اس پر موت واقع ہونی ہے۔ اس سے اسے چھٹکارا حاصل نہیں۔ جب موت یا قتل اللہ تعالیٰ کی راہ میں واقع ہوں اور اس کی رضاء مندی حاصل کرنی مقصود ہو تو وہی بہتر ہے اس سے کہ دنیا کی طلب میں انسان اپنا سارا وقت لگا دے، جس کا موت کے بعد اسے کوئی فائدہ نہ ہو۔ ”وہذا جواب فی غایۃ الحسن والقوہ“ یہ جواب بہت ہی حسین اور قوی ہے۔

### مقصد عظیم:

وذلك لان الانسان اذا توجه الى الجهاد اعرض قلبه عن الدنيا واقبل على الآخرة، فاذا مات، فكانه تخلص عن العدو ووصل الى المحبوب، واذا جلس في بيته خائف من الموت حريصا على جمع الدنيا، فاذا مات فكانه حجب عن المعشوق والقي في دار الغربة، ولا شك في كمال سعادة الأول وكمال شقاوة الثاني (کبیر ج ۹ ص ۵۷)

انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ جب جہاد کی طرف متوجہ ہو تو وہ دل دنیا سے ہٹالے، اور آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے، اس حال میں جب اس پر موت آجائے تو اس نے اپنے آپ کو دشمن سے چھڑا لیا ہے، اور وہ محبوب تک پہنچ گیا، یعنی رب تعالیٰ کا مقرب ہو گیا۔ اور جب موت سے ڈر کر گھر میں بیٹھ گیا اور دنیا کا مال جمع کرنے میں حریص ہو گیا تو اس کی موت جب اس حالت میں آئے تو اس نے اپنے آپ کو اپنے محبوب یعنی اللہ تعالیٰ سے دور کر لیا اور اپنے آپ کو اجنبی کر لیا۔ یقیناً پہلا مقام انتہائی سعادت کا مقام ہے اور دوسرا مقام انتہائی بدبختی ہے، متمم تمیم کے پیش سے استعمال ہوا ہے جس طرح قال، یقول کا استعمال ہے ”قلتم“ کاف کے پیش سے، آتا ہے جمہور قراء نے اس مقام پر تمیم کے پیش سے ہی پڑھا ہے۔



اور دوسرا استعمال اس کا ”خاف یخاف“ اور ”هاب یهاب“ کی طرح ہے، ”خفتم او هبتم“ میں خاء اور هاء کے نیچے زیر ہے۔ اسی طرح مبرد کی قراءت میں ”متم“ میں بھی میم کے نیچے زیر ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہاں تو اختلاف ہے، پیش والی قراءت کو زیادہ پسند کیا گیا ہے کہ یہ ”مات یحوت“ سے لیا ہوا ہے، لیکن ”مات یعات“ سے ”متنا“ میم کے کسرہ سے قرآن پاک میں کئی جگہ استعمال ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۵۷)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

﴿وَلَيْتُنْ قُتِلْتُمْ﴾ میں لام موطاً للقسیم ہے۔ تقدیر عبارت کی یہ ہے ”والله لئن قتلتم“ لمغفرة من الله ورحمة“ میں لام ابتدائیہ ہے جو دلالت کر رہا ہے کہ یہ جواب قسم ہے، اور اس میں تاکید والا معنی بھی پایا گیا ہے۔ ”مغفرة“ مبتداء ہے اور ”رحمة“ کا اس پر عطف ہے۔ اور خبر اس کی ”خیر“ ہے۔ ”من الله صفت ہے ”مغفرة“ کی اور عربی قاعدہ کے مطابق جب معطوف علیہ کی صفت ساتھ ذکر کر دی گئی تو معطوف کی صفت بھی خود بخود سیاق و سباق سے سمجھ آگئی یعنی معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگئی ”لمغفرة من الله ورحمة من الله“ پھر یہ بھی خیال رہے کہ دونوں الفاظ مبارکہ پر تنوین تقلیل کیلئے ہے۔ اب اس ترکیب مذکور کے لحاظ پر مکمل معنی یہ ہو گیا۔ اور قسم ہے اللہ کی اگر تم قتل کر دے جاؤ اللہ کی راہ میں یا مرجاؤ تو یقیناً اللہ کی تھوڑی بخشش اور اللہ کی تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۵۸۔ تفسیر ابی السعود ج ۲ ص ۱۰۴)

﴿خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾ حفص نے عاصم (رحمہما اللہ) کی روایت کے مطابق یاء سے غیب کے صیغہ سے

پڑھا ہے، اس قراءت کے مطابق معنی یہ ہے

”ان مغفرة الله خير مما يجمعونه هؤلاء المنافقون من الحطام الفانی“

بیشک اللہ کی بخشش اور رحمت بہتر ہے اس سے جو یہ منافقین دنیا کا فانی مال جمع کر رہے ہیں۔

لیکن بعض قراءتوں میں تاء سے خطاب کا صیغہ ﴿تَجْمَعُونَ﴾ ہے، اس صورت میں خطاب مؤمنین کو ہوگا۔

”فالمعنى انه تعالى كأنه يخاطب المؤمنين فيقول لهم مغفرة من الله خير لكم من

الأموال التي تجمعونها في الدنيا“

اب اس کا معنی یہ ہوگا، اے مومنو اللہ کی بخشش تمہارے لئے تمہارے ان مالوں سے بہتر ہے جو تم جمع کرتے ہو۔

(کبیر ج ۹ ص ۵۸)



مغفرت و رحمت کے بہتر ہونے پر چند وجوہ:

(۱) جو شخص دنیا کا مال طلب کرتا ہے وہ طلب کے وقت اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے ہوتا ہے اور اس کے حاصل کرنے میں تھکن میں ہوتا ہے ”ولعله لا ینتفع به غذا لأنه یموت قبل الغد“ وہ دیکھتا ہے کل اس سے وہ فائدہ نہ حاصل کر سکے اور اس کی موت کل سے پہلے ہی آجائے۔

”واما طلب الرحمة والمغفرة فانه لا بد وان ینتفع به لأن الله لا یخلف وعده“

لیکن رحمت اور بخشش کی طلب میں نفع ضرور حاصل ہوتا ہے، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا۔ اور رب تعالیٰ نے وعدہ یہ فرمایا ﴿فَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا یَرَهُ﴾ تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا، (۲) اللہ تعالیٰ کی عطاء یعنی اس کی بخشش اور رحمت کل تک باقی رہیں گی، لیکن ہو سکتا ہے مال کل تک باقی نہ رہے۔ ”فکم من انسان اصبح امیرا وامسی اسیرا“ کتنے ہی انسان صبح امیر ہوتے ہیں اور شام کو قیدی ہوتے ہیں۔

”وخیرات الآخرة لاتزول لقوله“ وَالْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ“ ولقوله

تعالیٰ ﴿مَاعِنْدُکُمْ یَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ﴾

نیکیاں باقی رہنے والی بہتر ہیں تمہارے رب کے ہاں۔ اور فرمایا، جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا، اور جو رب تعالیٰ کے ہاں ہے وہ ختم نہیں ہوگا۔

(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال کچھ دیر کیلئے باقی تو رہ جاتا ہے، لیکن حوادث اس سے فائدہ حاصل نہیں کرنے دیتے کوئی شخص مریض ہو گیا اور اسے درد لاحق ہو گیا تو وہ اس سے نفع نہ حاصل کر سکا، ”ومنافع الآخرة لیست كذلك“ لیکن آخرت کے منافع یوں نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ کیلئے نفع مند ہیں۔

(۴) بعض اوقات انسان اپنے مال سے کل نفع بھی حاصل کر لے گا لیکن دنیا کی لذات کے ساتھ تکالیف بھی پائی جاتی ہیں اور منافع نقصانات کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں، یہ بہت واضح ہے، کوئی پوشیدہ بات نہیں لیکن اخروی منافع تکالیف اور نقصانات سے پاک ہیں۔

(۵) اگر کسی شخص کو منافع حاصل ہوں لیکن اسے تکالیف نہ حاصل ہوں، ایسا بہت کم ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس کے منافع بھی ختم ہو جائیں گے اور اس کی اپنی زندگی بھی ختم ہونے والی ہے، پھر اسے جب کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ جتنی دیر نعمت حاصل نہیں رہی اس پر افسوس کرتا ہے، لیکن اخروی نعمتیں دائمی (ہمیشہ رہنے والی) ہیں، اور انسان کی زندگی بھی آخرت میں ختم ہونے والی نہیں۔ اور نہ ہی کوئی وہاں افسوس حاصل ہوتا ہے۔



(۶) دنیاوی منافع حسی ہیں، اخروی منافع عقلی ہیں۔ حسی منافع گھٹیا ہیں، اور عقلی منافع اعلیٰ ہیں۔ لہذا اخروی منافع کو فوقیت (بلندی) حاصل ہے۔

ان چھ وجوہ سے ہی آنے والے الفاظ مبارکہ کا مطلب آسانی سے سمجھا سکتا ہے۔

﴿لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾

”البتہ تھوڑی بخشش اللہ کی طرف سے اور تھوڑی رحمت بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

**اعتراض:** ﴿خَيْرٌ﴾ اسم تفصیل ہے جو زیادہ بہتری پر دلالت کرتا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی مال جمع کرنا اچھا ہے، لیکن اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت زیادہ بہتر ہیں۔ حالانکہ دنیاوی مال جمع کرنا تو اچھا ہی نہیں۔ تو یہاں ﴿خَيْرٌ﴾ کا استعمال کس طرح صحیح ہے؟

**جواب:** ”هذا وارد على حسب قولهم ومعتقدهم ان تلك الاموال خيرات فقليل

المغفرة خير من هذه الاشياء التي تظنونها خيرات“

یہاں ﴿خَيْرٌ﴾ کا استعمال ان لوگوں کے اعتقاد کے مطابق ہے۔ وہ دنیاوی مال کو بہت نعمت سمجھتے تھے، اور اسے بہتر قرار دیتے تھے، لہذا آیہ کریمہ میں بیان کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ دنیا کے مال کے جمع کرنے کو اپنے اعتقاد کے مطابق بہتر قرار دیتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت دنیا کے مال جمع کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ بلکہ اس میں ان کو تنبیہ بھی کر دی گئی کہ تم منافقت کو چھوڑ کر مخلص مؤمن بن جاؤ۔

**تنبیہ:** اگر ﴿مِمَّا يَجْمَعُونَ﴾ والی قراءت ہو اور خطاب مؤمنین کو ہو تو اس صورت میں مسئلہ

واضح ہے کہ اے مؤمنو تمہارا حلال مال جمع کرنا اگرچہ بہتر ہے کیونکہ اس سے تم حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرتے ہو لیکن اس دنیاوی مال پر ہی بھروسہ نہ رکھو بلکہ زیادہ توجہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت حاصل کرنے کی طرف کرو کیونکہ وہ زیادہ ہی بہتر ہے۔

(ماخوذ اکبر بالوضاحت والصرف ج ۹ ص ۵۸، ۵۹)





وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَآلِی اللّٰهِ تُحْشَرُونَ ۝ (آیہ نمبر ۱۵۸)

- (۱) اور اگر تم مرو یا مارے جاؤ تو اللہ کی طرف اٹھنا ہے۔ (کنز الایمان)
- (۲) اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کردے جاؤ تو اللہ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جانا ہے۔ (نجوم الفرقان)

### مقام توجہ:

عام طور پر قرآن پاک کے نسخوں میں ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ رسم الخط ہے۔ پھر بعض اوقات ﴿لَا﴾ پر گول نشان لگا دیا جاتا ہے کہ یہ الف پڑھنے میں نہیں آ رہا، تفسیر کبیر کے متن میں، ﴿لَا اِلٰهَ﴾ نہیں لکھا گیا، بلکہ صرف ﴿لَا اِلٰهَ﴾ لکھا گیا ہے، الف نہیں لکھا گیا۔ (راقم)

**مختصر مطلب:** اس آیہ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے "ان ترکتم الجہاد واحترزتم عن القتل والموت بقیتم ایاماً قلیلة فی الدنیا مع تلک اللذات الخسیسة تم ترکونها لامحالة فتکون لذاتها لغيرکم وتبعاتها علیکم" کہ اگر تم نے جہاد چھوڑ دیا اور تم نے اپنے گمان کے مطابق یہ سمجھا کہ تم نے اپنے آپ کو قتل ہونے اور مرنے سے بچا لیا حالانکہ حقیقت میں تمہاری موت کا وقت ہی نہیں آیا تھا، تو پھر بھی یہ یقین کر لو کہ تم نے دنیا میں تھوڑا وقت رہنا ہے اور یہ گھٹیا دنیاوی لذتیں تھوڑا عرصہ تمہیں حاصل رہیں گی، پھر یقیناً تم نے دنیا اور اس کی نعمتوں کو چھوڑ جانا ہے، اور تمہارے پیچھے آنے والوں کو وہ حاصل ہو جائیں گی،

"اما لو اعرضتم عن الذات الدنیا وطیباتها، وبذلتکم النفس والمال للمولی بکون حشرکم الی اللہ ووقوفکم علی عتبه رحمة اللہ وتلذذکم بذكر اللہ"

اور اگر تم نے دنیا کی لذات کو چھوڑا اور دنیا کے رزق حلال کو بھی چھوڑ کر تم نے اپنے مال اور اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا، اللہ کی رحمت کے دروازے کی دہلیز پر تمہیں کھڑا ہونا نصیب ہوگا، اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے لذت حاصل ہوگی۔ اب خود بخود سمجھ لیا جائے کہ دونوں مقامات میں کتنا بڑا فرق ہے۔ (ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۵۹)

### چند دقائق:

- (۱) یہاں ارشاد ہوا ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُحْشَرُونَ﴾ اور یہ نہیں فرمایا ﴿تُحْشَرُونَ لَآلِی اللّٰهِ﴾ اس لئے کہ



﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ کو پہلے ذکر کرنے سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، معنی یہ حاصل ہو گیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جاتا ہے، کسی اور کی طرف نہیں ”وہذا يدل على انه لا حاكم في ذلك اليوم ولا ضار ولا نافع الا هو“ اور یہ دلالت کرتا ہے اس پر کہ قیامت کے دن کوئی اور حاکم نہیں ہوگا، کوئی ضرر دینے والا، کوئی نفع پہنچانے والا سورۃ اللہ تعالیٰ کے نہیں ہوگا۔ خود رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (سورۃ المؤمن، آیت نمبر ۱۶) آج کس کی بادشاہی ہے؟ ایک اللہ سب پر غالب کی، (کنز الایمان) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ﴾ اور امر اس دن اللہ ہی کیلئے ہے۔

(۲) اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ”اللہ“ ذکر کیا ”وہذا الاسم اعظم الاسماء“ یہ اسم گرامی رب تعالیٰ کے باقی تمام ناموں سے بہت عظیم نام ہے۔ یہ کمال رحمت اور کمال قہر پر دلالت کر رہا ہے۔  
”فهو لدلالته على كمال الرحمة اعظم انواع الوعد ولدلالته على كمال القهر اشد انواع الوعد“

جب اس اسم گرامی کی دلالت رب تعالیٰ کی کمال رحمت پر ہے تو اس میں وعدہ کی بہت عظیم قسموں پر دلالت پائی گئی ہے اور کمال قہر پر دلالت کرنے کی وجہ سے اس میں رب کی تعالیٰ کی بہت شدید وعید کی قسموں کی دلالت بھی پائی گئی ہے۔  
(۳) اس آیت کریمہ میں اسم ”اللہ“ پر لام تاکید کو داخل کیا گیا، ارشاد فرمایا ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”وہذا ينبك على ان الالهية تقتضي هذا الحشر والنشر“ یہ اس پر متنبہ (خبردار) کر رہا ہے کہ رب تعالیٰ کی ”الہیۃ“ (اس کا معبود ہونا) اس حشر و نشر کا تقاضا کر رہا ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أَخْفِيهَا تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ﴾ (سورۃ طہ، آیت نمبر ۱۵) بیشک قیامت آنی والی ہے قریب تھا کہ میں اسے سب سے چھپاؤں کہ ہر جان اپنی کوشش کا بدلہ پائے۔ (کنز الایمان)

(۴) ﴿نُحْشَرُونَ﴾ مضارع مجہول کا صیغہ ہے، جس میں فاعل صراحۃ (ظاہر طور پر) ذکر نہیں کیا گیا، جس سے یہ ثابت کیا گیا ہے ”ان فاعل ذلك الحشر هو الله“ اس حشر کا فاعل وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ظاہر طور پر ذکر نہ کرنا ہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم اور کبیر ہے ”شہدت العقول بانه هو الله الذي يبدئ ويعيد، جس کی عظمت اور کبریائی پر عقلیں شاہد ہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو پیدا کرتا ہے اور اسی نے پھر اپنی طرف لوٹاتا ہے۔ اس مقام پر ﴿نُحْشَرُونَ﴾ کا فاعل ظاہر نہ ذکر کرنا اس کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کی نظیر اس آیت کریمہ میں بھی پائی گئی ہے۔



(اور حکم فرمایا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے) یہ حکم بھی صرف رب تعالیٰ ہی کا ہے جو اس کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔

(۵) تمام کے اٹھائے جانے کو اٹھانے والے کی طرف منسوب کیا گیا، تو یقیناً وہ مخلوق سے تو نہیں، کوئی اور ہی ہے، وہ ”اللہ“ ہے۔ خود بخود عقل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام مخلوق رب تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں، اور اسی کی مشیت میں ہے، ”فہم سواء كانوا احياء وامواتا لا يخرجون عن قهر الربوبية وكبرياء الالهة“ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے قہر اور اس کی الہیت کی کبریائی سے کوئی باہر نہیں، سب ہی زندہ اور مردہ اس میں برابر ہیں۔

(۶) ﴿تُحْشَرُونَ﴾ جمع کا صیغہ ہے، جس میں تمام کو خطاب کیا گیا ہے، یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ تمام جہان والوں کو اٹھایا جائے گا، میدان قیامت میں کھڑا کر دیا جائے گا، اور عدل و انصاف کیا جائے گا۔

فيجتمع المظلوم مع الظالم والمقتول مع القاتل والحق سبحانه وتعالى يحكم بين عبده بالعدل المبرأ عن الجور، كما قال ﴿وَنَضْعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن ”یہ جو اس آیت کریمہ کے چند دقائق و فوائد ذکر کئے ہیں یہ تو سمندر میں سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس آیت کریمہ میں راز رکھے ہوئے ہیں۔

(کبیر ج ۹ ص ۶۰)

ہاں ہاں یہ تو قرآن پاک کی عظمت ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ میں اسرار و کمالات کے موجزن دریا موجود ہیں۔

**فائدہ جلیلہ:** اللہ تعالیٰ کے کلام میں کتنی حسین اور مفید ترتیب رکھی گئی ہے، جس کی مثال نہیں ملتی،

”فانه قال في الآية الأولى ﴿لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ﴾ وهو إشارة الى من يعبدہ خوفاً من

عقابه، ثم قال (ورحمة) وهو إشارة الى من يعبدہ لطلب ثوابه، ثم قال في خاتمة الآية

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تُحْشَرُونَ﴾ وهو إشارة الى من يعبد الله لمجرد الربوبية والعبودية“

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے حضرات کی تین قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر اس کی عبادت کرتے ہیں، ان کا تذکرہ پہلی آیت ﴿لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ﴾ (البتہ بخشش ہے اللہ کی طرف) میں کیا گیا ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت ثواب اور جنت حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں ان کا تذکرہ ”ورحمة“ میں کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو رحمت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی ربوبیت کی وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ معبود حقیقی ہے اور ہم اس کے بندے ہیں ہمیں اس کی عبادت سے اس کا تقرب حاصل ہو جائے، ان



کا تذکرہ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَحْشَرُونَ﴾ میں کر دیا گیا ہے کہ ”ابتنہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمہیں اٹھایا جائے گا“  
 ”وهذا اعلى المقامات وابعد النهايات فى العبودية فى علو الدرجة، الا ترى انه لما شرف الملائكة قال ومن عنده لا يستكبرون عن عبادته، وقال للمقربين من اهل الثواب عند مليك مقتدر“

جب عبادت صرف رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے ہو تو عابد کو اعلیٰ مقام حاصل ہوگا، عبودیت کی حد تک جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اس تک وہ پہنچ جائے گا۔ رب تعالیٰ نے جب اپنے فرشتوں کو ان کے ذکر سے مشرف فرمایا تو یوں ”ارشاد فرمایا:

”وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۝ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۝“  
 (سورة الانبياء آية ٢٠، ١٩)

اور اس کے پاس والے اس کی عادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکیں، رات دن اس کی پاکی بولتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔  
 (کنز الایمان)

(ومن عنده) اس کے پاس والے ”یہ کون ہیں؟ ان کے متعلق صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ تفسیر خزان العرفان میں فرماتے ہیں، یہ ”اس کے مقربین میں جنہیں اس کے کرم سے اس کے حضور قرب و منزلت حاصل ہے۔ اور رب تعالیٰ نے اپنے اہل ثواب مقربین کا ذکر یوں فرمایا“

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ۝ فِي مَقْعَدِ صَدِّقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝﴾  
 بیشک پرہیزگار باغوں اور نہر میں ہیں، سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور،  
 (کنز الایمان، سورة القمر، آية نمبر ۵۴، ۵۵)

یعنی جو عبادت صرف رب تعالیٰ کی رضا کیلئے کرتے ہیں ”عذاب کے ڈر یا ثواب کی امید کیلئے نہیں کرتے، ان کو اپنے رب تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل ہوتا ہے، وہ بادشاہ اور قدرت والا رب ہے۔

”فبين ان هؤلاء الدين بذلوا انفسهم وابدانهم فى طاعته ومجاهدة عدوه يكون حشرهم اليه واستئناسهم بكرمه وتمتعهم بشروق نور ربوبيته“

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنے نفسوں اور بدنوں کو صرف رب تعالیٰ کی طاعت کیلئے اور اس کے دشمن (نفس و شیطان) سے مقابلہ و مجاہدہ کیا، تو ان کا حشر رب تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے، اور ان کو اس کے کرم سے انس حاصل ہوتا ہے، اور انہیں نور ربانی سے منور ہونے کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت بڑی وسعت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن مختصر طور پر اتنی مقدار ذکر کر دیا جس سے بصیرت حاصل ہو جائے۔ (کبیر ج ۹ ص ۵۹)



اسی آیہ کی تشریح میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے بغیر سند کے ایک روایت ذکر کی ہے ”والله اعلم بالصواب“  
 یروی ان عیسیٰ بن مریم صلوات اللہ علیہ وسلامہ مرباقوام نحفت ابدانہم واصفرت  
 وجوہہم ورأی علیہم آثار العبادۃ فقال ماذا تطلبون؟ فقالوا نخشی عذاب اللہ، فقال  
 ہوا کرم من ان لا ینخلصکم من عذابہ، ثم مربقوم آخرین فرأی علیہم تلک الآثار  
 فسألہم فقالوا نطلب الجنة والرحمة، فقال ہوا کرم من ان یمنعکم رحمته ثم مربقوم  
 ثالث ورأی آثار العبودیۃ علیہم اکثر فسألہم فقالوا نعبدہ لأنه الہنا ونحن عبیدہ  
 لالرغبۃ ولالرهبة، فقال انتم العبد المخلصون والمتعبدون المحقون‘

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کچھ لوگوں سے گذر ہوا، دیکھا کہ ان کے بدن کمزور ہو چکے ہیں اور چہرے زرد ہو چکے ہیں، اور  
 ان پر عبادت کے آثار نمایاں ہیں، آپ نے ان سے پوچھا، تم کیا چیز طلب کر رہے ہو، انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے  
 عذاب سے ڈر رہے ہیں۔ یعنی اس کے عذاب سے بچنے کا مطالبہ کر رہے ہیں آپ نے فرمایا وہ تو مکرم ذات ہے، ہو  
 سکتا ہے تمہارا یہ مطالبہ نہ قبول فرمائے، پھر آپ کا کچھ اور لوگوں سے گذر ہوا، ان پر آثار عبادت کو دیکھ کر ان سے  
 پوچھا، تم کس لئے عبادت کر رہے ہو؟ کہنے لگے کہ ہم جنت اور رحمت طلب کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ وہ مکرم ہے  
 ہو سکتا ہے تمہیں جنت و رحمت نہ عطاء کرے۔ (آپ کا مطلب اصل میں یہ تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو مطالبہ کیا جائے  
 وہ مل بھی جائے، کبھی خلوص میں کمی ہوتی ہے، کبھی ریاء کاری دخل انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے طلب کی ہوئی چیز نہ  
 ملے، دعاء میں قبولیت کسی اور وجہ سے ہو جائے) پھر آپ کا گذر ایک اور قوم سے ہوا، ان پر آثار عبادت دیکھ کر ان سے  
 پوچھا کہ تم عبادت کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم اس کی عبادت اس لئے کر رہے ہیں کہ وہ ہمارا الہ ہے، ہم اس کے  
 بندے ہیں، ہم کسی چیز کی رغبت یا کسی چیز کے ڈر کی وجہ سے اس کی عبادت نہیں کر رہے۔ تو آپ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ  
 کے مخلص بندے ہو، تم عبادت کا حق ادا کر رہے ہو۔ (کبیر ج ۹ ص ۵۹)

طلباء کرام کے یاد کرنے کیلئے خوبصورت عبارت:

جس عبارت کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ عبارت تو علامہ اسمعیل حقی رحمہ اللہ کی ہے۔ البتہ اس کا مفہوم تفسیر  
 کبیر سے ہی لیا ہے۔ اس لئے علامہ حقی رحمہ اللہ نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے یوں بیان کیا،

قال الامام فی تفسیرہ ”الانسان اذا توجه الى الجہاد اعرض قلبہ عن الدنیا و اقبل  
 علی الآخرة فاذا مات فکانہ تخلص من العدو و وصل الى المحبوب و اذا جلس فی



بیته خائفاً من الموت حریصاً علی جمیع الدنیا فاذا مات فکانه حجب عن المعشوق  
والقسی فی دار الغربة ولا شک فی کمال سعادة الاول وکمال شقاوة  
الثانی "انتهی" فحشر الغافلین بالحجاب وحشر الواصلین باظهار الجناب فمن کان  
فی هذه الدنیا اعمی بحب المال والمال کان فی الآخرة محجوباً عن مشاهدة  
الجمال" (روح البیان ج ۲ ص ۱۱۵)

انسان جب جہاد کی طرف متوجہ ہو تو اس کا دل دنیا سے اعراض کر لے، اور آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے تو جب  
اس کی موت آئے گی تو دشمن سے اسے چھٹکارا حاصل ہوگا اور وہ اپنے محبوب حقیقی تک پہنچ جائے گا، یعنی اسے قرب  
الہی حاصل ہوگا، یقیناً اس میں اسے کامل سعادت حاصل ہوگی، اور اگر وہ موت سے ڈر کر گھر میں ہی بیٹھ رہا، اور  
دنیا کی زندگی اور دنیا کے مال و دولت پر حریص رہا تو جب اس کی موت آئے گی تو اپنے محبوب حقیقی سے دور  
ہوگا، اور گویا کہ لہی نے اپنے آپ کو دار غربت میں ڈال دیا ہوگا، یہ اس کی بہت بڑی بد بختی ہوگی۔ لہذا پتہ چلا کہ  
واصلین کا حشر رب تعالیٰ کا قرب ہوگا۔ اور غافلین جو کہ دنیا کے مال و اسباب سے اندھا دھند محبت کرتے رہے  
اور تقرب الہی حاصل کرنے میں ناکام رہے وہ آخرت میں رب کریم جو معبود حقیقی ہے اس کے جمال یعنی اس کے  
انوار کی تجلیات کے مشاہدہ سے دور رہیں گے۔

جاننا زور تو دور نتوانم بود  
قانع بہشت و حور نتوانم بود  
اے محبوب حقیقی تیرے در سے دور میں نہیں ہو سکتا  
میں بہشت و حور پر قناعت نہیں کر سکتا





فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نُفِضُوكَ مِنْ حَوْلِكَ  
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ  
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ (آیہ نمبر ۱۵۹)

(۱) تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کیلئے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل  
ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے تو تم انہیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت  
کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو اور جو کسی بات کو ارادہ پکا کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو بیشک تو کل  
والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنز الایمان)

(۲) تو اللہ کی رحمت سے نرم ہوئے آپ ان کیلئے، اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج، (اور) سخت دل البتہ  
ہٹ جاتے وہ آپ کے ارد گرد سے، تو آپ درگزر رکھیں ان سے، اور بخشش طلب کرو ان  
کیلئے، اور آپ مشورہ کر لیں ان سے کاموں میں، تو جب آپ پکا ارادہ کر لو تو توکل (بھروسہ) رکھو  
اللہ پر، بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توکل رکھنے والوں سے۔ (نجوم الفرقان)

### مختصر مطلب:

احد میں جب بعض صحابہ کرام سے درہ چھوڑنے کی اجتہادی خطاء ہوئی، اور کفار کے اچانک درہ سے حملہ  
کرنے کی صورت میں بعض صحابہ کرام جو پسپا ہو گئے تھے۔

”ثم عادوا لم يخاطبهم الرسول الله ﷺ بالتغليظ والتشديد وانما خاطبهم بالكلام  
اللين“

پھر جب وہ لوٹ کر آ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے سخت کلام نہیں فرمایا، ان پر شدید غصہ نہیں کیا، بلکہ ان سے  
نرم کلام فرمایا، رب تعالیٰ نے اسی کی تعریف فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آپ ان پر نرم مزاج اور نرم دل واقع  
ہوئے، اگر آپ سخت مزاج ہوتے اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کو چھوڑ کر دور ہو جاتے، آپ کے پاس جمع نہ  
رہتے، پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے دنیا اور آخرت میں نفع کی راہنمائی فرمادی اس کی وجہ بھی حقیقت میں



نبی کریم ﷺ کا ان کو معاف کر دینا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مزید ان سے درگزر جاری رکھنے کا حکم دیا، اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا ارشاد فرمایا، صحابہ کرام کی مزید دل جوئی اور ان سے محبت قائم رکھنے کیلئے ان سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، پھر ساتھ ہی حکم فرمایا کہ آپ جب کوئی کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لیں تو پھر اللہ تعالیٰ پر ہی کامل بھروسہ رکھو، جو لوگ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۴۱، ۴۲) (مع وضاحت)

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ ”تو اللہ کی رحمت سے نرم ہوئے آپ ان کیلئے“

”فبما“ میں ”ما“ زائد ہے، جیسا کہ ”عما قلیل“ اور ”وجند ما هنالك“ اور ”فبما نقضهم ممانا“ میں ”ما“ زائد ہے، البتہ عرب حضرات بعض اوقات ”زائد لفظ کو تاکید کیلئے بھی استعمال کر لیتے ہیں اگرچہ وہاں تاکید کی اتنی ضرورت نہ بھی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿فَلَمَّا أَن جَاءَ الْبَشِيرُ﴾ میں ”ان“ زائد ہے اور تاکید کیلئے استعمال ہے۔

”وقال المحققون دخول اللفظ المهمل الضائع في كلام احكم الحاكمين غير جائز، وهنا يجوز ان تكون (ما) استفهاما للتعجب“

محققین حضرات کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین کے کلام میں کسی لفظ کو مہمل، ضائع ماننا جائز نہیں، بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ ”ما“ استفہام تعجب کیلئے ہو، اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے جب صحابہ کرام کو پریشان کر دینے والی اجتہادی خطا کر معاف کر دیا، کوئی سخت کلام نہیں فرمایا، ان کی کوئی سرزش نہیں کی تو ان کو بھی معلوم ہو گیا تھا ”هذا لا يتأتى الا بتأييد رباني وتسديد الهی“ کہ یہ صرف تائید ربانی سے ہی حاصل ہوا، اور اسی نے اپنے محبوب ﷺ کو درست فیصلہ کرنے کی راہنمائی کی، یہ مقام تعجب تھا اس لئے ”فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ“ کا معنی یہ ہو گا ”فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ“ تعجب ہے اس پر کہ کتنی ہی اللہ کی رحمت ہے آپ پر جس کی وجہ سے آپ ان پر نرم دل ہو گئے، اس معنی کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ”هذا هو الا صوب عندي“ یہ معنی میرے نزدیک بہت درست ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۲، ۶۳)

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

”باء“ اور ”عن“ اور ”من“ اور ”کاف“ کے ساتھ اکثر طور پر ”ما“ زائد ہوتا ہے۔ (البحر المحیط جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۴۰)

دائم کے نزدیک زائد تحسین کلام کیلئے یا تاکید کیلئے ہو تو وہ زائد ضائع نہیں، بلکہ مقصد کیلئے ہے۔



﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نَفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

”اور اگر ہوتے آپ سخت مزاج اور سخت دل تو البتہ وہ آپ کے ارد گرد سے ہٹ جاتے۔“

”بين تعالى ان ثمرة اللين هي المحبة والاجتماع عليه وان خلافتها من الجفوة والخشونة مؤد الى التفرق“

اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ نرم دل اور نرم مزاج ہونا محبت اور لوگوں کے اپنے ساتھ اجتماع کا ذریعہ ہے، اور اس کے خلاف سخت مزاجی اور سخت دلی محبت کے توڑنے اور جدا ہونے کا سبب ہے، مطلب تقریباً واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ اگر آپ صحابہ کرام کو ملامت کرتے، ڈانٹتے، جھڑکتے تو وہ بھی آپ کی مخالفت کرتے آپ سے دور بھاگتے اس کی وجہ یا ان کا ڈر ہوتا، یا حیاء کی وجہ سے آپ کے قریب نہ آتے، یہ کلمہ اسلام میں بٹ جانے کا سبب بنتا، اس طرح اسلام کی بنیادیں ضعیف ہو جاتیں، اور دشمن دلیر ہو جاتے، لیکن آپ نے نرمی فرمائی، معاف کر دیا تو مسلمانوں میں اجتماعیت برقرار رہی، اور حقوق اللہ پر عمل قائم و دائم رہا، ان کو چھوڑنے کا کوئی ذریعہ نہ بنا۔

(البحر المحیط جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۴۱)

”الفظ“ الغلیظ الجانب السنی الخلق“ جس کا مزاج سخت ہو، یا بد مزاج ہو اس پر ”فظ“ کا اطلاق ہوتا ہے اصل میں ”فظظ“ ہے، پہلے ظاء کے نیچے زیر ہے، جیسے ”حذر“ ڈرنے والا اور ”فرق“ جدا ہونے والا اور ڈرنے والا، لیکن دو حرف ایک جنس کے ہوں تو ان میں ادغام ہوتا ہے، جیسے ”صب“ اصل میں ”صبب“ ہے اسی وجہ ”فظ“ اور ”صب“ ہو گیا ”لَا نَفَضُوا“ اصل مادہ اس کا ”ف ض ض“ ہے، باب انفعال ہے، لام ابتدائیہ تاکید یہ استعمال ہے اصل میں ”فض“ کا معنی ہے متفرق ہو جانا، کہا جاتا ہے ”انفض القوم“ قوم متفرق ہو گئی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ اور جب انہوں نے کوئی تجارت یا کھیل دیکھا اس کی طرف چل دیئے اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے، یعنی اس آیت میں بھی ”انفضوا“ قوم کا دوران خطبہ حضور ﷺ سے ہٹ جانا اور تجارتی وفد کی طرف چلے جانے کا ذکر ہے اس طرح کہا جاتا ہے ”فضضت الكتاب“ میں نے کتاب کھولی ”لا يفضض الله فاك“ اللہ تمہارے منہ کو نہ کھولے ”فظ“ اور ”غلیظ القلب“ میں فرق ”الفظ الذي يكون سینی الخلق“ ”فظ“ کا معنی ہے بد خلق ہونا، تیز مزاج ہونا ”غلیظ القلب هو الذي لا يتأثر قلبه عن شئ“ جس شخص کا دل کسی چیز کے اثر کو قبول نہ کرے اسے ”غلیظ القلب“ کہا جاتا ہے۔



خیال رہے کہ بعض اوقات انسان تیز مزاج نہیں ہوتا اور کسی کو ایذا بھی نہیں دیتا لیکن وہ کسی پر رحم نہیں کرتا اور کسی پر نرم بھی نہیں ہوتا، اسی وجہ سے دونوں چیزوں کا ذکر کیا کہ نبی کریم ﷺ تند مزاج بھی نہیں تھے اور سخت دل بھی نہیں تھے بلکہ نرم دل تھے اور رحم فرمانے والے تھے۔

(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۳، ۶۶)

نبی کریم ﷺ کی نرم دلی اور حسن اخلاق:

(سورة الحجر، آية نمبر ۸۸)

﴿وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾

(کنز الایمان)

”اور مسلمانوں کو اپنے رحمت کے پروں میں لے لو۔“

(سورة الاعراف، آية نمبر ۱۹۹)

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾

اے محبوب معاف کرنا اختیار کرو، اور بھلائی کا حکم دو، اور جاہلوں سے منہ پھیر لو۔ (کنز الایمان)

(سورة القلم، آية نمبر ۴)

﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

(کنز الایمان)

اور بیشک تمہاری خوبو بڑی شان کی ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾

(سورة التوبة، آية نمبر ۱۲۸)

بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے، تمہاری بھلائی کے

(منقول از کبیر جلد ۹ صفحہ ۶۱)

(کنز الایمان)

نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان۔

عن عطاء بن يسار قال لقيت عبدالله بن عمرو بن العاص قلت اخبرني عن صفة

رسول الله ﷺ في التوراة قال اجل والله انه لموصوف في التوراة ببعض صفته في

القرآن يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذيرا وحرزا الاميين انت عبدى

ورسولى سميتك المتوكل ليس بفظ ولا غليظ ولا سخاب فى الاسواق ولا يدفع

بالسيئة السيئة ولكن يعفو ويغفر ولن يقبضه الله حتى يقيم به الملة العوجاء بان

يقولوا لا اله الا الله ويفتح بها اعينا عميا واذنا صما وقلوبا غلفا“

(رواه البخارى، مشكوة باب فضائل سيد المرسلين)

عطاء بن يسار کہتے ہیں، میں نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص کو کہا کہ تم مجھے خبر دو رسول اللہ ﷺ کی کسی صفت

کے متعلق جس کا ذکر توراة میں ہو، انہوں نے کہا ہاں (میں بتاتا ہوں) توراة میں آپ کی بعض وہ صفات بھی ذکر

ہیں، جو قرآن پاک میں ہیں، یعنی قرآن پاک میں ہے ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا



وَلَذِيْنَ اٰلَہِ اور یہ تمام صفات توراۃ میں بھی ہیں، کہ آپ کو رب نے فرمایا اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا شاہد بنا کر اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور آپ کو امین کا محافظ بنایا، اور رب تعالیٰ نے یوں فرمایا تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے، میں نے تمہارا نام متوکل رکھ دیا، آپ سخت مزاج نہیں، اور نہ ہی آپ سخت دل ہیں، اور نہ ہی آپ بازاروں میں چلانے والے ہیں، اور نہ ہی آپ برائی کو برائی سے دور کرنے والے ہیں، بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو اس وقت تک ہرگز قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ آپ کے ذریعے ٹیڑھی ملت کو درست کر دے، کہ وہ کہیں ”لا الہ الا اللہ“ اور آپ کے ذریعے اندھی آنکھوں کو کھول دیا جائے، اور بہروں کو کان عطاء کر دیے جائیں، اور بندوں کو کھول دیا جائے۔

### وضاحت حدیث:

اگرچہ حدیث پاک میں سے دو لفظوں ”لیس بفظ و غلیظ“ کو ذکر کرنا مقصد تھا، لیکن طلباء کرام کے فائدہ کیلئے مکمل حدیث نقل کر دی اور تمام کی تشریح بھی کی جا رہی ہے، جب عطاء بن یسار نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف توراۃ میں بھی ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں ”اجل“ کہا پہلے دو لفظوں پر زبر اور تیسرا حرف ساکن ہے، اس کا معنی ہے ”ہاں“ یعنی آپ کے اوصاف توراۃ میں بھی مذکور ہیں۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَٰهِدًا﴾ اے نبی ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا ”شاہدا“ حال مقدرہ ہے فاعل سے یا مفعول سے، معنی یہ ہے کہ اے نبی آپ کو جن لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے خواہ آچکے ہیں یا ابھی انہوں نے آنا ہے آپ ان کی تصدیق و تکذیب پر شاہد ہیں

”مقبولا قولک عند اللہ لہم وعلیہم کما یقبل الشاہد العدل فی الحکم“

اس حال میں کہ آپ کا قول اللہ تعالیٰ کے ہاں تصدیق کرنے والوں کیلئے جزاء خیر اور تکذیب کرنے والوں کیلئے عذاب میں مقبول ہوگا جیسا کہ عادل گواہ کا قول فیصلہ کرنے میں مقبول ہوتا ہے

”او شاہدا لافعال امتک یوم القیامۃ“ یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو قیامت کے دن آپ کی امت کے افعال پر گواہ بنایا جائے گا

”او لجمیع الانبیاء فی تبلیغہم کما قال اللہ تعالیٰ“ ﴿فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ بِشَہِیْدٍ وَجِئَا بِکَ عَلٰی ہٰؤُلَاءِ شَہِیْدًا﴾ (سورۃ النساء آیہ نمبر ۴۱)

”یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو تمام انبیاء کرام کی تبلیغ پر شاہد بنایا جائے گا۔“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) تو کیسی



ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں اور اے محبوب تمہیں ان سب کو گواہ۔ (کنز الایمان)  
 ”او مز کیا لامتك فی شهادتهم علی الامم تبلیغ رسالة الانبیاء الیهم كما قال الله  
 تعالیٰ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلٰی النَّاسِ وَیَكُوْنُ الرَّسُوْلُ  
 عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا﴾ (سورة البقرة آية نمبر ۱۴۳)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔  
 یا آپ کو اپنی امت کا شاہد بتایا گیا، کہ آپ کی امت جب انبیاء کرام کی تبلیغ پر گواہی دے گی کہ اے اللہ یہ کافر جو انبیاء  
 کرام کی تبلیغ کا انکار کر رہے ہیں جھوٹے ہیں، تو وہ کفار نبی کریم ﷺ کی امت پر اعتراض کریں گے کہ یہ گواہی کیسے  
 دے رہے ہیں یہ تو بعد میں آئے ہیں، مؤمنین بتائیں گے کہ ہمیں تو ہمارے نبی کریم ﷺ نے بتایا ہے، تو اس وقت نبی  
 کریم ﷺ اپنی امت کی سچائی کی گواہی دیں گے۔

”او معناه شاهدنا لقدرتنا وارادتنا فی الخلق كما یبشیر الیه قوله (ومبشرا) ای  
 للمؤمنین بالثوبة (ونذیرا) ای منذرا ومحفوظا للكافرین بالعقوبة“  
 اور آپ کے شاہد ہونے کا اور مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ مخلوق میں وہ ہمارے قدرت اور  
 ارادہ کی گواہی دیں گے، اسی کی طرف آنے والے الفاظ (مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا) اشارہ کر رہے ہیں کہ آپ  
 مؤمنوں کو بشارت دیں گے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر ثواب دینے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ اس پر قادر  
 بھی ہے، اور آپ کافروں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں گے کہ وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ رکھتا  
 ہے، تم اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکو گے کہ وہ اس پر قادر ہے۔

**تنبیہ:** نبی کریم ﷺ کی گواہی میں جو احتمال بیان کئے گئے ہیں وہ تمام ہی آپ کو حاصل رہیں گے، اس لئے  
 مراقاة میں ہے جہاں جہاں ”او“ آ رہا ہے اسے ”واؤ“ کے معنی میں لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، اگرچہ میں نے معنی  
 ظاہر کے مطابق ”یا“ کیا ہے لیکن پسند یہی ہے کہ معنی ”اور“ کیا جائے۔ (راقم)

**حرز الامین:** آپ امی لوگوں کیلئے محافظ ہیں ”حرز“ حاء کے نیچے زیر ہے اور راء ساکن ہے ”امین“ سے  
 مراد عرب لوگ ہیں ”وانما وسمعوا امین لان اغلبهم لا یقرؤن ولا ینکون“ ان کو امی کہا گیا ہے، اس کی وجہ  
 یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ لوگ لکھتے، پڑھتے نہیں تھے ”اولا ینسبون الی ام القری وہی مکہ“ یا ان کو امی  
 اس وجہ سے کہا گیا کہ وہ مکہ مکرمہ کی طرف منسوب تھے ”او ینکون نبیہم امیا“ یہ اس وجہ سے ان کو امی کہا گیا کہ ان  
 کے نبی امی ہیں، اس وجہ کے متعلق علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”ولعل هذا الوجه فی هذا المقام اوجه



لیشمل جميع الامة“ یہ وجہ سب سے بہتر ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی تمام امت کو شامل ہے، یہاں سے یہود کا یہ دعویٰ بھی رد ہو جائے گا کہ آپ صرف عرب کے نبی ہیں، نبی کریم ﷺ کی رسالت عامہ کا ذکر رب قدوس نے یوں فرمایا۔  
(سورة النساء آية لمبر)

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام لوگوں کی طرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔“ اور نبی کریم ﷺ نے اپنی رسالت عامہ کا یوں ذکر فرمایا ”قال لو كان موسى حيا لما وسعه الاتباعي“ اگر موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ ”قال ابن الملك ويجوز ان يكون المراد بالخرز حفظ قومه من عذاب الاستقبال“ ابن الملك رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی صفت ”خرز“ کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو تباہ و برباد کر دینے کے عذاب سے بچایا ہوا ہے۔ ”والحفظ لهم من العذاب مادام فيهم“ اور یہ بھی مراد ہے کہ آپ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو عذاب سے اس وقت تک بچائے رکھتا ہے جب تک ان میں موجود ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(الانفال آية نمبر ۳۳) ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ﴾

اور نہیں کہ اللہ ان کو عذاب کرے جب تک اے محبوب آپ ان میں تشریف فرما ہیں۔

**انت عبدی:** توراۃ میں نبی کریم ﷺ کا اور وصف بیان کیا گیا ”تم میرے عبد (بندہ خاص) ہو یہ“ عبد خاص“ والا معنی اضافت سے سمجھ آ یا، اور اضافت تشریفی ہے۔

**ورسولی:** اور آپ میرے خاص رسول ہیں، یہاں بھی اضافت تخصیص و تشریف پر دلالت کر رہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ﴾ (سورة الفتح، آية نمبر ۲۸) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔ (کنز الایمان)

یعنی ”رسولہ“ میں بھی اضافت تشریفی ہے، مراد خاص رسول یعنی ہوا۔ نبی کریم ﷺ ہیں، طلباء کرام پر یہ بات مخفی نہیں کہ اضافت جب عہد کیلئے ہو تو مضاف خود بخود معین ہو جاتا ہے، اور خصوصی طور پر ”اذا اطلق اسم الجنس فالمراد به الفرد الاكمل“ جب اسم جنس کو مطلقاً ذکر کیا جائے تو اس سے مراد فرد اکمل ہوتا ہے۔

**سميت المتوكل:** رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا وصف توراۃ میں بیان کیا ”نام رکھا میں نے آپ کا متوکل۔

”ای خصصتك بهذا الوصف لکمال تو کلک علی و تفویضک الی و تسلیمک لدی عملا بما فی القرآن“ (وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ) (وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ)



یعنی میں نے آپ کو اس وصف سے خاص کر دیا ہے کہ آپ نے مجھ پر کامل بھروسہ کیا، اور تمام امور آپ نے میرے سپرد کئے، اور تمام کام آپ نے میرے ذمہ کر دیئے، اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ نے قرآن پاک پر کامل عمل فرمایا، کیونکہ آپ کو حکم دیا گیا (اور آپ بھروسہ کریں اللہ پر) اور آپ کو حکم دیا گیا ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ﴾ اور بھروسہ کریں اس پر جو زندہ ہے جس پر موت نہیں آئے گی، تو آپ نے ان ارشادات پر عمل کرتے ہوئے کامل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کیا تو رب تعالیٰ نے آپ کا نام ”متوکل“ رکھ دیا۔

**لیس بفظ:** والمعنى ليس بسنى الخلق أو القول "معنى یہ ہے کہ آپ تند مزاج نہیں، آپ کے قول میں سختی نہیں۔  
**ولا غليظ:** "ای ضخیم کربہ المنظر أو سبی الفعل أو غليظ القلب وهو الاظهر لقوله تعالى وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ"

آپ میں بد نما موٹا پہ نہیں، آپ کے افعال برے نہیں، آپ کا دل سخت نہیں، اس معنی کو علامہ طاعلی قاری رحمہ اللہ نے زیادہ بہتر قرار دیا، کہ یہ معنی رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ﴾ کے مناسب ہے۔

**"ولا سخاب:** بتشديد الخاء في الاسواق" آپ بازاروں میں چلانے والے نہیں۔

"قال الطيبي ای هو لين الجانب تشریف النفس لا يرفع الصوت على الناس لسوء خلقه ولا يكثر الصياح عليهم في السوق لدنائه بل يلين جانبه لهم ويرفق بهم"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نرم مزاج ہیں، شریف النفس ہیں، اور آپ سخت مزاج نہیں کہ لوگوں پر آواز بلند کریں، اور آپ میں گھٹیا پن نہیں پایا گیا کہ آپ بازاروں میں چیخیں چلائیں بلکہ آپ نرم مزاج ہیں اور مہربانی فرمانے والے ہیں "ولا يدفع بالسينة السينة" اور آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، حالانکہ برائی کا بدلہ برائی سے دینا جائز ہے، لیکن معاف کر دینا زیادہ ہی بہتر ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ (سورۃ الشوری، آیت نمبر ۴۰)

اور برائی کا بدلہ اسی کے برابر برائی ہے تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

(کنز الایمان)

"اطلاق السينة على جزائها للمشاكله" برائی کے بدلہ پر برائی کا اطلاق مشاکلت کیلئے ہے یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بظاہر شکلا بدلہ بھی برانظر آتا ہو۔

"ولكن يعفوای عن المسنى ويفر ای يستر او يدعوله بالمغفرة لقوله تعالى فاعف



عنہم واستغفرلہم“

لیکن آپ برائی سے درپیش آنے والوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور ان کو بخش دیتے ہیں، یعنی ان کی پردہ پوشی فرماتے اور رب تعالیٰ سے بھی ان کی بخشش کی دعاء کرتے ہیں، رب تعالیٰ نے بھی آپ کو یہی ارشاد فرمایا ”آپ ان کو معاف کر دیں، اور ان کیلئے بخشش طلب کریں“ ”وہذا اقرب مراتب معاملتہ مع المسینین“ نبی کریم ﷺ کا برائی سے درپیش آنے والوں کو معاف کر دینا یہ زیادہ قریب مرتبہ تھا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر ”وکان قدیقا بلہم بالاحسان“ نبی کریم ﷺ کا وصف یہ تھا کہ آپ برائی سے درپیش آنے والوں پر احسان بھی فرماتے تھے۔

ولن یقبضہ اللہ حتی یقیم بہ الملة العوجاء بان یقولوا لا الہ الا اللہ“

اور آپ کا وصف یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو قبض نہیں کرے گا یہاں تک کہ آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ٹیڑھی ملت کو سیدھا کر دے گا، کہ وہ کہیں گے ”لا الہ الا اللہ“

اس سے مراد ملت ابراہیمی ہے کہ ایام فترت میں اس پر عمل چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ اس میں کہیں زیادتیاں کر دی گئی تھیں، اور کہیں کمی کر دی گئی تھی ”حتی قام الرسول ﷺ فأقامہا اللہ وادامہا“ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کے ذریعے ملت ابراہیمی کو پھر قائم و دائم کر دیا گیا، اور آپ کے ذریعے پھر ”لا الہ الا اللہ“ کا دور شروع ہو گیا ”وبفتح بہا اعینا عمیا و آذاننا صما و قلوبنا غلفا“ اور اس کلمہ کے ذریعے دین کے اندھوں کو حق راہ دیکھنی نصیب ہو گئی، اور بہرے کانوں کو سننے کی طاقت مل گئی، اور جن دلوں پر پردہ چھایا ہوا تھا ان سے پردے ہٹ گئے۔

(مکمل تشریح حدیث ماخوذ از مرقاۃ جلد ۱۱ صفحہ نمبر ۵۳، ۵۴)

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ”تو آپ درگزر رکھیں ان سے۔“

جس آیت کریمہ کی وضاحت جاری ہے، اسی کا یہ حصہ بھی ہے، پہلے بیان فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ جس کا مطلب بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ نے احد میں صحابہ کرام کی اجتہادی خطا کو معاف کر دیا وہ آپ کی نرم طبیعت، حسن اخلاق کا ذریعہ تھا، اب دوبارہ پھر ”فَاعْفُ عَنْهُمْ“ ارشاد فرمایا، اسی وجہ سے واقعہ نے ترجمہ کیا ہے ”تو آپ درگزر رکھیں ان سے“ یعنی جس طرح آپ نے پہلے ہی معاف فرما دیا ہے اسی طرح معافی کو ہمیشہ کیلئے جاری رکھئے، راقم کا ترجمہ تقریباً تفسیر ابی السعود کی اس عبارت میں دیکھئے۔

(فاعف عنہم) لتریب العفو او الأمر به علی ما قبلہ ای اذا کان الأمر کما ذکر فاعف

عنہم فیما يتعلق بحقوقک کما عفا اللہ عنہم“



”فاء“ ترتیب کیلئے ”عفو“ یا عفو کے امر کو ماقبل پر مرتب کیا، یعنی جب معاملہ اس طرح ہے جو ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی آپ ان کیلئے نرم دلی کا مظاہرہ کر چکے ہیں، تو اس کے بعد بھی آپ کے اپنے حقوق جو ان پر ہیں ان میں بھی معافی جاری رکھیں اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ”اور بخشش طلب ان کیلئے۔“

(وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ) اللہ فیما يتعلق بحقوقه تعالى اماما للشفقة عليهم واكما للبر بهم“ اور آپ ان کیلئے حقوق اللہ کے ساتھ متعلق تمام چیزوں میں ان کیلئے بخشش طلب کریں کہ اے اللہ اگر ان سے حقوق اللہ میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو ان کو معاف فرمادے، آپ کی دعا ان کیلئے کامل شفقت ہو گیا اور ان کیلئے آپ کی یہ دعا مکمل ان پر احسان ہوگا۔ (تفسیر ابی السعود)

**تنبیہ:** بعض حضرات نے احد میں صحابہ کرام کے پسپا ہونے کو اجتہادی خطا تک محدود کیا، بعض حضرات نے اجتہادی خطا کو بھی صرف درے سے ہٹنے والوں پر محدود کیا ہے، اور بعض حضرات نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، جن حضرات نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے، انہوں نے اس آیت کریمہ سے یہ دلیل پکڑی ہے۔

”فی هذه الآية دلالة قوية على انه تعالى يعفو عن اصحاب الكبائر، وذلك لان الانهزام في وقت المحاربة كبيرة لقوله تعالى ”وَمَنْ يُؤْلِهِمْ يَوْمَئِذٍ ذُبْرَةٌ“ (الی قوله) فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ“ فثبت ان انهزام اهل احد كان من الكبائر لم انه تعالى نص في الآية المتقدمة على انه عفا عنهم وامر رسوله ﷺ في هذا الآية بالعفو عنهم لم امره بالاستغفار لهم“

اس آیت کریمہ میں قوی دلالت اس پر پائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ والے لوگوں کو بھی معاف فرمادیتا ہے، کیونکہ احد میں صحابہ کرام کا لڑائی سے پسپا ہونا گناہ کبیرہ تھا، اس پر دلیل ان حضرات نے قریب ہی آنے والی آیت ﴿وَمَنْ يُؤْلِهِمْ يَوْمَئِذٍ ذُبْرَةٌ﴾ سے پکڑی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرمادیا، اور نبی کریم ﷺ کو بھی معاف کر دینے اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا، خیال رہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے اسی لئے آخر میں ذکر کیا ”وذلك من ادل الدلائل على ما ذكرنا“ یہ دلیل ہماری بہت قوی دلیل ہے جو ہم نے احد سے پسپا ہونے والوں کو گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا ہے۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

اگرچہ واقعہ کا ذہن اسکے خلاف ہے جو سابقہ اوراق میں سمجھا آ سکتا ہے، لیکن واقعہ سلف صالحین کی تحقیقی



بحثوں پر سچ پا بھی نہیں ہوتا، کہاں علامہ رازی رحمہ اللہ کہاں میرے جیسا، ہچمدان ناقل جو آپ کے ارشادات کو کما حقہ ادا بھی نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے خلاف لب کشائی سے محفوظ رکھے۔ (راقم)

فائدہ جلیلہ:

فدلت هذه الآية على انه تعالى يشفع محمدا ﷺ في الدنيا في حق اصحاب الكبائر  
فبان يشفعه في حقهم في القيامة كان اولی

یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آپ کی امت کیلئے دنیا میں شفاعت کرنے والا بنایا، اسی لئے فرمایا ”وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ“ اور آپ ان کیلئے بخشش طلب کریں، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ قیامت کے دن اور ہی زیادہ آپ کو شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

ترتیب عجیب:

پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کرنے کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ﴾ اور تحقیق اللہ نے ان کو معاف کر دیا، پھر نبی کریم ﷺ کو ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ”وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ“ ان کیلئے بخشش طلب کرو۔

كَأَنَّهُ قِيلَ لَهُ يَا مُحَمَّدُ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ قَبْلَ أَنْ تَسْتَغْفِرَ لَهُمْ وَاعْفَ عَنْهُمْ  
فإِنِّي قَدْ عَفَوْتُ عَنْهُمْ قَبْلَ عَفْوِكَ عَنْهُمْ ”وهذا يدل على كمال رحمة الله لهذه الامة  
وَالله اعلم بقوله تعالى وشاورهم في الامر“

گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ آپ ان کیلئے بخشش طلب کرو، بیشک میں نے ان کی بخشش آپ کی ان کیلئے بخشش طلب کرنے سے پہلے ہی کر دی، اور آپ ان کو معاف کر دو، میں نے ان کو آپ کے معاف کرنے سے پہلے ہی معاف کر دیا، اس کے بعد تیسرے مرتبہ میں مشورہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ان سے امور میں مشورہ کرو، مشورہ کرنے کے ذکر سے پہلے ایک اہم ذکر ضروری ہے۔ (ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۵)

نرمی کر کے حقوق اللہ کو ضائع کرنا جائز نہیں:

العین والسرفق انما يجوز اذا لم يفض الى اهمال حق من حقوق الله فاما اذا أدى الى  
ذلك لم يجز



دین میں اس طرح نرمی کرنا حرام ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو چھوڑنا لازم آئے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔  
﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾  
اے غیب بتانے والے (نبی) کافروں پر اور منافقوں پر جہاد کرو اور ان پر سختی فرماؤ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور کیا ہی برا انجام۔  
(سورۃ التحریم، آیہ نمبر ۹)

رب تعالیٰ نے اور ارشاد فرمایا:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَيَشْهَدُ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾

(سورۃ النور، آیہ نمبر ۲)

جو عورت بدکار ہو اور جو مرد تو ان میں ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمہیں ان پر ترس نہ آئے اللہ کے دین میں اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ اور پچھلے دن پر اور چاہیے کہ ان کو سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ حاضر ہو۔  
(منقول از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۳)

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ”اور آپ مشورہ کریں ان سے کاموں میں۔“

”شَاوِرْهُمْ يَشَاوِرُ مَشَاوِرَةً شَوَارًا“ اس کا معنی ماخوذ ہے ”شَرْتُ الْعَسَلِ“ سے اس کا مطلب ہے میں نے شہد نکالا، اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے ”اور کاموں میں ان سے مشورہ لے“ اور کبھی اس کا معنی لیا جاتا ہے ”شَرْتُ الدَّابَّةِ شَوَارًا“ جب تم چوپائے کو کسی جگہ پیش کرو، تو اس وقت کہا جاتا ہے ”کانہ بالعرض يعلم خيره وشره“ یعنی جب چوپائے کو کسی جگہ لے جاؤ (چرانے وغیرہ کیلئے) تو اس جگہ کا اچھا ہونا یا اچھا نہ ہونا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح

”فَكَذَلِكَ بِالْمَشَاوِرَةِ يَعْلَمُ خَيْرَ الْأُمُورِ وَشَرَّهَا“

مشورہ کرنے سے کاموں کی اچھائی اور برائی کا پتہ چلتا ہے۔

واقم نے اسی کے مناسب ترجمہ کیا ہے ”اور آپ مشورہ کریں ان سے کاموں میں۔“

مشورہ نہ کرنے والے حاکم کو معزول کر دیا جائے:

قال ابن عطية والشورى من قواعد الشريعة وعزائم الاحكام من لا يستشير اهل العلم والدين فعزله واجب، هذا مالا خلاف فيه“



ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ مشورہ کرنا شرعی قوانین سے ہے اور احکام میں پختہ ارادہ کرنے کا ذریعہ ہے جو شخص علماء اور دیندار لوگوں سے مشورہ نہیں کرتا ایسے شخص کو معزول کر دینا واجب ہے، اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں رب تعالیٰ نے مؤمنین کی مدح اپنے اس قول سے فرمائی:

﴿وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾  
(سورۃ الشوری آیت نمبر ۳۸)

اور وہ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم رکھی اور ان کا کام ان کے آپس کے مشورہ سے ہے، اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

مشورہ کرنے کی اہمیت سورۃ پاک کے نام سے ہی سمجھ آ رہی ہے، کہ اس ایک مضمون کی وجہ سے پوری سورۃ کا نام ہی الشوری رکھ دیا گیا۔ (راقم)

ایک اعرابی کہہ رہا تھا ”ما غبت قط حتی یغبن قومی“ مجھے غبن نہیں کیا جائے گا جب تک میری قوم کو غبن نہ کیا گیا، یعنی مجھے بھٹکا یا نہیں جاسکے گا جب تک میری قوم نہ بھٹک گئی، اس اعرابی سے پوچھا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا ”قال لا افعّل شینا حتی اشاورهم“ میں اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنی قوم سے میں مشورہ کر لیتا ہوں۔ (قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

### مشاورات کا عظیم قانون:

وقال ابن خویز منداد واجب علی الولاة مشاورۃ العلماء فیما لا یعلمون، وفیما اشکل علیہم من امور الدین، ووجوه الجیش فیما یتعلق بالحرب، ووجوه الناس فیما یتعلق بالمصالح، ووجوه الکتاب والوزراء والعمال فیما یتعلق بمصالح البلاد وعمارثہا“  
(قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

ابن خویز منداد رحمہ اللہ نے فرمایا احکام کو جب مسائل کا علم نہ ہو، اور دینی مسائل کو سمجھنے میں انہیں مشکل درپیش آ رہی ہو تو ان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ علماء کرام سے مشورہ کریں، اور جنگی امور کا مشورہ جنگ کرنے کے ماہرین سے کریں، اور نیکی کے کاموں اور ملک کے بہتری کے کاموں میں ملک کے سرکردہ نیک قبائل کے سردار آدمیوں سے مشورہ کر لے، اور ملک کو سنوارنے اور اس کی تعمیر و ترقی میں نیک عقلمند محررین اور عقلمند اور نیک وزراء اور نیک اور عقلمند حکومت میں کام کرنے والے عہدہ داروں سے مشورہ کر لے، بہت بڑا قانون سمجھ آ گیا کہ ماہر تعلیم سے تعلیمی امور کا مشورہ کر



لے، لیکن وہ تعلیم جو دین سے برگشتہ نہ کرے، دین سے دور صرف انگلش کے دلدادہ لوگوں نے آج ملک کو تباہی کے کنارہ پر کھڑا کر دیا، دین سے ناواقف لوگ آج یوں کہہ رہے ہیں، ہنود، یہود، قادیانی و عیسائی اور مسلم، سب ہی تو ہیں آپس میں بھائی بھائی، کاش کہ یہ لوگ سمجھیں کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایمان لانے والے اپنے دو چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے قریب کیا اور باقی کفار چچاؤں میں سے کسی کو اپنے قریب نہیں کیا، ہاں ہاں بات صرف یہی ہے۔  
 لپٹا جو دامن مصطفیٰ سے وہ یگانہ ہو گیا جس کے حضور ہو گئے اس کا زمانہ ہو گیا

آئیے دیکھئے اسی کا دوسرا رخ یہ ہے۔

جو تجھ سے یار پھرتے ہیں وہ یوں ہی در بدر خوار پھرتے ہیں

غرضیکہ ہر ماہر فن سے اس کے نیک تجربہ کار سے مشورہ لے (راقم) اور مشورہ دینے والا بھی نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی ”المستشار مؤتمن“ (جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ ائمن ہے) کے مطابق مشورہ دینے کو امانت سمجھ کر اپنی سمجھ اور صوابدید کے مطابق ہی مشورہ دے ”ماندم من استشار (رواہ الطبرانی) جس شخص نے مشورہ طلب کیا وہ اپنے فعل میں نادم (پشیمان) نہیں ہوتا، اور بیان کیا جاتا ہے ”من اعجب برأیہ ضل“ جس نے صرف اپنی رائے پر ہی تعجب کیا وہ بھٹک گیا

”قال العلماء وصفة المستشار ان يكون عالما دينا و قلما يكون ذلك الا في عاقل“

علماء نے بیان فرمایا کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ عالم ہو اور دیندار ہو، یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ عقلمند ہو۔  
 ”قال الحسن ما كمل دين امرئى مالم يكمل عقله“ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک کسی انسان کا دین کھل نہیں ہوتا جب تک اس کا عقل کامل نہ ہو۔ (قرطبی جلد ۴ صفحہ نمبر ۲۵۰)

مشورہ میں خطاء کے واقع ہونے پر کوئی پکڑ نہیں:

فاذا استشير من هذا صفة واجتهد في الصلاح وبذل جهده فو لعت الاشارة خطاء فلا غرامة عليه قاله الخطابي وغيره.

علامہ خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا گیا اگر اس میں صفات مذکور پائی گئیں، اس نے مشورہ دینے میں پوری جدوجہد کی لیکن اس سے غلطی واقع ہو گئی تو اسے کسی قسم کا کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔



## دنیاوی کاموں میں مشیر کیسا ہو؟

دنیاوی کام ہوں یا دینی ہوں جس سے مشورہ طلب کیا جائے اس کیلئے نیک ہونا دیندار ہونا ضروری ہے ”وصفة المتشار فی امور الدنيا ان يكون عاقلا مجربا“ دنیاوی کاموں کیلئے جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے اس کا عقلمند ہونا اور اس کام میں اسے تجربہ حاصل ہونا ضروری ہے جس کی کچھ مثالیں بیان کی جا چکی ہیں ”وقال بعضهم شاور من جرب الامور فانه يعطيك من رايه ما وقع عليه غالبا وانت تأخذه مجانا“ بعض حضرات نے بیان کیا ہے جن کاموں کا کسی کو تجربہ ہو اسی سے مشورہ لیا جائے، اسلئے کہ وہ اپنے تجربات سے تمہیں اچھی رائے دے گا اور تم اس سے مفت ہی اس کی اچھی رائے سے فائدہ حاصل کر لو گے ”شاور صديقك في الخفي المشكل و اقبل نصيحة صاحب مفضل“ اگر کسی کام میں خفاء پائی جائے یا تمہیں مشکل درپیش آئے تو اپنے دوست سے مشورہ کر لو اور فضیلت رکھنے والے صاحب کی نصیحت کو قبول کر لو

”وان باب امر عليك التوى فشاو رليبيا ولا تعصه“

اگر کسی کام کا دروازہ تم پر اٹک جائے تو عقلمند شخص سے مشورہ کرو اور اس کی نافرمانی نہ کرو۔ (ماخوذ از قرطبی جلد صفحہ نمبر ۲۵۱)

مشاورات میں عظیم برکت ہے:

❖ قال الله ما لدم من استشار ولا خاب من استخار“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے مشورہ کیا وہ پشیمان نہیں ہوا، اور جس نے استخارہ کیا وہ رسوا نہیں ہوا۔

❖ وروی سهل بن سعد الساعدي عن رسول الله ﷺ ما شقي قط عبد بمشورة وما سعد باستغناء رأي“

سہل بن سعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشورہ کرنے والا شخص بد بخت نہیں ہوتا، اور اپنی رائے سے عمل کرنے والا (مشورہ نہ کرنے والا) نیک بخت نہیں ہوتا۔

❖ وقد جعل عمر بن الخطاب رضي الله عنه الخلافة وهي اعظم النوازل شوري“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کارناموں سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اپنی شہادت سے پہلے شدید زخمی حالت میں مشاورتی کمیٹی قائم کر دی کہ یہ خلافت کا معاملہ آپ لوگ باہمی مشورہ سے طے کر لو، اس مشاورتی کمیٹی میں آپ نے اپنے بیٹے کو نہیں رکھا تا کہ یہ سلسلہ موروثی نہ ہو جائے، بادشاہت قائم نہ ہو جائے۔

❖ قال البخاري وكانت الائمة بعد النبي يستشيرون الامنا من اهل العلم في الامور



المباحة لياخذوا بأسهلها“

بخاری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ائمہ کرام حکام، خلفاء کرام مباح کاموں میں امین علماء کرام سے مشورہ کرتے تھے تاکہ آسان پر عمل کریں اور مشکل کو چھوڑ دیں۔

وقال سفيان الثوري ليكن اهل مشورتك اهل التقوى والامانة ومن يخشى الله تعالى“  
حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا تم اپنے مشورہ کیلئے متقی، پرہیزگار، امانت دار اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا انتخاب کرو۔

وقال الحسن والله ما تشاور قوم بينهم الا هدام لافضل ما يحضر بهم“  
حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ مشورہ کرنے والی قوم کو اللہ تعالیٰ نے ضرور ہدایت سے نوازا مشورہ کرنے سے ان کی رائے سے زیادہ فضیلت والا کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔  
روی عن علي بن ابي طالب ؓ قال قال رسول الله ﷺ ما من قوم كانت لهم مشورة فحضر معهم عن اسمعيل احمد او محمد فادخلوه في مشورتهم الا خير لهم“  
حضرت علی بن طالب ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی قوم مشورہ کیلئے جمع ہوں تو اس میں ان لوگوں کو ضرور شامل کر لیا کرو جن کے ناموں میں محمد، احمد آئے تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس مشورہ میں ضرور ہی خیر و برکت عطا فرمائے گا۔  
(ماخوذ از قرطبی جلد ۲ صفحہ نمبر ۲۵۱)

نبی کریم ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دینے میں حکمت :-

اگرچہ اس میں کئی حکمتیں پائی گئی ہیں، لیکن ان میں سے عظیم حکمت یہ ہے۔  
(۱) قال الحسن وسفيان بن عينة انما امر بذلك ليقنن به وغيره في المشاورة  
وبصيرة في امة“

ان تمام وجوہ سے واضح کو یہ وجہ عظیم نظر آئی جو حضرت حسن بصری اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہما نے ذکر فرمائی کہ آپ کو صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دیا کہ آپ کی اقتداء اور لوگ بھی کریں، اور آپ کی امت کیلئے مشورہ کرنا سنت بن جائے، یعنی آپ کو مشورہ کرنے کا حکم تعلیم امت کیلئے تھا۔

(۲) ان مشاورة الرسول ﷺ اياهم لوجب علو شانهم ورفعة درجتهم وذلك يقتضى

شدة محبتهم له وخلو صهم في طاعتهم“

نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دے کر یہ واضح کر دیا کہ صحابہ کرام کو عظمت شان حاصل



ہے ان کے درجات میں بلندی پائی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کو نبی کریم ﷺ سے شدید محبت حاصل تھی، اور وہ آپ کی فرمانبرداری بہت خلوص و محبت سے کرتے تھے۔

(۳) نبی کریم ﷺ کو سب لوگوں سے کامل عقل حاصل تھی، مگر یہ کہ مخلوق کے علوم متناہی ہیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کو امت کے فائدے کیلئے یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب آپ کو اعلیٰ عقل حاصل ہے تو جن سے مشاورت کا حکم دیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کسی کو زیادہ تجربہ ہو، وہ اس تجربہ کی وجہ سے جو رائے دے اس میں دوسروں کا فائدہ ہو، تو آپ بھی بہتر سمجھیں تو تجربہ کار کی رائے کو تسلیم کر لیں۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے غزوہ احد کا مشورہ کیا تو نو جوان صحابہ کرام اور شہادت سے سرشار حضرات نے میدان جنگ میں نکلنے کا مشورہ دیا، خود نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنا چاہتے تھے ”فلما خرج وقع ما وقع“ جب آپ صحابہ کرام کے مشورہ سے میدان جنگ میں تشریف لے گئے وہاں نبی کریم ﷺ کا زخمی ہونا، ستر صحابہ کرام کا شہید ہونا، اور بہت صحابہ کرام کا زخمی ہونا جیسے واقعات درپیش آ گئے، تو اُس کے بعد اگر آپ صحابہ کرام سے مشورہ چھوڑ دیتے تو ان کے دلوں میں یہ بات آتی کہ غزوہ احد میں جو ہم نے مشورہ دیا تھا وہ نبی کریم ﷺ کی رائے کے خلاف تھا، اسی وجہ سے آپ نے ہم سے مشورہ کرنا چھوڑ دیا، اس طرح ان کے دل پریشان ہوئے۔

”فامرہ اللہ تعالیٰ بعد تلک الواقعة بان یساورہم لیدل علی انہ لم یتق فی قلبہ الر من تلک الواقعة“

تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بعد نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ جاری رکھیں تا کہ ان کے دل سے یہ اثر ختم ہو جائے کہ شاید آپ ان سے اس کے بعد کبھی مشورہ نہیں کریں گے۔

(۵) ”وَسَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ“ لَا تَسْتَفِیدُ مِنْهُمْ رَايَا وَعِلْمًا لَّكِنْ لَعَلَّی تَعْلَمُ مَقَادِيرَ عَقُولِهِمْ وَافْهَامِهِمْ وَمَقَادِيرَ حَبْهِمْ لَكِ وَأَخْلَاصِهِمْ فِی طَاعَتِكَ فَحِينَئِذٍ يَتَمِيزُ عِنْدَكَ الْفَاضِلُ مِنَ الْمَفْضُولِ فَبَيْنَ لَهُمْ عَلَى قَدَرِ مَنَازِلِهِمْ“

نبی کریم ﷺ کو جو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ان کی رائے اور علم سے فائدہ حاصل کرنے کے محتاج تھے، بلکہ آپ کو اس لئے حکم دیا گیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام کی عقلوں اور سمجھوں کا اندازہ کریں وہ بھی ایک دوسرے کی عقل و فہم کا اندازہ کر لیں، پھر آپ یہ بھی دیکھیں کہ وہ آپ سے کتنی قدر محبت کرتے ہیں، اور آپ کی اطاعت میں کتنے مخلص ہیں، اس طرح صحابہ کرام کے مدارج و مراتب واضح ہو جائیں گے کہ زیادہ مرتبہ والا کون ہے اور کم مرتبہ والا کون ہے۔

(۶) ”وَسَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ لَا لِأَنَّكَ مَحْتَاجٌ إِلَيْهِمْ وَلَكِنْ لِأَجْلِ أَنَّكَ إِذَا سَاوَرْتَهُمْ فِی الْأَمْرِ“



اجتهد كل واحد منهم في استخراج الوجه الا صلح في تلك الواقعة لتصير  
الارواح متطابقة متوافقة على تحصيل اصلح الوجوه فيها وتطابق الارواح الظاهرة  
على الشئ الواحد مما يعين على حصوله وهذا هو السر عند الاجتماع في  
الصلوات وهو السر في ان صلوة الجماعة افضل من صلوة المنفرد

آپ کو مشورہ دینے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ آپ کو ان کے مشورہ کی کوئی محتاجی تھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ آپ جب ان  
سے مشورہ طلب کرو گے تو ہر ایک اپنی رائے پیش کرنے میں مکمل اجتہاد کرے گا، پوری کوشش سے اس کام کیلئے بہتر  
رائے دے گا، اس طرح تمام روحوں، تمام شخصوں کا ایک کام کرنے میں اتفاق ہو جائے گا، جب نیک روحمیں ایک کام  
میں متفق ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان نیک لوگوں کے اتفاق کی وجہ سے اس کام میں خیر و برکت حاصل  
ہوگی، یہی راز پایا گیا ہے اس میں کہ نمازوں کو سب مجتمع ہو کر ادا کرو، اور یہی راز یہی فائدہ اس سے حاصل ہوا کہ اکیلے  
نماز ادا کرنے سے جماعت سے نماز ادا کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

(۷) لما امر الله محمدا عليه السلام بمشاروتهم دل ذلك على ان لهم عند الله قدرا  
وقيمة فهذا يفيد ان لهم قدرا عند الله وقدرا عند الرسول وقدرا عند الخلق

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ کریں تو اسی سے پتہ چل گیا کہ  
صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کے ہاں خصوصی قدر و منزلت پائی جاتی ہے، اور اسی سے یہ عظیم فائدہ حاصل ہو گیا کہ  
جن کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے حضور ہے، ان کو رسول اللہ ﷺ کے ہاں بھی خصوصی قدر و منزلت حاصل  
ہے ان کی قدر و منزلت مخلوق کے دلوں میں بھی راسخ ہو چکی ہے۔

دائم کہتا ہے اے طلباء کرام! ”الخلق“ پر الف لام عہد خارجی ہے، جس سے مراد نیک مخلوق، علم والی  
مخلوق، طاہر روح والی مخلوق، پاک اصل مخلوق ہے۔ بد طینت، جہلاء مراد نہیں، اے بد بخت انسان! خدا را خدا اور رسول  
سے مقابلہ کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کر، صحابہ کرام کی گستاخی سے اپنی قبر انگاروں سے نہ بھر۔

(۸) عظیم بادشاہ بڑے بڑے اہم کاموں میں مشورہ صرف اپنے خواص اور مقربین سے کرتا ہے، صحابہ کرام سے  
اگرچہ اجتہادی خطا ہوئی، وقتی طور پر پسا بھی ہوئے لیکن جب انہوں نے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو رب تعالیٰ  
نے انہیں معاف کر دیا، معاف کرنے کے بعد یہ بات ان کے دلوں میں آسکتی تھی کہ اگرچہ ہمیں معاف تو کر دیا گیا ہے  
لیکن ہمارا وہ مرتبہ اور درجات پہلے حاصل تھے، وہ تمام ختم ہو چکے ہوں گے، تو رب تعالیٰ نے ان کو تسلی ہوئے فرمایا کہ میں  
نے تمہیں معاف کر دیا کیونکہ تم نے میری طرف رجوع کر لیا تو تمہارے مراتب کم نہیں گئے بلکہ اور زیادہ کر دیئے ہیں۔



”وذلك ان قبل هذه الواقعة ما امرت رسولی بمشاورتکم وبعد هذا الواقعة امرتہ بمشاورتکم لتعلموا انکم الآن اعظم حالا مما کنتم قبل ذلك والسبب فیہ انکم قبل هذه الواقعة کنتم تعولون علی اعمالکم وطاعتکم والآن تعولون علی فضلی وعفوی فیجب ان تصیر درجتکم ومنزلتکم الآن اعظم مما کان قبل ذلك لتعلموا ان عفوی اعظم من عملکم وکرمی اکثر من طاعتکم“

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے میں نے اپنے رسول (ﷺ) کو تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد آپ کو تمہارے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم دے دیا ہے، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اب تمہارا حال اور مرتبہ پہلے سے بڑھ گیا ہے، کیونکہ پہلے تم اپنے اعمال اور اپنی طاعت پر اعتماد کرتے تھے، اب تمہیں میرے فضل اور میرے معاف کرنے پر اعتماد ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اب تمہارے درجات اور مراتب پہلے سے بڑھ چکے ہیں، تمہیں یقین آنا چاہیے کہ میرا معاف کرنا تمہارے اعمال سے بہت عظیم ہے، اور میرا کرم تمہاری طاعت سے زیادہ ہے۔  
(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

### نبی کریم ﷺ کو امت سے مشاورت کب منع تھی؟

الفقوا علی ان کل ما نزل فیہ وحی من عند اللہ لم یجز للرسول ان یشاور فیہ الامۃ  
لأنه اذا جاء النص بطل الرأی والقیاس“

اس مسئلہ میں اہل علم کا اتفاق ہے، کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جن احکام کو وحی کے ذریعے بیان فرما دیا ان میں رسول اللہ ﷺ کو امت کے حضرات سے مشورہ کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ نص (وحی کے ذریعے حکم قرآنی) کے آجانے کے بعد رائے، قیاس مشاورت باطل ہو جاتے ہیں۔ (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

**مقام توجہ:** اس حکم سے پہلے بدر میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، یقیناً وہ مشورہ بھی رب تعالیٰ کے مرض کے مطابق ہی تھا، کیونکہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ کا وصف آپ کو حاصل تھا، خندق میں غطفان قبیلے سے صلح نہ کرنے کا مشورہ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کا نبی کریم ﷺ کا قبول فرمایا ﴿فَاَعْتَبِرُوا يَا اُولِيَ الْاَبْصَارِ﴾ ارشاد باری تعالیٰ، قیاس کرنے کا حکم دیتا ہے ”وكان علیہ الصلوٰۃ والسلام اولی الابصار“ جب نبی کریم ﷺ بصیرت رکھنے والوں کے سردار ہیں تو یہ حکم آپ کیلئے بھی تھا، پھر استنباط کرنے والوں کی شان رب تعالیٰ نے بیان فرمائی۔

﴿لَعَلِّمَهُ الَّذِينَ يَسْتَبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ وکان اکثر الناس عقلا وذكاء وهذا يدل علی انه



کان مامورا بالاجتهاد اذا لم ينزل عليه الوحي  
نبی کریم ﷺ سب لوگوں سے جب زیادہ عقلمند اور ذکی و ذہین تھے تو یقیناً آپ کو بھی قیاس، استنباط  
واجتہاد کرنے کا حکم تھا، البتہ شرط یہی تھی کہ اس میں وحی نازل نہ ہوئی ہو، وحی کے نازل ہونے کے بعد  
قیاس یا مشاورت جائز نہیں تھا۔ (ماخوذ از کیہ جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

علماء کرام اور طلباء کرام کیلئے لمحہ فکریہ:

قوله تعالى (وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ) يدل على وجوب  
استعمال اللين والرفق وترك الفظاظ والغلظة في الدعاء الى الله تعالى كما قال  
الله تعالى (إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ  
أَحْسَنُ) وقوله تعالى لموسى وهارون "فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا" لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل  
ہوتے تو وہ آپ کے ارد گرد سے ہٹ جاتے) اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف جب کسی کو بلایا جائے تو  
اس شخص کیلئے واجب ہے کہ وہ نرم لہجہ، نرم رویہ، نرم طبیعت رکھتے ہوئے دعوت دین اسلام دیں، سخت مزاجی، سخت دلی کو  
چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنی راہ کی طرف بلانے کا طریقہ بتا دیا، (ترجمہ) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر  
اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو اور رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت  
ہارون علیہما السلام کو فرمایا (ترجمہ) تو اس سے نرم بات کہنا اس امید پر کہ وہ دھیان کرے یا کچھ ڈرے۔

جب رب تعالیٰ نے دین اسلام کی تبلیغ کو نرمی اور اچھی نصیحت سے مشروط کر دیا ہے تو آئے دن مسائل میں جنگ  
وجہال کیوں؟ غلیظ زبانوں کا استعمال کیوں؟ جہلاء سے تقاریر کرانے کا رواج کیوں؟ (احکام القرآن للبخاری جلد ۲ صفحہ نمبر ۴۰)  
علماء کرام! خدا را سوچئے تمہیں خریدنے والے یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ ہیں، جو تمہیں لڑا رہے ہیں، وہ عقلمند  
ہیں جو اپنے مقاصد حاصل کر رہے ہیں، مجھے معاف کرتے ہوئے یوں کہنے دیجئے کہ بے وقوف وہی علماء و طلباء ہیں جو  
اغیار کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں، ان کے ہاتھوں بک رہے ہیں جو ان کے بک کا ذریعہ بن رہا ہے، معمولی  
بات پر پورے پاکستان کے درود یوار چاکنگ کر کے علماء کو لڑا کر قتل کرنے کا بہانہ بنایا جاتا ہے، علماء علماء کو نہیں قتل کر  
رہے بلکہ یہودیوں کے آلہ کار قتل کر کے ایک فرقہ کے مقتولوں کو دوسرے فرقہ کے ذمہ ڈال دیتے ہیں حالانکہ قاتل وہ  
خود ہوتے ہیں، علماء کرام اور طلباء کرام کی خدمت میں بعد ادب و احترام عرض ہے سمجھئے خدا را سمجھئے، اگر نہ سمجھئے تو نیست



(راقم)

و نابدو ہو جاؤ گے، قادیانیت چھا جائیگی، قادیانی دندنا رہے ہیں۔

### مسئلہ عظیمہ:

فجائز حنیث ان توافق آراؤہم رأی النبی وجائز ان یوافق رأی بعضهم رأیہ وجائز ان یخالف رأی جمیعہم فیعمل ۞ حنیث براءہ یكون فیہ دلالة علی انہم لم یكونوا معتقین فی اجتہادہم بل كانوا مأمورین فیہ لفعلہم ما امروا بہ ویكون علیہم حنیث ترک آرائہم واتباع رأی النبی ۞

نبی کریم ۞ جب صحابہ کرام سے مشورہ کر لیں تو ہو سکتا ہے کہ اس میں تمام صحابہ کرام کی بھی وہی رائے ہو اور بعض کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو، اور یہ احتمال بھی تھا کہ بعض کی رائے آپ کی رائے کے مخالف ہو اور بعض کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو، اور یہ احتمال بھی تھا کہ تمام کی رائے آپ کی رائے کے مخالف ہو، ان تمام صورتوں میں نبی کریم ۞ کی رائے پر عمل کرنا ہی ضروری تھا، آپ کی رائے کو تائید ربانی حاصل تھی، صحابہ کرام اپنی رائے اور اجتہاد میں مکمل آزاد نہیں تھے، ان سے مشورہ کرنا اور ان کا اجتہاد کرنا ان کے اجر و ثواب کیلئے تھا، اسی لئے صحابہ کرام کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنی آراء کو چھوڑ دیں اور نبی کریم ۞ کی رائے کا احترام کریں اور اسی کی تابعداری کریں۔

(احکام القرآن للجصاص صفحہ نمبر ۴۱، جلد ۲)

### دو حدیثوں میں تطبیق:

اخرجه الامام احمد من قوله ۞ للعمرین رضی اللہ عنہما لو اجتمعما علی مشورۃ ما خالفتما

نبی کریم ۞ نے حضرت عمر اور حضرت ابو بکر ۞ کو فرمایا اگر تم کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔

”واخرجه ابن عدی والبیہقی من قوله علیہ الصلوۃ والسلام عند نزول الآیۃ ”اما ان اللہ ورسوله یغنیان عنہا ولكن جعلها اللہ تعالیٰ رحمة لامتی“

جب اس آیہ کریمہ میں نبی کریم ۞ کو حکم دیا گیا ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ﴾ (آپ ان سے مشورہ کرو کاموں میں) تو اس کے نازل ہونے پر نبی کریم ۞ نے فرمایا ”خبردار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ۞ دونوں ہی لوگوں سے مشاورت سے مستغنی ہیں، وہ محتاج نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے میری امت پر رحمت فرمائی کہ ان سے مشورہ کرنے کا



حکم دیا۔ بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے کیونکہ پہلی حدیث پاک سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما متفق ہو جائیں تو نبی کریم ﷺ اس مشورہ کو ضرور مانتے، دوسری حدیث سے سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کے مشورہ کے نہ محتاج تھے اور نہ پابند تھے، ان میں تطبیق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اگرچہ کسی کے مشورہ کو قبول کرنے کے پابند نہ تھے، لیکن

”يحمل خبر عدم مخالفتهما لواجتماع علي الاشارة الى رفعة قدرهما وعلو شانهما وان اجتماعهما على امر لا يكون الاموافقا لما عند الله تعالى وهو الذي عليه المعول وبه العمل“

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قدر و منزلت کی بلندی اور رفعت شان کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کسی کام پر اتفاقی رائے قائم کر لیتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتا، اسی پر اعتماد کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان کے اتفاقی فیصلے کو قبول کیا، اور کبھی مخالفت نہیں کی۔ (ماخوذ از روح المعانی جلد ۳ صفحہ نمبر ۱۰۷)

خیال رہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اجتماعی مشورے کو قبول کرنا غزوہ احد میں واقع نہیں ہوا، یہی رائے علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں بیان کی ہے، آپ رقمطراز ہیں۔

”روى الواحدى فى الوسيط عن عمرو بن دينار عن ابن عباس انه قال الذى امر النبى ﷺ بمشاورة هم فى هذه الآية هم الذين امره بان يعفو عنهم ويستغفر لهم وهم المنهزمون فهذا باطل ان عمر كان من المنهزمين فدخل تحت الآية الا ان ابابكر ما كان منهم فكيف يدخل تحت هذه الآية، والله اعلم“ (كبير جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۷)

علامہ واحدی رحمہ اللہ نے وسط میں عمرو بن دينار کی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میرے نزدیک اس میں اشکال ہے، اسلئے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان حضرات سے مشورہ کرنے کا حکم دیا جن کو معاف کرنے کا حکم دیا اور ان کیلئے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا، یہ وہ لوگ تھے جو پسپا ہونے والے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو ثابت رہنے والوں میں سے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریب پہاڑ پر چڑھ گئے تھے، کیا آپ دفاع کی خاطر گئے تھے، یا کہ پسپا ہونے والوں میں تھے، اگر پسپا ہونے والوں میں تھے تو آپ بھی ان لوگوں میں داخل تھے جن سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

وعن ابن عمر كتب ابو بكر ان رسول الله ﷺ كان يشاور فى الحرب فعليك به“

(مظہری جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۶۱)



حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف لکھا کہ نبی کریم ﷺ جنگوں میں تمہارے ساتھ مشورہ کرتے تھے، اس لئے تم بھی اپنے کاموں میں مشورہ جاری رکھو۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہا انھا قالت ما رأیت رجلا اکثر استشارة للرجال من رسول اللہ ﷺ“ (معالم التنزیل للبغوی بالاسناد جلد ۱ صفحہ نمبر ۳۶۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی اور شخص نہیں دیکھا جس نے اپنے معاملات میں دوسروں سے مشورہ کیا ہو، یعنی سب لوگوں سے زیادہ اپنے معاملات میں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام سے زیادہ سے زیادہ مشورہ فرماتے تھے۔

### ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾

”تو جب آپ کا ارادہ کر لو تو توکل (بھروسہ) رکھو اللہ پر۔“

(فَإِذَا عَزَمْتَ) فاذا قطعت الراى على شئى بعد الشورى (فتوکل علی اللہ) فی امضاء امرک علی الارشد لا علی المشورة“ (مدارک التنزیل للسنفی)

مشورہ کے بعد جب کسی کام پر تمہاری رائے پختہ ہو جائے اور وہ کام کرنے کا تم پختہ ارادہ کر لو تو اس کام کے کرنے پر صرف مشورہ پر کامل اعتماد نہ رکھنا، بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ رکھنا کہ وہی تمہاری راہنمائی فرمائے گا، اور تمہارے کاموں کو بخوبی سرانجام دے گا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ ”بیشک اللہ محبت رکھتا ہے توکل کرنے والے سے۔“

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کا مطلب:

”فوض امرک الیہ واعتمد علیہ“ یعنی اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو اور اس پر اعتماد رکھو، یہی وجہ ہے کہ غزوہ احد کے متعلق صحابہ کرام سے جب آپ نے مشورہ کیا تو صحابہ کرام نے احد میں جانے کا مشورہ دیا، آپ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ نے ہتھیار جب زیب تن کر لئے یعنی اپنے جسم مبارک کے ساتھ ہتھیار لگا لئے تو صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مدینہ طیبہ میں رہ کر دفاعی جنگ کریں لیکن آپ نے فرمایا ”لا ینبغی لنبی ان یلبس لامتہ فیضعہا“ کسی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنے ہتھیار زیب تن کر لے تو پھر ان کو اتار دے، آپ کے اس ارشاد کی تائید میں ہی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ جب آپ کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، یعنی اعتماد صرف رب تعالیٰ پر ہو، نہ اپنی رائے پر ہو اور نہ ہی مشورہ پر کامل



بھروسہ ہو، اسلئے کہ مشورہ دینے والے اس کے انجام کو نہیں جانتے وہ صرف اپنے خیال کے مطابق بہتر مشورہ دیتے ہیں۔  
 ”وقد يتخبط العقل في النظر وقد يفعل الله تعالى على خرق العادة فلا وجه للاعتماد على الاراء“  
 انسانی عقل بعض اوقات نظر و فکر میں پھسل جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادات کے خلاف کام کر دیتا ہے، اس لئے انسان کو  
 چاہئے کہ وہ اپنی آراء پر کامل بھروسہ رکھے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے۔ (تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۶۲)

### توکل بمعنی التجاء الی اللہ:

”والتوکل ان يلتجئ الى الله خاصة ويطلب منه ان يجعل عاقبتہ سعیه خیرا ویحسن  
 الظن به فی ذلک“  
 توکل یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو ملجأ (جائے پناہ) بنائے، اور اسی سے اپنی کوشش، اپنے اعمال کی جزاء  
 طلب کرے، اور اسی پر کمال حسن ظن رکھے کہ وہی معطی ہے۔

### توکل بمعنی عدم معصیت:

قيل التوکل ان لا تعصى الله من اجل رزقک“ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ توکل یہ ہے کہ  
 رزق حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو، یعنی رزق حلال طلب کرنا توکل ہے، اور حرام طریقہ سے رزق  
 حاصل کرنا رب تعالیٰ پر بھروسہ نہ ہونے کے مترادف ہے۔

### توکل بمعنی صرف اللہ تعالیٰ سے طلب:

قيل معناه ان لا يطلب لنفسک ناصرا غیر الله ولا لرزقک خازنا غیره ولا لعملک  
 شاهد غیره“

توکل کا اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اپنا کوئی ناصر نہ بنایا جائے، اپنا رزق حاصل کرنے  
 میں کسی اور کو خازن نہ سمجھا جائے، اپنے اعمال کا کسی اور کو کوئی شاہد نہ بنایا جائے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ يدخلون الجنة سبعون الفامن امتی بغیر حساب  
 ، قيل يا رسول الله من هم قال هم الذين لا يكتوون ولا يسترقون ولا يتطيرون وعلى  
 ربهم يتوكلون“ (بخاری و مسلم) کذا روی البهوی عن عمران بن حصین

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ستر ہزار لوگ جنت  
 میں بغیر حساب کے داخل ہونگے۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے آپ نے



فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو جانوروں کو داغ نہیں دیں گے، جنتر منتر نہیں کریں گے فال نہیں نکالیں گے اپنے رب پر بھروسہ ہی رکھیں گے۔

عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله ﷺ لو انك تتوكلون على حق توكله لرزقكم كم يرزق الطير تغدو اخمصا وتروح بطناً (رواه الترمذی وابن ماجه)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر کامل توکل (بھروسہ) رکھو تو اللہ تعالیٰ تمہیں رزق دے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے صبح وہ بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔

**سوال:** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے تو پتہ چلتا ہے کہ ظاہری اسباب چھوڑ دینے کا نام توکل ہے حالانکہ ہم کتنے ہی اسباب کا سہارا لیتے ہیں تو کس طرح ان میں تطبیق ہے؟

**جواب:** "قلت لا بل ترك الاعتماد على الاسباب الاترى ان الاستيثار من باب التشبث بالاسباب فالله سبحانه امر بالاستشارة ثم امر ترك الاعتماد"

ظاہری اسباب سے مطلقاً منع نہیں فرمایا گیا بلکہ اسباب پر مکمل اعتماد سے منع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ پہلے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا، تو کہ مکمل اعتماد مشورہ پر ہی نہ کیا جائے۔  
”وقوله عليه الصلوة والسلام في الحديث وعلى ربهم يتوكلون ليس تفسيرا لقوله لا يكتون ولا يسترقون فان العطف يقتضى المغايرة“

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ "لا يكتون ولا يسترقون" کی تفسیر نہیں کیونکہ عطف مغايرة کو چاہتا ہے، حدیث شریف میں جن ستر ہزار کا ذکر ہے اس سے مراد بھی "لا تشبثون غالباً" وہ لوگ ہیں جو اسباب پر مکمل اعتماد نہیں کرتے ہوں گے، اسباب کے بغیر تو حیات ہی ممکن نہیں، کھانا، پینا حیات کے اسباب ہیں، نماز روزہ جنت کے اسباب ہیں۔  
(مظہری جلد ۲، ۱۶۲)

"دلت الآية على انه ليس التوكل ان يهمل الانسان نفسه كما يقول بعض الجهال والا لكان الامر بالمشاورة منافيا للأمر بالتوكل بل التوكل هو ان يراعى الانسان الاسباب الظاهرة ولكن لا يعول بقلبه عليها بل يعول على عصمة الحق" (کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۶۸)

یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اسے توکل نہیں کہا جاتا کہ انسان یونہی اپنے آپ کو بیکار چھوڑ دے جیسا کہ بعض جاہلوں کا کہنا ہے، مشورہ کرنے کا حکم ہی بتا رہا ہے کہ توکل اسے نہیں کہا جاتا کہ انسان ظاہری اسباب کو اختیار ہی نہ کرے بلکہ ظاہری اسباب کو اختیار کر کے ان پر مکمل اعتماد نہ کرے، محافظ کا رسا اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔



إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ  
وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۶۰)

(۱) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو ایسا کون ہے

جو پھر تمہاری مدد کرے اور مسلمانوں کو اللہ ہی کا بھروسہ چاہئے۔ (کنز الایمان)

(۲) اگر مدد کرے تمہاری اللہ تو کوئی نہیں غالب آ سکتا تم پر، اور اگر چھوڑ دے تمہیں تو کون شخص ہوگا وہ

جو امداد کرے گا تمہاری اس کے بعد، اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ (نجوم الفرقان)

ما قبل سے تعلق:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے مؤمنین کو بدر اور احد کی یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے  
بدر میں تمہاری امداد فرمائی تو کافر تم پر غالب نہیں آ سکے، اسی طرح رب تعالیٰ کی طرف سے جب بھی تمہیں امداد حاصل  
ہوگی تم پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا، لیکن احد میں تمہاری اپنی کوتاہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو تم پر  
بظاہر کچھ دیر کیلئے کفار کا غلبہ ہو گیا، اسی طرح جب بھی رب تعالیٰ کا ساتھ تمہیں حاصل نہ رہا تو تمہاری امداد کرنے والا  
اور کوئی نہیں ہوگا۔ (کبیر بالوضاحت جلد ۹، صفحہ نمبر ۶۸)

آیہ کریمہ میں ترغیب و ترہیب پائی گئی:

یعنی نیکیوں کی طرف رغبت دلائی گئی، اور معصیت سے ڈرایا گیا۔ رب تعالیٰ نے بدر کی امداد کو صبر اور تقویٰ پر  
موقوف فرمایا، تقویٰ گناہوں سے بچنا ہے۔

رب تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿بَلْ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فُورِهِمْ هَذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ  
الْمَلَائِكَةِ﴾

(سورۃ آل عمران، آیہ نمبر ۳۵)

کیوں نہیں اگر تم صبر کرو تقویٰ کرو اور کافرا اسی دم تم پر آپڑیں تو تمہارا رب تمہاری مدد کو پانچ ہزار فرشتے۔

اب اس زیر بحث آیہ کریمہ میں بیان کیا ﴿مَنْ نَصَرَهُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَهُ﴾ جس کی اللہ تعالیٰ امداد فرمائے

اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، اب اس دونوں مقدموں سے نتیجہ یہ حاصل ہوا۔



”ان من اتقى الله فقد فاز بسعادة الدنيا والآخرة فانه يفوز بسعادة لا شقاوة معها  
وبعز لا ذل معه ويصير غالبا لا يغلبه احد“

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، یعنی گناہوں کو چھوڑتا ہے وہ دنیا و آخرت میں سعادت حاصل کر لیتا ہے، وہ نیک  
بختی میں اس طرح کامیاب ہوتا ہے کہ اسے بدبختی حاصل نہیں ہوتی، اور اس طرح کی عزت حاصل ہوتی ہے کہ وہ  
ذلیل نہیں ہوتا۔ اسے اللہ تعالیٰ ایسا غلبہ عطاء کر دیتا ہے کہ کوئی اس پر غالب نہیں آ سکتا۔

”واما من اتى بالمعصية فان الله يخذله ومن خذله الله فقد وقع فى شقاوة لا سعادة  
معه او ذل لا عز معه“

لیکن جو شخص گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ اسے رسوا کر دیتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کرتا ہے  
وہ بدبختی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسے سعادت حاصل نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ اسے ذلت عطاء کر دیتا ہے اسے کوئی عزت  
حاصل نہیں ہوتی۔ (کبیر ج ۹ ص ۶۸)

”وان يخذلكم“ خذل (ن) خذلا، خذلا، خذلا، خذلا، خذل (تفعیل) عنه اصحابه، کسی کو مدد نہ  
دینے کی ترغیب دینا، کسی کو پسپائی اور جنگ بند کرنے آمادہ کرنا۔ ”خاذل مخاذلة“ مدد چھوڑنا ”تخاذل  
القوم“ بعض کا بعض کی مدد چھوڑنا۔ (النجد)

**مسئلہ:** اسی آیہ کریمہ سے اہل علم نے یہ دلیل پکڑی ہے۔

”ان الايمان لا يحصل الا باعانة الله والكفر لا يحصل الا بخذلانه، والوجه فيه ظاهر  
لانها دالة على ان الامر كله الله“ (کبیر ج ۹ ص ۶۹)

ایمان صرف اللہ تعالیٰ کی امداد سے حاصل ہوتا ہے، اور جب رب تعالیٰ اس کی امداد نہ فرمائے تو اسے کفر  
حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تمام امور، تمام کام اللہ تعالیٰ کے ہی قبضہ قدرت میں ہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

(فمن ذا الذى ينصركم من بعده) ای بعد خذلانه ای فلان ناصر لكم (جلالین) ”قوله ای  
بعد خذلانه“ اشار بذلك الى ان الاستفهام انكارى بمعنى النفي ولم يقل  
فلان ناصر لكم اشارة لعدم تقيطهم من النصر لطفابهم ای فارجعوا اليه ينصركم قال  
تعالى (وكان حق علينا نصر المؤمنين) (صاوی ج ۱ ص ۱۶۶)



اگر اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد چھوڑ دی جیسے احد میں کچھ دیر کیلئے چھوڑ دیں تھی تو کون امداد کرے گا تمہاری اسکے بعد، یعنی اس کی امداد چھوڑ دینے کے بعد تمہاری امداد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مفسر رحمہ اللہ ”مَنْ بَعْدِهِ“ کی تفسیر ”بعد خذلانہ“ سے کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ یہاں حذف مضاف ہے۔ اور ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ﴾ کی تفسیر ”فلان ناصر لکم“ سے کر کے یہ بتایا کہ ”یہ استفہام انکاری ہے نفی کے معنی میں ہے، البتہ یہ نہیں فرمایا ”فلان ناصر لکم“ تمہاری امداد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ درحقیقت اپنے بندوں پر مہربانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ ہم کسی اور سے امداد طلب کرتے شاید کوئی امداد کر دیتا، نہیں نہیں بات اصل میں یوں ہے کہ جب رب تعالیٰ نے تمہاری امداد چھوڑ دی تو پھر کوئی اور امداد کر سکے گا ہی نہیں۔ لہذا تم رب تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرو وہی تمہاری امداد فرمائے گا، اس نے خود ہی ارشاد فرمایا ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ہم نے ثابت کر رکھا ہے اپنے ذمہ کرم پر ایمان والوں کی امداد کرنا۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾

”اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔“

یعنی جب یہ ثابت ہو گیا کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اور بیشک جو وہ ارادہ فرماتا ہے اسی کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے ”ولا دافع لحكمه“ اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں ”وجب ان لا يتوكل المؤمن الا عليه“ تو ایمان والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیں۔

دینی طلباء کرام یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھیں:

وقوله ”وعلى الله فليتك كل المؤمنون“ يفيد الحصر اى على الله فليتك كل المؤمنون  
لاعلى غيره“ (کبير ج ۹ ص ۶۹)

رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں (وَعَلَى اللَّهِ) ظرف پہلے ذکر کی گئی، اور فعل ”فَلْيَتَوَكَّلْ“ بعد میں، اس لئے تقدیم ظرف حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ اسی لئے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے حصر کا ہی ترجمہ کیا ہے، و انهم نے بھی وہی نقل کیا ہے اور اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔

وعن صيب قال قال رسول الله ﷺ عجا لأمر المؤمن أن امره كله له خير وليس  
ذلك لأحد الا للمؤمن أن أصابته سراء شكر فكان خيرا له وأن أصابته ضراء صبر



فكان خيرا له“

(رواه مسلم، مشکوة باب التوكل والصبر)

حضرت صہیب فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کے کاموں پر تعجب ہے کہ بیشک اس کا ہر کام ہی بہتر ہے، سوائے مؤمن کے کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں، اس لئے کہ اگر اسے خوشی پہنچے تو وہ شکر کرتا ہے جو اس کیلئے بہتر ہوتا ہے، اور اگر اسے تکلیف پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے جو اس کیلئے خیر ہے۔

وعن ابی ذر ان رسول اللہ ﷺ قال انی لاعلم آية لو اخذ الناس بها لکفتهم ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب“

(رواه احمد وابن ماجه والدارمی) مشکوة باب التوكل والصبر

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک میں ایک آیت جانتا ہوں، اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہ ان کو کافی ہو جائے۔

وہ آیت کریمہ یہ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (سورة الطلاق، آیت نمبر ۳)

”اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کیلئے نجات کی راہ نکال دے گا، اور اسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو۔“

وعن عمرو بن العاص قال قال رسول الله ﷺ ان قلب ابن آدم بكل وادشعة فمن اتبع

قلبه الشعب كلها لم يباك الله باى واد اهلكه ومن توكل على الله كفاه الشعب“

(رواه ابن ماجه، مشکوة باب التوكل والصبر)

حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک انسان کا دل (غموں کی) ہر وادی سے معلق رہتا ہے، کسی شخص کا تمام وادیوں سے معلق رہے وہ کسی وادی میں ہلاک ہو جائے رب تعالیٰ کو کوئی برواہ نہیں، جو اللہ پر توکل رکھے اللہ تعالیٰ اسے ان (غموں کی) وادیوں سے کفایت کر جائے گا۔





مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلُّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غُلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ  
مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

(آیہ نمبر ۱۶۱)

- (۱) اور کسی نبی پر یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ کچھ چھپا رکھے اور جو چھپا رکھے وہ قیامت کے دن اپنی چھپائی چیز لے کر آئے گا پھر ہر جان کو ان کی کمائی بھر پور دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (کنز الایمان)
- (۲) نہیں کسی نبی کیلئے کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرے لے آئے گا ”وہ چیز جو خیانت کی اس نے“ قیامت کے دن پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کسب کیا اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (نجوم الفرقان)

### آسان اور مختصر مطلب:

ای ماصح ولا استقام لنبي من الانبياء ان يخون في المغنم لان الخيانة تنافي النبوة

یعنی تمام انبیاء کرام میں سے کسی نبی کی شان کے لائق غنیمت حاصل ہے، اس لئے نبوت اور خیانت ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر بالفرض کسی نے امر نبوت کے احکام پہنچانے میں کوتاہی کی جسے خیانت سے تعبیر کر دیا گیا تو قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے احکام خداوندی کیونکہ بجا نہیں لائے، پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کسب کیا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

(ماخوذ از روح المعانی و کبیر)

اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلُّ﴾ ”نہیں کسی نبی کیلئے کہ وہ خیانت کرے۔“

”الغلول هو الخيانة“ غلول کا معنی ہے خیانت کرنا۔ اصل میں اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو مخفی طور پر پکڑنا۔ جو کینہ سینہ میں چھپا ہوا ہے بھی ”غل“ (غین کی زیر سے) کہا جاتا ہے۔ غلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ اور وہ پانی جو درختوں کی جڑوں میں جاری ہوتا ہے وہ درختوں میں پوشیدہ ہوتا ہے اسے ”غلل“ کہا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے ”تغلل الشی اذا تخلل وخفی“ جب کسی چیز میں خلل واقع ہو اور مخفی ہو اس کیلئے بولتے ہیں ”تغلل الشی“



قال النبی ﷺ "من بعثناه علی عمل فغل شینا جاء یوم القیامة یحمله علی عنقه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص کو ہم نے کسی عمل کیلئے (صدقات کی وصول کیلئے) بھیجا تو اس نے خیانت کی تو قیامت کے دن وہ چیز اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا۔ اور ارشاد فرمایا "هدایا الولاة غلول" حکام اگر عطیات کو اپنے ذاتی ہدیئے سمجھیں تو یہ خیانت ہے۔ اور ارشاد فرمایا "لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان" بغیر خیانت کے جو چیز مانگ کر لی جائے اس پر کوئی ضمان نہیں۔

مختلف قراتوں کے لحاظ پر مختلف معانی:

ابن کثیر اور عاصم اور ابو عمر کی قراءت میں "یغل" میں یاء پر فتح اور غین پر ضمہ ہے، اس قراءت کے مطابق معنی یہ ہے "ماکان للنبی ان یخون" نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ اور باقی حضرات نے "یغل" کو یاء کے ضمہ اور غین کے فتح سے پڑھا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہے "ماکان للنبی ان یخان" نبی کی شان کے لائق نہیں کہ نبی کی خیانت کی جائے۔ (وہ خاموش ہو کر حق بیان نہ کریں) شان نزول میں مختلف قول ہیں، بعض پہلی قراءت کے مطابق ہیں اور بعض دوسری قراءت کے مطابق ہیں۔

پہلی قراءت کے مطابق چند روایات:

(۱) نبی کریم ﷺ کو بعض غزوات میں مال غنیمت حاصل ہوا، وہ مال غنیمت جمع کر لیا گیا۔ لیکن کچھ موانع کی وجہ سے تقسیم میں تاخیر ہو گئی، تو کچھ لوگ کہنے لگے کہ آپ مال غنیمت کیوں تقسیم نہیں کرتے، تو آپ نے فرمایا "لو کان لکم مثل احد ذہبا ما حبست عنکم منه درهما الا حسبون انی اغلکم منکم" اگر تمہارا احد پہاڑ کی طرح سونا ہو تو میں اس سے ایک درہم بھی نہیں روکوں گا، کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں تمہاری امانت میں خیانت کروں گا، تو اس یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ اداء وحی کے متعلق نازل ہوئی، نبی کریم ﷺ قرآن پاک پڑھنے تھے اور اس میں کافروں کے دین اور ان کے مذہب کو باطل قرار دیا گیا، فسألوه ان یحرک ذلک فنزلت هذه الآیة "تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارے دین اور ہمارے معبودوں کو باطل نہ کہا جائے، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ نبی کریم ﷺ تبلیغ دین میں کوئی خیانت نہیں کرتے۔



(۳) حضرت عکرمہ ؓ کا قول یہ ہے کہ یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ بدر میں ایک سرخ رنگ کی چادر گم ہو گئی ”فقال بعض الجہال لعل النبی ﷺ اخذها فنزلت هذه الآية“ بعض جاہلوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہ نبی کریم ﷺ نے لے لی ہو، تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی، کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ غنیمت میں خیانت کریں۔

(۴) حضرت ابن عباس ؓ نے ایک اور وجہ شان نزول کی یہ بیان کی۔

”ان اشراف الناس طمعوا ان يخصهم النبی علیہ الصلوۃ والسلام من الغنائم بشئ زائد فنزلت هذه الآية“

کہ بعض بڑے لوگوں نے لالچ کی کہ ہمیں مال غنیمت میں سے نبی کریم ﷺ زیادہ حصہ دیں، تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ نبی بے انصافی کر کے مال غنیمت میں خیانت کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

(۵) روی انہ علیہ الصلوۃ والسلام بعث طلائق فغنموا غنائم فقسمها ولم یقسم للفلاح فنزلت هذه الآية“

اس آیہ کریمہ کے نزول کا تعلق بدر کے واقعہ سے ہے کہ جن لوگوں کو دشمن کے حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا ہوا تھا وہ واپس جنگ میں شریک نہ ہو سکے، ان کیلئے ابتدائی طور پر مال غنیمت مقرر نہیں کیا گیا تھا تو رب تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرما کر ان کا حصہ مقرر کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا تاکہ ان کے معاملہ میں خیانت نہ ہو۔

(۶) احد میں جن حضرات کو درہ میں کھڑا کیا تھا، فتح حاصل ہونے پر وہ مال غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو گئے تھے۔

”وقالوا نخشی ان یقول النبی ﷺ من اخذ شیئا فهو له وان لا یقسم الغنائم کما لم یقسمها یوم بدر فقال علیہ الصلوۃ والسلام ظنتم ان اللفل فلاتقسم لکم فنزلت هذه الآية“

اور ساتھ ہی یہ کہنے لگے ایسا نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ نے بدر میں جو اعلان فرمایا تھا ”من قتل قتیلا فله سلبہ“ جس نے کسی (کافر شخص) کو قتل کیا اس کا سامان اسی لئے ہے، وہی اعلان یہاں بھی فرمائیں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا گمان تھا کہ ہم تمہارے معاملہ میں خیانت کریں گے اور مال غنیمت تقسیم نہیں کریں گے، آپ کے اس ارشاد گرامی کے مطابق نازل ہوئی کہ نبی غنیمت کے معاملہ میں خیانت نہیں کرتے۔ (کیرج ۹ ص ۷۰)

دوسری قراءت کے مطابق معانی:

یعنی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے مال غنیمت کی خیانت کی جائے وہ یوں ہی خاموش رہیں اور ان کو



منع نہ کریں۔ اس پر چند احادیث دیکھیں۔

❖ قال الامام احمد عن ابی مالک الاشجعی عن النبی ﷺ قال اعظم الغلول عند الله ذراع فی الارض تجدون الرجلین جارین فی الارض اوفی الدار فیقطع احدهما من حظ صاحبه ذراعا فاذا قطعه طوقه من سبع ارضین يوم القيامة

مسند امام احمد میں حضرت ابو مالک اشجعی کی روایت بیان کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا زمین کے ایک ذراع (ڈیڑہ فٹ) کی خیانت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا جرم ہے، تم دو شخصوں کو پاؤ گے کہ وہ زمین یا مکان میں ایک دوسرے کے بڑوسی ہیں، ایک نے دوسرے کے حصہ سے ایک ذراع کاٹ لیا، جب اس نے دوسرے کا حصہ کاٹ لیا تو قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈال دیا جائے گا۔

❖ قال الامام احمد عن عبدالرحمن بن جبیر قال سمعت المستور بن شداد يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول من ولی لنا عملا ولیس له منزل فلیتخذ منزلا، ولیس له زوجة فلیتزوج، ولیس له خادم فلیتخذ خادما، ولیس له دابة فلیتخذ دابة، ومن اصاب شیئا سوی ذلک فهو غال

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبدالرحمن بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی، وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جسے ہم عامل بنائیں (اور جتنا حق ہم اسے دیں) کہ وہ (اپنے عمل اور مزدوروں سے) اپنا گھر بنالے جب کہ اس کے پاس گھر نہ ہو، یا اس کی زوجہ نہ ہو تو شادی کر لے، یا اس کا خادم نہ ہو تو خادم حاصل کر لے، یا اس کے پاس سواری نہ ہو تو وہ سواری لے لے (یہ تو اسے حق حاصل ہے کہ ہم نے اسے اجازت دے دی) جس نے اس کے سوا اور کوئی چیز لے لی تو وہ خیانت کرنے والا ہوگا۔

❖ قال ابن جریر عن عکرمہ عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ لأعر بن احد کم یاتی يوم القيامة یحمل شاة لها ثغاء ینادی یامحمد یامحمد فأقول لا ملک لك من الله شیئا قد بلغتک، ولأعر بن احد کم یاتی يوم القيامة یحمل جملا له رغاء یقول یامحمد یامحمد فأقول لا ملک لك من الله شیئا قد بلغتک، ولأعر بن احد کم یاتی يوم القيامة یحمل فرس له حمحمة ینادی یامحمد یامحمد فأقول لا ملک لك من الله شیئا قد بلغتک

ابن جریر نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں



ضرور بر ضرورت میں سے قیامت کے دن اس شخص کو پہچانوں گا، جس نے (مال غنیمت میں خیانت کی) بکری اٹھا رکھی ہوگی وہ بکری اپنی آواز دے رہی ہوگی (میں میں کر رہی ہوگی) وہ شخص پکار رہا ہوگا اے محمد، اے محمد، تو میں کہوں گا آج میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں چھڑا سکتا کیونکہ میں نے تمہیں اس کے احکام پہنچا دئے تھے، اور میں ضرور بر ضرور پہنچانوں گا تم میں سے اس شخص کو قیامت کے دن آئے گا اس نے اونٹ اٹھایا ہوگا وہ اونٹ اپنی آواز دے رہا ہوگا، (یعنی بڑ بڑا رہا ہوگا) وہ شخص کہے گا یا محمد یا محمد تو میں کہوں گا میں اللہ تعالیٰ سے تمہیں نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے اس کے احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دئے تھے۔

❦ قال الامام احمد استعمل رسول الله ﷺ رجلا من الازد يقال له ابن اللتبية على الصدقة فجاء فقال هداكم وهذا اهدى لي فقام رسول الله ﷺ على المنبر فقال ما بال العامل بعثه على عمل فيقول هداكم وهذا اهدى لي أفلا جلس في بيت ابيه وامه فينظر ايهدي اليه ام لا؟ والذي نفس محمد بيده لا ياتي احدكم منها بشئ الا جاء به يوم القيامة على رقبة ان كان بعير له رغاء او بقرة لها خوار، او شاة تيعر، ثم رفع يديه حتى رأينا عفرة ابطيه ثم قال اللهم هل بلغت؟ ثلاثا

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حدیث ذکر کی کہ رسول اللہ ﷺ نے از د قبیلہ سے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے پر عامل بنایا اسے ابن لتبہ کہا جاتا تھا۔ تو وہ آیا اس نے کہا یہ تمہارا (مال) ہے، اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا، تو نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا اس عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو عمل پر بھیجتے ہیں تو وہ کہتا ہے یہ (مال) تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے، وہ اپنے ماں، باپ کے گھر کیوں نہیں بیٹھا تھا کہ وہ دیکھتا اسے ہدیہ دیا جاتا یا نہ دیا جاتا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی ایک بھی قیامت کے دن نہیں آئے گا مگر یہ کہ (خیانت کا) اس کی گردن پر اونٹ ہوگا جو اپنی آواز دے رہا ہوگا، یا گائے اٹھائے ہوگا جو اپنی آواز دے رہی ہوگی، یا بکری کو کواٹھائے ہوگا وہ بکری آواز دے رہی ہوگی، پھر آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، آپ نے تین مرتبہ یہ کہا، اے اللہ کیا میں نے احکام پہنچا دئے ہیں۔

❦ قال ابو عيسى الترمذی عن معاذ بن جبل قال بعثنی رسول الله ﷺ الى اليمن فلما سرت ارسل فی الثری فرددت فقال الثری لم بعثت الیک؟ لا تصیبن شیئا بغیر اذنی فانه غلول (ومن یغلل یأت بما غل يوم القيامة) لهذا دعوتک فامضی لعملک

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا، جب میں چلا تو میرے



پیچھے ایک شخص کو بھیجا مجھے واپس بلایا گیا، پھر آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ آپ کو واپس کیوں بلایا گیا؟ (اس کی وجہ یہ بتانا مقصود تھا) کہ میری اجازت کے بغیر ہرگز کوئی چیز نہ لینا کیونکہ وہ خیانت ہوگی۔ (پھر آپ نے بطور دلیل یہی زیر بحث آیت کریمہ پڑھی) ﴿وَمَنْ يُغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غُلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (اور جس نے خیانت کی وہ لے آئے گا وہ چیز جو اس نے خیانت کی قیامت کے دن) میں نے اسی وجہ سے تمہیں بلایا تھا، اب تم اپنے کام کیلئے چلے جاؤ (جس کیلئے تمہیں بھیجا تھا)

قال الامام احمد عن ابی هريرة قال قام فينا رسول الله ﷺ يوما فذكر الغلول فعظمه وعظم امره ثم قال لا ألفين احدكم يجي يوم القيامة على رقبته بعير له رغاء فيقول يا رسول الله اغثنى فاقول لا املك لك من الله شيئا قد بلغتكم لا ألفين احدكم يجي يوم القيامة على رقبته فرس لها حمحة فيقول يا رسول الله اغثنى فاقول لا املك لك من الله شيئا قد بلغتكم، لا ألفين احدكم يجي يوم القيامة على رقبته صامت فيقول يا رسول الله اغثنى فاقول لا املك لك من الله شيئا قد بلغتكم“ (بخاری و مسلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی جو بخاری و مسلم نے بھی ذکر کی، آپ فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے آپ نے مال غنیمت کی خیانت کا ذکر کیا، اس نے اس کی عظمت اور اس کے معاملہ (خیانت) کی عظمت کو ذکر کیا، پھر فرمایا ہرگز میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر اونٹ آواز دے رہا ہو (بر بڑا رہا ہو) وہ شخص کہے یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا آج اللہ تعالیٰ سے مالک نہیں بیشک میں نے اس کے احکام تمہیں پہنچا دئے تھے، ہرگز میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر گھوڑا ہنہار رہا ہو، وہ کہے یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا آج میں تمہاری کوئی امداد نہیں کروں گا کیونکہ میں نے تمہیں رب تعالیٰ کے احکام پہنچا دئے تھے، ہرگز میں تم میں سے کسی ایک کو قیامت کے دن نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر مال (سونا، چاندی) ہو، وہ کہے یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں اللہ تعالیٰ سے آج تمہیں نہیں چھڑاؤں گا کیونکہ میں نے تمہیں اس کے احکام پہنچا دئے تھے۔ (احادیث مذکورہ منقول ابن کثیر وصابونی)

روی ان النبی ﷺ لما وقعت غنائم هوازن فی یدہ یوم حنین، غل رجل بمخیط فنزلت  
ہذہ الآیۃ“

روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے حنین کے دن جب هوازن قبیلہ سے مال غنیمت حاصل کیا، تو ایک شخص نے مال غنیمت میں سے ایک سوئی جمع نہیں کرائی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔



❁ واعلم ان النبی ﷺ عظم امر الغلول وجعله من الكبائر "یقین کرلو کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے خیانت کو بہت عظیم اور گناہ کبیرہ قرار دیا۔

❁ عن ثوبان عن رسول الله ﷺ انه قال "من فارق روحه جسده هو برئ من ثلاث دخل الجنة الكبر والغلول والدين"

حضرت ثوبان ؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا روح اس کے جسم سے جدا ہو جائے (فوت ہو جائے) وہ تین چیزوں سے بچا رہا تو جنت میں داخل ہوگا، وہ تین چیزیں یہ ہیں تکبر، خیانت اور قرضیٰ

❁ عن عبدالله بن عمرو ان رجلا كان على ثقل النبی ﷺ يقال له كركرة فمات فقال النبی ﷺ هو في النار فذهبوا ينظرون فوجدوا عليه كساء وعباءة قد غلها

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک شخص کو نبی کریم ﷺ کے مال غنیمت پر مقرر کیا ہوا تھا، اسے کرکرہ کہا جاتا تھا وہ مر گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ آگ میں جائے گا۔ لوگ اسے دیکھنے کیلئے گئے تو دیکھا کہ اس نے ایک چادر اور ایک اونٹنی کپڑا خیانت کر لیا تھا۔ (منقول از کبیر ج ۹ ص ۷۰)

❁ واخرج الطبرانی عن كثير بن عبدالله عن ابيه عن جده ان النبی ﷺ قال لا اسلال ولا غلول "ومن يغلل يأت بما غل يوم القيامة"

طبرانی نے کثیر بن عبداللہ سے روایت ذکر کی جو انہوں نے اپنے باپ، دادا سے بیان کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کوئی شخص مال غنیمت میں چپکے سے کوئی نہ کھسکا لے اور نہ ہی خیانت کرے، (اور جو شخص خیانت کرے گا وہ خیانت کی ہوئی چیز قیامت کے دن لائے گا۔

❁ واخرج عبدالرزاق المصنف وابن جرير وابن المنذر عن قتادة قال ..... ذكر لنا ان نبي الله ﷺ كان يقول اجتنبوا الغلول فانه عار وشتار ونار"

حضرت قتادہ ؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مال غنیمت کی خیانت سے بچ جاؤ کیونکہ یہ عار اور آگ میں مجلس جانے کا ذریعہ ہے۔ (منقول از درمنثور)

❁ واخرج ابن ابي شيبة واحمد ومسلم وابوداود عن عدي بن عميرة الكندي قال قال رسول الله ﷺ يا ايها الناس من عمل منكم لنا في عمل فكتمنا منه مخيطة فما فوقه فهو غل وفي لفظ فانه غلول ياتي يوم القيامة"

عدي بن عميرہ کندي فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو جس شخص نے تم میں سے کوئی عمل کیا (یعنی جسے ہم نے عامل بنایا) تو اس نے ہم سے ایک سوئی یا اس سے زائد کوئی چیز چھپائی تو وہ



خیانت ہوگی وہ خیانت کی ہوئی چیز وہ قیامت کے دن لائے گا۔ (منقول از درمنثور)

**مسئلہ:** مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کھانے کی اشیاء اور چوپاؤں کا چارابقدر ضرورت استعمال کرنا جائز ہے۔

”قال عبد الله بن ابي اوفى اصبنا طعاما يوم حنين فكان الرجل ياتي فيأخذ منه قدر الكفاية لم ينصر“

عبداللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں حنین کے دن ہم نے طعام پایا، جس شخص کو جتنا طعام ضرورت ہوتا وہ بقدر ضرورت لے لیتا، پھر واپس ہو جاتا۔

وبن سلمان انه اصاب يوم المدائن ارغفة وجبنا وسكينا فجعل يقطع من الجبن ويقول كلوا على اسم الله“

حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں مدائن کے دن ہم نے روٹیاں اور پنیر اور چھری پائی، وہ پنیر کو چھری سے کاٹتے ہوئے فرمانے لگے، اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ (کیرج ۹ ص ۷۱)

**کافر کے ہتھیار سے کافر کو قتل کرنا جائز ہے:**

”روى عن البراء بن مالک انه ضرب رجلا من المشركين يوم اليمامة فوقع على لفاه فأخذ سيفه وقتله به“

براء بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یمامہ کے دن مشرکوں کے ایک شخص کو گردن کے پچھلے حصہ پر مارا اور اسی کی تلوار لے کر اسے قتل کر دیا۔ (کیرج ۹ ص ۷۱)

**نبوت اور خیانت کا اجتماع ممکن نہیں:**

اس کی وجہ یہ ہے کہ خیانت دنیا میں عار کا سبب ہے، اور آخرت میں نار (آگ) کا سبب ہے، جو نفس خیانت کی طرف رغبت کرتا ہے وہ بہت ہی گھٹیا ہوتا ہے، اور نبوت انسانیت کا بہت ہی اعلیٰ منصب ہے ”فلا تليق الا بالنفس التي تكون في غاية الجلالة والشرف“ یہ عظیم منصب تو صرف اسے حاصل ہوگا جسے بہت بڑی بزرگی اور شرافت حاصل ہوگی۔

”والجمع بين الصفتين في النفس الواحدة ممتنع فثبت ان النبوة والخيانة لا اجتماعان“

ایک ہی شخص میں نبوت اور خیانت کبھی جمع نہیں ہو سکتیں، یہ حکم ایسا ہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے



فرمایا ﴿مَا كَانَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنی اولاد بنائے۔ ”یعنی الالہیۃ والخذال ولد لا یجتمعان“ یعنی وہ ذات جو معبود حقیقی ہے اس کے ساتھ اولاد کے جمع ہونا ممکن نہیں۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے:

علامہ رازی رحمہ اللہ علیہ نے بہت خوبصورت انداز پر لام کے زائد ہونے کا تذکرہ کیا، لیکن لفظ زائد کی جگہ منقول کا لفظ ذکر فرمایا، عبارت ملاحظہ ہو۔

”وقیل اللام منقولة والتقدير وما كان النبی لیغل، کقولہ (ما كان الله ان يتخذ من ولد) ای ما كان الله ليتخذ ولدا“

بعض حضرات نے کہا ”للبنی“ میں لام منقول ہے، اصل عبارت یوں ہے ”وما كان النبی للیغل“ نبی خیانت نہیں کرتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ﴾ میں لام منقول ہے، یہ بھی معنوی لحاظ پر یوں ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَتَّخِذَ وَلَدًا﴾ ”اللہ تعالیٰ اپنی اولاد نہیں بناتا۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۱)

غلول کا اطلاق کس چیز پر:

”ان الغلول هو الخيانة الا انه في عرف الاستعمال صار مخصوصا بالخيانة في الغنيمة وقد جاء هذا ايضا في غير الغنيمة“

غلول کا معنی خیانت ہے، لیکن عام طور پر عرف میں مال غنیمت میں خیانت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن غنیمت کے بغیر مطلقاً خیانت کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۲)

﴿وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾

”اور جو خیانت کرے لے آئے گا وہ چیز جو خیانت کی اس نے“ قیامت کے دن“

اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہی چیز جو اس نے خیانت کی تھی قیامت کے دن وہی اس کی گردن پر سوار ہوگی تاکہ اس کی رسوائی زیادہ ہو، جیسا کہ پہلے احادیث میں مذکور ہے کہ اس پر بکری، اونٹ، گھوڑا سوار ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسے خیانت کا گناہ حاصل ہوگا۔ (غازن ج ۱ ص ۲۹۷)



﴿ثُمَّ تُوفَى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾

”پھر پورا پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کسب کیا“

یعنی جیسا عمل اس نے کیا ایسا ہی اسے بدلہ دیا جائے گا، اگر اس نے نیک عمل کیا تو اسے اجر و ثواب عطاء کیا جائے گا، اور اگر اس نے برا عمل کیا تو اسے عذاب دیا جائے گا۔  
(خازن)

﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ ”اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

یعنی قیامت کے دن عدل و انصاف کیا جائے گا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، ایسا بھی نہیں ہوگا کہ کسی کے اعمال کا اسے بدلہ ہی نہ دیا جائے یا سے کم بدلہ دیا جائے۔

عن زید بن خالد الجهنی قال ان رجلا من اصحاب رسول الله ﷺ توفي يوم خيبر فذكر لرسول الله ﷺ قال صلوا على صاحبكم فتغيرت وجوه الناس لذلك فزعم زید ان رسول الله ﷺ قال ”ان صاحبكم قد غل في سبيل الله، قال ففتشنا متاعه فوجدنا حورزا من حرر الزهود لا يساوي درهمين“

زید بن خالد جہنی فرماتے ہیں کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ایک شخص خیر کے دن فوت ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا تم اپنے صاحب پر نماز جنازہ پڑھو، لوگوں کے چہروں کے رنگ آپ کے اس ارشاد پر بدل گئے (یعنی پریشان ہو گئے کہ آپ خود جنازہ کیوں نہیں بڑھ رہے) زید (راوی) کا گمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تمہارے اس صاحب نے اللہ کی راہ میں خیانت کر لی ہے، وہ کہتے ہیں ہم نے ان کے سامان کی تفتیش کی تو اس میں یہود کے منکوں میں سے کچھ منکے پائے گئے جو دو درہم کے برابر بھی نہیں تھے یعنی اتنی مقدار خیانت کرنے پر نبی کریم ﷺ نے خود نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرما دیا، البتہ صحابہ کرام کو اجازت دے دی۔  
(معالم التنزیل للبعوی ج ۱ ص ۳۶۶)



أَفَمَنْ اتَّبَعَ رِضْوَانِ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطِ مَنِ اللَّهِ وَمَاوَهُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

(آیہ نمبر ۱۶۲)

(۱) تو کیا جو اللہ کی مرضی پر چلا وہ اس جیسا ہوگا جس نے اللہ کا غضب اوڑھا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور کیا بری جگہ پلٹنے کی۔ (کنز الایمان)

(۲) تو کیا جس نے تابعداری کی اللہ کی رضا کی وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور کتنی بری جگہ ہے اس کے پلٹنے کی۔ (نجوم الفرقان)

﴿أَفَمَنْ اتَّبَعَ رِضْوَانِ اللَّهِ﴾ ”تو کیا جس نے تابعداری کی اللہ کی مرضی کی۔“

یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت کر کے اسے راضی کیا، اس سے مراد مہاجرین و انصار صحابہ کرام ہیں۔

﴿كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطِ مَنِ اللَّهِ﴾

”وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے۔“

” (كَمَنْ بَاءَ) ”رجع“ (بِسَخَطِ مَنِ اللَّهِ) بالمعاصی والغلول وهم المنافقون وبعض الفساق“

وہ اس جیسا ہوگا جو لوٹا اللہ کی ناراضگی سے گناہوں اور خیانت کی وجہ سے، یعنی منافقین اور بعض فاسق لوگ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ کی طاعت کرنے والے، اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے والے اور اس کے نافرمان، خیانت کرنے والے، یعنی منافقین اور فاسق لوگ برابر ہو جائیں۔

﴿وَمَاوَاهُ جَهَنَّمَ﴾ ”اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور معصیت کے مرتکب کا ٹھکانا جہنم ہے۔

﴿وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ ”اور کتنی بری جگہ ہے اس کے پلٹنے کی۔“

یعنی نافرمان اور خیانت کرنے والے فاسقوں نے جہنم کی طرف پلٹ کر جانا ہے، یہ ان کا ٹھکانا اور پلٹنے کی جگہ بہت ہی بری ہے۔ (ماخوذ از مظہری)



آیہ کریمہ کا حکم عام ہے:

اگرچہ بظاہر نزول کے لحاظ سے خاص ہے، لیکن حکم کے لحاظ پر عام ہے جو تا قیامت آنے والے لوگوں کو شامل ہے۔ جس شخص نے خیانت کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضا کی تابعداری کی وہ اس جیسا نہیں ہو سکتا جس نے خیانت کی، جس نے ایمان لا کر اور طاعت کا عمل کر کے اللہ کو راضی کیا وہ اس شخص جیسا نہیں جس نے کفر و شرک کر کے اور معصیت یعنی گناہوں کا ارتکاب کر کے رب تعالیٰ کو ناراض کیا۔ مہاجرین و انصار جنہوں نے رب تعالیٰ کی رضا کیلئے کام کئے وہ منافقین کی طرح نہیں ہو سکتے جنہوں نے رب تعالیٰ کو ناراض کیا، اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے مشرکوں پر حملہ کیا اور ثابت قدم رہے، ان کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے تھا، وہ ان حضرات کی طرح نہیں جو وقتی طور پر پسپا ہو گئے وہ بظاہر اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کا ذریعہ بنے۔

یہ آیہ کریمہ عام ہے:

لَا تَقْلِبْ عَلَى الْقَدَمِ عَلَى الطَّاعَةِ فَهُوَ دَاخِلٌ تَحْتَ قَوْلِهِ (أَمَّنْ اتَّبَعَ رِضْوَانُ اللَّهِ) وَكُلٌّ مِنْ  
اخْلَدَ إِلَى مَتَابَعَةِ النَّفْسِ وَالشَّهْوَةِ فَهُوَ دَاخِلٌ تَحْتَ قَوْلِهِ (كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطِ اللَّهِ)

یعنی ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی طاعت کی وہ ﴿أَمَّنْ اتَّبَعَ رِضْوَانُ اللَّهِ﴾ میں داخل ہے، اور ہر وہ شخص جس نے اپنے نفس اور خواہشات کی تابعداری کی، رب تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی وہ ﴿كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطِ اللَّهِ﴾ میں داخل ہے۔  
(کبیر ج ۹ ص ۷۴)

**ضابطہ:** ان الآیة نازلة فی واقعة معينة لكنک تعلم ان عموم اللفظ لا یبطل لأجل  
خصوص السبب

بیشک آیہ کریمہ اگرچہ ایک خاص واقعہ کے حق میں نازل ہوئی، لیکن یہ ضابطہ یاد رکھو کہ خصوصی اسباب کی وجہ سے عموم الفاظ باطل نہیں ہوتے۔  
(کبیر ج ۹ ص ۷۴)

اعلیٰ حضرت اور علامہ رازی رحمہما اللہ:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے ”باء“ کا معنی ”احتمل، رجوع“ تحریر کیا ہے، یعنی جس نے اللہ کے غضب کو اٹھایا، اور اللہ کے غضب سے لوٹا، اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ترجمہ ”احتمل“ کے مطابق ہے ”اوڑھا“ راقم کا ترجمہ ہے ”لوٹا“ جو ”رجوع“ کا ترجمہ ہے، طلباء کرام دونوں معانی ذہن میں رکھیں۔



(آیہ نمبر ۱۶۳)

هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

(کنز الایمان)

(۱) وہ اللہ کے یہاں درجہ درجہ ہیں، اور اللہ ان کے کام دیکھتا ہے۔

(۲) وہ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں، اور اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔ (نجوم الفرقان)

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ﴾ ”وہ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں۔“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا، اس سے مراد عام ہے، ”یعنی اہل الخیر و اہل الشر درجات“ یعنی نیک لوگوں اور برے لوگوں کیلئے مختلف درجات ہیں۔ ابو عبیدہ اور کسائی رحمہما اللہ نے ”دَرَجَاتٌ“ کا معنی ”منازل“ بیان کیا ہے کہ لوگوں کے آخرت میں مختلف درجہ کے مقامات ہوں گے، نیک لوگوں کے کسی کے اعلیٰ مقامات ہوں گے، کسی کے کم درجہ کے، اسی طرح برے لوگوں میں سے کسی کا مقام شدید عذاب والا ہوگا، اور کسی کا کم عذاب والا ہوگا۔ ”درجاتہم فی الجنة ودرجاتہم فی النار“ جنت میں لوگوں کے مراتب اور منازل کیلئے لفظ ”دَرَجَاتٌ“ استعمال ہوتا ہے، اور جہنم میں مختلف مراتب و منازل کیلئے لفظ ”درکات“ استعمال ہوتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا﴾ (اور ہر ایک کیلئے درجات ہیں جو انہوں نے عمل کیا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

﴿وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾ ”اور اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔“

یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ”لَا يَظْلَمُهُمْ شَيْءٌ وَلَا يَزِيدُهُمْ شَيْءًا“ یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور نہ ہی کسی کے شر کو بڑھا کر کسی پر ظلم کیا جائے گا، ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ (ماخوذ از ابن کثیر) (ص ۳۳۳)

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ”ہم“ ضمیر ﴿أَفَمَنْ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ﴾ کی طرف فقط لوٹ رہی ہے، انہوں نے دلیل یہی پیش کی ہے۔

”ان الغالب فی العرف استعمال الدرجات لاهل الثواب والدرکات لاهل النار“  
عام عرف میں ثواب والوں کیلئے درجات کا استعمال کیا جاتا ہے، اور جہنم والوں کیلئے درکات کا استعمال کیا جاتا ہے۔  
(خازن ج ۱ ص ۲۹۹)



## جنتی لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) انبیاء کرام اور اللہ کے رسول، (۲) اولیاء کرام جو انبیاء کرام کے متبعین ہیں ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے بصیرت اور دلائل حاصل ہیں۔

(۳) مؤمنین جو اللہ تعالیٰ پر صدق دل سے ایمان لانے والے ہیں اور انبیاء کرام کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

(۴) علماء کرام جو دلائل عقلیہ سے رب تعالیٰ پر ایمان لانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے طبقہ کی شان بیان کی ﴿يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ یہ چار طبقہ کے لوگ قیامت کے دن جنات عدن میں ہوں گے، ایک سفید بلند مقام پر رب تعالیٰ کی زیارت کریں گے، ان کے علیحدہ علیحدہ چار مقام ہوں گے۔ ”طائفة منهم اصحاب منابر وهي الطبقة العليا الرسل والانبیاء“ ایک گروہ ان میں سے نورانی منبروں پر ہوں گے، یہ طبقہ وہ ہوگا جو بلند مقام رکھتے ہوں گے، یعنی اللہ کے رسول اور انبیاء کرام ہوں گے۔

”والطائفة الثانية هم الاولیاء ورثة الانبیاء قولاً وعملًا وحالاً وهم اصحاب الاسرة والعرض“

دوسرا طبقہ اولیاء کرام کا ہے جو انبیاء کرام کے اقوال و اعمال و حالات میں وارث ہیں، یہ نورانی تخت پر جلوہ گر ہوں گے۔

”والطبقة الثالثة العلماء بالله من طریق النظر البرهانی العقلی وهم اصحاب الكرسي“ تیسرا طبقہ علماء جو نظر و فکر کر کے دلائل عقلیہ سے حق راہ کو بیان کرتے ہیں، خود بھی حق راہ پر قائم رہتے ہیں، ان کو قیامت کے دن نورانی کرسیاں عطاء کی جائیں گی، جن پر وہ جلوہ افروز ہوں گے۔

”والطبقة الرابعة هم المؤمنون المقلدون فی توحیدهم ولهم المراتب وهم فی المحشر مقدمون علی اصحاب النظر العقلی وهم فی الکئیب يتقدمون علی المقلدین“

چوتھا طبقہ ان مؤمنین کا ہوگا جو خود تو اصحاب علم نہیں ہوں گے، لیکن علم والوں کے مقلد اور تابع ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ان کا ایمان ہوگا، یہ محشر میں عقلی دلائل سے رب تعالیٰ کو ماننے والے لیکن حق راہ پر چلنے والوں سے نورانی بلند مقام پر مقدم ہوں گے، جن کا تذکرہ پہلے تیسرے درجہ میں کیا جا چکا ہے۔

زقمر ثر ابر ثریا رسند

قیامت کہ نیکاں با علی رسند



قیامت کے دن نیک لوگ بلند مقام تک پہنچیں گے یعنی زمین سے ثریا ستاروں تک پہنچیں گے۔  
اس لئے اے انسان تو کچھ اچھے عمل کر لے، تاکہ قیامت کے دن تجھے اپنے برے اعمال پر ندامت نہ ہو۔  
ترا خود بماند سر از ننگ پیش کہ کردت بر آید عملهای خویش  
تیرا سر خود ہی شرم سے جھک جائے گا جب تیرے عمل تیرے سامنے آ جائیں گے۔

مخلوق کے مختلف درجات کی وجوہ:

(۱) فمنها بالسن ولكن في الطاعة والاسلام فيفضل الكبير السن على الصغير السن  
اذا كانا على مرتبة واحدة من العمل

کبھی عمر کے لحاظ پر زیادہ مرتبہ حاصل ہو جاتا، اسلئے کہ کم عمر والا اور زیادہ عمر والا جب ایک جیسی رب تعالیٰ کی طاعت کرتے ہیں، اور ایک جیسا ہی اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہیں، تو یقیناً جب ان کے اعمال ایک مرتبہ کے ہوں گے تو زیادہ عمر والا اپنے زیادہ اعمال کی وجہ سے بلند درجہ رکھتا ہوگا۔

(۲) ومنها بالزمان فان العمل في رمضان وفي يوم الجمعة وفي ليلة القدر وفي عشرين  
الحجة وفي عاشوراء اعظم من سائر الايام والازمان

اور وجہ بلندی درجات کی یہ ہوگی کہ بعض لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے مبارک دنوں اور مبارک اوقات میں عبادات کی ہوں گی، جن کی وجہ سے ان کے درجات بلند ہوں گے، یقیناً رمضان شریف میں غیر رمضان کی نسبت عبادت افضل ہے، جمعہ کے دن اور دنوں سے عبادت افضل ہے، لیلۃ القدر کی عبادت ہزار مہینہ سے بہتر ہے، اور ذی الحج کے دس دنوں کی عبادت افضل ہے، عاشوراء کے دن و رات کی عبادت بہت افضل ہے۔ اس طرح کے فضیلت والے دنوں اور فضیلت والے وقتوں میں رب تعالیٰ کو یاد کرنے والوں کو بلند درجات حاصل ہوں گے۔

(۳) ومنها بالمكان فالصلوة في المسجد الحرام افضل منها في مسجد المدينة وهي من  
الصلوة في المسجد الأقصى وهي منها في سائر المساجد

کبھی مکان کی شرافت و بلندی عبادات میں کمال پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو بلند درجہ حاصل ہو جاتا ہے، مسجد حرام میں نماز افضل ہے، کیونکہ ایک لاکھ کا ثواب حاصل ہوتا ہے، پھر مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا افضل ہے کیونکہ وہاں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے پچاس ہزار والی روایت ترمذی شریف میں



موجود ہے، پھر مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنا افضل ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ کے بعد دوسری مساجد کا مقام ہے۔

## محبت کی بات:

جواہر البحار جلد رابع ص ۸ پر یوں تحریر کیا گیا کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا تعداد کے لحاظ پر ثواب اس میں کم ہے نسبت مسجد حرام کے، لیکن نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے مسجد نبوی میں ادا کی ہوئی نماز ”پچاس ہزار کا درجہ رکھنے کے باوجود مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر جب کہ وہ ایک لاکھ کا درجہ رکھتی ہے“ بلند درجہ رکھتی ہے جیسا کہ منیٰ میں آٹھ ذی الحج کی نمازیں حاجیوں کیلئے مسجد حرام میں ادا کرنے سے افضل ہیں، حالانکہ منیٰ میں ادا کی ہوئی ایک نماز کا ثواب ایک کا ہی حاصل ہوگا، لیکن وہ ایک کا ثواب اس دن ایک لاکھ کے ثواب پر بھاری ہوگا۔

(۴) ومنها بالاحوال فان الصلوة بالجماعة افضل من صلوة الشخص وحده“  
بلند درجہ حاصل ہونے کی اور وجہ یہ ہے کہ بعض احوال فضیلت کا سبب ہوتے ہیں، کیونکہ جماعت سے نماز ادا کرنا کیلئے نماز ادا کرنے سے افضل ہے۔

(۵) ومنها بنفس الاعمال فان الصلوة افضل من امطة الاذى“  
کبھی اعمال بعض دوسرے بعض پر فضیلت رکھتے ہیں، جن کی وجہ سے درجات کی بلندی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ نماز ادا کرنا افضل ہے نسبت اس کے کہ ایذا پہنچانے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دیا جائے۔

(۶) ومنها في العمل الواحد فالمتصدق على رحمه صاحب صلة رحم وصدقة، وكذا من اهدى هدية لشريف من اهل البيت افضل من ان يهدى لغيره واحسن اليه“

بعض اوقات ایک ہی عمل ہوتا ہے، لیکن وہ مختلف حیثیات سے مختلف درجات رکھتا ہے، جیسا کہ صدقہ کرنا اپنے ذی رحم پر زیادہ فضیلت رکھتا ہے نسبت غیر کو صدقہ ادا کرنے سے، اسی طرح ہدیہ دینا اپنے اقرباء اور اپنے گھر والوں کو افضل ہے اور ووں کو دینے سے، کیونکہ اپنوں پر احسان کرنا افضل ہے غیروں سے۔

## خوش قسمت انسان:

ومن الناس من يجمع في الزمن الواحد اعمالا كثيرة فيصرف سمعه وبصره ويده فيما ينهني في زمان صومه وصدقته بل في زمان صلوته في زمان ذكره في زمان نيته من فعل وترك فيؤجر في الزمان الواحد من وجوه كثيرة فيفضل غيره ممن ليس كذلك“  
بعض خوش قسمت انسان ہوتے ہیں جو ایک ہی زمانے میں کثیر اعمال جمع کر لیتے ہیں، کان ان کے نیکی کی



باتوں کو سنتے ہیں، نظر ان کی نیکی کے کاموں کی طرف اٹھتی ہے، وہ اپنے ہاتھوں سے بھی نیک کام کرتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں اور صدقہ بھی کرتے ہیں، نماز بھی ادا کرتے ہیں، رب تعالیٰ کا ذکر بھی کرتے ہیں، وہ ایک ہی وقت میں بہت سی زیادہ نیکیاں حاصل کر لیتے ہیں، لیکن جن کو یہ مقام حاصل نہیں وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔

اگر مفلسی شرمساری بری

بضاعت بچھا کر آری بری

جتنا نیکیوں کا سرمایہ لائے گا اتنا ہی بلند مقام حاصل کرے گا اگر نیکیوں کے سرمایہ سے خالی رہا تو شرمندگی اٹھائے گا۔

قال رسول اللہ ﷺ لیصل من یوم یائی علی ابن آدم الاینادی فیہ یا ابن آدم الاخلق

جدید وانا فیما نعمل علیک غذا شهید، فاعمل فی خیر الشہد لک بہ غذا فانی

لو قدمضیت لم تر نبی ابد او یقول اللہ مثل ذلک

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، انسان کو ہر دن اور ہر رات پکارا جاتا ہے، اے ابن آدم ہم نئی خلق میں ہوتے ہیں، ہم تجھ پر کل گواہ ہوں گے جو تو عمل کرتا رہا، میری رضاء کیلئے اچھے عمل کر، تاکہ میں کل ان کو تجھ پر گواہ بناؤں، اگر تو میری رحمت سے محروم رہا تو وہ رحمت تجھے کبھی نظر نہیں آئے گی۔

### پیاری نصیحت:

فاعمل یا اخی عمل من یعلم انہ راجع الی اللہ وقادم علیہ یجازی علی

الصغیر والكبیر والقلیل والكثیر

اے میرے بھائی اس دنیا میں اچھے عمل کر لے، جب تو جانتا بھی ہے کہ تیرے اعمال تیرے رب کے حضور پیش ہونے ہیں، اس لئے خفگی کے اعمال کی طرف پیش پیش ہو کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہر چھوٹے اور بڑے، تھوڑے اعمال اور زیادہ اعمال پر تجھے جزا دی جائے گی۔

(روح البیان ج ۲ ص ۱۱۹، ۱۲۰)





لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (آیہ نمبر ۱۶۳)

(۱) بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔ (کنز الایمان)

(۲) تحقیق قسم ہے بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر، جب ان میں، ایک رسول معظم بھیجا ان کی جانوں میں سے، وہ تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیتیں، اور پاک کرتا ہے ان کو، اور سکھاتا ہے ان کو کتاب و حکمت، اور بیشک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (نجوم الفرقان)

دینی طلباء کرام توجہ فرمائیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا ترجمہ راقم نے کیا ہے ”تحقیق قسم ہے بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر۔“ یہ ترجمہ روح المعانی سے لیا گیا ہے اور طلباء کرام یہ بھی یاد رکھیں کہ ”لَقَدْ“ میں لام موطاً للقسم ہے ”والجملۃ جواب قسم محذوف ای واللہ“ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ“

یہاں قسم محذوف ہے، اور ”مَنَّ اللَّهُ“ جملہ جواب قسم ہے، ”معنوی طور پر عبارت یوں ہوگئی ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ قسم ہے اللہ کی تحقیق بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا ”بڑا احسان ہوا“ یہ ترجمہ قرطبی کے ان الفاظ سے لیا گیا۔ ”بین اللہ تعالیٰ عظیم منۃ علیہم بیعتہ محمد“ کو مبعوث فرما کر بہت بڑا احسان کیا“ اور ”رَسُولٌ“ کا ترجمہ ”راقم“ نے کیا ”ایک رسول معظم“ کیونکہ ”رَسُولٌ“ پر تنوین تعظیم کیلئے ہے۔ یہ ترجمہ روح المعانی کے ان الفاظ میں دیکھئے ”رَسُولًا“ عظیم القدر، جلیل الشان“ عظیم قدر والے اور جلیل شان والے رسول کو بھیجا۔ اور اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ﴿وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ کا ترجمہ کیا ہے۔ ”اور وہ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے“ ”راقم“ نے بھی تقریباً یہی ترجمہ نقل کیا ہے، یہ ترجمہ بھی روح المعانی کی اس عبارت میں دیکھئے۔

”(وان) هی المخفضة واللام هی الفارقة، والمعنی ان الشان كانوا من قبل الخ“ والی



هذا ذهب بعض المحققين وذكر مثله مكي الا انه قال "التقدير وانهم كانوا من قبل  
فجعل اسمها ضميرا عائدا على المؤمنين"

یعنی "ان" حقیقت میں حرف مشبہ بالفعل ہے، اور اس میں "نون" مشدود ہے، لیکن مخفف کر کے ساکن  
کر دیا ہے اسی وجہ سے اس کے بعد "لام" لفظی "پر داخل کیا گیا ہے، تاکہ اس سے پتہ چل جائے کہ یہ  
"ان" "منخفضة من المثقلة" ہے۔ مقتضی کا یہی قول ہے۔ کہ "ان" کا اسم ضمیر شان ہے، اصل میں  
"انهم" تحقیق "بے شک" ضرور وہ اس پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔  
(روح المعانی ج ۳ ص ۱۱۲)

طلباء کرام یہ بھی خیال رکھیں کہ ایک ترکیب میں اس جملہ کو "حالیہ" بنایا گیا ہے، اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا  
"حالانکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"  
(روح المعانی ج ۳ ص ۱۱۵)

اور قرطبی میں ایک ترکیب اور بھی بیان کی گئی ہے کہ "ان" تانیہ ہے، "ما" کے معنی میں، اور "الا" محذوف ہے، اس  
صورت میں معنی یہ ہوگا ﴿مَا كَانُوا مِنْ قَبْلِ الْإِثْنِ ضَلَالٍ﴾ نہیں تھے اس سے پہلے گمراہ کھلی گمراہی میں۔  
(قرطبی ج ۳ ص ۲۶۵)

## ما قبل سے تعلق:

چند وجوہ سے ما قبل سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔

(۱) اس سے پہلی آیہ کریمہ میں ایک قول بیان کیا گیا کہ بعض جہال و منافقین نے ایک چادر کے گم ہونے پر  
(معاذ اللہ) اس خیانت کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کر دی، تو رب تعالیٰ اس کا رد کیا کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ  
خیانت کریں۔ تو اس آیہ کریمہ میں اس کی مزید تاکید کی، کہ یہ رسول معظم تمہارے شہر میں پیدا ہوئے، تم میں آپ نے  
جو انی گزاری

"ولم يظهر منه طول عمره الا الصدق والامانة والدعوة الى الله والا عراض عن

الدنيا فكيف يليق بمن هذا حاله الخيانة"

اتنی عمر میں یعنی چالیس سال کے بعد اعلان نبوت فرمایا کیا ان چالیس سالوں میں تم نے ان میں سوائے سچائی اور  
امانت کے کچھ دیکھا، ہاں ہاں آپ نے تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت دی خود دنیا سے اعراض  
کیا مقصد دنیا کا مال و دولت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کی عبادت میں مشغولیت تھی، جس  
ذات کے یہ اوصاف تھے بھلا اس سے خیانت ہو سکتی ہے؟ نہیں، نہیں وہ تو امین ہے، (معاذ اللہ) خائن نہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے جب ان لوگوں کی خطا کو بیان کیا کہ تم نے میرے نبی کی طرف خیانت کو منسوب کیا، یہ تمہارا



قول باطل ہے، اس میں یا جہالت کا دخل ہے یا منافقت کا۔ اس کے بعد گویا کہ رب تعالیٰ نے یوں فرمایا ”  
لا اقطع بذاک ولا اکفی فی حقہ بان ابین براءتہ عن الخاینة والغلول ولکنی اقول  
ان وجودہ فیکم من اعظم نعمتی علیکم فانه یزکیکم عن الطریق الباطلة ویعلمکم  
العلوم النافعة لکم فی دنیا کم و فی دینکم فای عاقل ینحضر بیاہ ان ینسب مثل  
هذا لانسان الی الخیانة“

میں صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا اور نہ ہی صرف اسے کافی سمجھتا ہوں کہ صرف اتنا ہی بیان کر دوں کہ آپ  
خیانت سے پاک تھے، بلکہ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ میرے معظم نبی کا تم میں پایا جانا میرا تم پر بہت بڑا احسان ہے، تم  
پر میرا بڑا انعام ہے، کیونکہ میرے نبی تمہیں باطل طریقہ سے پاک کرتے ہیں۔ اور تمہیں وہ علوم سکھاتے ہیں جو  
تمہارے لئے دین اور دنیا میں نفع مند ہیں، تو کون سا وہ شخص ہوگا جو عقل رکھنے والا ہو وہ اتنے بڑا عظیم انسان کامل، نبی  
محتشم کی نسبت خیانت کی طرف کرے گا؟ ہاں حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا جملہ زبان پر لانا جس سے مصطفیٰ کریم ﷺ کی  
شان میں حرف آئے، اس سے اپنی عاقبت کو ہی برباد کرنا ہے، آپ کی شان کو تو رب قدوس بیان کرتا ہے، دنیا والا آپ  
کی شان کو بیان کرے تو وہ خوش قسمت ہے، اور نہ بیان کرے تو وہ بد قسمت ہے۔ بات تو اتنی ہی ہے۔ (راقم)

(۳) کانه تعالیٰ یقول انه منکم ومن اهل بلدکم ومن اقاربکم وانتم ارباب الخمول  
والدناءة فاذا شرفه الله تعالیٰ وخصه بمزايا الفضل والاحسان من جمیع العالمین  
حصل لکم شرف عظیم بسبب کونه فیکم فطعنکم فیہ واجتهاد کم فی نسبة  
القبائح الیہ علی خلاف العقل“

رب تعالیٰ نے گویا کہ یوں بیان فرمایا کہ میرے نبی تم میں سے ہیں۔ اے عربو میرے نبی تمہارے شہر، تمہارے علاقہ  
کے ہیں۔ میرے نبی تمہارے رشتہ دار ہیں۔ لیکن تم گنہگار تھے تم گھٹیا تھے، یعنی خاندانی بلندی بیشک تمہیں حاصل تھی  
لیکن کفر نے تمہیں گھٹیا بنا رکھا تھا، تمہارا اسلامی چہرہ چاہئیں تھا، کافر خواہ مشہور بھی ہو وہ اللہ کے ہاں گنہگار ہوتا ہے، سب  
جہان والوں پر جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہی خاندان سے ایک فرد عظیم کو مشرف بنایا، بہت بڑے فضل سے نوازا، اور  
اس ذات کو اپنے خصوصی انعام و احسان سے نوازا، تو اس محسن انسانیت کی وجہ سے تمہیں بھی بڑی شرافت مل گئی، تمہارا  
مرتبہ بھی بلند ہو گیا، اسلام میں تمہارا چہرہ چاہو گیا، کیونکہ وہ میرے معظم نبی تم میں موجود ہیں، تمہارے خاندان سے  
ہیں۔ لہذا کوئی مسلمان آپ کی شان میں نازیبا الفاظ بول کر اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن نہ بنائے ہاں منافق تو منافق  
ہے، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر، شان مصطفیٰ کریم ﷺ میں ایسے الفاظ ذکر کرے، جن میں گستاخی کا پہلو لکھ اور آپ کی



شان میں بلند وبالا الفاظ استعمال کرنے سے وہ آگ بگولا ہو جائے تو اس کا طریقہ ہی یہی ہے، وہ ہے ہی منافق، مؤمن اور منافق میں فرق کو پہچانے۔ (راتم)

(۴) جب نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے شرافت و منقبت عطا فرمائی، اور آپ کی وجہ سے آپ کی امت کو شرافت و منقبت حاصل ہوگئی ”وَجِبَ عَلٰی كُلِّ عَاقِلٍ اَنْ يَعْنِيَهُ بِاَقْصٰی مَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ“ تو ضروری ہے ہر عقلمند شخص کیلئے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی اپنی قدرت و سعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ امداد کرے۔

”فَوَجِبَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَحَارِبُوْا اَعْدَاءَهُ وَاَنْ تَكُوْنُوْا مَعَهُ بِالْيَدِ وَاللِّسَانِ وَالسِّفِّ

وَالسِّنَانِ وَالْمَقْصُوْدُ مِنْهُ الْعَوْدُ اِلٰی تَرْغِيْبِ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ مَجَاهِدَةِ الْكُفَّارِ“

لہذا تم پر واجب ہے کہ تم نبی کریم ﷺ کے دشمنوں یعنی کفار سے لڑائی کرو، اور نبی کریم ﷺ کا ہاتھ اور زبان اور تلوار اور نیزے سے ساتھ دو، آیہ کریمہ کے مقاصد میں سے ایک یہ مقصد بیان کرتا بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو کفار سے جہاد کرنے کی رغبت دلائی جائے۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۷، ۷۸)

لفظ ”مَنْ“ کے معانی:

”وَاصِلُ الْمَنْ الْقَطْعُ“ اصل میں ”من“ جو بنی اسرائیل پر آسمانوں سے نازل ہوا ﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّٰ وَالسَّلْوٰی﴾ (اور ہم نے نازل کیا تم پر من اور سلوی)

(۲) ”وَلَانِيْهَا اَنْ تَمْنُ بِمَا عَطَيْتَ“ دوسرا معنی ہے کسی پر احسان کر کے جتنا، رب تعالیٰ نے ارشاد

فرمایا، ”لَا تَبْطُلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنْ وَالْاَذٰی“ (نہ باطل کرو تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور ایذا پہنچا کر)

(۳) وَلَانِيْهَا الْقَطْعُ تَمْرًا مَعْنٰی هُوَ قَطْعُ كَرْمٍ، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (سورۃ التین

، آیہ نمبر ۶) انہیں بے حد ثواب ہے، (سورۃ القلم، آیہ نمبر ۳) اور ضرور تمہارے لئے بے انتہاء ثواب ہے (یعنی آپ

کیلئے منقطع نہ ہونے والا اجر ہے۔

(۴) ”وَرَابِعُهَا الْاِنْعَامُ وَالْاِحْسَانُ اِلٰی مَنْ لَا تَطْلُبُ الْجَزَاءُ مِنْهُ“ چوتھا معنی ”من“ کا یہ لیا گیا ہے کہ

انعام و احسان کرنا جس کی جزاء نہ طلب کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (سورۃ ص، آیہ نمبر ۲۹)

یہ ہماری عطا ہے اب تو چاہے تو احسان کریا روک رکھ تجھ پر کچھ حساب نہیں۔ (کنز الایمان)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ اور زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کرو۔



**فائدہ:** یہاں چوتھا معنی معتبر ہے یعنی رب تعالیٰ کا مومنین پر بہت بڑا انعام، بہت بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نے ان میں اپنے رسول معظم کو مبعوث فرمایا، جس پر اس نے کوئی اجر طلب نہیں کیا، بھلا اتنے بڑے انعام پر کوئی اجر دے بھی سکتا ہے، نہیں نہیں کسی کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس احسان عظیم کا بدلہ دے سکے۔ (راقم)

**بعثت رسول کل جہانوں پر احسان ہے:**

”ان بعثت الرسول احسان الی کل العالمین“ بیشک رسول اللہ ﷺ کو رب تعالیٰ کا بھیجنا تمام جہانوں پر احسان عظیم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اس لئے مبعوث فرمایا گیا کہ آپ ان کو اس راہ حق کی دعوت دیں جو ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑائے اور ثواب تک پہنچائے۔

وهذا عام فی حق العالمین لانه مبعوث الی کل العالمین، كما قال الله تعالى ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ﴾  
یہ احسان عظیم سب جہانوں کی مخلوق پر ہے، کیونکہ آپ کو تمام جہانوں کا رسول بنا کر بھیجا گیا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (سورۃ سبا، آیہ نمبر ۲۸)  
اور اے محبوب ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے، خوشخبری دیتا اور ڈر سنانا، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔ (کنز الایمان)

اس آیہ کریمہ کے ﴿وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ سے ہی مسئلہ کھل کر واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کے رسول ہیں کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے، جب آپ تمام انسانوں کے رسول ہیں تو یقیناً تمام مخلوق کے رسول ہیں، اسلئے آپ کا تشریف لانا تمام انسانوں پر احسان عظیم ہے

”لما لم ينتفع بهذا الانعام الا اهل الاسلام فلهذا التاويل خص تعالى هذا المنه بالمؤمنين“  
لیکن اس عظیم انعام سے نفع اہل اسلام نے حاصل کیا، اکثر لوگوں نے آپ کو نہ جانا کہ آپ سید الکائنات ہیں، آپ محسن عظیم ہیں تو وہ اپنی اس غفلت کی وجہ سے آپ کے انعام و احسان سے کامل فائدہ حاصل نہ کر سکے اسی وجہ سے ایمان والوں کا خصوصی ذکر کیا گیا، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قرآن پاک کے متعلق فرمایا ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ مع انہ ہدی للکل، كما قال الله تعالى ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے، حالانکہ قرآن پاک تمام لوگوں کیلئے ہدایت ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“ کہ قرآن پاک تمام لوگوں کیلئے ہدایت



ہے، لیکن اس ہدایت کو قبول کرنے والے متقین تھے، اس لئے ان کا خصوصی ذکر ”هٰذِي لِّلْمُتَّقِينَ“ سے کر دیا۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ مَّنْ يُخَشَاہَا﴾ (سورۃ النازعات، آیہ نمبر ۳۵)

تم تو فقط اسے ڈرانے والے ہو جو اس سے ڈرے، حالانکہ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ تمام لوگوں کیلئے نذیر (ڈرانے والے) کا ذکر ہے، لیکن اس ڈر سے فائدہ ان لوگوں نے ہی حاصل کیا جن کو خوف خدا حاصل ہوا۔

(ماخوذ از کبیر ج ۹ ص ۷۸)

تمام رسولوں کی بعثت احسان ہے لیکن احسان عظیم بعثت مصطفیٰ ﷺ ہے:

اعلم ان بعثة الرسول احسان من الله الى الخلق ثم انه لما كان الانتفاع بالرسول اكثر كان وجه الانعام في بعثة الرسل اكثر

تمام رسولوں کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر احسان ہے لیکن ہمارے رسول اللہ ﷺ احسان عظیم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولوں کی وجہ سے لوگوں کو نفع حاصل ہوا جس کی وجہ سے وہ ان کے محسن ٹھہرے، جب سب سے زیادہ نفع زیادہ انسانوں کو نبی کریم ﷺ سے حاصل ہوا تو آپ کا محسن عظیم ہونا بھی روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۸)

آپ کی بعثت کے احسان عظیم ہونے پر دو وجہ سے دلیل:

”احدهما المنافع الحاصلة من اصل البعثة“ ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو بھیجنے میں ہی منافع حاصل ہیں، یعنی آپ کی اصل بعثت میں منافع پائے گئے۔ ”والثانی المنافع الحاصلة بسبب مافیہ من الخصال التي ما كانت موجودة فی غیرہ“ دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ کی صفات خصوصیت وہ ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں، ان صفات کی وجہ سے مخلوق کو منافع حاصل ہیں۔

اصل بعثت کی وجہ سے منافع:

”رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا“ ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ مَّبَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (سورۃ النساء، آیہ نمبر ۶۵) رسول بشارت دیتے اور ڈر سنا تے تاکہ لوگوں کو اللہ کے ہاں رسولوں کے بعد حجت نہ رہے۔

بعثت رسول سے انتفاع کی چند وجوہ:

(۱) مخلوق پیدائشی طور پر صفت نقصان میں ہوتی ہے، اور اس میں سمجھ کی کمی ہوتی ہے۔ بلکہ عقل ابتدائی طور پر نہ



ہونے کے برابر ہوتی ہے

”فہو صلوات اللہ علیہ والسلام اور دعلیہم وجوہ الدلائل ونقحہا وکلما خطرہا

لہم شک او شہۃ ازالہا واجاب عنہا“

تو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ان پر دلائل قائم کرتے ہیں۔ خالص اور پختہ دلائل ہوتے ہیں، جب بھی ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ان کو زائل کرتے ہیں۔

(۲) مخلوق کو اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مولیٰ کی خدمت کرنی چاہئے، لیکن وہ خدمت کی کیفیت کو نہیں جانتے کہ خدمت کا حق کسی طرح بجایا جائے،

”فہو ﷺ شرح تلک کیفیۃ لہم حتی یقدموا علی الخدمۃ آمین من الغلط ومن

الاقدام علی ما لا ینبغی“

تو نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کیفیت کی ان کیلئے وضاحت فرمائی، تاکہ وہ اپنے مولیٰ کی خدمت کا حق اس طرح بجالانے کا حق ہے۔ اور وہ اس خدمت کی غلطی سے محفوظ رہیں۔ اور نامناسب طریقہ کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔

(۳) مخلوق میں سستی، غفلت، کسی کام میں تاخیر اور طال پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔

”فہو ﷺ یورد علیہم انواع الترغیبات والترہیبات حتی انہ کلما عرض لہما کسل

او فتور نشطہم للطاعة و رغہم فیہا“

تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ان کو نیکی کے کاموں کی رغبت دلائی، اور گناہوں سے ڈرایا، یہاں تک کہ جب ان کو سستی یا فتور عارضی ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو طاعت کیلئے چست کیا، اور ان کو ان کاموں کی رغبت دلائی۔

(۴) مخلوق کے عقل کے انوار بصر کے انوار کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ نظر کے نور سے انسان اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جب تک سورج کی روشنی نہ ہو۔

”ونورہ ﷺ عقلی الہی یجری مجری طلوع الشمس فبقوی العقول بنور عقلہ

ویظہر لہم من لوائح الغیب ما کان مسترا عنہم قبل ظہورہ فہذا اشارۃ حقیقیۃ الی

فوائد اصل البعۃ“

نبی کریم ﷺ کا نور عقل الہی ہے جو دنیا میں روشنی بکھیر رہا ہے جیسا کہ سورج سے روشنی سے دن روشن ہو جاتا ہے، اسی



طرح نبی کریم ﷺ جو عقل الہی ہیں آپ کے نور سے لوگوں کی عقلوں کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے جو چیزیں لوگوں پر غائب تھیں وہ آپ کے آنے سے ان پر ظاہر ہو گئیں۔ یہ آپ کی اصل بعثت کے فوائد اسی آیت کریمہ سے حاصل ہوئے۔ (کبیر ج ۹ ص ۷۸، ۷۹)۔

**سُبْحَانَ اللَّهِ!** کیا خوب علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ آپ کے آنے سے لوگوں پر غیبی چیزوں کو ظاہر کر دیا، یعنی آپ کے وسیلہ جلیلہ سے آپ کی امت کو بھی بعض علوم غیبیہ عطاء کر دئے گئے، عجیب ہیں ان لوگوں کے نظریات جو نبی کریم ﷺ کے علوم غیبیہ میں شک میں مبتلا رہ کر اپنی عاقبت کو برباد کرتے رہتے ہیں۔

**آپ کی صفات سے حاصل ہونے والے فوائد:**

(۱) اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ”مِنْ أَنْفُسِهِمْ“ (کہ آپ ان سے ہی تشریف لائے) جب نبی کریم ﷺ ان کے شہر میں پیدا ہوئے اور ان لوگوں میں ہی آپ نے پرورش پائی وہ آپ کے تمام افعال و اقوال (آپ کے کاموں، آپ کی باتوں) پر مطلع تھے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اول عمر سے لے کر آخر عمر تک سوائے سچائی اور درگزر کے کسی چیز کا مشاہدہ نہیں کیا، کیونکہ آپ کو دنیا سے کوئی محبت نہ تھی، آپ دنیا سے دور رہتے تھے، اور جھوٹ آپ کے قریب نہیں آ سکتا تھا، اور سچائی ہی آپ کا شیوہ تھی۔

”وَمَنْ عَرَفَ مِنْ أَحْوَالِهِ مِنْ أَوَّلِ الْعُمُرِ إِلَى آخِرِهِ مَلَازِمَتَهُ الصِّدْقَ وَالْإِمَانَةَ وَبَعْدَهُ عَنِ

الْخِيَانَةِ وَالْكَذِبِ يَغْلِبُ عَلَيْهِ ظَنُّ كُلِّ أَحَدٍ أَنَّهُ صَادِقُهُ فِي هَذَا الدَّعْوَى“

جب نبی کریم ﷺ نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تو لوگوں کو یقین ہو گیا، بعض کو غالب گمان حاصل ہو گیا کہ آپ

اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کیونکہ وہ لوگ آپ کی ساری زندگی کا مطالعہ کر چکے تھے ان کو معلوم تھا کہ

آپ نے ہمیشہ ہمیشہ سچ بولا، آپ نے ہمیشہ امانت کا پاس کیا، آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، آپ نے

کبھی امانت میں خیانت نہیں کی، تو آپ اپنی نبوت کے دعویٰ میں بھی یقیناً سچے ہیں۔

(۲) ”مِنْ أَنْفُسِهِمْ“ سے ہی اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ آپ نے نہ ہی کسی کی شاگردی

حاصل کی، اور نہ ہی کسی سے کوئی کتاب پڑھی، اور نہ ہی کسی درس میں داخلہ لیا، اور نہ ہی کسی سے اسباق کا تکرار کیا، اور

بیشک آپ نے چالیس سال تک کوئی نبوت و رسالت کی بات نہیں کی، پھر چالیس کے بعد آپ نے نبوت کا دعویٰ

کیا، اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے وہ علوم ظاہر فرمائے جو جہان والوں میں سے کسی ایک نے بھی ظاہر نہیں

کئے، پھر آپ نے متقدمین کے واقعات بیان فرمائے، اور پہلے انبیاء کرام کے واقعات اس طرح بیان فرمائے جیسے



ان کی کتب میں موجود تھے، ہر وہ شخص جو عقل سلیم رکھتا تھا اسے پتہ چل گیا ”ان هذا لايتأتى الا بالوحي السماوى والالهام الالهى“ کہ بیشک آپ کو یہ علوم صرف آسمانی وحی اور الہام الہی سے حاصل ہوئے ہیں۔

(۳) ”انه بعدا دعاء النبوة عرضوا عليه الاموال الكثيرة والازواج ليرك هذه الدعوى فلم

يلفت الى شئ عن ذلك“

آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو آپ کو بہت بڑے مال کی پیشکش کی گئی، اور آپ کو یہ کہا گیا جس خاندان کی اور جس گھر کی آپ لڑکی پسند کریں آپ کو اسی سے شادی کرادی جائے گی۔ لیکن آپ یہ دعویٰ نبوت چھوڑ دیں، آپ نے ان کی ہر قسم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا، رب تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا، آپ نے فقر پر قناعت کی یعنی آپ نے غریبانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی، اور آپ نے ہر قسم کی مشقت پر صبر کیا۔

”ولما علا امره وعظم شأنه واخذ البلاد وعظمت الغنائم لم يغير طريقه فى البعد عن

الدنيا والدعوة الى الله والكاذب انما يقدم على الكذب ليجد الدنيا فاذا وجدها

تمتع بها وتوسع فيها فلما لم يفعل شيئا من ذلك علم انه كان صادقا“

جب آپ کے معاملات بڑھتے چلے گئے، آپ کی عظمت شان نکھرتی چلی گئی، اور آپ نے مختلف شہروں کو فتح کر لیا، آپ کے پاس کثیر مال غنیمت آگیا، لیکن آپ جس طرح پہلے دنیا سے دور تھے اسی طرح دور رہے، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، آپ کے طور طریقہ نہیں بدلے، جھوٹا شخص دنیا کا مال بٹورنے کیلئے مختلف جھوٹے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، جب وہ دنیا کا مال پالیتا ہے اور اسے مالی وسعت مل جاتی ہے، تو وہ اپنے طور طریقے بدل لیتا ہے۔ تو اسی سے واضح ہو گیا کہ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔

(۴) ان الكتاب الذى جاء به ليس فيه الاتقير التوحيد والتنزيه والعدل والنبوة والبات

المعاد وشرح العبادات وتقير الطاعات ومعلوم ان كمال الانسان فى ان يعرف

الحق لذاته والخير لأجل العمل به ولما كان كتابه ليس الا فى تقرير هذين الامرين

علم كل عاقل انه صادق فيما يقوله“

بیشک آپ نے جو کتاب رب تعالیٰ کی طرف سے پیش کی اس میں توحید اور اللہ تعالیٰ کا ہر نقص سے پاک ہونے کا تذکرہ ہے۔ عدل اور نبوت کا ذکر اس میں موجود ہے، قیامت کا ذکر اس میں پایا گیا ہے۔ عبادات کی وضاحت اور طاعات کا بیان اس میں ہے۔ اور یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ انسان کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ حق کو لذاتہ پہچانے، اور خیر کو اس پر عمل کرنے کیلئے



پہچانے، جب اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ان دونوں چیزوں کا ذکر ہے یعنی حق اور خیر کا تو ہر عقلمند شخص کو معلوم ہو گیا کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں۔

(۵) نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے عرب حضرات کا دین سب سے گھٹیا دین تھا، کیونکہ وہ بت پرست تھے، ان کے اخلاق بڑے پست اور رذیل تھے، لوٹ مار کرنا، قتل و غارت ان کا عمل تھا، اور ردی طعام، ناپاک یعنی حرام طعام کھانا ان کا طریقہ تھا۔

”ثم لما بعث الله محمد ﷺ نقلهم الله ببركة مقدمة من تلك الدرجة التي هي اخس الدرجات الى ان صاروا الفضل الامم في العلم والزهد والعبادة وعدم الالتفات الى الدنيا وطيباتها ولا شك ان فيه اعظم المنة“

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا، تو آپ کے آنے کی برکت کی وجہ سے ان کے گھٹیا درجات جاتے رہے وہ علم و زہد اور عبادت میں تمام امتوں سے افضل ہو گئے، ان کی دنیا کی طرف توجہ ختم ہو گئی، صرف اور صرف حلال مال پر گذر اوقات کی، خواہ وہ حلال مال ان کو کم ہی حاصل ہوا، اس میں کوئی شک نہیں، یہ یقین کے درجہ تک پہنچی ہوئی بات ہے کہ آپ کا تشریف لانا مومنوں کیلئے بہت بڑا احسان ہے۔

جب تمام وجوہ مذکورہ کا تمہیں پتہ چل گیا کہ بیشک نبی کریم ﷺ ان میں پیدا ہوئے، انہیں میں پرورش پائی، ان لوگوں نے آپ کے احوال کا مشاہدہ کیا، ان دلائل پر مطلع ہو گئے، تو ان کو آپ کے احوال کے مشاہدہ سے ایمان لانا آسان ہو گیا، اگر وہ لوگ آپ کے احوال کو نہ جانتے تو شاید ایمان لانے میں وہ مضطرب و پریشان ہوتے

”فلهذه المعاني من الله عليهم بكونه مبعوثا، فقال“ ”اذْبَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ“

ان اسباب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ اپنے رسول معظم کو ان کے نفسوں سے ہی بھیجا۔

”فيه وجه آخر من المنة وذلك لانه صار شرفا للعرب وفخرا لهم، كما قال الله تعالى وانه لذكر لك ولقومك“

آپ کے تشریف لانے سے مومنوں پر اور بڑا احسان یہ بھی تھا کہ ان کو عرب میں ایک خاص شرافت حاصل ہو گئی۔ اور آپ کی وجہ سے ان کو مقام افتخار (فخر کرنے کا ذریعہ) حاصل ہو گیا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَإِنَّكَ لَذِكْرُ لَكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ یہ افتخار اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے بھی حاصل تھا، لیکن وہ مومنین کے ساتھ خاص نہ تھا، بلکہ عرب اور یہود و نصاریٰ اس میں مشترک تھے۔ پھر یہود موسیٰ علیہ السلام اور توراة پر فخر کرتے تھے، اور نصرانی



عسیٰ ﷺ اور انجیل پر فخر کرتے تھے، لیکن عرب حضرات کو ان کے مقابل کوئی مقام فخر حاصل نہ تھا۔

”فلما بعث اللہ محمدا ﷺ وانزل القرآن صار شرف العرب بذلك زائدا علی شرف جمیع الأمم“

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا اور قرآن پاک نازل فرمایا تو تمام عرب حضرات کو دوسری تمام امتوں پر شرف حاصل ہو گیا۔ یہ تمام فوائد جو ابھی تک ذکر کئے گئے ہیں یہ ”مِنْ أَنْفُسِهِمْ“ (انہیں سے) (آپ تشریف لائے) سے حاصل ہوئے۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ انسان کا کمال دو چیزوں میں ہے۔ ایک حق کو لذاتہ پہچانتے ہیں، اور دوسرا بھلائی کا حصول کہ وہ بھلائی نیکی کے کام کرے۔ اسی مسئلہ کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے ”للنفس الانسانية قوتان نظرية وعملية“ نفس انسانیت کو دو قوتیں حاصل ہیں، ایک قوت نظریہ، اور دوسری قوت عملیہ، تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب نازل فرما کر دونوں قوتوں کی تکمیل فرمادی۔

”فقوله تعالى (يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ) إشارة ای کونه مبلغا لذلك الوحي من عند الله الى الى الخلق، وقوله (وَيُزَكِّيهِمْ) إشارة تكميل القوة النظرية بحصول المعارف الالهية والكتاب إشارة الى محاسن الشريعة واسرارها وعللها ومنافعها“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: ﴿يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ﴾ ”آپ تلاوت کرتے ہیں ان پر اس کی آیتیں“ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ یہ درحقیقت مخلوق کی قوت عملیہ کی تکمیل ہے کہ وہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل کریں۔

اور ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (اور پاک کرتا ہے ان کو) سے اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کو آپ معارف الہیہ عطاء فرما کر ان کی قوت نظریہ کی تکمیل فرماتے ہیں۔ اور ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ“ (اور وہ سکھاتا ہے ان کو کتاب) سے اشارہ ہے معرفت تاویل کی طرف۔

”وبعبارة اخرى (الْكِتَابَ) إشارة الى ظواهر الشريعة (والحكمة) إشارة الى محاسن الشريعة واسرارها وعللها ومنافعها“

اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ“ سے اشارہ ظاہر شریعت کی طرف ہے کہ آپ ان کو شریعت کے احکام سکھاتے ہیں، اور ”وَالْحِكْمَةَ“ سے اس طرف اشارہ پایا گیا ہے کہ آپ ان کو شریعت کے محاسن اور اس کے راز اور اس کی علتیں اور منافع سکھاتے ہیں۔ ان تمام نعمتوں کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد گرامی سے



فرمائی ”وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ“ اور بیشک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

”ان النعمة اذا وردت بعد المحنة كان توقعا اعظم، فاذا كان وجه النعمة العلم

والاعلام ووردا عقيب الجهل والذهاب عن الدين كان اعظم“

قانون یہی ہے کہ جب نعمت کا حصول محنت کے بعد ہو تو اس پر عظیم توقع مرتب ہوتی ہے، اور عظیم فوائد اس پر مرتب ہوتے ہیں، جب جہالت اور دین کے جانے کے بعد رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے ذریعے ان کو علم عطاء فرمایا اور ان کو معلم بنایا تو یقیناً آپ ایمان والوں کیلئے بہت بڑی نعمت ثابت

ہوئے۔ (ماخوذ کبیر ج ص ۸۰ تا ۸۱)

### میلاد النبی ﷺ کے متعلق کچھ ذکر خیر:

سب سے بڑی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آجکل مختلف عنوانات سے ربیع الاول میں جلسے ہو رہے ہیں، کسی کا نام ”پیغمبر انقلاب کانفرنس“ کسی کا نام ذکر ”ولادت مصطفیٰ ﷺ کانفرنس“ اور کسی کا نام ”سیرت النبی ﷺ کانفرنس“ کسی کا نام حسن قراءۃ و حمد و نعت کانفرنس یہ عنوانات ان حضرات نے قائم کر رکھے ہیں جو بات بات پر بدعت کا فتویٰ دیتے ہیں، اور ”میلاد النبی ﷺ“ کے نام سے کئے جانے والے جلسہ سے پتہ نہیں کیوں ناراض ہوتے ہیں، جب ان کا کوئی عنوان کسی حدیث پاک سے ثابت نہیں۔ لیکن میلاد النبی ﷺ کا عنوان تو صحاح ستہ میں سے ترمذی رحمہ اللہ نے خود قائم کیا ہے۔ ”باب میلاد النبی ﷺ“ اسی باب میں یہ حدیث ذکر کی:

”عن المطلب ابن عبد الله بن قيس بن مخزومة عن ابيه عن جده قال ولدت انا

ورسول الله اعوام الفيل قال وسأل عثمان بن عفان قباث بن اشيم اخا بني يعمر بن

ليث انت اكبر ام رسول الله ﷺ فقال رسول الله ﷺ اكبر مني وانا اقدم منه في

الميلاد وقال ورأيت خذق اخضر محيل“ (ترمذی ج ۲ ص ۲۰۲)

عبد المطلب بن عبد الله بن قيس بن مخزومة اپنے باب دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میری اور رسول اللہ ﷺ

کی ولادت عام الفیل ابرہہ کے ہاتھیوں پر حملہ کرنیوالے سال میں ہوئی وہ کہتے ہیں عثمان بن عفان نے

بنی یعمر بن لیث کے بھائی قباث بن اشیم سے پوچھا کیا تم بڑے ہو یا رسول اللہ ﷺ بڑے ہیں؟ انہوں نے

کہا رسول اللہ ﷺ مجھ سے بڑے ہیں۔ لیکن ولادت میری آپ سے پہلے ہوئی“ میں نے ابائیل پرندوں

کی سبز رنگ کی بیٹ (فضلہ) متغیر (بدلی ہوئی) دیکھی۔

واقفم نے کبھی کسی عنوان پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خیال یہ ہوتا ہے کہ میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا



ذکر ہوتا رہے خواہ کسی نام سے بھی ہوتا رہے۔ میلاد النبی ﷺ کے محافل و مجالس میں آپ کے فضائل کو ذکر کیا جاتا ہے۔ ابھی جو آیہ کریمہ زیر بحث ہے اس میں نبی کریم ﷺ کی فضیلت کا ہی ذکر تو موجود ہے، قرآن پاک نبی کریم ﷺ کے اوصاف کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، اس کا نام میلاد النبی ﷺ کا ذکر ہی تو ہے۔

### میلاد النبی ﷺ کا جلسہ جو رب تعالیٰ نے قائم کیا:

وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لِمَا تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (سورة آل عمران، آية نمبر ۸۱)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر بھاری ذمہ اٹھایا سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (کنز الایمان)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اللہ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جس کسی کو نبوت عطاء فرمائی ان سے سید انبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نسبت عہد لیا اور ان انبیاء نے اپنی قوموں سے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں سید عالم ﷺ مبعوث ہوں تو آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں اس سے ثابت ہوا کہ حضور تمام انبیاء میں سب سے افضل ہیں۔ ”ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ“ سے مراد سید عالم ﷺ ہیں۔ ”لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ“ تو تم ضرور بر ضرور اس پر ایمان لانا، یعنی اس طرح ایمان لانا کہ ان کے صفات و احوال کو یوں تسلیم کرنا جو آپ کے مطابق ہوں اور کتب انبیاء کرام میں موجود ہوں۔ قرآن وحدیث میں ان کا تذکرہ ہو۔ (ماخوذ از خزائن العرفان)

آیہ کریمہ کی مکمل تفسیر اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے، یہ جلسہ ارواح انبیاء کرام میں کیا گیا۔

### نبی ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:

﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (سورة النساء، آية نمبر ۸۰) ”جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا“

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کیا جائے:

﴿يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (سورة التوبة، آية نمبر ۶۲)



تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ تمہیں راضی کر لیں اور اللہ و رسول کا حق زائد تھا کہ اسے راضی کرتے اگر ایمان رکھتے تھے۔  
(کنز الایمان)

منافقین اپنی مجالس میں سید عالم ﷺ پر طعن کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کے پاس آکر اس سے مکر جاتے تھے اور قسمیں قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنی بریت ثابت کرتے تھے، اس پر یہ آیہ نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ مسلمانوں کو راضی کرنے کیلئے قسمیں اٹھانے سے زیادہ اہم اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنا تھا اگر ایمان رکھتے تھے تو ایسی حرکتیں کیوں کیں جو خدا اور رسول کی ناراضی کا سبب ہوں۔

**فائدہ:** اس آیہ کریمہ سے یہ پتہ چلا کہ اس وقت جلسے دو قسم کے ہوتے تھے ایک وہ جس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان ہوتے تھے، وہ جلسہ اللہ نے منع فرمایا، انبیاء کرام نے آپ کے اوصاف بیان کئے، صحابہ کرام نے آپ کے اوصاف کا تذکرہ کیا، خود نبی کریم ﷺ نے اپنے اوصاف اور اپنی ولادت کا ذکر کیا، محدثین کرام نے آپ کی ولادت کا ذکر کیا، جیسا کہ ترمذی کی حدیث بیان کی جا چکی ہے۔

اور دوسرا جلسہ منافقین کا ہوتا تھا جو نبی کریم ﷺ کے خلاف ان کا کلام ہوتا تھا، پھر اس کا انکار بھی کرتے تھے کہ نہیں ہم تو نبی کریم ﷺ کے اوصاف بیان کر رہے تھے، آج کل بھی یہی طریقہ چلا آ رہا ہے، ربیع الاول میں جلسے دو قسم کے ہی ہو رہے ہیں، ایک اہل سنت و جماعت کا جس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف و فضائل بیان ہوتے ہیں، اور کچھ حضرات کی مجالس میں کفر و شرک و بدعات کا ذکر ہوتا ہے، بتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر چسپاں کی جاتی ہیں، اور کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات کی لپیٹ میں مسلمانوں کو لیا جاتا ہے۔ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے میلاد کا ذکر کیا:

مجموعی طور پر تمام انبیاء کرام کا ذکر اس آیہ کریمہ میں کیا ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (سورۃ البقرہ، آیہ ۲۵۳) ”یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی بعض کو بعض پر۔“

آدم کا تذکرہ آپ کی تخلیق سے پہلے یوں کیا:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (سورۃ البقرہ آیہ نمبر ۳)



”آپ کی تخلیق کے بعد آپ کا ذکر رب قدوس نے یوں کیا“

﴿قَالَ يٰٓإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیْ﴾ (سورۃ ص، آیت نمبر ۷۵)

فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا سجدہ کرنے سے اسے جسے میں نے دست قدرت سے بنایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرماتے ہوئے یوں فرمایا:

﴿اِنَّا اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی قَوْمِهٖ اَنْ اَنْذِرُ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (سورۃ نوح، آیت نمبر ۱)

بیشک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ ان کو ڈرا اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آئے۔ (کنز الایمان)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِبْرٰهٖمَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ (سورۃ مریم، آیت نمبر ۴۱)

”اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا (اور) نبی“ (کنز الایمان)

حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ اَمْرًا اِنَّہٗ قَائِمَةٌ فَضَحَّکْتُ فَبَشِّرْنٰہَا بِاسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ﴾ (سورۃ ہود، آیت نمبر ۷۱)

”اور اس کی بی بی کھڑی تھی وہ ہنسنے لگی تو ہم نے اسے اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی۔“

اس پہلے آیت نمبر ۶۹ میں یوں ذکر کیا ﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهٖمَ بِالْبَشْرِیْ قَالُوْا سَلَامًا قَالْ

سَلَامٌ﴾ اور بیشک ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس مژدہ لے کر آئے، انہوں نے سلام کہا، آپ نے (بھی) سلام کہا۔

حضرت اسمعیل علیہ السلام کا تذکرہ یوں کیا:

﴿وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ کَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا﴾ (سورۃ مریم، آیت نمبر ۵۲)

”اور کتاب میں اسمعیل کو یاد کرو بیشک وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتاتا“ (کنز الایمان)

حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِدْرِیْسَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا وَ رَفَعْنٰہُ مَکٰنًا عَلِیًّا﴾ (سورۃ مریم، آیت نمبر ۵۷، ۵۸)

اور کتاب میں ادریس کو یاد کرو بیشک وہ صدیق تھا غیب کی خبریں دیتا، اور ہم نے اسے بلند مکان پر اٹھالیا۔



حضرت اسمعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا تذکرہ یوں کیا:

﴿وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝ وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾  
(سورة الانبياء، آية نمبر ۸۵، ۸۶)

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو وہ سب صبر والے تھے، اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا بیشک وہ ہمارے قرب خاص کے سزاواروں میں ہیں۔ (کنز الایمان)

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کا ذکر یوں کیا:

﴿وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ﴾  
(سورة الانبياء، آية نمبر ۸۹، ۹۰)

”اور (یاد کرو) زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب! مجھے اکیلے نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے، تو ہم نے اس کی دعاء قبول کی اور اسے یحییٰ عطا فرمایا۔“

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا﴾  
اور کتاب میں موسیٰ کو یاد کرو بیشک وہ چنا ہوا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتانے والا، اور اسے ہم نے طور کی دہنی جانب سے ندا فرمائی اور اسے اپنے راز کہنے کو قریب کیا، اور اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون عطا کیا غیب کی خبریں بتانے والا نبی۔ (کنز الایمان، سورة مریم آية نمبر ۵۳ تا ۵۴)

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾  
(سورة النمل آية نمبر ۱۵، ۱۶)  
”اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو بڑا علم عطا کیا اور دونوں نے کہا سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت بخشی، اور سلیمان داؤد کا جانشین ہوا۔“

حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر فرمایا:

﴿وَإِذْ كُرِّهْنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسْنِي الشَّيْطَانُ يَنْصُبُ وَعْدًا﴾  
(سورة ص آية نمبر ۴)



”اور یاد کرو ہمارے بندہ ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے اور ایذا لگادی“

حضرت یسوع علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا سَمْعِيلَ وَيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِنَ الْأَخْيَارِ﴾ (سورة ص آية نمبر ۴۸)  
اور یاد کرو اسماعیل اور یسوع اور ذوالکفل کو اور سب اچھے ہیں۔

حضرت عیسیٰ، حضرت الیاس، حضرت یونس اور انبیاء کرام کا تذکرہ یوں کیا:

”وَبَلَدِكَ حُجَّتَنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَى قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَن نَّشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَإِسْمَاعِيلَ وَيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ۝“ (سورة الانعام، آية نمبر ۸۶ تا ۸۳)

”اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر عطاء فرمائی، ہم جسے چاہیں درجوں بلند کریں، بے شک تمہارا رب علم و حکمت والا ہے، اور ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطاء کئے ان سب کو ہم نے راہ دکھائی، اور ان سے پہلے نوح کو راہ دکھائی اور اس کی اولاد میں سے داود اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو یہ سب ہمارے قرب کے لائق ہیں۔ اور اسماعیل اور یسوع اور یونس اور لوط کو اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی۔“

تمام انبیاء کرام کا ذکر یوں فرمایا:

”وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا“ (سورة النساء آية نمبر ۱۶۴)

اور کچھ رسولوں کا ذکر ہم نے آپ سے کر دیا، اور کچھ رسولوں کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا، اور موسیٰ سے حقیقی طور پر کلام فرمایا۔

اور ذکر یوں کیا:

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ (سورة الانعام، آية نمبر ۱۲۴)



”اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے،

محافل میلاد النبی ﷺ میں کیا ہوتا ہے؟

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی مجالس میں آپ کے اوصاف کا ذکر ہوتا ہے، آپ کے معجزات کا ذکر ہوتا ہے، آپ کی نعت خوانی اور صلوٰۃ و سلام ہوتا ہے۔ ابھی تک جن آیات کو ذکر کیا ان میں انبیاء کرام کا ذکر خیر موجود ہے، صرف ایک ایک مثال پیش کی گئی، ورنہ ذکر انبیاء کرام میں کئی کئی آیات کریمہ کا ذکر ہے۔ راقم کی کتاب ”قذمۃ الانبیاء“ کا مطالعہ کرو تو آپ کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے کتنے کتنے اوصاف ذکر فرمائے جو ایک جزء ہے محفل میلاد النبی ﷺ کا۔

آئیے ذرا دیکھئے:

رب تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر اس انداز پر کیا کہ جس سے محفل میلاد النبی ﷺ کا سارا نقشہ نظر آ جاتا ہے۔ ﴿يَا زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ ”اے زکریا ہم تجھے خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جن کا نام یحییٰ ہے اس کے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی نہ کیا۔“ ﴿قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا﴾ عرض کی اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا میری عورت تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے سے سوکھ جانے کی حالت کو پہنچ گیا۔ ﴿قَالَ كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىٰ هَيْئٍ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا﴾ فرمایا ایسا ہی ہے، تیرے رب نے فرمایا وہ مجھے آسان ہے، اور میں نے تو اس پہلے تجھے اس وقت بنایا جب تو کچھ بھی نہ تھا۔ ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ عرض کی اے میرے رب مجھے کوئی نشانی دیدے فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات دن لوگ سے کلام نہ کرے بھلا چنگا ہو کر۔ ﴿فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴾ تو اپنی قوم پر مسجد سے باہر آیا تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہو۔ ﴿يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ اے یحییٰ کتاب مضبوط تھام، اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی ﴿وَخَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيًّا﴾ اور اپنی طرف سے مہربانی اور ستمرائی اور کمال ڈروالہ تھا۔ ﴿وَبَرَّ أَبَوَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ اور اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے والا تھا زبردست و تافرمان نہ تھا ﴿وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾ اور سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا اور



جس دن مرے گا اور جس دن مردہ اٹھایا جائے گا۔ (سورۃ مریم، آیہ نمبر ۱۵۲) (ترجمہ کنز الایمان)

ان آیات کریمہ کو پڑھئے، بار بار بڑھئے، انصاف کی نگاہ سے دیکھئے، کیا رب تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر نہیں دی؟ یقیناً خبر دی ہے۔ پھر خود ہی رب تعالیٰ نے نام بھی رکھا اور بتایا کہ اس سے پہلے کوئی تکھی نہیں تھا، یہ پہلا نام ہی تکھی آپ کے سامنے آیا ہے۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کی پیدائش پر خوشخبری پر تعجب کرتے ہوئے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے رب کائنات بیٹا کیسے پیدا ہوگا جبکہ میری عورت بانجھ ہے میں خود بڑھاپے کی اس عمر میں ہوں کہ بیٹے کا پیدا ہونا تصور میں نہیں آسکتا۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا میری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ جب تم کچھ بھی نہیں تھے تو تمہیں بھی تو میں نے ہی پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر کہ بیٹا تمہارا ضرور پیدا ہوتا ہے تو خوش ہو کر حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی نشانی بتادے کہ میرے بیٹے کا حمل ماں کے شکم میں قرار پکڑ گیا۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تم قدرتی طور پر تین دن، تین رات کوئی بات نہیں کر سکو گے حالانکہ تم اچھے بھلے ہو گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی تم عبادت کر سکو گے، آپ نے اشارہ سے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی صبح و شام تسبیح بیان کرنے کا حکم دیا۔ پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کتاب پر مضبوطی سے عمل کرو، پھر رب تعالیٰ نے فرمایا ان کو بچپن میں نبوت عطاء کی، اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کے دل میں رقت و رحمت اور مہربانی رکھی۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان کو ماں باپ کا فرمانبردار بنایا، سرکش اور نافرمان نہیں بنایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ولادت کے دن سلام بھیجا، اور فرمایا وفات کے دن آپ پر سلام ہو۔ اور جس دن آپ کو اٹھا یا جائے اس دن آپ پر سلام ہو۔

خدا را انصاف کیجئے! کیا آجکل علماء کرام میلاد النبی ﷺ کے مجالس میں وہی کچھ نہیں بیان کرتے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت میں ذکر کیا؟ یقیناً وہی کچھ بیان کرتے ہیں جو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا یوم ولادت یوں بیان کرتے ہیں:

”قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ الْكُتُبَ وَجَعَلْنِي نَبِيًّا ۝ وَجَعَلْنِي مُبْرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرَّ أَبَوَالِدَيْنِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ۝“  
(سورۃ مریم، آیہ نمبر ۳۰ تا ۳۳)

آپ نے کہا بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔ اور اس نے مجھے



برکت والا بنایا جہاں بھی میں ہوں، اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید فرمائی جب تک زندہ رہوں، اور مجھے اپنی ماں سے اچھا سلوک کرنے والا بنایا، اور مجھے زبردست، بد بخت نہ کیا۔ اور وہی سلامتی مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن زندہ اٹھایا جاؤں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیدائش کے ذکر میں اپنے اوصاف ذکر فرمائے، اور اپنی پیدائش اور وفات اور اٹھائے جانے پر سلام کا ذکر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا نوح علیہ السلام:

﴿سَلِّمْ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعِلْمَيْنِ ۖ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾  
(سورة الصافات، آية نمبر ۸۱ تا ۸۹)

”نوح پر سلام ہو جہاں والوں میں، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام:

﴿سَلِّمْ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۖ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾  
(سورة الصافات، آية نمبر ۱۰۹ تا ۱۱۱)

سلام ہو ابراہیم پر، ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام:

﴿سَلِّمْ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۖ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾  
(سورة الصافات آية نمبر ۱۲۰ تا ۱۲۲)

سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو بیشک وہ دونوں ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت الیاس علیہ السلام:

﴿سَلِّمْ عَلَىٰ إِيَّاسَ ۖ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾  
(سورة الصافات، آية نمبر ۱۲۳ تا ۱۲۴)



”سلام ہو الیاس پر، بیشک ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو، بیشک وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل الایمان بندوں میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا صلوة و سلام نبی کریم ﷺ پر اور بندوں کو حکم:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾  
(سورة الاحزاب، آیت نمبر ۵۶)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر، اے ایمان والو آپ پر درود اور خوب سلام بھیجو۔

بحث مذکور سے نتیجہ واضح ہوا:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی ولادت باسعادت کا تذکرہ کیا اور انبیاء کرام پر سلام بھیجا، اور نبی کریم ﷺ پر صلوة و سلام بھیجا، اور اس کے فرشتوں نے بھی آپ پر صلوة و سلام بھیجا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بھی حکم دیا کہ تم بھی میرے نبی پر صلوة و سلام بھیجو۔

صحابہ کرام کا ذکر انبیاء کرام:

”عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال جلس ناس عن اصحاب النبی ﷺ ينتظرونه قال فخرج حتى اذانا منهم سمعهم يتذاكرون فسمع حديثهم فقال بعضهم عجا ان الله اتخذ ابراهيم من خلقه خليلا وقال آخر ماذا باعجب من كلام موسى كلمة الله تكليما وقال آخر فعيسى كلمة الله وروحه وقال آخر آدم اصطفاه الله فخرج عليهم فسلم وقال قد سمعت كلامكم وعجبكم بان الله اتخذ ابراهيم خليلا وهو كذلك وموسى نجى الله وهو كذلك وعيسى روح الله وهو كذلك و آدم اصطفاه الله وهو كذلك الا وانا حبيب الله ولا فخر وانا حامل لواء الحمد يوم القيامة ولا فخر وانا اول من يحرك خلق الجنة فيفتح الله لي فيدخلنيها ومعنى فقراء المؤمنين ولا فخر وانا اكرم الاولين والآخرين ولا فخر.“ (دارمی ترمذی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے



جب آپ صحابہ کرام کے قریب ہوئے تو آپ نے ان کو مذاکرہ کرتے ہوئے سنا، آپ نے ان کے کلام کو سنا ان میں سے بعض حضرات نے تعجب کرتے ہوئے یہ کہا بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا، دوسرے کہنے لگے یہ کوئی اس سے زیادہ متعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے (بلا واسطہ) کلام فرمایا، دوسرے کہنے لگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ بنایا، کچھ اور حضرات کہنے لگے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صفی اللہ بنایا۔

اتنے میں نبی کریم ﷺ ان کے سامنے جلوہ گر ہوئے، سلام کہنے کے بعد ارشاد فرمایا میں نے تمہارا کلام سنا، اور تمہارے اظہار تعجب کو سنا (جو تم نے کہا) بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا یقیناً ایسا ہی ہے، اور موسیٰ علیہ السلام نجی اللہ ہیں یقیناً ایسا ہی ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ ہیں یقینی طور پر یہ درست ہے کہ آپ اسی طرح ہیں، اور آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں۔ محقق بات ہے کہ آپ صفی اللہ ہیں۔ خبردار (غور سے سنو آگاہ رہو) میں اللہ کا حبیب ہوں، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، قیامت کے دن لواء حمد میرے ہاتھ میں ہوگا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا، اور سب سے پہلے میری شفاعت کو ہی قبول کیا جائے گا، اس پر مجھے کوئی فخر نہیں، سب سے پہلے جنت کے دروازوں کے حلقوں کو میں ہی حرکت دینے والا ہوں گا، اللہ تعالیٰ میرے لئے جنت کے دروازے کھول دے گا، اور جنت میں داخل کرے گا کہ میرے ساتھ غریب ایمان دار لوگ ہوں گے، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، میں تمام پہلے آنے والے اور بعد میں آنے والوں میں مکرم ہوں گا مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔

حدیث پاک کی مکمل تفصیل و اہم کی کتاب ”شمع ہدایت“ میں دیکھئے، حدیث پاک سے اتنا واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام نے ذکر انبیاء کرام ایک مجلس میں کیا جو محفل میلاد النبی ﷺ کا حصہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سن کر منع نہیں فرمایا، بلکہ اپنے اوصاف حمیدہ بیان کر کے اپنے منصب کی حقیقت کو بیان فرمادیا۔

**اعتراض:** نبی کریم ﷺ نے تو انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے سے منع فرمایا آپ نے ارشاد فرمایا ”لا تفضلوا بین الانبیاء“ مجھے انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ (مسلم شریف ج ۲ کتاب الفضائل)

**جواب:** آپ کا یہ کلام عجز و انکسار پر مبنی ہے، لیکن دوسرے حدیث پاک میں آپ نے اپنی حقیقت کو یوں بیان فرمایا

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر و بیدی  
لواء الحمد ولا فخر و مامن یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی۔  
(مشکوٰۃ شریف باب فضائل سید المرسلین)



حضرت ابوسعید (خدری) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا، اس بات پر کوئی فخر نہیں، اس دن تمام آدم ﷺ اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہی ہوں گے۔

**تشریح:** جو تمام قوم سے فضیلت و خیریت میں برتر ہو اسے ”سید“ کہتے ہیں، یہ معنی علامہ ہر وی رحمتہ اللہ نے بیان فرمایا، اور سید کا مطلب یوں بیان کیا گیا۔

”هو الذي يفرع اليه جي النوائب والشدائد فيقوم بامرئهم ويتحمل عنهم مكارههم ويدفعها عنهم.“  
(نووی شرح مسلم کتاب الفضائل ج ۲)

”سید اسے کہتے ہیں جس کی طرف قوم اپنے مصائب و آلام میں پناہ پکڑے، وہ ان کی حاجات کو پورا کرے، خود مشقتیں برداشت کر کے ان کی تکالیف کو دور کرے“

**اعتراض:** حدیث شریفیں ”ولد آدم“ ذکر ہے، جس کا مطلب ہے ”مجھے اولاد آدم پر فضیلت حاصل ہے“ اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی فضیلت حضرت آدم ﷺ پر ثابت نہیں، اگرچہ دوسرے انبیاء کرام پر فضیلت ثابت ہے۔

**پہلا جواب:** ”فانهم يستعملون ولد آدم بمعنى نوع الانسان“ (نبراس)

بیشک عرب حضرات ”ولد آدم“ نوع انسان، کے معنی میں لیتے ہیں، یعنی عام محاورہ کے مطابق صرف اولاد آدم معنی نہیں، بلکہ تمام انسان مراد ہیں، جس میں آدم ﷺ بھی ہیں، اس طرح اب معنی یہ ہوگا کہ ”مجھے تمام انسانوں پر فضیلت حاصل ہے“

**دوسرا جواب:** ”ان للحديث تتمته موضحة للمطلوب وهو قوله ﷺ و مامن نبی يومئذ آدم

فمن سواه الا تحت لوائی“ (نبراس)

مطلب کو واضح کرنے کیلئے حدیث پاک کے آخری الفاظ سے تکمیل ہو رہی ہے کہ آدم ﷺ اور ان کے سوا تمام ہی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، یعنی تمام انسان بمع انبیاء کرام کے میرے جھنڈے کے نیچے پناہ لینے پر مجبور ہوں گے، (اس سے حضرت آدم ﷺ پر آپ کی فضیلت ثابت ہوگئی)

﴿يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ مجھے قیامت کے دن سرداری حاصل ہوگی، حالانکہ آپ کو دنیا میں بھی تمام پیادت حاصل ہے، پھر قیامت کے دن کے ذکر کرنے کا کیا مطلب؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت میں آپ کی فضیلت تمام پر نیا ہر ہو جائے گی۔



”ان فی یوم القیامۃ بظہر سوددہ لكل احد ولا یبقی منازع ولا معاند“ (نوی)  
 بیشک قیامت کے دن آپ کی سرداری ظاہر ہو جائے گی، کوئی جھگڑا کرنے والا جھگڑا نہیں کرے گا، اور  
 کوئی شخص عناد نہیں کرے گا، کیونکہ دنیا میں کفار، مشرکین نے آپ کی فضیلت کو تسلیم نہیں کیا۔

دنیا میں اگرچہ بہت لوگ آپ کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر براہ راست خدا تک رسائی حاصل کرنے کے دعویدار  
 ہیں لیکن قیامت کے دن تمام کو ہی میرے پیارے مصطفیٰ کریم ﷺ کا وسیلہ تلاش کرنا پڑے گا، جب تمام امتوں کو ان کے  
 انبیاء کرام فرمائیں گے ”اذہبوا لی غیری“ میرے بغیر کسی اور کا وسیلہ تلاش کرو، اس وقت میرے حبیب پاک ﷺ کی  
 زبان پر ہوگا ”انالہا“ کہ اس شفاعت کا میں ہی حقدار ہوں، آپ ہی شفاعت فرمائیں گے، اس وقت آپ کی شان  
 رسالت کی فوقیت واضح ہو جائے گی، کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔

”خلیل ونجی، کلیم و مسیح سبھی سے کہیں سے نہ بنی یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے“

نبی کریم ﷺ کی سرداری کا قیامت کے دن ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ رب تعالیٰ اپنے متعلق قیامت کے دن  
 فرمائے گا ”لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ“ آج کسی کی بادشاہی ہے؟ اللہ واحد و قہار کی، اگرچہ آج بھی  
 ہر قسم کی بادشاہی اسی کو حاصل ہے، اور تمام چیزیں اسی کی ملکیت میں ہیں، لیکن دنیا میں لوگ دعویدار موجود ہیں کہ اس  
 زمین کا میں مالک ہوں، اس مکان کا میں مالک ہوں، اس بادشاہی کا میں مالک ہوں۔ لیکن قیامت کے دن سب  
 دعوے ختم ہو جائیں گے وہاں صرف رب ذوالجلال کی بادشاہی ہوگی، مجازی طور پر بھی کوئی اپنی ملکیت اور بادشاہی کا  
 ذکر نہیں کرے گا۔

”ولا فخر“ ای ولا اقولہ تفاخرا بل اعتدادا بفضلہ وتحدثا بنعمتہ وتبلیغا لما امرت بہ“

یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا،

**پہلی وجہ:** آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے کی ضروری ہوتے ہیں تاکہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے، اور آپ  
 پر اعتقاد رکھے، اور آپ کی عزت و تکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے۔

**دوسری وجہ:** ”اعتدالا لما مر اللہ تعالیٰ“ ”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ (نوی) آپ نے اپنے  
 مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ  
 فَحَدِّثْ“ اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔



## نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی منانا:

”حصولِ نعمت پر تعریف کرنا باعثِ شکر ہے“

عن جابر بن عبد اللہ مرفوعاً من اعطی عطاءً فوجد فليجز به فان لم يجد فليشكر به  
فمن انى به فقد شكر ومن كتمه فقد كفر“

حضرت جابر بن عبد اللہ ﷺ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ جس شخص کو کوئی عطیہ دیا جائے وہ اگر بدلہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کا بدلہ دے، اگر بدلہ دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کی تعریف کرے، یہ تعریف کرنا شکریہ ادا کرنا ہوگا، جس شخص نے اسے چھپایا اس نے ناشکری کی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حصولِ نعمت پر تعریف کرنا ذریعہ شکر ہے، اور شکر کرنے سے حصولِ نعمت میں زیادتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ اور یاد کرو جب تمہارے رب نے سنا دیا کہ اگر احسان مانو گے (شکریہ ادا کرو گے) تو میں تمہیں اور دوں گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شکر سے نعمت زیادہ ہوتی ہے، شکر کی اصل یہ ہے کہ آدمی نعمت کا تصور اور اس کا اظہار کرے اور حقیقتِ شکر یہ ہے کہ منعم کی نعمت کا اس کی تعظیم کے ساتھ اعتراف کرے، اور نفس کو اس کا خوگر بنائے، یہاں ایک بار کی ہے وہ یہ کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے طرح طرح کے فضل و کرم و احسان کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے شکر میں مشغول ہوتا ہے، اس سے نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں، اور بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے یہ مقام بہت برتر ہے اور اس سے اعلیٰ مقام یہ ہے کہ منعم کی محبت یہاں تک غالب ہو کر قلب کی نعمتوں کی طرف التفات باقی نہ رہے، یہ مقام صدیقیوں کا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ (خزان العرفان)

## نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت بھی نعمت ہے:

﴿وَإِذْ تَكُونُوا نِعْمَتُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءَ فَأَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾  
(سورۃ آل عمران، آیت نمبر ۱۰۳)

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، جب تم (آپس میں ایک دوسرے کے) دشمن تھے، تو الفت ڈال دی اس نے تمہارے دلوں کے درمیان، تو ہو گئے تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی۔

یعنی اسلام کی بدولت عداوت دور ہو گئی، آپس میں دینی محبت پیدا ہو گئی، حتیٰ کہ اس اور خزرج کی وہ مشہور لڑائی جو ایک سو بیس سال سے جاری تھی اور اس کے سبب رات دن قتل و غارت کی گرم بازاری رہتی تھی، سید عالم ﷺ کے ذریعہ



اللہ تعالیٰ نے مٹادی اور جنگ کی آگ ٹھنڈی کر دی، اور جنگجو قبیلوں میں الفت و محبت کے جذبات پیدا کروئے۔

(خزائن العرفان)

اس آیت کریمہ سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے صدیوں پرانی عداوتیں، رنجشیں ختم ہو گئیں۔ نعمت کے حصول پر تذکرہ کرنا اور نعمت دینے والے کی تعریف کرنا ضروری ہے تاکہ شکریہ ادا ہو سکے اور نعمتوں کی زیادتی ہو سکے۔ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی آمد باسعادت کا تذکرہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرنا ہے جو یقیناً اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی اور ضامندی کا سبب ہے۔

**دوسری دلیل:** (اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا)

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾ (سورۃ یونس آیت نمبر ۵۸)

تم فرماؤ اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اور اسی پر چاہئے کہ خوشی کریں، وہ ان کے سب دھن دولت سے بہتر ہے۔ (کنز الایمان)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رحمت پر خوشی کرنے کا حکم فرمایا، رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، جیسا کہ روح المعانی میں ہے ”واخرج ابو الشیخ عن ابن عباس ؓ ان الفضل العلم والرحمة محمد ﷺ“ آیت کریمہ میں فضل سے مراد علم اور رحمت سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے علم کے حصول اور رحمت کے حصول پر خوشی منانے کا خود حکم دیا ہے۔

**آپ تمام جہانوں کیلئے رحمت ہیں:**

دوسرے مقام پر اور زیادہ طور پر آپ کو خطاب فرماتے ہوئے رب کریم نے آپ کو رحمت کائنات کہا ہے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (سورۃ الانبیاء، آیت نمبر ۱۰۷)

اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہانوں کیلئے۔ (کنز الایمان)

**تفسیر روح المعانی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر اس طرح بیان کی گئی:**

”والذی اختاره الله انما بعث لكل فرد فرد من العالمین ملائکتهم انهم وجنهم ولا فرق بین المؤمن والکافر من الانس والجن فی ذلک“  
مختار مذہب اس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جہان کر ہر فرد کیلئے رحمت بنا کر مبعوث کیا، ملائکہ ہوں یا



انسان ہوں یا جن سب کیلئے آپ رحمت ہیں، بلکہ انسانوں اور جنوں میں مومنوں اور کافروں سب کیلئے آپ رحمت ہیں۔

بلکہ روح المعانی میں آپ کی رحمت کی وسعت کو یوں بیان کیا گیا ”کل خیر فی العالم فمن آثار النبوة وکل شر وقع فی العالم او سيقع فسبب خفاء آثار النبوة ودروسها فالعالم جسد وروحه النبوة ولا قیام للجسد بدون روحه“ جہاں میں جو بھی ہے وہ آثار نبوت کی وجہ سے ہے، اور جہاں میں جو شر بھی واقع ہوا یا واقع ہوگا وہ آثار نبوت کے مخفی ہونے اور مٹ جانے کی وجہ سے، کیونکہ تمام جہان جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے، اسی لئے کہ جسم بغیر روح کے قائم نہیں رہ سکتا۔

**سوال:** نبی کریم ﷺ کافروں کیلئے کیسے رحمت ہیں؟

**جواب:** پہلے کفار کو طرح طرح کے عذاب دیئے گئے، کسی قوم کو بندر بنا دیا گیا، کسی قوم کو خنزیر بنا دیا گیا، کئی قوموں کو تباہ و برباد کر دیا گیا، لیکن نبی کریم ﷺ کی قوم کے کفار عذاب کا مطالبہ بھی کرتے رہے، لیکن آپ کی رحمت سے رب تعالیٰ نے ان کی شکلوں کو تبدیل نہیں کیا اور ان کو تباہ و برباد نہیں کیا۔

﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ إِنَّا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ﴾ (سورة الانفال، آية نمبر ۳۲، ۳۳)  
اور جب بولے کہ اے اللہ اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسائے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لا، اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہوں۔  
(کنز الایمان)

یعنی آپ رحمۃ للعالمین ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہم ان کے مطالبہ کے باوجود ان کو عذاب نہیں دیں گے۔

**علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:**

کہ مجھ سے سوال یہ کیا گیا کہ ربیع الاول میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے سلسلہ میں کئے جانے والے اعمال کا شرع میں کیا حکم ہے؟ اچھا ہے یا برا، اس کے کرنے والے کو ثواب حاصل ہوگا یا نہیں؟ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت کے متعلق ابتدائی واقعات کو بیان کرنا اور آپ کی ولادت پاک پر ظاہر شدہ علامات کو بیان کرنا، پھر کھانے کیلئے دسترخوان بچھانا، یعنی کھانے کی اشیاء تقسیم کرنا اور غیر شرع حرکات کئے بغیر واپس لوٹ جانا اچھا کام ہے۔

”هو من البدع الحسنة التي يشاب عليها صاحبها من تعظيم قدر النبي ﷺ واظهار



الفرح والا ستبشار بمولده الشريف“ (الحاوی للفتاوی جلد اول صفحہ نمبر ۱۸۹)  
یہ تمام جن کا ذکر کیا ہے یہ اچھی بدعات سے ہیں، ان پر عمل کرنے والے کو ثواب حاصل ہوتا ہے، کیونکہ  
اس میں نبی کریم ﷺ کی قدر و منزلت کی تعظیم پائی جاتی ہے، اور آپ پر فرحت و خوشی کا اظہار ہے، فرحت  
و خوشی کا اظہار زیادہ نعمتوں کے حصول کا سبب ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے واقعات پر مشتمل شیخ ابوالخطاب بن وحید نے  
ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ”التنویسی مولد البشیر والنذیر“ رکھا اس پر اس کے وقت کے بادشاہ مظفر ابو  
سعید میلاد النبی ﷺ کی محافل منعقد کرتا اور بہت مٹھائی، مکھن، مرغ اور بکرے کا گوشت اس کے دسترخوان پر ہوتا، جس  
میں تیس ہزار طشت مٹھائیوں کے ہوتے۔

”وكان يحضر عنده في المولد اعيان العلماء والصوفية“ (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۰)  
”اس کی محافل میلاد میں بڑے جلیل القدر علماء کرام اور صوفیاء عظام شریک ہوتے۔“

علماء و مشائخ کا شریک ہونا ہی جواز کی علامت ہے، ناجائز کام اتنے جلیل القدر علماء اور مشائخ کا شریک ہونا  
عقل سے دور ہے۔

یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی کذب بیانی:

ہر سال کسی نہ کسی جگہ سے عید میلاد النبی ﷺ کی مخالفت میں کوئی نہ کوئی اشتہار، کتابچہ چھاپ کر لوگوں کو گمراہ  
کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عام طور پر فتنہ یوں پھیلا یا جاتا ہے ”امام الانبیاء کی ہجرت کے ۶۰۴ سال بعد عیسائیوں  
کی دیکھا دیکھی عراق کے اربل بادشاہ ملک مظفر ابو سعید جو ایک نہایت بے دین، بڑا عیاش، فضول خرچ اور عیاش طبع تھا  
، اس نے اپنے دنیا پرست کذاب مولوی عمر بن حسن بن دحیہ کے ساتھ مل کر عید میلاد النبی ﷺ کی اس رسم کو ایجاد کیا  
(بحوالہ تاریخ ابن خلکان) اور لالچی مولوی نے ایک ہزار دینار لے کر عید میلاد النبی ﷺ کے حق میں فتویٰ دیا، اس طرح  
یہ عید رفتہ رفتہ مسلمانوں کے گھر گھر میں گئی اور سادہ دل لوگوں نے عقیدت احترام اور پیار محبت میں غلو کر کے اس کو  
دین کا حصہ بدعت بنالیا، یہ اس پمفلٹ کی عبارت تھی جو ہر سال میلاد النبی ﷺ کے موقع پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

آئیے دیکھئے یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے:

”جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔“

﴿لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾



”الکذب مقراض الایمان“ ”جھوٹ ایمان کی پیچی ہے۔“

آئیے اس جھوٹ کو علامہ حافظ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ کی کتاب الحاوی للفتاویٰ میں دیکھئے:

”حسن المقصد فی علم المولد صاحب اربل الملک المظفر ابو سعید کو کبریٰ بن زین الدین علی بن بکتکین احد الملوک الامجاد والكبراء الاجواد وکان له آثار حسنة“

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر خوشی کا اظہار کر کے اچھا عمل کرنے والا اربل بادشاہ مظفر ابو سعید کو کبریٰ بن زین الدین علی بن بکتکین تھا جو بزرگ اور بڑے اور نئی بادشاہوں سے تھا، اس کے بہت اچھے اعمال تھے۔ (الحاوی للفتاویٰ ج اول ص ۱۸۹)

اور یہ بھی بہت واضح بات ہے کہ کرکٹ کا شائق کرکٹ گراؤنڈ تعمیر کراتا ہے، کلب کا دلدار کلب تعمیر کراتا ہے، یعنی جس کو کسی کام سے محبت ہو وہی کام کرتا ہے، یقیناً نیک شخص ہی نیک کام کرتا ہے اور مساجد تعمیر کراتا ہے۔

”وهو الذي عمر الجامع الظفري بسفح قاسيون“

بادشاہ مظفر نے قاسیون کے پہلو میں جامع مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع مسجد ظفري رکھا گیا۔

(الحاوی للفتاویٰ حوالہ مذکور)

آئیے ابن جوزی اور ابن تیمیہ کے شاگرد حافظ ابن کثیر کا قول علامہ سیوطی رحمہ اللہ سے ہی سنئے۔

قال ابن کثیر فی تاریخہ کان يعمل المولد الشريف في ربيع الاول ويتحصل به احتفالا هائلا وکان شهما شجاعا بطلا عاقلا عالما عادلا رحمه الله واکرم مشواہ، قال وصف له الشيخ ابو الخطاب بن دحية مخلصا في المولد النبوي سماه التنوير في مولد البشير النذير فاجازه على ذلك بالف دينار وقد طالت مدته في الملک الى ان مات وهو محاصر للفرنج بمدينة عكا سنة ثلاثين وستمائة محمود السيرة والسيرة“ (الحاوی للفتاویٰ ج اول ص ۱۸۹)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، بادشاہ مظفر ربيع الاول میں میلاد النبی ﷺ کی بڑی بڑی محفلیں قائم کرتا تھا جو بہت ذہین تیز فہم، بہادر، بطل حریت، عقلمند، عالم، عادل تھا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور اس کا اچھا ٹھکانا بنائے، حافظ ابن کثیر نے ہی یہ بھی بیان کیا ہے کہ شیخ ابو الخطاب بن دحیہ رحمہ اللہ نے ولادت نبوی میں ایک بڑی مجلد کتاب تحریر کی جس کا نام ”التنوير في مولد البشير النذير“ رکھا۔ جس پر بادشاہ مظفر نے ایک ہزار دینار انعام دیا، وہ بہت دیر بادشاہی کرنے کے بعد فوت ہوئے، یعنی ان کی بادشاہی کی مدت لمبی تھی، اس نیک بادشاہ نے عکا شہر میں انگیزوں کا



محاصرہ جاری رکھا۔ اس کی وفات چھ سو تیس ہجری میں ہوئی، جس کی سیرت بھی اچھی تھی، اور اس کی بادشاہت بھی قابل تعریف تھی۔ خدرا انصاف کیجئے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر کی بات معتبر ہے کہ وہ بادشاہ نیک تھا یا آجکل کے یہودیوں کے آلہ کار لوگوں کی بات معتبر ہے کہ وہ برا تھا اور عیاش تھا، آجکل تو کتابوں سے اور اوراق نکال دینے کو رواج دے دیا گیا کیا ایسے ہتھکنڈوں سے دین اسلام مٹ جائے گا، اے مسلمانوں ہوشیار رہیں ایک قرآن پاک القدس سے چھایا گیا ہے جس میں کئی سورتوں کو نکال دیا گیا ہے، جس قرآن کا محافظ رب تعالیٰ ہو اس کی سورتوں کو نکال کر یہودی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے؟ نہیں نہیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے، اور ان کے آلہ کار بھی شان مصطفیٰ کریم ﷺ کو کم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

تاریخ ابن خلکان کی طرف منسوب کرنا بھی جھوٹ ہے:

ہاں ہو سکتا ہے تاریخ ابن خلکان کی عبارات کو بدل کر اپنا الوسیدھا کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا ورنہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ تاریخ ابن خلکان کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

”قال ابن خلکان فی ترجمة الحافظ ابی الخطاب بن دحیہ کان من اعیان العلماء ومشاهیر الفضلاء قدم من المغرب داخل الشام والعراق واجتاز بابل سنة اربع وستمائة فوجد ملکها المعظم مظفر الدین بن زین الدین یعنی بالمولد النبوی فعمل کتاب التنویر فی مولد البشیر النذیر وقرأ علیه بنفسه فأجازه بالف دینار قال وقد سمعناه علی السلطان مجالس ستة فی سنة خمس وعشرين وست مائة“

(الجاوی للفتاویٰ جلد اول ۱۹۰)

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں حافظ ابوالخطاب بن دحیہ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بڑے عظیم علماء میں سے تھے اور مشہور فضلاء میں سے تھے، وہ مغربی علاقہ سے آئے اور شام و عراق میں داخل ہوئے چھ سو چار ہجری میں ان کا ارمل بادشاہ پر گذر ہوا، تو انہوں نے اس عظیم بادشاہ کو نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر عظیم اہتمام کرتے ہوئے پایا تو عظیم عالم حضرت علامہ حافظ ابوالخطاب نے ایک کتاب میلاد النبی ﷺ کے موضوع پر لکھی جو خود ہی بادشاہ مظفر الدین بن زین الدین کو پڑھ کر سنائی، اس کتاب کا نام رکھا ”التنویر فی مولد البشیر النذیر“ بادشاہ نے اس کتاب پر ایک ہزار دینار انعام دیا، ہم نے چھ سو پچیس ہجری میں بادشاہ کے پاس چھ مجالس میں اس کتاب کو سنا۔

اعتراض: میلاد النبی ﷺ کی محافل اور خوشی و مسرت بدعت ہے، بدعت پر عمل کرنا گمراہی ہے یہ کام تو دین دار



علماء کرام کا نہیں بلکہ جاہل اور باطل راہ پر چلنے والے عوام کا ہے۔

**جواب:** ہر بدعت کو ضلالت و گمراہی سے تعبیر کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، بلکہ بدعت پانچ قسم کی ہے۔

نمبر 1 واجب: جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک سمجھنے کیلئے علم نحو کا پڑھنا۔

نمبر 2 حرام: اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا، بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار سمجھنا وغیرہ۔

نمبر 3 مستحب: دینی مدارس قائم کرنا، مساجد بنانا، سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں تھا۔

نمبر 4 مکروہ: ہر ایسا کام جس سے سنت کی ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کی ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔

نمبر 5 مباح: جیسے صبح کی نماز یا عصر کے بعد مصافحہ کرنا، لیکن بغیر سلام کے، اگر سلام بھی کرے تو مستحب ہوگا،  
(ماخوذ از حاشیہ مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۲۸ باب الاعتصام بالکتاب والسنة بحوالہ مراقاة)

یہی نے مناقب امام شافعی رحمہ اللہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا:

المحدثات من الامور ضربان احدهما ما حدث مما يخالف كتابا او سنة او ائرا  
او اجماعا فهذا البدعة الضلالة والثاني ما حدث من الخير لا خلاف فيه لو احدث من هذا  
محدثه غير مذمومة. (الحاوی للفتاویٰ جلد اول صفحہ نمبر ۱۹۲)

نئے امور یعنی بدعات کی دو قسمیں ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ ایسا نیا کام جو قرآن یا حدیث پاک یا آثار  
صحابہ یا اجماع امت کے مخالف ہو، یہ بدعت گمراہی ہے، یعنی ناجائز ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو، اس کے جائز ہونے میں کسی کو کوئی اختلاف  
نہیں، بلکہ بالاتفاق جائز ہے اور مستحسن ہے، اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہے، اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں۔

عن ابن عباس قال كان اهل الجاهلية يأكلون اشياء ويتركون اشياء تفذرا فبعث الله  
نبيه وانزل كتابه واحل حلاله وحرم حرامه فما احل فهو حلال وما حرم فهو حرام  
وما سكت عنه فهو عفو وتلا قل لا اجد فيما اوحى اى محرما على طاعم يطعمه الا  
ان يكون ميتة الآية. (رواه ابو داود، مشکوٰۃ باب ما يحل اكله وما يحرم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں لوگ بعض چیزوں کو کھاتے تھے، اور بعض چیزوں کو  
ناپسند سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور اپنی کتاب کو نازل



کیا، اور کچھ چیزوں کو حلال کیا اور کچھ چیزوں کو حرام کیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ حلال ہیں، اور جن چیزوں کو رب تعالیٰ نے حرام کیا ہے وہ حرام ہیں، اور جن چیزوں سے رب تعالیٰ نے سکوت اختیار کیا (نہ حلال کیا اور نہ حرام) وہ معاف ہیں، یعنی وہ مباح ہیں نہ حلال ہیں اور نہ حرام ہیں، پھر آپ نے بطور دلیل یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔

”قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مُسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“  
(الانعام، آیت نمبر ۱۴۵)

فرمادو میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی کی گئی کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام ہو، سوائے مردہ جانور کے یا بہنے والے خون، یا خنزیر کے گوشت کے تو بیشک وہ ناپاک ہے یا فسق ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے غیر کا نام لیا گیا ہو، جو شخص مجبور ہو گیا وہ خود خواہش نہ کرے اور نہ حد سے تجاوز کرے تو بیشک تمہارا رب بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ابن ماجہ اور ترمذی کی حدیث جو، مشکوٰۃ میں حضرت سلمان ؓ سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں  
”فَقَالَ الْحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَى عَنْهُ“  
(مشکوٰۃ کتاب الاطعمه)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے وہ معاف ہے۔

نئے کاموں کے ایجاد کیلئے نبی کریم ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا:

قال رسول الله ﷺ من سن في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شيء ومن سن في الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شيء.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرتا ہے، اسے اس کا ثواب ملے گا۔ اور اس کے بعد جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کا ثواب ملے گا، اور ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے، اس کو اس برے طریقہ کے رواج دینے کا گناہ ہوگا، اور جتنے آدمی اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کے مطابق بھی اسے گناہ ہوگا اور ان عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔  
(مشکوٰۃ شریف کتاب العلم)



اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ رائج کرنا منع نہیں بلکہ نیکیوں کا سبب ہے اور برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔ یہ سوال نہایت لغو اور بے حقیقت ہے کہ اسلام کیا اس وقت مکمل نہیں تھا؟ ہاں ہاں اسلام مکمل ہی تھا اسی لئے تو نبی کریم ﷺ نے خود اپنی امت کیلئے ایک ضابطہ و قانون پیش فرمادیا، تاکہ اسی قانون پر عمل کرنے والوں کو کوئی شخص غیر اسلامی شعار پر عمل کرنے کا طعنہ نہ دے سکے، بلکہ ایسا اعتراض علم شریعت سے بے خبری کی علامت ہے۔

میلاد النبی ﷺ پر انعقاد محافل اور ہر جائز خوشی مستحب ہے:

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ان الطلب فی المندوب تارة يكون بالنص وتارة يكون بالقياس وهذا وان لم يرد

فيه نص ففيه القياس على الاصلين“ (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۲)

مستحب بھی نص سے ثابت ہوتا ہے اور کبھی قیاس سے، اس میں اگرچہ نص تو وارد نہیں، لیکن دو اصل یعنی دو علتیں اور وجہ موجود ہیں جن سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔

پہلی وجہ یہ بیان فرمائی:

”ان النبی ﷺ قلم الملینة فوجد اليهود يصومون يوم عاشوراء فسألهم فقالوا هو يوم اغرق الله

فيه فرعون ونجى موسى ﷺ نحن نصومه شكر الله تعالى. (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۲)

بیشک نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا آپ نے ان سے روزہ رکھنے کی وجہ پوچھی انہوں نے کہا یہ وہ دن ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا اور موسیٰ ﷺ کو نجات دی اس لئے ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے روزہ رکھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے ان کے اس قول کو رد نہیں کیا، بلکہ دوسرے مقامات پر ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم بھی روزہ رکھیں یہ ایک روزہ رکھتے ہیں ہم دو روزے رکھیں گے۔

مقرر دن میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا:

مندرجہ بالا بحث ذکر کرنے کے بعد علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”فیستغاد منه فعل الشکر لله

على ما من به في يوم معين من اسداء نعمة او دفع نعمة“ (الحاوی للفتاوی ج اول ص ۱۹۶)



اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں و احسانات کی تکمیل اور مصائب کے مندرجہ کرنے کا معین دن میں شکر یہ ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ معین دن میں ہی روزہ رکھا جاتا تھا جو حصول نعمت اور اندفاع مصائب کا شکر یہ تھا۔ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں۔

”ای نعمة اعظم من النعمة بـروز هذا النبي نبي الرحمة في ذلك اليوم وعلى هذا ينبغي ان يتحرى اليوم بعينه حتى يطابق قصة موسى في يوم عاشوراء“

(الحاوی للفتاویٰ ج اول ص ۱۹۶)

نبی کریم ﷺ جو سراپا رحمت ہیں اس دن میں آپ کی تشریف آوری جو نعمت عظمیٰ ہے، اس نعمت سے بڑھ کر اور کیا عظیم نعمت ہو سکتی ہے، لہذا ضروری ہے کہ اس دن زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے تاکہ یوم عاشوراء میں موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے مطابقت ہو جائے۔

نبی کریم ﷺ نے ہر پیر کے دن اپنا یوم ولادت منایا:

وان كان النبي ﷺ لم يزد فيه على غيره من الشهور شيئا من العبادات وما ذاك الا لرحمته ﷺ بامته ورفقه بهم لانه عليه الصلوة والسلام كان يترك العمل خشية ان يفرض على امته رحمة منه بهم لكن اشار ﷺ الى فضيلة هذا الشهر العظيم بقوله للسائل الذي ساله

عن صوم يوم الاثنين ذاك يوم ولدت فيه“ (الحاوی للفتاویٰ ج اول ص ۱۹۳)

اگرچہ نبی کریم ﷺ نے اس ماہ میں بنسبت اور مہینوں کے زیادہ عبادات نہیں کہیں، صرف اپنی امت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے کیونکہ نبی کریم ﷺ امت پر رحمت فرماتے ہوئے ان پر فرض ہو جانے کے ڈر سے کئی اعمال ترک فرمادیتے تھے، لیکن آپ نے اس ماہ کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا، جب آپ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، یعنی آپ نے پیر کو اپنی پیدائش کا شکر یہ ادا کرنے کیلئے روزہ رکھا اور اس طرح اظہار مسرت کیا۔

آئیے حدیث مسلم کے اصل الفاظ مبارکہ دیکھئے:-

عن ابی قتادة ان رسول الله ﷺ سئل عن صوم الاثنين فقال فيه ولدت وفيه النزل

علی“ (اخرجه مسلم بالا سناد ج ۱ ص ۳۸۸ باب استحباب صیام ثلاثہ ایام من کل مہر الخ۔ مشکوٰۃ باب صیام تطوع)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق سوال کیا گیا آپ نے فرمایا، اس دن میں میری پیدائش ہے، اور اسی دن مجھ پر قرآن نازل کیا گیا، یعنی اس دن ابتداء نزول قرآن ہوا)



جائز کاموں سے اظہار مسرت کرے:

فینبغی ان یقتصر فیہ علی ما یفہم الشکر لله تعالیٰ من التلاوة والاطعام والصدقة  
والشاد الشعر من المدائح النبویة. (الحاوی للفتاویٰ ج اول ص ۱۹۳)  
ضروری ہے کہ صرف ان کاموں پر ہی اکتفاء کرے جن سے اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنا سمجھا  
جاسکے، تلاوت قرآن پاک کرے، طعام کھلائے، صدقہ و خیرات کرے، نبی کریم ﷺ کی مدح و توصیف  
نعت خوانی کی صورت میں کی جائے۔

مباح کام کرنے میں کوئی حرج نہیں:

”فینبغی ان یقال ما کان من ذلک مباحا بحیث یقتضی السرور بذلک الیوم لا بأس  
بالحاقہ“ (الحاوی للفتاویٰ ج اول ص ۱۹۶)  
ضروری ہے کہ یہ بیان کیا جائے کہ جو کام مباح ہیں یعنی ان کاموں کے کرنے میں شرعا ممانعت  
نہیں، لیکن ان کے کرنے سے خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہو، ایسے کام میلاد النبی ﷺ کے دن کرنے میں  
کوئی حرج نہیں،

حرام، مکروہ، خلاف اولی کاموں سے بچنا ضروری ہے:

وما کان حرام او مکروہا فیمنع و کذا ما کان خلاف الاولی (الحاوی للفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۶)  
جو کام حرام، مکروہ، یا خلاف اولی ہوں (یعنی بہتر نہ ہوں) وہ میلاد النبی ﷺ کے دن منع ہیں۔ مثلاً  
ناچ، گانا، ڈھول، باجا، خوشی کے اظہار میں نمازوں کو ضائع کرنا، یہ سب کام میلاد النبی ﷺ کے دن ناجائز ہیں۔

خرابی کو دور کیا جائے، اچھائی کو ختم نہ کیا جائے:

خدا! انصاف کریں کہ اگر نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت کی خوشی میں جلوس نکالا جائے، جس میں نعت  
خوانی ہو اور تلاوت قرآن پاک ہو اور تقاریر ہوں، نمازیں بھی قضاء نہ ہونے دی جائیں اس میں کیا خرابی ہے۔ اگر کوئی  
غیر شرعی حرکت ان نیک محافل یا جلوسوں میں شامل ہو جائے۔ تو صرف اسی کو ختم کرنے پر زور دیا جائے نہ کہ استجابی  
کاموں کو بھی حرام بنانے پر زور دیا جائے، جھوٹے خداؤں کی وجہ سے حقیقی خدا کو چھوڑ دینا، اور جھوٹے نبیوں کی وجہ  
سے حقیقی انبیاء کرام کو نہ ماننا اور ان پر ایمان نہ لانا عقل و دانش کا کام نہیں، بلکہ جہالت و حماقت ہے۔



## دوسری وجہ جس پر میلاد النبی ﷺ کی خوشی کا مستحب ہونا قیاس کیا گیا:

اخرجه البيهقي عن انس ان النبي ﷺ عرق عن نفسه بعد النبوة مع انه قد ورد ان جده عبدالمطلب عرق عنه في سابع ولادته والعقيقة لاتعاد مرة ثانية فيحمل ذلك على ان الذي فعله النبي ﷺ اظهار الشكر على ايجاد الله اياه رحمة للعالمين وتشريع لامته كما كان يصلي على نفسه لذلك فيستحب لنا ايضا اظهار الشكر بمولده بالاجتماع واطعام الطعام ونحو ذلك من وجوه القربات واظهار المسرات.

(الحادی للفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۶)

بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے بعد از اعلان نبوت اپنا عقیقہ خود کیا حالانکہ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے آپ کا عقیقہ آپ کی ولادت کے ساتویں دن کر دیا تھا، عقیقہ ایک مرتبہ ہی ہوتا ہے۔ دوبارہ نہیں ہوتا، نبی کریم ﷺ کے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنایا، اس لئے آپ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور نیز اپنی امت کیلئے مشروع فرمایا جیسا کہ آپ خود اپنی ذات پر درود پاک پڑھتے تھے تاکہ امت کو سنت کا ثواب بھی حاصل ہو جائے، اس وجہ سے اب ہمارے لئے بھی مستحب ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی ولادت کے دن اجتماعات منعقد کر کے اور طعام کھلا کر اور ہر قسم کی نیکی کے کام کر کے اور مسرت کا اظہار کر کے شکریہ ادا کریں۔

## نبی کریم ﷺ کی ولادت پر اللہ تعالیٰ نے قوم کو لڑکے عطاء کئے:

نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے قوم طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا تھی، ان برائیوں میں سے ایک بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا تھا، کئی اعلیٰ خاندان اپنی بیٹیوں کو عار کے پیش نظر زندہ درگور کر دیتے، ایک شخص ان میں ایسا تھا کہ اگر اپنی کسی بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتا تو اسے اون یا بکری کے بالوں کا جبہ (کوٹ) پہنا دیتا اور اپنے ساتھ جنگل میں اونٹ چرانے پر اسے مقرر کر دیتا، تاکہ کوئی شخص اس کو دیکھ نہ سکے اور یہ نہ کہے کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔ اور اگر وہ کسی بیٹی کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے چھ سال تک مہلت دیتا، جب چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں کو کہتا اسے غسل کراؤ، خوشبو لگاؤ، اچھا لباس پہناؤ، مزین کرو، پھر اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے جاتا، اس کیلئے ایک گڑھا کھودتا اور اسے کہتا اس میں دیکھو اس طرح اس کو دھکا دے کر نیچے گڑھے میں گرادیتا اور مٹی اس پر ڈال کر یعنی سطح زمین کے برابر کر کے واپس آ جاتا۔

(روح المعانی ج ۳ ص ۳۰)

جاء قيس بن عاصم التميمي الى رسول الله ﷺ فقال لي وادت ثمان بنات لي في الجاهلية (روح المعانی ج ۳ ص ۳۰)



قیس بن عاصم تسمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے عرض کیا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں اپنی آٹھ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا۔

معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ عورت کا چوپاؤں سے بھی کم مرتبہ تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے عورت کو اسلام میں عزت عطاء فرمائی، بیٹی ہونے کی حیثیت سے، زوجہ ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے جن حقوق کی مالک ہے۔ وہ حقوق نبی کریم ﷺ نے بیان فرما کر عورت کو بلند مقام دیا۔ لیکن افسوس آج مسلمان عورت غیر مسلموں کو دیکھ کر اسلامی شعار کو چھوڑ کر پھر حیوانیت کی طرف جانا پسند کر رہی ہے، بے حیائی اور عریانی، اور مردوں سے آزادانہ میل جول فیشن بن چکا ہے۔ جس معاشرہ سے غیر مسلم جو اس فیشن کے موجد ہیں وہ بیزار ہو چکے ہیں، وہ آج مسلمانوں کو پسند ہے، اللہ تعالیٰ ان بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لائے، آمین۔

عرض کر رہا تھا کہ اہل عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے گویا ان کے گھر بیٹی کے پیدا ہونے پر صف ماتم بچھ جاتی، ان کو خوشی نہ حاصل ہوتی بلکہ غم لاحق ہوتا۔ لیکن جس سال نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی وہ تو ہر طرف خوشی منانے کا سال تھا، اور آپ کی پیدائش پر ہی قوم آپ کی شان کو مکمل طور پر سمجھ لیتی یہ بھی مشکل تھا، نیز آپ رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے آپ کی آمد کے سال بیٹیوں کا پیدا ہونا قوم کیلئے غم کا سبب بنتا اور ان کا زندہ دفن کیا جانا آپ کی شان رحمت کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سال جن لوگوں کو اولاد عطاء کی ان کو بیٹے دئے بیٹیاں نہیں دیں۔

”وكان قد اذن الله تعالى تلك السنة لنساء الدنيا ان يحملن ذكورا كرامة لمحمد ﷺ  
اب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان الوہیت کے مطابق نبی کریم ﷺ کی ولادت پر لوگوں میں بیٹے تقسیم فرمائے، کیونکہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہی کسی چیز کو تقسیم کیا جاتا ہے، انسان کو یہ استطاعت نہیں وہ اپنی استطاعت کے مطابق مٹھائی اور کھانے تقسیم کرتا ہے۔  
(انوار محمدیہ، مواہب لدینیہ)

**نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اسراف نہیں:**

**اعتراض:** میلاد النبی ﷺ کی خوشی میں چراغاں کیا جاتا ہے، جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، ان پر پیسے خرچ ہوتے ہیں جو اسراف ہے اور اسراف شرعاً ناجائز ہے۔

**جواب:** جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ میلاد النبی ﷺ پر جائز طریقہ سے اظہار مسرت مستحب ہے، تو یقیناً مستحب کام پر خرچ ہونے والے پیسے بھی مستحب ہوں گے، ثواب کا ذریعہ ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مسجد نبوی کی دیواریں کچی تھیں، اور کھجور کی شاخوں کا چھت تھا جو بارش میں ٹپکتا تھا، نبی



کریم ﷺ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، بارش کی وجہ سے چھت ٹپکنا شروع ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کرنے کی وجہ سے کچھڑ ظاہر ہو رہا تھا لیکن آج مسجد کی تزیین پر لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں لیکن تمام مکاتب فکر کے علماء یہی کہتے ہیں کہ جس نے جنت میں گھر بنانا ہے وہ مسجد پر پیسے خرچ کرے، کسی نے کبھی نہیں کہا چس، رنگ و روغن، شیشے، شیشہ نگاری، قالین، ہیئر، پٹکھے ضرورت سے زائد چیزیں ہیں، ان پر پیسے خرچ کرنا اسراف ہے، لیکن حقیقت بھی یہی ہے ان کو اسراف کہنا نادانی ہوگی، کیونکہ مساجد کی شان و شوکت اپنے گھروں سے بڑھ کر ہونی چاہئے، جب مکان کچے اور سادہ ہوتے تھے اس وقت مساجد بھی اسی طرح ہوتی تھیں، جیسے مکانات بلند و بالا، پختہ، مزین بننے لگے تو ضروری ہو گیا کہ اسی طرح مساجد کو خوبصورت بنایا جائے تاکہ اپنے مکانات سے خانہ خدا کی حالت کم نظر نہ آئے، اسی طرح خوشی منانے کے ہر زمانہ میں طور و طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اب جبکہ بڑے بڑے مبلغین کو دیکھتے ہیں کہ اپنے بیٹوں کی پیدائش اور ان کی سالگرہ پر اور بیٹوں، بیٹیوں کی شادی پر، حج پر جاتے وقت، اور حج سے واپسی پر، اور کسی عزیز کی بیرون ملک سے واپسی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، چراغاں کرتے ہیں، گلے میں ہار ڈالتے ہیں اور ان کو جائز بھی سمجھتے ہیں، اسراف نہیں کہتے تو نبی کریم ﷺ کی ولادت پر زیادہ سے زیادہ خوشی کیوں نہ منائی جائے۔ کیونکہ یہ خوشی اسی کی کی جاتی ہے جس سے محبت ہوتی ہے، نبی کریم ﷺ تو آپ کے اپنے ہی ارشاد کے مطابق سب سے زیادہ محبت کی جائے، آپ فرماتے ہیں۔

﴿لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾

”کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے والد اور اولاد اور تمام لوگوں سے مجھے زیادہ محبوب نہ سمجھے۔“

اپنی اولاد سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ سے محبت اور اولاد کی پیدائش پر خوشی کرنے سے زیادہ خوشی نبی کریم ﷺ کی ولادت پر کرنا ہی ایمان ہے، ورنہ روح ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے،

وہی کس جو دو انفاق فی سبیل اللہ اسراف نہ گفتہ لا سرف فی الخیر

کسی صاحب علم نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنا اسراف ہے۔ (تحدیث ثامنیہ ص ۳۱۱)

”قیل لا خیر فی سرف ولا سرف فی خیر“ بیان کیا گیا ہے اسراف میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور نیکی میں خرچ کرنا اسراف نہیں۔ (مرقاۃ ج ۸ ص ۲۶۸)

واقم کو اس وقت حوالہ تو یاد نہیں لیکن مسئلہ سو فیصد یاد ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کہا ”لا خیر فی الاسراف“ اسراف میں کوئی نیکی نہیں۔ تو آپ نے فی البدیہہ جواب دیا ”لا اسراف فی



الخير“ نیکی کے کام میں اسراف نہیں۔

**اعتراض:** نبی کریم ﷺ کی ولادت بارہ ربیع الاول کو منائی جاتی ہے۔ حالانکہ علم تقویم کے لحاظ سے آپ کی ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول بنتی ہے، بارہ کو میلاد النبی منانا درست نہیں۔

**پہلا جواب:** جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو جمہور کے قول کو ترجیح دی جاتی ہے۔

”والاکثرون انه ولد عام الفیل وانه بعد الفیل بخمسين يوم وانه فی شهر ربیع الاول

يوم الاثنين لثنتی عشرة خلت منه عند طلوع الفجر“

اکثر حضرت یعنی جمہور کا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عام الفیل (ہاتھی والے سال) میں واقعہ فیل کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے، بیشک آپ ربیع الاول کے مہینہ میں پیر کے دن بارہ ربیع الاول صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال ولد ﷺ يوم الاثنين واستتب يوم الاثنين وخرج

مهاجرا من مكة الى المدينة يوم الاثنين ودخل المدينة يوم الاثنين ورفع الحجر يوم

الاثنين وكذا فتح مكة ونزول سورة المائدة يوم الاثنين“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے۔ آپ نے اعلان نبوت

پیر کے دن کیا، اور مکہ سے مدینہ طیبہ ہجرت پیر کے دن کی، اور مدینہ طیبہ میں آپ پیر کے دن پہنچے، آپ نے

حجر اسود کو چادر میں لے کر قریش کے سرکردہ سرداروں کو چادر پکڑنے کی دعوت دی اور خود حجر اسود کو کعبہ

شریف کی دیوار میں نصب کر کے ان کے نزاع کو ختم کیا وہ بھی پیر کا دن تھا۔ آپ نے مکہ شریف کو فتح کیا

وہ بھی پیر کا دن تھا، اور آپ پر سورۃ مائدہ بھی پیر کے دن نازل ہوئی۔

**دوسرا جواب:** علم تقویم کی وجہ سے حساب درست نہیں ہو رہا اس کی وجہ کیا ہے علامہ رازی رحمہ اللہ

نے اور قرطبی رحمہ اللہ نے ﴿إِنَّ عِلَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ (الآیۃ) (سورۃ توبہ، آیہ نمبر ۳۶، ۳۷) کے

تحت لکھا وہ ضیاء القرآن کے الفاظ میں دیکھئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے سال کے یہ چار مہینے (رجب، ذیقعد، ذی الحجہ، محرم) حرمت اور عزت

والے شمار ہوتے تھے، اور ان میں لڑائی کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی تھی، نیز فریضہ حج کی ادائیگی کیلئے ماہ ذی الحجہ کی

تاریخیں مقرر تھیں، کچھ عرصہ بعد اہل عرب پر اس حکم کی پابندی گراں گذرنے لگی ان کا پیشہ قزاقی، رہنری اور مار دھاڑ

بن کر رہ گیا تھا، تین ماہ تک متواتر (ذی قعد، ذی الحجہ، محرم) ماہ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا ان کیلئے ناقابل برداشت تھا اس

لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان مہینوں میں سے جس کو چاہا حلال کر لیا اور اس میں جی بھر کر قتل و غارت کی اور



اس کی جگہ سال کے کسی دوسرے مہینہ کو حرام کر دیا۔ حرمت والے مہینوں کی تعداد بھی چار رہی اور ان کا کام بھی بن گیا، نیز حج علاوہ ایک عبادت کے ان کیلئے ایک بہت بڑا تجارتی میلہ بھی تھا، دور و دراز سے تجارتی قافلے آتے جس سے انہیں بہت نفع ہوتا لیکن حج کا فریضہ کیونکہ قمری سال کے ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کیا جاتا تھا، اس لئے یہ ایسے موسم میں بھی آ جاتا، جبکہ سخت سردی یا گرمی ہوتی اور موسم اس نا سازگاری کی وجہ سے ان کا کاروبار ماند پڑ جاتا، اور انہیں دل خواہ نفع نہ ہوتا، اس مشکل کا حل انہوں نے یہ تجویز کیا کہ حج ہمیشہ معتدل موسم میں ادا کیا جائے، اس کیلئے انہوں نے حج کی مقررہ تاریخوں کو بدل دیا اور قمری سال کے بارہ مہینوں میں کیسہ کا ایک مہینہ برہا دیا۔ اس طرح تینتیس سال کے بعد صرف ایک بار حج اپنی صحیح تاریخوں ۹، ۱۰، ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا۔ ان دونوں صورتوں میں چونکہ صرف اپنی ذاتی سہولتوں اور مالی منفعتوں کیلئے، وہ اللہ تعالیٰ کے اٹل اور محکم احکام رد و بدل کر لیا کرتے تھے، اس ان کے اس فعل کو ”زیادۃ فی الکفر“ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

۱۰ھ میں جب رحمت عالمیان ﷺ حجۃ الوداع کیلئے مکہ تشریف لے گئے تو اس سال ان کے دستور کے مطابق بھی حج ۹۔ ۱۰۔ ذی الحجہ کو ادا ہونا قرار پایا تھا، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا ”ان الزمان قد استدار کھینہ یوم خلق السماوات والارض“ (بخاری کتاب التفسیر ج ۲) یعنی اس سال بھی حج انہی تاریخوں میں ادا کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی میں اس کیلئے مقرر فرمائی تھیں، اس میں مسلمانوں کیلئے درس عبرت ہے کہ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں اور دوسرے وجوہ کیلئے احکام الہی رد و بدل نہ کریں۔ (ضیاء القرآن ج ۲ ص ۲۰۳)

### خلاصہ جواب:

نبی کریم ﷺ نے جب حجۃ الوداع فرمایا اس وقت قدرتی طور پر صحیح تاریخ ۹ ذی الحجہ جمعہ کے دن مقام عرفات پر کھڑے ہونے کا دن تھا، اسی طرح جب آپ پیدا ہوئے قدرتی طور پر صحیح تاریخ ۱۲ ربیع الاول تھی۔ درمیان میں کوئی مستقل کیلنڈر نہیں تھا، ہر سال ایک مہینہ بڑھایا جاتا جس کا نام کبسیہ رکھا جاتا۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے دور میں یہ موجودہ کیلنڈر نہیں تھا، بلکہ بعض لوگ حساب ولادت نبوی کے سال سے کرتے، اور بعض لوگ آپ کی بعثت کے سال (یعنی آپ کے اعلان نبوت کے سال) سے کرتے، اور بعض لوگ عام قیل سے حساب کرتے، اور بعض ہجرت کے سال سے حساب کرتے۔ یہ موجودہ کیلنڈر حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں جاری کیا گیا۔ اس لئے علم تقویم سے حساب درست نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن پھر بھی راقم کا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی ۹ ربیع الاول آپ کی



پیدائش کا دن مان کر خوشی کا اظہار کرے تو مجھے اس سے بھی اتفاق ہوگا، اگر کسی کو ۹ ربیع الاول بھی اور ۲ ربیع الاول بھی غم ہی لاحق ہو تو وہ شیطان کا ساتھی ہے۔ علامہ ابوالقاسم سہیلی لکھتے ہیں۔

”ان ابلیس لعنہ اللہ دن اربع رنات انة حين لعن انه حين احبط ورنه حين ولد رسول

اللہ ﷺ ورنه حين انزلت فاتحة الكتاب قال والرنين والنحاء من عمل الشيطان“

ابلیس ملعون زندگی میں چار مرتبہ چیخ مار کر رویا، پہلی مرتبہ جب اس کو ملعون قرار دیا گیا، دوسری مرتبہ جب

اسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیلا گیا، تیسری مرتبہ سے جب سرکارِ دو عالم کی ولادت باسعادت

ہوئی، چوتھی مرتبہ جب سورۃ فاتحہ نازل ہوئی۔ (روضی الانف جلد اول ص ۱۸۱)

علامہ ابن کثیر نے بھی علامہ سہیلی کی اس عبارت کو ”السيرة النبويه ص ۲۱۲ ج ۱“ میں جوں کا توں

نقل کیا، اور ابن سید الناس نے ”عیون الاثر“ ص ۲۷ ج ۱ میں بھی اس روایت کو بعینہ درج کیا ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۵۶)

علم کے بحر بیکراں مفکر اسلام، مفسر قرآن کی تحقیق:

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ ضیاء النبی میں یوں رقمطراز ہیں:

”اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ محسن انسانیت ﷺ کو یوم میلاد دو شنبہ کا دن تھا، اس پر بھی علماء امت کا تقریباً

اتفاق ہے کہ ربیع الاول کا بابرکت مہینہ تھا، ماہ رمضان اور ماہ محرم کے اقوال کو اہل تحقیق نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا، البتہ

ماہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی جب مہتاب رشد و ہدایت نے جلوہ بار ہو کر ظلمت کدہ عالم کو منور فرمایا اس بارے میں

علماء کرام کے متعدد اقوال ہیں، ہم یہاں علماء محققین کی آراء ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جن کے مطالعہ سے

وہ بآسانی صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں گے۔

(۱) امام ابن جریر طبری جو فقید المثل مفسر، بالغ نظر مؤرخ بھی ہیں، وہ اس بارے میں لکھتے ہیں،

”ولد رسول اللہ ﷺ يوم الاثنين عام الفيل لاثنتي عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الاول“

رسول کریم ﷺ کی ولادت سوموار کے دن ربیع الاول شریف کی بارہویں تاریخ کو عام الفیل میں ہوئی

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۵)

(۲) علامہ ابن خلدون جو علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں امام تسلیم کئے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی

ہیں وہ لکھتے ہیں۔ ”ولد رسول اللہ ﷺ عام الفيل لاثنتي عشرة ليلة خلت من ربيع

الاول لاربعين سنة من ملك كسرى انوشیروان“

رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل کو ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی، انوشیروان کی حکمرانی



(تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۱۰)

کا چالیسواں سال تھا۔

(۳) مشہور سیرت نگار علامہ ابن ہشام متوفی ۲۱۳ھ عالم اسلام کے سب سے پہلے سیرت نگار امام محمد بن اسحاق سے اپنی السیرۃ النبویۃ میں رقمطراز ہیں۔

”ولد رسول اللہ ﷺ یوم الاثنين عشرة ليلة خلت من شهر ربيع الاول عام الفيل“  
رسول کریم ﷺ سوموار بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام)

(۴) علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوروی جو علم سیاست اسلامیہ کے ماہرین میں سے ہیں اور جن کی کتاب ”الاحکام السلطانیۃ“ آج بھی علم سیاست کے طلبہ کیلئے بہترین ماخذ ہے، اپنی کتاب اعلام النبویۃ میں ارشاد فرماتے ہیں، واقعہ اصحاب فیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز سوموار بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ (اعلام النبویۃ ص ۱۹۲)

علوم قرآن و سنت اور فن تاریخ کے یہ وہ جلیل القدر علماء ہیں جنہوں نے بارہ ربیع الاول کو یوم میلاد مصطفیٰ علیہ اطیب السخیۃ والثناء تحریر کیا ہے اور دیگر اقوال کا ذکر تک نہیں کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک صحیح اور معتد علیہ قول یہی ہے اور حاضر کے سیرت نگار محمد الصادق ابراہیم عرجون جو جامعہ ازہر مصر کے کلیۃ اصول الدین کے عمید رہے ہیں اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

وقد صرح عن طرق كثيرة ان محمد ﷺ ولد يوم الاثنين الاثني عشرة مضت من شهر ربيع الاول عام الفيل في زمن كسرى انوشيروان ويقول اصحاب التوفيقات التاريخية ان ذلك يوافق اليوم المكمل للعشرين عن شهر اغسطس ۵۷۰ بعد ميلاد المسيح ﷺ

کثیر تعداد ذرائع سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ بروز دو شنبہ بارہ ربیع الاول عام الفیل کسریٰ نوشیروان کے عہد حکومت میں تولد ہوئے، اور ان علماء کے نزدیک جو مختلف سمتوں کی آپس میں تطبیق کرتے ہیں انہوں نے عیسوی تاریخ میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء بیان کی ہے۔ (محمد رسول اللہ ج ۱ ص ۱۰۲)

ان کے علاوہ علامہ محمد رضا جو قاهرہ یونیورسٹی کی لائبریری کے امین تھے انہوں نے اپنی کتاب محمد رسول اللہ میں لکھا ہے۔

ولد النبي ﷺ في فجر يوم الاثنين لاثني عشرة ليلة مضت من ربيع الاول عشرين اغسطس ۵۷۰ واهل مكة يزورون موضع مولده في هذا الوقت

حضور نبی کریم ﷺ سوموار کے دن فجر کے وقت ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو بمطابق ۲۰ اگست ۵۷۰ء پیدا ہوئے، اہل مکہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے مقام ولادت کی زیارت کیلئے اسی تاریخ کو جایا کرتے ہیں۔

(محمد رسول اللہ ج ۲ ص ۱۹)



اب ہم چند دوسرے حوالے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ علامہ ابن جوزی میلاد مصطفیٰ علیہ  
اطیب التحیۃ والثناء کی تاریخ کے بارے میں اپنی تحقیق یوں قلمبند فرماتے ہیں۔

❖ ولد ﷺ یوم الاثنين لعشر خلون من ربيع الاول عام الفيل وقيل لليلتين خلتا منه قال  
ابن اسحاق ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنين عام الفيل لاثنتی عشرة ليلة مضت من  
شهر ربيع الاول

حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت بروز سوموار دس ربیع الاول کو عام الفیل میں ہوئی، یہ بھی کہا گیا  
ہے کہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ تھی اور امام ابن اسحاق فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ  
روز دو شنبہ بارہ ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی۔ (الوقایا ابن جوزی ص ۹۰)

امام الحافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن یحییٰ بن سید الناس الشافعی الاندلسی اپنی سیرت کی  
کتاب ”عیون الاثر“ میں تحریر فرماتے ہیں

❖ ”ولد سيدنا ونبينا محمد رسول الله ﷺ یوم الاثنين لاثنتی عشرة ليلة مضت من  
شهر ربيع الاول عام الفيل قيل بعد الفيل بخمسين يوما“

ہمارے آقا اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ سوموار کے روز بارہ ربیع الاول شریف کو عام الفیل میں پیدا  
ہوئے، بعض نے کہا ہے کہ واقعہ فیل کے پچاس روز بعد حضور کی ولادت ہوئی۔ (عیون الاثر جلد اول ص ۲۶)

اس کے بعد انہوں نے ربیع الاول کی دو اور آٹھ تاریخ کے قول نقل کئے ہیں، ابن ابی شیبہ نے اپنی تصنیف  
میں یہی تاریخ روایت کی ہے۔

❖ ”رواه ابن ابی شیبہ فی مصنفہ عن عفان عن سعید بن میناء عن جابر وابن عباس  
انہما قالوا ولد رسول الله ﷺ عام الفيل یوم الاثنين الثانی عشر من شهر ربيع الاول وفيه  
بعث فيه عرج به الى السماء وفيه هاجر وفيه مات وهذا هو المشهور عند الجمهور“

حضرت جابر اور ابن عباس دونوں سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ عام الفیل روز دو شنبہ  
بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے، اور اسی روز حضور کی بعثت ہوئی، اسی روز معراج ہوا، اور اسی روز ہجرت کی  
، اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک یہی تاریخ بارہ ربیع الاول مشہور ہے (درالدعائم بالصواب)

(سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹)

اس حدیث کے پہلے راوی ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں، ان کے بارے میں ابو زرعد رازی متوفی ۲۶۳ھ کہتے ہیں  
کہ میں نے ابو بکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا، محدث ابن حبان فرماتے ہیں ابو بکر عظیم حافظ حدیث



تھے، دوسرے راوی عفان ہیں ان کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ عفان ایک بلند پایہ امام ثقہ صاحب ضبط و اتقان ہیں، تیسرے راوی سعید بن میناء ہیں، ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا ہے، یہ صحیح الاسناد روایت و جلیل القدر صحابہ حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ مرفوع روایت کی موجودگی میں کسی مؤرخ یا ماہر فلکیات کا یہ کہنا کہ بارہ ربیع الاول تاریخ ولادت نہیں، ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ مولنا سید عبد القدوس ہاشمی عالم دین ہونے کے علاوہ فن تقویم میں بھی ید طولی رکھتے تھے، انہوں نے اس فن پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام تقویم تاریخی ہے، ان کے نزدیک بھی صحیح تاریخ ولادت بارہ ربیع الاول ہے، اہل حدیث کے مشہور عالم نواب سید محمد صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ ولادت شریف مکہ مکرمہ میں وقت طلوع فجر روز دوشنبہ شب دوازہم ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی جمہور علماء کا یہی قول ہے، ابن جوزی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ (اشمامۃ العہد یہ حوار خیر البریہ ص ۷)

علماء دیوبند کے مفتی اعظم مفتی محمد شفیع سیرت خاتم الانبیاء میں رقمطراز ہیں۔ الغرض جس سال اصحاب فیل کا حملہ ہوا اس کے ماہ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کے انقلاب کی اصل غرض آدم و اولاد آدم کا فخر، کشتی نوح کی حفاظت کا راز، ابراہیم کی دعاء موسیٰ و عیسیٰ کی پیش گوئیوں کا مصداق یعنی ہمارے آقائے نامدار محمد رسول اللہ ﷺ رونق افزائے عالم ہوتے ہیں۔ (سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۸ بحوالہ ضیاء النبی ج ۲، بحذف ص ۲۸۴۲۳)

دوسیرت نگاروں کی غلط فہمی کی وجہ سے سکولی طبقہ غلط فہمی کا شکار ہوا:

برصغیر پاک و ہند کے بعض سیرت نگاروں نے محمود پاشا فلکی کے حوالے سے لکھا کہ بارہ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں تھا، بلکہ پیر کا دن نور ربیع الاول کو بنتا ہے لہذا نو تاریخ صحیح ہے، لیکن دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ ان لوگوں کو محمود پاشا کے اصلی وطن کا بھی حتمی علم نہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلیمان منصور پوری نے محمود پاشا کو مصر کا باشندہ لکھا ہے ان دوسیرت نگاروں پر ہی زیادہ سکولی طبقہ ان کی سیرتوں پر انحصار کئے ہوئے ہیں حالانکہ یہ خود جا بجا ٹھوکریں کھاتے رہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب انہیں مکی لکھتے ہیں، مولنا حفظ الرحمن سیوہاروی نے قسطنطنیہ کا مشہور ہیت دان اور منجم بتایا ہے۔ مجھے بڑی کوشش کے باوجود محمود پاشا فلکی کی کتاب یا رسالہ نہیں مل سکا، البتہ معلوم ہوا کہ پاشا فلکی کا اصل مقالہ فرانسیسی زبان میں تھا، جس کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے نتائج الافہام کے نام سے عربی میں کیا اس کو مولوی سید محی الدین خان جج ہائی کورٹ حیدرآباد نے اردو کا جامہ پہنایا، اور ۱۸۹۸ء میں نولکشور پریس نے شائع کیا لیکن اب یہ ترجمہ نہیں ملتا۔ محمود پاشا فلکی نے اگر علم فلکیات کی مدد سے کچھ تحقیقات کی بھی ہیں، صحابہ کرام، تابعین اور



دیگر قدماء کی روایات کو جھٹلانے کیلئے ان پر انحصار کرنا کسی طرح مناسب نہیں، کیونکہ سائنسی علوم کی طرح فلکیات کی کوئی بات قطعی نہیں ہوتی۔  
(ضیاء النبی ج ۲ ص ۳۸، ۳۹)

**مقام توجہ:** اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ سن ہجری کا استعمال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں شروع ہوا اور پہلی مرتبہ یوم النہیس (جمعرات کے دن) ۲۰ جمادی الاول ۱۷ھ جولائی ۲۳۸ء کو مملکت اسلام میں اس کا نفاذ ہوا، اس کے بعد کا تاریخی ریکارڈ ملتا ہے، لیکن اس سے پہلے کا تقویمی ریکارڈ دستیاب نہیں، اور بعثت نبوی سے قبل عرب میں کوئی باقاعدہ کیلنڈر رائج نہیں تھا، عرب اپنی مرضی سے مہینوں میں رد و بدل کر لیا کرتے تھے (راقم نے ضیاء القرآن کے حوالہ سے پہلے ہی ذکر کر دیا ہے)  
(ضیاء النبی ج ۲ ص ۳۹)

محمود پاشا سے قبل بھی کچھ لوگوں نے نجوم کے حسابات سے یوم دلاوت معلوم کرنے کی کوشش کی، علامہ قسطلانی لکھتے ہیں، اہل زیتج کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی علوم نجوم اور ریاضی کے ذریعہ حساب لگا کر تاریخ نکالے گا مختلف ہوگی، پس ہمیں قدیم سیرت نگاروں، محدثین، مفسرین، تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بات ماننا پڑے گی۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہو گیا:

کہ حضور پاک صاحب لولاک محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء ۱۲ ربیع الاول عام الفیل پیر کے دن صبح کے وقت اس جہان ہست و بود میں اپنے وجود غصری کے ساتھ تشریف لائے۔  
(ضیاء النبی ج ۲ ص ۳۹)

مزید بحث ضیاء النبی میں دیکھیں، اور مدارج النبوة میں دیکھیں، راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں کچھ احوال ذکر کئے۔ یہاں مختصر بحث کی جا رہی ہے۔

میلاد النبی ﷺ کو عید کہنے کی وجہ:

عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں یہ تیسری عید کہاں سے آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ عیدیں صرف دو ہیں یہ احادیث اور کتب فقہ کی کی توجہ نہ کرنے وجہ سے وہ لوگ غلطی کا شکار ہوئے کاش کہ وہ کتب کا مطالعہ کریں، یوں ہی تخریب کاری ان کا وطیرہ ہے۔ درمختار باب العیدین میں عید کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔



”سہی بہ لان اللہ فیہ عوائد الاحسان ولعودہ بالسرور غالباً او تفاؤلاً ویستعمل فی کل یوم فیہ مسرة ولذا قبل عید وعید وعید صرن مجتمعة وبجہ الحبيب و یوم العید والجمعة“  
 عید کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے احسانات لوٹ کر آتے ہیں اور ان کے آنے سے سرور بھی غالباً لوٹ آتا ہے۔ یا نیک شگون کی وجہ سے عید کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کرے خوشی لوٹ آئے، کیونکہ عید کا معنی ہی ”لوٹنا“ ہے، ہر مسرت کے موقع پر لفظ عید کا استعمال کیا جاسکتا ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا: آج تو تین عیدیں جمع ہو گئیں حبیب کے چہرہ کا دیدار، اور عید کا دن اور جمعہ۔

جب ہر مسرت کے دن کو عید کہا جاسکتا ہے تو نبی کریم ﷺ کی ولادت کے دن سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کونسا ہو سکتا ہے؟ جب اس سے زیادہ قدر و منزلت والا اور کوئی دن نہیں تو اس دن سے بڑھ کر کسی دن میں مسرت بھی زیادہ نہیں ہو سکتی تو اس طرح اس دن کے عید ہونے سے، اور کوئی بڑی عید بھی نہیں ہو سکتی، البتہ نبی کریم ﷺ کی ولادت پر فرحت اور سرور حاصل ہو تو عید کہا جاسکتا ہے، نہ ہو تو عید کہنا بھی مشکل ہی نظر آتا ہے، اصل اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

جسے چاہا درپہ بلالیا جسے چاہا اپنا بنا لیا۔  
 یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

عن ابن عباس انه قرأ ”اليوم اكملت لكم دينكم“ الآية وعنده يهودی فقال لو نزلت هذه الآية علينا لاتخذناها عيداً فقال ابن عباس فانها نزلت فی یوم عیدین فی یوم جمعة و یوم عرفة“  
 (رواه الترمذی، مشکوٰۃ باب الجمعة)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بیشک یہ آیت ہم پر بھی اس دن نازل ہوئی جس دن دو عیدیں تھیں۔ ایک جمعہ کا دن اور ایک ذی الحج کی نو تاریخ تھی۔ یعنی ہم ہر ذوالحج کی نو تاریخ کو عید مانتے ہیں۔ اور یہ آیت بھی حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ کو نازل ہوئی، اور وہ دن جمعہ کا دن تھا جبکہ ہم پر جمعہ کے دن کو بھی عید مانتے ہیں۔

بخاری ج ۲ کتاب التفسیر میں یہی حدیث طارق بن شہاب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہی بات کہی اور آپ نے وہی جواب دیا جو حضرت ابن عباس رحمہ اللہ نے جواب دیا۔ واضح ہوا کہ ہر مسرت کا دن عید کا دن ہے، حبیب کے چہرہ کی زیارت کا دن، جمعہ کا دن، عرفہ کا دن، عید الفطر کا دن عید الاضحیٰ کا دن سب عید کے دن ہیں، اس لئے ولادة النبی ﷺ کا دن مسرت کا دن ہے، لہذا ایمان والوں کیلئے عید کا دن ہے۔  
**اعتراض:** جب ایک ہی دن ولادت اور وفات کا ہے تو خوشی منائی جاتی ہے، غم نہیں کیا جاتا، اس کی کیا وجہ



ہے؟ ویسے یہ اعتراض میں نے سنجیدہ الفاظ میں نقل کیا ہے ورنہ جہلاء عام لوگوں کو ان الفاظ سے ورغلا تے ہیں آپ نے کبھی یہ بھی سنا کہ ایک گھر سے میت کا جنازہ نکل رہا ہو اور لوگ خوشیاں منا رہے ہوں۔

**پہلا جواب:** تحقیق کی رو سے آپ کا وصال ۱۲ ربیع الاول کو نہیں بنتا۔ اس لئے کہ اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کیا اس وقت حقیقی طور پر ذی الحجہ کی ۹ تاریخ جمعہ کو تھی۔ اور اس مسئلہ میں بھی اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کا حجۃ الوداع کے بعد آنے والے ربیع الاول میں وصال ہوا، اور یہ بات بھی اتفاقی ہے کہ آپ کا وصال سوموار کو ہوا۔

آئیے! اب آپ حساب کریں کہ حجۃ الوداع کی آٹھ تاریخ جمعرات تھی، اور انیس تاریخ بھی جمعرات تھی، اگر چاند انیس کا تھا تو محرم کی پہلی تاریخ جمعہ تھا اور انیس تاریخ بھی جمعہ تھا، اگر مہینہ انیس دنوں کا تھا تو صفر کی پہلی تاریخ ہفتہ کا دن تھا اور انیس تاریخ بھی ہفتہ کا دن تھا۔ اس لحاظ پر ربیع الاول کی پہلی تاریخ اتوار کا دن تھا۔ لیکن تین چاند لگا تا انیس کے نہیں ہوتے، اگر ان میں سے ایک مہینہ آپ تیس گنا نہیں تو ربیع الاول کی پہلی تاریخ پیر کو ہوگی، اس طرح بارہ ربیع الاول جمعہ کے دن بنتی ہے۔ اگر آپ تین چاندوں میں سے دو چاند تیس کے بناتے ہیں تو ربیع الاول کی پہلی تاریخ منگل کو ہوگی، اس صورت میں ہفتہ کے دن بارہ ربیع الاول بنتی ہے۔ اگر تینوں چاند انیس کے ہی مانیں تو بارہ ربیع الاول جمعرات کو ہوگی۔ لیکن چشتیائے کرام بزرگان دین تینوں چاند انیس کے لئے کر دو ربیع الاول پیر کا دن آپ کا یوم وصال مانتے ہیں۔

گوڑہ شریف میں سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ دو ربیع الاول کو ہی آپ کا یوم وصال مناتے رہے، جس پر آج تک عمل جاری ساری ہے۔

**دوسرا جواب:** اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ کی پیدائش اور وصال کا دن ایک ہی ہے تو خوشی منانے اور غم نہ کرنے کی وجہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

والشريعة حثت على اظهار شكر النعم والصبر والسكون والكتم عند المصائب وقد امر الشرع بالعقبة عند الولادة وهي اظهار شكر وفرح بالمولود ولم يأمر عند الموت بلذبح ولا بغيره بل نهى عن النياحة واظهار الجزع فدللت قواعد الشريعة على انه يحسن في هذا الشهر اظهار الفرح بولادته ﷺ دون اظهار الحزن فيه بوفاته“

(الجاوی للفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۳)

شریعت نے نعمتوں کے شکر یہ کو ظاہر کرنے پر برا بیختہ کیا ہے، اور مصائب و آلام کے چھپانے اور ان پر



صبر و سکون کا حکم دیا ہے اور بچے کی ولادت پر خوشی منانے اور شکر کو ظاہر کرنے کیلئے شریعت نے عقیقہ کرنے کا حکم دیا ہے حالانکہ موت کے وقت ذبح وغیرہ کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا، بلکہ نوحہ کرنے اور جزع کرنے سے منع کیا گیا ہے، یہ قوانین شریعت اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت پر خوشی کا اظہار کرنا مستحسن طریقہ ہے لیکن آپ کی وفات پر غم کا اظہار اچھا نہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اولم ولو بشاة“ ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری (ذبح کرنے) سے ہو، اس سے بھی پتہ چلا کہ نعمت کے حصول پر شکر یہ ادا کرنا شرعاً اچھا طریقہ ہے۔

**تیسرا جواب:** وفات پر غم نہ کرنے کی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو قبر شریف میں دنیاوی زندگی سے بھی اعلیٰ زندگی حاصل ہے جب آپ زندہ ہیں تو غم کا کیا مقصد۔ انبیاء کرام کی مکمل زندگی کی بحث ”نجوم الفرقان جلد چہارم“ میں دیکھئے، یہاں صرف معترضین کے عالم اعزاز علی دیوبندی صاحب کی حاشیہ نور الایضاح کی عبارت دوبارہ تحریر کر رہا ہوں تاکہ مسئلہ سمجھنا آسان ہو۔

❁ ”مثله بعد وفاته کمثل شمع فی حجرة اغلق بابها فهو مستور عن هو خارج الحجره ولكن نوره کما کان بل ازید وهذا حرم نکاح ازواجه بعده ﷺ لم یجرح احکام المیراث فیما ترکہ لانهما من احکام الموت“

نبی کریم ﷺ کی مثال دنیا سے رخصت ہو جانے سے بعد اس طرح ہے جس طرح ایک شمع کو باہر سے کمرہ میں لے جائیں اور اس کا دروازہ بند کر دیا جائے اگرچہ وہ شمع کمرے سے باہر والوں سے چھپ گئی لیکن اس کی روشنی اسی طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ کیونکہ باہر روشنی کم تھی اندر جا کر زیادہ ہو گئی (اسی طرح نبی کریم ﷺ کو قبر شریف میں اگرچہ باہر والے لوگوں سے مستور ہیں لیکن آپ کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ ارفع و بلند ہے) اسی وجہ سے آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے، اور آپ کے ترکہ پر وراثت کے احکام جاری نہیں ہوئے، کیونکہ یہ دونوں کام مردوں سے تعلق رکھتے ہیں آپ تو زندہ ہیں۔

**اہل سنت و جماعت سے دردمندانہ اپیل:**

میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں نمازوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ ناچ، گانا، ڈھول، باجے بھنگڑا وغیرہ نہ پایا جائے۔ مساجد کے قریب سے گزرتے ہوئے نمازوں کے اوقات میں لاوڈ سپیکرز کا آواز پست رکھا جائے۔ نعت خوانی، ذکر، تقاریر، پر مشتمل جلوس، حدود سے تجاوز کر کے اغیار کو اعتراضات کا موقع نہ دیا جائے۔ تمام رات محافل نعت



منعقد کر کے صبح نماز کو قضاء کرنا حماقت ہے، عقل و دانش کا کام نہیں۔ محفل نعت کا انعقاد اتنی دیر ہو کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کی جائے۔ محفل نعت میں پیسے دینے والوں کے صرف نام شامل کر کے قرعہ اندازی کر کے کسی ایک کو عمرہ کا ٹکٹ دینا خالص جو بازی ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، ہاں سب شرکاء محفل کے نام شامل کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے کسی کو عمرہ کیلئے بھیجنا جائز ہے۔

لمحات فکر:

کبھی آپ نے یہ بھی سوچا آپ کے اغیار اپنا تمام پیسہ دینی مدارس پر خرچ کر رہے ہیں، آپ ایک رات کی محفل نعت پر لاکھوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں، آپ کی توجہ دینی مدارس کی طرف جب تک نہیں ہوگی آپ کے اغیار آپ سے بازی لے جاتے رہیں گے۔ پیسے مقرر کر کے نعت خوانوں اور مقررین کا محفل میں جانا بہت برا طریقہ ہے، ایسے پیشہ ور دین کے ڈاکوؤں سے بچ کر رہیں، صحیح علماء سے تقاریر کرائیں، نعت خوانوں کو بلائیں، فن کاروں اور مداریوں کو نہ بلائیں۔





أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ

(آیہ نمبر ۱۶۵)

اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(۱) کیا جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچے کہ اس سے دونی تم پہنچا چکے ہو تو کہنے لگو کہ یہ کہاں سے آئی، تم

فرمادو کہ وہ تمہاری ہی طرف سے آئی بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ (کنز الایمان)

(۲) کیا جب پہنچی تمہیں کوئی مصیبت، تحقیق پہنچا چکے ہو تم اس کی دو مثل، تم نے کہا، کہاں سے آئی

ہے یہ؟ آپ فرمادیں وہ تمہارے اپنے نفسوں کی طرف سے ہی آئی ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر

قادر ہے۔ (نجوم الفرقان)

مقام توجہ:

اس آیہ کریمہ میں مودودی صاحب نے ”قل“ کا ترجمہ کیا ”اے نبی ان سے کہو“ یعنی ”قل“ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، اس ترجمہ پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہم تو حق بات کو حق کہنے کے عادی ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہاں بہت اچھا ترجمہ ”قل“ کا کیا گیا ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ اس ترجمہ پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا، لیکن اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ جب ”قل“ اے محبوب آپ فرمادیں ”تو معترضین تیغ پا ہو جاتے ہیں کہ یہ ترجمہ مولوی بریلوی کا خود ساختہ ہے، کتنی بیہودگی، کتنی دیوانگی۔

شان نزول:

جب احد میں صحابہ کرام کو کچھ تکالیف اٹھانی پڑیں تو وہ تعجب سے ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے کہ ہم اسلام کے خدمت گزار ہیں جو دین حق ہے اور ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی ہیں، جبکہ ہمارے مقابل لوگ اللہ تعالیٰ سے شریک ٹھہرانے والے دین کے مددگار ہیں تو ان لوگوں کی طرف سے ہمیں کیسے تکالیف پہنچائی گئیں، جبکہ ہمارے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا وعدہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری امداد فرمائے گا۔ تو اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ تم نے ان کو



دو گنی شکست دی ہے بدر میں تم نے کافروں کے سر کردہ ستم لوگ قتل کردئے تھے اور ستم قیدی بنائے تھے، پھر احد میں بھی ابتدائی طور پر کامیابی تم کو ہی حاصل رہی، بعد میں تم اپنی غلطی کی وجہ سے ہی تکالیف میں آ گئے۔

”فلما هزمتموهم مرتين فأى استبعاد فى ان يهزمواكم مرة واحدة“

جب تم نے کافروں کو دو مرتبہ شکست دی تو کون سی بات ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے تمہیں نیچا کر دیا۔

(ماخوذ از کبیر جلد ۹ صفحہ نمبر ۸۱)

## زجاج کی غلطی علامہ واحدی کی گرفت:

زجاج نے کہا کہ مسلمانوں نے کافروں کو بدر میں شکست دی، پھر احد میں بھی ایک مرتبہ شکست دی

”ثم لما عصوا هزمهم المشركون“

پھر جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی تو کافروں نے ان کو شکست دے دی۔

”فانهزام المشرکین حصل مرتین وانهزام المسلمین حصل مرة واحدة وهذا اختيار

الزجاج“

مشرکوں کو دو مرتبہ شکست حاصل ہوئی اور مسلمانوں کو ایک مرتبہ شکست حاصل ہوئی۔

زجاج کا یہ قول دو وجہ سے سنگین ہے ایک تو صحابہ کرام کی اجتہادی خطا، کو اس نے رسول اللہ ﷺ کی دیدہ

دانستہ نافرمانی قرار دیا ہے، اور دوسری وجہ اس کے قول کے سنگین ہونے کی یہ ہے کہ اس نے کہا کہ

مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس دوسری غلطی پر علامہ واحدی نے یوں گرفت فرمائی۔

وطعن الواحدى فى هذا الوجه فقال كما ان المسلمين نالوا من المشرکين يوم

بدر فكذلك المشرکون نالوا من المسلمين يوم احد ولکنهم ما هزموا المسلمين

البتة، اما يوم احد فالمسلمون هزموا المشرکين اولاً ثم انقلب الامر“

کہ زجاج نے جو یہ کہا ہے کہ احد میں مسلمانوں کو شکست حاصل ہوئی یہ غلط ہے، صرف یوں کہا جاسکتا

ہے کہ بدر میں کافروں کو مسلمانوں کی طرف سے تکلیف پہنچی اور احد میں مسلمانوں کو مشرکین کی طرف

سے تکلیف پہنچی، لیکن مسلمانوں کو شکست بالکل نہیں ہوئی، میدان میں جم کر رہنا مسلمانوں کو ہی حاصل

رہا، ابتدائی طور پر مسلمانوں کو ہی برتری حاصل رہی، بعد میں معاملہ الٹ ہو گیا کہ وقتی طور پر مشرکین کو

کچھ برتری حاصل ہو گئی، اس کی وجہ بھی صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی کہ انہوں نے درے کو چھوڑ



﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ﴾ ”اے محبوب آپ فرمادیجئے وہ تمہارے نفسوں کی طرف سے۔“

یعنی احد میں جو تمہیں مصیبت پہنچی وہ تمہاری اپنی جانب سے کہ تم نے اجتہادی خطا کی، ایک دوسرے سے نزاع کیا بعض نے کہا یہیں رک جاؤ، بعض نے کہا اب رکنے کی ضرورت نہیں ہمیں فتح حاصل ہو چکی ہے، بس یہی وجہ تھی تمہیں مصیبت پہنچنے کی، اس میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کو سمجھنے میں تم نے غلطی کی وہ تمہاری غلطی تمہیں تکالیف پہنچنے کا ذریعہ بن گئی۔

ایک اور وجہ عظیم:

ماروی عن علیؑ انه قال جاء جبریلؑ الی النبیؐ یوم بدر فقال یا محمدان اللہ قد کرہ ما صنع قومک فی اخذہم الفداء من الاساری وقد امرک ان تخیرہم بین ان یقدموا الاساری فیضربوا اعناقہم، و بین ان یأخذوا الفداء علی ان تقتل منهم عدتہم فذکر رسول اللہ ﷺ ذلک لقومہ، فقالوا یا رسول اللہ ﷺ عشائرننا و اخواننا أخذ الفداء منهم، فنتقوی بہ علی قتال العدو و نرضی ان یتشهد منا بعدہم فقتل یوم احد سبعون رجلاً عدد اساری اہل بدر فہو معنی قوله قل هو من عند انفسکم ای بأخذ الفداء واختیار کم القتل“

حضرت علیؑ سے مروی ہے، بیشک آپ نے فرمایا کہ جبریلؑ نبی کریم ﷺ کے پاس بدر کے دن آئے، تو کہنے لگے اے محمد (ﷺ) بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کا قیدیوں سے فدیہ لینا ناپسند کیا ہے، اور تحقیق وہ تمہیں حکم دیتا ہے آپ اپنی قوم کو اختیار دے دیں یا تو وہ قیدیوں کی گردنیں اڑا دیں، یا ان سے فدیہ لے لیں لیکن ان کو قیدیوں کی تعداد میں شہید ہونا پڑے گا، نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو رب تعالیٰ کا یہ پیغام سنا دیا، تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے قبیلہ کے لوگ ہیں، ہمارے خاندانی بھائی ہیں، ہم ان سے فدیہ لے لیتے ہیں، اور دشمن سے ہم جنگ کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں، اور ہم اس پر راضی ہیں یعنی ہم اسے خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ ان قیدیوں کی تعداد میں ہم شہید ہو جائیں، ان کے اسی فیصلہ کے مطابق احد کے دن ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے کیونکہ بدر میں ستر قیدیوں



سے فدیہ لیا گیا تھا، یہی مطلب ہے رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا ﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ﴾ کہ یہ تمہارا اپنا ہی فیصلہ تھا کہ اب ہم ستر قیدیوں کا فدیہ لے لیتے ہیں، اور بخوشی ہم میں ستر آدمی شہید ہونے کو قبول کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۸۲ رواہ البیہقی، قرطبی)

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یعنی بیشک وہ قادر ہے تمہاری امداد پر اگر تم ثابت رہتے اور صبر کرتے جیسے وہ قادر ہے تمہاری امداد کے چھوڑ دینے پر جب تم نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف درے کو چھوڑ دیا۔

واجتمع اصحابنا بهذا على ان فعل العبد مخلوق لله تعالى قالوا ان فعل العبد شيء فيكون مخلوقا لله تعالى قادر اعليه“

اسی سے علماء اہل سنت نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ بیشک بندے کا فعل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، کیونکہ بندے کا فعل بھی شیء ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے۔

اسی سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو معتزلہ کا مذہب خود بخود باطل ہو گیا کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے، کیونکہ بندے کو اگر اپنے افعال کا خالق مانا جائے تو رب تعالیٰ کا خالق نہ ہونا ثابت ہوگا کیونکہ ایک چیز کی خلق کے بعد دوبارہ خلق نہیں، بندہ جب خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے تو اللہ تعالیٰ ہی اس کے افعال کا بھی خالق ہے۔ (کبیر جلد نمبر ۹ صفحہ نمبر ۸۲)





## نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن

فخر اہلسنت استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا عبدالرزاق بھٹرا لوی، مطاروی کی علمی شاہکار

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد اول)	200/=	اذان کے ساتھ درود شریف مستحب ہے	21/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد دوم)	200/=	سبز عمامہ کی برکات سے کذاب جل اٹھے	24/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد سوم)	200/=	انگوٹھے چومنا مستحب ہے	21/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد چہارم)	200/=	نماز کے بعد ذکر و دعا مستحب ہے	40/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد پنجم)	200/=	تکریم والدین مصطفیٰ ﷺ	20/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ششم)	200/=	احکام مساجد	24/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ہفتم)	200/=	نماز حبیب کبریاء	150/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد ہشتم)	200/=	نور الایضاح (عربی حاشیہ)	69/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد نهم)		تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان	120/=
نجوم الفرقان فی تفسیر آیات القرآن (جلد دہم)		السراجی فی المیراث (اردو)	33/=
شع بدایت	120/=	تلخیص المفتاح (عربی حاشیہ)	45/=
سراج الارواح (اردو حاشیہ)	36/=	کنز الدقائق (عربی حاشیہ)	270/=
تذکرۃ الانبیاء (مجلد خاص)	360/=	المظہر النوری علی المختصر القدوری	150/=
موت کا منظر مع احوال حشر و نشر	210/=	ایصال ثواب مستحب ہے	27/=
اقامت پیشہ کرنا مستحب ہے	21/=	جواہر السنایہ فی شرح ہدایہ جلد اول	200/=
اسلام میں عورت کا مقام	150/=	جواہر السنایہ فی شرح ہدایہ جلد دوم (زیر تہیہ)	







